بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ساقی۔ دہلی

سالنامہ جنوری ۱۹۳۷ء

ایڈیٹر

شاہد احمد۔ بی۔ اے (آنرز) دہلوی

قیمت ایک روپیہ چار آنے

ساقی کا سالانہ چندہ پانچ روپیہ ہے
جس میں اسکے تمام خاص نمبروں کی
قیمت بھی شامل ہے۔

جرعات

ساقی میں اُردو کے بہترین انشا پردازوں
کے مضامین شائع ہوتے ہیں اسکا معمولی
پرچہ بھی سو صفحے کا ہوتا ہے۔

جلد ۱۵ | سالنامہ ساقی۔ دھلی، بابت ماہ جنوری ۱۹۳۷ء | نمبر ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

الحمدللہ! ساقیؔ اپنی زندگی کے سات سال پورے کرکے اب آٹھویں میں قدم رکھ رہا ہے۔ سالگرہ کے موقع پر اب تک ہر سال ایک ضخیم خاص نمبر سالنامہ کی صورت میں شائع ہوتا رہا ہے، چنانچہ اس سال بھی نئے سال کی ابتدا سالنامہ سے ہو رہی ہے۔

سالنامہ کا پہلا مضمون استاذی شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن صاحب کا عطیہ ہے۔ مولانا کی علمی و تاریخی قابلیت مسلّم ہے۔ افسوس اسکا ہے کہ انکی مصروفیات اس درجہ بڑھی ہوئی ہیں کہ لکھنے لکھانے کا موقع بالکل نہیں ملتا۔ پچاس برس پہلے کی دلّی کے چشمِ دید حالات مولانا نے دلّی ریڈیو اسٹیشن کے لئے آغا محمد اشرف صاحب ایم۔اے۔ کے اصرار پر لکھے تھے اور چھ قسطوں میں یہ مضمون پڑھا گیا تھا۔ اسمیں ضروری ترمیم کے بعد ساقیؔ میں شائع کیا جا رہا ہے۔ آخیر کے چند صفحات مولانا نے ساقیؔ کیلئے اضافہ فرمائے ہیں۔ قاضی نذرالاسلام کو اُردو سے روشناس کرانے کا فخر مسٹر اختر حسین رائیپوری کو حاصل ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اسے اُن کا احسان سمجھنا چاہیئے کہ بنگالی زبان کے ایک جلیل القدر شاعر کے انوکھے خیالات انکے ذریعہ سے اُردو میں منتقل ہو گئے۔ پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب ایم۔اے کا مضمون تنقیدِ عالیہ کا عُمدہ نمونہ ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ آئندہ بھی آپ کے تنقیدی مضامین ساقیؔ میں شائع ہوتے رہیں گے۔ ساقیؔ کے سرپرست و معاونِ خصوصی مولانا عنایت اللہ دہلوی نے ہیملٹ جیسی شہرۂ آفاق تمثیل کا ترجمہ کرکے اُردو کے سرمایۂ ادب میں نہایت قیمتی اضافہ کیا ہے۔ یہ ایک بے نظیر چیز ہے جو آپکو صرف ساقیؔ ہی کے سالنامہ میں ملیگی۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے نمونے کا خطبۂ صدارت بڑے کام کی چیز لکھی ہے۔ اسے ہم مزاحِ خفی اور طنزِ لطیف دونوں کا نمونہ سمجھ سکتے ہیں۔ اسلم صاحب کے افسانے سوسائٹی کی سچی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ اسمیں اسلم صاحب کو کمال حاصل ہے۔ زبان سیدھی سادی مگر دلکش لکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ افسانویت کے ساتھ ساتھ انکے کردارِ افسانہ بے جان گڑیاں نظر نہیں آتے۔ جفا رو دست میں اسلم صاحب کی خصوصیاتِ نگارش سب بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ پروفیسر برآس نے ایک بہت مشکل موضوع پر مضمون لکھا ہے۔ کسی اور کے بس کا تھا بھی نہیں۔ اس مضمون کے پڑھنے سے عجیب عجیب باتیں معلوم ہوتی ہیں اور حیرت ہوتی کہ یہ خیالات جاپانیوں کے ذہن میں پیدا ہی کیسے ہوئے؟ من کی موج چھوٹا سا مضمون ہے مگر بہت خوبصورت۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے ایک اچھوتے موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ فارسی شاعری پر تبصرہ کرنے میں صاحبِ مضمون نے جو کاوش کی ہے۔ اسکا اندازہ دورانِ مطالعہ میں آپکو ہو جائیگا۔ اسکے بعد اُردو شاعری اور خصوصاً غالب کی شاعری پر جس پیرایہ میں روشنی ڈالی ہے بطورِ خاص دیکھنے کی چیز ہے۔ اِس مضمون میں گویا دادِ تحقیق بھی دی گئی ہے اور دادِ تنقید بھی۔ پروفیسر احمد علی کے آتش بار قلم کے چند نمونے آپ ساقیؔ کی گذشتہ اشاعتوں میں دیکھ چکے ہیں لیکن "ہماری گلی" انکے پچھلے سب افسانوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے اور اپنی طرز کا پہلا افسانہ ہے۔ مسٹر اختر حسین رائیپوری نے ایک ایکٹ کا ڈرامہ لکھا ہے۔ اس میں آپکو زبان و بیان، جذبہ و خیال کی نئی نئی مثالیں ملینگی۔ قریشی صاحب نے ایک دلچسپ تحقیقی مضمون لکھا ہے۔ محترمہ حجاب امتیاز علی افسانہ نگاری میں نئی نئی باتیں پیدا کرتی ہیں۔ اس سال انہوں نے ہوائی جہاز چلانا سیکھا ہے اور پہلی مُسلم خاتون ہیں جنہوں نے پائلٹ کی سند حاصل کی ہے۔ انہوں نے نئی طرز کے ہوائی افسانے لکھنے شروع کئے ہیں جنمیں سے پہلا افسانہ ساقیؔ میں شائع ہو رہا ہے۔

(۱) اسپرٹا [?] ... مشہور ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ اس روایت کی ابتدا ایک قدیم مجوسی

شیکسپیر کی شہرۂ آفاق تمثیل

ڈنمارک کا شہزادہ

ہیملٹ

مُترجمہ

مولانا عنایت اللہ۔ دہلوی۔ بی۔ اے۔

(سابق ناظمِ دار الترجمہ۔ حیدرآباد دکن)

ڈرامہ کے لوگ

کلاڈیوس - بادشاہ ڈنمارک۔

ہیملٹ - بادشاہِ سابق کا فرزند اور بادشاہِ حال کا بھتیجا۔

پلونیوس - بادشاہ کا وزیر۔

ہوریشیو - ہیملٹ کا دوست۔

لے ارتیز - پلونیوس وزیر کا بیٹا۔

درباری:
- ولٹیمند۔
- کورنیلیوس۔
- روزنکرانز۔
- گلڈنسٹرن۔
- اوسرک۔
- ایک شریف آدمی۔

فوجی افسر:
- مارسیلس۔
- برنارڈو۔

فرانسسکو - سپاہی

رینالڈو - پلونیوس وزیر کا ملازم۔

تماشا گر۔

دو گنوار گورکن۔

فورٹن براس - ناروے کا شہزادہ۔

ایک کپتان۔

انگریزی سفیر۔

گرٹرود ڈنمارک کی ملکہ اور شہزادہ ہیملٹ کی ماں۔

اوفیلیا - پلونیوس وزیر کی بیٹی۔

امرا، بیگمات۔ فوجی افسر، سپاہی، ملاح، قاصد اور دیگر ملازمین۔

شہزادہ ہیملٹ کے باپ کی روح۔

منظر - ڈنمارک۔

ڈنمارک کا شہزادہ ہیملٹ

جزوِ اوّل

پہلا منظر:- قصر السینور کے سامنے ایک لمبا چبوترہ۔ چبوترے پر فرانسسکو پہرہ دے رہا ہے۔ برنارڈو سامنے سے آتا ہے۔

برنارڈو:- کون ہے؟

فرانسسکو:- یہ بات تو میرے پوچھنے کی ہے۔ خبردار آگے نہ بڑھو۔ جواب دو کہ تم کون ہو۔

برنارڈو:- "بادشاہ زندہ باد!"

فرانسسکو:- اچھا برنارڈو تم ہو۔

برنارڈو:- ہاں میں برنارڈو ہوں۔

فرانسسکو:- واہ واہ خوب ٹھیک وقت پر آئے۔

برنارڈو:- بارہ بج رہے ہیں۔ فرانسسکو تمہارا پہرا ختم ہوا۔ جاؤ آرام کرو۔

فرانسسکو:- پہرے سے فارغ کرنے کا شکریہ۔ سردی بلا کی ہے اور میں بہت ہی تھکا ماندہ ہو رہا ہوں۔

برنارڈو:- کہو پہرے میں سب چُپ چاپ رہا۔

فرانسسکو:- پتّا تک نہیں کھڑکا۔

برنارڈو:- اچھا۔ شب بخیر۔ رستے میں ہوریشیو اور مارسیلس ملیں جو میرے ساتھ پہرا دینے والے ہیں تو اُن سے کہنا کہ جلد یہاں آ جائیں۔

فرانسسکو:- میں اُن کی آواز سنتا ہوں۔ کھڑے رہو۔ بتاؤ کون ہو؟

(ہوریشیو اور مارسیلس اندر آتے ہیں)

ہوریشیو:- اس ملک کے خیر طلب اور جاں نثار۔

مارسیلس:- اور بادشاہِ ڈنمارک کی وفادار رعایا۔

فرانسسکو:- اہا! دونوں صاحبوں کو سلام۔

مارسیلس:- خدا حافظ۔ کھرے جوان۔ پہرے سے تمہیں کس نے فارغ کیا؟ اچھا سلام۔

فرانسسکو:- برناڈو میری جگہ پہرا دے رہا ہے۔ اچھا شب بخیر خدا حافظ۔ (فرانسسکو چلا جاتا ہے)

مارسیلس:- برنارڈو۔

برنارڈو:- کہو کیا کہتے ہو۔ کیا ہوریشیو بھی ساتھ ہے؟

ہوریشیو:- سب نہیں تو کچھ تو ضرور ہے۔

برنارڈو:- شاباش ہوریشیو۔ شاباش مارسیلس خوب آئے۔

مارسیلس:- کہو۔ کیا آج شب کو بھی وہ چیز نظر آئی تھی؟

برنارڈو:- مجھے تو کچھ بھی نظر نہیں آیا۔

مارسیلس:- ہوریشیو کہتا ہے کہ وہ محض ہمارا وہم و خیال ہے۔ ہم نے جو خوفناک صورت دو مرتبہ دیکھی ہے اس کا یقین اُسے کسی طرح نہیں آتا۔ بڑی خوشامد درآمد سے اُسے یہاں تک لایا ہوں کہ وہ رات کو ہمارے ساتھ پہرا دے۔ اور اگر پھر وہ چیز نظر آئے تو ہم جو کچھ پہلے دیکھ چکے ہیں اسکی تصدیق کرے اور اُس سے بات بھی کرے۔

ہوریشیو:- دُور بھی کرو۔ کس وہم میں پڑے۔ وہ اب ہرگز نہ آئے گی۔

برنارڈو:- تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہو۔ اور اجازت دو کہ ہم

تم کو وہی واردات سنائیں جسکے یقین کرنے کیلئے تم نے اپنے کان پتھر کرلئے ہیں۔ ہم سے سُنو کہ ہم نے دو راتوں میں کیا دیکھا۔

ہوریشیو:۔ اچھا بیٹھ جاؤ۔ اور برنارڈو کو سارا قصہ سُنانے دو۔

برنارڈو:۔ سُنو کل شب کو جب یہ سامنے والا ستارہ قطب تارے سے مشرق کی طرف گردش کرتے کرتے وہاں آیا جہاں اب وہ آسمان کے اس حصے کو روشن کر رہا ہے اور گھنٹے نے ایک بجایا تو مارسیلس اور میں.......

(روح ایک غبار کی شکل میں نظر آتی ہے)

مارسیلس:۔ خاموش۔ کوئی بات نہ کرے۔ دیکھو پھر وہ آئی۔

برنارڈو:۔ صورت وضع قطع بالکل وہی ہے جو بادشاہ ڈنمارک آنجہانی کی تھی۔

مارسیلس:۔ تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو۔ ہوریشیو۔ اُس سے کچھ پوچھو تو۔

برنارڈو:۔ کیا وہ بادشاہ سے مُشابہ نہیں ہے؟ ہوریشیو ذرا غور سے دیکھو۔

ہوریشیو:۔ ہُو بہُو بادشاہ کی صورت ہے۔ خوف اور حیرت سے میں تو سرد پڑا جاتا ہوں۔

برنارڈو:۔ جو کچھ بھی ہو۔ اُس سے بات ضرور کرنی چاہیئے۔

مارسیلس:۔ ہوریشیو اُس سے کچھ پوچھو تو۔

ہوریشیو:۔ آپ کون ہیں اور کیوں اوقاتِ شب پر آپنے تصرف کیا ہے۔ اور کیوں ایسی جنگجو اور حسین شکل میں آپ ظاہر ہوئی ہیں جسمیں ڈنمارک کا بادشاہ جسکو ہم ابھی سُپردِ خاک کرچکے ہیں نکلا کرتا تھا؟ خُدا کی قسم دلا کر پوچھتا ہوں کہ آپ بتائیں آپ کون ہیں۔

مارسیلس:۔ معلوم ہوتا ہے کہ روح خفا ہوگئی۔

برنارڈو:۔ دیکھو وہ چُپکے چُپکے ایک طرف کو کھسک چلی۔

ہوریشیو:۔ ٹھیریئے۔ ٹھیریئے۔ میرا سوال ہے کہ آپ اپنا حال بتاتی جائیں۔ (روح چلی جاتی ہے)

مارسیلس:۔ روح تو چلی گئی اور کسی سے اُسنے بات نہ کرنی چاہی۔

برنارڈو:۔ ہوریشیو۔ تم پر اتنا رعشہ کیوں ہے۔ چہرہ کیوں زرد پڑ گیا؟ تم تو اُسکو ہمارا وہم وخیال ہی بتایا کرتے تھے۔ اب دیکھ لیا کہ وہ وہم وخیال سے کتنی بڑھکر ہے۔ اب بتاؤ کہ تمہارا کیا خیال ہے۔

ہوریشیو:۔ خُدا گواہ ہے کہ جب تک میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیتا کبھی اس کا یقین نہ کرتا۔

مارسیلس:۔ کیا وہ بادشاہ سے مُشابہ نہیں ہے؟

ہوریشیو:۔ ایسی ہی مُشابہ ہے جیسے تمہاری صورت تم سے مُشابہت رکھتی ہے۔ یہی زرہ و جوشن وہ اُس دن پہنے تھا جس دن کہ وہ مغرور و حریص بادشاہِ نوروے سے لڑا تھا۔ اور جبیں پر غصہ کے شکن وہی تھے جبکہ حالتِ قہر وعتاب میں اُسنے پولستان کے بہادروں کو جو یخ بستہ زمین پر پھسلنے والے ٹھیلوں پر سوار تھے قتل کرکے برف پر اُنکی لاشیں ڈال دی تھیں۔ حیرت کا مقام ہے۔

مارسیلس:۔ دو مرتبہ پہلے اور آج اس وقت اندھیری رات میں ہمارے پہرے میں جنگی لباس اور فوجی انداز میں گشت کرتی دکھائی دی ہے۔

ہوریشیو:۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ خیال کیلئے کونسا پہلو اختیار کیا جائے کہ یہ مُعمہ حل ہو۔ لیکن جہاں تک میری رائے کو دخل ہوسکتا ہے اتنا ضرور کہونگا کہ ہماری ریاست میں کوئی فتنہ یا فساد اُٹھنے والا ہے۔

مارسیلس:۔ اچھا سب بیٹھ جاؤ۔ اور جس کسی کو معلوم ہو وہ بتائے کہ ریاست میں آجکل جو پہرا چوکی اس شدت سے بڑھا ہے کہ مُلک کی رعایا کو دن تو دن راتوں کو بھی محنت و مشقت میں مشغول

ومصروف رہنا پڑتا ہے اسکا باعث کیا ہے ؟ یہ شبانہ روز برنجی توپیں کیوں ڈھالی جاتی ہیں، اور باہر کے ملکوں سے لڑائی کا سامان اس کثرت سے کیوں منگایا جاتا ہے ؟ جہاز بنانیوالوں میں کیوں اس سرگرمی سے کام ہو رہا ہے کہ ہفتے میں اتوار کو بھی کام نہیں چھوڑتے ؟ محنت و تن دہی میں رات دن ایک کر رکھا ہے۔ جو کوئی جانتا ہو وہ بتائے کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔

ہوریشیو:۔ یہ سب تو میں بتا سکتا ہوں۔ کم سے کم جہانتک افواہ ہے۔ اتنا تو تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ ہمارے آخری بادشاہ سے جس کی صورت ابھی ظاہر ہوئی تھی ایک زمانہ میں نوروے کے بادشاہ فورٹن براس نے نخوت و غرور سے متاثر ہو کر لڑائی کی تھی۔ اس جنگ میں ہمارے بادشاہ ہیملٹ نے جسکی شجاعت و جوانمردی کی شہرت دُنیا کے اس نواح میں ہو چکی تھی۔ فورٹن براس کو قتل کر دیا۔ جنگ سے پہلے ایک وثیقہ قوانین ملک اور علامات النسب کے قواعد کے مطابق تصدیق ہو کر اس مضمون کا مُرتب ہوا کہ اگر بادشاہِ نوروے لڑائی میں ہارا تو اس کی جان اور جس قدر ملک اس کے پاس اُس وقت ہوگا وہ سب ہمارے بادشاہ کا ہو جائیگا۔ لیکن ہمارے بادشاہ نے مفتوحہ مُلک اور اراضی کا تقریبًا نصف اس غرض سے چھوڑ دیا کہ مقتول بادشاہ فورٹن براس کی اولاد کو وہ پہنچ جائے۔ اگر فورٹن براس اس لڑائی میں کامیاب ہو جاتا تو اسی وثیقہ اور عہدنامے کی رُو سے جس سے بادشاہ ہیملٹ کو فورٹن براس کا مُلک ملا۔ ہمارے بادشاہ ہیملٹ کا مُلک فورٹن براس کو مل جاتا۔ اچھا اب فورٹن براس کا جوان بیٹا بہادر اور دلیر مگر ناتجربہ کار جوانی کے غرور میں مست ہو کر نوروے کی سرحدوں پر بہت سے اوباش اور بدمعاش لوگوں کو محض خوراک کے لالچ پر اس کام کیلئے جمع کر رہا ہے کہ جسمیں اُسے کچھ مل جائے۔ اور یہی کام ہے جسکی علامتیں ہماری ریاست میں آجکل آشکارا ہیں کہ اس شہزادے کے باپ نے ہمارے بادشاہ سے لڑ کر جو مُلک ہارا تھا اُس پر جبرًا و قہرًا پھر اپنا قبضہ قائم کرے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آجکل جس زور شور سے تیاریاں ہماری ریاست میں اس عُجلت و جانفشانی سے ہو رہی ہیں اور تمام ریاست میں ایک شور برپا ہے اسکی وجہ صرف یہی ہے۔

برنارڈو:۔ میں بھی یہی وجہ سمجھتا ہوں۔ اور یہی باعث ہو کہ یہ بدفال اور بدشگون صورت بالکل بادشاہ کی شکل میں ہمارے پہرے میں بار بار نظر آئی ہے۔ کیونکہ ہمارا بادشاہ ہی اس جنگ کا موضوع و مضمون تھا۔

ہوریشیو:۔ یہ واقعہ چشم دانش میں درد پیدا کرنے کیلئے ایک ذرہ کا پڑ جانا ہے۔ سلطنت روما کے زمانۂ عروج و اقبال میں کچھ پہلے اس سے کہ وہاں کا زبردست سالارِ فوج جولیس سیزر قتل ہوا قبریں مُردوں سے خالی ہو گئیں اور کفن پہنے مُردے شہر کے گلی کوچوں میں چکچاتے اور عجیب و غریب بولیاں بولتے پھرنے لگے۔ آسمان پر دُمدار ستارے نمودار ہوئے جن کی دُمیں روشن شعلوں کی تھیں۔ خونی رنگ شبنم زمین پر گری۔ کرۂ آفتاب میں سیاہ داغ پیدا ہوئے۔ اور ہمارا یہ مرطوب سیارہ یعنی قمر جس کی وجہ سے سمندر کے خدا نپتیون کی سلطنت قائم ہے اسمیں ایسا گہن لگا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ قیامت تک نہ اُتریگا۔ اور اسی طرح قہر و غضب کی پیش خبری دینے والے تقدیر کے مخبر و نقیب آفات و مصائب کا مقدمہ بنکر ظاہر ہوئے۔ زمین اور آسمان دونوں نے مل کر مُلک اور مُلک والوں کو خبردار کیا۔ لیکن خاموش۔ دیکھو وہ صورت پھر چلی آتی ہے۔

(روح پھر داخل ہوتی ہے۔)

میں تو اس روح کے غُبار میں گھستا ہوں چاہے وہ مجھ کو جلا ہی کیوں نہ ڈالے۔ اے روح ٹھہر۔ اگر تجھ میں آواز ہے اور تو

بول سکتی ہے تو مجھ سے بات کر۔ اگر کوئی بھلائی تیرے ساتھ کرنی ممکن ہو تو کہہ۔ تاکہ تجھے راحت اور مجھے سعادت نصیب ہو۔ مجھ سے بات کر۔ (مرغا اذان دیتا ہے) اگر تجھے اپنے ملک کی تقدیر کا حال معلوم ہے تو بتا تاکہ پہلے ہی علم ہو جانے سے آنے والی مصیبتیں ٹل سکیں۔ کچھ تو زبان سے کہہ۔ اگر زندگی میں تونے دولت جمع کی تھی اور اسکو بطن زمین میں دفن کر دیا تھا جس کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد اکثر روحیں آوارہ پھرتی ہیں تو بتا۔ ذرا تو دم لے۔ کچھ زبان سے کہہ۔ مارسیلس اسے روکو۔

مارسیلس :- کیا میں اپنے عصار سے روکوں؟

ہوریشیو :- اگر وہ نہ ٹھیرے تو یہی کرو۔

برنارڈو :- لو وہ تو یہاں ہے۔

ہوریشیو :- نہیں یہاں ہے۔

مارسیلس :- وہ تو چلی گئی۔ جس کی صورت ایسی شاہانہ ہو اُس پر عصار چلانا۔ (روح چلی جاتی ہے۔) بڑی بدسلوکی تھی۔ وہ تو مثل ہوا کے تھی جس پر ہاتھ اُٹھانا بالکل فضول تھا۔

برنارڈو :- وہ کچھ کہنے ہی کو تھی کہ مرغ نے بانگ دی۔

ہوریشیو :- اور بانگ سُنتے ہی وہ اس طرح چلی گئی جیسے کوئی مجرم طلبی کی آواز سُنتے ہی خوفزدہ ہو کر چلا جائے۔ میں نے سُنا ہے کہ خروس جو صبح کا جرس ہے وہ اپنی بلند اور تیز آواز سے دن کے خدا کو بیدار کرتا ہے اور اس کی بانگ سُنکر آوارہ گرد روحیں خواہ سمندر میں ہوں خواہ آگ میں ہوں، زمین پر ہوں یا فضا میں مُعلّق ہوں، نہایت سُرعت سے اپنے اپنے زندان کو واپس ہو جاتی ہیں۔ اور اس کا ثبوت اس چیز نے جو ابھی نظر آئی تھی بخوبی دیا ہے۔

مارسیلس :- ادھر مُرغ نے بانگ دی۔ اور اُدھر روح غائب ہوئی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب وہ وقت اور موسم آتا ہے کہ ہمارے نجات دینے والے کی ولادت پر جشن تہنیت ہوتا ہے تو مُرغِ صبح رات بھر بولتا اور چہکتا رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُس رات کو کوئی روح آوارہ نہیں پھرتی۔ راتیں نہایت خوشگوار ہوتی ہیں۔ ستارے نہیں گرتے۔ کسی پری یا دیو کا عمل دخل نہیں ہوتا اور نہ کوئی ساحر سحر کر سکتا ہے کیونکہ وہ وقت نہایت پاک اور مقدس ہوتا ہے۔

ہوریشیو :- ہاں میں نے بھی ایسا ہی سُنا ہے اور میں اس پر کسی قدر یقین بھی رکھتا ہوں۔ لیکن دیکھو سحر نور کا لباس پہنے سامنے کی مشرقی پہاڑی سے شبنم پر قدم مارتی چلی آتی ہے۔ اب ہمیں اپنا پہرا ختم کر دینا چاہیے۔ اور میری صلاح تو یہی ہے کہ اس وقت جو کچھ ہم نے دیکھا ہے اُس سے نوجوان شہزادہ ہیملٹ کو مُطلع کر دیں کیونکہ اپنی جان کی قسم یہ روح جو ہمارے سامنے بے زبان بن گئی تھی شہزادے ہیملٹ کو جب دیکھے گی تو اُس سے ضرور بات کریگی۔ کیا تم بھی رضامند ہو کہ ہم اپنا فرضِ منصب اور مُقتضائے وفاداری سمجھکر شہزادے سے روح کا واقعہ عرض کریں؟

دوسرا منظر :- شاہی محل میں ایک کمرہ

بادشاہ، ملکہ، شہزادہ ہیملٹ، پلونیئس، لے ارٹیز، ولٹی منڈ، کورنی لیوس۔ اور دیگر اُمرائے دربار اور خُدّامِ شاہی داخل ہوتے ہیں۔

بادشاہ :- گو ہمارے برادرِ عزیز و حبیب کی موت نے ہمارے دل میں رنج والم کے زخموں کو ہرا کر رکھا ہے اور مناسب بھی یہی ہے کہ اس غمگین وقوعے کا احساس برقرار رکھا جائے اور ہماری کُل رعایا بھی اس صدمہ میں یک جبینِ پُرغم بنی رہے۔ لیکن عقل نے فطرت کے ساتھ کشمکش کی اور اب ہم اپنے بھائی کو ایسے رنج والم کے ساتھ جسمیں عقل بھی شامل ہے یاد کرتے ہیں۔ اور خیال رکھتے ہیں کہ کہیں اپنی ذات کو بھی اس غم میں فراموش نہ کر دیں۔ پس وہ خاتون جو پہلے ہماری بہن تھی اب وہ ہماری ملکہ

ہے اور اس جنگجو سلطنت میں ہماری برابر کی شریک و سہیم ہے، گویا اس رنج آمیز خوشی میں کہ آنکھوں سے مسرت بھی ظاہر ہے اور آنسوؤں کی لڑیاں بھی جاری ہیں شادی میں ترانۂ غم اور رنج میں راحت کو برابر تول کر ہم اپنے بھائی کی بیوہ کو عقد میں لائے ہیں اور اُسکو اپنی ملکہ بنایا ہے۔ تم سب نے بھی اپنی صائب رائے کو اس معاملہ میں مُستثنے نہیں رکھا اور تم اس مقدمہ میں ہمارے ہمیشہ مُمد و معاون رہے ہو۔ اس لئے ہم سب کے مرہونِ منّت ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ کہنا ہے وہ یہ ہے، اور ہم سب کو اس کا علم بھی ہے، کہ بادشاہِ نوروے کے جوان بیٹے فورتن براس نے ہماری قوت و سطوت کو کم سمجھ کر یا اس خیال سے کہ ہمارے عزیز بھائی کی موت نے قوائے سلطنت کو مُضمحل اور بے قرینے کر دیا ہے، اپنے نفع اور فائدے کے مُردہ خواب و خیال کو از سرِ نو زندہ کر کے ہمیں پریشان کرنے کیلئے متعدد پیغام اس مضمون کے بھیجے ہیں کہ جس قدر مُلک اور زمین اس کے باپ نے ہمارے مُتوفی بھائی سے شکست کھا کر حسبِ مُعاہدات و دستاویزات اس کے حوالے کی تھیں اب وہ سب واپس کی جائیں۔ یہاں تک تو جو کچھ ہم کو اس امرِ خاص میں کہنا تھا وہ کہا۔ اب ہمیں جو کچھ کہنا ہے وہ ما بدولت اور اس جلسے کی اغراض کی نسبت ارشاد کرنا ہے۔ ہم نے بادشاہِ نوروے کو جو نوجوان فورتن براس کا چچا ہے اور آج کل صاحبِ فراش ہے۔ اس کے بھتیجے کی نسبت لکھا ہے کہ شاہِ موصوف اپنے برادرزادے کو اس قصد سے باز رکھے۔ نوجوان فورتن براس شاہِ نوروے کی رعایا میں سے فوجیں بھرتی کر رہا ہے۔ اُسکو بند کیا جائے۔ پس ہم کورنی لیوس تمکو اور ولتی مند تمکو اس پیغام کا حامل بنا کر مُعمّر بادشاہِ نوروے کے پاس بھیجتے ہیں۔ اِس معاملے میں سوائے ہمارے پیغام کے اور کچھ کہنے کا تمہیں اختیار نہ ہوگا۔ البتہ جس حد تک یہ تحریر جسمیں تمام مضامین مُفصّل اور مشرح بیان کئے گئے ہیں تم کو کچھ کہنے کی اجازت دے۔ مگر اس سے زیادہ کچھ کہنے کے تم مجاز نہ ہوگے۔ اچھا رُخصت۔ تمہارا فرضِ منصب یہی ہوگا کہ تم اس کام کو عُجلت سے انجام دو۔

کورنی لیوس } اس امر اور دیگر احکامِ شاہی کی بجا آوری
ولتی مند } ہمارا سب سے بڑا فرضِ منصب ہے۔

بادشاہ:۔ ہم کو اس میں ذرا بھی شک و شُبہ نہیں۔ اچھا اب رُخصت۔ (کورنی لیوس اور ولتی مند چلے جاتے ہیں) لے ارتیز تم کو کچھ کہنا تھا۔ تم نے اپنی کسی درخواست کا ہم سے ذکر کیا تھا۔ وہ کون سی عرضداشت ہوگی جو تم پیش کر دوگے اور ہم اُسے خوشی سے منظور نہ کرینگے۔ بادشاہِ ڈنمارک سے تم کسی چیز کی درخواست جو عقل پر مبنی ہو ایسی نہیں کر سکتے جو تمہارے بے مانگے منظور نہ کر لی جائے۔ انسان کا سر اُسکے دل سے اتنا تعلق نہیں رکھتا اور اسکے ہاتھ اُسکے دماغ کے اتنے خادم نہیں ہیں جس قدر کہ شاہی خانوادہ ڈنمارک تمہارے باپ کا زیرِ بارِ احسان ہے۔ لے ارتیز تم کیا چاہتے ہو؟

لے ارتیز:۔ خداوندِ نعمت۔ میری درخواست صرف اتنی ہے کہ فدوی کو فرانس جانے کی اجازت مرحمت ہو۔ میں فرانس سے بڑی مسرت کے ساتھ حضور کے جشنِ تاجپوشی میں شرکت حاصل کرنے یہاں حاضر ہوا تھا۔ اب چونکہ یہ سعادت نصیب ہو چکی ہے اس لئے اب میرے خیالات اور میری اُمیدیں بارگاہِ عالی میں مُتمنّی ہیں کہ اس ناچیز کو فرانس واپس جانے کی اجازت ملے۔ اور اس تکلیف دہی کا فدوی نہایت عجز و انکسار کے ساتھ خواستگارِ معافی ہے۔

بادشاہ:۔ تم نے اپنے والدِ بزرگوار سے بھی اجازت حاصل کر لی ہے؟ (پولونیوس کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے۔) تم کو کیا کہنا ہے؟

پلونیوس:- حضور اس نے بڑے اصرار کے بعد میری اجازت حاصل کرلی ہے۔ نہایت تامل و تذبذب کے بعد میں نے اُسکی درخواست منظور کی ہے۔ اور اب فدوی کی بھی یہی گزارش ہے کہ اس کو فرانس جانے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔

بادشاہ:- اچھا۔ اے ارتینز۔ جب تم جانا چاہو اس کے لئے وقت مقرر کرسکتے ہو۔ جب چاہو چلے جاؤ۔ اور اپنے وقت کو بہترین کوشش اور لیاقت کے ساتھ جیسا مناسب سمجھو صرف کرو۔ اور اب اپنے قرابت مند برادر زادے اور فرزند شہزادہ ہیملٹ سے ہمارا خطاب ہے۔

ہیملٹ (علیحدہ کہتا ہے) قرابت میں تو شبہ نہیں لیکن احسان و شفقت کچھ نہیں۔

بادشاہ:- ہیملٹ۔ یہ کیا بات ہے کہ ابتک غم کا بادل تمہارے دل پر چھایا ہے۔

ہیملٹ:- نہیں حضور میں تو خوش ہوں۔

ملکہ:- پیارے ہیملٹ۔ بس اب اپنے غم کی تاریکی کو دور کرو۔ بادشاہ کو اپنا شفیق و سرپرست سمجھو۔ اس طرح نظریں نیچے کئے باپ کو خاک میں ڈھونڈنے سے کیا حاصل۔ تم جانتے ہی ہو کہ اولاد کیلئے باپ کا مرنا ایک معمولی بات ہے۔ جو جیتے ہیں ان کو ایک دن مرنا ضرور ہے۔ زندگی ختم کرکے سب کو عدم میں جانا لازمی ہے۔

ہیملٹ:- ہاں اماں۔ یہ تو معمولی بات ہے۔

ملکہ:- اگر معمولی بات ہے تو تم اپنے رنج والم میں اتنی خصوصیت کیوں ظاہر کرتے ہو؟

ہیملٹ:- ملکہ میں ظاہر نہیں کرتا۔ بلکہ دل کا اصلی حال یہی ہے۔ ظاہر کرنا مجھے نہیں آتا۔ پیاری اماں نہ یہ میری کالی قبا یا دستور و رواج کے مطابق سیاہ لباس اور نہ مُنہ سے نکلی پُر درد آہیں اور نہ آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا اور نہ صورت پر غم و تکلیف کے آثار یا رنج والم کی اور علامتیں یا نشانات میرے دل کی حقیقی اور اصلی کیفیت کو ظاہر کرسکتے ہیں۔ کیونکہ یہ سب چیزیں تو وہ ہیں جو ظاہرداری اور نمود کے طور پر بھی انسان دکھا سکتا ہے۔ لیکن پیاری اماں میرا صدمہ تو ایسا ہے کہ وہ تمام غم والم کی علامتوں کالے کپڑوں اور سیاہ لباس سے کہیں بڑھکر ہے۔

بادشاہ:- ہیملٹ تمہاری فطرت نیک و طبیعت قابلِ تعریف ہے کہ تم اپنے باپ کیلئے اتنا غم کرتے ہو۔ لیکن خیال کرو کہ تمہارے باپ نے اپنے باپ کو مرتے دیکھا اور پھر اُس باپ نے اپنے باپ کو مرتے دیکھا ہوگا۔ اور پس ماندگان کا فرض ہوا ہوگا کہ کچھ دنوں انکا غم کریں۔ لیکن ہمیشہ باپ کے غم میں مبتلا رہنا ایک بے معنی سی بات ہے۔ یہ غم مردوں کو زیب نہیں دیتا۔ اِس کے معنی خُدا کے حکموں سے سرکشی کرنے کے ہونگے اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمہارا دل مضبوط نہیں ہے۔ صبر و شکیب سے وہ عاری ہے۔ سمجھ کمزور اور غیر تربیت یافتہ ہے۔ مرنا ایک دن ناگزیر ہے۔ جیسے اور معمولی باتیں ہیں جنہیں حواس محسوس کرتے ہیں اُنہی میں سے اِسکو بھی ایک معمولی بات سمجھو۔ عقل و فہم بتاتی ہے کہ جیسے دُنیا میں پہلا باپ مرا تھا اسی طرح اُس وقت سے لیکر آج تک باپ کا مرنا انسان کیلئے ایسا نقصان ہے جو ہمیشہ پیش آتا رہیگا۔ شہزادے ہماری تم سے درخواست ہے کہ اس غم کو دُور کرو۔ اور ہمیں تم اپنا باپ سمجھو۔ اور سبکو آگاہ ہوجانا چاہیئے کہ تم ہمارے تخت کے قریب ترین وارث ہو اور ہمکو تم سے ہی شریفانہ اُنس و محبت ہے جو ایک جاں نثار باپ کو اپنے فرزند کیساتھ ہوسکتی ہے۔ تمہارا قصد وٹن برگ کے درسگاہ میں واپس ہونے کا ہے۔ یہ ہمیں گوارا نہیں۔ وہاں جانے کا ارادہ فسخ کرو۔ یہیں ہماری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنکر رہو تم سلطنت میں ہمارے بہترین مشیر و صلاح کار و ہمارے عزیز قرابت منداور فرزند ہو۔

ملکہ:- ہیملٹ- اپنی ماں کے کہنے کو بھی نہ ٹالو- میں چاہتی ہوں کہ تم وٹن برگ نہ جاؤ- ہمارے ہی پاس رہو۔

ہیملٹ:- اماں جہاں تک میرے امکان میں ہوگا میں آپ کی تابعداری کرونگا۔

بادشاہ:- واہ واہ- یہ تو بڑا معقول اور محبت کا جواب ہے۔ جس طرح ہم ڈنمارک میں رہتے ہیں اسی طرح تم بھی یہیں رہو۔ ملکہ- ہیملٹ کا یہ شریفانہ جواب کسی دوسرے کی تحریک سے نہیں دیا گیا ہے- بلکہ خود اپنے دل سے دیا ہے- اس جواب سے میرا دل خوش ہوا- بس اس خوشی میں ہر جام شراب جو ہم پئیں گے اُس پر قلعہ کی سب سے بڑی توپ بادلوں میں گرجیگی، اور ہماری مے نوشی پر توپوں کی جو گرج زمین پر ہوگی اسکی صدائے بازگشت آسمان تک جائے گی- آؤ اب چلو۔

(ہیملٹ کے سوا باقی سب لوگ چلے جاتے ہیں)

ہیملٹ:- اے کاش یہ سخت و کرخت جسم پگھل جاتا یا برف کی طرح تحلیل ہو کر شبنم میں تبدیل ہو جاتا- نہیں تو قادر مطلق و قدیم نے خودکشی کے خلاف اپنا قانون نافذ نہ فرمایا ہوتا- اے خدا- میرے خدا- اس دنیائے فانی کے جتنے کام ہیں وہ کسقدر محنت و مشقت سے خستہ و ماندہ کرنے والے غیر دلچسپ اور بے سود ہیں- افسوس افسوس- یہ دنیا تو ایسا باغ ہے جس کی درستی کی طرف سے غفلت کی گئی ہے خس و خاشاک اس میں اُگ آئے ہیں- اور اُن کے تخم چاروں طرف بکھرے ہیں- جھاڑ جھنکاڑ بدنما درخت اس میں کثرت سے کھڑے ہیں- افسوس نوبت یہاں تک پہنچی- دو ہی مہینے تو مرے ہوئے گزرے تھے- نہیں- دو مہینے بھی نہیں- اور بادشاہ بھی کیسا بے نظیر و عدیم المثال جو اس بادشاہ کے مقابلے میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دن کا حسین خدا ایک بدصورت بدہیئت سیٹر کے مقابلے میں نظر آئے- میری ماں سے اُسے ایسی محبت تھی کہ اگر اُس کے رُخ نازک پر نسیم بہشت کا جھونکا ہلکے سے بھی لگتا تو اُسے ناگوار ہوتا- اے زمین و آسمان تم ہی بتاؤ کیا یہ بات یاد رکھنے کی نہیں ہے- وہ کیوں اُس پر اپنی جان قربان کرنے لگی- کیا عشق کی اشتہا سیر ہونے پر اور تیز ہوئی- ہائے ایک ماہ کے اندر...... اس خیال کو دل سے کیونکر دور کروں- اے کمزوری او تلون تیرا نام عورت ہے- ایک ماہ کا زمانہ تو اتنا تھا کہ وہ پاپوش بھی جنہیں پاؤں میں ڈالکر وہ میرے باپ کے جنازے کے ساتھ سر سے پاؤں تک آنسوؤں میں نہائی ہوئی گئی تھی پرانی نہ ہونے پائی ہونگی کہ اُس نے .... ایک حیوان مطلق بھی جو عقل سے بے بہرہ ہوتا ہے کچھ دن تو غم کرتا ہے- مگر میری ماں نے اور کسی سے بھی نہیں میرے چچا سے جو میرے باپ کا بھائی تھا شادی کرلی- میرے باپ سے وہ اتنا ہی مشابہ تھا جیسا کہ میں رستم سے مشابہ ہوں- ایک مہینے کے اندر پیشتر اس سے کہ وہ آنسو جو بدعہدی و بے وفائی کے ساتھ آنکھوں میں آکر انہیں پُر آشوب کرتے تھے خشک ہوئے ہوں- افسوس اس سُرعت و عجلت میں کیسا خُبث شامل تھا کہ ایسی شادی جو مذہباً حرام تھی فوراً کرلی گئی- یہ اچھا نہ کیا- اور اس کا انجام نیک نہ ہوگا- لیکن حالات وقت چاہتے ہیں کہ چاہے دل کے ٹکڑے ہو جائیں مگر زبان بند رہے۔

(ہوریشیو- مارسیلس اور برنارڈو اندر آتے ہیں)

ہوریشیو:- زندہ باش شہزادۂ والا تبار-

ہیملٹ:- اس وقت مل کر بہت دل خوش ہوا- اچھے ہو- ہوریشیو تم ہی ہو نا یا میں غلطی کرتا ہوں؟

ہوریشیو:- حضور میں ہوریشیو ہوں- حضور کا ادنیٰ خادم-

ہیملٹ:- خادم نہیں- دوست کہو- تم میرے دوست ہو اور میں تمہارا خادم ہوں- تم تو وٹن برگ میں تھے- یہاں کیسے آنا ہوا؟ اچھا مارسیلس بھی ہیں-

مارسیلس:۔ حضور۔ حاضر ہوں۔

ہیملٹ:۔ تم سے ملاقات کرکے اس وقت بڑا جی خوش ہوا۔ برناڑدو اچھے ہو۔ کہو تو یہاں آنا کیسے ہوا؟

ہوریشیو:۔ محض شوقِ آوارہ گردی۔ بجز اس کے اور کیا عرض کروں۔

ہیملٹ:۔ یہ بات تو میں تمہارے دشمن سے بھی سُننی گوارا نہ کرونگا۔ ایسی بات کہہ کر میرے کانوں کو کیوں صدمہ پہنچاتے ہو۔ میں خوب جانتا ہوں کہ تم آوارہ گرد نہیں ہو۔ لیکن یہ تو کہو کہ السینور میں تمہیں کیا کام تھا جو آئے۔ اچھا اب آئے ہو تو ہم تم کو یہاں کی شراب نوشی کے جلسوں میں شریک کرکے شراب پینی سکھا دینگے۔

ہوریشیو:۔ شہزادہ عالیجاہ۔ میں حضور کے والد مرحوم کی تجہیز وتکفین میں شرکت کی غرض سے حاضر ہوا تھا۔

ہیملٹ:۔ مکتب کے یار۔ کیوں شرمندہ کرتے ہو۔ یہ کہو کہ میری ماں کی شادی میں شرکت کیلئے آئے تھے۔

ہوریشیو:۔ فی الواقع۔ حضور کے والد کے انتقال کے بعد ہی شادی جلد پیش آئی۔

ہیملٹ:۔ وجہ کچھ نہیں۔ ہوریشیو جُزرسی، بچت، کفایت شعاری۔ موت کا کھانا باسی اور ٹھنڈا ہو کر شادی کے دسترخوان پر چُنا گیا۔ اے کاش میں اپنے جانی دشمن کو جس کا دوزخ میں ہونا پسند کرتا باغ فردوس میں دیکھتا مگر اس شرمناک دن کو جو دیکھنا پڑا دیکھنے کیلئے زندہ نہ رہتا ہوریشیو مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ والدِ بزرگوار سامنے کھڑے ہیں۔

ہوریشیو:۔ حضور کدھر کھڑے ہیں؟

ہیملٹ:۔ چشمِ تصوّر میں۔ ہوریشیو۔

ہوریشیو:۔ حضور میں نے ایک مرتبہ آنجہانی کو دیکھا تھا۔ بڑے نیک دل بادشاہ تھے۔

ہیملٹ:۔ وہی ایک سچے انسان تھے۔ کسی پہلو سے بھی دیکھئے۔ ان کی مثل دوسرا نہیں تھا۔ اب اُن کی صورت دیکھنی کہاں نصیب ہوگی!

ہوریشیو:۔ شہزادہ عالی وقار۔ میں نے بادشاہِ مرحوم کو کل ہی شب میں دیکھا ہے۔

ہیملٹ:۔ دیکھا۔ کس کو؟

ہوریشیو:۔ حضور کے پدرِ بزرگوار کو۔

ہیملٹ:۔ میرے والد عرش آشیاں کو؟

ہوریشیو:۔ حضور تھوڑی دیر کو اپنی حیرت کو کم کریں۔ اور غور سے سُنیں حتیٰ کہ میں جو کچھ ان دونوں صاحبوں کی موجودگی میں دیکھ چکا ہوں حضور کے سامنے بیان کروں۔ یہ ماجرا حیرت انگیز ہے۔

ہیملٹ:۔ برائے خُدا جلد سُناؤ کہ وہ کیا ماجرا ہے۔

ہوریشیو:۔ سُنیئے۔ کل سے پہلے دو راتیں برابر ان دونوں صاحبوں نے یعنی مارسیلس اور برنارڈو نے جو نصف شب کی وسیع ظُلمت میں پہرا دیتے تھے۔ دیکھا کہ ایک صورت بالکل آپکے والدِ مرحوم سے مُشابہ، سر سے پاؤں تک ہتھیار لگائے اُن کے سامنے آتی ہے اور شاہانہ انداز میں آہستہ قدم ان کے پاس سے گزرتی ہے۔ تین مرتبہ یہ صورت ان دونوں کی خوفزدہ نظروں کے سامنے سے گزرتی ہے۔ اور اتنی قریب آجاتی ہے کہ عصائے شاہی کے زد میں یہ دونوں آجاتے ہیں۔ خوف کے مارے یہ دونوں برف کی مثل سرد پڑ گئے۔ زبان بند ہوگئی اور اُس سے بات نہ کرسکے۔ یہ کُل واقعہ ان دونوں نے بطور ایک راز کے مجھ سے کہا۔ تیسری رات کو میں نے اُنکے ساتھ پہرا دیا۔ چنانچہ جو کچھ ان دونوں نے مجھ سے کہا تھا اب وہ حرف حرف صحیح ثابت ہوا۔ ٹھیک اُسی وقت اور

اُسی شکل میں جیسے کہ اُنھوں نے بیان کی تھی وہ صورت نمودار ہوئی۔ میں حضورکے والد مرحوم کو پہچانتا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے اتنے مُشابہ نہیں ہیں جتنے کہ وہ صورت بادشاہِ مرحوم کی شکل سے مُشابہ تھی۔

ہیملٹ:۔ یہ واقعہ کہاں پیش آیا؟

مارسیلس:۔ حضور۔ اُس چبوترے پر جہاں ہم پہرا دیتے تھے۔

ہیملٹ:۔ کیا تم نے اُس سے بات نہیں کی؟

ہوریشیو:۔ حضور، میں نے بات کی تھی مگر اُس نے کچھ جواب نہیں دیا۔ لیکن اتنا ضرور دیکھا کہ اُس نے اپنے سر کو پھیر کر اس طرح جنبش کی گویا کچھ کہنے کو ہے مگر اتنے ہی میں خروسِ سحر نے بانگ دی۔ اور بانگ کو سُنتے ہی وہ جلد جلد قدم اُٹھا کر ہماری نظروں سے غائب ہو گئی۔

ہیملٹ:۔ یہ تو عجیب بات سُنائی۔

ہوریشیو:۔ حضور یہ بات اتنی ہی سچ ہے جیسے کہ حضور مجھ کو زندہ دیکھ رہے ہیں۔ حضور کو اِس واقعہ سے اطلاع دینا ہم نے اپنا فرضِ منصب سمجھا۔

ہیملٹ:۔ اس میں کیا شُبہ ہے مگر مجھے اِس واقعہ کے سُننے سے بڑی ہی تکلیف ہوئی ہے۔ کیا آج شب کو بھی تم ہی پہرا دو گے؟

مارسیلس
برنارڈو:۔ } حضور۔ آج بھی ہم ہی پاسبانی کریں گے۔

ہیملٹ:۔ کیا تم نے کہا تھا کہ وہ صورت ہتھیار لگائے تھی؟

ہوریشیو:۔ حضور۔ وہ از فرق تا قدم بالکل مُسلّح تھی۔

مارسیلس
برنارڈو:۔ } حضور۔ وہ سر سے پاؤں تک ہتھیار لگائے تھی۔

ہیملٹ:۔ تم نے اُس کا چہرہ غور سے دیکھا تھا؟

ہوریشیو:۔ سر کے خود کے دونوں حصے نیچے اوپر اُٹھے تھے اور چہرہ صاف نظر آتا تھا۔

ہیملٹ:۔ چہرے پر غُصہ تھا؟

ہوریشیو:۔ بجائے غصّہ کے چہرہ پر رنج زیادہ پیدا تھا۔

ہیملٹ:۔ چہرے کا رنگ زرد تھا یا اُس پہ سُرخی تھی؟

ہوریشیو:۔ نہیں حضور۔ بالکل زرد تھا۔

ہیملٹ:۔ کیا اُس نے نگاہ جما کر تمہاری طرف دیکھا تھا؟

ہوریشیو:۔ برابر ہماری طرف نہایت غور سے دیکھتی رہی۔

ہیملٹ:۔ کاش میں وہاں اُس وقت ہوتا۔

ہوریشیو:۔ حضور کو سخت حیرت ہوتی۔

ہیملٹ:۔ اس میں کیا شک ہے۔ کیا کچھ دیر تک وہ صورت ٹھیری تھی؟

ہوریشیو:۔ اتنی دیر تک جتنی دیر میں کوئی متانت تیزی سے گِنے۔

مارسیلس
برنارڈو:۔ } نہیں اس سے کچھ زیادہ قیام کیا تھا۔

ہوریشیو:۔ اُس وقت نہیں جبکہ میں نے اُسے دیکھا ہے۔

ہیملٹ:۔ کیا ڈاڑھی میں سیاہ اور سفید بال ملے جُلے تھے؟

ہوریشیو:۔ ڈاڑھی بالکل ویسی ہی تھی جیسے کہ بادشاہ کی زندگی میں میں نے دیکھی تھی۔ بال جو سیاہ تھے وہ گہرے سیاہ تھے اور جو سپید تھے وہ چاندی کی مثل چمکتے تھے۔

ہیملٹ:۔ آج میں بھی تمہارے ساتھ پہرے پر رہونگا۔ ممکن ہے کہ وہ صورت پھر ظاہر ہو۔

ہوریشیو:۔ میں سمجھتا ہوں کہ ضرور آئیگی۔

ہیملٹ:۔ اگر اُس نے میرے باپ کی شکل اختیار کی ہے تو میں اُس سے بات کرونگا اس میں چاہے دوزخ مُنہ پھاڑے میرے قدموں کے سامنے آکر مجھے منع ہی کیوں نہ کرے مگر میں اُس سے گفتگو ضرور کرونگا۔ اب تم سب سے میری التجا ہے کہ اگر تم نے ابھی تک اس واقعہ کو کسی سے نہیں کہا ہے تو آیندہ بھی اسکو اپنے ہی تک رکھنا اور بالکل خاموش رہنا۔ اور آج رات کو بھی جو کچھ پیش آئے

اُس کو اپنے دل میں رکھنا اور کسی سے کہنا نہیں۔ میں تم کو تمہاری اِس محبّت و توجّہ کا صلہ دونگا۔ اچھا رُخصت۔ آج شب کو گیارہ اور بارہ کے بیچ میں قلعہ کے چبوترے پر تم سے ملونگا۔

ہوریشیو:۔ حضور کے حکم کی بجا آوری ہمارا فرض ہے۔

ہیملٹ:۔ فرض نہیں۔ بلکہ جو محبّت مجھکو تمہارے ساتھ ہے اُسی محبّت کا میں تم سے متوقّع ہوں۔ خدا حافظ۔ میرے باپ کی روح ہتھیار لگائے نمودار ہوئی ہے۔ اس میں خیریت نہیں معلوم ہوتی۔ مجھے شُبہ ہے کہ خُون کیا گیا ہے۔ اے کاش رات جلد آجاتی۔ جبتک وہ آئے، اے میری روح تو چین سے بیٹھ۔ بُرے کام چاہے ساری دُنیا مل کر آنکھ سے اوجھل کرے مگر وہ ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

تیسرا منظر:۔ پلونیوس وزیر کے مکان کا ایک کمرہ۔ لے ارٹیز اور اوفیلیا اندر آتے ہیں۔

لے ارٹیز:۔ میرا تمام ضروری سامان جہاز پر رکھدیا گیا ہے۔ خُدا کو سونپا۔ پیاری بہن جب کبھی بادِ موافق چلتی ہو اور خط پہونچانے کیلئے جہاز موجود ہو تو سو نہ جانا۔ اپنی خیریت ہمیشہ لکھتی رہنا۔

اوفیلیا:۔ کیا آپکو میرے خط بھیجنے میں شُبہ ہے؟

لے ارٹیز:۔ رہی ہیملٹ کی محبت جو آجکل تمہارے ساتھ وہ ظاہر کر رہا ہے تو اُسکو محض وضع کی پابندی یا جوانی کی ترنگ سمجھو۔ یہ محبّت تو ایسی ہے جیسے ابتدائے بہار میں نرگس کا پھول قبل از وقت کھلے۔ اور اُسے ثبات نہ ہو۔ حسین اور خوشنما ہو مگر قیام نہ ہو۔ ایک لمحہ کیلئے مہکتا رہے اور اس سے زیادہ نہو۔

اوفیلیا:۔ ہاں میں بھی اِس سے زیادہ نہیں سمجھتی۔

لے ارٹیز:۔ اس کی محبّت کا خیال ترک کرو۔ کیونکہ فطرت جب نمو پر ہوتی ہے تو وہ صرف گوشت پوست ہی میں نہیں بڑھتی، بلکہ یہ کالبدِ خاکی جُوں جُوں نشوونما پاتا ہے تو اُس کے اندر طبیعت اور عقل بھی ترقی پکڑتی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ اِس وقت اُسے تم سے عشق ہو اور اُس کے قصد و ارادے میں کوئی بات خارج دخل نہ ہو۔ مگر اُس کی اعلیٰ نسبی کا خیال کرکے تمکو ڈرنا چاہیئے۔ وہ اپنے قصد اور ارادے پر قادر نہیں، اپنے اونچے نام و نسب کا وہ تابع ہے، وہ معمولی طبقے کے آدمی کی طرح نہیں ہے، کہ اپنے لئے جو طریقہ چاہے وضع کرے۔ کیونکہ اسکی پسند اور انتخاب پر تمام سلطنت کی خیر و سلامتی کا حصر ہے۔ اسی وجہ سے اُس کا انتخاب اِس جماعت کی رائے کے ساتھ مشروط ہے جس کا وہ سردار اور حاکم ہے۔ پس اگر وہ تم سے کہے کہ اُسے تم سے عشق ہے تو اِس بات کا یقین اُسی حد تک کرو جس حد تک اُسکو اپنے کسی قصد و ارادے کو عمل میں لانے کی قوّت ہو۔ یہ امر تمام ڈنمارک کی صلاح اور مشورے پر مبنی ہے۔ لیکن اگر تم نے اس کی میٹھی میٹھی باتوں کا یقین کیا اور اپنا دل اسکے پیچھے کھو بیٹھیں تو پھر جس حالت میں کہ خود اسکو اپنے افعال پر قدرت نہیں اور تم نے اپنی پاکدامنی کی دولت بھی اُس پر قربان کردی تو سمجھ لو کہ ایسی صورت میں تم اپنی عزت و ناموس کو کس درجے نقصان پہونچاؤ گی۔ میری پیاری بہن۔ اس سے تم ڈرو اور خوف کرو۔ اور اپنی محبّت کو اتنا پیچھے رکھو کہ ہوائے نفس کی زد اور خطرے سے وہ بچی رہے، وہ محتاط سے محتاط لڑکی بھی بے شرم ہے جو اپنا حُسن ماہ و فلک کو دکھائے کیونکہ نیکی و عفّت بھی دُشنام و بُہتان کے صدموں سے مُستثنےٰ نہیں ہیں۔ کلیوں میں بھی جبکہ وہ کھِل کر ابھی پھُول نہیں ہوئی ہیں کیڑا لگ جاتا ہے۔ جوانی جو گُلِ سحرگاہی کی طرح شبنم میں تر نظر آتی ہے، گرم ہوا کے جھونکے اُسے غارت کر دیتے ہیں۔ مُضر ہوائیں لگنی ضروری ہیں۔ بس ہوشیار رہو۔ اور سب سے بڑی احتیاط یہی ہے کہ ڈرتی رہو۔ جوانی کے ولولے خود طبیعت پر ضبط رکھنے میں مانع آتے ہیں خواہ کوئی

بہکانے پھسلانے والا موجود ہو یا نہ ہو۔

اوفیلیا:۔ آپکی پند و نصیحت کے اثر کو اپنے دل پر پاسبان بنا کر بٹھا دونگی۔ لیکن اچھے بھائی کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ایک ناصح نامہربان کی طرح جو سبکو تو نصیحت و نیک ہدایت کرتا ہے مگر خود نیک نہیں ہوتا۔ مجھے تو عرش پر پہونچنے کا بلند اور خاردار راستہ بتاتے ہو لیکن خود کہیں کسی رند خراباتی کی طرح عیش و عشرت کے پندار میں آکر غلط راہ پر جس میں پھول بکھرے پڑے ہیں بے سوچے بوجھے نہ چلنے لگنا۔

لے ارتیز:۔ بہن تم میرا فکر نہ کرو۔ باتوں میں بہت دیر ہوگئی اور لو باباجان بھی آرہے ہیں۔

(پلونیوس داخل ہوتا ہے)

دوبارہ رُخصت ہونے میں خیر و برکت کی دُعا کا ملنا دوچند خوشی کا باعث ہوتا ہے۔

پلونیوس:۔ ہائیں لے ارتیز۔ تم ابھی تک یہیں ہو۔ جاؤ جلد جہاز پر بیٹھو۔ دیکھو ہوا سے بادبان پھول گئے ہیں۔ مگر تم ابھی تک یہیں ہو۔ اچھا خُدا حافظ۔ میں تمہارے حق میں دعائے خیر کرتا ہوں اور یہ چند نصیحتیں بھی سُنکر اپنی لوحِ دل پر نقش کرلو۔ کبھی اپنے دل کی بات زبان پر نہ لاؤ۔ اور جس ارادے کو اچھی طرح جانچ نہیں لیا ہے اُسپر کبھی عمل نہ کرو۔ لوگوں سے بے تکلف ہوجاؤ مگر دہقانیت کے درجے تک نہیں جن دوستوں کی دوستی کو آزما چکے ہو انکو اپنی روح و رواں کے ساتھ فولاد کے بندوں سے کسے رکھو۔ لیکن ہر کس و ناکس کے ساتھ جن کا تجربہ نہیں ہے کہ وہ کیسے آدمی نکلیں گے مُصافحہ کرتے کرتے ہاتھ شل نہ کرو۔ کسی ٹنٹے جھگڑے میں پڑنے جہاں تک ممکن ہو پرہیز کرو۔ لیکن جب شریک ہولئے تو پھر وہ طریقہ اختیار کرو کہ مخالف تم سے خوف کھائے ہر شخص کی بات سُنو لیکن کم لوگ ایسے ہوں جن سے اپنی بات کہو۔ ہر شخص سے جو کچھ وہ تمہاری نسبت کہنا چاہتا ہے سُنو لیکن جو کچھ اس کی نسبت تمہاری رائے ہے اُسے اپنے ہی تک رکھو۔ لباس حسبِ مقدور قیمتی پہنو۔ صاف سُتھرا اچھا سلا ہو لیکن اسمیں بھڑک نہ ہو۔ لباس سے انسان کی حیثیت معلوم ہوتی ہے۔ فرانس کے شُرفا اور عالی نسب اس معاملہ میں خاص طور پر خوش مذاق اور سلیقہ شعار ہیں۔ نہ کسی کے قرضدار بنو اور نہ قرض خواہ۔ کیونکہ قرضہ میں روپیہ کے ساتھ دوست بھی ہاتھ سے جاتا ہے۔ قرضہ لینے کا شوق کفایت شعاری میں کمی پیدا کرتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنی ذات کے ساتھ دیانت برتو۔ اگر ایسا کیا تو پھر جیسے دن اور رات کا یکے بعد دیگرے پیش آنا لازمی ہے تم بھی دوسرے کے ساتھ بددیانتی نکروگے۔ خُدا حافظ لے ارتیز۔ تمہارے لئے میری دُعا ہے کہ ان نصیحتوں کو تمہارے دل میں زیادہ پُختہ و مُستحکم کرے۔

لے ارتیز:۔ نہایت ادب و تعظیم سے باباجان میں آپ سے رُخصت کی اجازت چاہتا ہوں۔

پلونیوس:۔ اب وقت ہے کہ تم جلد روانہ ہوجاؤ۔ جہاز پر تمہارے نوکر انتظار کر رہے ہیں۔

لے ارتیز:۔ اوفیلیا۔ بہن خُدا حافظ۔ جو باتیں میں نے تم سے کہی ہیں اُن کا خیال رکھنا۔

اوفیلیا:۔ ہاں بھائی آپکی نصیحتیں میرے حافظہ میں محفوظ و مُقفل ہیں۔ اور اس قفل کی کُنجی بہتر ہے کہ آپ اپنے ہی پاس رکھیں۔

لے ارتیز:۔ اچھا خُدا حافظ۔ خُدا کو سونپا۔

(لے ارتیز چلا جاتا ہے)

پلونیوس:۔ اوفیلیا۔ لے ارتیز نے تم سے کیا باتیں کہی ہیں؟

اوفیلیا:۔ جی ہاں۔ شہزادہ ہیملٹ کے بارے میں کچھ کہا ہے۔

پلونیوس:۔ واللہ۔ یہ تو تم نے خوب یاد دلایا۔ مجھ سے کہا گیا

کہ اُس نے تنہائی میں اپنا وقت اکثر تمہاری صحبت میں بسر کیا ہے۔ اور تم نے بھی اکثر مُلاقات کرکے بڑی آزادی اور فیاضی سے کام لیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے اور احتیاط کی غرض سے مجھ سے ایسا ہی بیان کیا گیا ہے تو مجھے بھی کہنا پڑتا ہے کہ تم اپنی حالت اور پاسِ عزّت سے اتنی باخبر نہیں ہو جیسا کہ میری بیٹی کو ہونا چاہیئے۔ تم دونوں میں کیا بات چیت ہوئی ہے؟ سچّا سچّا حال مجھ سے کہو۔

اوفیلیا:۔ اِس زمانے میں شہزادے نے کئی بار اظہارِ محبّت کیا۔

پلونیوس:۔ محبّت کی بھی خوب کہی۔ بیٹی تُو تو کچّی لکڑی ہے۔ تجھے ان خطرناک معاملات کا خاک تجربہ نہیں۔ کیا تجھے اسکی محبّت اور اُلفت کی باتوں کا جیسا کہ تُو کہتی ہے یقین ہے۔

اوفیلیا:۔ باباجان۔ مجھے نہیں معلوم کہ اُن کی باتوں کو میں کیا سمجھوں۔

پلونیوس:۔ سُن میں بتاتا ہوں۔ تُو دودھ پیتی بچّی بن جا۔ اور جان لے کہ اُس کی جھُوٹی محبّت کی باتوں کو تُو نے کھری چاندی سمجھ لیا ہے۔ مگر جانے رکھ کہ وہ چیز کھری اور سچّی نہیں۔ تُو اپنا نرخ بڑھا ورنہ سمجھ لے کہ تو مجھے بیوقوف بنوائیگی۔

اوفیلیا:۔ باباجان۔ شہزادے نے میرے ساتھ اپنا عشق نہایت معزز طریقے سے ظاہر کیا۔

پلونیوس:۔ تُو اُسے معزز طریقہ سمجھتی ہوگی۔ اری اَحمق۔

اوفیلیا:۔ باباجان۔ جو کچھ وہ زبان سے کہتا تھا اُسپر سچّے دل سے آسمان اور خُدا کی قسمیں بھی کھاتا جاتا تھا۔

پلونیوس:۔ یہ قسمیں اور وعدے تو چڑیاں پکڑنے کے پھندے ہوتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ جب انسان کا خُون گرم ہوتا ہے تو اُس کا دل زبان پر بڑے بڑے وعدے اور اقرار دلانے میں نہایت فیاض ہوجاتا ہے۔ بیٹی عشق و محبّت کی اِن باتوں کو تو محض ایک بھڑک ہی سمجھ۔ اس میں چمک ہی چمک ہے۔ گرمی نہیں ہے۔ بلکہ سچ پُوچھو تو چمک اور گرمی دونوں ندارد ہیں۔ اپنی قدر و قیمت کو بیٹی اتنا نہ گھٹا کہ جب وہ بات چیت کی درخواست کرے تو تُو اُسکو حُکم سمجھ کر اسکی بجاآوری سے انکار نہ کرسکے۔ شہزادہ ہیملٹ کو بس اتنا سمجھ لے کہ وہ ایک نوجوان ہے شوق اور قوّت دونوں چیزیں اس میں موجود ہیں۔ اُسے عشق کرنے کیلئے اتنا وسیع میدان حاصل ہے کہ تجھے عشق قبول کرنے کیلئے نہیں ہے۔ اس کے وعدوں پر نہ جا۔ یہ وعدے ایسے دلّال ہیں جو اپنے اصلی رنگ میں نہیں بلکہ ایسی باتوں کے حامی اور وکیل بنتے ہیں جن کا نتیجہ بے عزتی ہے۔ ان وعدوں کو سپید پوش قرم سمجھ جو معقول مگر فریب دہ تقریر کرکے زیادہ دھوکے میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ اور اسی کو میری اِس کُل تقریر کا ماحصل سمجھ۔ اور سُن کہ آج سے میں اِس بات کو ہرگز گوارا نہ کرونگا تُو اپنے فرصت کے اوقات کو شہزادہ ہیملٹ سے بات چیت اور ملاقاتوں میں جو موجب بدنامی ہوتی ہیں صرف کرے۔ بس تجھے حُکم دیتا ہوں کہ اِس کا خیال اور اپنے چال چلن کی اصلاح مدِنظر رکھ۔

اوفیلیا:۔ باباجان۔ میں آپکا حُکم بجالاؤنگی۔

چوتھا منظر:۔ قلعہ کا چبوترہ۔ ہیملٹ ہوریشیو اور مارسیلس داخل ہوتے ہیں۔

ہیملٹ:۔ سرد ہوا تو کاٹے کھاتی ہے۔ سردی بے حد ہے۔

ہوریشیو:۔ حضور۔ ہوا نہایت سرد و تیز ہے اور جسم میں گھُسی جاتی ہے۔

ہیملٹ:۔ کیا وقت ہوگا؟

ہوریشیو:۔ میں سمجھتا ہوں کہ بارہ بجنے میں کچھ ہی کسر ہوگی۔

مارسیلس:۔ نہیں بارہ تو بج چُکے ہیں۔

ہوریشیو:۔ میں نے گھنٹے کی آواز نہیں سُنی۔ وہ وقت قریب آتا جاتا ہے جبکہ روح چلتی پھرتی نظر آئی تھی۔

(اندر باجے بجنے اور توپیں سر ہونے کی آواز آتی ہے)

یہ شور کیسا ہے۔ کچھ حضور کو معلوم ہے؟

ہیملٹ:۔ بادشاہ سلامت رت جگا منا رہے ہیں۔ محفلِ بادہ نوشی گرم ہے۔ جام و ساغر گردش میں ہیں۔ شرابی نشے میں بدمست ہوکر ناچ رہے ہیں اور جب بادشاہ بادۂ ناب نوش کرتا ہے تو نقارے و نفیر کسی کا جامِ صحت پینے کا اعلان کرتے ہیں۔

ہوریشیو:۔ غالباً یہاں کا دستور ہوگا۔

ہیملٹ:۔ واللہ۔ گو میں یہاں کا باشندہ ہوں اور انہی باتوں میں پرورش پائی ہے لیکن میرا خیال تو یہ ہے کہ ان رسموں کی عدم پابندی انکی پابندی سے زیادہ قابلِ عزت سمجھی جاتی ہے۔ یہ مستانہ نوشیاں مشرق سے لیکر مغرب تک دوسری قوموں میں ہمکو بدنام کرتی ہیں۔ وہ ہمکو رند و شراب خوار بلکہ خنزیر تک کہتے ہیں۔ اور اس طرح ہمارے نام کو داغ لگتا ہے۔ پھر ہم خواہ کیسے ہی بلند پایہ کام کریں اُن کی وقعت و خوبی زائل ہوجاتی ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگ کوئی قدرتی نقص رکھتے ہیں۔ یہ نقص یا تو کوئی جسمانی بدنمائی یا کسی ذلیل گھر میں پیدا ہونا ہوتا ہے۔ جو انسان کا قصور نہیں کیونکہ اُسے کسی اونچے گھرانے میں پیدا ہونے پر قدرت نہیں۔ یا یہ نقص اس قسم کا ہوتا ہو کہ مزاج میں کسی خلط میں افراط ہوگئی اور وہ قیود جو عقل و ادراک پر تھیں ٹوٹ گئیں۔ یا یہ نقص کسی عادت کی زیادتی کی وجہ سے پیدا ہوجاتا ہے جو اُس کے تمام حرکات و سکنات کو بدنام کردیتا ہے خواہ اسکی اور خوبیاں رحمتِ خداوندی کا کیسا ہی عمدہ انعام ہوں۔ بہرکیف لوگ بالعموم ایسے آدمیوں کو ناپاک اور بُرا سمجھتے ہیں اور اُس خاص نقص کو اُسکا سب سے بڑا عیب خیال کرتے ہیں۔ تھوڑی سی کھوٹ بھی سارے کھرے پن کو زائل کردیتی ہے اور تحقیر و بدنامی اس کے حق میں نتیجہ کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔

ہوریشیو:۔ حضور ملاحظہ کریں۔ وہ آرہی ہے۔

(روح داخل ہوتی ہے)

ہیملٹ:۔ آسمان کے فرشتو اور اے رحمتِ الٰہی کے مبشرو ہمیں اپنی پناہ میں رکھو۔ اے روح خواہ تو نیک ہو یا بد، تیرا مرجع جنت ہو یا دوزخ۔ خواہ تو اپنے ساتھ نسیمِ بہشت لائی ہو خواہ تیرے ہمراہ دوزخ کے جلانے جھلسانے والے جھونکے ہوں، خواہ تیرا ارادہ اچھا ہو یا بُرا، تو ایک ایسی فہم و ادراک سے بعید شکل میں ظاہر ہوئی ہے کہ میں تجھ سے گفتگو شروع کرونگا۔ میں تجھے ہیملٹ کے نام سے پکارونگا۔ تجھے باپ یا بادشاہ یا شہریارِ ڈنمارک کے لقب سے خطاب کرونگا۔ بہرکیف جو کچھ دریافت کرونگا اُسے بتانا تیرے لئے ضروری ہوگا۔ اور میری اس آرزو میں کہ کسی طرح لاعلمی دور ہو میرے سینے کو شق نہ ہونے دے۔ ہاں بتا کہ تیری ہڈیاں جو قبر میں دفن ہو چکی تھیں اور اُن پر دعائیں پڑھی جا چکی تھیں۔ کیوں اپنے کفن کو توڑ کر باہر نکلی ہیں۔ اور سنگِ مرمر کے وزنی تابوت نے کیوں اپنا دہن کھول کر تجھے باہر کردیا۔ اس کے کیا معنی ہیں کہ ایک مُردہ جسم فولاد کی زرہ سر سے پاؤں تک پہنے ایسی راتوں میں جبکہ ماہتاب بادلوں کی پُشت سے نکل کر دنیا کو روشن کرنے کی کوشش میں ہے کیوں نمودار ہوا ہے۔ اور ہم انسانوں کے دل و دماغ کو جو فطرت کا ایک کھیل ہیں ایسے خیالات سے معمور کرتا ہے جن کا متحمل ہونا ہماری طاقت سے زیادہ ہے۔ بتا کہ یہ کیا ہے اور کیوں ہے۔ ہم تیرے لئے کیا بھلائی کرسکتے ہیں؟

(روح ہیملٹ کی طرف اشارہ کرتی ہی)

ہوریشیو:۔ حضور۔ روح آپکو اشارہ کرکے بلاتی ہی کہ آپ اُسکے

ہمراہ چلیں۔ گویا کوئی بات حضور سے وہ علیحدہ کہنا چاہتی ہو۔
مارسیلس :- ملاحظہ ہو کہ کسقدر محبّت و اخلاق سے علیحدہ جگہ چلنے کا وہ آپکو اشارہ کرتی ہے۔ لیکن حضور ہرگز اس کے ساتھ نہ جائیں۔
ہیملٹ :- میں ضرور جاؤنگا۔ اگر اس نے یہاں بات نہ کی تو جدہر وہ اشارہ کرتی ہے اُدھر جاؤنگا۔
ہوریشیو :- حضور ہرگز نہ جائیں۔
ہیملٹ :- اس میں نقصان کیا ہے۔ میں کیوں ڈروں۔ اپنے جسم کی قیمت تو میں ایک تنکے کے برابر سمجھتا ہوں۔ اے روح تو میری روح کا کیا بگاڑ سکتی ہے؟ کیونکہ تیری طرح میری روح بھی غیر فانی ہے۔ دیکھو وہ میری طرف پھر اشارہ کرتی ہے۔ لو میں اس کے پیچھے چلا۔
ہوریشیو :- حضور نہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ حضور کو سمندر کی طرف لیجائے ۔ا ور اُس پہاڑ کی چوٹی پر پہونچ کر جو سمندر پر جھکی کھڑی ہے کوئی اور مہیب شکل اختیار کرے جو آپکی عقل و حواس کو گم کر دے۔ اور آپ دیوانے ہو جائیں۔ پہلے اِن باتوں کو سوچ لیجئے۔ جگہ اتنی بلند ہے کہ وہاں پہونچکر خواہ مخواہ نیچے گرنے کا خیال دل میں پیدا ہوتا ہے۔ ذرا ملاحظہ کیجئے کہ پہاڑ کی چوٹی سے سمندر کتنا نیچا واقع ہوا ہے۔ اور سمندر کا شور اور غل اوپر تک پہونچتا ہے۔
ہیملٹ :- روح میری طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اے روح آگے بڑھ میں تیرے پیچھے پیچھے آتا ہوں۔
مارسیلس :- حضور ہرگز اسکے پیچھے نہ جائیں۔
ہیملٹ :- اپنے ہاتھ ہٹاؤ۔ مجھے کوئی نہ روکے۔
ہوریشیو :- کہا مانیئے۔ ساتھ نہ جائیے۔
ہیملٹ :- نہیں تقدیر پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔ اور میرے اعصاب شیروں کے اعصاب کی طرح سخت ہو گئے ہیں۔ دیکھو وہ ابھی تک مجھے بلا رہی ہے۔ **ہوریشیو۔ مارسیلس** مجھے چھوڑ دو۔ ورنہ قسم ہے جو مجھے روکے گا اُسے جان سے مار ڈالوں گا۔
ہوریشیو :- خیال اور تصوّر نے اسے دیوانہ بنا دیا ہے۔
مارسیلس :- ہم کو بھی اُس کے ساتھ جانا چاہیئے۔ اس میں اُسکا حکم ماننا دُرست نہیں ہے۔
ہوریشیو :- اچھا چلو۔ خُدا جانے اِسکا انجام کیا ہونیوالا ہے۔
مارسیلس :- اِس ریاست کی کوئی کل ضرور بگڑی ہے۔
ہوریشیو :- خدا اسکو اپنی امان میں رکھے۔
مارسیلس :- آؤ ہم بھی شہزادے کے پیچھے پیچھے چلیں۔

پانچواں منظر :- چبوترے کا دوسرا حصّہ

روح اور ہیملٹ نظر آتے ہیں۔

ہیملٹ :- اے روح تُو مجھے کہاں تک لیجائیگی۔ میں آگے نہ جاؤنگا۔
روح :- مجھے غور سے دیکھ۔
ہیملٹ :- ضرور۔
روح :- میری واپسی کا وقت قریب آ رہا ہے کہ میں آگ اور گندھک کے شعلوں میں پڑکر عذاب اُٹھاؤں۔
ہیملٹ :- اے روح۔ مجھے سخت صدمہ ہے اور تجھپر رحم آتا ہے۔
روح :- رحم مجھ پر نہ کرو۔ بلکہ جو کچھ میں کہوں اُسے غور سے سُنو۔
ہیملٹ :- کہیئے۔ غور سے سُننا میرا فرض ہے۔
روح :- جب تُو میرا حال سُنیگا تو تجھے انتقام لینا ہوگا۔
ہیملٹ :- یہ کیا کہا۔
روح :- ہیملٹ میں تیرے باپ کی روح ہوں۔ مجھے ایک مدّت مُقرّرہ تک راتوں کو آوارہ گرد رہنے اور دن میں آگ میں جلنے کا حکم ہے۔ حتیٰ کہ زندگی میں جن گناہوں کا ارتکاب مجھ سے ہوا ہے وہ سب آگ میں تپ کر پاک نہ ہو جائیں۔ جس زندان میں

اس وقت میں ہوں وہاں کے راز افشا کرنے کی مجھے سخت ممانعت ہے۔ وہاں جو کچھ گزرتی ہے اگر اس کا ایک شمہ بھی میں تجھ سے کہوں تو تیری روح کو وہ ذہنی پہونچے کہ خوف سے تیرا خون جم جائے۔ اور تیری آنکھیں اپنے حلقوں سے اس طرح نکل پڑیں جیسے آسمان پر دو ستارے ٹوٹتے نظر آتے ہیں۔ اور تیرے یہ صاف ستھرے اور گندھے کاکل کھل کر ان کا ایک ایک بال اس طرح کھڑا ہو جائے جیسے خار پشت کو غصہ دلانے سے اس کے کانٹے اس کی پیٹھ پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن عالم ارواح کی باتیں فانی انسان کو سنانا جائز نہیں۔ سن سن سن اگر تجھے اپنے باپ سے محبت تھی۔

ہیملٹ:- ارے خدایا!

روح:- سن کہ میرا خون ہوا ہے۔ جو فہم اور فطرت کے خلاف ایک فعل تھا۔ اب تجھے میرے خون کا انتقام لینا ہے۔

ہیملٹ:- خون!

روح:- ہاں خون۔ کسی کو جان سے مارنا فی نفسہ برا فعل ہے لیکن میرا خون کرنا اس سے بھی بدتر اور فطرت انسانی کے خلاف تھا۔

ہیملٹ:- اے روح جلد بتا کہ یہ کیا ماجرا ہے تاکہ میں ایسے پر لگا کر جو تخیل اور تعشق کے خیالات سے بھی تیز رو ہوں انتقام لینے کو اڑ جاؤں۔

روح:- میں تجھ میں عزم و ارادہ پاتا ہوں۔ لیکن اگر تو نے اس امر میں کوشش نہ کی تو پھر تیری مثال اس موٹی اور گیلی گھاس کی سی ہوگی جو دوزخ کے دریائے لیتھی کے کنارے آسانی سے اگ آتی ہے اور جس دریا کا پانی پینے سے انسان سب کچھ فراموش کر دیتا ہے۔ کیا انتقام کی تحریک تجھ میں پیدا نہ ہوگی۔ مشہور یہ کیا گیا کہ میں اپنے باغ میں سوتا تھا ایک سانپ نے مجھے کاٹا۔ اس کے زہر سے میں مر گیا۔ غرض ایک جھوٹی خبر مشہور کر کے ڈنمارک کے کانوں کو صدمہ پہونچایا گیا۔ مگر اے شریف و نجیب نوجوان سن رکھ کہ جس سانپ نے تیرے باپ کو کاٹا تھا آج اس کے سر پر ڈنمارک کا تاج ہے۔

ہیملٹ:- ہائے میرا دل تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ ہو نہ ہو یہ کام میرے چچا کا ہے۔

روح:- لاریب! یہ حرکت اسی محرمات سے ہم بستر ہونیوالے زانی اور خبیث کی ہے، دغا فریب اور ایسی توجہات سے جو بیوی کو شوہر سے بیوفا بنا کر اغوا کریں۔ اس نے میری ظاہرا نیک بخت ملکہ پر قابو حاصل کر لیا اور اسے اپنی ہوا و ہوس کا شکار بنا لیا۔ ہیملٹ اس سے زیادہ پستی میں بلندی سے گرنے کی مثال نہ ملے گی۔ میرا عشق ملکہ کے ساتھ ہمیشہ وہی رہا جس کا اقرار شادی کے وقت میں نے کیا تھا۔ مگر افسوس۔ مجھ سے ٹوٹ کر وہ ایک خبیث کی طرف راغب ہوئی۔ جس کے قدرتی اوصاف مجھ سے کم درجے کے تھے لیکن جس طرح ایک نیک بخت انسان کو کوئی فرشتہ کی صورت میں آکر بہکائے۔ مگر وہ بدراہ نہ ہوگا اسی طرح ایک شہوت پرست گو اس کا عقد کیسی پاکیزہ و فرشتہ خصلت عورت ہی سے کیوں نہ ہو اور نیکی کے بستر پر خواہ کیسی ہی لذتیں اسے حاصل ہوں مگر پھر بھی وہ اپنی ہوائے نفس کو ناپاک اور پلید چیزوں سے سیر کریگا۔ لیکن خاموش۔ باد سحر مجھے محسوس ہونے لگی ہے۔ اس لئے مختصر کہتا ہوں جبکہ میں اپنے باغ میں حسب عادت تیسرے پہر سو رہا تھا تو اسی حالت میں تیرا چچا چپکے چپکے میرے قریب آیا۔ ہاتھ میں اس کے ایک شیشی تھی جس میں ہن بین کا زہر بھرا تھا۔ اور اس محرک جذام زہر کے قطرے اس نے میرے کانوں میں ٹپکا دیئے۔ اس زہر کو انسان کے خون کے ساتھ بڑی دشمنی ہے۔ پارے کی طرح تیزی سے وہ تمام رگوں اور شریانوں میں دوڑ جاتا ہے اور جس طرح دودھ میں ترشی کے قطرے ڈالنے سے دودھ جم کر دہی ہو جاتا ہے

اِسی طرح زہر کے پھیلتے ہی رقیق اور تندرست خون جسم میں منجمد ہوکر رہ جاتا ہے۔ اور یہی حال میرا ہوا۔ اور جیسا کہ کوڑھ کے مرض میں ہوتا ہے میرا سارا جسم ایک کھنڈر بن گیا۔ اور نہایت مکروہ پپڑیاں تمام بدن پر جم گئیں۔ غرض اس طرح جبکہ میں سو رہا تھا ایک بھائی کے ہاتھ سے اپنے تاج وتخت اور ملکہ سے یک لخت محروم ہوگیا۔ ایسے وقت میں کہ میرے گناہوں کا درخت خوب پھول رہا تھا۔ توبہ او راستغفار سے اپنے گناہوں کی صفائی کا موقع بھی نہ ملا تھا اور نہ کلیسا کی آخری برکت جو مرتے وقت دی جاتی ہے مجھے ملی تھی اور ایسی حالت میں کہ میں مرنے کیلئے مطلق تیار نہ تھا۔ نہ کسی پادری نے مجھے مسح کیا تھا اور نہ اُس کے سامنے اپنے گناہوں کا اقرار کر سکا تھا۔ غرض کہ تمام گناہوں کا بوجھ سر پر لئے خدا کی حضوری میں جوابدہی کیلئے روانہ کر دیا گیا۔ ہائے، یہ کیسا غضب تھا۔ کیسا قہر تھا۔ اگر تو دل رکھتا ہے تو اس ظلم کو برداشت نہ کر اور بادشاہ ڈنمارک کے بستر کو عیش ونشاط اور ایک محرم سے ملوث ہونے کی ناپاک سیج نہ رہنے دے۔ لیکن اس کام کو جس طرح تو چاہتا ہے انجام دے، مگر اس کا خیال ہمیشہ رکھ کہ تیری ماں کے خلاف کوئی بات دل میں نہ آنے پائے اور کوئی امر جو اُس کا موجب آزار ہو عمل میں نہ آئے۔ اُسے اُس کے خُدا اور اس کے اعمال پر چھوڑ دے جو اُس کے ضمیر کو نیش ونشتر بن کر چھید رہے ہیں۔ اچھا اب خُدا کو سونپا۔ جگنو کی ہلکی چمک زرد پڑ چلی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صبح ہونے کو ہے۔ ہیملٹ خُدا حافظ۔ خُدا کے سپرد کیا۔ مجھے یاد رکھیو۔

ہیملٹ:۔ اے عرش کے فرشتو اور اے زمین کے لوگو تم سے فریاد ہے اور کہو تو میں اس فریاد میں اہل جہنّم سے بھی خطاب کر دوں۔ شرم شرم۔ اے دل مجھ پر سے اپنا قبضہ نہ ہٹا۔ اور اے میرے اعصاب اس صدمے سے تم کمزور نہ پڑو۔ بلکہ مجھے سنبھالے رکھو۔ تجھے یاد رکھوں؟ جب تک اِس سر اور دماغ میں قوتِ حافظہ تخت نشین ہے تجھے یاد رکھونگا۔ یاد رکھنا کیسا میں تو حافظہ کی لوح پر جس قدر نقوش کتابوں کی پڑھی ہوئی موعظتِ حسنہ کے اور مُشاہدے اور جوانی نے عشق ومحبت کے جتنے نقش ونگار اس پر بنائے ہیں ان سب کو مٹا کر صرف تیرا حکم اُس پر قائم رکھونگا۔ اور کوئی چیز اُس پر اضافہ نہ ہوگی۔ خالص تیرا حکم رہیگا۔ کوئی اور چیز اس میں آمیز نہ ہوگی۔ عرش کی قسم۔ ارے ڈھونڈی عورت اور تو خبیث ہنستے ہوئے شیطان ملعون! میری یادداشت کی کتاب کہاں ہے بہتر ہے کہ لکھ لوں۔ (لکھتا ہے) کہ شیطان ہنستا بھی رہے اور اپنی شیطنت سے باز نہ آئے۔ کم سے کم ڈنمارک میں تو یہی حال رہیگا۔ اچھا چچا جان میں نے آپکا نام اپنی یادداشت میں درج کر لیا ہے۔ اچھا۔ آخری الفاظ روح نے کیا کہے تھے؟ "خُدا حافظ۔ خُدا کو سونپا۔ یاد رکھیو" میں نے تو ان پر قسم کھائی ہے۔

ہوریشیو
مارسیلس } :۔ (اندر سے پکارتے ہیں) شہزادے شہزادے۔

مارسیلس:۔ (اندر سے) عالیجاہ ہیملٹ۔

ہوریشیو:۔ خُدا ہر بلا سے اُسے محفوظ رکھے۔

ہیملٹ:۔ خُدا ایسا ہی کرے۔

ہوریشیو:۔ (اندر سے آواز لگاتا ہے) ہلو ہو ہو۔ شہزادے

ہیملٹ:۔ ہلو ہو ہو۔ آ بیٹا۔ آ میرے شکرے آ۔

(ہوریشیو اور مارسیلس اندر آتے ہیں)

مارسیلس:۔ فرمایئے شہزادہ والا تبار کیسی گزری؟

ہوریشیو:۔ حضور کیا خبر ہے؟

ہیملٹ:۔ حیرت خیز۔ تعجب انگیز۔

ہوریشیو:۔ اچھے آقا کچھ بتایئے تو۔

ہیملٹ:۔ نہیں تم کہدوگے۔

ہوریشیو۔ خُدا کی قسم میں کسی سے نہ کہونگا۔

مارسیلس:۔ اور نہ میں کسی پر ظاہر کرونگا۔

ہیملٹ:۔ تم اسے کیا کہوگے۔ کیا کبھی انسان کے دل میں ایسا خیال گزر سکتا تھا۔ لیکن تم کسی سے کہنا نہیں۔

ہوریشیو / **مارسیلس**:۔ ہرگز نہیں۔ جیسی جی چاہے قسم لے لیجئے۔

ہیملٹ:۔ ڈنمارک میں کوئی بدمعاش ایسا نہیں جو پکا شیطان نہ ہو۔

ہوریشیو:۔ محض اس بات کو کہنے کیلئے تو ایک روح کو قبر سے نکلنے کی ضرورت نہ تھی۔

ہیملٹ:۔ ہاں دُرست۔ بہت ٹھیک کہتے ہو۔ اور اب زیادہ کچھ کہے سُنے بغیر ہاتھ ملاؤ اور جسکو جو کام ہو اس کے لئے جائے رُخصت ہو۔ ہر شخص کو کوئی نہ کوئی کام تو ہوتا ہے۔ اور میں بھی جہاں تک مجھ غریب کو کوئی کام ہے اُس کے لئے رُخصت ہوتا ہوں دیکھو میں تو جاتے ہی خُدا سے دُعا مانگونگا۔

ہوریشیو:۔ آقا۔ یہ باتیں حضور کی تو اناپ شناپ کچھ بے جوڑ سی ہیں۔

ہیملٹ:۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہارے دل کو رنجیدہ کیا۔ تم ضرور رنجیدہ خاطر ہوئے۔

ہوریشیو:۔ لیکن آقا ہم نے کچھ بُرا نہیں مانا۔

ہیملٹ:۔ ہاں سینٹ پاٹرک کی قسم ہوریشیو اس میں بہت کچھ رنج پہونچنے کی بات ہے۔ رہی وہ صورت جو ہمکو نظر آئی تھی، وہ روح تو بڑی مسکین اور سچی دیانت دار روح ہے، جو کچھ اس میں اور مجھ میں پیش آیا تم اسکو جاننا چاہتے ہو۔ تو اس خواہش کو جہانتک ممکن ہو دبائے رکھو۔ اور اب میرے سچے دوستو۔ تم دوست ہو۔ پڑھے لکھے آدمی ہو اور سپاہی بھی ہو۔ میری ایک درخواست منظور کرلو۔

ہوریشیو:۔ حضور فرمائیں وہ کیا ہے ہم اُسے تسلیم کرینگے۔

ہیملٹ:۔ جو کچھ آج رات کو تم نے دیکھا ہے وہ کسی سے نہ کہوگے۔

ہوریشیو:۔ حضور ہم کسی پر ظاہر نہ کرینگے۔

ہیملٹ:۔ نہیں نہیں قسم کھاؤ۔

ہوریشیو:۔ میں اپنے ایمان کی قسم کھاتا ہوں کہ کسی سے نہ کہونگا۔

مارسیلس:۔ اور حضور میں بھی ایمان سے کہتا ہوں کہ کسی پر کوئی بات ظاہر نہ کرونگا۔

ہیملٹ:۔ اچھا میری تلوار پر قسم کھاؤ۔

مارسیلس:۔ قسم تو ہم کھا ہی چکے ہیں۔

ہیملٹ:۔ نہیں میری تلوار پر قسم کھاؤ۔

روح:۔ (زمین کے نیچے سے کہتی ہے) قسم کھاؤ۔

ہیملٹ:۔ آہا۔ تم بھی یہی کہنے لگیں۔ کیا زمین کے نیچے نیچے یہاں تک پہونچ گئیں؟ ہوریشیو، مارسیلس، تم نے زمین کے اندر سے جو آواز آئی ہے وہ سُنی؟ اِدھر آؤ۔

ہوریشیو:۔ حضور قسم جن الفاظ میں لی جاتے وہ بتایئے۔

ہیملٹ:۔ بس الفاظ یہی ہیں کہ جو کچھ تم نے دیکھا ہے وہ کسی سے نہ کہوگے۔

روح:۔ (زمین کے اندر سے آواز آتی ہے) قسم کھاؤ۔

ہیملٹ:۔ اے روح تجھے کہیں قرار بھی ہے۔ کبھی یہاں ہے کبھی وہاں ہے۔ اچھا۔ لے ہم یہاں سے ہٹ کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ہوریشیو، مارسیلس۔ اِدھر آجاؤ۔ اور میری تلوار پر اپنا ہاتھ رکھو کہ جو کچھ دیکھا ہے اسکا ذکر کبھی نہ کروگے۔

روح:۔ (زمین کے اندر سے کہتی ہے) قسم کھاؤ۔

ہیملٹ:۔ خوب کہا۔ اے زمین کے اندر ہی اندر کھود کر چلنے والی کیا تو زمین کے اندر اندر ہی اتنی دُور پہونچ سکتی ہے؟ آؤ دوستو یہاں سے بھی ہٹ کر کھڑے ہوجائیں۔

ہوریشیو:۔ اے رات اور دن تم گواہ رہنا کہ یہ کیسی عجیب باتیں

پیش آ رہی ہیں۔

ہیملٹ:۔ اوران باتوں کو عجیب اجنبی ہی سمجھکر اُن کا خیر مقدم کرو۔ ہوریشیو زمین اور آسمان میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کا وہم وگمان تک ہمارے فلسفے میں نہیں گزرا ہے۔ آؤ آؤ۔ اگر رحمتِ باری میں یقین رکھتے ہو جیسے کہ پہلے رکھتے تھے تو اگر آیندہ میں کسی عجیب وغریب شکل یا وضع میں، جس کا اختیار کرنا میں ضروری سمجھوں، ظاہر ہوں تو تم یہ نہ کرنا کہ بغلوں میں ہاتھ دیکر کھڑے ہو جاؤ۔ سر اِس طرح ہلاؤ (ہیملٹ سر ہلاتا ہی) یا کوئی مشتبہ سی بات زبان پر لاؤ اور کہو ہاں ہمیں سب حال معلوم ہے اور اگر ہم چاہیں تو بتا بھی سکتے ہیں، غرض ایسے مشتبہ جملوں میں جن سے معلوم ہو کہ تم میرے حال سے واقف ہو گفتگو نہ کرنا۔ بس خُدا کی رحمت و برکت تمہاری شامل حال رہے اور خُدا تمہاری مدد کرے۔ قسم کھاؤ۔

روح:۔ (اندر سے بولتی ہے) قسم کھاؤ!

ہیملٹ:۔ اے رُوح۔ ذرا توچین سے بیٹھ۔ (ہوریشیو اور مارسیلس قسم کھاتے ہیں) میرے شریف دوستو۔ اُس تعلق ومحبت کی وجہ سے جو میں تمہارے ساتھ رکھتا ہوں میں اپنے تئیں تمہارے سپُرد کرتا ہوں۔ یہ عاجز ہیملٹ جو کچھ تمہاری محبت میں تمہارے لئے کر سکتا ہے کبھی اُس سے دریغ نہ کریگا۔ آؤ ساتھ چلیں اور میری یہی التجا ہے کہ تم دونوں بالکل خاموش رہنا۔ زمانے کی کل بگڑی ہوئی ہے۔ افسوس اِس کا نہیں ہو کہ اس بگڑی کل کو سنوارا جائے بلکہ غم اس کا ہے کہ میں اس کے سنوارنے کے لئے دُنیا میں کیوں پیدا ہوا۔ آؤ ہم سب ساتھ چلیں۔

(سب چلے جاتے ہیں)

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

جُزوِ ثانی

پہلا منظر:۔ پلونیوس کے مکان کا ایک کمرہ

پلونیوس اور رینالدو داخل ہوتے ہیں۔

پلونیوس:۔ رینالدو۔ یہ روپیہ اور خطوط اُسے دیدینا۔

رینالدو:۔ بہت اچھا حضور۔

پلونیوس:۔ لیکن رینالدو۔ مُلاقات سے پہلے پوری سمجھ بُوجھ اور ہوشیاری سے اس کے حالات دریافت کر لینا۔

رینالدو:۔ حضور میرا خود بھی یہی ارادہ تھا۔

پلونیوس:۔ واللہ! خوب کہا۔ بہت خوب کہا۔ پہلے تو یہ تحقیق کرنا کہ ڈنمارک کے کون کون لوگ پیرس میں رہتے ہیں اور کیوں رہتے ہیں۔ ان کی وجہ معاش کیا ہے اور وہ کہاں کہاں رہتے ہیں۔ اُنکے دوست اور مُصاحب کون ہیں۔ اُنکے اخراجات کیونکر چلتے ہیں۔ غرض جب اس طرح ہیر پھیر کے سوالوں کے بعد مطلب پر پہونچو تو پوچھنا کہ کیا وہ میرے لڑکے کو جانتے ہیں جب یہ سب کچھ پُوچھنے کے بعد تم اُس بات تک پہونچو جو دراصل دریافت کرنے کی ہے تو کہنا۔ ہاں میری بھی کچھ دُور کی صاحب سلامت ہے۔ اس کے باپ اور دوستوں سے بھی کسیقدر واقف ہوں اور کچھ اُسے خود کو بھی جانتا ہوں۔ مگر اتنا ضرور کہدینا کہ اچھی طرح نہیں جانتا، پھر کہنا کہ اگر یہ وہی شخص ہے جسے میں سمجھ رہا ہوں تو اُس کے مزاج میں تو وحشت بہت ہی۔ بعض عادتیں بھی اُس کی خراب ہیں، اس کے بعد جو تہمتیں تم اس کے ذمہ رکھنی چاہو رکھنا۔ لیکن کوئی تہمت ایسی نہ لگانا جس میں اُس کی عزت پر حرف آئے۔ بلکہ اِس قسم کی بُرائیاں جیسے شراب کی عادت، مزاج میں تُندی

دتبنری یا ایسے عیوب بیان کرنا جو بالعموم اُن نوجوانوں میں پائے جاتے ہیں جو گھر سے دُور آزاد رہتے ہیں۔

رینالدو:- مثلاً قمار بازی کا عیب۔

پلونیوس:- ہاں ہاں۔ یا شراب خواری یا شمشیر بازی یا بد کلامی۔ یا بات بات پر لڑ بیٹھنے کی عادت۔ اتنا تم کہہ سکو گے۔ مگر اس سے آگے نہ بڑھنا۔

رینالدو:- حضور، ان میں تو اسکی عزت پر بٹا لگے گا۔

پلونیوس:- واللہ۔ ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن جب ان بُرائیوں کا ذکر کرو تو ذرا انہیں ہمو موکر ہلکا کرتے جانا۔ مگر اس قسم کی کوئی تہمت نہ رکھنا کہ وہ حرامکاری کرتا ہے۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے میرا مطلب صرف اتنا ہے کہ اُسکی بُرائیوں کو اس ترکیب اور ہوشیاری سے بیان کرنا کہ وہ ایسے عیب معلوم ہوں جو آزادی حاصل کرنے سے قدرتی طور پر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اور اکثر نوجوان اُن میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ غرض بُرائیاں اس قسم کی ہوں جو اکثر نوجوانوں میں دیکھی جاتی ہیں۔

رینالدو:- بہتر ہو کہ حضور خود ہی فرما دیں کہ وہ کس قسم کی بُرائیاں ہوں۔

پلونیوس:- واللہ، رینالدو۔ میرا مطلب صرف اتنا ہی تھا اور یہی ایک تدبیر ہے جس سے ہم اپنے مطلب کو پہونچ سکتے ہیں۔ بس تم خفیف الزام میرے نورِ چشم پر ایسے لگانا جیسے کوئی نئی چیز کو معمولی استعمال سے بگڑتا دیکھکر کچھ کہے۔ اچھا اب ذرا غور سے جو کچھ کہوں اُسے سُنو۔ جس آدمی سے تم اِن باتوں کو دریافت کروگے تو اُس سے پوچھنا کہ کیا کبھی تم نے اُسکو ان بُرائیوں میں دیکھا ہے تو وہ ضرور تم سے اتفاق کریگا۔ اور کہے گا "ہاں صاحب"، یا "ہاں دوست"، یا "ہاں مہربان"، غرض جیسا کچھ بھی بات چیت کا طریقہ مختلف ملکوں اور مختلف قوموں میں ہوگا اسمیں وہ تم سے بات کریگا۔

رینالدو:- بہت بہتر حضور۔

پلونیوس:- اچھا اب سُنو۔ اگر وہ کہے "ہاں دیکھا ہے......"، ہاں تو میں کیا کہنے کو تھا؟ واللہ میں کوئی بات کہنے کو تھا۔ کچھ یاد ہے؟ بات کہاں چھوڑی تھی؟

رینالدو:- حضور فرماتے تھے کہ وہ تم سے اتفاق کریگا اور کہیگا "ہاں صاحب"، "ہاں مشفق"، "ہاں مہربان"۔

پلونیوس:- ٹھیک ہے۔ بس بس۔ یاد آگیا۔ درست ہے، وہ تم سے کہیگا کہ "ہاں میں اُس شخص کو جانتا ہوں۔ کل ہی کی تو بات ہے یا تھوڑے ہی دن کا تو ذکر ہے اُسے دیکھا تھا" اور یہ کہ وہ ایسے ایسے آدمی کے ساتھ تھا۔ اچھا۔ جب تم یہ کہوگے کہ وہ قمار باز ہے یا شراب کے نشے میں چُور رہتا ہے یا ٹینس کھیلتے کھیلتے لڑ پڑتا ہے تو تم سمجھے بھی کہ اس طرح تھوڑا سا جھوٹ بول کر تم سچّی بات پر پہونچ جاؤگے۔ چنانچہ ہم دانا اور دُور اندیش طبیعتوں کا خاصہ یہی ہے کہ جب کسی حقیقت کو پہنچنا چاہتے ہیں تو اسی طرح کی ایچ پیچ ترکیبوں سے چکّر اور چرخیاں لگا کر اصل بات دریافت کر لیتے ہیں۔ غرض جو ترکیبیں میں نے تمہیں بتائی ہیں اُن سے تم میرے نور العین کا کچّا چٹھا معلوم کر لوگے۔ میرا مطلب تو تم خوب سمجھ گئے ہوگے۔

رینالدو:- حضور خوب سمجھ گیا۔

پلونیوس:- پھر یہ کہ سُنی سُنائی باتوں پر نہ جانا۔ خود بھی غور سے دیکھکر اُسکا حال معلوم کرتے رہنا۔ مگر جس شغل میں وہ آج کل ہو اُسی میں رہنے دینا۔

(اوفلیا داخل ہوتی ہے)

کہو بیٹی کیسی ہو؟

اوفلیا:- میرا تو ڈر کے مارے بُرا حال ہے۔

پلونیوس:- خُدا کیلئے کہو تو کیا بات ہے؟

اوفلیا:- بابا جان سُنیئے۔ میں اپنے اندر والے کمرے میں بیٹھی

سی رہی تھی کہ یکایک شہزادہ ہیملٹ کچھ عجیب حال میں اندر گھس آئے۔ بٹنے کے بند کھلے تھے۔ سر پر ٹوپی نہ تھی میلی کچیلی جرابیں۔ جراب بندوں کے کھل جانے سے ٹخنوں پر اس طرح پڑی تھیں جیسے قیدی کے پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوں۔ چہرے کا رنگ قمیص کے رنگ کی طرح سپید ہو رہا تھا۔ گھٹنے تھرتھر کانپتے تھے۔ نگاہیں اس درجہ محزون و واجب الرحم تھیں کہ گویا ابھی دوزخ سے نکل کر اس غرض سے آئے ہیں کہ وہاں کے درد و عذاب بیان کریں۔ غرض باوا جان اس حال میں شہزادے صاحب میرے سامنے آئے۔

پلونیوس:- بیٹی۔ ضرور تیرے عشق میں وہ دیوانہ ہو گیا ہو۔

اوفلیا:- باوا جان۔ اس کی خبر تو مجھے نہیں۔ مگر میں ڈر بہت گئی ہوں۔

پلونیوس:- اُس نے کچھ بات بھی کی تھی؟

اوفلیا:- اپنے ایک ہاتھ سے میری کلائی مضبوط پکڑ لی۔ اور اتنا پیچھے ہٹے کہ ہاتھ خوب تن جائے۔ اور دوسرے ہاتھ سے آنکھوں پر سایہ کرکے اتنے غور سے میرے چہرے کو دیکھنے لگے کہ گویا کوئی مصور تصویر کھینچنے والا ہے۔ بڑی دیر تک یہی کیفیت رہی۔ آخر کار میرے ہاتھ کو ہلکا سا جھٹکا دیکر اپنے سر کو اس طرح تین بار اوپر نیچے کیا۔ اور پھر ایک آہ سرد جو کلیجہ کے پار ہوئی جاتی تھی ایسی بھری کہ معلوم ہوتا تھا کہ سارا جسم پاش پاش ہو کر جان نکل جائیگی۔ جب یہ ہو لیا تو انہوں نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور گردن میری طرف پھیر کر مجھے دیکھتے ہوئے بغیر اس کے کہ نظر دروازے کی طرف کریں کمرے سے باہر نکلنا شروع کیا۔ غرض اس طرح بغیر دروازے کی طرف نظر کئے وہ دروازے سے باہر ہو گئے۔ مگر نگاہ میری طرف برابر جمائے رکھی۔

پلونیوس:- بیٹی۔ آ۔ میرے ساتھ چل۔ میں بادشاہ سلامت کے پاس جاتا ہوں۔ یہ تو غلبۂ عشق کا شدید جنون ہے جس کا اثر مہلک ہوا کرتا ہے عشق کا جذبہ تو انسان سے وہ وہ سخت کام لیتا ہے کہ فطرت انسانی کا کوئی دوسرا جذبہ ایسا نہیں کر سکتا۔ یہ حال سنکر سخت افسوس ہوا۔ بیٹی۔ حال میں تو نے کوئی سخت بات تو اُسے نہیں کہی تھی؟

اوفلیا:- نہیں باباجان۔ اتنا ضرور ہوا کہ جیسا آپ نے حکم دیا تھا جتنے خط انھوں نے بھیجے تھے وہ میں نے واپس کردئے اور جب وہ ملنے آئے تو میں ملی نہیں۔

پلونیوس:- یہ کہو نا تو پھر اس بات نے اُس کا دل اُلٹ دیا۔ مجھے افسوس ہے کہ پچھلی دفعہ جو باتیں میں نے تجھ سے اسکی نسبت کہی تھیں اُن پر پورا غور نہیں کیا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ محض تفنن طبع کے طور پر وہ تیرا عاشق بنا ہے اور غرض اس کی تیری بربادی ہے۔ لیکن لعنت ہو میرے اس خیال پر واللہ! میری عمر کے بڈھے ضعیف تو کسی کی نسبت رائے قائم کرنے میں بدگمان و بدظن بنکر غلطی کرتے ہیں اور جوان آدمی یہی غلطی عقل و فراست سے بغیر کام لئے کرتے ہیں۔ بادشاہ سلامت سے یہ کل حال عرض کردینا ضروریات سے ہے۔ کیونکہ اگر ان باتوں کو پوشیدہ رکھا تو عشق کا مخفی رکھنا جتنا موجب رنج و الم ہوسکتا ہے اتنا اُس کا آشکارا کرنا بادشاہ یا ملکہ کا موجب پریشانی اور ناگواری نہیں ہوسکتا۔

(پلونیوس اور اوفلیا اسٹیج پر سے چلے جاتے ہیں)

دوسرا منظر:- قصر شاہی کا ایک کمرہ

بادشاہ اور ملکہ۔ روزنکرانسز اور گلڈنسٹرن داخل ہوتے ہیں۔

بادشاہ:- محبانِ من روزنکرانسز اور گلڈنسٹرن ہم تمہیں خیر مقدم کہتے ہیں۔ علاوہ اشتیاقِ ملاقات کے جو ضرورت تمہیں طلب کرنے کی اس وقت داعی ہوئی اُس نے مجبور کیا

ہم تمکو جلد یہاں بلائیں۔ تم نے شہزادہ ہیملٹ کے تغیرِ حال اور تبدیلِ مزاج کے متعلق سُنا ہوگا۔ سوائے اس کے کہ مزاج میں تبدیلی واقع ہوئی اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ باطن اور ظاہر دونوں کچھ ایسے بدلے ہیں کہ سابق سے وہ بالکل مختلف نظر آتے ہیں۔ بجز اس کے کہ اس حالت کا سبب اُن کے والد کے انتقال کو قرار دیا جائے۔ اور کوئی سبب ہماری سمجھ اور وہم وگمان سے خارج ہے۔ چونکہ تم دونوں نے بچپن سے شہزادے کے ساتھ پرورش پائی ہے اور اس کے مزاج اور طبیعت سے خوب واقف ہو۔ اسلئے ہماری درخواست ہے کہ تم دونوں کچھ دنوں ہمارے دربار میں رہو تاکہ تمہارے قرب اور اثرِ صحبت سے شہزادہ کچھ چونچال ہو اور ایسے مشاغل کی طرف رجوع ہو جو موجبِ مسرت وانبساط ہوتے ہیں۔ اور جب کبھی موقع پاؤ تو معلوم کرو کہ کیا کوئی بات جو ہمارے علم میں نہیں ہے ایسی ہے جو اس کی افسردگیٔ خاطر کا اس درجہ باعث ہوئی ہے تاکہ ہم اس شکایت کو رفع کرنے کی کوشش کریں۔

ملکہ :- اے نیک بخت اور سعادتمند نوجوانو۔ وہ اکثر تمہارا ذکر کیا کرتا تھا۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم دونوں کے برابر کوئی دو شخص ایسے نہیں ہیں جن سے اُس کا دلی تعلق اس درجہ ہو۔ اگر ہماری اُمیدوں کی سرسبزی کیلئے تم دونوں اتنا احسان وکرم کرو کہ چند روز یہاں قیام کرو تو تمہارا یہاں تکلیف کرنا ایسا ہی باعثِ منت گذاری ہوگا جیسا کہ ایک بادشاہ اور ملکہ کے لئے ہو سکتا ہے۔

روزنکرانٹز :- بادشاہ اور ملکہ سلامت۔ حضور ہمارے آقا اور داد گستر ہیں۔ حضور بندگانِ عالی بطور حکم کے نہ کہ بطور درخواست کے جو کچھ ارشاد کرنا ہو ارشاد کریں۔ اور تعمیلِ احکام ہمارا فرضِ عین ہوگا۔

گلڈنسٹرن :- ہم دونوں حضور کے تابعدار اور حضور کے حکم وارشاد کی تعمیل میں پوری کوشش اور توجہ سے ہم اپنی ادنیٰ خدمات پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

بادشاہ :- شریف ونجیب روزنکرانٹز اور گلڈنسٹرن۔ ہم تمہارے شکرگذار ہوئے۔

ملکہ :- شریف روزنکرانٹز اور گلڈنسٹرن میں بھی تمہاری ممنونِ احسان ہوں۔ اور چاہتی ہوں کہ تم دونوں میرے فرزند سے جو اسقدر تبدیل ہو گیا ہے جلد ملاقات کرو۔ (ملکہ دربار کے خادموں سے کہتی ہے) تم میں سے کوئی ان دونوں کو وہاں پہنچائے جہاں شہزادہ ہیملٹ اس وقت ہو۔

گلڈنسٹرن :- خدا سے دُعا ہے کہ ہماری حاضری اور ہماری خدمات شہزادے کے حق میں موجب خیر ومسرت ثابت ہوں۔

ملکہ :- آمین!

(روزنکرانٹز اور گلڈنسٹرن اور چند خادم کمرے سے باہر جاتے ہیں۔ پلونیوس کمرے میں آتا ہے)

پلونیوس :- جہاں پناہ۔ شاہِ ناروے کے پاس جو سفارت روانہ ہوئی تھی وہ بخیر وسلامتی جواب باصواب لے کر واپس آگئی ہے۔

بادشاہ :- پلونیوس۔ واہ واہ۔ تم ہمیشہ اچھی خبر لاتے ہو۔

پلونیوس :- کیا حضور واقعی ایسا ہے۔ یہ ناچیز حضور کو یقین دلاتا ہے کہ وہ اپنے فرائضِ منصب کا ادا کرنا خدا اور اپنے بادشاہ کے سامنے جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ اور یہی میرا خیال ہے ورنہ سمجھنا چاہیئے کہ اب میرا دماغ کسی حکمت وتدبیر کی تہ کو مثل سابق نہیں پہونچ سکتا۔ خداوندِ نعمت۔ میں نے شہزادہ ہیملٹ کی دیوانگی کا سبب بھی دریافت کر لیا ہے۔

بادشاہ :- دیوانگی کا سبب ضرور بتاؤ۔ میں تو اُسکے سُننے کا بے حد مُشتاق ہوں۔

پلونیوس :- پہلے حضور والا سفیروں سے ملاقات کرلیں، پھر جو خبر لایا ہوں وہ سناؤنگا گویا کھانے کے بعد وہ شیرینی کا کام دیگی۔

بادشاہ :- پلونیوس تم ہی ضروری مراسم وآداب ادا کرکے سفیروں کو دربار میں لے آؤ (پلونیوس چلا جاتا ہے) پیاری ملکہ تم نے سنا پلونیوس وزیر کہتا ہے کہ اس نے تمہارے فرزند کی سوء مزاجی کا سبب دریافت کرلیا ہے۔

ملکہ :- میں سمجھتی ہوں کہ شہزادے کی شکایتوں کا سبب باپ کا مرنا اور ہم دونوں کی اسقدر جلد شادی ہوجانا ہے۔

بادشاہ :- یہ جو کچھ بھی ہو لیکن واقعی سبب تحقیق ہونا ضروری ہے۔

(پلونیوس مع ولٹی منڈ اور کورنیلیوس پھر دربار میں حاضر ہوتا ہے)

ہمارے سچے وفادار دوستو تمہاری واپسی سے ہم خوش ہوئے۔ ولٹی منڈ کہو ہمارے برادر شاہ ناروے کے پاس سے کیا خبر لائے؟

ولٹی منڈ :- جہاں پناہ۔ بادشاہ ناروے کی طرف سے حضور کو آداب ومزاج پرسی پہونچاکر عرض ہے کہ ہمارے پہونچتے ہی شاہ موصوف نے اپنے آدمی اس حکم سے اپنے برادر زادے فورٹن براس کے پاس بھیجے کہ جو فوجیں وہ بھرتی کررہا ہے اُن کا بھرتی کرنا بند کیا جائے۔ شاہ ناروے سے اس بارے میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ یہ فوجیں دراصل پولستان والوں سے لڑنے کے لئے فراہم کی جارہی ہیں۔ لیکن جب اس امر کی تحقیقات پورے طور پر ہوئی تو معلوم ہوا کہ نہیں حضور سے لڑنے کے لئے یہ فوجیں تیار کی گئی ہیں۔ یہ سُنکر بادشاہ ناروے کو سخت رنج وافسوس ہوا اور کہا کہ میری بیماری ضعیفی اور کمزوری کی وجہ سے لوگ ناجائز نفع اُٹھارہے ہیں۔ چُنانچہ فوراً فورٹن براس کی گرفتاری کا حکم جاری ہوا۔ فورٹن براس خود حاضر ہوا۔ بادشاہ نے اسکو سخت ملامت کی۔ فورٹن براس نے چچا کے سامنے اس امر کا عہد کیا کہ آیندہ وہ شاہ ڈنمارک کے مقابلہ کا قصد نہ کریگا۔ اس پر بادشاہ اس قدر خوش ہوا کہ اُس نے تینس ہزار دینار سُرخ کا سالانہ وظیفہ اپنے بھتیجے کا مقرر کردیا۔ اور اس بات پر رضامندی ظاہر کی کہ جو فوج مُرتب کی ہے وہ پولستان والوں سے لڑسکتی ہے۔ علاوہ اسکے اور چند امور کی اجازت دی ہے جو اس تحریر میں درج ہیں چُنانچہ اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس فوج کو حضور اپنے ملک میں سے امن وعافیت کے ساتھ گزرنے دیں تاکہ پولستان والوں سے جنگ ہوسکے۔ بشرطیکہ حضور اپنے ملک کی حفاظت وسلامتی کے لئے جو شرائط ضروری ہوں اُنکو منظور کریں۔ جن کا مسودہ بھی اس تحریر میں موجود ہے۔ (ایک لفافہ بادشاہ کو پیش کرتا ہے)

بادشاہ :- ہم یہ کُل حالات سُنکر خوش ہوئے۔ کسی اور وقت اس تحریر کو پڑھکر اسپر غور کریں گے۔ اس وقت ہم تم دونوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ تم نے اس خدمت کو بڑی خوبی سے انجام دیا۔ اب جاکر آرام کرو۔ آج ہی شب کو ضیافت میں پھر مُلاقات ہوگی۔ وطن میں تمہارا آنا مُبارک ہوا۔

(ولٹی منڈ اور کورنیلیوس چلے جاتے ہیں)

پلونیوس :- اب جہاں پناہ اور حضور ملکہ سلامت۔ یہ معاملہ تو اس طرح بخیر وخوبی ختم ہوا۔ اب جو کچھ باقی رہا وہ یہ بحث ہے کہ بادشاہوں کا کیا طرز عمل ہونا چاہئے۔ فرائض منصب کنہیں کہتے ہیں۔ دن کیوں دن ہے اور رات کیوں رات ہے۔ وقت کیوں وقت ہے۔ پس چونکہ ایجاز واختصار بلاغت کی جان ہیں اور کلام میں طوالت کو محض جوارح سمجھنا چاہئے جنہیں محض نمود ونمائش کے لئے حرکت میں لایا جاتا ہے اس لئے فدوی نہایت مختصر طور پر عرض کریگا کہ حضور کا فرزند دیوانہ ہوگیا ہے اور میں اُسے دیوانہ ہی کہونگا۔ کیونکہ دیوانگی کی تعریف اگر میں کچھ کرسکتا ہوں تو وہ یہی ہے کہ شہزادہ کو بجز دیوانگی کے دوسری شکایت نہیں اور اب اس بات سے نظر پوشی اختیار نہ فرمائی جائے۔

ملکہ:- تقریر ایسی کیجئے جس میں فضولیات کم ہوں اور مطلب زیادہ ہو۔

پلونیوس:- حضور میں بقسم عرض کرتا ہوں کہ میری نیت میں کوئی حیلہ یا فریب نہیں ہے۔ رہا یہ امر کہ شہزادہ دیوانہ ہے بالکل صحیح ہے۔ یہ خبر بالکل صحیح اور قابل رحم ہے۔ اور قابل رحم اس وجہ سے ہے کہ وہ صحیح ہے۔ میرے اس انداز بیان میں کسی قدر حماقت ضرور محسوس ہوگی اس لئے میں اس طرز کو ترک کرتا ہوں۔ مگر میں کوئی حیلہ یا مکر نہیں کرتا۔ پس ہم کو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ شہزادہ واقعی دیوانہ ہوگیا ہے۔ تو پھر یہ رہ جاتا ہے کہ اس نتیجہ کا سبب دریافت ہو۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اس نقص کی وجہ معلوم کریں۔ کیونکہ یہ نقص یا نتیجہ کسی سبب کا مسبب ضرور ہے۔ پس اس مقدمے میں صرف اتنی ہی بات باقی ہے اور اب اسی بات کو حضور سنیں۔ میری ایک دختر ہے، اور جب تک وہ میرے پاس ہے میری ہے۔ اس نے میری فرمانبرداری اور اطاعت گزاری کے خیال سے ——— ذرا ان الفاظ کو حضور اپنے ذہن میں رکھیں ——— مجھے یہ خط دیا ہے۔ اب اسے سنیئے اور جو کچھ نتیجہ نکالنا ہو نکالیئے۔

(خط پڑھتا ہے)

"اُس پاک نفس فرشتہ خصال بُتِ حسین کے نام جس کی پرستش میری روح کرتی ہے۔ یعنی نہایت حسین اور پری چہرہ اوفلیا کے نام": حضور خیال فرمائیں حسین اور پری چہرہ کس غضب کے الفاظ ہیں۔ لیکن آگے سنیئے۔ اُسکے سینہ میں پر یہ وغیرہ وغیرہ۔

ملکہ:- کیا یہ خط ہیملٹ نے بھیجا ہے؟

پلونیوس:- حضور ملکہ سلامت۔ ذرا توقف فرمائیں۔ بندہ جو کچھ عرض کریگا وہ اپنے ایمان سے عرض کریگا۔

"شُبہ کر کہ ستارے آگ سے بنے ہیں۔
شُبہ کر کہ آفتاب حرکت کرتا ہے۔
شُبہ کر کہ سچ جھوٹ ہوتا ہے۔
لیکن کبھی میرے عشق میں شُبہ نہ کرنا۔

پیاری اوفلیا مجھے شعر کہنا نہیں آتا۔ کسی ترتیب و تنظیم میں دل سے آہوں کا کھینچنا نہیں جانتا۔ لیکن یہ کہ مجھکو تجھ سے عشق بھی ہے۔ عشق بھی وہ جس کی شدت کی انتہا نہیں۔ میرے اس عشق کا دل سے یقین کر۔ خدا حافظ۔

اے محبوبہ جب تک یہ سازِ ہستی میرا میرے ساتھ ہے میں ہمیشہ کو تیرا ہوں۔

ہیملٹ"

میری مطیع و تابعدار بیٹی نے یہ خط مجھے دکھایا۔ علاوہ اسکے جب کبھی اور جس طریقے سے شہزادے نے حالتِ عشق میں توسل تضرع ظاہر کیا وہ سب اُس نے میرے سامنے بیان کیا۔

بادشاہ:- مگر اوفلیا نے بھی شہزادے کے اس عشق کو تسلیم کیا یا نہیں؟

پلونیوس:- جہاں پناہ میری نسبت کیا خیال فرماتے ہیں؟

بادشاہ:- میں تم کو راست باز و معزز خیال کرتا ہوں۔

پلونیوس:- خوشا قسمت کہ میں حضور کی جناب میں اپنے کو ایسا ثابت کرسکوں لیکن جب میں نے اس آتشی تحریر کو پڑھا تو حضور کے خیال میں کیا آتا ہے کہ میں نے کیا کیا؟ وہ بھی سنیئے۔ میں پڑھنے کی میز یا کتاب کی طرح بے حس و بے جان نہیں رہا۔ میں نے اپنے دل میں یہ نہ کہا کہ جانے بھی دو، اور جو کچھ ہو رہا ہے اُسے چلنے دو۔ میں نے اس عشق بازی کے قصے کو بے توجہی سے نہیں دیکھا۔ بھلا حضور کے خیال شریف میں کیا آتا ہے کہ اس موقع پر میں نے کیا کیا؟ حضور فدوی نے فوراً اُدھر متوجہ ہو کر اپنا کام شروع کر دیا۔ اور میں نے اپنی جوان بیٹی سے کہا "سن بیٹی۔ تیرا اور اس کا ستارہ ایک نہیں۔ تم دونوں کا جوڑ نہیں۔ سمجھ لے کہ ایسا نہیں ہوسکتا"۔ پھر میں نے اُسے حکم دیا کہ کمرہ بند کرکے وہیں پڑی رہے۔ نہ شہزادے کو اور نہ اُسکے کسی قاصد کو اپنے پاس آنے دے۔

اور نہ جو تحفے تحائف بھیجے انہیں قبول کرے۔ جب میں یہ حکم دے چکا تو میری ہدایتوں سے میری بیٹی مستفید ہوئی۔ اور شہزادے کی آمد و رفت بند ہوئی۔ قصہ مختصر اُس دن سے شہزادہ افسردہ دل اور پریشان خاطر رہنے لگا۔ پھر کھانا پینا چھوڑ دیا۔ پھر راتوں کی نیند حرام ہوئی۔ پھر جسمانی ضعف پیدا ہوا۔ پھر ہذیان شروع ہوا۔ غرض ایک حالت سے دوسری حالت میں تنزل کرتا ہوا اُس جنون میں مبتلا ہوا جس میں اب وہ دیوانوں کی طرح باتیں کرتا ہے۔ اور ہم سب اُسکے حال پر افسوس کرتے ہیں۔

بادشاہ: ۔ پلونیوس۔ کیا واقعی تمہارا یہی خیال ہے؟

پلونیوس: ۔ جہاں پناہ۔ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ میں نے کسی بات کو کہا ہو کہ اس طرح ہے اور وہ اُسی طرح نہ نکلی ہو؟

بادشاہ: ۔ یاد تو نہیں پڑتا۔

پلونیوس: ۔ (اپنے شانوں اور سر کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے) اگر یہ بات اسی طرح نہیں ہوئی جیسے کہ میں نے عرض کی ہے تو پھر ان شانوں سے یہ سر اُتروا لیا جائے۔ اگر واقعات راہ بتانے کو حاضر ہو جائیں تو یہ ناچیز معاملہ کی اصل کو خواہ وہ زمین کے جگر ہی میں کیوں مخفی نہ ہو، معلوم کئے بغیر نہ رہیگا۔

بادشاہ: ۔ تو پھر کس طرح آزمائش کرکے اس بات کی تصدیق کریں؟

پلونیوس: ۔ حضور کو علم ہوگا کہ بعض دن شہزادہ چار چار گھنٹے مسلسل اس دالان میں ٹہلا کرتا ہے۔

ملکہ: ۔ ہاں یہ بالکل سچ ہے۔

پلونیوس: ۔ بس جس دن وہ ٹہلتا ہوگا۔ میں اپنی بیٹی کو اُسکے پاس بھیجونگا۔ پھر ہم اور آپ دالان کے پردوں میں چھپ کر سُنینگے کہ اُن میں کیا باتیں ہوتی ہیں۔ اگر اُس وقت ثابت ہو کہ شہزادے کو عشق نہیں ہے اور اِس آزار نے اُسکے ہوش و حواس معطل نہیں کئے ہیں تو پھر حضور فدوی کو وزارت سے برطرف فرمائیں اور یہ عاجز کہیں جا کر کھیتی باڑی یا گاڑی بانی کرنے لگے گا۔

بادشاہ: ۔ اچھا ہم اسی طرح آزمائش کرینگے۔

ملکہ: ۔ لیکن ذرا اِدھر نظر اُٹھاؤ۔ دیکھو تو وہ غریب کیسا افسردہ خاطر کچھ پڑھتا چلا آتا ہے۔

پلونیوس: ۔ حضور دونوں یہاں سے تشریف لے جائیں اور میں ابھی شہزادے سے بات کرتا ہوں۔

(بادشاہ، ملکہ اور ملازمین چلے جاتے ہیں)

(ہیملٹ کچھ پڑھتا ہوا اندر آتا ہے)

اجازت ہو تو دریافت کروں کہ شہزادہ ہیملٹ کا مزاج اب کیسا ہے؟

ہیملٹ: ۔ اچھا ہوں۔ خدا رحم کرے۔

پلونیوس: ۔ حضور مجھے پہچانتے ہیں؟

ہیملٹ: ۔ ہاں خوب۔ تم تو مچھلیاں بیچا کرتے ہو نا؟

پلونیوس: ۔ حضور۔ میں ماہی فروش نہیں ہوں۔

ہیملٹ: ۔ تو پھر کاش تم ایماندار ہوتے!

پلونیوس: ۔ حضور نے کیا فرمایا؟ ایماندار آدمی ہوتے؟

ہیملٹ: ۔ ہاں ہاں۔ دُنیا کا حال تو یہ ہے کہ ہزاروں میں مشکل سے ایک ایماندار ملتا ہے۔

پلونیوس: ۔ یہ حضور نے بالکل سچ فرمایا۔

ہیملٹ: ۔ کیونکہ آفتاب جو ایک مرے ہوئے کتے میں کیڑے ڈالتا ہے وہی سڑے ہوئے گندے گوشت پر اپنا نور برسا کر اُسے چومتا ہے۔ تمہاری ایک بیٹی بھی تو ہے؟

پلونیوس: ۔ حضور ہے تو۔

ہیملٹ: ۔ اُسے عام لوگوں میں پھرنے چلنے نہ دینا۔ بچوں کا پیدا ہونا بڑی برکت کی بات ہے، لیکن تمہاری بیٹی کا صاحبِ اولاد ہونا بڑی بُری بات ہوگی۔

پلونیوس :- (علیحدہ کہتا ہے) دیکھئے اب تک میری بیٹی کا ذکر بار بار زبان پر ہے۔ پہلے تو مجھے پہچانا نہیں۔ سمجھا کہ میں ماہی فروش ہوں۔ افسوس جنون بہت بڑھ گیا۔ وارفتگی کہیں کی کہیں پہونچی۔ سچ ہے کہ عشق بُرا آزار ہے۔ میں نے بھی جوانی میں اسکی بڑی بڑی تکلیفیں اُٹھائی ہیں۔ میرا حال بھی قریب قریب یہی ہو چُکا ہے۔ اب میں پھر اس سے بات کرتا ہوں۔

حضور کیا پڑھتے ہیں؟

ہیملٹ :- الفاظ۔ الفاظ۔ الفاظ۔

پلونیوس :- حضور کا حال کیا ہے؟

ہیملٹ :- کن دو کا حال پوچھتے ہو؟

پلونیوس :- حضور میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حضور کیا مطالعہ کر رہے ہیں؟

ہیملٹ :- کچھ تہمتیں ہیں۔ کچھ افترا پردازیاں اور بہتان بندیاں ہیں۔ یہ مسخرا ہجو گو مصنف کہتا ہے کہ بڈھوں کی ڈاڑھیاں سپید ہوتی ہیں۔ چہروں پر جھرّیاں ہوتی ہیں اور اُن کی آنکھوں سے زرد زرد لُعاب جیسے درخت کا گوند ہو ہمیشہ بہتا رہتا ہے۔ عقل کم رکھتے ہیں اور ان کی ٹانگیں بہت کمزور ہوتی ہیں۔ گو مجھکو ان تمام باتوں سے پورا اتفاق ہے لیکن میں پسند نہیں کرتا کہ ایسی باتیں کسی کتاب میں چھاپی جائیں۔ کیونکہ آپ بھی اتنے ہی جوان ہو سکتے ہیں جتنا جوان میں ہوں بشرطیکہ اُلٹے چلنے کی مہارت آپ رکھتے ہوں۔

پلونیوس :- گو شہزادہ دیوانہ ہے مگر اس دیوانگی میں بھی بکار خود ہوشیار معلوم ہوتا ہے اور گفتگو میں ایک قسم کا ربط ہے۔ حضور یہاں سے نکل کر تازی ہوا میں آئیں۔

ہیملٹ :- کیا اس ہوا سے نکل کر اپنی قبر میں چلا جاؤں؟

پلونیوس :- واقعی قبر میں تو ہوا نہیں ہوتی (علیحدہ کہتا ہے) دیکھو تو شہزادے کے جواب بعض وقت کیسے پُر معنی ہوتے ہیں۔ یہ محض اتفاق ہے کہ حالت جنون میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ ایک مجنوں ایسا جواب دے جو ایک صاحب عقل و دانش بھی برجستہ نہ دے سکے۔ شہزادے کو تو میں یہیں چھوڑتا ہوں اور کوئی ترکیب ایسی کرتا ہوں کہ میری بیٹی سے اُس کی ملاقات ہو جائے۔ شہزادۂ عالی وقار اب میں حضور سے رخصت حاصل کرنی چاہتا ہوں۔

ہیملٹ :- تم مجھ سے کوئی چیز ایسی حاصل نہیں کر سکتے جسکو میں اپنی خوشی اور مرضی سے دینا چاہوں۔ سوائے اس جان کے جو میں رکھتا ہوں۔ یہ جان البتہ حاضر ہے۔ اسے قبول فرمایئے۔

پلونیوس :- حضور کو خُدا کے سپرد کیا۔

ہیملٹ :- یہ بڈھا بڑا باتونی اور احمق ہے۔

(روزنکرانز اور گلڈنسٹرن اندر آتے ہیں)

پلونیوس :- کیا آپ شہزادہ ہیملٹ سے ملاقات کو جاتے ہیں؟ دیکھئے شہزادہ وہ سامنے کھڑا ہے۔

روزنکرانز :- خُدا آپکو اس کا اجر نیک دے۔

گلڈنسٹرن :- میرے نہایت نجیب و شریف شہزادے!

روزنکرانز :- میرے محبّ و مکرّم!

ہیملٹ :- پیارے دوستو! تمہارا مزاج کیسا ہے؟ گلڈنسٹرن اہا! روزنکرانز۔ بچپن کے رفیقو۔ تم دونوں کیسے ہو؟

روزنکرانز :- دُنیا کے بسنے والوں میں معمولی حیثیت سے بسر کرتے ہیں۔

گلڈنسٹرن :- ہماری خوشحالی یہی ہے کہ زیادہ خوشحال نہیں۔ کلاہ تقدیر کا ہم طرہ نہیں۔

ہیملٹ :- اور نہ پاپوش تقدیر کی کف پا ہو۔

روزنکرانز :- حضور نے صحیح فرمایا۔ یہ دونوں باتیں ہم میں نہیں ہیں۔

ہیملٹ :- کہو کیا خبر ہے؟

روزنکرانٹر:۔ خبر سوائے اس کے کچھ نہیں کہ دُنیا کہُن سال ہوتی جاتی ہے۔

ہیملٹ:۔ تو سمجھ لو کہ قیامت قریب ہے۔ لیکن تمہاری یہ خبر صحیح نہیں ہے۔ اچھا میں تم سے خاص طور پر چند سوال کرتا ہوں۔ دوستو۔ ذرا یہ تو بتاؤ کہ تم نے کیا جُرم کیا تھا کہ جس کی سزا میں تقدیر نے تمہیں اس قید خانے میں بھیجا۔

گلڈنسٹرن:۔ حضور اِسے قید خانہ فرماتے ہیں۔

ہیملٹ:۔ ڈنمارک کے قید خانے ہونے میں کسکو شک ہے۔

روزنکرانٹر:۔ یوں تو پھر ساری دُنیا ہی قید خانہ ہے۔

ہیملٹ:۔ اور بڑا بھاری قید خانہ ہے جس میں بے شمار محبس، زنداں اور بندی خانے موجود ہیں۔ اور ان سب میں ڈنمارک سب سے بڑا قید خانہ ہے۔

روزنکرانٹر:۔ تو پھر یوں فرمایئے کہ تاج و تخت نہ ملنے کی مایوسی نے اسے قید خانہ بنا دیا ہے اور حضور کی وسعتِ خیال کیلئے یہ میدان بہت تنگ ہو گیا۔

ہیملٹ:۔ خُدایا۔ میرا حال تو یہ ہے کہ اگر تم مجھکو بادام کے خول میں بھی بند کر دو تو میں اپنے تئیں کون و مکان کا بادشاہ سمجھنے لگوں۔ لیکن جو خواب مجھے نظر آیا کرتے ہیں اُنسے لاچار ہوں۔

گلڈنسٹرن:۔ یہ خواب بھی حضور مُلک گیری کے ہوتے ہونگے۔ کیونکہ جو لوگ دولت وجاہ کی محبّت رکھتے ہیں اُن کا مقصود بھی تو خواب کی پرچھائیں یا اُس کا سایہ ہوتا ہے۔

ہیملٹ:۔ خواب بھی تو کسی چیز کا سایہ یا پرچھائیں ہوتا ہے۔

روزنکرانٹر:۔ دُرست ہے۔ لیکن میں تو جاہ و دولت کی محبّت کو بھی ایسا ہی ہلکا اور ہوائی سمجھتا ہوں کہ میرے نزدیک تو وہ بھی ایک پرچھائیں یا سایئے سے زیادہ نہیں۔

ہیملٹ:۔ لیکن مال و دولت سے محبّت رکھنے والے بڑے بڑے بادشاہ اور سُورما ہوتے ہیں۔ اور جو اس محبّت کو ہلکا اور ہوائی سمجھتے ہیں وہ مال و دولت سے محروم فقیر اور گدا ہوتے ہیں۔ تو پھر سمجھئے کہ یہ فقیر و گدا جسم و حقیقت رکھتے ہیں اور بادشاہ اور سُورما محض سایہ اور پرچھائیں ہوتے ہیں۔ کیا اب ہم بھی دربار میں جاتے ہیں۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ مجھ میں اب کسی مضمون پر بحث کرنے کی طاقت نہیں رہی۔

روزنکرانٹر }
گلڈنسٹرن } ہم تو حضور کی خدمت میں برابر حاضر رہیں گے۔

ہیملٹ:۔ نہیں نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ میں تم کو اپنے خادموں خدمتگاروں میں نہیں شمار کر سکتا۔ سچ پوچھو تو میرے مُلازم میری خدمت بہت بُری طرح کرتے ہیں۔ کیا دوستی اور محبّت کا مُقتضا نہیں ہے کہ میں تم سے پوچھوں کہ تم السینور میں کیسے آئے۔

روزنکرانٹر:۔ حضور کی مُلاقات کے سوا کوئی غرض نہ تھی۔

ہیملٹ:۔ میں تو ایسا محتاج اور فقیر ہوں کہ دینے کے نام شُکریہ تک پاس نہیں رکھتا۔ میرے عزیز دوستو میرا شُکریہ قبول کرو۔ اور اس شُکریہ کی قیمت میں اگر تم نے کھوٹا بادام بھی دیا تو قیمت گراں رہیگی۔ کیا تمہارا خود ملنے کو جی چاہتا تھا؟ یعنی کیا تمہاری یہ مُلاقات محض اپنی خوشی و مرضی سے ہے؟ دیکھو جواب ایمان اور سچّائی سے دینا۔ سچّی بات کہنا۔

گلڈنسٹرن:۔ حضور ہم کیا جواب دیں۔

ہیملٹ:۔ جو کچھ جواب دو وہ سچ سچ دو حقیقت تو یہ ہے کہ تم یہاں بُلائے ہوئے آئے ہو۔ سچّی بات تمہاری نظروں سے ٹپک رہی ہے۔ جیسے تمہارا دل قدرتاً نہیں چھپا سکتا۔ مجھے معلوم ہے کہ بادشاہ اور ملکہ نے تمہیں یہاں بُلایا ہے۔

روزنکرانٹر:۔ بُلانے میں اُن کی غرض کیا ہو سکتی تھی؟

ہیملٹ:۔ تم ہی بتاؤ۔ یہ تو میرے بتانے کی بات نہیں۔ لیکن

میں اُس محبت اور اُلفت کی قسم اور اُن حقوقِ آشتی و مُروّت کا واسطہ دیکر جو بچپن میں ساتھ رہنے سے پیدا ہوئے تھے۔ اور اسی طرح اور تعلقات کی قسم دیکر جو مجھ سے بڑھکر کوئی خوش تقریر تمہیں دلائے تم سے التجا کرتا ہوں کہ اس معاملہ میں تم میرے ساتھ پوری سچائی اور صفائی برتوگے اور بتاؤگے کہ کیا فی الواقع بادشاہ اور ملکہ نے تمہیں یہاں بلایا ہے۔

روزنکرانز:۔ (گلڈنسٹرن کو اپنی طرف بلاکر) اب بتاؤ کیا کہتے ہو؟

ہیملٹ:۔ واہ واہ! میں تمہیں دیکھ رہا ہوں مگر سچی بات کہنے میں مجھ سے ہرگز نہ رُکنا۔

گلڈنسٹرن:۔ حضور ہم بلائے گئے ہیں۔

ہیملٹ:۔ اچھا۔ اب یہ مجھ سے سُنو کہ کیوں بلائے گئے ہو۔ وجہ تمہاری طلبی کی مجھے پہلے ہی معلوم ہے اس بارے میں تمہیں کچھ کہنا ضروری نہیں۔ اور تم نے جو وعدہ بادشاہ اور ملکہ سے اُس کو مخفی رکھنے کا کیا ہے اُس میں کوئی فرق نہ آئیگا۔ بات یہ ہے کہ کچھ دنوں سے، وجہ معلوم نہیں، ہر قسم کی زندہ دلی مجھ سے زائل ہوگئی ہے کسی قسم کی تفریح یا ورزش میں اب نہیں کرتا۔ اور ہر وقت طبیعت پر کچھ ایسا بوجھ رہتا ہے کہ یہ خوشنما زمین مجھے ایک ویران اور خشک پہاڑی نظر آتی ہے۔ یہ فضا، یہ نیلا گنبد، یہ سر پر معلّق آسمان اور یہ پُر تکلّف چھت جس میں حسین روشنیاں چمک رہی ہیں غرض یہ کُل چیزیں میری نگاہ میں گندے اور متعفن بخارات کا ایک مجموعہ یا بادل ہیں۔ انسان کیسی اعلیٰ صنعت ہے عقل و ادراک اسکو کیسا بلند عطا ہوا ہے۔ صورت میں کیسا ہوشیار اور چونکنّا۔ حرکت میں کیسا سُبک۔ عمل میں کیسا فرشتہ، اور عقل و فراست میں خُدا کا ہم پلّہ بنتا ہے۔ دُنیا کا وہ حُسن و جمال ہے۔ حیوانات میں ایسا نمونہ ہے کہ جس سے اعلیٰ تر ممکن نہیں۔ لیکن میری نظر میں اب اس خاک کے جوہرِ بے بہا کی کچھ وقعت نہیں۔ کوئی مُتنفس مجھے اب خوش نہیں کرسکتا۔ اور نہ کوئی عورت۔ گو تمہارے مُسکرانے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت مجھے خوش کرسکتی ہے۔

روزنکرانز:۔ حضور ہمارے خیال میں کوئی بات ایسی نہیں تھی۔

ہیملٹ:۔ تو جب میں نے کہا تھا کہ کوئی مُتنفس مجھے خوش نہیں کرسکتا تو تم مُسکرائے کیوں تھے؟

روزنکرانز:۔ حضور ہم اس بات پر مُسکرائے تھے کہ اگر انسان حضور کو خوش نہیں کرسکتا تو پھر یہ تماشہ کرنے والے ایکٹر جو حضور نے طلب کئے ہیں اُن کی خاطر و مدارات اور مہمانداری کیا خاک ہوسکے گی۔ ہمیں یہ ایکٹر راستے میں ملے تھے اور وہ یہاں حضور کے سامنے تماشہ کرنے آرہے ہیں۔

ہیملٹ:۔ جو ایکٹر بادشاہ بنے گا میں اُس سے خوش ہونگا اور یہ بادشاہ سلامت مجھ سے اس طرح انعام حاصل کریں گے جیسے کوئی بادشاہ اپنی رعیت سے خراج وصول کرتا ہے۔ اور جو شہسوار کا روپ بھریگا اُسے تلوار اور سپر لگانی پڑے گی۔ عاشق بھی گریہ و زاری مفت نہ کریگا۔ وہی جسکے دماغ میں تلوّن بھرا ہوگا اپنا وہم اور تلوّن دکھائیگا۔ جو ایکٹر محفل کا مسخرا بنے گا وہ اُن لوگوں کو ہنسائیگا جو ذراسے اشارے پر قہقہے لگانے کو تیار ہوتے ہیں۔ اور جو عورت کا بھیس بدلیگا اگر غیر مُقفّیٰ اشعار نے کوئی رُکاوٹ پیدا نہ کی تو وہ اپنی تقدیر کی پوری سرگزشت سُنائیگا۔ کوئی اُسے بات کرنے میں نہ روک سکے گا۔ یہ کونسے ایکٹر ہیں؟

روزنکرانز:۔ یہ وہی ایکٹر ہیں جن کا تماشہ دیکھکر حضور خوش ہوا کرتے تھے۔ یہ شہر کے مشہور و معروف درد انجام تماشے دکھانے والے ایکٹر ہیں۔

ہیملٹ:۔ یہ کیا بات ہے کہ وہ پھیری والے تماشاگر ہوگئے؟ اگر ایک ہی مقام پر تماشا کرتے ہوتے تو شہرت اور نفع دونوں

میں زیادتی ہوتی۔

روزنکرانٹز:۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسکی وجہ وہ مخالفت ہے جو حال میں قوانین کی تبدیلی سے پیدا ہوئی ہے۔

ہیملٹ:۔ کیا اب بھی لوگ انکے ایسے ہی قدردان ہیں جیسے کہ شہر میں ہمارے زمانہ قیام میں تھے۔ کیا اب تک لوگ ان کی سرپرستی کرتے ہیں؟

روزنکرانٹز:۔ نہیں حضور۔ اب وہ پہلی سی بات نہیں رہی۔

ہیملٹ:۔ کیا تماشاگری میں پہلا سا کمال نہیں رہا؟

روزنکرانٹز:۔ نہیں حضور۔ کوشش تو وہ پہلے ہی جیسی کرتے ہیں اور لوگ اُن کی قدر بھی کرتے ہیں۔ لیکن آج کل ایک کمپنی ایسی تیار ہوئی ہے جس میں بچے ہی بچے ہیں۔ کمپنی کا ہے کو شِکروں کا آشیانہ سمجھئیے۔ جس میں بچے بھرے ہر وقت چیں چیں کرتے ہوں۔ سوال جواب میں خوب چیخنے چلاتے ہیں۔ حاضرین مجلس خوب زور شور سے تعریف کے نعرے لگاتے ہیں۔ اب اسی کمپنی کے تماشے خلقت پسند کرتی ہے۔ اپنے ذلیل اسٹیج پر یہ ایکٹر جو تماشے دکھاتے ہیں اُن کے مصنف بھی بدکلامی اور ہجوگوئی میں بڑی شدت سے کام لیتے ہیں اور یہ نوعمر ایکٹر بھی مضامین کے ادا کرنے میں اتنا شور وغل مچاتے ہیں کہ ایک مضبوط دل کا آدمی تلوار لگائے بھی اپنی ہجو سننے وہاں جاتے ہوئے ڈرتا ہے۔

ہیملٹ:۔ کیا اس کمپنی کے سب ایکٹر بچے ہی ہوتے ہیں۔ اس کا سرپرست کون ہے۔ اُجرت انکو کس طریقے پر دی جاتی ہے۔ کیا وہ ایکٹر کا پیشہ اُس وقت تک کرتے ہیں کہ اُن کی لڑکپن کی آواز گانے کے قابل رہے۔ جب بڑے ہو کر اُنھوں نے کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرنا چاہا مگر نہ اختیار کرسکے اور جوان ہو کر بھی ایکٹر ہی رہے تو کیا اس وقت وہ یہ نہ کہینگے کہ ڈرامہ نویسوں نے اُن کے ساتھ بدسلوکی کی کہ جو پیشہ وہ اختیار کرنے کو تھے اُس کے خلاف تقریریں لکھ کر ایکٹ کرنے کو انہیں دیں۔

(اندر سے باجے اور تاشوں کی آواز آتی ہے۔)

روزنکرانٹز:۔ لیجئے حضور ایکٹر آرہے ہیں۔

ہیملٹ:۔ شریف روزنکرانٹز اور شریف گلڈنسترن السینو میں تمہارا آنا موجبِ مسرت ہوا۔ ہاتھ بڑھاؤ۔ مصافحہ کرنے میں تامل نہ کرو۔ کسی سے خیر مقدم پر جو الفاظ یا جملے کہے جاتے ہیں وہ ایک رسمی اخلاق ہوتا ہے۔ میں مصافحہ کرکے تمہارے ساتھ اخلاق ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میرا ارادہ ان ایکٹروں کے ساتھ زیادہ رسمی اخلاق برتنے کا ہے۔ اس لئے ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ تمہاری بہ نسبت میں نے ان ایکٹروں کے ساتھ زیادہ اخلاق برتا۔ میں تمہارا خیر مقدم کرتا ہوں لیکن یہ بھی کہتا ہوں کہ میرا چچا جو میری ماں سے شادی کر لینے سے میرا باپ ہے اور میری ماں اسی شادی کی وجہ سے میری چچی ہے، یہ دونوں غلط راہ پر ہیں۔

گلڈنسترن:۔ کیوں حضور۔ وہ کیسے غلط راہ پر ہیں؟

ہیملٹ:۔ میرا جنون تو دماغ کے قطب نما میں صرف ایک ہی سمت میں رہتا ہے یعنی شمال شمال مغرب میں۔ لیکن اگر ہوا جنوب کی ہوئی تو میں شکرے اور جس شکار کے پیچھے وہ اُڑتا ہے دونوں کو جدا جدا دیکھ سکتا ہوں۔

(پلونیوس اندر آتا ہے)

پلونیوس:۔ نوجوانو۔ اُمید ہے کہ آپ بخیر ہونگے۔

ہیملٹ:۔ روزنکرانٹز تم سنو اور گلڈنسترن تم بھی سنو اور میرے ہر کان کی طرف ایک ایک سننے والا رہے۔ یہ موٹا تازہ دودھ پیتا بچہ ابھی تک اپنے نہالچوں ہی میں پڑا لوٹ رہا ہے۔

روزنکرانٹز:۔ لوگ کہتے ہیں کہ بڑھاپا دوسرا بچپن ہوتا ہے شاید یہ بچہ دوسری مرتبہ ہمارے سامنے آیا ہے۔

ہیملٹ:- میں پہلے سے کہے دیتا ہوں کہ یہ شخص ہم کو محض اس بات کی اطلاع دینے آیا ہے کہ ایکٹر آ گئے ہیں۔

پلونیوس:- حضور شہزادہ عالی وقار! میں خدمتِ عالی میں ایک خبر لے کر آیا ہوں۔

ہیملٹ:- میں بھی حضور کو ایک خبر سنانے آیا ہوں۔ وہ یہ کہ روسکیس روما میں ایکٹر تھا۔

پلونیوس:- حضور کے طلب کئے ہوئے ایکٹر حاضر ہو گئے ہیں۔

ہیملٹ:- بھن بھن بھن۔

پلونیوس:- حضور میں اپنے ناموس کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے قول پر بھروسا کریں۔

ہیملٹ:- تو کیا ہر ایک ایکٹر گدھے پر سوار ہو کر آیا ہے؟

پلونیوس:- حضور۔ یہ لوگ دنیا کے بہترین ایکٹروں میں ہیں۔ ہر قسم کے ڈراما دکھانے میں انہیں کمال حاصل ہے۔ خواہ ڈراما از قسم ٹریجڈی ہو خواہ کومیڈی۔ خواہ تاریخی ہو خواہ رعوی۔ خواہ رعوی مع ظرافت یا خالص۔ چاہے ڈراما تاریخی رعوی شامل ہو اور خواہ ایسا ہو جس میں ٹریجڈی، کومیڈی، تاریخی رعوی تمام قسمیں ملی جلی ہوں۔ شاعری ایسی پاکیزہ جس میں کسی طرح کی قید و بندش نہیں۔ یونان کے مشہور ٹریجڈی نویس کے کلام میں اتنا وزن کہاں اور نہ وہاں کے کومیڈی نویس پلاتس کی شاعری میں اتنی لطافت ہے۔ ڈراما خواہ مقررہ کلاسکل طرز میں لکھے جائیں خواہ رومانس کے آزاد انداز میں تحریر ہوں۔ بہرکیف یہ تماشا گروہ ہیں جنکے تماشے واقعی دیکھنے کے قابل ہیں۔

ہیملٹ:- او لیفاتہ بنی اسرائیل کے قاضی تیرے پاس کیسا خزانہ تھا؟

پلونیوس:- حضور ہی بتائیں کہ وہ خزانہ کیا ہے۔

ہیملٹ:- تمہیں اس کی دولت کا حال نہیں معلوم۔ ایک حسین دختر کے سوا اور کچھ نہ رکھتا تھا۔
اور اس سے اسکو بڑی محبت تھی۔

پلونیوس:- (علیحدہ) دیکھو۔ ابھی تک میری بیٹی ہی کے خیال میں ہے۔

ہیملٹ:- بڈھے لیفاتہ۔ کیا میں سچ نہیں کہتا؟

پلونیوس:- کیا حضور مجھے لیفاتہ سمجھ رہے ہیں؟ تو میری بھی ایک بیٹی ہے جسے میں بہت چاہتا ہوں۔

ہیملٹ:- اس سے یہ نتیجہ تو نہیں نکلتا۔

پلونیوس:- تو پھر حضور فرمائیں کہ دوسرا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟

ہیملٹ:- نتیجہ نہیں۔ اور اس فقرے کے بعد کہ "محبت تھی" آتا ہے:-

"جیسا کہ خدا کا حکم تھا وہ ہوا"

اور اس سے آگے جو کچھ آتا ہے وہ تم جانتے ہی ہو۔ دوسرے گیت کے پہلے شعر سے جو کچھ تم معلوم کرنا چاہتے ہو وہ معلوم ہو جائیگا۔ لو وہ ایکٹر آ گئے۔ اب قطع کلام کرتا ہوں۔

(چار یا پانچ ایکٹر آتے ہیں)

آئیے آئیے۔ مبارک مبارک۔ آپکا یہاں تک تکلیف کرنا ہمارا باعثِ مسرت ہوا۔ تم سے مل کر تو بڑا ہی دل خوش ہوا۔ اہا دوست تم تو بڑے پرانے ہو۔ ہائیں! پہلے جب دیکھا تھا تو چہرہ صاف تھا۔ اتنے ہی دن میں ڈاڑھی بھی نکل آئی۔ آج ڈنمارک میں مجھ سے ملنے آئے ہو۔ اور اچھا تم جوان بیگم بھی ہو۔ واللہ جب آخیر مرتبہ تم سے ملا ہوں تو تمہارا قد اتنا نہ تھا۔ اتنو بقدر اس لکڑی کے تلے کے جو قد کو اونچا کرنے کے لئے پاپوش میں لگاتے ہیں تم اونچے ہو گئے۔ خدا سے دعا مانگتے رہو کہ تمہاری آواز کھوٹی اشرفی کی آواز کی طرح بگڑ نہ جائے۔ لڑکو۔ تم سب کے آنے سے دل بہت ہی خوش ہوا۔ تمہارا حال تو فرانس کے شکرے بازوں کا سا ہی کہ جس پرندے پر پہلے نظر پڑی اسی پر شکرہ چھوڑ دیا۔ بس فوراً کوئی تقریر سنا کر اپنا کمال دکھاؤ۔ مگر تقریر پرُ زور ہو۔

پہلا ایکٹر:- کونسی تقریر حضور سننی پسند فرماتے ہیں۔

ہیملٹ:- بہت دن ہوئے کہ میں نے ایک تقریر تمہاری زبان سے سُنی تھی۔ مگر وہ ایکٹ نہیں کی گئی تھی اور کی بھی گئی ہو تو ایک مرتبہ سے زیادہ نہیں۔ مگر وہ تقریر ایسی نہ تھی جسے عوام الناس پسند کرتے۔ چونکہ حد درجہ لطیف تھی اس لئے عوام کے مذاق کے مطابق نہ تھی۔ لیکن میں نے اور دوسرے لوگوں نے جو رائے قائم کرنے میں مجھ سے بھی بڑھکر تھے اس ناٹک کو بہت ہی عمدہ سمجھا تھا۔ ترتیب مناظر میں مصنف نے بڑی ذہانت اور حسن شناسی سے کام لیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک شخص کہنے لگا کہ "اس تقریر میں رکیک باتیں اتنی نہ تھیں جو عبارت کو چٹ پٹا بنا کر عوام کے قابل پسند بناتیں۔ اور نہ انداز بیان ایسا تھا جس میں مصنف پر بناوٹ اور تصنع کا الزام عاید ہوتا۔ طرز تحریر قدرتی تھا جس سے عمدہ نتائج نکلتے تھے اور جن کا اثر بھی مسرت خیز تھا۔ کلام میں اصلی حسن تھا۔ ظاہری نمود اور ٹھرک نہ تھی"۔ اس ناٹک کا ایک حصہ خصوصاً وہ جو اینیاس نے دایدو کو سنایا ہے اور خاصکر وہ تقریر جس میں پرائم کا قتل ہونا بیان ہوا ہے۔ اگر وہ تقریر تمہیں یاد ہو تو اس مصرع سے شروع کرنا۔ ہاں بھلا وہ کیا تھا...... اب یاد آیا:-

"وہ ظالم و سفاک پرہوس ہرکانیہ کے درندے کی مثل" نہیں نہیں پرہوس کے ذکر سے شروع ہوتا ہے"۔ ظالم و سفاک پرہوس جس کے ہیبت ناک بازو اسکے عزم و ارادے کی مثل اندھیری رات کی طرح سیاہ تھے جبکہ وہ کاٹ کے گھوڑے میں چھپا بیٹھا تھا۔ اب اُس نے اپنے سیاہ رنگ پر خون کا رنگ اور چڑھایا۔ سر سے پاؤں تک پُرہیبت شکل میں ماؤں باپوں بیٹیوں بیٹوں کے خون میں رنگا ہوا اور اس رنگ پر تپتی گلی کوچوں کی گرد گرمی سے لپی بن کر سارے جسم کو چمٹی تھی۔ بازاروں کی روشنی نے قتل و غارت میں مدد کی۔

غرض پرہوس قہر و غضب سے سوزاں و بریاں از سر تا قدم خون میں لتھڑا ہوا، آنکھیں یاقوت کی مثل چمکتی، یہ جہنمی سفاک بڈھے پرائم کو تلاش کرنے لگا"۔

اسی طرح آگے بڑھتے چلے جاؤ۔

پلونیوس:- واللہ! حضور نے خوب پڑھا لب و لہجہ، انداز و ادا سب بے مثل تھا۔

پہلا ایکٹر:- اور اب پرہوس کی نظر پرائم پر پڑی اور دیکھا کہ وہ یونانیوں پر تلوار کے ہلکے ہاتھ چلا رہا ہے۔ اُسکی پُرانی قسم کی بھاری تلوار جو اُس سے سنبھلتی نہیں جہاں ایک دفعہ پڑتی ہے پھر وہاں سے اُٹھنا نہیں جانتی۔ تلوار اس کے قابو کی نہیں ہے اور لڑائی میں پرہوس اور پرائم کا جوڑ نہیں ہے۔ یہ حال دیکھ کر پرہوس پرائم پر جھپٹ پڑتا ہے۔ غصہ میں تلوار کا وار کرتا ہے مگر نشانہ خطا جاتا ہے لیکن تلوار کی ہوا سے پرائم زمین پر گرتا ہے۔ پھر تروجہ کا سارا شہر اس تلوار کی ضرب سے لرز جاتا ہے شہر کے اونچے اونچے برج پاش پاش ہو کر زمین پر گرتے ہیں اور ان کے گرنے کی آواز پرہوس کے کانوں میں پہونچتی ہے۔ اور وہ دیکھو پرہوس کی تلوار جو پرائم کے سفید سر پر تلی ہے معلوم ہوتا ہے کہ اُس میں حرکت نہیں رہی۔ اور پرہوس ایک ظالم و سفاک خونی کی تصویر کی طرح پردے پہ قائم ہو جاتا ہے۔ اس طرح کہ اب ارادہ باقی ہے نہ طاقت۔ کھڑا کا کھڑا بُت بنکر رہ گیا ہے جس و حرکت نہیں کر سکتا۔ اور جس طرح کہ طوفان آنے سے پہلے دیکھنے میں آتا ہے کہ زمین و آسمان پر ہر چیز ساکت ہوتی ہے۔ بادل جہاں تھے وہیں قائم ہو جاتے ہیں۔ ہوا چلتی ہے مگر آواز نہیں ہوتی۔ اور نیچے زمین پر موت کا سا سکوت طاری ہوتا ہے۔ اُسی طرح پرہوس جب [illegible] میں تلوار لئے ساکت ہوا تو یکایک انتقام کی آگ بھڑکی اور پھر جو کچھ ہوا یہ تھا کہ مانند خدائے جنگ کی زرہ تیار کرنے میں سائکلوپ آہن گر کے ہتھوڑے

بھی اس طرح نہ پڑتے ہونگے جیسے کہ پرہوس کی خون آلودہ تلوار پرائم کے جسم نزار پر پڑنے لگی۔

دُور ہو۔ دُور۔ اے بیسوا تقدیر کی دیبی۔ کاش تمام اربابِ فلک اپنے مُتفقہ اجلاس سے تیرے اختیارات سلب کرنے کا حکم نافذ کرتے اور انسان کے مقسوم کا جو چرخہ تو آسمان پر بیٹھی چلا رہی ہے اُسکے پُرزے پُرزے کرکے عرش سے جہنّم کے طبقۂ اسفل کے رہنے والوں میں پھینک دیتے۔

پلونیوس:۔ تقریر بہت طویل ہے۔

ہیملٹ:۔ گھبرایئے نہیں۔ وہ آپکی ڈاڑھی سمیت حجام کے پاس بھیجی جائیگی۔ ایکٹر۔ مہربانی کرکے پڑھے چلے جاؤ۔ یہ بُڈھا احمق تو مبتذل مذاق کا کوئی گیت یا گندی باتوں کی کوئی کہانی پسند کریگا۔ ورنہ سُنتے سُنتے سو جائیگا۔ اب تم ملکہ ہکوبہ کا حال سُناؤ۔

پہلا ایکٹر:۔ اب جس کسی نے ملکہ کے نمدہ پوش سر کو دیکھا.....

ہیملٹ:۔ نمدہ پوش سر

پلونیوس:۔ سر کے لئے نمدہ پوش۔ غضب کی ترکیب ہے۔

پہلا ایکٹر:۔ کہ وہ برہنہ پا اِدھر اُدھر بھاگتی پھرتی ہے اور شعلوں کے دل میں خوف پیدا ہوتا ہے کہ کہیں وہ اپنی اندھی آنکھوں کے اشکوں سے اُنہیں بجھا نہ دے۔ اور اُس سر کو نمدے کا ایک ٹکڑا لپٹا ہے جس پر کبھی تاج رہتا تھا۔ اور ملکہ کا جسم زار کثرتِ اولاد کی وجہ سے لاغر اور کمزور ہو رہا ہے۔ رختِ شاہی کی جگہ صرف ایک کمبل کا ٹکڑا ہے جسے اُٹھا کر یونہی لپیٹ لیا ہے۔ افسوس! جس نے یہ حال دیکھا ہوگا اُس نے تقدیر سے سرکشی و بغاوت کرکے اُس کی نسبت کیا کچھ زہر نہ اُگلا ہوگا۔ اور جب اربابِ فلک نے دیکھا ہوگا کہ پرہوس کس طرح ملکہ ہکوبہ کے شوہر پرائم کے جسم کو اپنی تلوار کی ضربوں سے قیمہ بنا رہا ہے اور اس صدمے اور رنج میں ہکوبہ نے نالہ و زاری کا جو شور مچایا ہوگا تو اُسے سُنکر اگر اِس دُنیائے فانی کی چیزوں کا کوئی احساس خُداؤں کو نہیں ہا ہو

تب بھی عرش کی جلتی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے ہونگے۔ اور آسمان کے خداؤں میں سخت قہر و غضب کا طوفان برپا ہوا ہوگا۔

پلونیوس:۔ دیکھئے تو ایکٹر کے چہرے کا رنگ کیسا بدل گیا ہے اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں۔ ایکٹر۔ اب آگے نہ پڑھو۔

ہیملٹ:۔ اچھا۔ جانے دو۔ باقی تقریر پھر کبھی سُنینگے۔ اچھا جنابِ والا

پلونیوس۔ آپ ذرا ایسا انتظام کریں کہ یہ ایکٹر آرام و آسائش سے رہیں۔ سُنا آپ نے؟ انہیں کسی طرح کی تکلیف نہ ہو۔ کیونکہ یہ لوگ اپنے زمانے کی تاریخ اور حیاتِ انسانی کے زندہ دفتر ہیں۔ دُنیا سے رخصت ہونے پر آپکے لوحِ مزار پر آپکی نسبت کیسی سے کیسی بُری بات کندہ کی جائے وہ مٹ جائیگی، لیکن اگر انہوں نے کوئی بُری بات آپکی نسبت کہدی تو وہ زندگی میں اور زندگی کے بعد بھی اَمِٹ رہے گی۔

پلونیوس:۔ شہزادۂ عالی وقار۔ میں ان لوگوں کے ساتھ ان کی لیاقت اور حیثیت کے مطابق برتاؤ کرونگا۔

ہیملٹ:۔ نہیں۔ واللہ آپ اس سے کہیں زیادہ اخلاق اور مہربانی سے پیش آئیں۔ اگر آپ ان سے انکی لیاقت اور حیثیت کے مطابق پیش آئیں گے تو پھر کون ایسا ہوگا جو تازیانے کی سزا پانے کے قابل نہ نکلے؟ آپ ان کے ساتھ اپنے مرتبے اور شان کے مطابق برتاؤ کریں۔ اور جس قدر وہ کم سلوک کے قابل نظر آئینگے اُسی قدر آپ فیاضی اور دریادلی میں شہرت اور نیک نامی حاصل کریں گے۔

پلونیوس:۔ صاحبو۔ اِدھر تشریف لایئے۔

ہیملٹ:۔ دوستو۔ اس کے ساتھ جاؤ۔ ہم کل ایک ناٹک دیکھیں گے۔ ارے پُرانے دوست تو نے کچھ سُنا بھی؟ کیا تم وہ ناٹک دِکھا سکوگے جسکا نام "گونزاگو کا خون" ہے؟

پہلا ایکٹر:۔ حضور ہم یہ ناٹک دِکھا سکیں گے۔

ہیملٹ:۔ اچھا کل شبکو ہم یہی ناٹک ملاحظہ کرینگے۔ میں چند

اشعار جو شمار میں بارہ یا سولہ سے زیادہ نہ ہونگے لکھکر دونگا۔ تم انکو ابھی ناٹک میں کہیں کھپا دینا۔ کیا ایسا ممکن ہوگا؟

پہلا ایکٹر:۔ حضور کا حکم سر آنکھوں پر۔

ہیملٹ:۔ اچھا۔ تم سب وزیر پلونیوس کے ساتھ جاؤ۔ مگر رستے میں اُسے چھیڑنا یا منہ نہ چڑانا۔ (پہلا ایکٹر چلا جاتا ہے) اور میرے پیارے دوستو روزنکرانٹز اور گلڈنسٹرن۔ میں کل شب تک آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔ اور السینور میں آپکے قدم رنجہ فرمانے پر خیر مقدم کہتا ہوں۔

روزنکرانٹز:۔ حضور جیسا مناسب سمجھیں۔

ہیملٹ:۔ اچھا خدا حافظ۔

اب میں تنہا ہوں۔ ہائے میری نالائقی اور کمینہ پن کی بھی کوئی انتہا ہے۔ حیرت کا مقام ہے کہ یہ ایکٹر محض ایک تماشے یا قصّے میں یا شاعر کے جوشِ تخیل میں یا محض ایک خیالی جذبے میں اپنے دل و دماغ کو شاعر کے خیال کا ایسا ہمدرد و ہم نوا بنالے اور اسکو اسدرجہ اپنا کرے۔ اور یہ سب کس کے لئے؟ ملکہ ہکوبہ کے لئے۔ ہکوبہ اس ایکٹر کی یا یہ ایکٹر ملکہ ہکوبہ کا کون ہوتا تھا کہ وہ اُس کے لئے ایسا زار و قطار رونے لگے۔ لیکن جو وجہ میرے رنج و صدمے کی ہے اگر کہیں وہ اُس میں ہوتی تو پھر وہ تمام اسٹیج پر اشکوں کا طوفانِ عظیم برپا کر دیتا۔ اور اس غضب کی پُرجوش تقریر کرتا کہ تماشائیوں کے کانوں کے پردے پھٹ جاتے۔ مجرم و خطا کار دیوانے اور مجنوں ہو جاتے۔ بے گناہوں کے دل پر چوٹ لگتی۔ جاہل دنگ رہ جاتے۔ اور سب کی بصارت و سماعت مبتلائے حیرت ہو جاتی۔ لیکن میں کوڑھ مغز و ہم و خیال کا پُتلا ایسا ہوں کہ جو کچھ مجھ پر گزری ہے اُس سے بھی لاعلم و بے پروا ہوں۔ افسوس میری زبان بند ہے۔ اُسکے لئے جو بادشاہ ہی نہ تھا بلکہ میرا باپ بھی تھا اور جسے ایک دغاباز نے فریب اور مکاری سے جان و مال دونوں سے محروم کر دیا۔ تو کیا پھر میں بزدل ہوں؟

کیا دُنیا میں کوئی شخص ایسا ہے جو مجھے بُزدل یا نامرد کہے۔ کیا کسی کی ہمت ہے کہ میرے سر پر کوئی چیز مار کر مجھ سے کہے کہ تو نامرد و بزدل ہے۔ یا کوئی میری ڈاڑھی کے بال نوچکر انہیں اس طرح پھونک مارے کہ میرے چہرے پر اُڑ کر آئیں۔ یا میری ناک پکڑ کر ہلائے اور میرے منہ پر مجھے جھوٹا اور دروغ گو کہے۔ کیا ان باتوں کی کسی کو مجال ہوسکتی ہے۔ نہیں۔ قسم ہے مسیح کے زخموں کی کہ اس قسم کی توہین اور استہزا اگر اختیار بھی کیا جائے تو میں اسکے لائق ہوں۔ ممکن ہے کہ ایک بھولے غریب کبوتر کی طرح میری طبیعت بھی مسکین و غریب ہو۔ ورنہ مدت گزری ہوتی کہ میں اس بادشاہ کے جسم کے پرزے پرزے اور ٹکڑے ٹکڑے کرکے فضا میں اُڑتے ہوئے چیل کوّوں کو کھلا دیتا۔ یہ چچا بڑا غارتگر بدمعاش اور خونی ہے۔ دغاباز و مکار ہے۔ اپنی خطاؤں پر اُسے ذرا ندامت نہیں۔ سفاک و خون آشام ہے۔ ہائے انتقام! میں بھی کیسا گدھا ہوں۔ یہ بھی خوب بات ہوئی کہ میں جو ایک مقتول پیارے باپ کا بیٹا ہوں جسکو عرش اور دوزخ دونوں نے مل کر انتقام پر آمادہ کیا ہے وہ ایک بازاری بیسوا کی طرح عشق و محبت ظاہر کرنے میں جھوٹی باتیں بنائے یا ایک ذلیل ماما کی طرح کوسنے اور گالیاں دینے لگے۔ دیکھا گیا ہے کہ بعض وقت قاتل بیٹھے تماشہ دیکھ رہے ہیں اور تماشے میں کوئی مضمون عمداً ایسا دکھایا گیا کہ جسنے ان کے دل پر فوری اثر کیا۔ اور اُنھوں نے خود اپنے گناہ کا اقبال کرلیا۔ گو خونی کی زبان خون کرنا قبول نہ کرے مگر خون خود اپنے تئیں پکارے بغیر نہیں رہتا۔ میں ان ایکٹروں سے کہونگا کہ میرے چچا کے سامنے کوئی تماشا ایسا کریں جس میں میرے باپ کے قتل کی مثل قتل کا کوئی وقوعہ دکھایا جائے۔ میں چچا کی نظروں کو دیکھتا رہونگا۔ اور اس طرح اس کے دل میں جو کچھ اُس وقت گزریگا اس طرح معلوم کرونگا جس طرح جراح زخم میں سلائی ڈال کر فاسد مادہ کی جڑ تک پہونچ جاتا ہے۔ اگر اُس کا چہرہ متغیر ہوگیا تو پھر مجھے

سچّا حال معلوم ہو جائیگا۔ جو روح میں نے دیکھی ہے ممکن ہے وہ کوئی بھوت یا آسیب ہو۔ یا محض شیطان ہو۔ اور شیطان کے اختیار میں ہے کہ جیسی شکل چاہے بنالے۔ ممکن ہے کہ وہ شکل میرے عزیز و مہربان باپ ہی کی ہو۔ ممکن ہے کہ میرے دل کی کمزوری ہو یا چونکہ میں ہمیشہ غمزدہ و افسردہ خاطر رہتا ہوں اور شیطان ایسے آدمیوں کے ساتھ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔ شیطان ہی نے مجھے جہنم واصل کرنے کے لئے یہ تدبیر کی ہو۔ نہیں اس طریقے سے مجھے اپنے چچا کے جرم کا ثبوت بہ نسبت رُوح کے بیان کے زیادہ قوی مل جائیگا۔

(ہیملٹ چلا جاتا ہے)

جُزوِ ثالث

پہلا منظر:۔ قصرِ شاہی کا ایک کمرہ

بادشاہ۔ ملکہ۔ پلونیوس۔ اوفیلیا۔ روزنکرانٹز اور گلڈنسترن کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔

بادشاہ:۔ تو کیا گفتگو میں کوئی پہلو ایسا نہ نکال سکے جس سے معلوم ہوتا کہ شہزادے نے کیوں اپنی بھلی چنگی زندگی کو اس وحشت اور جنون سے غارت کر رکھا ہے؟

روزنکرانٹز:۔ حضور، شہزادے کو اتنا علم تو ضرور ہے کہ ان کی طبیعت دائرۂ اعتدال سے خارج ہے لیکن کیوں ایسا ہے اسکی وجہ مطلق نہیں بتاتے۔ اور نہ اسکا موقع دیتے ہیں کہ ہم اُن کی طبیعت کا ٹھیک اندازہ کر سکیں بلکہ حالتِ جنون میں بھی جب کبھی ہم نے اُنکو اس پہلو پر لانا چاہا کہ وہ اپنی اصلی حالت بیان کریں تو فوراً پلٹ گئے۔

ملکہ:۔ یہ تو بتاؤ کہ وہ تم سے اچھی طرح ملا؟

روزنکرانٹز:۔ حضور۔ ملے ایسے جیسے شریف سے شریف ملتا ہے۔

گلڈنسترن:۔ مگر ملاقات میں بھی طبیعت پر بہت زور دیکر یہ بات پیدا کی۔

روزنکرانٹز:۔ خود سوال کم کرتے ہیں لیکن جب ہم نے کچھ پوچھا تو اس کا مفصل جواب دیا۔

ملکہ:۔ تم نے کسی تفریح یا خوش کُن مشغلے کی طرف اُسے راغب کیا؟

روزنکرانٹز:۔ حضور ملکہ سلامت۔ صورت یہ پیدا ہوئی کہ چند ایکٹروں کو شہزادے نے طلب فرمایا تھا۔ جاتے ہوئے یہ ایکٹر ہمیں راہ میں ملے۔ جب ہم شہزادے کے پاس پہونچے تو ہم نے عرض کیا کہ ایکٹر آ رہے ہیں۔ اتنا سُنکر شہزادے کا چہرہ بشاش ہو گیا۔ یہ ایکٹر اس وقت محل میں حاضر ہیں اور جہاں تک میرا خیال ہے اُنکو حکم ملا ہے کہ آج شب کو وہ شہزادے کے سامنے حاضر ہو کر تماشا دکھائیں۔

پلونیوس:۔ یہ بالکل سچ ہے شہزادے نے مجھ سے کہا ہے کہ میں حضور اور ملکہ سلامت سے اُنکی طرف سے درخواست کروں کہ حضور بھی یہ تماشا دیکھیں۔

بادشاہ:۔ نہایت خوشی سے۔ مجھے یہ سُنکر مسرت ہوئی کہ شہزادہ ایسے تفریح کے جلسوں کی طرف متوجہ ہوا ہے۔ روزنکرانٹز اور گلڈنسترن ذرا شہزادے کی طبیعت کو سنبھالے رکھو اور خوشی کی باتوں کی طرف اُسے مائل کرو۔

روزنکرانٹز:۔ تعمیلِ ارشاد ہمارا فرض ہے۔

(روزنکرانٹز اور گلڈنسترن چلے جاتے ہیں)

بادشاہ:۔ پیاری ملکہ گرتز رود۔ آپ بھی اس وقت چلی جائیں تو بہتر ہو۔ ہم نے ہیملٹ کو خفیہ طور پر یہاں بلایا ہے تاکہ اُسکی ملاقات اوفیلیا سے کرائی جائے۔ اور یہ ملاقات محض اتفاقی معلوم ہو۔ اوفیلیا

کا باپ اور ہم جو جائز طریقے پر ایسے امور میں جاسوسی کر سکتے ہیں یہاں کہیں چھپ کر بیٹھیں گے تاکہ بغیر اپنے تئیں دکھائے دوسرے دوں کو دیکھیں۔ جو کچھ اُن دونوں میں باتیں ہوں اُنکو سُنکر اور اس کی حالت کو ملاحظہ کرکے تحقیق کر سکیں کہ کیا واقعی عشق اس کی موجودہ وحشت اور دماغی پریشانی کا سبب ہے یا کوئی اور بات ہے۔

ملکہ:- میں بادشاہ کا حکم بجالاتی ہوں۔ اوفیلیا سنو۔ میں سمجھتی ہوں کہ تمہارا حُسن و جمال شہزادے کو اپنی اصلی حالت پر لے آئیگا اور یہ امر دونوں کی عزت و ناموس کا موجب ہوگا۔

اوفیلیا:- حضور کے کہنے کے مطابق میری کوشش یہی رہیگی۔

(ملکہ چلی جاتی ہے۔)

پلونیوس:- اوفیلیا۔ بیٹی۔ اِدھر آؤ۔ بادشاہ سلامت حضور اور فدوی دونوں یہاں چھپ بیٹھتے ہیں۔ (اوفیلیا سے کہتا ہے) بیٹی یہ کتاب پڑھنے لگو۔ تاکہ تمہاری تنہائی کی وجہ پڑھنے میں مصروفیت معلوم ہو۔ اِس خصوص میں جیسا کہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے ہم پر یہ الزام عائد ہوتا ہے کہ ایسے گناہوں میں بھی جو خباثت میں شیطان سے کم نہیں ہوتے نیک اور پارسا بنکر اُنکو راستی اور نیکی کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔

بادشاہ:- (علیحدہ) وزیر کی یہ بات دل پر تیر سی لگی ہے افسوس ایک بیسوا کے رُخسار جنہیں رنگ لگا کر وہ حسین بناتی ہے اُن رنگوں کے مقابلے میں جن سے وہ حُسن پیدا کرتی ہے اتنے بدنما نہیں جس قدر کہ میرے گناہ کے مقابلہ میں وہ جھوٹی اور مصنوعی نیکیاں جو بھائی کے قتل کو چھپانے کے لئے کرتا ہوں، کریہہ و بدنما معلوم ہوتی ہیں، ہائے یہ کیسا بوجھ دل پر ہے۔

پلونیوس:- حضور میں شہزادے کے قدموں کی آواز سُنتا ہوں۔ بہتر ہے کہ ہم چھپ بیٹھیں (بادشاہ اور پلونیوس چھپ جاتے ہیں۔ ہیملٹ کمرے میں داخل ہوتا ہے)

ہیملٹ:- زندہ رہنا بہتر ہے یا مرجانا۔ یہی بڑا شُبہ ہے جسے رفع کرنا ہے۔ کیا شرافتِ نفس اس میں زیادہ ہے کہ تقدیر جفا کار کے سنگ و پیکاں برداشت کئے جائیں۔ یا آلام و مصائب کے بحرِ امواج کے مقابلہ پر آمادہ ہو کر اس کشمکش میں سب کچھ ختم کر دیا جائے۔ مرجانا سوجانے سے زیادہ نہیں۔ اور اس موت کی نیند سے یہ سمجھنا کہ دل کا سوز و درد اور وہ صدہا صدمے جو انسان کو لاحق ہوتے ہیں رفع ہو جائینگے اور اس بنا پر ایسی نیند کی آرزو ہر انسان کے دل میں ہونی چاہیئے۔ مرنا یا نیند کا آجانا ممکن ہے کہ اس نیند میں کچھ خواب بھی نظر آئیں اور یہی سب سے بڑی قباحت ہے۔ کیونکہ جب روح اس کالبدِ خاکی سے رُخصت ہوئی اور موت کی نیند طاری ہوئی تو پھر اس نیند میں خدا جانے کیسے کیسے خواب نظر آئیں۔ بس یہی چیز ہے جو تامل و تذبذب پیدا کرتی ہے۔ اور ہماری مصیبتوں کی زندگی دراز ہوتی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر کون ایسا ہوگا جو زمانے کی جفا کاریاں، دشمنِ سفاک کے جور و ستم، نخوت زدہ بزرگانِ ملت کی بے اعتنائیاں عدل و انصاف میں التوا کی تکلیفیں اُٹھائیگا۔ نیکو کار اور قانع نالائقوں کی سختیاں جھیلیں گے۔ جبکہ ایک چھوٹے سے تیز خنجر کو سینے میں بھونک کر اس سارے حساب کتاب سے یکلخت چھٹکارا ہو سکتا ہے۔ پھر کون ہے جو زندگی کا بوجھ اور اس بوجھ میں دبا پسینے میں غرق آہیں بھرنا پسند کریگا۔ لیکن یہ خوف کہ مرنے کے بعد کیا پیش آئیگا اور اُس اجنبی مُلک میں جس کی سرحد پر پہونچ کر آج تک کوئی مُسافر پلٹ کر گھر نہیں آیا کیا کچھ نہ بنے گی۔ بس یہی خوف ہے جو ہمارے ارادے اور ہمت کو پست کر دیتا ہے اور ہم مجبور ہوتے ہیں کہ جو تکلیفیں اس وقت پہونچ رہی ہیں اُنہیں برداشت کریں اور اُن تکلیفوں کی طرف نہ جائیں جن کا حال معلوم نہیں کہ وہ کیسی ہوں۔ غرض اسی طرح زیادہ غور و فکر کی عادت ہمارے ارادوں کو کمزور کر دیتی ہے

اور ان کے چہرے کا رنگ اُڑا کر اُن پر زردی پیدا کر دیتی ہیں۔ ہمارے دکھائی دیتے اور ہمارے بڑے بڑے بلند اور نتیجہ خیز منصوبوں کا رُخ بدل کر انکو حیطۂ عمل میں نہیں آنے دیتی (اوفیلیا پر نظر پڑتی ہی) اے دل ذرا ٹھہر۔ اے حسین لڑکی اپنی دُعاؤں میں میرے گناہوں کی معافی مانگنی بھی یاد رکھنا۔

اوفیلیا:- شہزادۂ عالی قدر، مدّت کے بعد ملنا ہوا۔ اس زمانے میں حضور کا مزاج کیسا رہا؟

ہیملٹ:- بجد عجز و انکسار سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اچھا ہوں، اچھا ہوں، اچھا ہوں۔

اوفیلیا:- تحائف اور خطوط جو حضور نے عنایت فرمائے تھے وہ میرے پاس ہیں۔ مدّت سے انتظار میں تھی کہ انہیں واپس کر دوں میری التجا ہے کہ حضور اب انہیں واپس لے لیں۔

ہیملٹ:- ہائیں۔ میں کیسے واپس لیلوں؟ میں نے تو کبھی تمہیں کچھ دیا ہی نہ تھا۔

اوفیلیا:- حضور یاد فرمائیں۔ بہت سے تحائف عطا ہوئے تھے اور تحائف ہی نہیں بلکہ اُن کے ساتھ عشق و اُلفت کے بہت سے شیریں جملے اور الفاظ بھی تھے جنہوں نے انکی قدر و قیمت اور بڑھا دی تھی۔ اب چونکہ بوئے عشق و اُلفت اُن میں نہ رہی اس لئے واپس کرتی ہوں۔ شریف طبیعتوں کے نزدیک بڑی بڑی قیمت کے تحفے اور پیشکش بھی ادنیٰ اور ارزاں ہو جاتے ہیں اگر دینے والا نامہربان ہو جائے۔ بس یہ تحائف حاضر ہیں۔ انہیں حضور واپس لیں۔

ہیملٹ:- ہا ہا۔ کیا تم نیک بخت ہو؟

اوفیلیا:- ہوں تو۔

ہیملٹ:- کیا تم حسین ہو؟

اوفیلیا:- اس سے حضور کا کیا مطلب؟

ہیملٹ:- مطلب یہ کہ اگر تم نیک اور حسین دونوں ہو تو تمہاری نیکی کو حسن سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہیئے۔

اوفیلیا:- کیا نیکی سے بھی بڑھکر کوئی چیز ہے جس سے حسن تعلق رکھ سکتا ہے؟

ہیملٹ:- ہاں سچ ہے۔ کیونکہ حسن کی قوت نیک کردار کو اتنا بدکردار بنا سکتی ہے کہ نیکی حسن کو اتنا نیک کردار نہیں بنا سکتی۔ کسی زمانے میں یہ بات خلافِ قیاس سمجھی جاتی تھی۔ لیکن اب زمانہ اسکو سچ بنا رہا ہے۔ ہاں کسی زمانے میں مجھے تم سے عشق تھا۔

اوفیلیا:- حضور نے مجھے یقین تو ایسا ہی دلایا تھا۔

ہیملٹ:- تمنے میرا یقین نہ کیا ہوتا۔ کیونکہ جب کسی بدذائقہ پھل کی شاخ میں خوش ذائقہ پھل کی شاخ کا پیوند لگاتے ہیں تو پہلے پھل کا بُرا ذائقہ اُس میں کچھ نہ کچھ قائم رہتا ہے۔ اچھا۔ مجھے تم سے کبھی عشق نہ تھا۔

اوفیلیا:- تو میں اور بھی دھوکے میں رہی۔

ہیملٹ:- تم تو کسی دیرِ راہبات میں جا رہو۔ کیونکہ باہر رہ کر سوائے گنہگار پیدا کرنے کے اور تم سے کچھ نہ ہو سکیگا۔ میں خود بھی نیک کردار نہیں۔ میں تو ایسے ایسے سخت گناہوں کا مرتکب ہوا ہوں کہ کاش میری ماں مجھکو نہ جنتی۔ میں مغرور ہوں، منتقم ہوں۔ حُبِ جاہ و مال رکھتا ہوں۔ میرے گناہ تو اتنے ہیں کہ اُن کے خیال میں تخیل اور اُنکی تشکیل میں تصوّر عاجز ہے۔ وقت میں اتنی گنجائش نہیں کہ اس میں وہ سب بیان ہو سکیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھ جیسا انسان کیوں آسمان اور زمین کے درمیان کیڑے کی طرح رینگتا پھرتا ہے۔ ہم سب بدکار اور شیطان ہیں۔ ہماری کسی بات کا یقین نہ کرو۔ اوفیلیا بہتر یہی ہے کہ تم راہبات کی کسی خانقاہ میں جا رہو۔ تمہارے والد کہاں ہیں؟

اوفیلیا:- گھر پر ہیں۔

ہیملٹ:- گھر کے دروازے بند کر دو کہ وہ باہر نہ نکلنے پائیں اور گھر سے باہر کسی دوسری جگہ احمق نہ بنیں۔ اچھا رخصت۔ تمہیں خدا کو سونپا۔

اوفیلیا:- افسوس۔ یہ کیا حالت ہو۔ خُدایا رحم کر۔ مدد کر۔

ہیملٹ:- اگر تم نے شادی کی تو شادی کے تحفے میں یہ دعائے بد تیرے حق میں کرتا ہوں کہ خواہ تو یخ کی طرح عفیف اور آسمانی برف کی طرح پاکدامن ہی کیوں نہ ہو مگر بدنامی اور تہمت سے نہ بچ سکے گی۔ جا۔ راہبات کی خانقاہ میں جا رہ اور خُدا تیرا نگہبان رہے۔ یا اگر شادی کرنی ایسی ہی ضروری ہو تو کسی احمق سادہ لوح سے کرنا کیونکہ عقلمند جانتے ہیں کہ تم عورتیں مردوں کی کیا گت بناتی ہو۔

اوفیلیا:- اے آسمان کے فرشتو۔ اِسکو پھر اپنے حواس میں لے آؤ۔

ہیملٹ:- میں نے سُنا ہے کہ تم اپنا چہرہ رنگتی ہو۔ خُدا نے تمہیں ایک چہرہ وہ بھی حسین دیا تھا مگر تم ایک نیا چہرہ اپنے لئے تیار کرتی ہو۔ تم ناچتی ہو۔ تھرکتی ہو۔ ہکلا ہکلا کر باتیں کرتی ہو۔ خُدا کی مخلوق کے نئے نئے نام رکھکر اُنہیں پکارتی ہو اپنی شرارتوں کو جہل و نادانی پہ محمول کرتی ہو۔ بس جاؤ دفع ہو۔ میں آگے کچھ نہ کہونگا۔ اسی نے مجھے دیوانہ بنایا ہے۔ سُنو۔ میں کہتا ہوں کہ اب شادیاں زیادہ نہ ہونے پائیں گی۔ جو شادیاں کر چکے ہیں ان میں بجز ایک شخص کے سب زندہ رہینگے۔ باقی جتنے ہیں وہ بغیر شادی کئے رہینگے۔ اوفیلیا جا۔ راہبات کی کسی خانقاہ میں جا رہ۔

(ہیملٹ باہر چلا جاتا ہے)

اوفیلیا:- خُدایا۔ کیسا نیک اور شریف دل اُلٹا ہو۔ جس کی نظر ایک درباری کی نظر کی طرح تیز و معاملہ فہم۔ جس کی زبان ایک عالم کی طرح فصیح۔ جس کی شمشیر ایک مردِ میدان کی تلوار کی طرح شجاعت میں یگانہ تھی۔ ماں باپ کی اُمید اور سلطنت کا سدا بہار پھول تھا۔ جامہ زیبی اور وضع تراشی میں سب کے لئے آئینہ تھا۔ وہ ایک ایسا قالب تھا جس میں سب ڈھلنا چاہتے تھے۔ دیکھنے والے اُسے دیکھا کرتے تھے۔ افسوس اب وہ کیا سے کیا ہو گیا۔ اور عورتوں میں سب سے زیادہ غمزدہ اور بدنصیب میں ہوں جس کے کانوں نے وعدہ ہائے عشق و اُلفت کے نغمے اسی طرح سُنے تھے جیسے کوئی زبان سے پھولوں کا رس چوسے۔ ہوش و حواس اور انکی سردار قوتِ مُدرکہ میں وہ فتور ہے جیسے سُریلی خوش آواز گھنٹیاں بجتے بجتے بے سُری ہو جائیں۔ ہائے۔ وہ صورت اور جوانی کا تندرست چہرہ دیوانگی اور جنون نے کیسا بگاڑ دیا۔ وائے بر حالِ من۔ پہلے کیا دیکھا تھا اور اب کیا دیکھتی ہوں۔!

(بادشاہ اور پلونیوس پھر آتے ہیں)

بادشاہ:- اِس دیوانگی کا سبب عشق ہرگز نہیں ہو سکتا جو کچھ وہ کہتا ہے گو اُس میں ربط کم ہے لیکن اُسے دیوانگی یا جنون نہیں کہہ سکتے۔ کوئی بات اُسکے دل میں ایسی جمی ہے جو نکل نہیں سکتی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اِس حالت میں جو کچھ اُس سے ہونے والا ہے وہ پُرخطر ہے۔ اِس خطرے کے تدارک کیلئے ہم نے ارادہ کیا ہے کہ شہزادے کو انگلستان اُس خراج کی وصولی کیلئے روانہ کیا جائے جو باجگزاروں نے اپنی غفلت سے ابھی تک ادا نہیں کیا۔ ممکن ہے کہ نئے نئے سمندروں اور مُلکوں اور وہاں کے عجائبات کو دیکھ کر جو خیال اُس کے دل میں جم گیا ہے اور جس پر اُس کا دماغ ہر وقت کام کرتا رہتا ہے اور جو فی الواقع اس کی دیوانگی کا سبب ہوا ہے دُور ہو جائے۔ پلونیوس تمہارا کیا خیال ہے؟

پلونیوس:- اِس تدبیر سے شہزادے کی صحت کو نفع ضرور ہوگا۔ لیکن میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ شہزادے کی دیوانگی کی ابتدا عشقِ ناکام سے ہوئی ہے۔ اوفیلیا۔ تم میں اور شہزادے میں جو باتیں ہوئی ہیں۔ بیٹی اب اُنہیں سُننے کی ہمیں ضرورت نہیں۔ وہ کُل باتیں ہم سُن چکے ہیں۔ جہاں پناہ جو حکم چاہیں دیں لیکن اگر مناسب تصور فرمائیں تو بہتر ہو کہ آج کے تماشے کے بعد شہزادے کی روانگی کا حکم صادر فرمایا جائے۔ اور شہزادے کی والدہ سے بھی ارشاد ہو کہ وہ شہزادے سے دریافت کریں کہ وہ کیا بات ہے جس کا

غم اُس کے دل میں اس طرح بیٹھ گیا ہے۔ اور اتنا اور عرض کرتا ہوں کہ ملکہ سلامت شہزادے کی اس بے اعتدالی مزاج کی وجہ صاف صاف معلوم کریں۔ ماں اور بیٹے میں جو باتیں ہونگی اُن کو میں چھپکر سُنونگا۔ اگر ملکہ سلامت کو بھی کوئی وجہ دریافت نہ ہو سکی تو پھر شہزادے کو انگلستان روانہ کردیا جائے۔ یا اگر حضور مناسب سمجھیں تو یہیں کسی مقام پر نظر بند کردیں۔

بادشاہ:۔ بلاشبہ ایسا ہی ہونا بھی چاہیئے۔ جب کوئی بڑا آدمی دیوانہ ہوجائے تو اُس کی طرف سے غفلت نہ ہونی چاہیئے۔

دوسرا منظر:۔ قصرِ شاہی کا ایک وسیع کمرہ۔

ہیملٹ اور تماشہ کرنے والے ایکٹر اندر آتے ہیں

ہیملٹ:۔ وہ تقریر جو میں نے سُنائی تھی اُسے ذرا تم بھی سُناؤ۔ مگر ادا کرنے میں روانی اور سلاست کا خیال رہے۔ لیکن اگر بُرانے ایکٹروں کی طرح تم بھی چیخنے چلاّنے تو پھر میں بہتر سمجھونگا کہ یہ تقریر کسی ڈھنڈورا پیٹنے والے کو دیدوں کہ وہ سارے میں چیختا پھرے۔ اچھا، اور تقریر جب ادا کرو تو اس طرح ہاتھ بہت نہ نچانا۔ ہر مضمون لُطف و آہستگی سے ادا ہو۔ جب دیکھو کہ تقریر کے الفاظ میں جوش و خروش حد سے گزرا ہوا ہے تو اُس وقت بھی طبیعت کو روک کر ایک طرح کا ضبط اور متانت تقریر کے ادا کرنے میں دکھانا۔ بات یہ ہے کہ جب میں کسی ہٹے کٹے ایکٹر کو دیکھتا ہوں کہ سر پر بالوں کی ٹوپی لگائے کسی پرزور تقریر میں اپنی طرف سے جوش و جذبہ بڑھا کر اُس کی دھجیاں اور پرخچے اُڑاتا ہے تو میرے دل کو سخت تکلیف پہونچتی ہے۔ ایسا بدتمیز ایکٹر اُن تماشائیوں کو جو سب سے نیچے کے درجے میں بیٹھے ہوتے ہیں غُل مچا مچا کر خوش کرتا ہے۔ اِن تماشا دیکھنے والوں کو سوائے گونگوں کے اشاروں یا ایسی تقریروں کے جن میں خوب غُل غپاڑہ ہو اور کسی بات کے سمجھنے کی تمیز نہیں۔ میرا بس چلے تو ایسے ایکٹر کو کوڑے مار کر باہر کردوں۔ تار اجنت اور ظالم ہیرود کے تماشوں میں جن میں خود غُل اور شور کثرت سے ہوتا ہے اُن میں بھی اپنی طرف سے شور و غوغا اور بڑھا دیتے ہیں۔ ایسی نامعقول حرکتوں سے تمہیں پرہیز کرنا ہوگا۔

ایکٹر:۔ سرکار جیسا حکم دیتے ہیں، غُل شور کچھ نہ ہونے پائیگا۔

ہیملٹ:۔ لیکن آواز کو بالکل ہلکا بھی نہ کردینا۔ ان باتوں میں خود تمہاری طبیعت تمہاری رہبر اور مُعلّم بن جائیگی۔ جہاں تک عبارت اجازت دے وہیں تک حرکات و سکنات سے مضمون کو بتانا۔ بنانے میں عبارت کے مطلب سے تجاوز نہ کرنا اور سب سے زیادہ خیال اس بات کا رکھنا کہ فطرت کا عکس آئینہ بنکر دکھایا جائے۔ نیکی کو نیکی کی شکل میں، بدی کو بدی کی شکل میں ظاہر کرنا۔ زمانہ کی جو حالت ہو اُسکو صحیح صورت میں سامنے لانا۔ لیکن اگر ان چیزوں کے ادا کرنے میں حد سے تجاوز کیا یا ناقص طور پر انہیں دکھایا تو حاضرین میں جو جاہل ہونگے وہ تو اس پر ہنسیں گے اور خوش ہونگے۔ لیکن جو سخن فہم اور دقیقہ سنج ہیں وہ ناخوش ہونگے اور اعتراض کریں گے۔ ایسے لوگوں کے اعتراضوں اور نکتہ چینیوں کو بہ نسبت جاہلوں کے ہنسنے اور خوش ہونے کے زیادہ باوقعت سمجھو۔ ایسے ایکٹر موجود ہیں اور جنکو میں نے تماشا کرتے دیکھا ہے۔ اِن کی لوگوں نے بہت تعریف کی۔ لیکن جن ایکٹروں کی تعریف ہوئی اُن کی نسبت بغیر اس کے کہ عامیوں کی طرح گندی زبان استعمال کروں کہہ سکتا ہوں کہ اُنکی زبان ایک باخدا عیسائی کی سی زبان نہ تھی۔ اور نہ اُن کا طور طریقہ عیسائیوں یا غیر عیسائیوں یا بازاریوں کا سا تھا۔ اسٹیج پر ان کی حرکات اتنی خلافِ فطرت تھیں اور وہ اتنا شور و غُل مچاتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ فطرت کے پیدا کردہ نہیں بلکہ کسی نو آموز مددگار کے وضع کئے ہوئے ہیں۔ وہ انسان نہیں بلکہ انسان کی ایک بھدی اور نامعقول نقل معلوم ہوتے تھے۔

پہلا ایکٹر:- حضور ہم نے اب اپنی پہلی حالت سے بہت زیادہ ترقی کر لی ہے۔

ہیملٹ:- بیشک بعض خامیاں ایسی تھیں کہ اُن کی قطعاً اصلاح ضروری تھی۔ مثلاً جو لوگ تم میں مسخرے بنتے ہیں اُنکو حکم دیا جائے کہ جہانتک ڈرامہ میں تحریر ہے اُس سے آگے نہ بڑھیں اور نہ اپنی طرف سے کوئی بات تمسخر کی اضافہ کریں۔ بعض ایکٹر ایسے ہوتے ہیں کہ اپنی ظرافت دکھانے کو بروقت کوئی ایسی بات بڑھا دیتے ہیں کہ جاہل خوب قہقہے لگائیں۔ چونکہ ڈراما کے اور مضمونوں کا خیال رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے اس لئے انکی یہ ظرافت بدنُما ہو جاتی ہے۔ اور جو نا سمجھ ایکٹر ایسا کرتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حد درجہ بے وقوف ہے۔ اچھا جاؤ۔ تماشے کی تیاری کرو۔

(ایکٹر باہر چلے جاتے ہیں۔ پلونیوس اور روزنکرانٹز اندر آتے ہیں)

پلونیوس:- حضور۔ جہاں پناہ اور ملکہ سلامت دونوں تماشہ دیکھنے تشریف لائیں گے۔ بلکہ ابھی تشریف لا رہے ہیں۔

ہیملٹ:- ایکٹروں سے کہو کہ وہ جلدی کریں۔

(پلونیوس چلا جاتا ہے)

(روزنکرانٹز اور گلڈنسٹرن سے مخاطب ہو کر کہتا ہے)

آپ دونوں صاحب بھی مدد کریں کہ تماشا جلد شروع ہو جائے۔

روزنکرانٹز }
گلڈنسٹرن } ہم ابھی جاتے ہیں اور اسکا اہتمام کرتے ہیں۔

ہیملٹ:- کیا ہوریشیو تم ہو؟

(ہوریشیو اندر آتا ہے۔)

ہوریشیو:- حضور۔ حاضر خدمت ہوں۔

ہیملٹ:- ہوریشیو۔ تم ایسے سچے اور ایماندار آدمی ہو کہ ایسے آدمی سے ملنے کا کبھی پہلے اتفاق نہیں ہوا۔

ہوریشیو:- یہ حضور کیا فرماتے ہیں!

ہیملٹ:- نہیں یہ نہ سمجھنا کہ میں نے محض تمہارے خوش کرنے کو یہ بات کہی ہے۔ کیونکہ اگر خوشامد کرتا بھی تو تمہارے پاس سوائے خوش مزاجی اور نیک سیرتی کے رکھا کیا ہے جو مجھے تم سے کسی نفع کی اُمید ہوتی۔ تمہاری یہ خوش مزاجی اور سیرت نیک ہی تمہارا کھانا پینا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اور اسکے سوا کوئی دولت نہیں۔ پھر مُفلس کی خوشامد ہی کون کرتا ہے۔ خوشامد کی شیریں زبان تو امیروں کو خوش کرنے کو ہوتی ہے جو دولت اور نامعقول شان و شوکت رکھتے ہیں۔ خوشامدی جُھک جُھک کر انہیں آداب بجا لاتے ہیں۔ دولت مند ہی خوشامدیوں کو انعام اکرام دے سکتے ہیں۔ ہوریشیو۔ دوستوں میں اچھے بُرے کی تمیز کا مادّہ جب سے مجھ میں پیدا ہوا دوستی کیلئے میں نے تمہیں منتخب کیا۔ اور تمہیں میں نے ہمیشہ اپنا سمجھا۔ کیونکہ تم ایسے شخص ہو جو زندگی کی تمام مصیبتوں کو اس طرح برداشت کرتے ہو کہ گویا وہ کوئی چیز نہیں اور تقدیر کی ضربوں اور صدموں کو صبر و شکر کے ساتھ سہتے ہو۔ اور بڑی برکت والے ہیں وہ لوگ جن میں عقل اور غصہ اعتدال کے ساتھ ہو۔ پھر اُس کا حال اس نے کا سا نہیں ہوتا کہ تقدیر نے جس پردے پر اُنگلی رکھی ویسی ہی صدا پیدا ہونے لگی کیا ایسا کوئی آدمی بنا سکتے ہو جو اپنے جذبے اور غصّے کا غلام نہ ہو۔ اگر کوئی آدمی ایسا ہے تو میں اسکو اپنے دل کے سب سے اندر کے گوشے میں جیسا کہ تم کو رکھتا ہوں رکھ لوں۔ اچھا سنو۔ یہ باتیں تو ہو لیں۔ آج شب کو بادشاہ سلامت کے سامنے ایک ناٹک ہونے والا ہے۔ اِس ناٹک میں ایک منظر ایسا آتا ہے جسکے واقعات میرے باپ کی موت کے واقعات سے جو تمہارے علم میں ہیں بہت کچھ مُشابہ ہیں پس تم سے التجا ہے کہ تم اِس تماشے کو دیکھو اور سب سے زیادہ یہ کہ میرے چچا کو خوب غور سے دیکھتے رہنا۔ تماشے میں ایک تقریر ایسی

آپ نے کہا چچا کا مخفی جرم خود اُس کے چہرے سے آشکارا ہو جائیگا۔ اگر ایسا
نہ ہو تو پھر لعنت ہے اُس سمع پر جسے ہم نے تم نے دیکھا ہے اور میرے
تصوّرات ایسے ہی گندے اور ناپاک ہیں جیسے کہ تحت الثریٰ کے
آہن گر وُلکن کی دُکان۔ تم اپنی نظر اُس پر جڑ دینا میں بھی اُسے
برابر دیکھتا رہونگا۔ پھر اُسکے قیافے سے جو جو رائے ہم اور تم قائم
کرینگے تنہا بیٹھکر اُن کا مقابلہ کریں گے۔

ہوریشیو:۔ حضور میں تو اُسے اسقدر غور سے دیکھتا رہونگا
کہ اگر تماشا ہوتے وقت وہ کوئی چیز چُرائیگا بھی تو اُسے فوراً
پکڑ لونگا۔ اگر ایسا نہ کروں تو پھر مسروقہ چیز کی قیمت دینے کو تیار
رہونگا۔

ہیملٹ:۔ دیکھو وہ بادشاہ اور ملکہ تماشا دیکھنے آرہے ہیں۔
اب میں پھر وہی بے پروائی کا انداز اختیار کرتا ہوں۔ تم اپنے
بیٹھنے کے لیے کہیں جگہ کر لو۔

(باجے بجتے ہیں۔ بادشاہ، ملکہ، پلونیوس،
اوفیلیا، روزنکرانز، گلڈنسٹرن، اور اور لوگ
آتے ہیں)

بادشاہ:۔ کہو شہزادے، تمہارا مزاج کیسا ہے؟

ہیملٹ:۔ خوب ڈٹ کر کھاتا ہوں۔ گرگٹ کی طرح میری غذا
بھی ہوا ہے اور وعدوں پر گزر رہے جو ہوا سے کم نہیں جس غذا
پر میں پرورش پا رہا ہوں اُس پر تو ایک مُرغی کا بچہ بھی نہیں پل
سکتا۔

بادشاہ:۔ ہیملٹ۔ تمہاری یہ باتیں میرے سوال کا جواب
نہیں۔ میں نے تمہارا مزاج پوچھا تھا۔ نہ یہ کہ تم کھاتے کیا ہو۔
یہ میرا سوال ہی نہ تھا۔

ہیملٹ:۔ اور نہ اب وہ میرا جواب ہے۔ (پلونیوس سے کہتا ہے)
ایک مرتبہ تم نے کہا تھا کہ طالب علمی کے زمانے میں تم بھی تماشا
کیا کرتے تھے۔

پلونیوس:۔ ہاں حضور تماشا کرتا تھا اور اچھا ایکٹر سمجھا جاتا تھا۔

ہیملٹ:۔ تم کیا بنا کرتے تھے؟

پلونیوس:۔ میں جولیس سیزر بنا کرتا تھا۔ قصر کیپیٹول میں قتل ہوا۔
بروٹس میرا قاتل تھا۔

ہیملٹ:۔ یہ اُس کا ظلم تھا کہ ایسے موٹے تازے بچھڑے کو اُس نے
ذبح کر ڈالا۔ کہو ایکٹر تماشا کرنے کو تیار ہیں؟

روزنکرانز:۔ حضور کے حکم کے منتظر ہیں۔

ملکہ:۔ پیارے ہیملٹ یہاں آکر میرے پاس بیٹھو۔

ہیملٹ:۔ نہیں امّاں۔ یہاں ایک اور بھی دلکش چیز موجود ہے۔

پلونیوس:۔ (بادشاہ سے) حضور نے خیال فرمایا۔ شہزادے
صاحب کیا فرماتے ہیں۔

ہیملٹ:۔ (اوفیلیا سے) بیگم۔ کیا میں آپکی گود میں بیٹھ جاؤں؟
(اتنا کہہ کر اوفیلیا کے قدموں میں بیٹھ جاتا ہے)

اوفیلیا:۔ بھلا حضور یہ کیسے ہوسکتا ہے۔

ہیملٹ:۔ نہیں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ کیا اپنی پیٹھ تمہارے
گھٹنوں سے لگا کر بیٹھ جاؤں۔

اوفیلیا:۔ اِس وقت حضور کی طبیعت بشاش ہے۔

ہیملٹ:۔ کیا میری طبیعت کو پوچھتی ہو؟

اوفیلیا۔ حضور۔

ہیملٹ:۔ اے خدایا! نہیں۔ میں تو ایک شاعر ظرافت اور
تمسخر کے اشعار لکھنے والا ہوں۔ انسان کو سوائے خوش رہنے
کے کام ہی کیا ہے۔ دیکھو میری ماں کیسی خوش نظر آرہی ہیں۔
گو میرے باپ کو مرے ہوئے صرف دو گھنٹے ہوئے۔

اوفیلیا:۔ نہیں حضور، چار مہینے گزر چکے۔

ہیملٹ:۔ ہائیں کیا اتنے دن ہوگئے تو کیا یہ سیاہ کپڑے
جواب تک پہنتا ہوں اُتار کر شیطان کے حوالے کردوں کہ اب
ماتمی لباس وہ پہنے۔ خُدایا۔ مرے ہوئے دو مہینے گزر گئے اور ابتک

اُس کی یاد دل سے نہیں گئی۔ اس سے اُمید ہوسکتی ہے کہ کسی بڑے آدمی
کے مرنے پر اُس نصف سال تک یاد رکھا جاسکتا ہے۔ اور اس مدّت
میں ضرورت ہوگی کہ اُس کی یادگار میں گرجا تعمیر کئے جائیں۔ ورنہ
سب اسکو اس طرح بھول جائیں گے جیسے کہ کاٹ کے ناچنے گھوڑے
کو جسکا ذکر گیتوں میں آیا ہے بھول جاتے ہیں۔

(چوبی نفیریں بجتی ہیں۔ گونگے تماشے والے تماشا
دکھاتے ہیں۔)

تماشے میں ایک بادشاہ اور اُس کی ملکہ آپس میں بہت
ہی پیار اخلاص دکھاتے ہوئے آتے ہیں۔ ایک کا ہاتھ
دوسرے کے ہاتھ میں ہے۔ ملکہ بادشاہ کو زمین تک
جھک کر تعظیم دیتی ہے۔ بادشاہ اُسے اُٹھاتا ہے اور اپنا
سر ملکہ کے سینے پر رکھتا ہے۔ اور اسی حال میں پھولوں کی
سیج پر بیٹھ جاتا ہے۔ ملکہ یہ دیکھکر کہ بادشاہ سو
گیا ہے اس کے پاس سے چلی جاتی ہے۔ اتنے میں
ایک آدمی آتا ہے۔ سوتے بادشاہ کے سر سے تاج اُتار کر
اُسے بوسہ دیتا ہے۔ یہ آدمی اب بادشاہ کے کانوں میں
زہر ڈالتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ ملکہ آتی ہے۔ دیکھتی
ہے کہ بادشاہ مرا پڑا ہے۔ بہت روتی پیٹتی ہے۔
اب زہر دینے والا چند گونگے تماشا کرنے والوں کے
ہمراہ آتا ہے۔ لوگ آکر بادشاہ کی لاش اُٹھا لے
جاتے ہیں۔ زہر دینے والا ملکہ کو بڑی بڑی قیمتی چیزیں
پیش کرتا ہے۔ ملکہ پہلے انکار کرتی ہے لیکن تھوڑے
سے تامل کے بعد آخر کار اُسکے تحائف قبول کر لیتی ہے۔

(تماشا دکھا کر ایکٹر چلے جاتے ہیں۔)

اوفیلیا:۔ شہزادہ والا قدر اس تماشے سے کیا مطلب ہوا۔

ہیملٹ:۔ اس سے مطلب در پردہ شرارت یعنی خالص شرارت ہے۔

اوفیلیا:۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شروع کا حصہ پورے تماشے کا خلاصہ ہے۔

(تماشے کا خلاصہ بیان کرنے والا آتا ہے)

ہیملٹ:۔ تماشے میں جو کچھ ہونے والا ہے وہ چھپا نہیں رہ سکتا۔
ایکٹر خود اس کی سب باتیں ظاہر کر دیں گے۔

اوفیلیا:۔ کیا یہ آدمی جو اسٹیج پر آیا ہے کُل حال تماشے کا پہلے
سے بتا دے گا؟

ہیملٹ:۔ ہاں۔ کوئی تماشا جو تم دکھاؤگی اگر اُس کے دکھانے میں
شرماؤ گی نہیں تو پھر وہ بھی قصّے کا مطلب بیان کرنے میں نہ شرمائیگا۔

اوفیلیا:۔ اس طرح حد سے نہ گزریئے۔ مجھے تماشا دیکھنے دیجئے۔

خُلاصہ گو:۔ ہم اپنے لئے اور اس درد انجام تماشے کے لئے آپکی
توجہ و مہربانی کے خواستگار ہیں۔ اور اُمید کرتے ہیں کہ حاضرین جلسہ
اس تماشے کو صبر کے ساتھ دیکھیں گے۔

ہیملٹ:۔ یہ تماشے کا خُلاصہ ہوا یا وہ مختصر عبارت ہوئی جو
انگوٹھی کے اندر کے رُخ کندہ کی جاتی ہے۔

اوفیلیا:۔ یہ بیان تو بہت ہی مختصر ہے۔

ہیملٹ:۔ ایسا ہی مختصر ہے جیسے مرد کے ساتھ عورت کا عشق۔

(تماشا کرنے والے آتے ہیں۔ ایک بادشاہ بنا
ہے اور دوسرا ملکہ۔)

ایکٹر بادشاہ:۔ سورج دیوتا کا رتھ پورے تیس مرتبہ خطّے
بحر نیپتون کی قلمرو اور اس گول زمین کے گرد چکر لگا چکا ہے اور
ماہتاب اپنے نورِ مستعار میں چمکتا تین سو ساٹھ مرتبہ زمین کے گرد
گردش کر چکا ہے۔ یہ زمانہ وہ ہے کہ رشتۂ عشق و الفت میں
ہمارے دل منسلک تھے اور پھر شادی ہوجانے سے ہم تن واحد
ہوگئے۔

ایکٹر ملکہ:۔ اتنی ہی گردشیں آفتاب و ماہتاب اور کریں پیشتر
اس سے کہ ہمارا عشق ختم ہو لیکن افسوس! کچھ زمانے سے تم کچھ
ایسے بیمار و ناخوش اور اپنی پہلی حالت سے بدلے ہوئے رہتے ہو
کہ اب تم پر مجھے اعتبار نہیں رہا۔ گو اعتبار نہ ہو مگر اس سے تمہارا

دل بے چین نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ عورت کے عشق ۔ خون کی یہ خاصیت ہے کہ یا تو وہ ہوتا ہی نہیں اور اگر ہوتا ہے تو بیحد۔ اِس کا ثبوت تمہیں مل چکا ہے کہ مجھے تم سے کسقدر زیادہ عشق ہے۔ یہی افراطِ عشق میرے خوف کا اندازہ بھی بتاتا ہے۔ کیونکہ جن دو دلوں میں عشق زیادہ ہوتا ہے وہاں ذرا سے شبہ میں خوف بھی بے انتہا پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جہاں تھوڑا سا خوف بھی شروع ہو کر زیادتی اختیار کرے وہاں عشق کی افراط کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے۔

ایکٹر بادشاہ:۔ حقیقت یہ ہے کہ پیاری اب میں تم سے جدا ہوتا ہوں۔ مفارقت اب جلد پیش آتی معلوم ہوتی ہے جیسے اعضائے رئیسہ اپنا فعل ترک کرتے جاتے ہیں۔ میرے بعد تم اِس خوش نما اور حسین دُنیا میں زندہ رہوگی۔ سب تم سے محبت کریں گے اور تمہاری عزت کریں گے اور کیا عجب ہے کہ مجھ جیسا مہربان شوہر بھی کوئی تمہیں مل جائے۔

ایکٹر ملکہ:۔ بس ایسی باتیں نہ کرو۔ وہ عشق جو دوبارہ شادی پر مجبور کرے وہ میرے لئے ایک دھوکا اور فریب ہوگا۔ لعنت ہو مجھ پر جو میں دوسرا شوہر کروں۔ کوئی عورت تاوقتیکہ پہلے شوہر کی قاتل نہ ہو دوسرا شوہر نہیں کرتی۔

ہیملٹ:۔ یہ الفاظ تو بادشاہ کو نہایت تلخ گزرے ہونگے۔

ایکٹر ملکہ:۔ کوئی عورت جب دوسری شادی کرتی ہے تو اس کا سبب سچا عشق نہیں ہوتا بلکہ کسی نفع کی خواہش ہوتی ہے۔ اگر دوسرے شوہر کے بستر پر بوس وکنار کیا تو گویا میں نے اپنے شوہر کو دوبارہ جان سے مارا۔

ایکٹر بادشاہ:۔ جو کچھ اِس وقت زبان سے کہتی ہو خدا کرے کہ اُس پر عمل بھی رہے لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس بات کا ہم قصد کرتے ہیں بعد کو اُس سے پھر جاتے ہیں۔ نیک ارادوں کا پورا ہونا زیادہ تر ہماری یاد پر منحصر ہوتا ہے۔ نیک ارادے پیدا جلد ہوتے ہیں مگر وہ دیرپا نہیں ہوتے۔ اور جب تک وہ پختہ ہوں اِس طرح رہتے ہیں جس طرح کچا پھل درخت کی شاخ پر رہتا ہے لیکن جب پختہ ہو جاتے ہیں تو بغیر شاخ کو ہلائے خود گر جاتے ہیں۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم ایسے وعدوں کا ایفا کرنا بھی فراموش کر دیتے ہیں جو ہم نے خود اپنے دل سے کئے تھے اور جب حالتِ جوش و جذب میں کسی بات کا ارادہ کرتے ہیں تو جب وہ جوش وجذبہ جاتا رہتا ہے تو وہ ارادہ بھی معطل ہو جاتا ہے۔ خوشی یا رنج کی شدت جوش و خروش کو زائل کر دیتی ہے اور اس کے ساتھ وہ ارادے بھی زائل ہو جاتے ہیں جو اس جوش و خروش کی حالت میں کئے تھے۔ جب خوشی انتہا سے زیادہ ہوتی ہے تو اُس کے بعد رنج و تکلیف کا شدت سے آنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ خوشی میں رنج اور رنج میں خوشی خفیف اسباب سے پیدا ہو جاتی ہے۔ دُنیا کو ہمیشگی نہیں۔ اور اس پر کیا تعجب ہو سکتا ہے اگر ہمارا عشق بھی ہماری زندگی کے اور سرمایوں کی طرح تبدیل ہو جائے۔ یہ سوال ابھی تک حل نہیں ہوا کہ عشق دولت سے متاثر ہوتا ہے یا دولت عشق سے۔ جب کوئی بڑا آدمی بگڑتا اور تباہ ہوتا ہے تو تم نے دیکھا ہوگا کہ اُس کے عزیز اور دوست اُس سے کس طرح کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ اور جب کوئی تنگدست متمول ہو جاتا ہے تو پھر اُس کے دشمن بھی دوستی کا دم بھرنے لگتے ہیں۔ آج تک تو یہی ثابت ہوا ہے کہ عشق و اُلفت کا دار و مدار دولت و مال پر ہے۔ جو شخص دُنیا کی دولت سے محتاج نہیں وہ دوست سے بھی محروم نہیں رہتا لیکن جب وہی شخص محتاج ہو جاتا ہے اور کسی دوست سے مدد چاہتا ہے تو اس کوشش میں اُسے فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ دوست ظاہری دوست تھا، فی الواقع وہ اُس کا دشمن تھا۔ لیکن اِس گفتگو کو جس ربط و التزام سے شروع کیا تھا اگر اُسی اہتمام کے ساتھ اُسے ختم کیا جائے تو کہنا پڑیگا کہ ہماری خواہشیں ہمارے اصلی مفہوم سے اِس درجہ مختلف ہوتی ہیں کہ ہمارے تمام منصوبے اور

تدبیریں ہمیشہ بیکار ثابت ہوتے ہیں کیسی بات کو سوچنا ہمارا کام ہے لیکن اُس سے جو نتیجہ پیدا ہونے والا ہو وہ ہمارے بس کا نہیں۔ اِس وقت تم کہہ رہی ہو کہ میں دوسرا شوہر نہ کرونگی لیکن یہ خیال پہلے شوہر کے مرتے ہی جاتا رہے گا۔

ایکٹر ملکہ:- زمین سے اَن اور آسمان سے اُجالا، دن کا چین اور رات کی نیند نصیب نہ ہو۔ دل اور ایمان کی تقویت نااُمیدی اور مایوسی میں تبدیل ہوجائے جو میں دوسرا شوہر کروں۔ اور اگر ایسا کروں تو میری خوشی اور راحت کا سامان صرف اتنا رہجائے کہ ایک تنہا راہبہ کی طرح میں اپنی ساری عمر قید خانے میں کاٹوں۔ خوشی اور آرزو کی مٹانے والی چیزیں آئیں اور میری ہر خوشی اور آرزو کو مٹا دیں۔ خُدا مجھکو اس دُنیا اور عاقبت دونوں میں ہمیشہ رنج و عذاب میں رکھے جو ایک مرتبہ بیوہ ہونے کے بعد میں سُہاگن بنوں۔

ہیملٹ:- اگر اب بھی اپنے قول سے پھریں تو پھر کیا؟

ایکٹر بادشاہ:- اچھا تو تم قسم کھاؤ کہ میرے مرنے پر پھر شادی نہ کرو گی۔ اچھا پیاری بیوی۔ تھوڑی دیر کو مجھے اکیلا پڑا رہنے دو۔ طبیعت بہت سُست ہی۔ چاہتا ہوں کہ دن سو کر کاٹوں۔

ایکٹر ملکہ:- خُدا کرے کہ نیند آکر تمہیں چین آجائے اور ہم دونوں میں کبھی مفارقت نہ ہو۔

ہیملٹ:- (ماں سے) اماں۔ یہ تماشا کچھ آپکو پسند آیا؟

ملکہ:- میرے خیال میں تو ملکہ کی تقریر میں مبالغہ زیادہ ہی۔

ہیملٹ:- لیکن سوال تو یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہتی ہی اُس پہ پختہ بھی رہے گی؟

بادشاہ:- شہزادے کیا تم اِس قصّے کو پہلے سُن چکے ہو۔ اِس میں کوئی بات ناگوار یا تکلیف دہ تو نہیں آتی؟

ہیملٹ:- نہیں حضور۔ یہ سب باتیں تو ہنسی مذاق میں ہو رہی ہیں اور ہنسی ہنسی میں ایکنے دوسرے کو زہر بھی دیدیا ہی۔ دُنیا کے نزدیک تو اس میں کوئی امر ناگوار یا تکلیف دہ نہیں ہوا۔

بادشاہ:- اِس تماشے کا نام کیا ہے؟

ہیملٹ:- جہاں پناہ۔ اِس کا نام "موُشدان" ہے۔ اور اگر حضور یہ پوچھیں کہ ایسا نام کیوں رکھا گیا تو اُسکو محض ایک طرز بیان سمجھنا چاہیئے۔ یہ تماشا ایک وقوعہ قتل کی محض نقل ہے جو شہر وانیا میں پیش آیا تھا۔ مقتول ایک بڑا رئیس تھا جسکا نام گونزاگو تھا۔ اور اُس کی بیوی کو باپتستی کہتے تھے۔ اب یہ دونوں آنیوالے ہیں۔ لیکن حضور کو اور مجھکو اس سے کیا؟ ہمارے دل اور قلب تو بالکل پاک صاف ہیں کیسی تھکے ہارے ٹٹو کی طرح ہماری گردن زخمی نہیں ہی کہ گردنی پڑتے ہی ہمیں تکلیف ہو۔ ہم سے کونسی خطا ہوئی ہی۔

(لوسی نیاس داخل ہوتا ہے)

اِس شخص کا نام لوسی نیاس ہے اور یہ تماشے والے بادشاہ کا بھتیجا ہوتا ہے۔

اوفیلیا:- شہزادے صاحب آپ تو پورے نقّاد ہوگئے کہ تماشے میں جو کچھ گزرتا ہے اس کے ہر پہلو کو خوب سمجھاتے ہیں۔

ہیملٹ:- یہ تو یہ۔ اگر تم میں اور تمہارے عاشق میں دو کٹھ پتلیوں کی طرح لڑائی ہو پڑے تو میں تم دونوں کی تقدیر کا حال کہ کیا پیش آنے والا ہے بتا سکتا ہوں۔

اوفیلیا:- اِس گفتگو میں مطلب تو ہے مگر اخلاق نہیں۔

ہیملٹ:- بس حالت بُری ہو یا بھلی، جاؤ اور اپنے شوہروں کے ساتھ رہو۔ قاتل چہرے بہت بنا چُکا۔ بس اب اپنا کام شروع کر۔ دوزخ کا پرندہ انتقام کیلئے بھیانک آواز میں بول رہا ہے۔

لوسی نیاس:- ارادہ سیاہ کاری کا ہے۔ ہاتھ قوی ہیں۔ زہر تیز ہے، وقت مناسب اور ہلاکت کیلئے اچھا ہے۔ کوئی آدمی بھی قریب نہیں ہے۔ او رے زہر قاتل جسے اندھیری رات میں بوٹیاں چُن کر اور تین بار اُن پر ہلاکت کا منتر پڑھکر تیار کیا ہے، اپنی سگونہ سمیّت کا اثر ایک بھلی چنگی جان کو غارت کرکے دکھا، سوتے آدمی کے

یں زہر ڈالتا ہے)

لمٹ :- جہاں پناہ۔ دیکھئے۔ قاتل حصولِ جاہ و مال کیلئے کس طرح
غ میں چپکے سے آکر سوتے آدمی کے کان میں زہر ڈالتا ہے۔ اس
تے ہوئے آدمی کا نام گونزاگو ہے۔ مشہور قصہ ہے اور بڑی
بزہ اطالوی زبان میں لکھا گیا ہے۔ اب حضور آگے ملاحظہ فرمائینگے
قاتل کس طرح گونزاگو کی بیوی سے عشق پیدا کرتا ہے۔

فیلیا :- دیکھئے۔ بادشاہ سلامت تخت سے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

لمٹ :- جھوٹ موٹ کی آگ سے ڈر گئے۔

لمہ :- جہاں پناہ۔ مزاج کیسا ہے؟

نیوس :- تماشا بند کر دیا جائے۔

شاہ :- روشنی لاؤ۔

ب پکارتے ہیں :- روشنی لاؤ۔ روشنی لاؤ۔

لمٹ :- آہوانِ صحرا میں جو زخمی ہوا وہ جھاڑیوں میں جا چھپا۔
زخمی نہیں ہوا وہ چوکڑیاں بھرتا پھرتا ہے۔ اِس تدبیر میں پوری
بیابی، ٹوپی میں بہت سے پَر، پاپوش میں گلاب کے پھول لگے کیا اس
ند کے لئے کافی نہیں ہیں کہ مجھے اس کمپنی میں حصّہ دار بنا یا جائے۔

ورشیو :- پورے نہیں تو آدھے حصّہ دار تو ضرور بنائے جائینگے۔

یملٹ :- نہیں پورا حصّہ دار۔ اے میرے نہایت عزیز دوست
ہیں معلوم ہے کہ یہ سلطنت ایک ایسے بادشاہ سے محروم ہوئی ہے
شکل و صورت میں خدائے جوپیٹر سے مشابہ تھا۔ اور اب اس کی
بگہ تخت پر ایک "موز" بیٹھا ہے۔

ورشیو :- حضور قافیہ کا لحاظ کرکے "گدھا" فرمایا ہوتا۔

یملٹ :- میرے اچھے ہورشیو۔ ایک ہزار اشرفیوں کی شرط سہی
وح نے جو کچھ کہا تھا وہ بالکل سچ تھا۔ بادشاہ کی حالت تم نے دیکھی۔

ورشیو :- حضور حالت اچھی طرح دیکھی۔

یملٹ :- جس وقت زہر دینے کی باتیں ہو رہی تھیں۔

ورشیو :- بادشاہ کی کیفیت میں نے بغور دیکھی تھی۔

ہیملٹ :- آؤ آؤ۔ بانسریاں بجانے والے آگئے۔ بادشاہ نے اگر تماشا
پسند نہیں کیا تو پسند نہ آیا ہوگا۔ چلو بانسریاں تو سُنیں۔

(روزنکرانز اور گلڈنسٹرن پھر آتے ہیں)

گلڈنسٹرن :- حضور، شہزادہ والا قدر۔ صرف ایک بات عرض
کرنے کی اجازت دیجئے۔

ہیملٹ :- بات کیسی۔ پوری کتاب پڑھ ڈالیئے۔

گلڈنسٹرن :- حضور۔ بادشاہ سلامت۔

ہیملٹ :- کیوں خیر باشد۔ بادشاہ سلامت کو کیا ہوا؟

گلڈنسٹرن :- جہاں پناہ خلوتکدہ میں تشریف لیگئے ہیں اور
وہاں طبیعت بہت ناساز ہو گئی ہے۔

ہیملٹ :- کیا شراب زیادہ پی لی؟

گلڈنسٹرن :- نہیں حضور، مزاج سخت برہم ہے۔

ہیملٹ :- بہتر ہوتا کہ یہ شکایت کسی شاہی طبیب سے بیان کی جاتی۔
مجھ سے کہنے سے کیا حاصل؟ اگر میں نے اِس برہمی مزاج کا کچھ علاج
کیا تو طبیعت اور بگڑ جائیگی۔ میری تجویز اخلاقی تنقیہ ہوگا جس سے
صفرے کی شدت ہوگی اور مزاج اور نادرست ہو جائیگا۔

گلڈنسٹرن :- حضور گفتگو ایسی کریں جس کے کچھ معنی ہوں میرے
سوال کو ٹالیں نہیں۔

ہیملٹ :- اچھا جناب میں کچھ بولتا ہی نہیں۔ آپکو جو کچھ کہنا ہو کہیں۔

گلڈنسٹرن :- ملکہ سلامت یعنی حضور کی والدہ نہایت پریشان
اور سراسیمہ ہیں اور اِسی حال میں اُنھوں نے مجھے آپ کی خدمت
میں بھیجا ہے۔

ہیملٹ :- آپکی تشریف آوری باعثِ عزت ہوئی۔

گلڈنسٹرن :- شہزادہ عالی انتساب۔ حضور کا یہ لطف و کرم
صحیح قسم کا نہیں ہے۔ اگر جناب والا مجھے کوئی معقول جواب دیں تو
میں آپکی والدہ کا حکم عرض کروں ورنہ معافی طلب کرکے واپس جاؤں
اور یہ معاملہ ختم ہو۔

ہیملٹ:- جنابِ والا۔ میں آپکو کوئی معقول جواب نہیں دے سکتا۔ مزاج اِس وقت میرا صحیح نہیں ہے۔ اس میں خواہ آپ جواب طلب کرتے ہوں یا جیسا کہ آپ فرماتے ہیں میری والدہ جواب مانگتی ہوں بس زیادہ گفتگو غیر ضروری ہے۔ مطلب کی بات کہیئے۔ اچھا تو بیان کیجئے کہ میری والدہ نے کیا فرمایا ہے ؟

روزنکرانٹز:- حضور وہ فرماتی ہیں کہ آج جو کچھ تم نے کیا اُسنے مجھے سخت حیرت اور تعجّب میں ڈالا۔

ہیملٹ:- ارے عجیب غریب فرزند جو اپنی ماں کو ایسی حیرت میں ڈالے۔ اِس تعجّب اور حیرت کے بعد کچھ اور بھی فرمایا ؟ اگر کچھ کہا ہو تو بتاؤ۔

روزنکرانٹز:- وہ خوابگاہ میں جانے سے پہلے آپ سے تنہائی میں کچھ گفتگو کرنا چاہتی ہیں۔

ہیملٹ:- ایک امّاں نہیں اگر دس امائیں ہوں تو میں اُن کے حکم کی تعمیل کرونگا۔ فرمایئے۔ کچھ اور بھی کہنا ہے ؟

روزنکرانٹز:- ایک زمانہ تھا کہ حضور مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔

ہیملٹ:- قسم ہے اِن چور اور اُٹھائی گیرے ہاتھوں کی۔ یہی حال میرا اب تک ہے۔

روزنکرانٹز:- مہربان شہزادے۔ بتایئے کہ آپکی شوریدہ مزاجی کی اصلی وجہ اور حقیقت کیا ہے ؟ اگر آپ اپنے رنج اور صدمے کی اصلی وجہ بیان نہ کرینگے تو اندیشہ ہے کہ آپ اپنی آزادی میں مخل ہونگے۔

ہیملٹ:- بھائی جان! بڑی وجہ یہی ہے کہ میں بادشاہ نہیں ہوا۔

روزنکرانٹز:- یہ کس طرح ممکن ہے جبکہ بادشاہ سلامت خود فرما چکے ہیں کہ اُن کے بعد ڈنمارک کے تاج و تخت کے مالک آپ ہونگے۔

ہیملٹ:- بجا ہے۔ یہ بھی وہی مثل ہوئی کہ جبتک گھاس جنگل میں اُگیگی۔ آگے آگے جو کچھ آتا ہے وہ ایک ماندہ اور فرسودہ خیال ہے۔

(ایکٹر بانسری بجانیوالوں کے ہمراہ آتے ہیں۔)

آہاہا۔ بانسری بجانے والے آگئے۔ مجھے بھی ایک بانسری دو۔ (اتنا کہکر ہیملٹ ایک بانسری والے سے بانسری لے لیتا ہے) اچھا گلڈنسٹرن رُخصت ہونے سے پہلے مجھے تم سے یہ کہنا ہے کہ کیوں تم مجھے ایک شکرہ باز کی طرح شکار کی ہوا لیکر دام کی طرف بیجاتے ہو ؟

گلڈنسٹرن:- فرضِ منصبی نے اِس طرح آزادی کے ساتھ حضور سے گفتگو کرنے پر مجبور کیا ہے۔ یہ میری محبت ہے جس نے مجھے اتنا گستاخ بنایا ہے۔

ہیملٹ:- میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ اچھا ذرا اس بانسری کو تو بجاؤ۔

گلڈنسٹرن:- حضور مجھے بانسری بجانی نہیں آتی۔

ہیملٹ:- نہیں میں بہت عاجزی سے کہتا ہوں کہ ذرا اسکو بجاؤ تو۔

گلڈنسٹرن:- حضور یقین فرمائیں کہ میں بانسری بجانا مطلق نہیں جانتا۔

ہیملٹ:- نہیں میں منّت سے کہتا ہوں کہ ذرا اِسے بجاؤ تو۔

گلڈنسٹرن:- حضور میں سچ عرض کرتا ہوں کہ بانسری بجانا میں مطلق نہیں جانتا۔

ہیملٹ:- اِس کا بجانا تو اتنا آسان ہے جیسے جھوٹ بولنا۔ نَے کے اِن سُوراخوں پر اُنگلیاں اور انگوٹھا رکھو۔ ایک سرے کو مُنہ میں لیکر پھونکو۔ پھر دیکھو کہ کیسی دلکش صدا اُس سے نکلتی ہے۔ دیکھو یہ سُوراخ یا پردے ہیں۔

گلڈنسٹرن:- حضور۔ مجھے مطلق واقفیت نہیں کہ کس راگ کے پیدا کرنے کیلئے کن پردوں پر اُنگلیاں دوڑانی پڑتی ہیں۔

ہیملٹ:- اچھا دیکھو۔ تم مجھے کسقدر نالائق سمجھتے ہو۔ تم مجھے بجانے کو تو تیار ہو گئے۔ اور ظاہر کرنے لگے کہ مجھے بجانے کیلئے تو جن پردوں پر اُنگلیاں دوڑانی پڑتی ہیں وہ تمہیں معلوم ہیں میرا رازِ دل تو

نیچے سُروں سے لیکر اوپر کے سُروں تک مجھے بجا کر دریافت کرنا چاہتے ہو۔ اِس تھوڑی سی عمر کے سازِ ہستی میں لحنہائے خوش و نغمہ ہائے دلکش بھرے پڑے ہیں لیکن افسوس تم مجھے بجا کر انہیں نہیں سُن سکتے۔ بہ سوگندِ مسیح۔ کیا تم واقعی سمجھتے ہو کہ مجھے بجانا اس بانسری کے بجانے سے آسان ہے؟ جس ساز کا نام لیکر چاہو مجھے پکارو۔ تم مجھے غصّہ دلا سکتے ہو لیکن مجھے بانسری کی طرح بجا کر میرے دل کا حال معلوم نہیں کر سکتے۔

(پلونیوس اندر آتا ہے)

خدا نگہبان پلونیوس۔

پلونیوس:۔ ملکہ سلامت حضور کو یاد فرما رہی ہیں اور فوراً کچھ بات کرنا چاہتی ہیں۔

ہیملٹ:۔ اے وزیرِ باتدبیر۔ آپ ذرا آسمان کی طرف تو دیکھیں کیا وہ بادل بالکل اونٹ کی شکل نہیں ہے۔

پلونیوس:۔ واللہ! بالکل اُونٹ معلوم ہوتا ہے۔

ہیملٹ:۔ نہیں میں سمجھتا ہوں کہ اسکی شکل بالکل نیولے کی سی ہے۔

پلونیوس:۔ حضور دُرست ہے۔ پیٹھ تو ایسی ہی اونچی کئے ہے جیسے نیولا ہو۔

ہیملٹ:۔ نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ اس کی شکل وہیل مچھلی کی سی ہے۔

پلونیوس:۔ حضور بجا ہے۔ بالکل وہیل مچھلی معلوم ہو رہا ہے۔

ہیملٹ:۔ تو پھر اچھا۔ دیکھا جائیگا۔ امّاں کے پاس بھی کبھی آ رہینگے۔ (علیحدہ کہتا ہے) یہ لوگ مجھے حد سے زیادہ احمق بناتے ہیں۔ (پلونیوس سے) کچھ جلدی نہیں ہے۔ میں امّاں کے پاس کبھی نہ کبھی پہونچ رہونگا۔

پلونیوس:۔ تو حضور کیا میں جا کر ملکہ سلامت سے یہی عرض کردوں؟

ہیملٹ:۔ اتنا کہنا کہ میں امّاں کے پاس کبھی نہ کبھی پہونچ رہونگا۔

کونسی مشکل بات ہے۔ (پلونیوس چلا جاتا ہے) دوستو۔ اس وقت مجھے معاف کرو۔ میں تنہائی چاہتا ہوں۔ (سوائے ہیملٹ کے سب چلے جاتے ہیں)

رات کا یہ وقت وہی ہے جو جادو اور سحر کرنے کیلئے ہمیشہ سے اچھا مانا گیا ہے۔ یہی وقت ہے کہ قبریں اپنا دہن کھول دیتی ہیں تاکہ روحیں نکل کر دُنیا میں گشت لگائیں۔ دوزخ سے دُنیا پر آفات نازل ہوں۔ تو کیا میں بھی اس وقت گرم جیتا خون پیئوں اور کوئی ایسا سخت کام کروں جسے دن بھی دیکھکر سہم جائے لیکن خاموش۔ اس وقت مجھے اپنی ماں کے پاس جانا ہے۔ اے دل، ماں اور فرزند میں جو تعلق فطرت نے رکھا ہے اس سے نہ ہٹ جانا۔ بادشاہ نیرو جس نے اپنی ماں کو قتل کیا تھا اس کی مثال کی پیروی نہ ہو۔ زبان سے البتہ جو جُملے نکلیں گے وہ خنجر بُرّاں کا کام دینگے۔ زبان خنجر بنے گی مگر دل اور زبان مُنافق رہیں گے۔ دل گو زبان کی تائید کرنا معلوم ہوگا لیکن زبان جو کچھ کہے گی اس پر دل عمل نہ کرے گا۔

تیسرا منظر۔ شاہی محل کا ایک کمرہ۔

بادشاہ، روزنکرانز اور گلڈنسٹرن اندر آتے ہیں

بادشاہ:۔ میں شہزادے کو اب پسند نہیں کرتا اور یہ بات کسی طرح ہماری سلامتی کیلئے مفید نہیں ہو سکتی کہ اُسے اِس حالتِ دیوانگی میں یونہی آزاد رہنے دیا جائے۔ بس تیاری کرو۔ میں نیابت کے پروانے جو تمہیں انگلستان میں پیش کرنے ہونگے جلد تیار کر رہا ہوں۔ شہزادے ہیملٹ کو تمہارے ساتھ جانا ہوگا۔ جو منزلت اور مرتبہ ہمیں اس وقت حاصل ہے وہ اجازت نہیں دیتا کہ ہم ایک ایسے شخص کو جس کی دیوانگی سے ہر وقت خطرہ پیدا ہونے کا اندیشہ بڑھتا جاتا ہے، اپنے قریب رہنے دیں۔

گلڈنسٹرن:۔ ہم خود سفر کی تیاری جلد کر رہے ہیں۔ اگر مذہب کے اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو حضور کا یہ خوف بالکل بجا ہے حضور

کی سلامتی جان و مال پر ہزارہا مخلوق کی جان و مال کی سلامتی کا انحصار ہے۔ پس حضور۔ تا ابد شاد و آباد رہیں۔ ہر متنفس کو اپنی جان کی سلامتی کا خیال رہنا چاہیئے چہ جائیکہ بادشاہ جس کی سلامتی پہ ہزارہا کی سلامتی کا دار و مدار ہے۔ بادشاہ کا مرنا صرف بادشاہ کا مرنا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی موت مثل گرداب کے ہوتی ہے کہ آس پاس کی سب چیزیں اس میں آکر غرق ہو جاتی ہیں۔ بادشاہ کی موت اُس زبردست چکر کی مثل ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر قائم ہو اور اُس کے اڑوں میں ہزارہا چھوٹی چھوٹی چیزیں لگی ہوں۔ جس وقت وہ چکر پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گر پڑیگا تو اُس کے گرنے کی مُہیب اور دہشتناک آواز میں اُن چھوٹی چیزوں کے گرنے کی آوازیں بھی شامل ہونگی۔ بادشاہ کبھی تنہا رنج نہیں کرتا بلکہ اُس کا رنج اس کی تمام رعایا کا رنج و غم ہوتا ہے۔

بادشاہ:۔ اب تم دونوں بحری سفر کیلئے جلد تیار ہو جاؤ۔ کیونکہ ہم اس وجہ خوف یعنی شہزادے کو جلد دُور کرنا چاہتے ہیں۔ اِس وقت تو وہ نہایت آزادی سے جہاں چاہتا ہے آوارہ پھرتا ہے۔

روزنکرانز گلڈنسٹرن} حضور ہم نہایت تیزی سے سفر کی تیاری کرتے ہیں۔
(روزنکرانز اور گلڈنسٹرن باہر چلے جاتے ہیں۔

(پلونیوس اندر آتا ہے)

پلونیوس:۔ جہاں پناہ۔ شہزادہ ہیملٹ اپنی والدہ کے کمرے میں اُن سے تنہا مُلاقات کرنے والے ہیں۔ حکم ہو تو پردے کے پیچھے چھُپ کر بیٹھ جاؤں۔ مجھے یقین ہے کہ ملکہ سلامت حضور کے فرمانے کے مطابق اپنے فرزند کی تنبیہ اچھی طرح کرینگی۔ لیکن ماں کا دل ہے۔ ممکن ہے مہر مادری فرزند کا حامی اور طرفدار بنا دے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ماں بیٹے میں جو باتیں ہوں اُنکو کوئی دوسرا بھی سُنتا رہے۔ جہاں پناہ۔ فدوی رُخصت ہوتا ہے۔ اور حضور کے خوابگاہ میں تشریف لیجانے سے قبل جو کچھ مجھے علم ہوگا اُس سے مُطلع کرونگا۔

بادشاہ:۔ اے میرے وفادار وزیر میں تیرا نہایت مشکر گذار ہوں۔

(پلونیوس چلا جاتا ہے)

میرے گُناہوں کی عفونت آسمان تک پہونچی ہے۔ بھائی کا قتل تو ابتدائے آفرینش سے سخت گُناہوں میں شمار ہوا ہے۔ جس پر خدا نے سب سے پہلے لعنت کی ہے۔ اب کس مُنہ سے خدا سے دُعا مانگوں۔ گو چاہتا ہوں کہ دُعا میں خُدا کے سامنے جُھکوں میرا گُناہ ایسا سخت اور کریہہ ہے کہ دُعا کے قصد پر بھی وہ غالب ہے۔ اور میرا خیال اس آدمی کی طرح ہے جسے دو باتیں کرنی ہیں مگر اس تذبذب میں کہ کونسی کرے اور کونسی نہ کرے ایک بات بھی عمل میں نہیں آتی۔ یہ ملعون ہاتھ بھائی کے خون میں آلودہ ہو کر زیادہ بھاری اور سیاہ ہو گیا ہے۔ کیا خُدا کی رحمت و کرم میں اتنی قدرت نہیں ہے کہ اسکو دھو کر ہلکا اور اُجلا مثل برف کے کردے، رحمتِ باری کا مقصد تو یہی ہے کہ وہ انسان کے گُناہوں کو بخش دے۔ خُدا کی عبادت کرنے کے دو ہی مقصد ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جب انسان ارتکابِ گناہ کے قریب ہو تو اُسے روک دے اور اگر گُناہ سرزد ہو چکا ہے تو اُسے بخش دے۔ بس مجھے مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ جب گُناہ کا مرتکب میں ہو چکا تو اُس کی رحمت کا طالب بھی ہو سکتا ہوں۔ لیکن خُدا سے دُعا کس شکل میں مانگوں۔ کیا یہ کہوں کہ بھائی کو قتل کیا ہے؟ اے خُدا میرا گُناہ معاف کر۔ یہ کیونکر ممکن ہے؟ کیونکہ وہ چیزیں جن کے لئے خون کیا تھا میرے پاس موجود ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے۔ کہ خون کرنے سے جو چیزیں حاصل ہوئی ہوں وہ اپنے قبضے میں ہوں اور خُدا گُناہ معاف کردے۔ دُنیا کا حال تو ایسا خراب ہے کہ اگر کوئی مجرم زردار ہے تو وہ زر دیکر انصاف کو ایک طرف ہٹا دیتا ہے۔ اور یہی ناجائز رقمیں قانون کو مجرم پر اپنا عمل نہیں کرنے دیتیں۔ لیکن خدا کے دربار میں یہ حالت نہیں ہے۔ وہاں کوئی جرم بغیر سزا کے نہیں رہتا۔ انسان کے اصلی اعمال کو دیکھکر اُس کے ساتھ انصاف کیا جاتا ہے اور ہمارے گُناہ سب ہمارے روبرو آکر ہمارے خلاف گواہی دیتے ہیں۔ تو اب کیا کرنے کو باقی رہا ہے؟ توبہ اور ندامت ظاہر

کرنے سے اب کیا ہو سکتا ہے۔ توبہ اور ندامت وہ چیزیں ہیں کہ سب کچھ کر سکتی ہیں۔ لیکن اس وقت وہ کیا کر سکتی ہیں جبکہ کوئی سچے دل سے توبہ نہ کر سکے۔ افسوس میری اس زبوں حالت پر۔ اے میرے قلب جو گناہ کر کے موت سے بھی زیادہ سیاہ اور تاریک ہو گیا ہے۔ اور اے میری روح تو ایک پرندے کی طرح لاسے میں آلودہ ہے۔ جتنا تڑپتی ہے اور پھنستی چلی جاتی ہے۔ اس حال میں اے عرش کے فرشتو میری مدد کرو اور اے میرے سخت و کرخت گھٹنوں خدا کے سامنے جھکو۔ اور اے فولاد کی سی پتلی سخت رگوں جنہیں دل آویزاں ہے ایسی نرم ہو جاؤ جیسے نوزائیدہ بچے کی رگیں اور اعصاب ہوتے ہیں۔ (بادشاہ جاتا ہے اور خدا کی جناب میں جھکتا ہے)

(ہیملٹ اندر آتا ہے)

ہیملٹ:۔ بادشاہ اس وقت عبادت میں مصروف ہے۔ کیا اسی حال میں میں اُسے قتل کر دوں۔ اگر ایسا کیا تو وہ سیدھا بہشت میں داخل ہوگا۔ تو کیا اس میں میرا انتقام پورا ہو جائیگا۔ ذرا غور کر لوں، ایک شیطان خبیث نے میرے باپ کا خون کیا۔ اس خون کے بدلے میں نے جو اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اس خونی خبیث کو جنت میں بھیج دیا۔ یہ تو انتقام نہیں ہوا بلکہ اس خونی بادشاہ سے مجھے انعام کا مستحق بناتا ہے۔ اس نے میرے باپ کو ایسی حالت میں جان سے مارا تھا کہ وہ دنیا کی مکروہات میں مبتلا تھا، روٹی پیٹ بھر کر کھا چکا تھا۔ اس کے گناہ اس وقت اتنے تھے جیسے پھولوں کے موسم میں پھول کھلتے ہوں۔ اب اس کی روحانی کیفیت کیا ہے اس کا حال خدا ہی کو معلوم ہے لیکن جہاں تک میرا خیال جاتا ہے اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔ تو کیا میں اپنے باپ کے قاتل سے انتقام ایسے وقت میں لوں جبکہ وہ قاتل خدا کے سامنے عبادت اور دعا میں جھکا ہو۔ اور خدا کے سامنے گڑگڑاتا ہو کہ اس کے قلب کو ارتکاب گناہ کے عذاب سے پاک کر دے۔ کیا اسکو ایسے وقت میں ایک زندگی سے دوسری زندگی کی راہ بتانے میں اپنے باپ کے خون کا بدلہ واقعی نکال سکتا ہوں۔ نہیں، ہرگز نہیں اے تلوار اپنے نیام میں جا۔ اور کسی اور پُرخوف و خطر موقع کی منتظر ہو۔ یعنی کسی ایسے موقع کی جبکہ یہ بادشاہ شراب پیے سوتا ہو۔ یا حالت قہر و غضب میں ہو۔ یا کسی ایسے کام میں مشغول ہو جس میں نجات آخروی کی مطلق اُمید نہ ہو۔ اُس وقت اچانک اُسکا گلا کاٹ تاکہ موت کے کرب میں ایسا ایسا تڑپے اور رگڑے کہ آسمان تک اُس کے پاؤں لگیں۔ اور اسکی روح پر خدا کا غضب نازل ہو۔ اور دوزخ کی صورت سیاہ اور تاریک ہو کر وہ جہنم واصل ہو......

میری ماں اس وقت میرا انتظار کرتی ہوگی۔ لیکن اس وقت ماں سے ملاقات میں دیر کرنی مثل دوا کے ہے جو مریض کو اس غرض سے دیتے ہیں کہ دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے کچھ دن اور بیمار رہے۔

بادشاہ:۔ خدا سے دعا مانگ رہا ہوں۔ لیکن دعا کے الفاظ اوپر جاتے ہیں اور ان کا مدعا نیچے ہی رہتا ہے۔ دعا کے الفاظ اگر پورا خیال خدا کی طرف رجوع نہ ہو کبھی خدا تک نہیں پہونچتے۔

چوتھا منظر:۔ ملکہ کی خلوت گاہ۔

ملکہ اور پلونیوس اندر آتے ہیں۔

پلونیوس:۔ حضور، شہزادہ ابھی آتا ہے۔ حضور اچھی طرح اسکی تادیب کر دیں اور فرمائیں کہ تمہاری نازیبا حرکتیں اتنی بڑھی ہیں کہ اب ان کی تاب کسی کو نہیں رہی اور یہ کہ حضور نے جہاں تک ممکن تھا شہزادے کی حمایت کی اور بادشاہ کے عتاب و غضب سے اُسے بچاتی رہیں۔ میں یہاں چھپ بیٹھتا ہوں۔ جو بات ہے اُس سے صاف صاف کہیئے۔

ہیملٹ:۔ (اندر سے پکارتا ہوا آتا ہے) اماں۔ اماں۔ اماں اماں آپ کیسی ہیں؟

ملکہ:۔ ہیملٹ تو نے اپنے باپ کو بہت ہی خفا کر دیا۔

ہیملٹ:۔ اماں آپ نے میرے باپ کو بہت ہی خفا کر دیا۔

ملکہ:- بس بس۔ اپنی یاوہ گو زبان سے گستاخانہ جواب نہ دے۔

ہیملٹ:- جاؤ جاؤ۔ تم اپنی خبیث زبان سے فضول سوال نہ کرو۔

ملکہ:- ہیملٹ بیٹا۔ یہ تیرا کیا حال ہے؟

ہیملٹ:- کیوں اماں۔ حال کیا ہے؟

ملکہ:- بیٹا کیا تو مجھے بھول گیا؟

ہیملٹ:- نہیں۔ صلیب مقدس کی قسم۔ ایسا نہیں ہے۔ آپ ملکہ ہیں یعنی اپنے متوفی شوہر کے بھائی کی بیوی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر آپ میری ماں ہوتیں۔

ملکہ:- اگر میرے کہنے کا اثر نہیں تو پھر میں اُنکو بلاتی ہوں جو تجھ سے بات کر سکیں۔

ہیملٹ:- نہیں آپ اُس وقت تک یہاں سے نہیں ہل سکتیں جب تک کہ میں آپکو ایک ایسا آئینہ پیش نہ کردوں جس میں آپ اپنے دل کا اصل حال دیکھ لیں۔

ملکہ:- تو کیا کریگا۔ کیا مجھے جان سے مارنے کا ارادہ رکھتا ہے؟ لوگو۔ مدد کرو۔ مدد کرو۔

پلونیوس:- (پردے کے پیچھے سے چلاتا ہے) لوگو دوڑو۔ بچاؤ بچاؤ۔

ہیملٹ:- (سیف نیام سے نکالتا ہے) ارے چوہا۔ چوہا۔ ایک ایک اشرفی شرط سہی کہ میں نے اِس چوہے کو مار لیا۔ (پردے کے پیچھے سیف کا ایک ٹھوکا دیتا ہے)

پلونیوس:- (پردے کے پیچھے سے) ارے مار ڈالا۔

(پلونیوس فرش پر گرتا ہے اور مر جاتا ہے)

ملکہ:- ارے کمبخت تُو نے یہ کیا کیا؟

ہیملٹ:- مجھے نہیں معلوم کیا تھا۔ کیا وہ بادشاہ سلامت تھے؟

ملکہ:- یہ تُو نے غصے کے جنون میں کیسا خون کر دیا۔

ہیملٹ:- خون۔ اچھی اماں۔ یہ خون تو اتنا ہی بُرا ہے جیسے کہ ایک بادشاہ کو مار کر اُس کے بھائی سے عقد کرنا۔

ملکہ:- بادشاہ کو مار کر!

ہیملٹ:- ہاں اماں میں نے یہی کہا ہے۔ (پردہ اُٹھا کر پلونیوس کے مُردے کو دیکھکر کہتا ہے) ارے بدبخت، ہرجائی، احمق۔ جا خدا کو سونپا۔ میں سمجھا تھا کہ تجھ سے بھی بڑا آدمی پردے کے پیچھے ہے۔ اب تیری سمجھ میں آیا کہ ہر بات میں دخل دینا کیسا خطرناک ہوتا ہے۔ اماں، اب ہاتھ پٹخنے اور ملنے سے کیا ہونا ہے۔ بیٹھ جائیے تاکہ میں آپ کا دل ہلا دوں۔ اب میرا صرف اتنا ہی کام ہے۔ اگر آپ کے دل میں کچھ گداز باقی ہے اور معصیت کی عادت نے اُسے بالکل پتھر نہیں کر دیا کہ عقل و ہوش کی ضربوں کی اُسے مطلق پروا نہو تو سُنئے

ملکہ:- مجھ سے کونسا قصور ہوا ہے جو تو اس طرح چیخ چیخ کر میرے ساتھ گستاخانہ گفتگو کرتا ہے؟

ہیملٹ:- آپنے وہ کام کیا ہے جو فطرتِ نیک سے ایمان و حیا کو خارج کر دیتا ہے، جو نیکی کو دغا اور منافقت بناتا ہے۔ جو عشقِ معصوم کی حسین پیشانی سے پھول اُتار کر وہاں آبلہ پیدا کرتا ہے اور شادی کے وقت جو قول و قرار کئے گئے تھے اُنکو ایک جُواری کی جُھوٹی قسمیں ٹھیراتا ہے۔ آپکا کام تو ایسا ہے کہ ہنگامِ عقد جو وعدے اور قسمیں ہوئی تھیں اُنکو عزت و حُرمت سے محروم کر دیتا ہے۔ جسنے مذہب کو ایک بے معنی مجموعہ الفاظ کا بنا دیا۔ شرم و غیرت سے فرشتوں کے چہرے بھی عرش پر سُرخ ہو گئے اور اُس خاک نے بھی جس سے یہ زمین بنی ہے اپنی صورت ایسی اُداس بنالی کہ گویا یوم جزا نزدیک ہے اور آپکے گناہ کی سزا دیکھنی ہے۔

ملکہ:- ارے غضب۔ خُدا جانے وہ کہنے کی بات کس بلا کی ہوگی جس کی تمہید ایسے شور و غُل اور بادل کی گرج کے ساتھ اُٹھائی جا رہی ہے۔

ہیملٹ:- ذرا اِس طرف نظر اُٹھا کر اِس تصویر کو ملاحظہ کیجئے۔ اِس میں دونوں بھائیوں کی صحیح شبیہ موجود ہے۔ اِس شبیہ کو دیکھئے کہ پیشانی پر کیسی شرافت برستی ہے۔ کاکل خُدائے شمس کے بل

کھائے ہوئے شعلے معلوم ہوتے ہیں۔ سینہ جو پیٹر کے سینے سے مشابہ ہے اور چہرے پر حکومت اور کارفرمائی کی وہ شان ہے جو خدائے جنگ کے چہرے پر نظر آتی تھی۔ قیام کا انداز خداؤں کے قاصد مریخ کا سا ہے کہ گویا ابھی آسمان سے پرواز کرتا ہوا پہاڑ کی چوٹی پر اُترا ہے۔ یہ شبیہ اُن مردانہ اوصاف اور خوبیوں کا مجموعہ ہے جس میں آسمان کے ہر خدا نے اپنی طرف سے خاص طور پر حسن و زیبائی اضافہ کی ہے تاکہ دُنیا دیکھے اور سمجھے کہ ہاں انسان کامل اِسے کہتے ہیں۔ اچھا۔ یہ تو آپکے پہلے شوہر تھے۔ اب آپ اپنے موجودہ شوہر کو ملاحظہ فرمائیں۔ کھیت میں گیہوں کی ایک سڑی بال پاس کی صحیح و تندرست بال کو لپنے اثر سے سڑا دیتی ہے۔ اِسی طرح ایک نالائق بھائی نے اپنے لائق بھائی کو ہلاک کر دیا۔ اگر آنکھیں تھیں تو کیونکر ممکن ہوا کہ اِس بلند اور پُر فضا مرغزار کو چھوڑ کر کیچڑ اور دلدل کو اپنے لئے چراگاہ بنایا اور وہاں کی ناپاک چری کو چر کر اپنے تئیں فربہ بنانا چاہا۔ اگر آنکھیں تھیں تو اسکو عشق نہیں کہا جا سکتا تھا کیونکہ اب آپکی عمر اتنی ہے کہ جوانی کے خون کی حدت اُس میں باقی نہیں ہے۔ اب آپکا خون سرد ہے اور عقل کی رہنمائی کا منتظر۔ ہائے وہ عقل بھی کیسی تھی جسنے گرا کر کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ اتنی سمجھ تو آپ میں تھی ورنہ حس و حرکت معدوم ہو جاتی۔ لیکن وہ سمجھ فی الواقع مفلوج ہو گئی تھی۔ جنون اور دیوانگی بھی کبھی ایسی غلطی میں نہ پڑتے اور حواس بھی لذائذِ نفس کے اِس درجہ غلام نہ بنتے کہ انتخاب کی ان کو مطلق تمیز نہ رہتی۔ وہ کون شیطان تھا۔ جسنے دھوکا دے کر آپکو ایسے اندھے انتخاب پر مجبور کیا۔ اگر آنکھیں ہوتیں اور لامسہ نہ ہوتی، اگر لامسہ ہوتی اور بصارت نہ ہوتی۔ اگر کان ہوتے ہاتھ اور آنکھیں نہ ہوتیں۔ اگر شامہ ہوتی اور باقی کُل حواس معطل ہو چکے ہوتے تب بھی اِن حواسوں میں سے کوئی کمزور سے کمزور حصّہ بھی کسی حس کا باقی ہوتا تو آپ ایسی احمقانہ حرکت نہ کرتیں۔ اسے عزت و شرم تیرے چہرے کا خون کیا ہوا۔ اگر دوزخ اپنی آنچ تیز کر کے ایک ادھیڑ عمر کی عورت میں ایسے سرکشانہ جذبات کو ہیجان میں لا سکتی ہے تو پھر جوانی کا تو کیا پوچھنا ہے۔ وہ تو نیکی کو موم سمجھکر اپنی ہی گرمی سے اُسے پانی کر سکتی ہے۔ اِس حالت کو شرمناک نہ کہو جبکہ نفس کی مجبوریاں برابر گناہوں کی ترغیب دیتی ہوں۔ اور بڑھاپے کا سرد اور جما ہوا خون جلتا نظر آتا ہو۔ اور عقل جو ارادے کو روک سکتی ہے شوقِ معصیت کو سیر کرتی ہو۔

ملکہ:۔ ہیملٹ بس اب زیادہ نہ کہہ۔ تو نے میری نظر کو میرے قلب کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔ اور میں دیکھتی ہوں کہ اس میں بہت سیاہ داغ اور دھبے ہیں۔ جس کی سیاہی کبھی دُور نہیں ہو سکتی۔ تیری باتیں چھریوں اور خنجروں کی طرح میرے کانوں کے پار ہوئی جاتی ہیں۔ پیارے فرزند اب زیادہ اِس بارے میں نہ کہہ۔

ہیملٹ:۔ وہ قاتل ہے اور خبیث ہے۔ وہ ایسا غلام ہے جسکی قیمت تمہارے پہلے شوہر کے مقابلے میں دسویں حصّہ کا بیسواں حصّہ بھی نہیں ہے۔ وہ ایک کریہہ اور بدنما نقل بادشاہوں کی ہے۔ وہ چور ہے، سارق ہے جسنے ایک سلطنت سرقہ کر کے اسپر حکومت شروع کر دی اور اِس مملکتِ عظمیٰ کو اُٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا جیسے کوئی الماری پر سے اُچک کر کوئی چیز اپنی جیب میں رکھ لے۔

ملکہ:۔ بس اب آگے کچھ نہ کہو۔

ہیملٹ:۔ وہ اصلی بادشاہ نہیں ہے بلکہ میلے کچیلے چیتھڑوں اور پھٹے پُرانے کپڑوں کا بنا ہوا ایک گُڈّا ہے۔

(روح اندر آتی ہے)

اے روح میری محافظ بن۔ اور اپنے پروں سے ہوا میں مجھ پر چھائی رہ۔ اے آسمانی محافظو۔ اے روح محترم تو کیا چاہتی ہے؟

ملکہ:۔ ہائے افسوس۔ یہ تو بالکل دیوانہ ہو گیا۔

ہیملٹ:۔ اے روح۔ کیا تیرے اِس وقت آنے کی وجہ یہ ہے کہ اپنے کاہل اور سست فرزند کو اس کی کاہلی پر زجر و توبیخ کرے؟ زمانہ

دراز گزر جانے سے اُس کے جوش میں کمی ہو گئی ہے اور تیرے حکم کی بجاآوری میں تاخیر و تساہل ظاہر ہو رہا ہے۔ اے روح مجھے بتا کہ تو کیا کہنے آئی ہے؟

روح:- ہیملٹ فراموش نہ کر۔ میرا اس وقت یہاں آنا اس غرض سے ہے کہ تیرے عزم و ارادے کو جو کند ہو گیا ہے تیز کر دوں۔ لیکن دیکھ تیری ماں پر کیسی عجیب حیرانی طاری ہو رہی ہے۔ اے فرزند! اپنی ماں کو اُن خطرناک خیالات سے جو اس وقت اُس کے دل میں ہیں نجات دے۔ کیونکہ کمزور جسم میں خیال اور تصور بہت قوت سے اثر کرتا ہے۔ ہیملٹ! اپنی ماں سے بات کر۔

ہیملٹ:- اماں۔ آپ کا مزاج کیسا ہے؟

ملکہ:- میرا حال تو جو کچھ ہو تو اپنا حال تو دیکھ کہ تو نظریں اوپر کئے خالی خولی ہوا کو دیکھتا ہے اور اس سے باتیں بھی کرتا ہے تیری آنکھوں میں سے تیری روح خوفزدہ ہو کر جھانکتی معلوم ہو رہی ہے اور تیرے سر کے بال جن میں پٹیاں جمی تھیں اس طرح کھڑے ہیں جیسے سوتے سپاہی خطرے کی اطلاع سنتے ہی مُردے سے زندہ ہو جاتے ہیں۔ اے پیارے فرزند اپنے قہر و غضب کے ان شعلوں کو صبر و تسکین کے چھینٹوں سے ٹھنڈا کر۔ تو کہاں اور کس چیز کو دیکھتا ہے؟

ہیملٹ:- میں تو اسے دیکھتا ہوں۔ نہیں اُسے۔ کیا آپ نہیں دیکھتیں کہ اُس کی صورت کیسی زرد ہو رہی ہے۔ اور ادھر کس قدر غور سے دیکھ رہا ہے۔ اُس کی یہ واجب الرحم صورت اور مظلومانہ فریاد دونوں مل کر ایسی ہیں کہ اگر بےحس پتھروں سے بھی خطاب کریں تو وہ جنبش میں آجائیں۔ اے روح، میری طرف ایسی عاجزی کی نظروں سے نہ دیکھ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جو دشوار کام مجھے کرنا ہے اُس کا رنگِ انتقام مٹ جائے اور بجائے خون بہانے کے میں آنسو بہا کر رہ جاؤں۔

ملکہ:- بیٹا، یہ تو کس سے باتیں کرتا ہے؟

ہیملٹ:- اماں۔ کیا آپ سامنے کچھ نہیں دیکھتیں؟

ملکہ:- میں تو کچھ نہیں دیکھتی۔ حالانکہ جتنی چیزیں ہیں سب کو دیکھ رہی ہوں۔

ہیملٹ:- تو کیا آپ نے کچھ سنا بھی نہیں؟

ملکہ:- سوائے اپنی اور تیری باتوں کے اور کچھ نہیں سنا۔

ہیملٹ:- نہیں، اب ذرا ادھر تو دیکھیں۔ دیکھئے وہ چپکے چپکے کھسکی۔ یہ میرے باپ کی روح ہے اور وہی لباس پہنے ہے جو وہ زندگی میں پہنا کرتے تھے۔ دیکھئے وہ چلی۔ ابھی تک دروازے میں ہے۔ (روح چلی جاتی ہے)

ملکہ:- بیٹا۔ یہ سب باتیں تیرے دماغ نے پیدا کی ہیں۔ دیوانگی میں ایسی ہوائی صورتیں اکثر دکھائی دیا کرتی ہیں۔

ہیملٹ:- نہیں اماں، میں دیوانہ نہیں ہوں۔ میری نبض ایسے ہی اعتدال کے ساتھ چل رہی ہے جیسے کہ آپکی نبض، اور اسکی ضربوں سے وہی صحت جسمانی ثابت ہوتی ہے جو آپکی نبض سے ہو۔ جو باتیں اس وقت میں نے کہی ہیں وہ دیوانگی کی نہیں ہیں، چاہے اسکو آپ آزما کر دیکھ لیں۔ اور جو بات جن الفاظ میں کہی ہے اس کا اعادہ کر سکتا ہوں۔ دیوانگی یا جنون میں جو بات جس طرح پہلے کہی جاتی ہے دیوانہ اُسکو اُسی طرح دوہرا نہیں سکتا۔ اماں خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپ یہ خیال کر کے دل کو تسکین نہ دے لیں کہ واقعی آپ اپنے گناہوں کا حال نہیں سن رہی ہیں بلکہ محض میری حالتِ دیوانگی کی گفتگو سنتی ہیں۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو سمجھ لیجئے کہ ایک نہایت گندے زخم پر ایک جھلی سی آجائیگی۔ آپ سمجھیں گی کہ زخم مندمل ہو گیا ہے مگر فی الواقع فاسد مادہ اندر ہی اندر پھیل کر اپنا زہر پھیلاتا رہیگا۔ خدا کے سامنے اپنے گناہوں کا اقرار کیجئے اور جتنے گناہ پہلے کئے ہیں اُن سے توبہ کیجئے، اور یہ کہ آئندہ گناہوں سے پرہیز کریں گی۔ لیکن محض اتنا کہہ کر اپنے گناہوں کے بارے میں دل کو تسکین نہ دے لو کیونکہ اس سے گناہ بد سے بدتر ہوتے چلے جائیں گے۔ مجھے معاف کیجئے کہ میں اس طرح خود آپکے فائدے کیلئے آپکو نصیحتیں کرتا ہوں۔

زمانے کی حالت ایسی خراب ہو کہ خود نیکی کو بدی کے سامنے خواستگار بہ معافی ہونا پڑتا ہے، اور میں ادب سے جُھک کر عرض کرتا ہوں کہ ہر شخص اپنی اصلاح کرے۔

ملکہ:۔ ہیملٹ۔ تونے میرے دل کے دو ٹکڑے کر دیئے۔

ہیملٹ:۔ تو پھر اماں بُرا ٹکڑا پھینک دو اور اچھا ٹکڑا اپنے پاس رکھکر زیادہ پاک زندگی بسر کرو۔ اچھا رُخصت، چچا کے بستر پر اب نہ جانا۔ اگر دل میں نیکی نہیں ہے تو خُدا کے لئے ظاہر ہی میں نیکی اختیار کر لو۔ گناہ کی عادت ایک بُھوت ہے جو تمام نیک خیالات کو غارت کر دیتا ہے، بُری عادتیں شیطان کے مثل ہوتی ہیں۔ لیکن عادت میں ایک خصلت فرشتوں کی بھی پائی جاتی ہے وہ یہ کہ اگر کوئی آدمی اچھے اور نیک کام کرنے کی عادت ڈال لے تو پھر وہ واقعی نیک اور اچھا ہوجاتا ہے، عادت تو وہ قوت ہو کہ انسان کی اصلی فطرت کو بدل سکتی ہے، یا تو وہ شیطان پر غالب آجاتی ہو یا اسکو اپنی زبردست قوت سے قلب سے بالکل نکال دیتی ہو۔ اچھا اب ایک مرتبہ پھر آپ سے رُخصت چاہتا ہوں۔ اگر آپکی طبیعت اِس طرف مائل ہے کہ خدا کے سامنے جُھک کر اُسکی رحمت کی طالب ہوں تو اماں میں بھی ادب سے جُھک کر ماں کی زبان سے وہ دعائیں سُننی چاہتا ہوں جو ماں بیٹے کو دیا کرتی ہے۔ رہا یہ وزیر پلونیوس تو اس کے مارے جانے پر میں سخت نادم ہوں لیکن مشیت سے کس کو چارہ ہے۔ اُس کی مرضی یہی تھی کہ ہمکو اِس طرح سزا دے کہ میں اُس کے قتل کا مُرتکب ہوں اور اسکو اس طرح سزا ملے کہ وہ میرے ہاتھ سے مارا جائے اور اس طرح میں خُدا کا تازیانہ اور انتقام کا لینے والا ہوں۔ اس وقت میں اُسکی لاش کو یہاں چھپائے دیتا ہوں، پھر اُس کے قتل کا پورا جوابدہ ہو سکتا ہوں، اب میں پھر رُخصت چاہتا ہوں، میرے یہ جگر شق کرنے والے الفاظ فی الحقیقت ایک قسم کی مہربانی ہیں (تاکہ آپ گناہ سے توبہ کریں) ایک خُون تو ہو چکا اب اُس سے بھی بدتر خُون کرنا باقی ہے۔ ملکہ سلامت حضور سے صرف ایک بات اور عرض کرنی ہے۔

ملکہ:۔ بیٹا میں کیا کروں۔

ہیملٹ:۔ جو باتیں آپکے نہیں کرنے کی ہیں وہ بتائے دیتا ہوں۔ اگر یہ بدکار بادشاہ آپ سے ہمکنار ہونا چاہے تو آپ اُسے ہمکنار نہ ہونے دیں، اگر وہ لُطف میں آکر آپکے رُخسار کو چھوئے تو اُسے نہ چھونے دیں۔ اگر پیار میں حقارت کے جُملے وہ آپکی نسبت کہے تو آپ اُنہیں نہ سُنیں۔ اور نہ اِس وقت کی سب باتیں اُس سے کہیں اور نہ یہ کہیں کہ میں واقعی دیوانہ نہیں ہوں بلکہ کسی مطلب کیلئے دیوانہ بنا ہوں اگر آپ نے یہ کُل باتیں کہدیں تو واللہ آپکے لئے خوب ہی ہوگا کیونکہ ایک حسین عاقل اور ہوشمند ملکہ اپنی بیش بہا چیزیں ایک بچے بدمعاش موری کے مینڈک، منحوس چمگادڑ اور آوارہ بلّے سے چھپا نہیں سکتی ہے۔ کون ہو جو ایسا نہ کریگا؟ اگر آپ کو معمولی عقل اور رازداری سے نفرت ہو تو ان باتوں کو کہدیجئے پس آپکی وہی حقیقت ہوگی جو اُس بندر کی ہوئی تھی کہ جسنے گھر کی چھت پر کبوتروں کا پنجرہ کھول کر کبوتر اُڑا دیئے اور خود خالی پنجرے میں بیٹھ کر نیچے گر کر اپنی گردن توڑ لی۔

ملکہ:۔ بیٹا سُن لے کہ اگر الفاظ تنفس کے ذریعہ ادا ہوتے ہیں اور جان کا حصر تنفس پر ہے تو مجھ میں اتنی جان نہیں کہ تیری یہ باتیں میں کسی دوسرے سے کہوں۔

ہیملٹ:۔ مجھے انگلستان جانا ہو۔ اِسکا علم تو آپکو ہوگا؟

ملکہ:۔ ہاں، میں تو یہ کہنا بھُول ہی گئی کہ تمہارے انگلستان بھیجنے کا فیصلہ ہوا ہو۔

ہیملٹ:۔ اِس مضمون کے خطوط تیار ہو چکے ہیں اور اُن پر بادشاہ کی مُہر بھی ہو چکی ہے اور میرے دو ہم مکتب جن کی معرفت خطوط بھیجے جارہے ہیں وہ میرے لئے راستہ صاف کرکے میری رہبری کرینگے۔ میں اپنے اِن دونوں مکتب کے یاروں کا اعتبار اتنا ہی کروں گا جیسے کوئی سانپ کے دانتوں کا کرے جن کے نیچے زہر کے چھالے ہوتے ہیں۔

یہ دونوں میرے ساتھ اس غرض سے ہو گئے کہ بادشاہ اگر میرے حق میں کوئی دغا و فریب کرے تو وہ اسکی تعمیل کریں۔ بس اس شیطان بادشاہ کی چالوں کو چلنے دینا چاہیئے۔ واہ کیا خوب تماشا ہوگا جبکہ سُرنگ لگانے والا اپنی ہی لگائی سُرنگ سے خود اُڑ جائے۔ واللہ کیسی مشکل بنے گی جب میں اُن کی سُرنگ سے ایک گز نیچے اپنی سُرنگ لگا دونگا اور اُس کے و لغتے ہی دشمن کے پرخچے آسمان تک اُڑتے نظر آئینگے۔ واہ کیا خوب ہوتا ہے جبکہ دو مخالف اور زبردست چالیں ایک دوسرے سے مقابل ہوتی ہیں۔ یہ چچا جان تو مجھے چالبازی میں اُستاد بنا دینگے۔ اب میں اس لاش کو گھسیٹ کر باہر کے کمرے میں ڈالے دیتا ہوں۔ اماں خُدا حافظ۔ حقیقت میں بادشاہ کا یہ دانشمند وزیر باتدبیر جو زندگی میں ایک فضول گو احمق اور چالاک مُشیر تھا اب مر کر نہایت ہی خاموش رازدار بنا ہے۔ آئیے جناب والا آپ کو گھسیٹ کر اس مضمون کا خاتمہ کردوں۔

(سب چلے جاتے ہیں ہیملٹ پلونیوس کی لاش کو گھسیٹتا ہوا اسٹیج پر سے چلا جاتا ہے۔)

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

جزوِ رابع

پہلا منظر:۔ شاہی محل کا ایک کمرہ،

بادشاہ، ملکہ، روزنکرانٹز اور گلڈنسٹرن داخل ہوتے ہیں۔

بادشاہ:۔ ملکہ پیاری۔ یہ تمہاری آہیں اور ٹھنڈے ٹھنڈے سانس یونہی نہیں ہیں۔ کوئی بات ضرور ہوئی ہے۔ بتاؤ تو کیا ہے۔ کچھ سمجھ میں تو آئے۔

ملکہ:۔ (روزنکرانٹز اور گلڈنسٹرن سے کہتی ہے) میں اس وقت تنہائی چاہتی ہوں۔ آپ دونوں صاحب کچھ دیر کو باہر تشریف رکھیں۔ (روزنکرانٹز اور گلڈنسٹرن باہر چلے جاتے ہیں)

بادشاہ:۔ کرٹرود تم نے ہیملٹ سے کیا باتیں کیں۔ اب اُس کا کیا حال ہے؟

ملکہ:۔ بادشاہ سلامت کیا بتاؤں کہ آج شب کو میں نے کیا دیکھا ہیملٹ کی دیوانگی اور جنون کی تو یہ کیفیت ہے جیسے سمندر کی موجیں اور آسمان کی تیز و تند ہوائیں یہ بتانے کو اُن میں کون قوی تر ہے آپس میں لڑیں جنون کا دورہ اُس پر ایسا سخت پڑا کہ کمرے میں پردے کے پیچھے کسی چیز کی آہٹ پا کر یکلخت نیام سے تلوار نکال لی اور یہ کہہ کر کہ "چوہا چوہا" اس دماغی وحشت میں بے دیکھے بھالے اُس نیک و شریف بڈھے یعنی پلونیوس کو قتل کر دیا۔

بادشاہ:۔ ارے یہ کیسا غضب ہوا۔ اگر ہم اُس وقت وہاں ہوتے تو ہمارا بھی یہی حال ہوتا۔ ہیملٹ کی یہ آزادی سب کے لئے خطرناک ہے۔ خود تمہارے لئے ہمارے لئے اس کے اس طرح آزاد پھرنے سے خطرہ ہے۔ افسوس، اس خون کا جواب کیونکر دیا جائیگا۔ سارا الزام ہم پر عائد ہوگا کہ کیوں ایسے دیوانے کی نقل و حرکت پر قابو رکھنے کیلئے پورا بندوبست نہیں کیا۔ اور کیوں ایسے مقامات پر جہاں مجمع عام ہوتا ہو اُسے جانے دیا۔ لیکن ہمیں اُس کے ساتھ اتنی محبت تھی کہ کچھ پس و پیش نہ سوچ سکے اور اس بارے میں کوئی تدارک نہ کیا۔ اور جیسے کوئی ایک غلیظ بیماری کو دوسروں سے چھپانے میں بیماری کو بڑھا لیتا ہے یہی حال ہمارا ہوا اس بیماری کو چھپانے میں مرض کو اتنا بڑھا یا کہ جان خطرے میں پڑ گئی وہ گیا کہاں؟

ملکہ:۔ پلونیوس جس کا خون کیا ہے اُس کی لاش کو چھپانے گیا ہے گو خون کیا ہو مگر اس حال میں بھی اُسکا جنون ادنیٰ معدنیات میں

خالص سونے کی طرح دمک رہا ہے اور جو حرکت اُس سے ہوگئی ہے اُس پر رو رہا ہے۔

بادشاہ:۔ گرٹرود۔ اب یہاں سے چلو۔ کل صبح ہی آفتاب کی کرنیں پہاڑوں کی چوٹیوں پر چمکنے نہ پائینگی کہ ہم ہیملٹ کو جہاز پر سوار کر کے یہاں سے روانہ کر دینگے۔ اور اُس کی نالائق حرکت کی صفائی کے بارے میں ہم اپنی دانشمندی اور دبدبۂ شاہی سے کام لیکر غور کرینگے گلڈنسٹرن!

(گلڈنسٹرن اور روزنکرانز پھر کمرے میں آتے ہیں)

تم دونوں ہمارے سچے وفادار و جاں نثار ہو۔ جاؤ۔ اور کچھ اور لوگوں کو بھی ساتھ لو، ہیملٹ نے حالتِ جنون میں پلونیوس کو قتل کر دیا ہے اور اُس کی لاش کو اپنی ماں کے کمرے سے گھسیٹتا ہوا کہیں لے گیا ہے۔ تم جاؤ۔ اور اُسے تلاش کرو۔ بات چیت اُس سے نرمی سے کرنا اور لاش کو لیکر گرجا میں جلد آ جاؤ۔

(روزنکرانز اور گلڈنسٹرن چلے جاتے ہیں)

ہم اپنے دانا اور عاقل ترین مشیروں کو بُلا کر اُن سے یہ واقعہ کہتے ہیں اور جو کچھ ہم نے قصد کیا ہے وہ بھی اُن کے سامنے بیان کرینگے۔ اور جس طرح یہ خون بدقسمتی سے ہوا ہے اُس کا حال بھی کہیں گے۔ ممکن ہے کہ تہمت اور بہتان نے اپنی سرگوشیاں دُنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس طرح پہونچائیں ہوں جیسے توپ اپنے زہریلے گولے کو نشان پر پہونچاتی ہو۔ بس ہماری کوشش ہو گی کہ تہمت اور بہتان ہمارے نام کو اپنا ہدف نہ بنائیں؛ اور اُن کے تیر خالی خُولی ہوا میں پہونچکر بے اثر ہو جائیں۔ ملکہ چلو۔ اِس وقت میرے دل میں خوف اور پریشانی بہت ہے۔

دوسرا منظر:۔ شاہی قصر کا دوسرا کمرہ

(ہیملٹ اندر آتا ہے)

ہیملٹ:۔ لاش کو میں نے خوب چھپا دیا ہے۔

روزنکرانز اور گلڈنسٹرن:۔ (اندر سے پکارتے ہیں) شہزادہ ہیملٹ! حضور ہیملٹ!

ہیملٹ:۔ لیکن سُنو۔ یہ آواز کیسی ہے۔ ہیملٹ کو کون پکارتا ہے؟ اچھا پکارنے والے سامنے ہی آ گئے۔

(روزنکرانز اور گلڈنسٹرن آتے ہیں۔)

روزنکرانز:۔ حضور نے لاش کیا کی؟

ہیملٹ:۔ خاک کو خاک میں ملا دیا جس کی وہ جنس تھی۔

روزنکرانز:۔ مگر آخر بتایئے تو وہ ہے کہاں تاکہ ہم اُسے اُٹھا کر گرجا میں پہونچائیں۔

ہیملٹ:۔ ہرگز یقین نہ کرو۔

روزنکرانز:۔ کس بات کا یقین؟

ہیملٹ:۔ کہ میں تمہاری رائے مانونگا اور اپنی رائے پر نہ چلونگا۔ علاوہ اس کے اگر کوئی اسفنج مجھ سے کچھ سوال کریگا تو میں اُسے جواب دینا اپنا فرض نہ سمجھونگا۔ بادشاہ کا فرزند ہو کر میں ایک اسفنج کو کیا جواب دے سکتا ہوں۔

روزنکرانز:۔ کیا حضور مجھے اسفنج سمجھتے ہیں؟

ہیملٹ:۔ ہاں۔ ضرور ضرور میں تمہیں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ جو بادشاہ کی عنایات حکم و احکام انعام و اکرام کو اسی طرح اپنے میں جذب کر لیتے ہیں جیسے اسفنج پانی کو چُوس لیتا ہو۔ اِس قسم کی خدمات بادشاہ ہی کو آخر میں فائدہ پہونچاتی ہیں۔ تم جیسے خدمت گزاروں کو بادشاہ بندر کی مثل اپنے کلّے میں ایک طرف اخروٹ کی طرح رکھ لیتا ہے۔ پہلے مُنہ میں رکھتا ہے پھر حلق میں اُتار لیتا ہے تمہاری جاسوسی سے جو کچھ معلوم کرنا ہو معلوم کر لیتا ہے۔ پھر کچھ مطلب تم سے نہیں رکھتا۔ اور جب وہ تمہیں دبا کر سب کچھ نکال لیتا ہے تو پھر تم خُشک ہو جاتے ہو۔

روزنکرانز:۔ میں حضور کا مطلب نہیں سمجھا۔

ہیملٹ:۔ یہ سُنکر مجھے خوشی ہوئی۔ کیونکہ جو کچھ میں نے کہا تھا وہ ایک شرارت کی بات تھی جو ایک احمق کے کان میں کہی تھی۔

روزنکرانٹز:- حضور یہ فرمائیں کہ لاش آپ نے کہاں رکھ دی ہے اور ہمارے ہمراہ بادشاہ سلامت کی حضور میں حاضر ہوں۔

ہیملٹ:- لاش تو بادشاہ کے ساتھ ہے لیکن بادشاہ لاش کے ساتھ نہیں۔ بادشاہ ایک مُردہ چیز ہے۔

روزنکرانٹز:- بادشاہ ایک مُردہ شے ہے!

ہیملٹ:- ہاں وہ لاشے ہے۔ مجھے اُس کے سامنے لے چلو۔ آؤ۔ آنکھ مچولی ہو جائے۔ دیکھو یہ چور چلا۔ سب پیچھے پیچھے دوڑو۔

تیسرا منظر:- قصرِ شاہی کا ایک اور کمرہ

بادشاہ مع اہلِ دربار کے اندر آتا ہے۔

بادشاہ:- روزنکرانٹز کہو کیا گزری؟

روزنکرانٹز:- لاش کہاں ہے۔ ہم یہ بات شہزادے سے دریافت نہ کر سکے۔

بادشاہ:- مگر وہ خود کہاں ہے؟

روزنکرانٹز:- باہر کھڑے ہیں۔ پہرا لگا دیا گیا ہے۔ حضور کے حکم کا انتظار ہے۔

بادشاہ:- اُسے ہمارے سامنے لاؤ۔

روزنکرانٹز:- گلڈنسٹرن۔ شہزادے کو بادشاہ سلامت کے سامنے لاؤ۔

(ہیملٹ اور گلڈنسٹرن بادشاہ کے سامنے حاضر ہوتے ہیں)

بادشاہ:- کہو ہیملٹ پلونیوس کہاں ہے؟

ہیملٹ:- پلونیوس دعوت کھانے گیا ہے۔

بادشاہ:- دعوت کہاں ہے؟

ہیملٹ:- وہاں ہے جہاں وہ دعوت نہیں کھاتا بلکہ دعوت اُسکو کھاتی ہے۔ بڑے بڑے صاحب تدبیر کیڑوں کے ایک مجمع نے اُسے نوش کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کیڑا ہی وہ جاندار ہے جو ایک شہنشاہ کو اپنی غذا بناتا ہے۔ ہم جانوروں کو موٹا کرکے کھاتے ہیں کہ اُنکو کھا کر خود موٹے ہو جائیں اور پھر اس فربہی میں کیڑے ہمیں کھاتے ہیں۔ آپ کا موٹا بادشاہ اور آپ کا دُبلا فقیر یہ دونوں ایک ہی دسترخوان پر دو مختلف قسم کے کھانے ہیں۔ پھر اس کے بعد سب کا خاتمہ ہے۔

بادشاہ:- افسوس! افسوس!

ہیملٹ:- جس کیڑے نے بادشاہ کو کھایا ہے انسان اُسے کانٹے میں لگا کر اُس سے مچھلیاں پکڑ سکتا ہے اور پھر وہ اُس مچھلی کو کھا سکتا ہے جس نے کانٹے والے کیڑے کو کھایا تھا۔

بادشاہ:- ہیملٹ ان باتوں سے تمہارا کیا مطلب ہے؟

ہیملٹ:- صرف آپکو یہ بتانا مقصود ہے کہ ایک بادشاہ فقیر کی آنتوں میں سے کیونکر گزر سکتا ہے۔

بادشاہ:- پلونیوس کہاں ہے؟

ہیملٹ:- بہشت میں۔ اور وہاں اس لئے بھیجا گیا ہے کہ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھیے۔ اگر آپکے قاصد کو وہاں نہ ملے تو پھر دوسری جگہ (دوزخ میں) آپ اُسے خود تلاش کریں۔ اور اگر اس مہینے میں اُسکا کہیں پتہ نہ چلے تو جب سیڑھیاں چڑھ کر آپ بالاخانے پر جانے لگیں گے تو اُسکی عفونت خود محسوس کر لینگے۔

بادشاہ:- (دربار کے خُدّام سے کہتا ہے) جاؤ۔ وہیں جا کر اُسے ڈھونڈو۔

ہیملٹ:- جب تک تم وہاں پہونچوگے لاش وہیں بیٹھی رہیگی۔

بادشاہ:- ہیملٹ۔ تمہاری یہ حرکت ایسی ہے کہ جس نے خود تمہاری جان کو خطرے میں ڈالا ہے۔ ہمیں تمہارا خیال ہے اور تمہارے کام کو نہایت رنج و افسوس کے ساتھ دیکھتے ہیں مُناسب سمجھتے ہیں کہ تم کو یہاں سے روانہ کر دیں اور یہ روانگی نہایت جلد بڑی سُرعت کے ساتھ ہو۔ بس تم سفر کے لئے تیار ہو جاؤ۔ جہاز تیار ہے۔ ہوا موافق ہے۔ ساتھ جانے والے بھی حاضر ہیں اور تمہاری انگلستان کو روانگی کے لئے تیار ہیں۔

ہیملٹ:- انگلستان جانے کے لئے؟

بادشاہ:۔ ہاں۔ ہیملٹ۔

ہیملٹ:۔ اچھا ہے۔

بادشاہ:۔ بلاشبہ اچھا ہے۔ اگر تم کو ہمارے مقاصد معلوم ہو گئے ہیں۔

ہیملٹ:۔ میں تو ایک چھوٹے سے فرشتے کو دیکھ رہا ہوں کہ آسمان سے وہ جھانک رہا ہے اور وہی آپ کے مقاصد سے واقف ہے۔ بس اب چلوں۔ انگلستان جانا ہی۔ پیاری اماں، خدا حافظ۔

ملکہ:۔ اپنے مہربان اور محبت کرنے والے باپ کو بھی تو خدا حافظ کہہ لو۔

ہیملٹ:۔ نہیں، میں تو اپنی اماں کو خدا حافظ کہتا ہوں۔ ماں اور باپ زن و شو ہوتے ہیں۔ اور وہ دونوں ایک تن ہوتے ہیں۔ پس ماں سے خدا حافظ کہنا کافی ہے۔ آؤ۔ چلو انگلستان چلیں۔

بادشاہ:۔ ہمراہی شہزادے کے ساتھ پیادہ پا جائیں اور حتی الامکان کوشش کریں کہ وہ جہاز پر جلد سوار ہو جائے۔ بس یہی کرنا ہم چاہتے ہیں کہ آج ہی شب کو اس کی روانگی عمل میں آئے۔ بس جاؤ۔ تمام حکم احکام پروانہ جات تیار ہو چکے ہیں اور ان پر مہر بھی ہو چکی ہے۔ کل معاملہ ختم ہو چکا ہے۔ مہربانی کر کے جلدی کرو۔ (روزنکرانز اور گلڈنسٹرن باہر جاتے ہیں۔)

اور اے انگلستان اگر تجھے ہمارے ساتھ اتنا ہی تعلق ہے جتنا کہ ہماری قوت و صولت کا علم تجھے خبردار رکھتا ہے۔ تیرے زخم جو ڈنمارک کی تلوار نے تجھے پہونچائے تھے ابھی تک ہرے ہیں۔ تو نے ہم سے خوف کھا کر ہماری اطاعت قبول کی ہے اس لئے ہمارے شاہانہ احکام سے تو بے پروا نہ ہوگا۔ جو خطوط کے ذریعہ مفصل کیفیت کے ساتھ ہم روانہ کر رہے ہیں۔ اور جن میں تحریر ہے کہ ہیملٹ کو فوراً پہونچتے ہی ہلاک کر دیا جائے۔ انگلستان تجھ سے درخواست ہے کہ تو اس کام کو کر دے۔ یہ شہزادہ ہمارے حق میں تپ محرقہ بن کر خون میں زہر پھیلا رہا ہے۔ تو ہی ہمیں اس مرض سے شفا بخش سکتا ہے۔ جب تک یہ کام نہ ہو جائیگا مجھے کسی بات سے خوشی میسر نہ ہوگی۔

چوتھا منظر:۔ ڈنمارک کا ایک وسیع میدان

فورتن براس، ایک کپتان اور سپاہ مارچ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

فورتن براس:۔ کپتان۔ تم شاہ ڈنمارک کی خدمت میں حاضر ہو اور میرا سلام پہونچا کر کہنا کہ فورتن براس سابقہ حکم کے مطابق بادشاہ سے اجازت چاہتا ہے کہ وہ مع فوج کے بادشاہ کی سلطنت میں سے گزرے جس جگہ ملاقات کا اہتمام کیا گیا ہے اس سے تم واقف ہو۔ اگر بادشاہ ڈنمارک میری حاضری ضروری سمجھیں تو نہایت خوشی سے شاہ موصوف کے سلام کو حاضر ہو سکتا ہوں اور یہی تم بادشاہ سے عرض کر دینا۔

کپتان:۔ جس طرح حضور نے فرمایا ہے اسی طرح بادشاہ کی خدمت میں عرض کروں گا۔

(ہیملٹ، روزنکرانز اور گلڈنسٹرن اور اور لوگ آتے ہیں)

ہیملٹ:۔ مہربان۔ یہ کس کی فوج ہے؟

کپتان:۔ بادشاہ نوروے کی سپاہ ہے۔

ہیملٹ:۔ اتنا اور فرمائیے کہ کس غرض سے کہاں کا قصد رکھتی ہے۔

کپتان:۔ پولستان کے ایک حصے پر چڑھائی کرنے جا رہی ہے۔

ہیملٹ:۔ فوج کا سپہ سالار کون ہے؟

کپتان:۔ بادشاہ نوروے کا برادرزادہ فورتن براس فوج کا افسر اعلیٰ ہے۔

ہیملٹ:۔ کیا یہ لشکر پولستان خاص پر چڑھائی کرتے جا رہا ہے یا پولستان کے کسی سرحدی مقام کا قصد رکھتا ہے؟

کپتان:۔ سچ پوچھیے تو بات صرف اتنی ہے کہ اس وقت ہم زمین کے ایک ٹکڑے کیلئے جا رہے ہیں جس کے حاصل کرنے میں سوائے نام

ے کوئی مفاد نہیں۔ پانچ اشرفیاں سالانہ لگان دیکر بھی میں اُس ٹکڑے کو کاشت کرنا گوارا نہ کروں اور نہ زمین کا یہ ٹکڑا اگر ناروے یا پولستان نے کسی شخص پر فروخت کرنا چاہا تو اس سے زیادہ منافع حاصل ہوسکے گا۔

ہیملٹ :۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ پولستان دشمن سے اِس زمین کو بچانے میں کچھ کوشش بھی نہ کریگا۔

کپتان :۔ نہیں۔ پولستان نے پہلے ہی سے وہاں اپنی فوجیں بٹھادی ہیں۔

ہیملٹ :۔ دو ہزار جانیں اور بیس ہزار اشرفیاں کافی قیمت نہیں ہیں کہ یہ معاملہ بغیر لڑے طے ہوجائے۔ یہ دولت اور امن کے بڑھ جانے کے نتیجے ہیں، جو جِرمِ سلطنت میں ایک اندرونی پھوڑے کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور یہ پھوڑا خود پھوٹ کر جان کو ضائع کردیتا ہے۔ اور موت کا سبب بالکل ظاہر نہیں ہونے پاتا۔ میں آپ کا شکرگزار ہوا۔ خدا آپکی مدد کرے۔

روزنکرانز:۔ حضور آپ آگے چلیں۔

ہیملٹ :۔ تم آگے بڑھو میں ابھی آتا ہوں (سب چلے جاتے ہیں۔ ہیملٹ تنہا رہ جاتا ہے)

ہر موقع بر محل مجھے متنبہ کرکے انتقام کشی کی طرف اشتعال دیتا ہے۔ اِنسان کوئی چیز نہیں اگر اس کی زندگی اور اُس کے وقت کا مطلب صرف اتنا ہو کہ کھائے اور سو رہے۔ اگر یہی ہے تو پھر وہ حیوانِ مطلق سے زیادہ نہوا۔ یقینی وہ خالق کون و مکاں جس نے ہمیں عقل و حواس دیکر پیدا کیا تاکہ ہم پس و پیش سوچکر قدم ڈالیں، اُس نے یہ عقل و قوتِ مُدرکہ اسلئے نہیں عطا کی کہ ہم اس سے کچھ کام نہ لیں، اور اس طریقہ سے اُسے بیکار اور فرسُودہ کردیں۔ یا تو مجھ میں حیواناتِ مطلق کی سی یہ فراموشی ہے یا بُزدلی اور تذبذب ہے کہ میں ہر بات کو سوچتا بہت ہوں اگر میں اپنے ان خیال کو چار پارہ کروں تو ایک حصہ اُس میں عقل اور تین حصے غفلت و بُزدلی پائی جائیگی۔ میں نہیں سمجھتا کہ کیوں میں اب تک یہ کہنے کو زندہ ہوں کہ ابھی مجھے یہ بات کرنی ہے۔ اس کام کو ختم کرنے کیلئے میرے پاس وجہ، ارادہ، ہمت اور ذرائع موجود ہیں۔ مثالیں بھی ایسی واضح اور روشن نظر آتی ہیں جو مجھے سمجھاتی ہیں کہ جوکچھ کرنا ہے جلد کرو۔ ذرا اِس لشکر کو دیکھئے۔ اس کے حجم اور قوت کو ملاحظہ کیجئے جو ایک کمزور اور نازک شہزادے کی سرکردگی میں جارہا ہے اِس شہزادے میں مُلک گیری کا جوش موجزن ہے۔ لڑائی کی وجہ اور انجام پر وہ ہنستا ہے۔ مگر جوکچھ فانی اور غیر یقینی ہے اُسے موت اور خطرے کی بازی میں لگا دیتا ہے۔ اور یہ سب کن چیزوں کے لئے؟ اُس چیز کیلئے جو ایک خالی انڈے کے چھلکے کے برابر ہے۔ اِنسان وہی بڑا ہے جو لڑنے کیلئے کسی بڑی وجہ یا دلیل کی ضرورت نہ سمجھے بلکہ جب عزت کا سوال درمیان ہو تو خفیف سی خفیف بات پر بھی لڑ بیٹھے۔ اب میرا حال سُنو کہ میرا باپ مارا گیا۔ ماں کے دامن عصمت پر بدنامی کا داغ لگا۔ میری عقل میں فتور اور خون میں وحشت پیدا ہوئی۔ مگر میں نے اِن سب باتوں پر بھی خوابِ غفلت طاری رکھا۔ شرمندہ و خجل ہوکر دیکھ رہا ہوں کہ بیس ہزار جانوں کا تلف ہونا یقینی امر ہے۔ اور یہ کس لئے؟ محض ایک خیال اور شُہرت کیلئے، جو خود ایک دہوکے سے کم نہیں۔ اور یہ کُل سپاہ اپنی قبروں میں اس طرح جانے کو ہے جیسے کوئی آرام کی نیند لینے اپنے بستر پر جائے۔ اور زمین کے اتنے سے ٹکڑے کیلئے لڑتی ہے جس پر وہ سب ملکر لڑ بھی نہیں سکتے اور جس میں اتنی گنجائش بھی نہیں کہ جتنے مارے جائیں اُن کے دبانے کیلئے اُس میں قبرستان بن سکے۔ اے دل، اب سے میرے خیالات خونی ہوجانے چاہئیں۔ یا پھر وہ بالکل بے وقعت سمجھے جائیں۔

پانچواں منظر :۔ السینور کا قلعہ۔ قصر کا ایک کمرہ

ملکہ، ہورشیو اور چند درباری آتے ہیں۔

ملکہ :۔ میں اُس سے بات نہ کرونگی۔

درباری :۔ حضور، وہ بہت اصرار کرتی ہے بلکہ اُسکا یہ اصرار جنون تک

پہونچا ہے۔ اُسکی حالت واجب الرحم ہے۔

ملکہ:۔ مجھے اس سے کچھ سروکار نہیں۔

درباری:۔ وہ اکثر اپنے باپ کو یاد کرتی ہو اور کہتی ہے کہ دُنیا میں عجیب عجیب باتیں ہوا کرتی ہیں۔ وہ کبھی کھانستی ہے کبھی اپنا سینہ پیٹتی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر غصّہ کرنے لگتی ہو۔ کچھ ایسے مشکوک اور مشتبہ الفاظ زبان پر لاتی ہے جن میں بعض کے معنی ہوتے ہیں اور بعض مُہمل ہوتے ہیں۔ اکثر باتوں کا کچھ مطلب نہیں نکلتا لیکن اُس کے کہنے میں کچھ ایسی سادگی اور بھُول پن ہوتا ہے کہ سُننے والے اُن سے مطلب پیدا کرنا چاہتے ہیں اور اپنے اپنے خیال کے مطابق اُن سے معنی پیدا بھی کر لیتے ہیں۔ اُس کے الفاظ کو اس طرح اُلٹ پلٹ کر جوڑتے ہیں کہ اپنے ہی خیال کے مطابق جس طرح چاہیں اُن سے معنی پیدا کرلیں۔ اور لوگوں کے سامنے جو اشارے یا حرکتیں وہ کرتی ہے یا جس جس طرح سر ہلاتی ہو اُن سے بھی کچھ مطلب نکالیں۔ اتنا ضرور سمجھ میں آتا ہے کہ اُس کے الفاظ میں کوئی خیال مخفی ہے، گو کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی مگر تمام گفتگو اور حرکتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی سخت رنج والم میں مُبتلا ہے۔

ہوریشیو:۔ نامناسب معلوم ہوتا ہو کہ حضور اُس سے مُلاقات نہ کریں۔ حضور کے نہ ملنے سے لوگوں میں خطرناک شکوک پھیل جائیں گے۔

ملکہ:۔ اچھا اُسے اندر آنے دو۔

(ہوریشیو باہر چلا جاتا ہے)

میری گُنہگار روح، جیساکہ اکثر گنہگاروں کا حال ہوتا ہے، خفیف سے خفیف بات کو بھی یہی سمجھتی ہے کہ وہ کسی پُرخطر معاملہ کا مُقدمہ ہے۔ مجرم اور گنہگار کے دل میں کچھ ایسے شکوک اور شُبے بھرے ہوتے ہیں کہ افشائے راز کا خوف اس کے گناہ کی دلیل بن جاتا ہے۔

(ہوریشیو اور اوفیلیا اندر آتے ہیں۔)

اوفیلیا:۔ ڈنمارک کی حسین ملکہ کہاں ہیں؟

ملکہ:۔ اوفیلیا۔ کہو تمہارا مزاج کیسا ہے؟

اوفیلیا:۔ (گانے میں کہتی ہے) مجھے کیونکر معلوم ہو کہ تمہارا عشق بہ نسبت دوسرے کے عشق کے زیادہ سچّا ہے۔ ٹوپی میں سیپ لگائے۔ ہاتھ میں ملیا ساعصا لئے جوتیوں پر غلاف تسموں سے بندھے۔

ملکہ:۔ افسوس! اے حسین لڑکی۔ اِس وقت اِس گیت کے گانے کا کیا محل تھا؟

اوفیلیا:۔ زبان سے کہو بھی اور اُسکے حق میں دعا بھی کرو۔

(گاتی ہے)

وہ مر گیا اور رُخصت ہوا، اے ملکہ

وہ ختم ہوا اور چلا گیا۔ اُسکے سر کے نیچے ہری ہری گھاس کا تکیہ ہے۔ اور پاؤں کے نیچے ایک پتھر رکھا ہے۔

ملکہ:۔ اوفیلیا۔ کچھ بتاؤ تو تمہارا حال کیا ہے۔

اوفیلیا:۔ نہیں ذرا سُنیئے تو۔ (گاتی ہے)

اُس کا کفن ایسا اُجلا ہو جیسے پہاڑ پر اُجلی برف ہو۔

(بادشاہ اندر آتا ہے۔)

ملکہ:۔ بادشاہ سلامت۔ آپ اس لڑکی کا حال دیکھتے ہیں۔

اوفیلیا:۔ (اپنا گیت جاری رکھتی ہے) کفن پر پھول بچھے تھے۔ لوگ اُسے دیکھکر روتے تھے۔ اور یہی آنسوؤں کی جھڑی میں اُسے قبر تک لے گئے۔

بادشاہ:۔ اے پیاری معصومہ۔ تیرا مزاج کیسا ہے؟

اوفیلیا:۔ خدا آپکو اس کا نیک اجر دے۔ لوگ کہتے ہیں کہ نان بائی کی بیٹی اُلّو بنا دی گئی تھی۔ اے خدا ہم جو کچھ بھی ہیں جانتے ہیں کہ کیا ہیں مگر اس کی خبر نہیں کہ آئندہ کیا ہو جائیں گے۔ خدا ایسا کرے کہ کھاتے وقت وہ تمہارے ساتھ ہو۔

بادشاہ:۔ باپ کے خیال میں ہے۔

اوفیلیا:- مہربانی کرکے ایسی کوئی بات زبان پر نہ لائیے، لیکن جب وہ پوچھیں کہ اس کا کیا مطلب ہے تو کہئے (گاتی ہے) کل سینٹ ولنٹین کا دن ہے۔ میں کل صبح سویرے تمہاری کھڑکی کے نیچے آؤں گی کہ تمہاری منگیتر بنوں۔

بادشاہ:- یہ حال اس کا کب سے ہے؟

اوفیلیا:- سب خیریت رہے گی۔ صبر وشکر کرنا چاہئیے، لیکن مجھے تو سوائے رونے کے دوسری بات بھلی نہیں لگتی۔ جب خیال آتا ہے کہ ٹھنڈی ٹھنڈی زمین پر اُسے لٹایا ہوگا۔ اب میں آپکے صلاح مشورے کا شکریہ کرتی ہوں۔ گاڑی لاؤ۔ اچھا بیوی نہیں خُدا کے سپرد کیا۔ میری اچھی بیوی تمہارا خُدا نگہبان ہے۔

(اوفیلیا چلی جاتی ہے)

بادشاہ:- دیکھو۔ اس کے ساتھ آدمی برابر رہیں اور اس پر نظر رکھیں۔ (ہوریشیو چلا جاتا ہے۔)

افسوس! یہ تو غم کا انتہائی بُرا اثر ہے اور یہ سارا غم باپ کے مرنے سے اس میں پیدا ہوا ہے۔ اے گرترود۔ گرترود جب آلام سر پر آتے ہیں تو ایک غم نہیں ہوتا بلکہ غموں کا پورا لشکر ہوتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہوئی کہ اوفیلیا کا باپ مارا گیا۔ اس کے بعد تمہارے فرزند کو مُلک سے جانا پڑا۔ اُس نے حرکت ہی ایسی سخت کی کہ مجبور ہوکر اُسے مُلک بدر کرنا پڑا اور یہی قرین انصاف بھی تھا۔ رعایا کے دل میں طرح طرح کے بُرے خیالات اور تاریک شکوک پیدا ہوکر عجیب عجیب افواہیں اُڑ رہی ہیں۔ اور یہ سب پلونیوس کی موت کے متعلق ہیں۔ یہ ہماری ناتجربہ کاری تھی کہ اس گڑبڑ میں ہمنے وزیر کی لاش دفن کروادی۔ اس صدمے میں اوفیلیا کا دل اُلٹ گیا۔ جب دماغ صحیح نہ رہے تو انسان انسان نہیں رہتا بلکہ اُس کی محض ایک تصویر یا حیوان مطلق رہ جاتا ہے اور ان سب باتوں پر طرّہ یہ ہے کہ اوفیلیا کا بھائی فرانس سے چپ چاپ یہاں آگیا ہے، باپ کی موت پر حیرت زدہ ہے۔ ہر وقت رنج والم میں مبتلا سب سے الگ تھلگ رہتا ہے۔ اس حال میں گپ اُڑانے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ یہ اُسکے کان میں باپ کے مارے جانے کے عجیب عجیب قصے پھونک رہے ہیں۔ ان لوگوں کو ہر وقت یہی دُھن سوار رہتی ہے کہ کوئی بات ایسی ہاتھ لگے جسے وہ پلونیوس کی موت کی وجہ قرار دیں۔ جب کوئی بات نہیں ملتی تو وہ خاص مجھ پر الزام رکھنے میں مطلق پرہیز نہیں کرتے اور ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جو اُس کے باپ کے متعلق طرح طرح کی خبروں سے اُس کے کان نہ بھرتے ہوں چونکہ حقیقت سے ناواقف ہیں اس لئے جو بات سُناتے ہیں وہ ایسی ہوتی ہے جس سے موت کا الزام ہم پر عائد ہو۔ پیاری گرترود۔ اس وقت تو ہمارا حال یہ ہے کہ جیسے مُہلک توپ سے گولا نکل کر بیسیوں اور بیسیوں جگہ ہمیں زخمی کرکے موت تک پہنچا دے۔ سُنو۔ یہ کیسا شور ہے؟ ہمارے سوئیس سپاہی کہاں ہیں؟ اُنکو ہماری حفاظت کیلئے دروازوں پر آکر کھڑا ہوجانا چاہئیے۔

(دوسرا درباری اندر آتا ہے۔)

کیا بات ہے؟

درباری:- حضور اپنی حفاظت پر نگاہ رکھیں۔ سمندر بھی جوش وخروش میں آکر اور اپنے کناروں سے باہر ہوکر مسطح زمینوں کو اس طرح غرق نہیں کرتا جس طرح کہ لے ارتیز غوغائیوں اور بلوائیوں کے ایک انبوہ کثیر کو ساتھ لئے تیزی اور سُرعت سے حضور کے مُلازمین و متوسلین کو مجروح و مغلوب کر رہا ہے، جو انبوہ اسکے ساتھ ہے وہ لے ارتیز کو بادشاہ کہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ دُنیا گویا آج شروع ہوتی ہے۔ قدامت کو فراموش اور قدیم آئین و قوانین اور سابق کے تمام عہد و پیمان قول وقرار کو یکطرف کرکے وہ سارے میں چیختے پھرتے ہیں کہ بادشاہ کو منتخب کرنا ہمارا کام ہے اور ہم نے ارتیز کو بادشاہی پر نامزد کرتے ہیں کہ ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر ٹوپیاں اُچھال اُچھال کر وہ پھٹے گلے لے ارتیز کی تعریف میں

اس زور سے نعرے بلند کرتے ہیں کہ اُن کا شور آسمان تک پہونچتا ہے۔ "لے ارتیز بادشاہ ہوگا" "لے ارتیز بادشاہ ہوگا" یہی سب کی زبان پر ہے۔

ملکہ :- ڈنمارک کے یہ خبیث کتے اصل شکار کے پیچھے دوڑتے دوڑتے غلط راہ پر پڑ گئے ہیں، مگر اس حال میں بھی خوش ہو ہو کر غُل مچاتے ہیں۔

بادشاہ :- محل کے دروازے ان بلوائیوں نے توڑ دیئے ہیں۔

(لے ارتیز ہتیار لگائے آتا ہے۔ اس کے پیچھے بہت سے لوگ ڈنمارک کے ہیں۔)

لے ارتیز :- ارے یہ بادشاہ کہاں ہے؟ (اپنے ہمراہیوں سے کہتا ہے) تم سب باہر رہو۔

ساتھ والے :- ہمیں بھی اندر آنے دیجئے۔

لے ارتیز :- نہیں۔ آپ سب سے کہتا ہوں کہ کچھ دیر مجھے بادشاہ سے تنہا بات چیت کرنے دیجئے۔

ساتھ والے :- بہت اچھا۔ بہت مناسب۔

لے ارتیز :- (اپنے ساتھ والوں سے) میں آپکا شکرگزار ہوا۔ دروازے پر پہرا دیتے رہیئے۔

اے خبیث بادشاہ۔ میرا باپ مجھے دے۔

ملکہ :- لے ارتیز۔ تم تو اچھے آدمی تھے۔ جو کچھ کہنا ہو آہستگی سے کہو۔

لے ارتیز :- اگر آہستگی یا سلامت روی کا ایک قطرہ بھی میرے خون میں ہو تو میں اپنے باپ کا بیٹا نہیں۔

بادشاہ :- لے ارتیز۔ کچھ کہو تو کہ آخر اس جوش و خروش کی وجہ کیا ہے۔ تمہارا یہ ہنگامہ تو ایک باولا بھوت معلوم ہوتا ہے۔ ملکہ۔ تم لے ارتیز کو جو کچھ وہ کہے کہنے دو۔ ہمارا خیال نہ کرو۔ بادشاہ پر خُدا کی اتنی رحمتیں اور برکتیں حلقہ کئے ہوتی ہیں کہ سرکشی اور انحراف دُور کھڑے شرارتیں سوچتے ہیں۔ لیکن ایک کو بھی بادشاہ کی طرف بڑھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ لے ارتیز کوئی سبب تو بیان کرو کہ کیوں تم نے یہ فساد برپا کیا ہے۔ گرٹرود تم بیچ میں نہ بولو۔ ہاں لے ارتیز جو شکایت ہو وہ بیان کرو۔

لے ارتیز :- میرا باپ کہاں ہے؟

بادشاہ :- مر گیا۔

ملکہ :- لیکن بادشاہ نے اُسے نہیں مارا۔

بادشاہ :- ملکہ۔ تم دخل نہ دو۔ جو کچھ اُسے کہنا ہے کہہ لینے دو۔

لے ارتیز :- میرا باپ کیونکر مرا۔ دیکھو، مجھے کبھی دھوکے میں نہ رکھو۔ جہنم میں جائے بادشاہ کی اطاعت اور وہ عہد وفاداری جو بادشاہ کے ساتھ کیا تھا۔ اور شیطانِ سیاہ رُو کے حوالے ہوں وہ سب قسمیں اور حلف جو بادشاہ کی اطاعت و فرمانبرداری کے لئے اُٹھاتے تھے۔ خیر و برکت، ایمان و ضمیر سب دوزخ کے گہرے سے گہرے غار میں جا گریں۔ مجھے واصل جہنم ہونے کی پروا مطلق نہیں۔ میں اپنے قول پر مضبوط ہوں۔ دین و دُنیا دونوں ہیچ سمجھتا ہوں۔ جو کچھ ہونا ہے وہ ہو جائے۔ مجھے اپنے باپ کی موت کا انتقام اچھی طرح لینا ہی۔

بادشاہ :- تو کیا تم اُسکے دشمنوں کو معلوم کرنا چاہتے ہو؟

لے ارتیز :- جو میرے باپ کے دوست تھے اُن سے تو میں ہاتھ پھیلا کر بغل گیر ہونا چاہتا ہوں اور اُن کے ساتھ میرا حال وہی ہوگا جو پیلیکن پرندہ کا ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچّوں کو اپنے خون کے قطرے ٹپکا کر پیدا کرتا ہے۔

بادشاہ :- اچھا دیکھو، اب تم ایک اچھے جوان اور شریف زادے کی طرح باتیں کرنے لگے۔ سمجھ لو کہ میں تمہارے باپ کی موت کا باعث ہرگز نہیں ہوا۔ اُسکی موت کا مجھے بیحد رنج و صدمہ ہے۔ رہا یہ امر کہ تمہارے باپ کو کس نے ہلاک کیا تو یہ تمہارے دل و دماغ پر اس طرح روشن ہوگا جیسے آفتاب کی روشنی تمہاری نظر کو محسوس ہوتی ہے۔

ہمراہی:- (جو باہر کھڑے ہیں) ہاں اوفیلیا کو اندر جانے دو۔

لے ارتیز:- یہ کیسا غل ہے۔ کیا بات ہے؟

(اوفیلیا پھر اندر آتی ہے)

اے حدت و تمازت میرا دماغ خشک کردو۔ اے سیلِ اشک کے نمکِ شور میری آنکھوں کا نور جلا دے۔ قسم ہے جنے میری اِس پیاری بہن کو دیوانہ بنایا اُس سے نہایت سخت انتقام لونگا۔ میزانِ درد و عذاب میں دشمنوں نے جو تکلیفیں پہونچائی ہیں گو اِس وقت اُس کا پلڑا جھکا ہوا ہے لیکن میرا انتقام ایسا ہوگا کہ یہی بھاری پلڑا مقابلہ میں ہلکا ہوکر میزان کی ڈنڈی کو چھونے لگے گا۔ اے بہار کے پھول۔ پیاری لڑکی۔ عزیز بہن۔ حسین اوفیلیا۔ خدایا کیا ممکن ہے کہ ایک جوان لڑکی کے ہوش و حواس اِس طرح معطل ہوجائیں جیسے ایک مردِ پیرانہ سال کی زندگی معرضِ خطر میں ہوتی ہے۔ محبت میں فطرت حسین ہوجاتی ہے اور جب فطرت حسین ہوئی تو بیٹی نے باپ کی محبت میں اپنی فطرت کا خوشترین حصہ قربان کردیا۔

اوفیلیا:- (گاتی ہے) چہرہ بے نقاب کرکے تابوت پر رکھکر اُسے لیگئے
ہے نونی نونے نونے ہے نونے
اور قبر میں اشکوں کی بارش ہونے لگی۔ پیارے
باپ تجھے خدا کو سونپا۔

لے ارتیز:- نہیں اگر تو اپنے حواس میں ہوتی اور بدلہ کو کہتی تو اِس سے زیادہ تحریک انتقام پیدا نہ کرتی۔

اوفیلیا:- (پھر گاتی ہے) تمہیں گانا چاہیئے۔ لے داؤن آ داؤن
اور تم تو اُسے لے داؤن آ کہتے ہو۔
یہ گانا تو ایسا ہے کہ کوئی چرخہ لاکر دے۔ وہ بے ایمان کون تھا جو اپنے آقا کی بیٹی کو چُرا لے گیا۔

لے ارتیز:- یہ بے معنی گفتگو بامعنی گفتگو سے زیادہ پُراثر ہے۔

اوفیلیا:- یہ روزمری کا پھول اپنے سینے پر رکھ کر کہتی ہوں کہ پیارے باپ مجھے بھول نہ جانا۔ اور یہ پانسی کے پھول یادآوری کیلئے ہیں۔

لے ارتیز:- یہ تو صحیفۂ جنون ہے جس میں خیالات اور دوسروں کی یاد درج ہے۔

اوفیلیا:- یہ فینل[1] اور کولمبین کے پھول بادشاہ سلامت کے لئے ہیں اور ریو[2] کی یہ بوٹی حضور ملکہ کے لئے ہے۔ ہمیں اِس بوٹی کا نام عفوِ گناہ کی بوٹی رکھنا چاہیئے۔ میرے خیال میں ملکہ سلامت اس بوٹی کو اتوار کے دن لگا سکیں گی (کیونکہ یہ دن وہ ہے جبکہ وہ اُس گناہ کی معافی مانگ سکتی ہیں جس کا اُنہیں افسوس ہے) یہ پھول آپکو بہت زیب دیگا کیونکہ یہ ناپاک خیالات کا روکنے والا ہے۔ اور یہ پھول ڈیزی کا ہے۔ (جو جوان لڑکیوں کو دیتی ہوں کہ مردوں کی بے وفائی سے ہوشیار رہیں) اور کچھ پھول نرگس کے ہیں۔ جو تمہیں دیتی ہوں۔ لیکن جب میرا باپ مرا تو وہ سب کملا گئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کی موت ایسی ہی اچھی ہوئی جیسے اچھے آدمیوں کی ہوا کرتی ہے۔

(گاتی ہے) میری موت کا دارومدار تو اِس حسین و خبریں بدن پر ہے۔

لے ارتیز:- اِس دیوانگی میں جو خیال زبان سے ادا کرتی ہے وہ دُنیا کی مصیبتوں اور جہنم کے قہر و غضب میں بھی ایک حسن و نزاکت پیدا کردیتا ہے۔

اوفیلیا:- (پھر گاتی ہے) کیا اب وہ نہ آئیگا
کیا اب پھر نہ آئیگا
نہیں نہیں۔ وہ تو مرگیا۔
چاہے تو بھی مرجائے مگر وہ آنیوالا نہیں۔
اُس کی ڈاڑھی بگلے کا پر تھی۔

---

[1] یہ پھول نااحسانمندی خوشامد کرکے دھوکا دینے سے مُراد رکھتے ہیں۔ [2] ریو کی بوٹیوں سے مُراد نفسانی خیالات کو روکنا ہے۔

سر کے بال بھی سفید ہو چکے تھے۔
وہ نواب گیا - چلا گیا -
ہمارا رونا پیٹنا غم کرنا سب ہیچ ہے -
خدا اُسکی روح پر رحمت کرے -
اور سب عیسائیوں کی ارواح کیلئے میں خدا سے دعا کرتی ہوں۔ خدا اُن سب پر اپنی رحمت کرے۔

(اوفیلیا چلی جاتی ہے)

لے ارتیز:- اے خدا تو دیکھتا ہے کہ یہ کیا حال ہے -

بادشاہ:- میں تمہارے غم میں شریک ہوں اور اگر تم اسکا یقین نہ کروگے تو مجھ پر ظلم کروگے - ذرا علیحدہ چلو اور اپنے دانا سے دانا اور ہوشیار سے ہوشیار دوستوں کو ساتھ لوتا کہ وہ کل قصہ سنکر مجھ میں اور تم میں انصاف کریں - اور اگر وہ کسی طرح کی شہادت سے بھی معلوم کریں کہ بواسطہ یا بلا واسطہ ہمارا ہاتھ بھی اِس قتل میں شریک ہے تو میں اپنا تاج و تخت حتیٰ کہ جان تک بلکہ جو کچھ میرا ہے سب نہیں دینے کو تیار ہوں تاکہ تمہارا اطمینان ہوجائے۔ لیکن اگر کوئی شہادت میرے خلاف نہ ملی تو پھر میں تم سے درخواست کرونگا کہ تم چند روز صبر کرو اور ہم اِس امر میں کوشش کرینگے کہ تمہارے دل کو کسی طرح تسلی و اطمینان ہو۔

لے ارتیز:- اچھا مجھے منظور ہے۔ ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ جس طریقے سے اُس کی موت پیش آئی، خفیہ طور پر اُس کی تدفین، قبر پر کسی قسم کا نشان عزت تلوار یا کوئی اور یادگار نصب نہیں کیا گیا۔ یا باضابطہ طریقے پر کوئی نقش و نگار اُسکی تربت پر نہیں بنایا گیا۔ یہ سب باتیں وہ ہیں جو آسمان سے رو رو کر زمین سے کہتی ہیں کہ ہمارے متعلق تحقیقات ہونی چاہیئے۔ اور میں بھی اِنہی امور کی تفتیش چاہتا ہوں -

بادشاہ:- یہ سب کچھ تحقیق کیا جائیگا اور جو اصل مجرم ہوگا وہ گردن زدنی ٹھہریگا۔ بس آؤ۔ میرے ساتھ چلو۔

(سب چلے جاتے ہیں)

چھٹا منظر:- شاہی محل کا ایک دوسرا کمرہ

ہوریشیو اور ایک ملازم آتا ہے۔

ہوریشیو:- وہ کون لوگ ہیں جو مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

ملازم:- چند ملاح ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم آپکے واسطے چند خطوط لائے ہیں -

ہوریشیو:- اچھا اُنہیں اندر آنے دو -

(ملازم چلا جاتا ہے)

سمجھ میں نہیں آتا کہ دُنیا کا وہ کونسا حصہ ہے جہاں سے مجھے خطوط کے ذریعے یاد کیا گیا ہے۔ ہو نہو شہزادہ ہیملٹ نے مجھے یاد کیا ہو۔ اُنکے سوائے دوسرا کون ہو سکتا ہے -

(ملاح اندر آتے ہیں)

پہلا ملاح:- خدا حضور کو سلامت رکھے -

ہوریشیو:- تم بھی سلامت رہو۔

پہلا ملاح:- یہ تو خدا کی مرضی پر ہے۔ وہ چاہیگا تو حضور بھی سلامت رہیں گے۔ آپکے واسطے ہم ایک خط لائے ہیں۔ یہ خط اُس سفیر نے لکھا ہے جو انگلستان روانہ کیا گیا تھا۔ اگر آپکا نام ہوریشیو ہے جیسا کہ مجھکو بتایا گیا ہے تو یہ خط آپکا ہے -

ہوریشیو:- (خط پڑھتا ہے) ہوریشیو، جب تم یہ خط پڑھ لو تو اِن ملاحوں کو بادشاہ کی حضور میں پیش کرادو۔ اِن ملاحوں کے پاس چند خطوط بادشاہ سلامت کے نام کے بھی ہیں - مجھے سمندر پر سفر کرتے دو دن بھی نہیں ہوتے تھے کہ ایک زبردست بحری قزاق نے بڑی تیزی سے اپنا جہاز ہمارے جہاز کے تعاقب میں ڈالا۔ یہ دیکھکر کہ ہمارے جہاز کی رفتار سست ہے ہم لڑائی پر مجبور ہوئے۔ جب قزاقوں نے پاس آکر ہمارے جہاز سے اپنے جہاز کو ملا دیا اور دونوں جہازوں میں

آمد و رفت ممکن ہوگئی تو اتنا دیکھتے ہی میں اپنا جہاز چھوڑ قزاقوں کے جہاز پر آگیا۔ میرے جہاز پر آتے ہی قزاقوں نے اپنا جہاز ہمارے جہاز سے دُور نکال لیا۔ وہ اب میں قزاقوں کا قیدی ہوگیا۔ اُن کا برتاؤ میرے ساتھ ایسی ہی مروّت اور رحمدلی کا رہا جیسے کہ چوروں اور قزاقوں کا ہو سکتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ بس میں چاہتا ہوں کہ میں بھی اِن کے ساتھ نیک سلوک کروں۔ بس میرے خطوط تم بادشاہ کے سامنے پیش کرا دو۔ اور اس کے بعد جہاں تک جلد ممکن ہو گویا موت سے بھاگ رہے ہو تم مجھ سے ملنے آؤ۔ مجھے تمہارے کان میں ایسی باتیں ڈالنی ہیں کہ جب تم سُنو گے تو گُنگ ہو جاؤ گے۔ یہ معاملہ کچھ ایسا عجیب ہے کہ الفاظ اُسے ادا کرنے میں قاصر ہیں۔ یہ ملاح جہاں کہیں بھی میں ہونگا تمہیں میرے پاس لے آئینگے۔ روزنکرانز اور گلڈنسٹرن بدستور انگلستان جا رہے ہیں۔ اُن کی نسبت بھی مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔ خدا حافظ۔ وہ جسے تم جانتے ہو کہ تمہارا دلی دوست ہے۔

ہیملٹ

ہوریشیو:۔ ملاحو آؤ۔ میں تمہیں اِن خطوط کے لئے بادشاہ تک پہونچنے کی راہ بتاتا ہوں۔ اور جب یہ کام ختم ہو جائے تو تم مجھے اُس شخص کے پاس پہونچا دو جسکے پاس سے یہ خط میرے نام لائے ہو۔

ساتواں منظر:۔ شاہی محل کا ایک اور کمرہ۔

بادشاہ اور لے ارتیز داخل ہوتے ہیں۔

بادشاہ:۔ لے ارتیز۔ اب تو تمہارا ایمان اس جُرم سے میری بریت پر گواہی دیگا اور تم سچے دل سے مجھے اپنا دوست سمجھ گئے۔ کیونکہ اب تو تم نے سُن لیا کہ جسنے تمہارے باپ کو مارا تھا وہ دراصل میری جان لینے کی فکر میں تھا۔

لے ارتیز:۔ بے شک سب باتیں معلوم ہوگئیں مگر یہ نہ معلوم ہوا کہ حضور نے ایسے سنگین مجرم کو سزا کیوں نہ دی۔ کیونکہ حفظِ جان اور عقلِ خداداد کی بنا پر مجرم کو سزا دینے کی تحریک حضور میں پیدا ہونی لازمی تھی۔

بادشاہ:۔ صرف دو باتیں ایسی تھیں جن کی وجہ سے میں مجرم کو سزا نہ دے سکا۔ تُم اِن باتوں کو دل کی کمزوری پر محمول کرو گے مگر میں ایسا نہیں سمجھ سکتا تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ شہزادے کی ماں بیٹے کو دیکھکر جیتی ہے اور میرا حال یہ ہے کہ خواہ تم اسکو خوبی سمجھو یا عیب کہ ملکہ میری روح و رواں کے ساتھ ایسی وابستہ ہے جیسے آسمان کے کواکب اپنے افلاک کے ساتھ مخصوص ہیں۔ کوئی ستارہ اپنے فلک سے باہر گردش نہیں کر سکتا۔ اسی طرح بغیر ملکہ کے میرا جینا ناممکن ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ شہزادے کے ساتھ عام رعایا کو بہت محبت بلکہ کہنا چاہیئے کہ عشق ہے۔ شہزادے کی بُرائیاں اپنا رنگ رعایا کی محبت پر نہیں چڑھنے دیتیں۔ اور جیسے ایک ندی کی نسبت مشہور ہے کہ اُس کا پانی لکڑی کو پتھر بنا دیتا ہے۔ اگر شہزادے کے پاؤں میں بیڑیاں بھی پڑی ہوں تو وہ انکو اُسکی نیکیاں سمجھیں گے۔ پس ایسی تیز و تُند آندھی میں میرے تیر اتنے بھاری اور مضبوط نہ تھے کہ وہ اپنے نشانے پر پہونچتے۔ اگر میں انہیں چلاتا بھی تو وہ پلٹ کر میری ہی کمان پر آتے، ہدف پر ہرگز نہ پہونچتے۔

لے ارتیز:۔ غرض اس طرح ایک شریف باپ کا سایہ میرے سر سے اُٹھ گیا۔ ایک بہن دیوانی ہوگئی جب اُس کے ہوش و حواس سلامت تھے تو وہ ایسی لائق اور قابل تھی کہ زمانہ اس کی مثل نہ دکھا سکتا تھا۔ کچھ ہو اب تو مجھے قاتل سے انتقام لینا ضرور ہے۔

بادشاہ:۔ اِس خیال سے پریشان ہو کر راتوں کی نیند حرام نہ کرو۔ ہم کو ایسی کچی مٹی کا بنا نہ سمجھو کہ کوئی ہماری ڈاڑھی پکڑکر جھنجھوڑے گا اور ہم اُسکو ایک کھیل سمجھیں گے۔ کچھ دِنوں بعد

میں تمہیں اطلاع کرونگا۔ مجھے تمہارے باپ کے ساتھ بیحد محبت تھی اور ایسی محبت تھی جو صرف اپنی ذات کے ساتھ ہوسکتی ہے۔ اور یہ بات ایسی ہے جو تمہارے سوچنے کی ہے۔

(ایک قاصد اندر آتا ہے۔)

کہو، کیا خبر ہے؟

قاصد:- شہزادہ ہیملٹ کے چند خطوط حضور کے نام کے ہیں۔ یہ حضور کے نام کا ہے اور یہ ملکہ معظمہ کے نام کا۔

بادشاہ:- کیا خطوط ہیملٹ کے پاس سے آئے ہیں۔ اُنکا لانے والا کون ہے؟

قاصد:- چند ملاح ان خطوں کو لائے ہیں۔ میں نے اُنہیں دیکھا نہیں ہے۔ کلاڈیو نے یہ خط مجھے دیئے تھے اور میں حضور کے سامنے لایا ہوں۔

بادشاہ:- لے ارتیز تم ذرا ٹھہرو۔ ان خطوں کا مضمون سُنتے جاؤ۔ قاصد تم باہر جاؤ۔ (قاصد چلا جاتا ہے۔)

(بادشاہ خط پڑھتا ہے۔)

"مُقتدر و معلّیٰ۔ آپکو معلوم ہونا چاہیئے کہ میں تنہا حضور کی سلطنت پر چھوڑ دیا گیا ہوں۔ کل خدمتِ والا میں حاضر ہونگا اور طلبگار معافی ہو کر اپنی اس عجیب واپسی کا حال عرض کرونگا۔ ہیملٹ"

اِس سے کیا مطلب ہوا۔ کیا وہ لوگ بھی جو ہیملٹ کے ساتھ گئے تھے واپس آرہے ہیں۔ یا یہ کُل قصّہ ایک فریب ہے اور کوئی بھی واپس نہیں آرہا۔

لے ارتیز:- حضور ہیملٹ کا خط پہچانتے ہیں؟

بادشاہ:- ہیملٹ کا خط ہونے میں مطلق شُبہ نہیں۔ "یہ تنہا" اور نیچے "اکیلا" دونوں لفظ اُسی کے ہاتھ کے لکھے ہیں۔ اب بتاؤ۔ تمہاری کیا صلاح ہے؟

لے ارتیز:- میں تو یہ سب کچھ دیکھکر حیران اور دنگ ہوں، اچھا ہے۔ آنے تو دیجئے۔ اس خیال سے میرے دل کے کسانہ رنج کو ایک طرح کی تقویت ہوتی ہے۔ جب شہزادہ مجھ سے دوچار ہوگا تو میں اُس کے مُنہ پر کہونگا کہ تو میرے باپ کا قاتل ہے۔

بادشاہ:- اگر ایسا ہے تو لے ارتیز، ہیملٹ خواہ انگلستان گیا ہو جہاں میں نے اُسے روانہ کیا ہے یا یہاں واپس آگیا ہو جیسا کہ وہ لکھتا ہے ہر صورت میں مجھ سے وعدہ کرو کہ جو کچھ میں کہونگا وہی تم کروگے۔

لے ارتیز:- حضور جیسا فرمائینگے وہی میں کرونگا۔ بشرطیکہ آپکا حکم یہ ہو کہ درگزر کرکے مصالحت کرلو۔

بادشاہ:- مصالحت کا حکم نہیں بلکہ ایسا حکم ہوگا جس میں تمہارے قلب کو تسکین ہو۔ اگر ہیملٹ یہاں آگیا ہے اور اُس نے اپنا بحری سفر ناتمام رکھا ہے اور دوبارہ سفر کرنے کا ارادہ نہیں کیا تو پھر میں اسکو ایک ایسے کام میں لگا دونگا جس کی صورت میں نے پہلے ہی سے سوچ رکھی ہے۔ اور یہ کام ایسا ہوگا جس سے سوائے اس کی موت کے دوسرا نتیجہ نہ نکلے گا۔ اور یہ موت بھی ایسی صورت سے پیش آئیگی کہ ہم پر کسی قسم کا الزام عائد نہ ہوگا۔ بلکہ اس کی ماں تک سمجھے گی کہ بیٹے کی موت اتفاقیہ ہوئی ہے۔

لے ارتیز:- حضور جس طرح فرمائینگے وہی کرونگا۔ لیکن حضور ایسی کوئی ہدایت نہ کریں کہ ہیملٹ کی موت کا موجب کوئی دوسرا ہو۔ میں نہ ہوں۔

بادشاہ:- میں تم ہی کو اُسکا قاتل بنانا چاہتا ہوں۔ جب سے تم سیر و سفر میں زیادہ مصروف رہے ہو ہیملٹ کے کان تک یہ خبر پہونچی ہے کہ تم نے ایک فن میں کمال پیدا کرکے بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ اس خاص فن کے علاوہ دیگر فنون میں تمہاری دستگاہ کا حال سُنکر ہیملٹ کے دل میں آثار رشک و حسد پیدا نہیں ہوا۔ اِس خاص فن کو میں ایک ادنیٰ قسم کی چیز سمجھتا ہوں۔

لے ارتیز:- حضور وہ کونسا فن ہے؟

بادشاہ:- نوجوانوں کی ٹوپی کا وہ ایک ادنیٰ طرۂ امتیاز ہے اور میرے نزدیک وہ ایک معمولی شغل ہے۔ لیکن جوانوں کے لئے اس کا ہونا ایسا ہی ضروری ہے جیسے اُن کے لئے باریک اور البیلی پوشاک یا بڈھوں میں سیاہ اُونی کپڑے جو متانت کے ساتھ حفظانِ صحت کے بھی مُوجب ہوں۔ دو ماہ کا عرصہ ہوتا ہے کہ نارمنڈی کا ایک شریف زادہ یہاں وارد ہوا تھا۔ میں خود اُس سے ملا تھا۔ یہ شریف زادہ فرانسیسیوں کے مقابلے میں لڑ بھی چکا تھا۔ اہلِ فرانس کو گھوڑے کی سواری میں بالعموم بڑی دسترس ہوتی ہے مگر یہ نارمن شریف زادہ تو شہسواری میں طلسم و سحر دکھاتا تھا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر اس طرح جم کر بیٹھا تھا گویا کہ زمین سے درخت اُگا ہے۔ پھر ایسے عجیب و غریب کرتب کرتا تھا کہ سوار گھوڑے کے جسم کا ایک حصہ معلوم ہوتا تھا۔ جسم ہی نہیں بلکہ فطرت میں بھی گھوڑے کا نصف شریک نظر آتا تھا۔ شہسواری کے متعلق جسقدر شکلیں میرے ذہن میں تھیں وہ ان سب سے بڑھا ہوا تھا۔

لے ارتیز:- حضور نے فرمایا کہ وہ نارمنڈی کا رہنے والا تھا۔

بادشاہ:- ہاں وہ قوم نارمن سے تھا۔

لے ارتیز:- واللہ وہ یقینی لامنڈ ہوگا۔

بادشاہ:- ہاں نام یہی تھا۔

لے ارتیز:- میں اُسے خوب جانتا ہوں۔ وہ تو تمام قوم کا زیور ہے۔

بادشاہ:- مگر جس فن میں تمہیں کمال حاصل ہے وہ اُسے مجبوراً بیان ہی کرنا پڑا۔ شمشیر و خنجر چلا کر دشمن کی مدافعت میں جو دسترس اور ملکہ تمہیں حاصل ہے۔ اس کی خوبیاں پکار پکار کر کہنے لگا کہ اگر کوئی آدمی تمہاری جوڑ کا مل گیا اور دونوں میں مقابلہ ہوا تو یہ چیز قابلِ دید ہوگی، اور یہ کہ فرانس کے جسقدر شمشیر باز تھے وہ تمہارے ہاتھ دیکھکر اپنی سب تیزی بھول گئے اور اُنکی قوت محاربت وصیانت اور چھی نظروں میں فرق پیدا ہونے لگا۔ جب ہیملٹ نے تمہارے یہ کمالات سُنے تو وہ رشک و حسد سے جل اُٹھا اور جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو خدا سے دُعا مانگنے لگا کہ کاش تم یہاں آتے اور اُس کا اور تمہارا مقابلہ شمشیر چلانے میں ہو جاتا، پس اس صورت میں.......

لے ارتیز:- حضور کس صورت میں؟

بادشاہ:- لے ارتیز میرا خیال ہے کہ تمہیں اپنے باپ سے بہت محبت تھی۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ایک وقت آتا ہے کہ محبت شروع ہوتی ہے اور اس بات کا ثبوت بھی مجھے مل چکا ہے کہ محبت کی تیزی اور قدر زمانے اور وقت کے گزرنے سے کم ہوجاتی ہے۔ خود عشق میں بھی ایک چیز ایسی موجود ہے جو کبھی کبھی اس شعلے کو سرد کر دیتی ہے۔ نیکی اور راستی میں بھی ایک موقع ایسا آتا ہے کہ اُن کی وقعت کچھ نہیں رہتی۔ کیونکہ نیکی و راستی کا حال اُس مرض کا سا ہے جو خود اپنی زیادتی سے رفع ہو جاتا ہے۔ اگر ہمیں کسی کام کے کرنے کی خواہش ہے تو اس خواہش کے ساتھ ہی اُسے انجام دیدینا چاہیئے۔ کیونکہ خواہش بدلتی رہتی ہے اور اُس میں اتنی رکاوٹیں اور التوا پیدا ہوتے رہتے ہیں جتنی کہ زبانیں، ہاتھ یا حادثات ہوتے ہیں۔ پس اگر ہمیں کوئی کام کرنا ہو تو اس کے خیال کے ساتھ ہی اُسے انجام دینا ضروری ہوتا ہے اگر اُسکو اُسی وقت انجام نہیں دیا تو پھر وہ ایک ایسی بیکار چیز ٹھہرتا ہے جیسے انسان کے مُنہ سے آہ کا نکلنا جو آہ بھرنے والے کو تسکین بھی دیتی ہے اور تکلیف بھی۔ اچھا اب زخم کے اُس مقام پر آتے ہیں جو سب سے زیادہ پُر درد ہے۔ سُنو ہیملٹ واپس آگیا ہے۔ کہو کیا ارادہ ہے۔ اپنے باپ کے فرزند ہونے کا ثبوت دوگے یا باتیں ہی باتیں تھیں۔

لے ارتیز:- میں تو گرجا میں بھی اُسکا گلا کاٹنے کو تیار ہوں۔

بادشاہ:- حقیقت میں کوئی جگہ بھی دُنیا میں ایسی نہیں جو انسان کا خون روا رکھتی ہو لیکن انتقام کے لئے کوئی جگہ مانع و مستثنٰے نہیں مگر اے عزیز لے ارتیز اگر یہی کرنا ہے تو چند روز اور اپنے کمرے میں

بند پڑے رہو۔ ہیملٹ جب واپس آئیگا اور اُسے معلوم ہوگا کہ تم بھی آئے ہوئے ہو اور ہم ایسے آدمی مقرر کرینگے جو تمہاری شمشیر بازی کی تعریفیں اُس کے سامنے کرینگے اور اس فن میں تمہاری شہرت کا ذکر جو اُس نارمن نے کیا تھا اور بھی نمک مرچ لگا کر کیا جائیگا۔ مختصر یہ کہ تم دونوں کا مقابلہ کروا دیا جائیگا اور تم دونوں پر۔ بازیاں لگائی جائینگی کہ کون جیتتا ہے ہیملٹ مزاج کا بہت بے پرواہ ہے۔ طبیعت کا سخی اور سازش کرنے کا مادہ مزاج میں مطلق نہیں ہے۔ جب تلواریں لڑنے کو دی جائینگی تو وہ اُنہیں غور سے نہیں دیکھیگا۔ پس تم ایسی تلوار اُٹھا لینا جس کی نوک پر گھنڈی نہ لگی ہو اور پھر دغا و فریب کا ایک ہاتھ ہیملٹ کے ایسا رسید کرنا کہ اپنے باپ کے خون کا بدلہ نکال لو۔

لے ارٹیبز:۔ حضور میں ایسا ہی کرونگا اور اس کام کیلئے میں اپنی تلوار پر ایک روغن ایسا ملونگا جو میں نے ایک اتائی سے خریدا تھا۔ اس روغن کی سمیت کا یہ حال ہے کہ اگر چاقو کے پھل پر لگا کر ذراسی خراش پہونچا دی جائے تو پھر کوئی دوا یا جڑی بوٹی جو چاندنی رات میں چُنی گئی ہو اُسے اچھا نہ کریگی اور اس خراش کا انجام سوائے موت کے دوسرا نہ ہوگا۔ میں اپنی تلوار کی نوک کو اس زہر سے آلودہ کر دونگا۔ اگر یہ نوک ذرا بھی ہیملٹ کو چھُو گئی تو پھر اُس کا زندہ بچنا مُحال ہوگا۔

بادشاہ:۔ ہمیں اس بات پر کسیقدر اور غور کر لینا چاہیئے اور اس کام کیلئے اور موقعے اور ذریعے بھی سوچ لینے چاہئیں۔ بفرضِ محال اگر تمہاری تدبیر میں کامیابی نہ ہوئی یا اُس کے انجام دیتے دینے کسیکو پتہ چل گیا تو پھر بہتر یہ ہوگا کہ یہ چال نہ چلی جائے، یا اس چال کے ساتھ اُس کی مدد کیلئے کوئی دوسری ترکیب بھی ہو۔ اگر پہلی چال کارگر نہ ہوئی تو دوسری میں کامیابی یقینی ہوگی۔ اچھا ٹھہرو ذرا غور کر لینے دو۔ تم دونوں پر ہم بازی لگائیں گے۔ ہاں سمجھ میں آگیا۔ جب مقابلے میں تلواریں چلاتے چلاتے تم گرم ہو جاؤ اور پیاس معلوم ہو تو تم تلوار کے ہاتھ اور بھی تیزی سے چلانا تاکہ احساسِ تشنگی یقینی ہو جائے۔ اُس وقت ہیملٹ پانی پینے کو مانگیگا۔ اِس موقع کیلئے ہم شربت کا ایک جام تیار رکھیں گے۔ اگر اس شربت کا ایک قطرہ بھی حلق سے اُتر گیا تو ہمارا مقصود پورا ہوگا۔

(ملکہ اندر آتی ہے)

کہو پیاری ملکہ کیسی ہو؟

ملکہ:۔ ایک مصیبت پر دوسری مصیبت اتنی جلدی آتی ہے کہ بیچ میں کچھ وقفہ نہیں ہوتا۔ لے ارٹیبز تمہاری بہن اوفیلیا ڈوب کر مر گئی۔

لے ارٹیبز:۔ ڈوب گئی! کہاں؟

ملکہ:۔ نہر کے کنارے بیدِ مجنوں کا ایک درخت نہر پر جھکا ہوا ہے۔ اُس کے پتّوں کی پُشت کی سپیدیاں نہر میں اپنا عکس ڈالتی تھیں۔ یہاں تمہاری بہن عجیب وضع سے طرح طرح کے پھولوں کے گُنھے پہنے آئی۔ درخت کی جو شاخیں نہر پر جھکی تھیں اُن پر پھول اور گُنھے لگانے چڑہی تھی کہ پاؤں رکھتے ہی شاخ ٹوٹی اور یہ پیاری لڑکی پھولوں اور گُنھوں سمیت اس جوئے اشکبار میں گری، اس کے کپڑے پانی پر پھیل گئے اور اسی شکل میں پانی کچھ دیر اُسے سمندر کی پری کی طرح اپنی سطح پر سنبھالے رہا۔ اور اس حالت میں وہ پُرانے پُرانے گیت گاتی رہی۔ جان کے خطرے سے ایسی ناآشنا تھی، کہ پانی کی رہنے والی کوئی حسین مخلوق معلوم ہوتی تھی۔ لیکن دیر تک یہ حالت نہ رہی۔ جب کپڑے پانی میں تر ہو کر بھاری ہوگئے تو یہ غریب جان گیت گاتے گاتے ڈوب کر کیچڑ پانی میں مر گئی۔

لے ارٹیبز:۔ ہائے افسوس! اوفیلیا میری پیاری بہن۔ تو ڈوب گئی۔

ملکہ:۔ ہاں ڈوب گئی۔

لے ارتیبز:- پیاری اوفیلیا - تجھے پانی سے اتنا واسطہ رہا ہے کہ میں اب آنسو نہ بہاؤنگا - لیکن فطرت حسب دستور آنسو بہانے پر مجبور کرتی ہے گو مردانہ غیرت مانع ہے - لیکن جب یہ آنسو خشک ہو جائینگے تو یہ عورتوں کی سی کمزوری طبیعت سے دُور ہو جائیگی اور میں انتقام کیلئے تیار ہو جاؤنگا اسوقت بادشاہ سلامت میں رُخصت چاہتا ہوں - بہت سے آتشیں الفاظ زبان پر آرہے ہیں لیکن یہ حماقت کے آنسو کی آگ کو بُجھائے دیتے ہیں -

جُزو خامس

پہلا منظر:- گرجا سے ملحق قبرستان -

دو گورکن نظر آتے ہیں -

پہلا گورکن:- جس عورت نے خودکُشی کی ہے کیا اُسکی میّت ایسی جگہ دفن ہوگی جہاں عیسائی دفن کئے جاتے ہیں ؟

دوسرا گورکن:- ہاں، ایسی ہی زمین میں دفن ہوگی - اس لئے قبر جلد کھود کر تیار رکھو - افسرِ تحقیقاتِ اموات نے یہی تجویز کیا ہے کہ تدفین عیسائیوں کے طریقے پر ہو -

پہلا گورکن:- اگر وہ اپنی جان بچانے کی کوشش میں ڈوبی ہوتی تو البتہ ایسا ہو سکتا تھا -

دوسرا گورکن:- یہ جو کچھ بھی ہو - تحقیقات میں ایسا ہی ثابت ہوا ہے -

پہلا گورکن:- مُجرم نے اپنی صفائی کے وقت ایسی ہی دلیل پیش کی ہوگی - اس کے سوا دوسری بات کیا ہو سکتی تھی - معاملہ کی کُل صورت یہ ہے کہ اگر میں جان بُوجھ کر ڈوب مروں تو یہ ایک فعل ہوا اور فعل کی تین شاخیں ہوا کرتی ہیں - کرنا، انجام دینا اور عمل - پس نتیجہ یہ نکلا کہ وہ دیدہ و دانستہ نہیں ڈوبی -

دوسرا گورکن:- نہیں بھیّا - خُدا تمہیں نیکی دے - ذرا سُنو تو -

پہلا گورکن:- ذرا مجھے تو کہہ لینے دو - فرض کیا یہاں پانی ہے اور وہاں آدمی کھڑا ہے - اگر یہ آدمی پانی کے پاس جا کر عمداً ڈوب مرے، اس میں چاہے وہ اپنی مرضی سے گیا ہو یا بلا مرضی بہرکیف وہ جاتا ضرور ہے - اچھا - اِس بات کو بھولنا نہیں - اگر پانی اِس آدمی کے پاس آکر اِسے ڈبو دے تو پھر نہیں کہہ سکتے کہ آدمی خود ڈوبا ہے - پس جو آدمی اپنی جان کھونے کا مُجرم نہیں اُسکی نسبت یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُس نے اپنی زندگانی کم کر دی -

دوسرا گورکن:- کیا یہ قانون ہے ؟

پہلا گورکن:- ہاں قسم ہے - اموات کی تحقیقات کا قانون یہی ہے -

دوسرا گورکن:- سچ پوچھو تو بات اتنی ہے کہ اگر یہ میّت کسی بڑے گھرانے کی نہ ہوتی تو پھر اسکو اس زمین سے باہر دفن کیا جاتا - جہاں عیسائیوں کے مُردے دفن ہوتے ہیں -

پہلا گورکن:- یار سچ پوچھو تو پتے کی بات تم نے یہ کہی ہے - دُنیا میں بڑے آدمیوں میں جتنی ہمّت ڈوب مرنے یا پھانسی لے لینے کی ہوتی ہے وہ مُفلس اور غریب عیسائیوں میں نہیں ہوا کرتی - چل رے میرے بیلچے آگے چل - باغ بانوں، زمین کھودنے والوں اور گورکنوں کے سوا دُنیا میں کوئی شریف نہیں - کیونکہ اِنکا پیشہ وہی ہے جو آدم کا پیشہ تھا -

دوسرا گورکن:- کیا آدم بھی شریف تھے ؟

پہلا گورکن:- آدم تو دُنیا میں پہلے شریف تھے جن کے پاس اوزار اور ہتھیار رہتے -

دوسرا گورکن:- ارے یار جا بھی - آدم کے پاس اوزار اور ہتھیار کہاں سے آئے -

پہلا گورکن:- ارے کیا تو کافر ہے - انجیل کا مطلب تو بھی نہیں سمجھتا - سُن - انجیل میں آیا ہے کہ "آدم نے زمین کھودی" کیا بغیر اوزار

کے زمین کھود سکتے تھے۔ اچھا۔ ایک اور بات تجھ سے پوچھتا ہوں۔ اگر جواب نہ دیا تو پھر قائل ہونا پڑیگا کہ تو نرا......

دوسرا گورکن:- ارے کیا بکتا ہے؟

پہلا گورکن:- اچھا بتا وہ کون ہے جو معمار، جہاز بنانے والے یا بڑھئی سے بھی زیادہ مضبوط کام بناتا ہے؟

دوسرا گورکن:- وہ جو پھانسی کا تختہ تیار کرے کیونکہ یہ تختہ ایک ہزار مجرموں کو پھانسی دینے کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔

پہلا گورکن:- ایمان سے۔ بات اچھی کہی۔ پھانسی کا تختہ اسمیں شک نہیں کہ اچھی چیز ہے کیونکہ مجرموں کے ساتھ وہ بھلائی کرتا ہے۔ پس جب تونے کہا کہ پھانسی کا تختہ گرجا کی عمارت سے بھی زیادہ مضبوط ہوتا ہے تو پھر یہی تختہ تیرے لئے اچھا ہوگا۔ اچھا، پھر سوچ کر جواب دے۔

دوسرا گورکن:- یہی پوچھتا ہے نا کہ معمار، جہاز بنانے والے اور بڑھئی سے کون زیادہ مضبوط عمارت بناتا ہے؟

پہلا گورکن:- ہاں یہی پوچھا ہے۔ بتاؤ نا۔ پھر چھٹی۔

دوسرا گورکن:- ٹھیرو۔ کچھ کچھ سمجھ میں آیا ہے۔

پہلا گورکن:- پھر بتاتے کیوں نہیں؟

دوسرا گورکن:- قسم ہے یار۔ میں ہارا۔ تو ہی بتا کیا جواب ہے۔

(ہیملٹ اور ہوریشیو دور سے نظر آتے ہیں)

پہلا گورکن:- بس اب اپنی سمجھ پر زیادہ زور نہ ڈال سست گدھے پر جب تک ڈنڈے نہ پڑیں وہ کب قدم آگے ڈالتا ہے۔ اگر پھر کوئی تجھ سے یہ سوال کرے تو کہنا "گورکن"! کیونکہ جو گھر گورکن بناتا ہے وہ قیامت تک سلامت رہیگا۔ اچھا دوست۔ ذرا یوگان کی دکان سے ایک کوزہ شراب کا تو لے آ۔ (پہلا گورکن چلا جاتا ہے۔ دوسرا قبر کھودنے میں مصروف ہے۔ اور گاتا بھی جاتا ہے)

جوانی میں عاشق بنے تو خوب دل کھول کر بنے
سمجھا تھا کہ عاشقی بڑی شیریں چیز ہے۔
لیکن وقت گزرنے پر معلوم ہے کہ بالکل بے فائدہ ہے۔

ہیملٹ:- کیا اس شخص کو کام میں اتنا خیال بھی نہیں کہ قبر کھود رہا ہے اور گاتا بھی جاتا ہے؟

ہوریشیو:- قبریں کھودتے کھودتے اس بات کی حس نہیں رہی کہ ایسے غم کے موقع پر خوشی کا اظہار درست نہیں۔

ہیملٹ:- بالکل ٹھیک ہے۔ جو ہاتھ زیادہ مشقت نہیں کرتے انکا احساس نازک ہو جاتا ہے۔

پہلا گورکن:- (گاتا ہے)

لیکن عمر رواں نے چپکے چپکے آکر مجھے اپنے پنجوں میں پکڑلیا
اور موت کی اقلیم میں اس طرح پہونچا دیا کہ گویا جوان ہوا ہی نہ تھا۔

(ایک کھوپری نکال کر اوپر پھینکتا ہے)

ہیملٹ:- (کھوپری اٹھا کر کہتا ہے) ہوریشیو۔ اس کاسۂ سر میں کبھی زبان ہوگی جس سے وہ نغمہ سرائی کرتا ہوگا۔ اس گورکن گنوار نے اُسے نکال کر زمین پر اس طرح پھینک دیا کہ گویا وہ قائن (ابن آدم) کے گلے کی ہڈی ہے۔ قائن وہ تھا جس نے دنیا میں سب سے پہلا قتل کیا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ سر کسی ماہر سیاست کا ہو اور جس تک اب اس کوڑھ مغز گدھے کی پہونچ ہوگئی اور اُس نے اٹھا اسے زمین پر پھینک دیا۔ اور یہ ماہر جہانبانی ایسا ہو کہ خدا تک کو دھوکا دینے کو تیار ہو۔ کیوں میں درست کہتا ہوں یا نہیں؟

ہوریشیو:- ہاں، بالکل ممکن ہے۔

ہیملٹ:- یا یہ سر کسی بڑے درباری کا ہو جو آقا کے سامنے حاضر ہوکر کہا کرتا تھا "خداوند آداب بجا لاتا ہوں۔ حضور کا مزاج کیسا ہے؟" یا ممکن ہے کہ یہ سر فلاں فلاں حضور والا کا ہو جو فلاں فلاں جناب عالی کے گھوڑے کی تعریف کرتے تھے اور مطلب یہ تھا کہ گھوڑا حضور والا کی نذر کر دیا جائے۔

ہوریشیو:- بجا ہے۔

ہیملٹ:- اور بیگم کرم کے ہاتھ پڑکر نہ وہ صورت رہی نہ شکل گورکن

کے بیلچے کھا کر کبھی ادھر آتا ہے اور کبھی اُدھر جا پڑتا ہے۔ واہ یہ بھی کیس بلا کا انقلاب ہے اور ہمارے سمجھنے کے لئے کیسی عبرتناک بات پیدا کرتا ہے۔ کیا ان ہڈیوں کی پرورش و پرداخت میں اتنی زحمت بھی نہ اُٹھانی پڑی تھی کہ آج یہ ہڈیاں گیٹریاں بنا کر کھیلنے کے قابل ہو گئیں۔ اِس خیال سے سر میں درد و گرانی پیدا ہوتی ہے۔

پہلا گورکن :۔ (گاتا ہے)

ایک کُدال اور ایک پھاوڑا اور
ایک کفن پہننے کو ہو۔
اور زمین میں ایک گڑھا کھودا جائے۔
آج جو مہمان آرہا ہے اُسکی یہی خاطر و مدارات ہے۔

(ایک کھوپری اور نکال کر پھینکتا ہے)

ہیملٹ :۔ لو ایک سر اور آیا۔ ممکن ہے کہ یہ کسی بڑے قانون داں کا سر ہو۔ اب وہ اسکی باریک بینیاں، وہ مُوشگافیاں، قانونی حیلے حوالے، وہ نالشات، مقدمات اور عرضی دعوے کدھر گئے؟ اب کیوں وہ اِس گنوار کی گندی کُدال کی چوٹیں سہے اور پڑے رہا ہے۔ مار پیٹ کا استغاثہ کیوں دائر نہیں کر دیتا۔ ممکن ہے یہ سر کسی مالدار کا ہو جو زندگی میں بڑی بڑی اراضی خریدا کرتا تھا۔ وہ اُس کے تمسکات، دستاویزات پٹے، رسیدیں، بیع نامے اور رہن نامے کہاں گئے۔ اب تو اِس کھوپری میں سوائے مٹی کے اور کچھ نہیں بھرا۔ کیا یہ دستاویزات اب کوئی حقِ بیع و شری اسکے لئے نہیں پیدا کرتے۔ ان دستاویزات کے مکمل و مصدقہ ہونے میں کلام نہیں۔ قبالے اور رہن نامے اس کثرت سے ہیں کہ وہ اِس تابوت کے صندوق میں نہیں سما سکتے۔ اور زمینوں کے اِس مالک کے پاس سوائے اِس تابوت کے اور کچھ باقی نہیں ہے۔

ہوریشیو :۔ حضور بالکل سچا ہے۔ سوائے اِس تابوت کے اب وہ کچھ نہیں رکھتا۔

ہیملٹ :۔ کیا وہ چرمی قرطاس جس پر دستاویزات تحریر ہوتی ہیں بھیڑ کے چمڑے سے نہیں تیار کیا جاتا؟

ہوریشیو :۔ حضور، کبھی کبھی وہ بچھڑے کی کھال سے بھی تیار کیا جاتا ہے۔

ہیملٹ :۔ بس اب کوئی اِن دستاویزات پر بھروسا کرے تو اُسے بھیڑ یا بچھڑا تصوّر کرنا چاہیئے۔ میں ذرا اِس گورکن سے باتیں کرتا ہوں۔ گورکن، یہ قبر کس کی ہے؟

پہلا گورکن :۔ میری ہے۔ (گاتا ہے)

زمین میں گڑھا کھودنا ہے
اور یہی مہمان کی بڑی تواضع ہے۔

ہیملٹ :۔ ہاں، میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ قبر تیری ہے کیونکہ تو قبر میں کھڑا جھوٹ بول رہا ہے۔

پہلا گورکن :۔ سرکار تو قبر سے باہر کھڑے جھوٹ بولتے ہیں لیکن قبر آپکی نہیں ہے۔ میں قبر میں کھڑا جھوٹ نہیں بولتا مگر اِس پر بھی قبر میری ہے۔

ہیملٹ :۔ تو جھوٹا ہے۔ قبر میں جیتا جاگتا موجود ہے اور اِسپر بھی قبر اپنی بتاتا ہے۔ قبر تو مُردے کی ہوا کرتی ہے۔ زندہ کی کب ہوتی ہے۔

پہلا گورکن :۔ یہ تو بڑا چلتا ہوا جھوٹ ہے۔ اب وہ پھر میری طرف سے آپکی طرف پہونچتا ہے۔

ہیملٹ :۔ کس مرد کیلئے یہ قبر کھودی گئی ہے؟

پہلا گورکن :۔ کسی مرد کیلئے نہیں کھودی گئی ہے۔

ہیملٹ :۔ تو کیا کسی عورت کیلئے کھودی گئی ہے؟

پہلا گورکن :۔ سرکار نہ کسی مرد کیلئے کھودی گئی ہے نہ کسی عورت کے لئے۔

ہیملٹ :۔ اچھا بتا اِسمیں کون دفن ہوگا؟

پہلا گورکن :۔ وہ جو کسی زمانے میں عورت تھی۔ خدا رحم کرے وہ مر گئی۔

ہیملٹ:- یہ گورکن تو بات بڑی جچی تُلی کہتا ہے۔ اِس سے گفتگو کرنے میں تو بڑا قانون وقاعدہ درکار ہے۔ ورنہ اگر سوال میں ذرا بھی شُبہ ہوا تو جواب ٹھیک نہ دیگا۔ ہوریشیو، قسم کھا کر کہتا ہوں کہ زمانہ کچھ ایسا بدلا ہے کہ کمینے شریفوں کی پیروی میں اپنے پاؤں کے انگوٹھوں سے انکی ایڑیاں زخمی کرتے ہیں۔ اچھا میاں گورکن بتاؤ تم کتنے دن سے گورکن کا پیشہ کرتے ہو؟

پہلا گورکن:- برس کے تمام دنوں میں اُس خاص دن سے جبکہ ہمارے بادشاہ ہیملٹ نے فورٹن براس پر غلبہ پایا تھا۔

ہیملٹ:- اِس بات کو کتنا عرصہ ہوا؟

پہلا گورکن:- کیا آپ نہیں بتا سکتے؟ یہ بات تو ہر بے وقوف بتا سکتا ہے۔ یہ وہی دن تو تھا جبکہ ہمارا نوجوان شہزادہ ہیملٹ پیدا ہوا تھا۔ یہ وہی شہزادہ ہے جو دیوانہ ہوگیا ہو اور انگلستان بھیجا گیا ہے۔

ہیملٹ:- کچھ معلوم ہے کہ انگلستان کیوں بھیجا گیا ہے؟

پہلا گورکن:- اِس لئے کہ وہ پاگل ہوگیا تھا۔ وہاں اپنے حواس میں آجائیگا اور اگر نہ بھی آیا تو وہاں اِس سے کچھ زیادہ فرق نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ وہاں سب آدمی ہمارے شہزادے کی طرح پاگل ہیں۔

ہیملٹ:- شہزادہ پاگل کیونکر ہوگیا؟

پہلا گورکن:- لوگ کہتے ہیں کہ کچھ عجیب طرح سے دیوانہ ہوا ہے۔

ہیملٹ:- عجیب طرح سے کیونکر؟

پہلا گورکن:- اِس طرح کہ ہوش وحواس معطّل ہوگئے۔

ہیملٹ:- کس بناء پر؟

پہلا گورکن:- یہ تو سرکار یہی بتائیں۔ لڑکپن سے لیکر اب تک مجھے گورکنی کرتے تیس برس ہوئے ہیں۔

ہیملٹ:- اچھا بتاؤ۔ مُردہ قبر میں کتنے دن تک بغیر سڑے رہ سکتا ہے؟

پہلا گورکن:- اگر مرنے سے پہلے نہ سڑ چکا ہو۔ کیونکہ آج کل چیچک کی لاشیں بہت دیکھنے میں آتی ہیں جو قبر میں رکھتے رکھتے سڑ اُٹھتی ہیں۔ بس تو سمجھئے کہ آٹھ نو برس تک مُردہ قبر میں بغیر سڑے پڑا رہیگا۔ چمڑا رنگنے والا البتہ نو برس تک قبر میں نہیں بگڑیگا۔

ہیملٹ:- کیوں اُسے زیادہ دن کیوں لگیں گے؟

پہلا گورکن:- چمڑا رنگتے رنگتے اُس کی کھال ایسی پکّی ہوجاتی ہے کہ مدّت تک پانی اُس پر اثر نہیں کرتا اور آپ کا پانی آپ کے مُردہ جسم کو سب سے زیادہ گلانے والا ہے۔ اچھا لیجئے۔ یہ کھوپری ملاحظہ ہو جس کی یہ کھوپری ہے اُسکو مرے ہوئے ایک بیس تین برس ہوئے۔

ہیملٹ:- یہ کھوپری کس کی ہے؟

پہلا گورکن:- یہ بڑا ہی شریر اور پاگل آدمی تھا۔ سرکار کے خیال میں بھلا کون تھا؟

ہیملٹ:- مجھے نہیں معلوم۔

پہلا گورکن:- سرکار وہ بڑا ہی پاگل اور شریر تھا۔ ایک مرتبہ اُس نے انگوری شراب کا پورا خُم میرے سر پر اُلٹ دیا تھا۔ اچھا سرکار بتاتا ہوں، یہ کھوپری یورک کی ہے جو بادشاہی دربار کا مسخرا تھا۔

ہیملٹ:- یہ کھوپری!

پہلا گورکن:- ہاں سرکار یہی کھوپری۔

ہیملٹ:- (کھوپری اُٹھاتا ہے) ذرا مجھے دیکھنے دو۔ افسوس۔ غریب یورک۔ ہوریشیو، میں اِسے خوب جانتا تھا۔ یہ انتہا درجے کا ظریف اور زندہ دل شخص تھا۔ ہزارہا مرتبہ وہ مجھے اپنے کندھوں پر چڑھائے چڑھائے پھرا ہے۔ لیکن اب وہ کیسا بھیانک اور نفرت کے قابل ہوگیا ہے۔ مجھے تو دیکھنے سے اُبکائی آتی ہے۔ یہاں وہ ہونٹ تھے جنہیں خُدا جانے میں کتنی مرتبہ پیار کیا تھا۔ اب وہ تیری ہنسیاں، قہقہے، اُچھل کود، وہ تیرے گیت کیا ہوتے اور وہ

ئف وظرائف کدھر گئے جنکو سُنکر کوئی شخص میز کے گرد ایسا نہ ہوتا جو مارے ہنسی کے بیتاب نہ ہو جاتے۔ اب اُن میں ایک بھی نہیں جو سے کم تیرے ان بکوسے دانتوں کو مُنہ چڑالے۔ ہونٹ سب گل ۔ دانت ہی دانت رہگئے۔ اچھا میری حسین و نازک بیگم کے رے میں کوئی جائے اور اُس سے کہے کہ چہرے پر رنگ ایک انچ ر الگائے کیونکہ آخیر میں یہی صورت اُس کی بھی ہونے والی ہے۔ میری نازک بیگم اگر اِسکو لطیفہ سمجھکر ہنسنے لگے تو ہنسنے دو۔

ورشیبو، مہربانی کرکے ایک بات تو بتاؤ۔

ورشیبو:۔ حضور وہ کیا بات ہے فرمایئے۔

ہملٹ:۔ کیا قبر میں اسکندر کی بھی یہی صورت ہوگئی ہوگی؟

ورشیبو:۔ یہ تو یقینی امر ہے۔

ہملٹ:۔ اور اس میں سے بھی ایسی ہی بدبو آتی ہوگی۔ اف فوہ!

(یورک کی کھوپری زمین پر رکھدیتا ہے۔)

ورشیبو:۔ یقینی حضور۔

ہملٹ:۔ ہورشیبو مرنے کے بعد ہماری مٹّی کی بھی کیسی ی گت بنتی ہے۔ ذرا تصوّر سے کام لو۔ کیا یہ خیال میں نہیں سکتا کہ اسکندر کی شریف خاک ایک پیپے کے سوراخ کو بند تی ہو۔

ورشیبو:۔ حضور اِس طرح خیال کرنا تو ایک عجیب بات ہوگی۔

ہملٹ:۔ بالکل نہیں۔ اسکندر کی خاک کا پتہ چلانے میں اس تک پہونچنا کہ ایک پیپے کے سوراخ پر تھوپی گئی ہوگی بالکل سان ہے۔ سُنو۔ اسکندر مر گیا۔ اسکندر زمین میں دفن ہوا۔ کر مٹّی ہوجانا ضروری ہے۔ مٹّی اور ریت کو ملاکر گارا بناتے ہ۔ پس اِس گارے سے جس کی شکل اسکندرِ اعظم نے اِس ت اختیار کی ہے کیا ممکن نہیں کہ اس سے ایک پیپے کے سوراخ ہ بند کردیا جائے۔

پُرصولت وحشمت سیزر مر کر مٹّی ہوگیا۔ یہ مٹّی ہوا کو

روکنے کیلئے ایک روزنِ دیوار کو بند کرسکتی ہے۔ وہ مٹّی جو تمام
دُنیا کو لرزہ براندام رکھتی تھی، آج ایک دیوار کے روزن پر
تُھپ کر سرد ہواؤں کو روکتی ہے۔
لیکن خاموش! خاموش! ایک طرف کھڑے ہوجاؤ۔ بادشاہ
کی سواری آتی ہے۔

(بہت سے پادری صفیں باندھے، اوفیلیا
کا جنازہ، لے ارٹیز، ماتم کرنے والے، اور ان کے
پیچھے بادشاہ اور ملکہ مع حالی موالی کے آتے ہیں)

بادشاہ اور ملکہ کس چیز کے پیچھے پیچھے آرہے ہیں اور کیوں ماتمی مراسم میں اتنی کمی کی گئی ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ جسکی میّت ہے اُس نے اپنے ہی ہاتھوں اپنی جان تلف کی ہے اور اس کے ساتھ ہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی بڑے گھرانے کی میّت ہے۔ آؤ کہیں چُھپ بیٹھیں اور دیکھیں کہ کیا ہوتا ہے۔

لے ارٹیز:۔ اور کیا رسمیں کرنی ہیں؟

ہیملٹ:۔ یہ شخص جس نے ابھی بات کی ہے لے ارٹیز ہے۔ بڑا شریف آدمی ہے۔ ذرا دیکھتے رہو آگے کیا ہوتا ہے۔

لے ارٹیز:۔ کیا کوئی اور رسم کرنی ہے؟

پہلا پادری:۔ میّت کے متعلق جس قدر رسموں کی اجازت دی گئی تھی اُن سے زیادہ کی گئی ہیں۔ موت مشتبہ تھی۔ اگر بادشاہ کا حکم کلیسائی احکام پر غالب ہوتا تو میّت اُس زمین میں دفن کی جاتی جو متبرک نہ تھی۔ اور آپ کی یہ ہمشیرہ اُسی نامتبرک زمین میں اُس وقت تک پڑی رہتی کہ اسرافیل صورِ قیامت پھونکتے اور قبر پر دعائیں پڑھکر دم کرنے کی جگہ اُس پر ٹھیکرے، پتھر اور سنگریزے پھینکے جاتے۔ لیکن ہم نے اجازت دی کہ دوشیزگی کے پھولوں کا تاج وہاں رکھا جائے اور کنواری میّت کیلئے جسطرح پھول بچھائے جاتے ہیں اس کے لئے بھی بچھائے جائیں۔ اور جب تک میّت قبر تک پہونچے گرجا کا گھنٹہ برابر بجتا رہے اور عیسائیوں کی طرح تمام مراسم تدفین ادا کئے جائیں۔

لے ارتیز:- تو اب اس کے بعد اور کچھ کرنا باقی نہیں رہتا۔

پہلا پادری:- نہیں نہیں۔ اگر ہم زیادہ یہیں کرینگے اور میت کی قبر پر اس کی بخشش کے لئے دعائیں مانگیں گے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ ہم شعائر کلیسا کو ناپاک و نجس کرتے ہیں اور ایک ایسی میت کے لئے عاقبت میں راحت و آرام پیدا کرنا چاہتے ہیں جو صرف ایسے مرنے والے کیلئے مخصوص ہے جس نے قدرتی طور پر اپنی جان خدا کے سپرد کی ہو۔

لے ارتیز:- میت کو قبر میں رکھدے۔ اس کی پاک و مطہر خاک سے نرگس و سوسن کے پھول کھلیں گے اور اے کم ظرف پادری سن لے میری بہن خدا کے تخت کے پاس فرشتوں کی صف میں کھڑی ہوگی اور تو اس وقت جہنم میں پڑا درد و عذاب میں رونا اور چیختا ہوگا۔

ہیملٹ:- کیا یہ حسین اوفیلیا کا جنازہ ہے؟

ملکہ:- (میت پر پھول ڈالتے ہوئے) پیاروں کیلئے یہ پیارے پھول۔ خدا کو سونپا۔ میں سمجھتی تھی کہ تو میرے ہیملٹ کی دلہن بنیگی اور میں تیری شادی کی سیج سجاؤنگی۔ یہ کیا خبر تھی کہ تیری قبر پر پھول ڈالونگی۔

لے ارتیز:- اے سہ گونہ رنج والم جو وہ چند آفات و آلام بن کر نازل ہوئے اور اس کے ہوش و حواس معطل کر دیئے۔ لوگو، ابھی اس پر مٹی نہ ڈالو۔ مجھے ذرا اسے گلے لگا لینے دو۔

(لے ارتیز قبر میں کود پڑتا ہے)

اچھا اب زندہ اور مردہ دونوں پر مٹی ڈالو اور اتنی ڈالو کہ یہ سطح فراز اونچی ہوتے ہوتے ایک پہاڑ ہو جائے اور پہاڑ بھی اتنا بلند ہو کہ وہ پیلیون سے اور نیلی فام جبل اولمپس سے جس کی چوٹی آسمان سے باتیں کرتی ہے زیادہ مرتفع ہو جائے۔

ہیملٹ:- (آگے بڑھکر) یہ کون ہے جس کے غم میں اتنا جوش و خروش ہے، جس کی آہ و فغاں گردش کرتے ستاروں پر بھی اپنا سحر کر کے ان کی گردش کو روک دیتی ہے۔ اور جس کی آہیں انجم فلک کے کانوں کو بھی زخمی کر ڈالتی ہیں۔

میں ڈنمارک کا شہزادہ ہیملٹ ہوں (ہیملٹ بھی قبر میں کود پڑتا ہے)

لے ارتیز:- شیطان تیری روح قبض کرے۔ (لے ارتیز اور ہیملٹ قبر میں لڑنے لگتے ہیں۔)

ہیملٹ:- قبر میں دعائے مغفرت کی جگہ شیطان سے فریاد کرنا درست نہیں۔ مہربانی کر کے میرے گلے سے اپنی انگلیاں ہٹا لو۔ گو میرے مزاج میں غصہ زیادہ نہیں ہے پھر بھی کوئی چیز مجھ میں ایسی موجود ہے جو خطرناک اور خوفناک ہے۔ اگر تم میں عقل ہے تو اس چیز سے خوف کرو۔ لے ارتیز میرے گلے سے اپنا ہاتھ ہٹا لو۔

بادشاہ:- ان دونوں کو پکڑ کر قبر سے باہر کر دو۔

ملکہ:- ہیملٹ! ہیملٹ!

سب پکارتے ہیں:- شریفو۔ شریف زادو۔ بس جانے دو۔

ہوریشیو:- شہزادے صاحب۔ ذرا غصے کو کم کیجئے۔

(خدام شاہی دونوں کو علیحدہ کرتے ہیں اور دونوں قبر سے باہر آتے ہیں۔)

ہیملٹ:- مجھے تو اس بات پر اسوقت تک لڑنا ہے جب تک کہ میری پلکیں دیدوں پر حرکت کرنا بند نہ کر دیں۔

ملکہ:- بیٹا وہ کونسی بات ہے جس پر تجھے لڑنا ہے؟

ہیملٹ:- مجھے اوفیلیا سے عشق تھا اور اتنا عشق تھا کہ چالیس ہزار بھائیوں کی محبت بھی میرے عشق کو نہ پہونچ سکتی تھی۔ تو اب تو اس کے لئے کیا کریگا؟

بادشاہ:- اے لے ارتیز جانے دو۔ ہیملٹ دیوانہ ہے۔

ملکہ:- لے ارتیز خدا کے واسطے جو کچھ وہ کہتا ہے اسے گوارا کرلو۔ اس کے کہنے کا کچھ خیال نہ کرو۔

ہیملٹ:- مسیح مجروح کی قسم۔ بتا کہ تو اسکے لئے کیا کر سکتا ہے؟ کیا تو اس کے لئے روئیگا؟ فاقے کریگا، لڑیگا، یا اپنے تئیں پھاڑ ڈالیگا؟ کیا تو سرکہ پیئیگا؟ پورا گھڑیال کھا جائیگا؟ نہیں، مجھ

سے کچھ بھی نہ ہو سکیگا اور میں یہ سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ کیا تو عورتوں کی طرح رونے کو یہاں آیا تھا اور میرے مقابلے میں اپنی محبت جتانے کو قبر میں کود پڑا۔ اور کیا تو زندہ ہو کر مُردے کے ساتھ دفن ہونا چاہتا تھا؟ یہ صرف میں کرسکتا ہوں۔ اور اگر تو پہاڑوں کی ڈینگ مارتا ہے تو سن کہ کئی لاکھوں کروڑوں ایکڑ مٹی مجھ پر اور تجھ پر ڈالدے حتیٰ کہ یہ تودۂ خاک اتنا اونچا ہو کہ اُس کی چوٹی سورج کی گرمی سے جھلسنے لگے اور کوہ اوسا اس کے مقابلے میں ایک مُرا یا مسّا نظر آنے لگے۔

ملکہ:۔ یہ حالت محض جنون کی ہے اور جب یہ دورہ ختم ہو جائیگا تو پھر یکلخت وہ ایک مسکین قمری کی طرح خاموش ہو جائیگا جو اپنے دو زریں بچوں کو نکال کر ان پر غمگین صورت بنائے بیٹھی ہوتی ہے۔

ہیملٹ:۔ اے ارٹیز، سنتے ہو۔ تم نے میرے ساتھ کیوں ایسا بُرا برتاؤ کیا؟ اس کی وجہ کیا ہے؟ تم سے مجھے ہمیشہ محبت تھی۔ ہرکولیز کو جو کچھ کرنا ہے کرنے دو لیکن کتے اور بلی کا بھی ایک دن آنے والا ہے۔ (ہیملٹ چلا جاتا ہے)

بادشاہ:۔ ہوریشیو، مہربانی کرکے تم شہزادے کے ساتھ رہو۔

(ہوریشیو چلا جاتا ہے۔)

(لے ارٹیز سے) صبر کرو۔ شب گذشتہ جو گفتگو تم سے ہوئی تھی اُس سے اب تمہارے جی کو تقویت ہونی چاہیئے۔ ہم اب اِس معاملہ کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ملکہ گرترود، تم اپنے فرزند پر نگہبان مقرر کرو۔ اس قبر پر ایک زندہ یادگار قائم ہوگی، اور مجھے اُمید ہے کہ جلد امن و سلامتی کا زمانہ آنے والا ہے۔ اِس وقت ہمیں صبر سے کام لینا چاہیئے۔

دوسرا منظر:۔ شاہی محل میں ایک بڑا ایوان۔

ہیملٹ اور ہوریشیو اندر آتے ہیں۔

ہیملٹ:۔ اِسوقت جو کچھ گزرا وہ تو تم نے دیکھ ہی لیا۔ اب میرے سفر کا حال سُنو۔ سفر اختیار کرنے کی وجہ تو تم کو معلوم ہے۔

ہوریشیو:۔ حضور خوب معلوم ہے۔

ہیملٹ:۔ ہوریشیو، جب میں جہاز پر سوار ہوا تو دل میں کچھ ایسی کشمکش تھی کہ نیند نہ آئی اور میری پریشانی اور بے چینی کا یہ عالم تھا کہ باغی ملّاح بھی جنکے پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوں اتنے بے چین اور پریشان نہ ہوتے ہونگے۔ اسی حال میں مجھے طیش آیا اور اسکا آنا میرے حق میں مبارک ہوا۔ معلوم رہنا چاہیئے کہ بعض وقت بے سوچے سمجھے بھی کوئی بات کر بیٹھنی ہمارے حق میں مُفید اور بکار آمد ہو جاتی ہے۔ اور اس کے مقابلے میں بڑے فکر و غور کے منصوبے اور سازشیں بھی اتنی کارگر نہیں ہوتیں۔ اِس سے ہمیں یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ ہم کیسی ہی بھدّی اور نامعقول کوئی چیز گھڑیں مگر اُسکو صحیح شکل و صورت دینے والا خُدا کا ہاتھ ہوتا ہے۔

ہوریشیو:۔ اِس میں کیا شک ہے۔

ہیملٹ:۔ غرض یکایک طیش میں آ گیا یونہی گلے میں ڈالے اُٹھا اور اندھیرے میں اُن دونوں (روزنکرانز اور گلڈنسٹرن۔) کو ڈھونڈنے لگا، اور جب اُن کے قریب پہونچا تو چپکے سے اُن کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جو کچھ ہاتھ لگا اُسکو لئے اپنے کمرے میں آیا۔ حالتِ خوف میں تمام قاعدے اور قوانین دل سے مفقود ہوتے اور وہ فرمان جو میں نے اُنکی جیب سے نکالا تھا اُس کی مُہر توڑ کر اُسے پڑھا۔ جب پڑھا تو ہوریشیو کیا بتاؤں اس میں بادشاہ کی خباثت و شرارت کیسی بھری تھی۔ بڑی عبارت آرائی کے ساتھ بادشاہ ڈنمارک نے بادشاہِ انگلستان کی مزاج پُرسی کی تھی اور میری نسبت نہایت سخت و سنگین الزام لگا کر قطعی حکم تھا کہ فرمان کے پڑھتے ہی بلا تاخیر یعنی اتنی مُہلت بھی نہ دی جائے کہ تبر کو سان رکھکر تیز کر لیا جائے۔ میرا سر تن سے جُدا کر دیا جائے۔

ہوریشیو:۔ حضور کیا ایسا ممکن تھا؟

ہیملٹ:- لو یہ فرمان موجود ہے۔ کسی وقت فرصت میں اُسے پڑھ لینا۔ اِس وقت تو یہ سُن لو کہ میں نے اسکے بعد کیا کیا۔

ہوریشیو:- ضرور فرمائیں۔

ہیملٹ:- جب میں نے دیکھا کہ شرارتوں اور فتنوں کے دامِ بلا میں بُری طرح گرفتار ہوا ہوں اور اُن کی سازش بہت پہلے اِس سے کہ میں کچھ اس بارے میں غور کر سکتا تھا شروع ہو ئی تھی تو میں بیٹھ گیا اور جو فرمان وہ لیکر چلے تھے۔ اُس کی جگہ ایک دوسرا فرمان نہایت خوشخط لکھنے لگا۔ کسی زمانے میں آجکل کے مُدبّرانِ مصلحتِ مُلکی کی طرح مجھے بھی خیال ہو چلا تھا کہ خوشنویسی شریفوں کا شیوہ نہیں اور خوشخطی میں مشق بہم پہونچانے کے بعد میں نے اپنا خط بگاڑنا شروع کیا۔ لیکن ہوریشیو اس وقت اُسنے بڑا کام دیا۔ ہوریشیو، کیا تم جاننا چاہتے ہو کہ میں نے فرمان میں کیا عبارت تحریر کی۔

ہوریشیو:- ہاں حضور سُنائیے۔

ہیملٹ:- میں نے اپنے چچا کلادیوس کی طرف سے نہایت اصرار سے درخواست کی اور تحریر کیا کہ چونکہ انگلستان بادشاہِ ڈنمارک کے ساتھ سچّا اتحاد رکھتا ہے اور اُسے اُمید ہے کہ دونوں بادشاہوں میں جو محبّت اور تعلق ہے وہ ہمیشہ درختِ خُرما کی طرح پُھولتا پھلتا رہیگا اور امن و سلامتی کے کنٹھے پہنے ہم دونوں اس طرح سب میں کھڑے نظر آئینگے جیسے دو جُملوں میں علامت عطف ہوتی ہے۔ اور ان کے علاوہ بہت سے اہم و ضروری امور یاد دلا کر لکھا کہ اس تحریر کو پڑھتے ہی بلا تردُد یا آیندہ کسی بحث کے خیال کے اِس فرمان کے حاملوں کو فوراً ہلاک کر دیا جائے اور اُنہیں اتنی مُہلت بھی نہ دی جائے کہ موت کے وقت وہ پادری کے سامنے اپنے گُناہوں کا اقرار کرسکیں۔

ہوریشیو:- حضور نے اپنی اِس تحریر پہ مُہر کس کی لگائی؟

ہیملٹ:- اس میں خُدا معاون و مددگار رہا۔ اتفاق سے میرے والد کی مُہر میرے خریطے میں تھی۔ اور اُسی کے نمونے پر ڈنمارک کی شاہی مُہر تیار ہوئی تھی۔ غرض میں نے اپنی تحریر کو اصلی تحریر کی طرح تہہ کرکے اور بادشاہِ ڈنمارک کے دستخط اُسپر بنا کر آخرکار لفافے پہ مُہر کر دی۔ اور چُپکے سے پھر جا کر جہاں سے پہلی تحریر نکالی تھی وہیں یہ نئی تحریر رکھدی۔ اِس ردوبدل کا حال کسی پر نہ کُھلا۔ دوسرے دن قزاقوں سے لڑائی ہوئی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تمہیں معلوم ہی ہے۔

ہوریشیو:- تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ روزنکرانز اور گلڈنسٹرن مرنے جارہے ہیں۔

ہیملٹ:- سُنو ہوریشیو جو لوگ میرے قتل کی سازش میں ایسے ذوق و شوق سے شریک ہوئے ہوں وہ مجھے کیونکر عزیز ہو سکتے تھے۔ اُن کی ناکامی خود اُن کی چالوں کا نتیجہ ہوئی۔ ایسے کم درجہ آدمیوں کا، دو زبردست آدمیوں کے بیچ میں آجانا جیسے میں اور میرا چچا ہے، خطرناک ہوتا ہے۔

ہوریشیو:- یہ بادشاہ بھی عجیب ہے۔

ہیملٹ:- ہوریشیو، ذرا سمجھو تو جس وقت خیال آتا ہے کہ اس میرے چچا کلادیوس نے میرے باپ کو جان سے مارا۔ میری ماں کو بے عزتی کا داغ لگایا۔ میرے اور تختِ ڈنمارک کے درمیان آکر مجھے بادشاہی سے محروم رکھا جس کا میں مستحق تھا اور اُسپر بھی وہ میری جان کا ایسا لاگو ہوا کہ ماہی گیر بھی مچھلی کی جان کا اتنا دُشمن نہیں ہوتا۔ اور یہ کُل کام نہایت دھوکے فریب اور دغا سے کئے۔ تو کیا پھر ایک پاک ضمیر کا فرض نہ تھا کہ اس بازو سے اُس کا کام تمام کیا جائے۔ کیا ایک مرضِ مُتعدی کے مریض کو جو دوسروں کے لئے خطرناک ہے اِس بات سے روکنا کہ وہ دوسروں کی تکلیف میں زیادتی نہ پیدا کر سکے ایسی چیز ہوسکتا ہے جس کا عذاب مجھے اُٹھانا پڑے۔

ہوریشیو:- بادشاہ کے پاس سے تھوڑے دن میں انگلستان سے

خیر آجائیگی کہ وہاں اِس معاملے میں کیا ہوا۔

ہیملٹ:- بلاشبہ تھوڑی مدت میں بادشاہ پر کُل حال روشن ہوجائیگا۔ لیکن یہ بیچ کا زمانہ تو میرا ہے۔ اِنسان کی زندگی ختم کرنے میں دیر ہی کیا لگتی ہے۔ لیکن میرے اچھے ہوریشیو، نے ارتیبز کے ساتھ میں اپنے آپے کو بالکل بھول گیا۔ اِس کا مجھے بڑا قلق اور افسوس ہے، کیونکہ مجھے اپنا حال دیکھکر اس کی حالت کا اندازہ کرنا چاہیئے تھا۔ میں اُس سے پھر ملکر یہ بات صاف کرلونگا۔ اصل بات یہ ہے کہ اُس نے اپنی بہن کے مرنے پر اپنا غم کچھ ایسا بڑھا چڑھا کر ظاہر کیا کہ مجھے اُس پر بیجا غصّہ آگیا۔

ہوریشیو:- خاموش رہیئے۔ کوئی اِدھر آرہا ہے۔

(اوسرک داخل ہوتا ہے۔)

اوسرک:- شہزادۂ والا قدر۔ ڈنمارک میں حضور کی واپسی پر مُبارکباد عرض کرتا ہوں۔

ہیملٹ:- میں نہایت ادب و انکسار کے ساتھ جناب کا شکریہ ادا کرتا ہوں (ہوریشیو سے مخاطب ہوکر) تم اِس پانی پر اُڑنے والی مکھی سے واقف ہو؟

ہوریشیو:- نہیں حضور، میں واقف نہیں۔

ہیملٹ:- تو تم بڑے خوش قسمت ہو، کیونکہ اس سے واقف ہونا ایک قسم کی مذموم حرکت ہے۔ اسکے پاس زمین بہت ہے اور وہ بڑی سبز حاصل و شاداب ہے۔ جانوروں کا رئیس جانور ہی کو ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر یہ جانور صاحبِ املاک ہو تو اس کے دانہ گھاس کی کُنڈالی بادشاہ کے دسترخوان پر رکھی جائیگی۔ دیکھئے ہوا کیسا کوّے کی طرح کائیں کائیں کرتا ہے۔

کریم فرما۔ اگر حضور کو فرصت ہو تو بادشاہ سلامت کی فرمائی ہوئی ایک بات عرض کروں۔ ضرور میں اُسے دل و جان سے سُنونگا۔ آپ ٹوپی سر پر رکھ لیں۔ ٹوپی سر کیلیئے ہوتی ہے۔

اوسرک:- حضور، میں سمجھتا ہوں کہ اِسوقت گرمی بہت ہے۔

ہیملٹ:- نہیں جناب میرا یقین کریں، اِس وقت سردی بہت ہے ہوا شمال کی چل رہی ہے۔

اوسرک:- حضور، سردی البتہ زیادہ ہے۔

ہیملٹ:- لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میرے مزاج کے آدمی کیلئے اِس وقت گرمی زیادہ ہے۔

اوسرک:- حضور بجا ہے۔ گرمی اتنی ہے کہ عرض نہیں کرسکتا۔ لیکن بادشاہ سلامت نے مجھے آپ کے پاس یہ کہنے کو بھیجا ہے کہ جہاں پناہ نے آپ پر ایک بڑی بھاری شرط لگائی ہے۔ یہی امر تھا جو.......

ہیملٹ:- میں نہایت عاجزی سے عرض کرتا ہوں۔ آپکو یاد ہوگا۔

(اوسرک سے ٹوپی سر پر رکھنے کو کہتا ہے۔)

اوسرک:- نہیں شہزادۂ والاجاہ سچ عرض کرتا ہوں کہ ٹوپی میں اپنے سر پر اپنے آرام کیلئے نہیں رکھتا۔ حضور سُنیں کہ حال میں ایک شخص نے ارتیبز نامی شاہی دربار میں وارد ہوا ہے۔ یقین فرمائیں کہ نہایت شریف آدمی ہے۔ مذاقِ سلیم رکھتا ہے اور شریفوں کی طرح نہایت باتمیز ہے۔ اُس کی حرکات و سکنات سب خوشگوار ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے میں عرض کرسکتا ہوں کہ وہ آدمی کیا ہے قواعد و ضوابط کی ایک زندہ کتاب ہے جو حسبِ ضرورت دوسرے شخص کو مطالعہ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ حضور اُس کی ذات میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک شریف زادے میں ہونی چاہئیں۔ وہ بڑی خوبیوں کا آدمی ہے اور اپنے عُمدہ اوصاف کو نہایت احسن طریقے پر ظاہر کرتا ہے۔

ہیملٹ:- جو کچھ آپ نے اس کی نسبت فرمایا ہے اُسکو کچھ نقصان نہیں پہونچتا۔ گو مجھے علم ہے کہ اس کی تمام خوبیوں اور اوصاف پسندیدہ کی اگر ایک فہرست تیار کی جائے تو وہ اتنی ہوگی کہ ایک بڑے عالمِ ریاضیات کے حافظے کو بھی چکر میں ڈال دے اور سبکو شمار کرنے میں بھی وہ قاصر رہے۔ لیکن میں اُس کی تعریف صرف اس حد تک ضرور صحیح خیال کرتا ہوں کہ وہ بڑا لائق اور قابلیت کا شخص ہے

اور اس کے جملہ اوصاف اسقدر عدیم المثال ہیں کہ اُن کے بیان کرنے میں بجز اس کے کوئی دوسری صورت نہیں ہے کہ آئینہ لیکر اُسکو اُس کی صورت دکھادی جائے۔ اور کوئی شخص جو اُس کی نقل اُتارے اُس کی حقیقت بجز ایک عکس کے اور کچھ نہ ہوگی۔

اوسرک :- حضور نے اُس کا حال ایسا صحیح بیان کیا ہے کہ اُسمیں غلطی کا ہرگز احتمال نہیں۔

ہیملٹ :- لیکن جناب من۔ اِس گفتگو سے فی الواقع حاصل کیا ہے کہ ہم ایک شریف کا حال اپنی اپنی نامعقول عبارت میں بیان کریں؟

اوسرک :- حضور بجا ہے۔

ہیملٹ :- کیا یہ ممکن نہیں کہ اُس شریف زادے کے حالات سادے طرز و الفاظ میں بیان کئے جائیں، آپ تو ضرور سادی عبارت میں اُس کے حالات بیان کرسکتے ہیں۔ لیکن اس وقت اُس کے ذکر سے منشا کیا ہے۔ اُن صاحب کا اسم گرامی کیا ہے؟

اوسرک :- لے ارتیز۔

ہوریشیو :- اوسرک کا خزانۂ الفاظ خالی ہوگیا ہے اور اس کے سرمایہ میں جسقدر طلائی الفاظ تھے وہ سب صرف ہوچکے ہیں۔

ہیملٹ :- اچھا اُس کا نام لے ارتیز ہے۔

اوسرک :- میں سمجھتا ہوں کہ حضور اس سے واقف نہیں ہیں؟

ہیملٹ :- اِس سوال کے جواب میں آپ جو کچھ دریافت فرماتے ہیں اسے کاش آپکو علم ہوتا کہ میں اُس سے ناواقف نہیں ہوں۔ لیکن اگر آپکو اِس کا علم بھی ہوتا تو مجھے اس سے کیا نفع تھا۔ اور فرمائیے۔

اوسرک :- تو حضور اس سے ناواقف نہیں ہیں کہ وہ کیسی لیاقت اور خوبیوں کا آدمی ہے۔

ہیملٹ :- مجھے خواہی نخواہی تو اس امر کا دعویٰ نہ ہونا چاہیئے کہ میں لے ارتیز کی خوبیوں سے واقف ہوں۔ اس میں تو گویا اپنی خوبیوں سے اُس کی خوبیوں کا مقابلہ کرنا پڑیگا۔ وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے شخص کی خوبیوں کی نسبت یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اُن سے واقف ہوں تاوقتیکہ وہ نہ جانتا ہو کہ وہی خوبیاں خود اپنے میں موجود ہیں۔

اوسرک :- حضور، خوبیوں سے میرا مطلب صرف یہ تھا کہ تلوار چلانے میں وہ بہت ہوشیار اور مشاق ہے۔ ہر شخص کی زبان پر ہے کہ اس فن میں دوسرا اس کی مثل نہیں ہے۔

ہیملٹ :- اُس کا ہتھیار کیا ہے؟

اوسرک :- سیدھی سیف اور خنجر۔

ہیملٹ :- اچھا یہی دو ہتھیار چلانے وہ جانتا ہے۔ اس کے علاوہ جناب کو اور کیا فرمانا ہے؟

اوسرک :- جہاں پناہ نے ایک فرانسیسی سے حضور پر شرط لگائی ہے کہ اگر حضور ہارے تو بادشاہ سلامت چھ بربری گھوڑے دینگے اور اگر لے ارتیز ہارا تو وہ فرانسیسی چھ فرانسیسی تلواریں اور چھ خنجر مع اُن کے سازوسامان کے بادشاہ کی نذر کریگا۔ تلواروں کے آویزے نہایت ہی خوبصورت اور بیش بہا ہیں۔ اور اُن پر بھی وہی کام ہے جو تلواروں اور خنجروں کے قبضوں پر ہے۔

ہیملٹ :- "آویزوں" سے جناب کا کیا مطلب؟

ہوریشیو :- حضور کو متن میں اس لفظ کا کیا پتہ چلیگا جب تک حاشیہ پڑھکر اس کے معنی تحقیق نہ کرلیں گے؟

اوسرک :- آویزوں سے مطلب وہ تسمے اور فیتے ہیں جن سے کمر میں تلوار لٹکائی جاتی ہے۔

ہیملٹ :- بہتر ہو کہ آویزوں کی جگہ یہی جملہ جو آپنے ابھی فرمایا ہے استعمال کیا جائے۔ ہاں تو شرط میں ایک جانب مُلک بربر کے چھ گھوڑے اور دوسری جانب چھ فرانسیسی تلواریں مع سازوسامان کے بدی گئی ہیں، گویا یہی شرط فرانس اور ڈنمارک میں ہماری شمشیر بازی پر ہوئی ہے۔

اوسرک:- لیکن بادشاہ سلامت نے اس شرط میں اتنی بات اور بڑھا دی ہے کہ آپکی نو ضربیں ارتیز کی بارہ ضربوں کے برابر سمجھی جائینگی۔ اگر نے ارتیز کی ضربیں بارہ سے بڑھ گئیں تو وہ جیت جائیگا۔ جہاں پناہ چاہتے ہیں کہ دونوں صاحبوں کا مقابلہ فوراً ہوجائے۔ اب جیسا حضور جواب دینگے وہی بادشاہ سلامت کی خدمت میں عرض کرونگا۔

ہیملٹ:- اگر میں نے مقابلہ سے انکار کردیا تو کیا ہوگا؟

اوسرک:- حضور میرے عرض کرنے کا مطلب صرف اتنا تھا کہ جناب والا اس مقابلہ میں شرکت فرمانا پسند کرینگے۔

ہیملٹ:- اچھا میں اسی ایوان میں دن کے ایسے حصے میں جبکہ میں ورزش کیا کرتا ہوں آونگا۔ تلواریں وہاں موجود رہنی چاہئیں۔ اگر فریقین کی مرضی ہوئی اور بادشاہ سلامت اپنی شرط پر قائم رہے تو دو ہی باتیں ہونگی۔ یا تو مقابلے میں جیت کر بادشاہ سلامت کو ان کی بدی ہوئی بازی جتا دونگا یا نتیجہ شرمندگی اور وہ چوٹیں ہونگی جو فریق مخالف میرے جسم پر پہونچائیگا۔

اوسرک:- ارشاد ہو تو جو کچھ حضور نے فرمایا ہے بجنسہ بادشاہ سلامت کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کروں۔

ہیملٹ:- ہاں مضمون اتنا ہی ہو، رہی الفاظ کی زیب و زینت تو اس کا آپکو اختیار ہے۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اوسرک:- جناب والا، یہ خاکسار اپنی خدمات پیش کرکے بصد عجز و نیاز حضور سے رخصت چاہتا ہے (چلا جاتا ہے)

ہیملٹ:- مجھے بھی اپنا ادنیٰ ملازم سمجھئے! اس کام میں اس شخص کا اپنی خدمات پیش کرنا ہی مناسب تھا۔ کیونکہ ایسے شستہ اور پُر تکلف الفاظ پر دوسرا کون قادر ہوسکتا ہے۔

ہوریشیو:- واللہ حضور، اوسرک تو بو طیط چڑیا کے بچے کی طرح انڈے سے نکلتے ہی ابھی چھلکا سر پر چپکا ہے دوڑا ہوا بادشاہ سلامت کے پاس گیا ہے کہ حضور کے جواب سے بادشاہ کو مطلع کرے۔

ہیملٹ:- یہ تو وہ ہے جس نے شیرخوارگی کے زمانے میں ماں کی چھاتی منہ میں لیتے وقت اس جرأت اور آزادی کی معافی ماں سے مانگی تھی۔ اس طرح اس اوسرک اور اس کے قبیل کے اکثر لوگوں کو میں جانتا ہوں جن کی یہ گندی دنیا تعریفیں کرتی ہے۔ جہاں اسے وقت کی راگنی پہچانی آگئی پھر اس میں ایک سطحی اخلاق پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ اخلاق کیا ایک مجموعہ جھاگوں اور کفنوں کا ہوتا ہے۔ مگر یہ کف اور جھاگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان لوگوں کی رائے کے مقابلے میں بھی قائم رہتے ہیں جو اپنے خیالات کو اناج کی طرح پھٹک پھٹک کر میل کچیل سے صاف کرلیتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کی حقیقت اتنی ہی ہے کہ جہاں پھونک ماری یہ جھاگ اور بلبلے ٹوٹ کر سب فنا ہوجاتے ہیں۔

(امرائے دربار میں سے ایک امیر آتا ہے)

امیر:- جہاں پناہ نے نوجوان اوسرک کو حضور کی خدمت میں بھیجا تھا۔ اب وہ بادشاہ سلامت کی حضور میں خبر لایا ہے کہ جناب والا ایوان شاہی میں بندگان عالی کی خدمت میں حاضر ہونگے۔ جہاں پناہ دریافت فرماتے ہیں کہ کیا آپ نے ارتیز سے شمشیر بازی کے لئے اس وقت تیار ہیں، یا کچھ دیر بعد ارادہ فرمائینگے؟

ہیملٹ:- میں جو کچھ کہہ چکا ہوں اسی پر قائم ہوں۔ جہاں پناہ کی جو کچھ خوشی ہے وہی میری خوشی ہے۔ اگر وہ چاہتے ہیں کہ مقابلہ اسی وقت ہو تو میں حاضر ہوں۔ بہرکیف اس وقت یا آئندہ کسی وقت بشرطیکہ میں ایسا ہی آمادہ ہوں جیسے کہ اس وقت ہوں مقابلہ کے لئے حاضر ہونگا۔

امیر:- بادشاہ اور ملکہ سلامت دونوں تشریف لارہے ہیں۔

ہیملٹ:- خوشا نصیب کہ وہ تشریف لارہے ہیں۔

امیر:- ملکہ سلامت چاہتی ہیں کہ مقابلہ سے پیشتر آپ نے ارتیز کی کچھ خاطر و تواضع کردیں۔

ہیملٹ:- ملکہ کا یہ ارشاد نہایت معقول و مناسب ہے (امیر چلا جاتا ہے)

ہوریشیو:- جو شرط آپ پر بدی گئی ہے وہ آپ ہارتے معلوم ہوتے ہیں۔

ہیملٹ:- میرا خیال ایسا نہیں ہے کیونکہ جب سے لے آرٹیز فرانس گیا ہے میں برابر مشق کرتا رہا ہوں۔ جتنی ضربیں میرے لئے مقرر ہوئی ہیں اُن کے اعتبار سے تو مجھے جیتنے کی اُمید ہے۔ لیکن ہوریشیو کیا بتاؤں کہ اس وقت میرا دل کتنا پریشان اور سراسیمہ ہے۔ مگر دل کی حالت سے اس وقت کیا بحث ہے۔

ہوریشیو:- حضور، پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔

ہیملٹ:- ہار جانے کا خیال محض ایک بیوقوفی ہے اور اس عورتوں کا سا خوف دل میں پیدا ہوتا ہے۔

ہوریشیو:- اگر حضور کی طبیعت کسی بات کو ناپسند کرتی ہو تو آپ اپنی طبیعت کی پابندی کریں۔ میں ایوان میں بادشاہ اور ملکہ کا انتظار کرونگا اور جب وہ آئینگے تو عرض کردونگا کہ شہزادے کی طبیعت اس وقت حاضر نہیں ہے۔

ہیملٹ:- نہیں ہرگز نہیں۔ ہمیں کسی شگون کی پروا نہیں۔ ایک چھوٹی سی چڑیا کی موت پر بھی تقدیر پہلے سے حکم لگا دیتی ہے۔ تقدیر کا لکھا پورا ہونا لازمی ہے۔ اگر اس وقت وہ پوری ہونے والی ہے تو اس وقت ورنہ آئندہ ضرور پوری ہوگی۔ تقدیر کے لئے آمادہ و تیار رہنا بڑی بات ہے جو کچھ اپنے پاس ہے جب مر کر کچھ اپنے قبضے میں نہ رہے گا تو پھر دُنیا کو جلد چھوڑنے کا کیا غم۔

(بادشاہ، ملکہ، اُمرائے دربار، اوسرک، خدّام
شاہی تلواریں وغیرہ لئے اندر آتے ہیں)

بادشاہ:- ہیملٹ ادھر آؤ۔ میں اپنی طرف سے یہ ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دیتا ہوں (بادشاہ، لے آرٹیز کا ہاتھ ہیملٹ کے ہاتھ میں دیتا ہے۔)

ہیملٹ:- لے آرٹیز تم مجھے معاف کردو۔ میں نے تمہارے ساتھ ناانصافی کی، لیکن اگر شریف ہو تو تم مجھے معاف کردوگے۔ بادشاہ کو معلوم ہے اور غالباً تم نے بھی سُنا ہوگا کہ میں آجکل کیسا قسمت کا مارا ہو رہا ہوں۔ جو کچھ میں نے کیا اُس سے تمہاری طبیعت ضرور مکدّر ہوئی ہوگی۔ میں سب کے سامنے کہتا ہوں کہ وہ حالتِ جنون تھی جس میں ہیملٹ نے لے آرٹیز کی عزت کو صدمہ پہونچایا۔ لیکن کیا ہیملٹ نے لے آرٹیز کو یہ صدمہ پہونچایا؟ نہیں، ہیملٹ ہرگز اس کا باعث نہیں ہوا۔ اگر ہیملٹ اپنی طبیعت اور فطرت سے خارج ہو جائے اور جب وہ ہیملٹ ہی نہ ہو تو پھر وہ لے آرٹیز کے ساتھ کوئی بے انصافی یا بدسلوکی نہیں کرسکتا۔ پس ہیملٹ اُسے صدمہ پہونچانے کا باعث نہیں ہوا۔ ہیملٹ کو اس سے قطعی انکار ہے۔ تو پھر لے آرٹیز کی عزت کو صدمہ پہونچانے والا کون تھا؟ ہیملٹ نہ تھا بلکہ اُس کی دیوانگی تھی۔ اگر یہی بات ہے تو ہیملٹ بھی اُن میں ہے جنہیں نقصان پہونچا۔ ہیملٹ کی دیوانگی ہیملٹ کی دُشمن ہے۔ پس لے آرٹیز میرے اس اعتذار کو سُنکر کہ میں نے دیدہ و دانستہ تمہیں نقصان نہیں پہونچایا تم مجھے اپنی طبیعت کی فیاضی اور دریا دلی سے معاف کردوگے۔ یہ سمجھو کہ ایک ناسمجھ لڑکے کی طرح میں نے تیر چھوڑا تھا جو مکان کے اوپر سے گزر کر میرے بھائی کے جا لگا۔

لے آرٹیز:- میرے قدرتی خیالات کو جو اس انتقام کے سب سے بڑے محرک ہیں آپکے اس فرمانے سے ضرور اطمینان ہوگیا۔ لیکن میری ذاتی عزت کو جو صدمہ پہونچا ہے اس کے اعتبار سے میں مجبور ہوں کہ میں آپکا دوست ہوکر نہ رہوں اور آپ سے علیحدگی رکھوں میرا اور آپکا ملاپ اُس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک قوم کا کوئی معزز بزرگ جو آئینِ فطرت و عزت کا ماہر ہو مجھے اس بات کا یقین نہ دلادے کہ سابقہ نظائر ایسی موجود ہیں کہ میں آپسے مصالحت کرسکتا ہوں۔ بس یہی صورت ہے جس میں میں اپنی عزت و آبرو کو برقرار رکھ سکتا ہوں۔ جو خُلق و محبت آپنے ظاہر فرمایا ہے اُسکو میں خُلق و محبت ہی سمجھونگا۔ اور آپ کو کبھی نقصان نہ پہونچاؤنگا۔

ہیملٹ:- میں یہ منظور کرتا ہوں اور اب اپنے بھائی سے دوستانہ

مُقابلہ پر آتا ہوں اور سچے دل سے اُس سے شمشیر بازی کیلئے تیار ہوتا ہوں۔ ہمیں تلواریں دی جائیں۔ آؤ تلوار کے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔

لے ارتیز:۔ ایک تلوار مجھے بھی دی جائے۔

ہیملٹ:۔ میری کم مشقی کی حالت میں تمہاری مشق و مہارت اس طرح چمکیں گی جیسے اندھیری رات میں آسمان پر ستارے چمکتے ہیں۔

لے ارتیز:۔ یہ تو مجھے آپ چھیڑتے ہیں۔

ہیملٹ:۔ نہیں، قسم ہے اس ہاتھ کی میں چھیڑتا نہیں۔

بادشاہ:۔ نوجوان اوسرک ان دونوں کو تلواریں دو۔ شہزادے جو شرط ہم نے لگائی ہے وہ تو تم کو معلوم ہے نا؟

ہیملٹ:۔ حضور مجھے خوب معلوم ہے۔ حضور نے کمزور فریق کیلئے شرط میں تفاوت رکھا ہے۔

بادشاہ:۔ مجھے اس کا مطلق خوف نہیں کہ تم ہار وگے۔ میں تم دونوں کی اس فن میں مہارت دیکھ چکا ہوں مگر چونکہ تمہارا حریفِ مقابل زیادہ مہارت رکھتا ہے اس لئے شرط میں چند ضربوں کا فرق رکھا ہے۔

لے ارتیز:۔ یہ تلوار بھاری بہت ہے۔ دوسری تلوار دیکھنے دو۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ تلواروں کی لمبان تو سب ایک ہی ہے۔

اوسرک:۔ فدوی حاضر ہے۔

بادشاہ:۔ سامنے کی میز پر شراب کے پیالے آراستہ کرو۔ اگر ہیملٹ لے ارتیز کے پہلی یا دوسری ضرب لگائے یا وہ لے ارتیز کا تیسرا وار بچا جائے تو حکم ہو کہ قلعہ کے تمام دمدموں سے توپیں سر ہوں۔ بادشاہ اس دُعا کے ساتھ جامِ شراب نوش کریگا کہ ہیملٹ کا دم بڑھے۔ شراب کے پیالے میں ایک موتی بھی ڈالا جائے اور یہ موتی وہ ہو جسکی قیمت چار مُسلسل شاہانِ ڈنمارک کے تاجوں کے موتیوں سے زیادہ ہو۔ جامِ شراب مجھے دو۔ نقاروں کی آواز پر نفیر بجیں اور نفیر کی آواز ہر بار توپچیوں کو ہوشیار کرے اور توپوں کی گرج آسمان تک پہونچے۔ آسمان سے ان کی صدائے بازگشت زمین پر آئے۔ اچھا تو ہیملٹ کا جامِ صحت نوش کرتے ہیں۔ مُقابلہ شروع ہو۔ اور تم جو حکم مقرر ہوئے ہو غور سے دیکھتے رہو۔

ہیملٹ:۔ لے ارتیز آؤ۔

لے ارتیز:۔ آیئے شہزادے صاحب (مُقابلہ شروع ہو جاتا ہے)

ہیملٹ:۔ ایک ضرب میری صحیح ہوئی۔

لے ارتیز:۔ نہیں۔

ہیملٹ:۔ انصاف شرط ہے۔

اوسرک:۔ ہیملٹ کی ضرب صحیح ہونے میں ذرا شبہ نہیں۔

بادشاہ:۔ ٹھیرو۔ مجھے شراب دو۔ ہیملٹ یہ موتی تمہارا ہو گیا۔ اور لو یہ تمہارا جامِ صحت نوش کرتا ہوں۔

(نفیر بجتے ہیں اور توپوں کی آوازیں آتی ہیں)

یہ جامِ شراب ہیملٹ کو دو۔

ہیملٹ:۔ ابھی شراب نہ پیونگا۔ یہ بازی ختم ہو جانے دیجئے۔ جامِ شراب وہیں رہنے دو۔ لے ارتیز آؤ پھر تلوار کے ہاتھ ہو جائیں۔ دوسری ضرب بھی میری ہو گئی۔ تم کیا کہتے ہو؟

(دونوں پھر تلوار چلاتے ہیں)

لے ارتیز:۔ ہاں۔ آپکی تلوار سے مجھے چھُو ضرور گئی ہے۔ اتنا مانتا ہوں۔

بادشاہ:۔ ہمارا فرزند جیت جائیگا۔

ملکہ:۔ ڈیل کا بھاری ہے اور دم بھی پھُول چلا ہے۔ بیٹا۔ میرا رومال لیکر پیشانی کا پسینہ پونچھ لو۔ ہیملٹ میرے فرزند، میں تیرے جیتنے کیلئے جامِ شراب نوش کرتی ہوں۔

ہیملٹ:۔ اچھا اماں۔ اچھا۔

بادشاہ:۔ گرٹرود۔ ہرگز یہ شراب نہ پینا۔

ملکہ:۔ میں تو ضرور پیونگی۔ معاف فرمائیں۔ مجھے یہ شراب پینے دیں۔

بادشاہ:۔ (علیحدہ) یہ جام تو وہ ہے جس میں زہر ملا تھا۔ اب کیا ہو سکتا ہے، ملکہ تو پی چکی۔

ہیملٹ:۔ اماں۔ میں ابھی نہیں پیونگا۔ ذرا صبر کیجئے۔

ملکہ:- بیٹا، میرے پاس آ- میں تیری پیشانی کا پسینہ پونچھ دوں-

لے ارٹیز:- بادشاہ سلامت حکم ہو تو ہیملٹ کے ضرب لگاؤں-

بادشاہ:- میں نہیں سمجھتا کہ ضرب لگا سکو گے-

لے ارٹیز:- (علیحدہ) میرا ضمیر مجھے منع کرتا ہے-

ہیملٹ:- آؤ، تیسری بار بھی ہو جائے- لے ارٹیز تم توقف کیوں کرنے لگے؟ میں کہتا ہوں کہ جسقدر پھرتی ممکن ہے اُس سے ضرب لگاؤ- تم تو مجھے کچھ سمجھتے ہی نہیں-

لے ارٹیز:- ایسا خیال ہے تو آیئے- (دونوں تلواریں چلاتے ہیں)

اوسرک:- وار کسی کا بھی سخت نہیں پڑتا-

لے ارٹیز:- اچھا اب سہی (لے ارٹیز زہر آلودہ تلوار سے ہیملٹ کو زخمی کرتا ہے- اس کشمکش میں تلواریں دونوں کے ہاتھ سے گر جاتی ہیں- لے ارٹیز کی تلوار ہیملٹ اور ہیملٹ کی تلوار لے ارٹیز اُٹھا لیتا ہے، اور اب ہیملٹ لے ارٹیز کو زخمی کرتا ہے)

بادشاہ:- دونوں کو علیحدہ کر دو- انہیں غصہ آگیا ہے-

ہیملٹ:- لے ارٹیز پھر آؤ-

اوسرک:- جہاں پناہ، ملکہ سلامت کا حال تو دیکھیں-

ہوریشیو:- فریقین زخمی ہو گئے ہیں اور لہو بہہ رہا ہے، شہزادہ ہیملٹ، حضور کا کیا حال ہے؟

اوسرک:- لے ارٹیز تمہارا کیا حال ہے؟

لے ارٹیز:- میرا حال تو اُس سدھے ہوئے جانور کا سا ہو رہا ہے جو دوسروں کو پکڑنے کیلئے پھندے کے پاس باندھا جاتا ہے- اور خود پھندے میں پھنس جاتا ہے- میں خود اپنے فریب و دغا کا شکار ہوا ہوں، اور یہی ہونا بھی چاہیئے تھا-

ہیملٹ:- ملکہ کا کیا حال ہے؟

بادشاہ:- تم دونوں کا لہو بہتا دیکھکر غش آگیا ہے-

ملکہ:- نہیں نہیں- شراب میں کچھ تھا- اور مجھ پر اب زہر کا اثر ہے-

(ملکہ مرجاتی ہے)

ہیملٹ:- دغا، فریب، دروازے بند کر دو- اور دغا باز کو گرفتار کرو-

لے ارٹیز:- وہ دغا باز میں موجود ہوں- ہیملٹ کوئی دوا دنیا میں اب ایسی نہیں جو تمہیں شفا بخشے- آدھے گھنٹے سے زیادہ کی جان تم میں اب باقی نہیں، جو تلوار تمہارے ہاتھ ہے اُس کی نوک پر گھنڈی نہیں ہے اور نوک زہر آلود ہے- میں نے یہ دہوکا دینا چاہا تھا مگر وہ دھوکا اب خود مجھ پر چل گیا- اب میں گرتا ہوں اور گر کر پھر نہ اُٹھونگا- ہیملٹ، تمہاری ماں کو زہر دیا گیا ہے- اب مجھ سے بات نہیں ہوتی- سارا الزام بادشاہ پر ہے بادشاہ پر-

ہیملٹ:- کیا تلوار کی نوک زہر میں بجھی ہے؟ آ زہر اپنا کام کر- (ہیملٹ بڑھکر وہی تلوار بادشاہ کے سینے میں بھونک دیتا ہے-)

بادشاہ:- دوستو ابھی کچھ نہیں گیا ہے- مجھے اس دشمن سے بچاؤ- صرف تھوڑی سی خراش آئی ہے-

ہیملٹ:- ارے بدبخت- حرامکار- بے گناہوں کا خون کرنے والے- لعین کلادیوس- یہ زہر جو بچا ہے وہ بھی پی- اِسی میں موتی بھی پڑا ہے- میری ماں جہاں مری ہے تو بھی مرجا-

(بادشاہ مرجاتا ہے-)

لے ارٹیز:- اِس کی یہی سزا تھی- یہ زہر وہ ہے جسے بادشاہ نے خود تیار کیا تھا- شریف ہیملٹ، مجھے معاف کرنا- میری اور میرے باپ کی موت کا باعث تم نہ تھے- اور نہ میں تمہاری موت کا باعث ہوا ہوں- (لے ارٹیز مرجاتا ہے-)

ہیملٹ:- لے ارٹیز، خدا تجھے اپنے الزام سے بری رکھے- میں بھی تیرے ہی ساتھ چلتا ہوں- ہوریشیو میں مرتا ہوں- اے بدنصیب ملکہ تجھے خدا کو سونپا- لوگو، جو صورت زرد کئے کھڑے لرزتے ہو، جو زبان سے کچھ نہیں کہتے اور اِس ہولناک منظر کو حیرت سے بُت بنے دیکھ رہے ہو- اگر میرے پاس وقت ہوتا (ورنہ یہ موت کا ظالم حولدار میری گرفتاری میں اتنی جلدی نہ کرتا اور مجھکو تھوڑی سی مہلت بھی دیتا) تو میں اِن دردناک واقعات کی پوری کیفیت بیان کرتا لیکن

اب کیا ہو سکتا ہے۔ ہوریشیو، میں مرتا ہوں۔ تم زندہ رہو۔ جن لوگوں کے دل میں شبہ ہو اُن سے میرا اور اس کُل قصّے کا احوال بیان کر دینا۔

ہوریشیو:- ہرگز یقین نہ رکھیئے کہ میں آپ کے بعد زندہ رہونگا میرا حال بھی پُرانے زمانے کے رومانیوں کا سا ہے، آجکل کے ڈنمارک والوں کا سا نہیں ہے۔ تھوڑی سی زہر آمیز شراب ابھی اس پیالے میں باقی ہے۔

ہیملٹ:- نہیں ہرگز نہیں۔ ہوریشیو، اگر تو مرد ہے اور مروّت رکھتا ہے پیالہ مجھے دے۔ (ہوریشیو پیالہ اپنے پاس رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔)

خُدا کا واسطہ دیتا ہوں۔ ہوریشیو پیالہ مجھے دیدے۔ پیارے ہوریشیو ذرا خیال تو کر کہ میرے مرنے کے بعد لوگ مجھے کس قدر مطعون و بدنام کرینگے۔ اگر سچی بات ظاہر نہ کی گئی اور معاملہ اسی حال میں رہا جس میں کہ اس وقت ہے۔ اگر تجھے کبھی مجھ سے محبّت تھی اور تیرے دل کو کبھی مجھ سے تعلق تھا تو تھوڑے دن اور اُس خوشی سے مُنہ پھیرے جو موت لانے والی ہے اور درد و تکلیف کے ساتھ اس جور و ظلم کی دُنیا میں اس غرض سے جیتا رہ کہ میرے متعلق صحیح واقعات بیان کریگا (دُور سے سپاہیوں کے مارچ کرنے اور بندوقوں کے چھُوٹنے کی آواز آتی ہے) یہ آواز کیسی ہے؟

اوسرک:- نوجوان فورٹن براس جو پولستان سے فتح پاکر واپس آرہا ہے، انگلستان کے سفیروں کی سلامی اُتارتا ہے۔

ہیملٹ:- ہوریشیو میں مرتا ہوں۔ یہ قاتل زہر اب میری رگوں میں اثر کرنے لگا ہے۔ انگلستان سے خبر آنے تک میں زندہ نہیں رہ سکتا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ڈنمارک پر حکومت کے لئے فورٹن براس کا انتخاب ہوگا۔ میں بھی مرتے وقت اُسی کے لئے رائے دیتا ہوں۔ اور جب اُس سے ملو تو میری طرف سے یہی کہدینا۔ اور کم و بیش یہاں کے حالات سے بھی اُسے آگاہ کرنا باقی سنّاٹا ہے۔

(ہیملٹ مرجاتا ہے۔)

ہوریشیو:- ہائے کیسا شریف دل چٹخ کر ٹوٹا ہے۔ پیارے شہزادے تجھے خُدا کے سُپرد کیا۔ فرشتوں کے جھُرمٹ پرواز کرتے تیری روح کو آسمان پر لے جائیں اور وہاں اپنے شیریں نغمے سُنا سُنا کر تجھے آرام کی نیند سُلا دیں۔ یہ نقّارے یہاں کیسے بجتے آرہے ہیں؟

(سپاہیوں کے اندر آنے کی آواز آتی ہے فورٹن براس اور انگلستان کے سفیر مع اور لوگوں کے ایوان میں آتے ہیں۔)

فورٹن براس:- یہ کیسا دردناک منظر آنکھوں کے سامنے ہے؟

ہوریشیو:- کیا چیز ہے جس کی تلاش ہے؟ درد و حسرت کی یہاں کیا کمی ہے۔

فورٹن براس:- مُردوں کے یہ تُودے جانوں کے تلف ہونے پر فریاد کرتے ہیں۔ یا انتقام کیلئے اور جانوں کے ضائع کئے جانے کا تقاضا کرتے ہیں۔ اے موت، انسان کی مغرور فاتح۔ تیرے تاریک محل میں اس سے بڑھکر ضیافت کا سامان کیا ہوگا؟ تُو نے کیسے کیسے دُنیا کے سرداروں اور بادشاہوں کا ایک ہی وار میں کام تمام کیا ہے۔ اور کیسے خُونی و سفّاک طریقوں سے اُن کی جان قبض کی ہے۔

پہلا انگریزی سفیر:- یہ نظّارہ نہایت خوفناک ہے، افسوس کہ ہماری سفارت انگلستان سے دیر میں آئی، وہ کان اب بہرے ہیں جو ہم سے خبریں سُنتے کہ کس طرح بادشاہِ ڈنمارک کا حُکم ہم بجالائے۔ روزنکرانز اور گلڈنسٹرن اب زندہ نہیں ہیں وہ حسب الحکم قتل کر دیئے گئے۔ اب اس حکم کی تعمیل کا شکریہ ہم کس زبان سے سُنیں گے؟

ہوریشیو:- اُسکی زبان سے نہیں سُن سکتے جو آج کو زندہ ہوتا تو آپکا

شکر گذار ہوتا۔ لیکن اُس نے کبھی اِن دونوں کے قتل کا حکم نہیں دیا تھا۔ اِس خون خرابے کے موقع پر ایک معرکۂ پولستان سے اور دوسرے انگلستان سے ایسے ٹھیک وقت وارد ہوتے ہیں کہ اب آپ ہی حکم دیں کہ یہ لاشیں اُٹھوا کر کسی بلند مقام پر عوام الناس کے معائنہ کیلئے رکھی جائیں اور مجھے اجازت دیں کہ لاعلم دُنیا کے سامنے میں تقریر کروں اور اُس میں بیان کروں کہ یہ عبرتناک واقعات کیونکر وقوع میں آئے۔ پھر آپ سُنینگے کہ کیسے کیسے گُناہ کیسے کیسے قتل اور قانونِ قدرت کے خلاف افعال، کیسی کیسی غلط تجویزیں اور تحریکیں اور اتفاقیہ قتل پیش آئے؛ اور آپکے گوش گذار ہوگا کہ بعض اموات کیسی دغا و فریب اور مجبوریوں کا نتیجہ تھیں۔ اور انجام کار اغراض و مقاصد کی غلط طریقے پر تکمیل میں کس طرح اصل محرک اور بانی فساد کے سر پر کُل آفات نازل ہوگئیں۔ یہ جُملہ حالات و واقعات میں صحیح صحیح بے کم و کاست بیان کرونگا۔

فورتن براس:۔ مناسب ہے۔ جلد انتظام کیا جائے کہ ہم یہ کُل حالات سُنیں۔ تمام عمائد و شُرفا کو جمع کیا جائے کہ یہ واقعات اُن کے گوش گذار ہوں۔ رہا میں، تو میں ڈنمارک کا تاج و تخت رنج و تکلیف کے ساتھ قبول کرتا ہوں۔ جہاں تک میری یاد کام کرتی ہے میں سمجھتا ہوں کہ مملکتِ ڈنمارک پر میرے کچھ حقوق ہیں اور وہ ایسے ہیں کہ اِس وقت اُن کو پیش کرنے کا میں مجاز ہوں۔

ہوریشیو:۔ اِس بارے میں مجھے بھی کچھ کہنا ضروری ہے، یعنی اُس کا قول نقل کرنا جس کی زبان اب نہ کُھلیگی۔ لیکن پہلے لاشوں کو کسی بلند مقام پر رکھدیا جائے۔ کیونکہ اِس وقت تمام رعایا میں وحشت و پریشانی پھیلی ہے۔ ممکن ہو کہ سازشیں اور فساد نئی پکڑیں۔ اِس امکان کو دفع کرنا ضروری ہے۔

فورتن براس:۔ چار کپتان آئیں اور ہیملٹ کی لاش کو ایک مردِ میدان کی لاش کی طرح اُٹھا کر اسٹیج پر رکھیں۔ اِس کی قسمت میں اگر بادشاہی آتی ہوتی تو اِس سے بہت سی علامتیں ایسی ظاہر ہوئی تھیں کہ وہ بڑا لائق و فیاض بادشاہ ہوتا۔ جس وقت ہیملٹ کا جنازہ گزرنے لگے تو فوجی باجے اور تمام حربی مراسم جنازے پر ادا کئے جائیں۔ جاؤ سپاہ کو حکم دو کہ وہ جنازے کی سلامی اُتاریں۔

(ماتمی باجے بجتے ہیں۔ لوگ لاشوں کو اُٹھائے نظر آتے ہیں۔ بندوقوں اور توپوں کی آوازیں بلند ہوتی ہیں)

(ترجمہ) ــــــــ عنایت اللہ دہلوی

نمونے کا خطبۂ صدارت

ہندوستان میں آج کل کانفرنسوں کا بڑا زور ہے۔ بڑے دن کی چھٹیوں میں جب لوگوں کا ہاضمہ درست ہوتا ہے اور ریل کا ٹکٹ سستا ہوجاتا ہے تو یارانِ طریقت کو کانفرنس کی سوجھتی ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو چھوٹی بڑی دو ڈھائی سو کانفرنسیں ہر سال ہوجاتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ میلا دیکھنے کا شوق ہم لوگوں کی گھٹی میں پڑا ہے مگر میلوں میں جانے کو پڑھے لکھے لوگ اب بُرا سمجھنے لگے ہیں۔ اس لئے کہ وہاں دُنیا بھر کے اُجڈ جاہل اکٹھا ہوتے ہیں جن کے پاس جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں ہماری نازک عقل اور سُبک تہذیب کو ٹھیس نہ لگ جائے اور یہ وہ آئینہ نہیں ہے ؎

جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ پڑھ لکھ کر آدمی کو چیزوں سے زیادہ لفظوں کا شوق ہوجاتا ہے۔ اور اُسے حرفوں اور ان کی آوازوں میں کائنات کی حقیقت چھُپی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ میلوں چیزوں کا بازار لگتا ہے لفظوں کی دُکانیں نہیں ہوتیں۔ اس لئے پڑھے لکھوں نے میلے کی جگہ کانفرنس کا نقشہ جمایا ہے۔ جہاں ان کی ضیافتِ طبع کا پورا سامان موجود ہوتا ہے۔ یعنی گرما گرم تقریریں اور اُن میں چٹپٹے مسالے دار فقروں کی چاٹ۔ لفظوں کی جتنی رسید کانفرنس میں ہاتھ آجاتی ہے وہ بہت سے لوگوں کو سال بھر کے لئے خیالات سے بے نیاز کردیتی ہے۔

مگر کانفرنس میں اور تو سب مزے میں رہتے ہیں مصیبت بے چارے صدر کی ہوتی ہے جسے ایک لمبا چوڑا خطبۂ صدارت لکھ کر یا لکھوا کر پڑھنا پڑتا ہے۔ نہ جانے کس کس جتن سے تو غریب صدر بنتا ہے اور پہلے دن سے یہ فکر سر پر سوار ہوجاتی ہے کہ ایک دھواں دھار خطبۂ صدارت لکھا جائے اور اس کی ہزار دو ہزار یا دس پندرہ ہزار کاپیاں اپنی گرہ سے دام خرچ کرکے چھپوائی جائیں۔ پہلی مشکل یہ ہوتی ہے کہ لکھے تو کیا لکھے اور لکھوائے تو کیا لکھوائے۔ دُنیا کا قاعدہ ہے کہ صدر کی تقریر میں کام کی باتیں ہوتی ہیں۔ یعنی کانفرنس کے اگلے سال کے کاموں کا خاکہ کھینچا جاتا ہے۔ مگر ہماری کانفرنس جو میلے کا نعم البدل ہے کام کا جھگڑا ہی نہیں رکھتی۔ پھر اس کا خاکہ کیا خاک کھینچا جائے اس لئے صدر کو یا اس کے ہمزاد کو جو خطبۂ صدارت لکھتا ہے یہی کرنا پڑتا ہے کہ جلسے کے مذاق کو دیکھ کر لفظوں کے خمیر سے ایسی تیز شراب کھینچے "جو قلب کو گرما دے اور روح کو تڑپا دے"۔ یعنی تھوڑی دیر کے لئے مردہ دلوں میں زندگی کا وہ جوش اور ولولہ پیدا کردے۔ جسے عمل سے سروکار نہ ہو۔ مگر اس شراب کا کھینچنا ہر ایک کا کام نہیں۔ اس کے لئے بڑا پُرانا منجھا ہوا بھبکا چاہیئے۔ کیونکہ اگر شراب میں سچ مچ کا نشہ ہوا تو ایک طرف حکومت کی آبکاری کا ڈر ہے۔ دوسری طرف سوسائٹی کے ٹھیکیدار کا کھٹکا ہے اور تیسری طرف مذہب کے محتسب کا خوف ہے۔ اس میں بس اتنا ہی سرور ہونا چاہیئے کہ جلسے کے ختم تک سُننے والوں کا دل و دماغ جھومتا رہے۔ اگر ہر طرح کی احتیاط کے باوجود کبھی اتفاق سے زیادہ چڑھ جاتی ہے اور جلسہ قابو سے باہر ہونے لگتا ہے تو ایسے وقت میں چندے کا نسخہ بہت کام آتا ہے جہاں چندے کا نام آیا اور جلسے کا نشہ ہرن ہوا۔

غرض خطبۂ صدارت کا ایسا بے ڈھب معاملہ ہے جس کی وجہ سے کانفرنسوں کیلئے صدر ڈھونڈھنا روز بروز مشکل ہوتا جاتا ہے۔

بھر بازار میں مانگ بڑھ رہی ہے اور اُدھر مال کی رسد گھٹتی جاتی ہے۔ اس سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ لوگوں کو صدر بننے کا شوق نہیں رہا۔ "جذبۂ بے اختیار شوق" اب بھی بہت سے دلوں میں بھڑک رہا ہے مگر خطبۂ صدارت کی فکر اکثر اس آگ کو ٹھنڈا کر دیتی ہے اور اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں خدانخواستہ صدروں کی ہڑتال ہو گئی تو کانفرنسوں کا کاروبار ہی بند کرنا پڑے گا۔ اس لئے ہم کے ایک ہمدرد نے جو اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتے جناب صدر کے حال پر رحم کھا کر ایک نمونے کا خطبۂ صدارت تیار کیا ہے جو ہر کانفرنس میں خواہ وہ سیاسی ہو یا علمی، اخلاقی ہو یا معاشرتی، اچھوت اُدھار کی ہو یا گرام سُدھار کی تھوڑی بہت ترمیم کر کے بے تکلف پڑھا جا سکتا ہے۔ ہم اس کا خلاصہ آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کے کام آئے۔ مصنف کی طرف سے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ اس خطبہ کے جملہ حقوق غیر محفوظ ہیں:۔

"حاضرین اور حاضرات۔ بھائیو اور بہنو۔ آپ نے جو بے پناہ عزت آج مجھے بخشی ہے اس کا شکریہ، آہ اس کا شکریہ! میں کس زبان سے ادا کروں! وہ الفاظ کہاں سے لاؤں کس لغت میں ڈھونڈھوں، جو میرے شدید و عمیق اطول و عریض جذباتِ قلب کی ترجمانی کریں۔ جب میں اس عظیم الشان، جلیل القدر منصب کو دیکھتا ہوں اور اپنی ہیچ مدانی، ہیچ میرزی پر نظر ڈالتا ہوں تو کانپ اُٹھتا ہوں کہ میں اس کی عظمت و جلالت کا بار کیونکر اُٹھاؤں گا، اور یہ میری ناکسی اور نااہلی کا بوجھ کیوں کر سہے گا۔ یہ مسند صدارت جس پر آپ کی ذرہ نوازی سے میں آج بیٹھا ہوں، یعنی ابھی دو منٹ ہوئے بیٹھا تھا اور یہ تقریر ختم کر کے پھر بیٹھوں گا مجھ سے پہلے ان حضرات کی جلوہ گاہ رہ چکی ہے جن کا نام بقائے دوام کی طلسمی لوح پر زریں حرفوں سے تحریر ہے۔ زمانے کا انقلاب دیکھئے کہ آج یہی مسند مجھ جیسے ننگ خلائق کی بیٹھک ہے۔"

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

بہرحال اب میں خاکساری اور منزلت نفس کے جذبات کو جو میرے دل میں اُمڈ رہے ہیں دبانے کی کوشش کروں گا۔ اگر میں اپنی نالائقی پر زیادہ زور دیتا ہوں تو اس سے آپ کی مردم شناسی پر حرف آتا ہے اور یہ مجھے ہرگز گوارا نہیں۔ آپ نے اس منصب جلیل کے لئے میرا انتخاب آخر کسی مصلحت ہی سے کیا ہوگا۔ میری یہ مجال نہیں کہ ملک و ملت کے فیصلے پر نکتہ چینی کروں۔ چار و ناچار سمعاً و طاعتاً کہ کر آپ کے فیصلے کے آگے سر جھکاتا ہوں اور اس بار گراں کو اپنے کمزور کندھوں پر اُٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

بھائیو اور بہنو! ہماری کانفرنس کا یہ اجلاس ایک مہتم بالشان، معرکۃ الآرا تاریخی اجلاس ہے۔ اس کی مافوق العادۃ اہمیت کی پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ اُس شہر (یا قصبے یا گاؤں) میں ہو رہا ہے جو ہندوستان جنت نشان کی جان ہے۔ اس کے دلکش، نظر فریب منظر، اس کی جاں فزا روح پرور آب و ہوا کی تعریف نہ میں کر سکتا ہوں نہ آپ سن سکتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں آفتاب عالم تاب جسم خاکی کو حرارت پہنچاتا ہے، ماہتاب دل پرسوز کو برودت بخشتا ہے، آب ناب جگر کی پیاس بجھاتا ہے، ہوائے صافی پھیپھڑوں کو تازگی بخشتی ہے۔ مجھے یقین ہے اور آپ بھی یقین کیجئے کہ شاعر نے یہ شعر اسی کی شان میں کہا ہے ؎

اگر فردوس بر روئے زمیں است ؛ ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

جو ہے جنت زمیں پر تو یہی ہے ؛ یہی ہے بھائیو بہنو یہی ہے

اس مقام کی تاریخی عظمت کا حال مطبوعہ تواریخ میں موجود ہے، اور اگر اتفاق سے نہ ہو تو غیر مطبوعہ مسودوں میں ضرور ہوگا۔

اس مردم خیز خطے کے مشاہیر کے نام چاہے زمانے کے دل سے محو ہو گئے ہوں مگر سرکاری کاغذات میں اب تک محفوظ ہوں گے۔ اور زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں گے ؎

ثبت است بر جریدۂ دفتر دوام ما

دوسری وجہ اس اجلاس کی اہمیت کی یہ ہے کہ ایسے زمانے میں ہو رہا ہے جو ہندوستان کی تاریخ میں نازک ترین موقع ہے اس موقع کی نزاکت، اُف! اس موقع کی نزاکت میں کیا عرض کروں آپ خود ہی خوب سمجھتے ہیں ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز

ہمیں اس وقت نہایت حزم و احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ ہر قدم سوچ سمجھ کر، دیکھ بھال کر اٹھانا چاہیئے اور پھونک پھونک کر رکھنا چاہیئے، مگر انتہائی حزم و احتیاط کے ساتھ ہی ہمیں ہمت مردانہ، جرأت رندانہ، عزم بالجزم اور سعی بالمرۃ کی ضرورت ہے۔ آئے مادرِ وطن کے من چلے بیٹو اور بیٹیو، نپولین کی مثال کو سامنے رکھو جس کے یہ الفاظ اب تک فضائے عالم میں گونج رہے ہیں "ناممکن کا لفظ ڈکشنری سے خارج کردو!" اور اس بطل جلیل کا قول بھی نہ بھولو، جس کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں آتا کہ اگر فلاں پہاڑ ہماری راہ میں حائل ہے تو وہ پہاڑ نہیں رہے گا۔ اور دُور کیوں جاؤ خود ہمارے بزرگوں کے عدیم المثال کارنامے ہمارے دلوں کو گرمانے، روح کو تڑپانے اور خون کو کھولانے کے لئے کیا کم ہیں ؎

کس قوم سے ہمت میں یا حوصلے میں کم تھے ؛ جب جوشِ حمیت تھا دُنیا میں ہمیں ہم تھے

حاضرین و حاضرات، بھائیو اور بہنو، اس اجلاس میں آپ کے سامنے بڑے معرکتہ الآرا ریزولیوشن پیش ہونے والے ہیں جن پر ہماری موت و حیات کا انحصار ہے۔ یاد رکھیئے کہ سارا ہندوستان بلکہ کل رُبع مسکون آپ کے فیصلے کا منتظر ہے۔ دُنیا کی آنکھیں اور کان اسی طرف لگے ہوئے ہیں۔ اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں اس لئے کہ بیسویں صدی میں دُنیا کی آنکھیں اور کان اخبار ہیں اور انھوں نے اپنے نامہ نگار یہاں لگا رکھے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ ان اہم ترین ریزولیوشنوں کو جو اس تاریخی اجلاس میں آپ کے سامنے پیش ہوں گے نہایت غور اور توجہ سے سُنیں گے "ٹھنڈے دل سے" "سر جوڑ کر" ان کے معائب و محاسن پر غور کریں گے اور اس کے بعد آزادیٔ ضمیر اور حریت فکر کے ساتھ ان کی موافقت یا مخالفت کریں گے۔ نہ بھولئے کہ آپ کے یہ ریزولیوشن سالانہ رپورٹ میں چھپ کر اس وقت تک کُتب خانوں کی زینت بنے رہیں گے جب تک انحطاط کا تیزاب اوراق کاغذ کو نہ گلا دے۔ یا زمانے کا انقلاب نفیس عطار کی دکان پر نہ پہنچا دے۔ موافقت اور مخالفت دونوں کی ہمیں شدید ضرورت ہے اس لئے کہ جب تک موافقت نہ ہو گی ریزولیوشن کیونکر پاس ہوں گے، اور اگر ریزولیوشن نہ پاس ہوئے تو کانفرنس سے کیا فائدہ؟ اسی طرح جب تک مخالفت اور نوک جھونک نہ ہو محفل میں حدت اور تقریروں میں کسی طرح شدت پیدا ہو گی اور سُننے والوں کو لُطف کیا آئے گا؟ حریفوں کا مقابلہ دیکھنے کا شوق انسان کی فطرت میں ہے۔ اسی شوق کو پورا کرنے کے لئے بٹیروں اور مرغوں کی پالیاں، مینڈھوں اور ہاتھیوں کی لڑائیاں ہوتی، اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے دنگلوں میں پہلوان، مشاعروں میں شاعر لڑائے جاتے ہیں۔ کانفرنس میں بھی لوگ یہ کشمکش چاہتے ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کا اہتمام کریں۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے مقرروں کو اس معاملے میں زیادہ تاکید کی ضرورت نہیں۔ خدا کے فضل سے وہ خود ہی جنگ زرگری اور جنگ آہن گری کے لئے بے تاب نظر آ رہے ہیں۔ بلکہ ان کے خشمگیں تیور دیکھ کر میں ان سے درخواست کرتا ہوں

یہ بحث میں تہذیب اور اعتدال کو ہاتھ سے نہ دیں۔

ہم نے ان کانفرنسوں کا طریقہ اس پارلیمنٹ سے سیکھا ہے جو سب پارلیمنٹوں کی ماں ہے، مگر افسوس ہے کہ ہم نے اس سے وہ چیز نہیں سیکھی جو پارلیمنٹ کی زبان کہلاتی ہے۔ اس زبان کا اصل اصول یہ ہے کہ سخت سے سخت بات بھی نرم الفاظ اور گوارا لہجہ میں کہی جائے۔ تاکہ طرزِ ادا کی شیرینی سے مضمون کی تلخی کی تلافی ہو سکے۔ مثلاً اس بات کو کہ "تم جھوٹ بولتے ہو" ایک دلکش تبسم کے ساتھ یوں ادا کرتے ہیں "اور آپ کے الفاظ مرکزِ اصلیت سے منحرف ہیں"۔ ہمیں بھی حتی الامکان اس سُنت کی تقلید کرنی چاہیئے۔ مثلاً اس مکروہ جملے کی جگہ کہ "تم جھک مارتے ہو" ہمیں نہایت اخلاق اور خندہ پیشانی سے کہنا چاہیئے "آپ تو مچھلی کا شکار کر رہے ہیں"۔ اگر کسی سے یہ کہنا ہے کہ "تم ٹوڈی ہو" تو رشتِ خطی ہوکر سُریلی آواز میں کہیے "آپ بینڈک نوش فرماتے ہیں"۔ میں نے یہ جملے مثال کے طور پر عرض کر دئے۔ اسی طرح آپ ہر ثقیل اور جزیل مطلب کو لطیف اور رقیق الفاظ کے سانچے میں ڈھال سکتے ہیں۔

حاضرین وحاضرات بھائیو اور بہنو! اب میں اپنی لاطائل تقریر سے آپ کی زیادہ سمع خراشی نہیں کرونگا۔ اس لئے کہ ابھی بہت سے اور حضرات کو یہ خدمت انجام دینا ہے۔ میں نے آپکے سامنے کانفرنس کے مقاصد کو حاصل کرنے کی کوئی عملی صورت پیش نہیں کی اس لئے کہ عملی صورتوں کا قاعدہ ہے کہ ضرورت کے وقت خود ہی پیش آجاتی ہیں۔ عمل ایک ضمنی اور فرعی چیز ہے۔ اصل چیز ذوقِ عمل اور شوقِ عمل، ہوشِ عمل اور جوشِ عمل ہے، جسے آپکے دلوں میں ابھارنے کی ادنیٰ سی کوشش میں نے کی ہے اور وہ میرے بعد دوسرے مقرر کریں گے۔

خدا سے دُعا ہے کہ ہماری کوشش کامیاب ہو اور ان تقریروں کا ایک ایک لفظ بجلی بن کر آپکے رگ و پے میں دوڑ جائے، شعلہ بن کر آپکے دل و دماغ میں بھڑک اُٹھے، اور آپ میں سے ہر ایک کی زبان سے بے ساختہ نکل جائے ؎

بڑا فلک کو کسی دل جلے سے کام نہیں
جلا کے خاک نہ کردوں تو داغؔ نام نہیں

(ڈاکٹر) عابد حسین

نکات

(۱)
درد سے بیتاب ہو کر جیتا ہے جگر
پھر بھی ہے تاکید دل کو صبر کر شیون نہ کر
ہمت مردانہ ہی مشکل میں ہے یارو مشکل کشا
ورنہ دل ہو جائیگا آزردہ سے آزردہ تر

(۲)
نالۂ لب آشنا غوغائے بے تاثیر ہے
نالۂ زیرِ گلو تقدیر کی تعمیر ہے
آسماں سر پر اٹھا لینے سے کچھ بنتا نہیں
نالۂ زیرِ گلو شمشیرِ عالمگیر ہے

(۳)
جوہرِ دل کی جلا آئینہ گوں نالوں سے ہے
بوستانِ سینہ کی رونق انہیں لالوں سے ہے
خالقِ جذبات پاک ضبط و غیرت کی قسم
گنجِ خودداری ترا محفوظ انہیں تالوں سے ہے

(۴)
دشمنِ جانِ خودی ہے آہ ہو یا نالہ ہو
سازِ دل پر سوز آہوں سے نہ تبخالہ ہو
سوز ہی ہے سازِ دل ہیں ہم اہلِ دل
گلشنِ ہستی کے لالے ہیں یہاں
باغ میں ممکن نہیں بے داغ کوئی لالہ ہو

امین حزیں (سیالکوٹی)

جفاءِ دوست

چندر موہن اور شوشی کرن کالج میں پڑھتے تھے دونوں میں گہرے مراسم تھے۔ چندر موہن کا باپ ایک بنیکر تھا اور شوشی کرن ایک غریب لیکن شریف براہمن کا بیٹا تھا۔ چندر موہن چونکہ امیر تھا اس لئے امیرانہ ٹھاٹھ سے رہتا۔ لیکن شوشی کرن کی سادگی اور شرافت بھی قابلِ ستائش تھی۔ چندر موہن کو پڑھنے لکھنے سے کچھ زیادہ شغف نہ تھا۔ لیکن شوشی کرن تعلیم حاصل کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس کا نصب العین صرف یہ تھا کہ یونیورسٹی سے ڈگری لے کر کوئی اچھی ملازمت حاصل کرلے۔ ان خصوصیات کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے اچھے دوست تھے۔

"شوشی! تم تو کتاب کے کیڑے ہی ہو گئے"۔ ایک روز موہن نے اُس کے ہاتھ سے کتاب چھینتے ہوئے کہا۔

شوشی نے جواب دیا:-

"موہن! تم سچے ہو۔ تمہارے ہاں تو دولت کا ہُن برستا ہے اور مجھے فکر روزگار ہے"۔

"روزگار کی ایسی تیسی!" موہن بولا۔ "جس نے پیدا کیا ہے وہ کھانے کو بھی ویسے ہی دیدیگا۔ یہ چند روزہ زندگی اگر ہنسی مذاق میں گزر جائے تو میری دانست میں یہی زندگی کا حاصل ہے۔ اور جو کولھو کا بیل بنکر رہنا پڑے تو تُف ہے ایسی زندگی پر"۔

شوشی یہ سُنکر ہنس دیا۔

کالج کے قُرب و جوار میں سنسکرت کا ایک مشہور ودیارتھی رہتا تھا۔ بہت نیک سیرت اور پاک باطن آدمی تھا۔ شوشی کرن کو جب موقع ملتا گھڑی دو گھڑی ودیارتھی کے پاس جا بیٹھتا اور اُس سے سنسکرت پڑھتا۔ اس صحبت میں بوڑھے ودیارتھی کی بیٹی کملا بھی شامل ہوا کرتی۔ شوشی سے تو کملا کو کچھ اتنا حجاب نہ تھا لیکن جب کبھی چندر موہن بھی موجود ہوتا تو کملا جو ہندومت کی آغوش میں پل کر پروان چڑھی تھی کچھ اس طرح سُکڑی سی بیٹھی رہتی جیسے شاہین کے خوف سے کبک۔

کملا کا عنفوانِ شباب تھا حُسن کی رعنائیاں اور شباب کی مستیاں کچھ اس طرح پھوٹ رہی تھیں جیسے موسمِ بہار میں کسی شاخِ بریدہ میں سے نئی نئی کونپلیں۔ پھر اس پر اس کی سادگی اور حیا سونے پر سہاگہ کا کام دیتی تھی۔ لیکن شوشی کرن کی طبیعت میں بھی ایک حجاب تھا اور یہ حجاب دونوں میں کچھ اس طرح حائل تھا کہ نہ اُسے کملا سے کُھل کر بات کرنے کی جراٴت ہوتی نہ کملا ہی بلا ضرورت اس سے بات چیت کرتی۔ لیکن اس پر بھی دونوں کے اندازِ تکلم سے صاف ظاہر تھا کہ دل خود بخود ایک دوسرے کی طرف کھنچے جا رہے ہیں۔ لیکن ایک روز ایک معمولی سے واقعہ نے یہ پردہ بھی اُٹھا دیا جس سے دونوں کی زندگی میں ایک خوشگوار تغیر پیدا ہو گیا۔

ایک روز شوشی کرن بوڑھے ودیارتھی کے پاس بیٹھا سنسکرت کی کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ پاس ہی سوڈے کی ایک بوتل رکھی تھی۔ ودیارتھی نے کملا سے بوتل کھولنے کو کہا۔

لیکن شوشی بولا:-

"لایئے نا میں کھولدوں"۔

"بوتل کھولنے کی ڈبی تو ہے نہیں"۔ کملا نے کہا۔

"تو کیا مضائقہ ہے"۔ شوشی بولا۔ "ہاتھ سے کُھل جائیگی"۔

یہ کہتے ہوئے اُس نے ہاتھ کا ایک انگوٹھا بوتل کے مُنہ پر رکھ کر اوپر سے دوسرا ہاتھ زور سے مارا۔ جانے کیا بات ہوئی جو بوتل پھٹ

گئی اور شوشی کرن کا ہاتھ بُری طرح زخمی ہوگیا۔ اور خُون نکلنے لگا۔ کملا نے جلدی سے اپنی سپید ساری کا پلّو پھاڑکر زخم پر پٹی باندھ دی اور اُوپر سے پانی ٹپکانے لگی۔ لیکن خون پھر بھی بند نہ ہوا۔

ودیارتھی بولا :-

"میرے خیال میں تو ڈاکٹر کو ہاتھ دکھلانا چاہیئے۔ زخم گہرا معلوم ہوتا ہے۔"

"نہیں!" شوشی نے کہا "معمولی سا زخم ہے۔ کملا نے ساری ایسے ہی پھاڑ ڈالی۔"

کملا نے ذرا مُسکرا کر کہا :-

"آپ کا ہاتھ جو زخمی ہوگیا۔ دیکھئے ناخُون تو ابھی تک نکل رہا ہے۔"

"بند ہو ہی جائیگا۔" شوشی نے زخمی ہاتھ دوسرے ہاتھ سے دباتے ہوئے کہا۔

"درد تو زیادہ نہیں؟" ودیارتھی نے پوچھا۔

اور پاس سے کملا بولی :-

"ہاتھ تو نیلا ہو رہا ہے۔ درد بھی شدت کا ہوگا۔"

"آپ تو مفت میں پریشان ہو رہے ہیں۔" شوشی نے ذرا مُسکرا کر کہا "گھڑی دو گھڑی کی تکلیف ہے خود رفع ہو جائیگی۔"

کچھ دیر بعد شوشی اپنے گھر چلا آیا۔

شام کو جب چندر موہن اُس سے ملا تو ہاتھ پر پٹی بندھی دیکھکر پوچھا۔

"یہ پٹی کیوں باندھ رکھی ہے؟"

"ہاتھ کٹ گیا ہے۔"

"وہ کیسے؟" چندر موہن نے پوچھا۔

"سوڈے کی بوتل پھٹ گئی تھی۔"

"آج ودیارتھی جی کے ہاں تو نہیں گئے؟" موہن نے پوچھا۔

"گیا تو تھا۔"

"اور ہاتھ بھی وہیں کٹا؟" موہن نے پوچھا۔

"ہاں!"

"کملا بھی تھی؟" موہن نے پوچھا۔

"ہاں!" شوشی نے جواب دیا۔ "یہ پٹی اُس غریب نے اپنی ساری پھاڑ کر باندھی تھی۔"

"بڑے خوش قسمت ہو" چندر موہن نے ہنسکر کہا "آج سے میں بھی روز جایا کرونگا۔"

"کیا حرج ہے؟"

"حرج تو نہیں" چندر موہن نے کہا "لیکن تم جو کہیں ناراض ہوگئے تو؟"

"میں کیوں ناراض ہونے لگا؟" شوشی کرن نے پوچھا۔

"بھئی!" موہن نے ہنسکر کہا "تم ایسے بھگتوں سے ڈر ہی لگتا ہے۔"

"پاگل ہو تم!" شوشی نے مُسکرا کر کہا "میں تو صرف سنسکرت پڑھنے جاتا ہوں۔"

"بالکل ٹھیک!" موہن نے جواب دیا "سنسکرت پڑھنے اور عشق کا سبق پڑھانے۔"

دونوں ہنسنے لگے۔ اتنے میں ان کا ایک دوست بنسی دھر بھی وہاں آگیا۔ بنسی دھر بنیا اور لومڑ صفت آدمی تھا۔ لیکن بڑا چرب زبان۔ شہر میں دلالی کا کام کرتا تھا۔ میٹرک تک تینوں نے ساتھ تعلیم پائی تھی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد موہن اور شوشی تو کالج میں داخل ہوگئے اور بنسی دھر کام کاج کرنے لگا۔ بنسی دھر کے آنے سے گفتگو کا موضوع بدل گیا۔

رات شوشی کرن کو بخار ہوگیا۔ اور وہ اگلے روز کالج نہ جا سکا۔ آج چندر موہن کالج سے واپسی کے وقت ودیارتھی کے ہاں

چلا گیا۔ اتفاق سے اُس وقت دو یارتھی موجود نہ تھا کملا برآمدے میں میٹھی کروشیا سے بُن رہی تھی۔ چندرموہن بھی پاس ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"دویارتھی جی کہاں گئے؟" اُس نے اِدھر اُدھر دیکھکر پوچھا۔

"کہیں باہر گئے ہیں۔" کملا نے جواب دیا۔

"شاید!" چندرموہن نے کملا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "شوشی کرن کے ہاں گئے ہونگے۔"

"کیوں؟" کملا نے پوچھا۔

"کل اُس کا ہاتھ جو کٹ گیا تھا۔" چندرموہن نے جواب دیا۔ "لیکن وہ آپ کا بہت ممنون ہے۔"

"ہاں کیوں نہیں۔" کملا نے ذرا مسکرا کر کہا۔ "ہماری وجہ سے ہاتھ جو کٹا اُن کا۔"

"اور آپ نے اُس کی خاطر اپنی ساری پھاڑ ڈالی۔" چندرموہن بولا۔

"اوہو!" کملا نے کہا۔ "اُنھوں نے اتنی سی بات بھی آپ سے کہہ دی۔"

"جی ہاں!" موہن نے جواب دیا۔ "بسا اوقات ایک معمولی سا واقعہ بھی کسی بڑی چیز کی تمہید ہو جایا کرتا ہے۔"

لیکن کملا نے کچھ جواب نہ دیا۔ موہن پھر بولا:-

"کیا خیال ہے آپ کا؟"

کملا نے یونہی سر ہلا دیا۔

"آپ عیادت کو تو جائیں گی؟" موہن نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں!" کملا نے کروشیا سے بُنتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں آپ ہی!" موہن بولا۔ "شاید وہ آپ کا منتظر ہی ہو۔"

"منتظر؟" کملا نے پھر اُسی انداز سے پوچھا۔ "میرا؟"

"ہاں ہاں!" موہن بولا۔ "آپ کا۔"

لیکن کملا نے کچھ جواب نہ دیا۔ موہن پھر بولا:-

"جسکی خاطر آپنے ساڑی پھاڑ ڈالی، کیا اُسکی خبر کو نہ جاؤ گی؟"

کملا کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ موہن بولا:-

"اس میں ناراض ہونے کی تو کوئی بات نہیں۔ میں تو محض اسلئے حاضر ہوا ہوں کہ اصل حالات سے آپکو مطلع کر دوں۔ شوشی کرن کا باپ بہت غریب آدمی ہے۔"

"لیکن وہ آپکے دوست تو ہیں؟" کملا نے پوچھا۔

یہ سُنکر چندرموہن نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا:-

"دوست! ہاں اُس کا گھر راستہ میں پڑتا ہے۔ میں اپنی کار میں اُسے ساتھ بٹھا لاتا ہوں۔"

"تو دوست ہوئے نا۔" کملا بولی۔

"خیر!" چندرموہن نے مسکرا کر کہا۔ "جو کچھ بھی آپ سمجھیں۔"

"خوب!"

اتنا کہہ کر کملا چپ ہو گئی۔ موہن بولا:-

"خیر! اس ذکر کو چھوڑئیے۔ آج میں کچھ اور بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

"تو دویارتھی جی کو آلینے دیجئے۔" کملا نے کہا۔

"نہیں۔" چندرموہن نے کہا۔ "مجھے تو صرف آپسے ہی کچھ کہنا ہے۔"

"دویارتھی جی کے سامنے نہیں کہہ سکتے؟" کملا نے پوچھا۔

"نہیں۔" موہن نے جواب دیا۔ "بعض باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو بزرگوں کے سامنے نہیں کہی جا سکتیں۔"

کملا نے یونہی سر ہلا دیا۔ چندرموہن نے کرسی ذرا آگے سرکالی اور کہا۔

"کملا! حیران مت ہو۔ میں جو کچھ ہوں وہ تمہیں اور دویارتھی جی کو معلوم ہے...... میں ذات پات......"

"میں تو آپسے کہہ چکی۔" کملا بات کاٹ کر بولی۔ "آپ کو جو کچھ کہنا ہو وہ دویارتھی جی سے کہئیے۔"

"آپ نہ سُنیں گی؟" موہن نے پوچھا۔

"میں ایسی باتیں سُننے کی عادی نہیں!" یہ کہہ کر کملا اُٹھ کر اندر چلی گئی۔

***

دو یارتھی کے ہاں سے لوٹتے ہوئے چندر موہن بنسی دھر سے ملا۔ جب چندر موہن کملا سے اپنی ملاقات کا واقع بیان کر چکا تو بنسی دھر بولا۔

"لیکن یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ آیا کملا کو شوشی سے محبت ہے بھی یا نہیں؟"

"وہ کچھ کہتی سُنتی تو پتہ بھی چلتا!" موہن نے جواب دیا۔

"تو پھر میرے خیال میں تمہیں شوشی سے معلوم کرنا چاہیے!" بنسی بولا۔

"ہاں!" چندر موہن نے کہا۔ "یہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر شوشی کو کملا سے محبت ہوئی تو پھر؟"

"دیکھا جائے گا!" بنسی نے کہا۔ "پہلے معلوم تو ہو جائے!"

"تم بھی ساتھ چلو گے؟" موہن نے پوچھا۔

"نہیں!" بنسی نے کہا۔ "میرا جانا ٹھیک نہیں۔ مجھے بظاہر اس معاملہ میں الگ ہی رہنے دو۔ بلکہ مناسب تو یہ ہوگا کہ اگر یہ معاملہ طول کھینچے تو میں ظاہرداری کے طور پر شوشی کا ہم خیال بنا رہوں گا!"

"یہ باتیں تم میں نہ ہوں تو تمہیں مار آستین کون کہے!" چندر موہن نے ہنسکر کہا۔

"غریب کا کیا ہے!" بنسی بولا۔ "جو کسی کا جی چاہا کہہ لیا!"

کچھ دیر دونوں میں اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔

***

شوشی کرن دو چار روز نہ تو کالج ہی گیا نہ دو یارتھی کے یہاں جا سکا۔ ایک روز بیچ میں ڈال کر چندر موہن پھر اُس سے ملا۔ باتوں باتوں میں اُس نے کہا۔

"شوشی! سُنا ہے تم کملا سے شادی کرنے والے ہو!"

"تم سے کس نے کہا؟" شوشی کرن نے تعجب سے پوچھا۔

"سُن لیا کہیں سے!" چندر موہن ہنسکر بولا۔ "ٹھیک ہے نا!"

"محض غلط!" شوشی نے جواب دیا۔

"کملا ہے تو خوبصورت!" موہن نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں ہے تو سہی!"

"تم کہو تو میں پیغام دوں!" موہن نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ضرور!"

"ناراض تو نہ ہو جاؤ گے؟" موہن نے پھر اُسی انداز سے کہا۔

"میں کیوں ناراض ہونے لگا!" شوشی نے جواب دیا۔

"ایک بات پوچھوں!" موہن نے کہا۔

"ہاں! ہاں!"

"تم پیغام کیوں نہیں دیتے؟" موہن نے مسکرا کر پوچھا۔

"دل تو تمہارا آیا ہے!" شوشی نے ہنسکر کہا۔ "اور پیغام میں دوں!"

"لیکن تمہارا آنا جانا تو وہاں بہت زیادہ ہے!" موہن بولا۔

"ہے تو سہی!" شوشی نے جواب دیا۔

"تو پھر محبت بھی ہوگی!" موہن نے ہنسکر کہا۔ "اب مکرنا مت!"

"بہت دُور کی کوڑی لائے تم!" شوشی نے مسکرا کر کہا۔

"دعا کرو!" موہن نے ہنسکر کہا۔ "کملا مان جائے۔"

"آزما دیکھو!"

"تم کالج کب چلو گے؟" موہن نے پوچھا۔

"کل ارادہ تو ہے!"

"کملا کے ہاں بھی جاؤ گے؟" موہن نے پوچھا۔

"خیال تو ہے!"

"بنسی دھر تو نہیں آیا؟"

"اس روز کے بعد تو نہیں ملا۔"

"اچھا دوست ہے تمہارا۔" موہن نے ہنسکر کہا۔

"اور تمہارا بھی تو دشمن نہیں۔" شوشی نے جواب دیا۔

"میں ایسوں کو کب مُنہ لگاتا ہوں۔" موہن بولا "محض تمہاری
خاطر بات کرلیتا ہوں۔"

"میری خاطر؟" شوشی نے مسکراکر کہا "کب سے؟"

"بھئی!" موہن اُٹھتے ہوئے بولا "تمہیں تو ہر بات پر بحث
کرنے کی عادت پڑگئی ہے۔ لو میں تو چلتا ہوں اب۔"

اگلے روز کالج سے لوٹتے ہوئے شوشی کرن ودیارتھی کے
ہاں گیا۔ اتفاق سے ودیارتھی اُس وقت موجود نہیں تھا۔ لیکن کملا
بڑے تپاک سے ملی۔ خوشی اور مسرت سے اُس کا چہرہ اس طرح
چمک رہا تھا جیسے ستارہ سحر۔ وہ ذرا جھجک کر بولی۔

"آپ کو ملال تو ہوگا کہ ہم آپکی خبر کو نہیں آئے۔"

"ہرگز نہیں۔" شوشی نے کہا "زخم تو معمولی تھا۔ جانے بخار
کیوں ہوگیا۔"

"اب تو آرام ہے۔" کملا نے پوچھا۔

"آرام ہی ہے تو حاضر ہوگیا ہوں۔" شوشی کرن نے جواب
دیا۔

"آپ غالباً کالج بھی تو نہ جاتے ہونگے۔" کملا نے پوچھا۔

"کالج جاتا" شوشی بولا "تو کیا ودیارتھی جی کے درشنوں
کو نہ آتا۔"

"آپ غالباً موٹر میں آئے ہونگے۔" کملا نے پوچھا۔

"موٹر؟" شوشی نے ہنسکر کہا "میرے پاس موٹر کہاں؟"

"لیکن کالج تو آپ اکثر موٹر ہی میں جایا کرتے ہیں۔" کملا بولی۔
"موہن بابو سے آپ کے گہرے مراسم معلوم ہوتے ہیں۔"

"وہ غریب جان کرکر یا کرتے ہیں۔" شوشی نے جواب دیا۔

"غریب جان کر؟" کملا نے ہنسکر کہا۔

"تو اور کیا؟" شوشی ہنسکر بولا "غریب جو ہوا۔"

"کیا خیال ہے آپ کا اُن کے متعلق؟" کملا نے پوچھا۔

"بہت شریف آدمی ہے۔" شوشی نے کہا "بہت اچھا دوست ہے۔"

"یہ سُنکر کملا مسکرانے لگی۔

شفق کی سُرخی سے مشرقی آسمان گلنار ہو رہا تھا۔ آفتاب
بلند مکانات کے عقب میں چھپ چکا تھا۔ ہوا ذرا تیز ہو چلی
تھی۔ کملا کی مُرغی پانچ سات چوزے ساتھ لئے کُٹ کُٹ کرتی
اِدھر اُدھر پھر رہی تھی۔ اور ایک چیل جو غالباً ایک آدھ کی تاک
میں تھی سر پر منڈلا رہی تھی۔ کملا تھوڑا سا دانہ لے آئی اور کھابچے
کے پاس دانہ ڈال کر مُرغی پکڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن مُرغی
ہاتھ نہ آئی اور کُٹ کُٹ کرتی اِدھر اُدھر پر پھیلا پھیلا کر بھاگی
پھرتی۔ ایک بار جو شوشی کرن کے پاس سے گذری تو اُس نے لپک کے
پکڑ لی۔ کملا نے مُرغی کھابچے میں بند کردی۔ پھر دونوں مل کر چوزے
پکڑنے لگے۔

شوشی کرن نے جو ایک کو پکڑ کر ذرا پیار سے دبایا تو وہ زور
زور سے چُوں چُوں کرنے لگا۔

"یہ تو روئی کا گالا ہے۔ اسے سخت ہاتھ نہ لگایئے۔"

"یہ لیجئے!" شوشی کرن ہاتھ بڑھا کر بولا۔ "سنبھالئے اسے۔"

کملا نے شوشی کے ہاتھ سے چوزہ لے کر اپنے گال سے
لگا لیا اور تبسم آمیز نگاہوں سے شوشی کی طرف دیکھکر بولی:۔

"ہے نا روئی کے گالے کی طرح نرم!"

"نہیں!" شوشی نے مسکراکر کہا "ایک دوشیزہ کے دل کی طرح
نازک اور نرم ہے۔"

کملا نے مسکراکر پوچھا۔

"آپ نے کیسے جانا کہ ایک دو فقیرہ کا دل نرم ہوتا ہے"

"آنکھیں سب کچھ کہہ دیتی ہیں" شوشی نے مسکرا کر جواب دیا۔

"کس کی آنکھیں؟" کملا نے پوچھا۔ "دیکھنے والے کی"

"نہیں!" شوشی بولا۔ "آپ کی"

کملا ہنسنے لگی۔

آج کی ملاقات کے بعد جب شوشی کرن گھر کو لوٹا تو اُسے یہ خدشہ ہونے لگا کہ چندر موہن کہیں سچ مچ ہی شادی کا پیغام نہ دیدے۔

دو روز بعد کا واقعہ ہے کہ بوڑھا دویارتھی عینک لگائے بیٹھا تھا۔ سامنے سنسکرت کا کوئی قلمی نسخہ رکھا تھا۔ پاس ہی چندر موہن ایک کرسی پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ دویارتھی کہہ رہا تھا "موہن بابو! آپ نے کملا سے جو کہا وہ بھی مجھے معلوم ہے۔ اور اس وقت جو کچھ آپ نے کہا وہ بھی میں نے غور سے سنا ہے۔ بیشک ماں باپ کی یہ قدرتی خواہش ہوتی ہے کہ لڑکی کسی امیر گھرانے میں بیاہی جائے۔ لیکن غریب کی لڑکی امیر گھر جاکر خوش نہیں رہ سکتی۔ کملا کی شادی میں اپنے جوڑ کے کسی خاندان میں کروں گا۔ سنا نہیں کہ اُتم سے اُتم ملے۔ نیچ سے نیچ۔ پانی سے پانی ملے۔ کیچ سے کیچ۔

موہن بابو! شادی عمر کا پھندا ہے۔ جوانی کے جذبات انسان کو اکثر غلط راہ پر ڈال دیتے ہیں اور کچھ وقت گذرنے کے بعد غلطی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اُس وقت پریشانی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ کملا کے متعلق جو کچھ میں کہہ چکا ہوں اُسے میرا قطعی فیصلہ سمجھو۔"

"آپ میری عرض پر ایک بار پھر غور کریں۔" موہن نے لجاجت سے کہا۔

"موہن بابو!" دویارتھی بولا۔ "جو لوگ زیادہ سوچ بچار کرنے کے عادی ہوتے ہیں وہ پریشان بھی زیادہ رہتے ہیں۔ تم جوان ہو دولت مند ہو۔ بہتر سے بہتر رشتہ تمہیں مل سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر بوڑھا دویارتھی مطالعہ میں مشغول ہو گیا۔

بنسی دھر موٹر میں بیٹھا چندر موہن کا انتظار کر رہا تھا۔ موہن کا اُترا ہوا چہرہ دیکھکر بولا۔

"انکار؟"

"قطعی!"

"مجھے پہلے ہی خیال تھا۔" بنسی دھر نے کہا۔ "کہ بوڑھا نہ مانے گا۔"

"لیکن کسی نہ کسی طرح منوانا تو ضرور چاہیئے!" موہن نے کہا۔

"مان تو جاتا۔" بنسی بولا۔ "لیکن تم نے جلدی کی۔"

"کیسے؟"

"پہلے کملا سے میل ملاپ بڑھانا چاہیئے تھا۔ سونے کی جھلک بُری چیز ہوتی ہے۔" بنسی نے جواب دیا۔

"تو کیا اب سونے کی جھلک نہیں دکھائی جا سکتی۔" موہن نے پوچھا۔

"میرے خیال میں تو شوشی نے محض تمہیں اُلو بنایا ہے۔" بنسی دھر نے کہا۔

"تم میری بات کا جواب دو۔" موہن نے کہا۔ "شوشی سے پیچھے سمجھ لیں گے۔"

"کملا لالچ میں آنے والی لڑکی نہیں۔" بنسی دھر نے کہا۔

"تو کچھ تدبیر ہی تو بتلاؤ۔" موہن نے کہا۔ "کیا کروں؟"

"انتظار!"

"اور جو شوشی کی بات ٹھیر گئی تو؟" موہن نے پوچھا۔

"تو پھر شوشی سے سمجھ لیں گے۔" بنسی نے جواب دیا۔

"جرم؟" چندر موہن نے بنسی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں!" بنسی بولا "تدبیر!"

اس واقعہ کے بعد چندر موہن نے کملا سے تعلقات بڑھانے کی کوشش کی لیکن اس میں بھی اُسے کامیابی نہ ہوئی اور ایک روز تو دو یا رکملا نے اُسے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ ان باتوں سے باز آجائے۔ ساتھ ہی چندر موہن کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کملا اور شوشی میں محبت کی پینگیں بڑھ رہی ہیں۔ پھر جب دونوں گھرانوں میں ان کی شادی بیاہ کا ذکر اذکار ہونے لگا تو اپنی ندامت اور نامرادی کے خیال سے چندر موہن کے سینے پر سانپ لوٹنے لگا۔ ساتھ ہی دسہرے کے ایام میں شوشی کرن کا کملا سے بیاہ ہو گیا۔ بظاہر تو موہن دوست کی شادی ہو جانے پر بہت خوش تھا لیکن دل میں اس نے شوشی سے ایک خوفناک انتقام لینے کا عہد کر لیا۔

جاڑا پڑتے ہی شہر میں طاعون نمودار ہوا۔ چندر موہن کا باپ پہلے ہفتے میں فسکا رہوا۔ اور پندرہ بیس روز بعد شوشی کرن کے والدین بھی چل دیئے۔ چندر موہن کو باپ کی جگہ کام کرنا پڑا۔ اور شوشی کرن کو معاش کی خاطر کالج چھوڑنا پڑا۔ کچھ عرصے کے بعد شوشی کو ایک فرم میں ملازمت مل گئی۔ اب موہن اور شوشی کو بہت کم ملنے کا موقع ملتا۔ لیکن کبھی ملاقات ہوتی بھی تو موہن بابو سرد مہری سے پیش آتا۔

بنسی دھر کاروبار کے سلسلے میں شہر سے کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ اور چندر موہن کو اُس کا بہت انتظار تھا۔ کچھ روز بعد جب وہ واپس آیا تو آتے ہی چندر موہن سے ملا۔ دونوں بہت دیر تک صلاح مشورہ کرتے رہے۔ لیکن کوئی صورت بنتی نظر نہ آئی۔ بنسی دھر بولا:

"ترکیب وہ کرنی چاہیئے کہ سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے۔"

"تم ہمیشہ یہی کہا کرتے ہو،" چندر موہن نے جھنجھلا کر کہا۔ "لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے۔"

"تو گویا تم کملا کو زبردستی حاصل کرنا چاہتے ہو!" بنسی دھر نے پوچھا۔

"کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔" موہن بولا۔

"ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے۔" بنسی دھر نے کہا۔

"کیا؟" موہن نے پوچھا۔

"ہم شوشی کرن کو ملازمت سے علیحدہ کروا سکتے ہیں۔" بنسی نے جواب دیا۔

"اس سے کیا ہو گا؟" موہن نے پھر پوچھا۔

"تمہیں اُس سے انتقام لینے کا موقع مل جائے گا۔" بنسی نے جواب دیا۔

"وہ کیسے؟"

"تم اُسے اپنے یہاں ملازم رکھ لینا۔" بنسی بولا۔

"پھر؟"

"پھر؟" بنسی ہنس کر بولا "تباہی! بربادی اور رسوائی۔ یہی چاہتے ہونا؟"

"وہ کیسے؟"

"موقع آنے دو۔" بنسی دھر نے کہا "پھر بتلاؤں گا۔"

اس گفتگو کے کوئی سات ایک روز بعد بنسی اور موہن کی سازش سے فرم والوں نے شوشی کرن کو ایک مہینے کی تنخواہ پیشگی دے کر ملازمت سے برطرف کر دیا۔ ظاہر یہ کیا گیا کہ اس کی جگہ تخفیف میں لائی گئی ہے۔ شوشی کرن کچھ پریشان سی صورت بنائے جب گھر واپس آیا تو کملا نے پوچھا "خیر تو ہے؟"

شوشی کرن نے جیب سے تنخواہ کے روپے نکال کر کملا کے آگے رکھ دیئے۔

"یہ روپے کیسے ہیں؟" کملا نے پوچھا۔

"فرم والوں نے مجھے آج جواب دیدیا ہے۔" شوشی بولا۔ "یہ ایک مہینے کی پیشگی تنخواہ ہے۔"

"موقوف کردیا؟" کملا تعجب سے بولی۔ "کس جرم پر؟ کوئی نوٹس تو دیا ہوتا۔"

"میری جگہ تخفیف میں لائی گئی ہے۔" شوشی نے جواب دیا۔

کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ کملا بولی:۔

"ایک بات کہوں؟"

"کہو۔"

"آپ موہن بابو سے کہیں۔" کملا نے کہا۔ "شاید وہ اپنے دفتر میں آپ کو جگہ دیدیں۔"

"وہ تو سیدھے منہ بات تک نہیں کرتا۔" شوشی نے تسخر کی سے جواب دیا۔

"اس کا باعث تو میں ہوں۔" کملا بولی۔

"کملا!" شوشی نے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ پچھلی باتوں کا کبھی ذکر مت کیا کرو۔"

کملا چپ ہوگئی۔ شوشی کہنے لگا:۔

"بنسی دھر کا کام بھی خوب چلتا ہے۔ وہ ملے تو اُس سے مشورہ کروں۔"

"آپ بھی دلالی کا کام کریں گے؟" کملا نے پوچھا۔

"کیا حرج ہے۔" شوشی بولا۔ "بنسی دھر کو دیکھو کیا مزے سے بسر ہورہی ہے۔"

"جیسے آپ کی مرضی!" کملا یہ کہہ کر کام کاج میں لگ گئی۔

شوشی کرن کو بیکار بیٹھے کئی روز ہوچکے تھے۔ ایک دو جگہ اُس نے کچھ کوشش بھی کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ بنسی دھر جو پہلے بہت کم ملا کرتا تھا اب تقریباً ہر روز ملنے لگا۔ ایک روز باتوں باتوں میں اُس نے کہا:۔

"تم چندر موہن سے کیوں نہیں کہتے۔"

"کیا کہوں؟" شوشی نے پوچھا۔

"یہی ملازمت کیلئے!" بنسی دھر نے جواب دیا۔ "آخر تمہارا دوست تو ہے۔"

"امیر کی غریب سے کیسی دوستی؟" شوشی نے کہا۔

"محض خیال ہے تمہارا۔" بنسی بولا۔ "موہن بابو بہت اچھا آدمی ہے اُس نے دو ایک بار مجھ سے تمہارا ذکر بھی کیا تھا۔"

"کیا؟" شوشی نے پوچھا۔

"یہی کام کے متعلق۔" بنسی نے کہا۔

"کیا وہ مجھے اپنے دفتر میں جگہ دے سکے گا؟" شوشی نے پوچھا۔

"خیال تو ہے۔" بنسی نے کہا۔ "مل کر پوچھ لو۔"

"ملنے کو تو دل نہیں چاہتا۔"

"وجہ؟"

"وہ اب ذرا تمکنت سے ملتا ہے۔" شوشی نے کہا۔

"اور تم بھی اُس سے کھنچے کھنچے سے رہتے ہو۔" بنسی نے جواب دیا۔ "تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔"

شوشی کرن نے کچھ جواب نہ دیا۔ بنسی کہنے لگا:۔

"خیر! میں آج موہن سے بات کروں گا۔ کیا اچھا ہو جو تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

"ہاں!" شوشی بولا۔ "چلا چلوں گا۔"

شوشی کرن سے مل کر بنسی دھر سیدھا چندر موہن کے یہاں گیا۔ اُس نے پوچھا:۔

"کہو! کیا خبر لائے۔"

"خبر کیسی!" بنسی بولا۔ "آج شام کو میں اُسے ساتھ لاؤں گا۔"

"کچھ شکوہ شکایت تو کرتا ہوگا۔" موہن نے مسکرا کر پوچھا۔

"صرف تمہاری سرد مہری کا شکوہ کرنا تھا۔" بنسی نے جواب دیا۔

"پھر اب کیا صلاح ہے؟" موہن نے پوچھا۔

"تم اسے اپنے دفتر میں ملازم رکھ لو۔" بنسی بولا۔

"پھر؟" موہن نے پوچھا۔

"پہلے ایک بات تو ہو جائے۔" بنسی نے کہا۔ "پھر دیکھا جائیگا۔"

اُسی شام جب شوشی کرن چندر موہن سے ملا تو وہ شکایت کے طور پر بولا:۔

"افسوس ہے! تم نے مجھ سے تو ذکر تک نہ کیا یہ تو بنسی نے مجھ سے کہا کہ تمہیں فرم والوں نے علیحدہ کر دیا ہے۔"

"خیر!" شوشی بولا "تم نے سُن تو لیا۔"

"لیکن تم نے خود ذکر کیوں نہ کیا" موہن نے پوچھا۔

"موہن بابو!" شوشی نے مسکرا کر کہا۔ "تم بڑے آدمی ہو۔"

"لیکن تمہارا دوست تو ہوں۔" موہن نے پوچھا "کیا اس سے بھی انکار ہے تمہیں۔"

کچھ دیر اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر موہن بولا:۔

"میرے پاس ایک چالیس روپے کی جگہ خالی ہے۔ فی الحال یہ قبول کرو۔"

شوشی نے اس کا شکریہ ادا کیا اور دوسرے روز موہن کے دفتر میں کام کرنے لگا۔ اُس کے ذمہ اس روپے کا حساب کتاب تھا جو باہر سے آتا تھا۔ شوشی کرن کو دفتر میں کام کرتے دو مہینے ہو چکے تھے۔ ایک روز کوئی بارہ بجے کے قریب بنسی دھر اُسکے پاس آیا اور کہنے لگا:۔

"شوشی کرن! آج تمہیں ایک تکلیف دینے آیا ہوں۔"

"کیا؟"

"تم پہلے وعدہ کرو" بنسی بولا۔ "پھر کہوں گا۔"

"تم کہو تو سہی!" شوشی نے کہا۔

"شوشی!" بنسی دھر بولا۔ "اس وقت میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

"تم تو اشاروں میں بات کرتے ہو۔" شوشی بولا۔

"مجھے دو گھنٹے کے لئے پندرہ سو روپے کی ضرورت ہے۔" بنسی بولا۔

"کاش میرے پاس روپے ہوتے۔" شوشی نے مسکرا کر کہا۔ "تو میں کبھی انکار نہ کرتا۔"

"شوشی!" بنسی نے کہا۔ "ابھی بارہ بجے ہیں۔ تین بجے تک واپس کر دوں گا۔"

شوشی مسکرانے لگا۔

"تم مذاق سمجھتے ہو۔" بنسی نے کہا۔ "رام جانے! تین بجے تک واپس کر دوں گا۔"

"لاؤں کہاں سے؟" شوشی بولا۔

"یہ دفتر کا روپیہ جو تمہارے پاس ہے۔" بنسی نے کہا۔

"نہیں!" شوشی بولا۔ "اس میں سے تو میں ایک پیسہ بھی نہیں دے سکتا۔"

"شوشی!" بنسی بولا۔ "دنیا میں دھرم اور بھرم ہی دو ایسی چیزیں ہیں جنکی خاطر انسان جان تک قربان کر دیتا ہے۔ اسوقت میری عزت کا سوال ہے۔ اگر تم صرف دو تین گھنٹے کے لئے میرا اعتبار کرو تو عمر بھر احسان مند رہونگا۔"

"تم چندر موہن سے کیوں نہیں کہتے؟" شوشی نے پوچھا۔

"اُس سے کہنا ہوتا تو تمہارے پاس کیوں آتا؟" بنسی نے کہا۔ "رام کے لئے کہیں اُس سے ذکر مت کر دیجیو۔"

بنسی دھر بڑا چرب زبان تھا۔ آخر شوشی کرن اس کے بھرّے میں آ ہی گیا اور بنک کے روپے میں سے پندرہ سو روپیہ اُسے دیدیا۔ بنسی کے جانیکے کوئی گھنٹہ بھر بعد دفتر کا اکونٹنٹ شوشی کے پاس

آبیٹھا اور آمدنی کا رجسٹر اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ جب رجسٹر دیکھ چکا تو روپیہ گنا گیا۔ اس میں وہی پندرہ سو کی رقم جو شوشی نے منشی کو دی تھی کم تھی۔ اکونٹنٹ نے روپیہ اور رجسٹر صندوق میں بند کرکے قفل اور مُہر لگادی اور اُسی وقت فون پر پولیس کو غبن کی اطلاع دیدی۔ پولیس نے آتے ہی شوشی کرن کو حراست میں لے لیا۔ اب تین بجنے کو تھے کہ اتنے میں منشی دھر کا آدمی پندرہ سو روپیہ واپس لے آیا۔ لیکن پولیس نے اس روپے پر بھی قبضہ کرلیا۔ شوشی نے چندر موہن سے ملنا چاہا۔ لیکن معلوم ہوا کہ وہ نو بارہ بجے کی گاڑی میں کسی جگہ چلا گیا ہے۔ روپیہ چونکہ موجود تھا اس لئے شوشی کی ضمانت ہوگئی۔

چندر موہن حقیقت میں شہر میں ہی تھا۔ یہ سب کارروائی موہن اور منشی کے صلاح مشورہ سے ہوئی تھی۔ منشی کا خیال تھا کہ شوشی جب جیل میں جائے گا تو کملا کو شیشے میں اُتار لینا آسان ہوگا۔ لیکن دونوں کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ اکونٹنٹ نے چندر موہن کے اشارے سے جو بیان پولیس میں دیا اُس سے شوشی پر پولیس کی اور بھی سخت گرفت ہوگئی۔ شوشی کرن نے کئی بار چندر موہن سے ملنے کی کوشش کی۔ لیکن اُسنے کبھی موقع نہ دیا۔ آخر غبن کے جرم میں شوشی کا عدالت میں چالان ہوگیا۔ اس کے خلاف شہادت دینے والوں میں چندر موہن بھی تھا اور منشی دھر بھی۔

پہلی پیشی ختم ہونیکے بعد شوشی جب گھر آیا تو عزت اور لاج کی خاطر زہر کھا کر خودکشی کرلی۔ اور کملا نے پتی کے مرتے ہی کپڑوں میں آگ لگا کر جان دیدی۔ اور پتی کی ارتھی اُٹھنے سے پیشتر ہی اُس سے جاملی۔

ایم۔ اسلم

حضرت ایم۔ اسلم کی دو کتابیں

نرگس

وہ ہستی جسے دُنیا طوائف، بیسوا، رنڈی اور بازاری عورت کے نام سے پکارتی ہے۔ جس کی زندگی گندے زخم کی طرح گھناؤنی سمجھی جاتی ہے۔ جو اپنے حُسن کی دوکان سجاتی ہے تاکہ اُس کی عصمت کے خریدار زیادہ سے زیادہ پیدا ہوں۔ کیا آپکو معلوم ہے کہ یہ بازاری جنس ایک عورت بھی ہے اور اپنے پہلو میں ایک دھڑکتا ہوا دل رکھتی ہے۔ اور اس دل کے ایک گوشے میں سچی محبت کی وہ جلن رکھتی ہے جو بالآخر اُس کی ہستی کو پھونک ڈالتی ہے؟ نرگس کی داستان عشق دیکھئے جو ایک ایسی ہی بنت معصیت کی دردناک رُوداد ہے۔ قیمت دو ۲ روپے۔

گناہ کی راتیں

اس پاپ کی دُنیا میں گناہ کا اندھیرا پھیلا ہوا ہے۔ لیکن نیکی و معصومیت کی چمک اس میں اس طرح نظر آجاتی ہے جس طرح تاریک بادلوں میں بجلی۔ اور یہ بجلی چمک کے پھر سیاہ بادلوں میں روپوش ہوجاتی ہے۔ "گناہ کی راتیں" ایسے ہی سات سمے دکھائینگی۔ ماحول کا اثر واقعات کا اتفاق اور زندگی کی مجبوری کس طرح جسم کی بھوک کو غیر محسوس طور پر بڑھا دیتی ہے، آنکھوں پر لذت کا وہ دبیز پردہ ڈالدیتی ہے جو نیکی و بدی کے امتیاز کو مٹا دیتا ہے اور عورت بدترین گناہ کی اُس گندی کیچڑ میں گر جاتی ہے جو اُسکے دامن عصمت سے پھر کبھی نہیں چھوٹتی۔ قیمت ایک روپیہ۔

ملنے کا پتہ:۔

ساقی بک ڈپو۔ دہلی

ہماری گلی

میرا مکان چیلوں کے کوچہ میں تھا۔ میرے کمرے کے دروازے میں دو پٹ تھے۔ نیچے کا حصہ بند کر دینے سے صرف اوپر کا حصہ ایک کھڑکی کی طرح کھلا رہ جاتا تھا۔ یہ کھڑکی تیلی سڑک پر کھلتی تھی۔ سامنے مرزا دودھ والے کی دوکان تھی اور میرے مکان کے دروازہ کے برابر صدیق بنئے کی اور اس کے برابر عزیز خیراتی کی۔ اور آس پاس کہاروں کی دوکانیں، عطار کی دوکان، پان والے کی اور دو چار اور دوکانیں تھیں، مثلاً قصائی کی، بساتی کی، حلوائی کی دوکان۔

ہمارے محلہ میں سے ہو کر لوگ دوسرے محلوں کو جا سکتے تھے۔ اس لئے سڑک برابر چلا کرتی تھی، اور طرح طرح کے لوگ راستہ بچانے کے لئے میری کھڑکی کے سامنے سے گذرتے۔ کبھی کوئی سفید پوش گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں چھتری لگاتے ہوئے چلا جاتا۔ کبھی شام کو کوئی ولایتی مُنڈا پہنے، انگریزی ٹوپی لگائے۔ چھڑکاؤ کے پانی سے بچتا ہوا اپنے کپڑوں کو چھینٹوں سے بچاتا، بچوں اور لڑکوں سے کتراتا ہوا یا اُن کے گھورنے پر غراتا اور آنکھیں نکالتا ہوا گذر جاتا۔ کبھی کبھی راہ گیر عاجز آکر لڑکوں کو مارنے کے لئے لکڑی یا چھتری اُٹھاتا۔ دُور بھاگ کر لڑکے چلاتے "لُولُو ہے ہے، لُولُو ہے"۔ پھر مرزا دودھ والے کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دیتی۔

"ابے لمڈو، کیا کرتے ہو! تم کو گھروں میں کچھ کام نہیں؟"

اور اگر کوئی پاس بیٹھا ہوتا تو مرزا اُس سے کہنے لگتا۔

"ان کی ماؤں کو تو دیکھو، لونڈوں کو چھوڑ رکھا ہے کہ سانڈ بیلوں کی طرح گلیوں میں رولا مچایا کریں۔ حرامزادوں کو گالی گلوچ اور دھینگا مشتی کے علاوہ اور کچھ کام ہی نہیں۔"

اور مرزا کی چھوٹی چھوٹی سُرخ آنکھیں جھپکنے لگتیں اور وہ اپنی سفید تکونی ڈاڑھی پر ایک ہاتھ پھیرتا، اور کسی خریدار کی طرف مخاطب ہو جاتا، اور کونڈے میں سے دہی یا کڑھاؤ میں سے دودھ نکال کر ملائی کا ٹکڑا ڈالتا اور خریدار کی طرف بڑھا دیتا۔

لوگ کہتے تھے کہ مرزا کی رگوں میں شریف خون دورہ کرتا ہے۔ لڑکپن میں سبق یاد نہ کرنے پر اُس کے باپ نے اُسکو گھر سے نکال دیا اور کچھ روز مارے مارے پھرنے کے بعد اُس نے دوکان کر لی۔ اس کے بعد اکثر اُس کے باپ نے اُس سے معافی بھی مانگی اور خوشامد بھی کی لیکن مرزا نے گھر واپس جانے سے انکار کر دیا۔ پھر مرزا نے شادی کر لی اور اس کا کام چل نکلا۔ اس کی دوکان کے چھوٹے چھوٹے ملائی کے پیڑے شہر بھر میں مشہور تھے۔ اور اُس کا دودھ بہت لذیذ ہوتا تھا۔ رات کو جب کوئی دودھ لینے آتا تو وہ اُسکو آبخورے اور لُٹیا میں خوب اُچھالتا یہاں تک کہ اُس میں سے جھاگ نکلنے لگتے۔ پھر کھپچے سے ملائی کا ٹکڑا اس صفائی سے توڑتا کہ دودھ ہلنے تک نہ پاتا تھا۔

اکثر اُس کی بیوی دوکان پر بیٹھتی تھی۔ وہ بوڑھی ہو گئی تھی، اُسکے چہرے پر جھُرّیاں پڑی ہوئی تھیں، اُس کی کمر جھک گئی تھی اور مُنہ میں ایک دانت باقی نہ تھا۔ اُس کی اونچی پیشانی اور اُس کے گورے رنگ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی اچھے گھرانے کی عورت ہے۔

لیکن اب انکا کاروبار کم ہو گیا تھا کیونکہ ضعیفی کی وجہ سے وہ زیادہ محنت نہ کر سکتے تھے۔ اُنکا اکلوتا بیٹا مر چکا تھا، اور اب ان کا ہاتھ بٹانے والا کوئی نہ تھا۔ ترکِ موالات کے زمانہ میں جب آزادی کا خیال مُلک میں اِدھر سے اُدھر تک ہل چل مچائے تھا، مرزا کا لڑکا اپنے دوستوں کے ساتھ جلوس میں شریک ہوا۔ گاندھی جی کی جے اور بندے ماترم کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔ گھنٹا گھر پر گوروں کی فوجیں مسلح کھڑی تھیں۔ کپتان پولیس، ڈپٹی کمشنر اور چند اور انگریز کھڑے لوگوں کے ہجوم اور قومی غصہ کو پریشانی

سے دیکھ رہے تھے۔ لوگ آگے جانا چاہتے تھے، لیکن فوجیں اُنکو گذرنے سے روک رہی تھیں۔ لوگوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی اور ڈپٹی کمشنر نے گولی چلانے کا حکم دیدیا۔ گولیوں کی بوچھاڑیں بہت لوگ کام آئے، اور مرزا کا بیٹا بھی مرنے والوں میں تھا۔ بڑی دیر کے بعد جب لاش لیجانیکی اجازت ملی تو لوگ مرزا کے لڑکے کی لاش کو اُس کے گھر لائے۔

ساری دوکانیں بند تھیں اور محلہ میں سناٹا چھایا ہوا تھا، جاڑوں کی دھوپ مردہ اور سرد معلوم ہوتی تھی۔ نالیوں میں صفائی نہ ہوئی تھی اور اُن میں سڑاند پھوٹ رہی تھی۔ جب لاش گھر میں آئی تو مرزا اور اُس کی بیوی سکتے کے عالم میں رہ گئے۔ انکو کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ اُن کا بیٹا جو ابھی ابھی زندہ تھا، ہنس بول رہا تھا جس نے صبح ہی کو بیٹرے تیار کئے تھے، گڑھا او مانجھا تھا، جو کپڑے بدل کر اپنے کسی دوست سے ملنے گیا تھا، اب زندہ نہیں ہے بلکہ مرچکا ہے۔ وہ بار بار خون میں لتھڑی ہوئی لاش کو دیکھتے تھے اور مرزا کی بیوی لاش سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ لوگوں نے اُس کو الگ کرنیکی کوشش کی، لیکن وہ ایک منٹ کے لئے لاش سے علیٰحدہ نہ ہوتی تھی۔ وہ "ہائے ہائے میرا لال" کہہ کہہ کر روتی تھی، اور کبھی کبھی اُس کے مُنہ سے چیخ نکلتی، اور وہ چلاّتی۔

"ان فرنگیوں کو خدا غارت کرے، میرے لال کو مجھ سے چھین لیا۔ خدا کرے کہ یہ غارت ہوں۔!"

مرزا پاگلوں کی طرح کبھی گھر کے اندر کبھی باہر بولایا ہوا پھرتا تھا۔ صدیق بنیئے نے اپنی دوکان کھول لی تھی اور مرزا جو بال بکھیرے ہوئے ادھر سے گذرا تو صدیق نے آواز دی اور پوچھا:۔

"بھائی بڑا افسوس ہوا۔ حادثہ کیا پیش آیا؟"

مرزا کی آنکھوں میں ایک آنسو باقی نہ تھا، لیکن اُس کے سالے چہرے پر کرب کی حالت تھی۔

"تقدیر پھوٹ گئی، میرا پلا پلایا لڑکا جاتا رہا" یہ کہہ کر مرزا پھر گھر کی طرف چلا گیا۔

گاہک جو کھڑے ہوئے تھے پوچھنے لگے کیا ہوا۔ صدیق نے جُھک کر دیکھا۔ اُسی وقت ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور سڑک پر گرد اور غبار اُڑنے لگا۔ ایک کاغذ کا ٹکڑا ہوا میں اُٹھا اور کچھ دور اوپر جاکے اُلٹتا پلٹتا نیچے کی طرف گرنے لگا۔ مرزا کے پٹھے بال ہوا میں اُڑ رہے تھے، اور وہ گلی میں غائب ہوگیا۔

"ہوا کیا۔ ترکِ موالات کرنے گیا تھا، گولی لگی اور مر گیا۔ نہ جانے اپنے کام میں دل کیوں نہیں لگاتے۔ سرکار کے خلاف جانیکا نتیجہ یہی ہے۔ تگڑا جوان تھا، ان دوزخ کے چیونٹوں اور کھدر پوشوں کا شکار ہوگیا۔"

یہ کہتے کہتے صدیق نے ایک مٹکے کے مُنہ میں کفگیر ڈالا۔ بہت سے مٹکے برابر برابر دیوار میں گڑے ہوئے تھے اور کاہک کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ کفگیر میں دال نکال کر صدیق نے گاہک کی طرف بڑھائی۔ گاہک جو بے غوری سے صدیق کی باتیں سن رہا تھا دال کو اپنے کپڑے میں باندھنے لگا۔ یکایک اُس کی نگاہ دال پر پڑی اور وہ بولا:۔

"واہ میاں بانشا، یہ کونسی دال دے رہے ہو؟ میں نے تو ارہر کی مانگی تھی۔ ذری پھرتی کرو۔ مجھے دیری ہو رہی ہے بیوی بکے گی۔"

گھر میں مرزا کی بیوی اپنا سر دے دے مار رہی تھی، اور بیان کر کرکے روتی تھی اور انگریزوں اور گاندھی کو کوستی تھی۔ تائین کی ماں کو جب اس حادثہ کی خبر ملی تو وہ پُرسے کے لئے آئی۔ اس کا جوان لڑکا بھی ایک دیوار کے نیچے دب کر مر گیا تھا، اور وہ اُسکے ننھے ننھے بچوں کو سلائی کرکے پالتی تھی۔ دونوں گلے مل مل کر خوب روئیں، اور مرزا کی بیوی کو ذرا تسلّی ہوئی۔۔۔۔ آخرکار لڑکے کو دفن کرنے لے گئے۔ رات اندھیری تھی اور رہی سہی تاریکی کی طرح سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا سرد تھی اور محلہ میں سیل کی وجہ سے جاڑا

اور زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ لیمپوں کی دھیمی روشنی میں محلہ بھیانک اور ڈراؤنا معلوم ہو رہا تھا اور سڑک پر کوئی جاندار چیز نہ دکھائی دیتی تھی۔ صرف مرزا کی دکان کے اندر کئی ایک بلیوں کے غرانے اور کھڑبڑ کی آواز آرہی تھی۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد تک اکثر مرزا کی بیوی کے گانے کی آواز آیا کرتی تھی ع

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دلکو میرے قرار ہے

لیکن پھر وہ خاموش رہنے لگی، اور کام کاج میں مشغول رہتی۔

میرے مکان کی ڈیوڑھی میں ایک پرانا کھجور کا درخت تھا۔ ایک زمانہ میں اُس میں پھل لگا کرتے تھے اور شہد کی مکھیاں غذا کی تلاش میں نیچے اُتر آتی تھیں۔ اس کی بڑی ڈالیوں پر اکثر جانور آکے بیٹھتے تھے، اور بھولے بھٹکے کبوتر راتوں کو بسیرا لیا کرتے تھے۔ لیکن اب اُس کے پتے جھڑ گئے تھے، ڈالیاں گر چکی تھیں اور اُس کا تنا سیاہ اور بدہیئت رات کی تاریکی میں اُس بانس کی طرح کھڑا رہتا جو کھیتوں میں جانوروں کو ڈرانے کے لئے گاڑ دیا جاتا ہے۔ اب نہ اُس پر جانور منڈلاتے تھے، نہ شہد کی مکھیاں اُس طرف آتی تھیں۔ کبھی کبھی صرف کوئی کوا اُس کے ٹھنٹھ پر بیٹھ کر کائیں کائیں کرتا اور اپنا گلا پھاڑتا، یا کوئی چیل اُس پر ذرا دیر کو بیٹھ کر چلچلاتی اور پھر اُڑ جاتی۔ صبح کی بڑھتی ہوئی روشنی میں تنا آسمان پر چمک اُٹھتا تھا، لیکن شام کو فضا کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں وہ آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا اور رات میں مل جاتا۔ رات کو اکثر گھر میں داخل ہوتے وقت میری نگاہ اُس کے موٹے اور بھیانک تنے پر پڑتی، پھر اُس کے ساتھ ساتھ اُٹھتی ہوئی آسمان پر جاتی۔ تارے چمکتے ہوتے تھے، اور ٹھیک اُس کے سرے پر بنات النعش کا آخری ستارہ مجھکو دکھائی دیتا، لیکن وہ تنا میری نگاہ اور آسمان کے درمیان حائل ہو جاتا اور میں تاروں کے پھیلاؤ کو نہ دیکھ سکتا تھا۔

محلہ میں اکثر ایک پاگل عورت آیا کرتی تھی۔ کسی نے اُس کے بال کاٹ دئے تھے اور اُس کا سر اُسکے توانا اور بھاری جسم پر ایک اخروٹ کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ خداترس لوگ کبھی کبھی اُسے کپڑے پہنا دیا کرتے۔ لیکن چند ہی گھنٹوں کے بعد وہ پھر ننگی ہو جاتی تھی۔ یا تو کوئی کپڑوں کو اُتار لیتا یا وہ خود اُنکو پھاڑ کر پھینک دیتی تھی۔ اس کے مُنہ سے ہمیشہ رال بہا کرتی تھی اور اُس کے ہاتھ اکڑے ہوئے رہتے۔ وہ اکثر مٹک مٹک کر سڑک پر ناچتی اور تھرکتی اور گونگوں کی طرح گُن گُن کرتی۔ جیسے ہی وہ محلے میں داخل ہوتی لڑکوں کا ایک غول اُس کے پیچھے پیچھے تالیاں بجاتا اور "پگلی"، کہہ کہہ کر پتھر پھینکتا، اور منہ چڑاتا۔ عورت "ایں، ایں" کرتی اور کونوں میں چھپتی۔ جب کبھی مرزا کی دوکان کے سامنے یہ واقعہ ہوتا تو مرزا لڑکوں پر چیختا۔

"ابے سسرو! تمہیں مرنا نہیں ہے! بھاگو یہاں سے۔ دُور ہو!"

لیکن ذرا دیر کے بعد لڑکے پھر جمع ہو جاتے۔

اکثر بڑے آدمی بھی اُس سے مذاق کرتے۔ وہ بدصورت ضرور تھی، لیکن اُسکی عمر زیادہ تھی۔ اُس کا پیٹ بڑھا ہوا تھا۔ اور اکثر منّو جو کھاتے پیتے گھرانے کا لڑکا تھا لیکن اب بدمعاشوں میں مل گیا تھا، اُس کے پیٹ پر ہاتھ رکھکر کہتا:-

"کیوں، تیرے بچہ کب ہوگا؟"

اور پگلی ایک دردانگیز وحشیانہ آواز نکالتی اور اپنے ہاتھ آگے بڑھاتی جو ڈھیلے اور بلجلے رہتے کسی راہگیر یا دوکاندار سے مخاطب ہو کر منّو کی طرف اشارہ کرتی۔ اُس کی کریہہ آواز میں ایک منّت ہوتی تھی، ایک بےکس و بےبس شخص کی وہ التجا جو وہ اپنے حاکم یا اپنے سے زیادہ طاقتور انسان سے کرتا ہے کہ مجھے بخش دو۔

اور بچا لو۔ مگر اور لوگ بھی مذاق کرنے میں شریک ہو جاتے اور زور زور سے قہقہہ لگاتے......

ہندوستان میں ہزارہا لوگ ایسے ہیں جن کو سوائے کھانے پینے اور مر جانے کے کسی بات کا احساس نہیں۔ وہ پیدا ہوتے ہیں، بڑھتے ہیں، کمانے لگتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں، اور مر جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں دنیا کی کسی بات سے کوئی واسطہ نہیں۔ انسانیت کی لَو اُن میں نہیں ہوتی۔ زندگی کی عظمت کا انکو کوئی احساس نہیں جیسے غلام جو کام کرنے اور مر رہنے کے علاوہ کوئی دوسری حقیقت نہیں جانتے۔ زندگی کا طلوع اور موت کا غروب اُن کے لئے دونوں یکساں ہیں۔ اُن کے لئے دن کام کرنے اور راتیں سو رہنے کے لئے بنی ہیں۔ بس یہی اُنکی زندگی ہے۔ اور یہی زندگی کی حقیقت اور صرف موت اُنکو زندگی سے نجات دلا سکتی ہے......

ایک اور چیز جو ہمارے محلّہ میں کثرت سے دکھائی دیتی تھی وہ کُتّے تھے۔ مرے ہوتے اور فاقہ زدہ۔ اکثر کو کھُجلی تھی اور اُن کی کھال میں سے گوشت نظر آتا تھا۔ اپنے بڑے بڑے دانتوں کو نکوس کر وہ اپنے پُٹھے کھُجاتے تھے یا قصائی کی دوکان کے سامنے ایک ہڈی کے پیچھے ایک دوسرے کو نوچتے اور لہولہان کر دیتے۔ وہ اپنی دُمیں ٹانگوں کے بیچ میں دبائے نالیوں میں سونگھتے دبے دبے آتے تھے، اور قصائی کی دوکان کے سامنے چھیچھڑوں پر جھپٹتے۔ لیکن اکثر جیسے ہی انکو کوئی گوشت کا ٹکڑا یا ہڈی دکھائی دیتی تو چیلیں اوپر سے جھپٹا مارتیں اور اُن کے سامنے سے گوشت کو اُٹھا لیجاتیں۔ پھر وہ ایک ایسے آدمی کی طرح جو خفیف ہو گیا ہو اپنی دُم دبائے ہوئے سڑک کو سونگھا کرتے یا اپنی جھینپ آپس میں، لڑائی لڑ کے اور ایک دوسرے کا خون بہا کر مٹاتے......

صبح کو بہت سویرے شیرا چنے بیچنے والے کی آواز آتی تھی وہ اپنی جھولی میں گرم گرم تانبے بُھنے ہوئے چنے گلی گلی اور کوچہ کوچہ بیچتا پھرتا تھا۔ اس کی عمر کوئی چالیس سال کے قریب تھی، لیکن وہ دُبلا اور سوکھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں ابھی سے نمایاں ہو گئی تھیں اور اس کی خشخشی ڈاڑھی میں سفید بال آ گئے تھے۔ اُس کی آنکھیں ایک بیمار کی آنکھوں کی طرح تھیں جن کے نیچے سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے، اور جن میں بھوک اور غربت رنج اور مصیبت صاف جھلکتے تھے۔ اُن کے ڈھیلوں میں باریک باریک سُرخ رگیں دُور سے دکھائی دیتی تھیں جیسے یا تو نشہ میں یا دنوں کے فاقہ اور بخار کے بعد پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کے سر پر ایک کپڑے کی میلی ٹوپی ہوتی تھی۔ گلے میں پھٹا ہوا قمیص اور اور اُس کی اُٹنگی دھوتی میں سے اُس کی پتلی پتلی ٹانگیں دکھائی دیتی تھیں۔

عرصہ ہوا وہ ہمارے شہر میں کسی نزدیک کے ضلع سے کام کی تلاش میں آ گیا تھا۔ وہ رات کو ایک مسجد میں پڑ رہتا اور دن بھر شہر کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا۔ لیکن شہروں کی حالت روزگار کے معاملہ میں گاؤں اور قصبوں سے کسی طرح بہتر نہیں! اور شیرا کو کوئی کام نہ ملا۔ مسجد میں میر امان اللہ نماز پڑھنے آیا کرتے تھے۔ شیرا نے اُن کو اپنا قصہ سُنایا۔ میر صاحب کو اسکی حالت پر ترس آیا اور اُسے اپنے گھر لے گئے۔ شیرا نیک اور دیانتدار آدمی تھا۔ کچھ عرصے کے بعد میر صاحب نے اُسے پانچ روپے دئے اور کہا:-

”اس سے کوئی کام شروع کر دینا، اس لئے میں یہ روپے دیتا ہوں۔ جب تمہارے پاس پیسے ہوں تو یہ رقم واپس کر دینا، ورنہ کوئی فکر کی بات نہیں۔“

شیرا نے دال سیو اور کابلی چنوں کا خونچہ لگایا۔ کچھ عرصے میں شیرا کو بہت سے محلّہ والے جان گئے اور اسکا سودا خوب بکنے لگا۔

ال بھر کے اندر ہی اُس نے میر صاحب کے روپے واپس کر دئے۔
پنے بیوی بچّوں کو بُلا لیا اور ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے
لگا، اور بہت خوش تھا۔

اسی دوران میں عبدالرشید کو سوامی شردھانند کے
قتل کرنے کے جرم میں پھانسی کا حکم ہو گیا۔ سارے شہر کے مسلمانوں
میں ایک تہلکہ مچا ہوا تھا۔ پھانسی والے روز جیل کے باہر ہزاروں
آدمیوں کا ہجوم تھا۔ وہ سب دروازہ توڑ کر اندر گھس جانا
چاہتے تھے لیکن جب پولیس نے عبدالرشید کی لاش کو دینے
سے انکار کر دیا تو لوگوں کے جوش اور غصّے کا کوئی ٹھکانا نہیں
رہا۔ اُن کا بس نہیں چلتا تھا کہ کس طرح جیل کو مسمار کر دیں اور
اور اُس غازی مرد کی لاش کو ایک شہید کی طرح دفن کریں۔

اُس دن شیرا کسی کام سے جامع مسجد کی طرف گیا
ہوا تھا۔ آسمان پر غبار چھایا ہوا تھا اور سڑکیں ایک شہر خموشاں
کی طرح سُنسان اور اجاڑ معلوم ہو رہی تھیں۔ اُسکو کوئی ایک
بھوکے کتے پڑے ہوئے دو نے چاٹتے دکھائی دئے۔ ایک نالی
میں ایک مرا ہوا کبوتر پڑا تھا۔ اُس کی گردن ایک طرف مڑ گئی تھی،
اس کی ٹانگیں، سخت اور نیلی، اُوپر اُٹھی ہوئی تھیں، اُس کے
پر پانی میں بھیگ گئے تھے اور اُس کی ایک آنکھ کریہہ معلوم
ہو رہی تھی۔ شیرا کھڑا ہو کر اُسکو دیکھنے لگا۔ اتنے میں سامنے سڑک
کے موڑ سے کلمہ کی آواز زور زور سے آنے لگی۔ لوگ ایک
جنازہ لئے چلے آرہے تھے۔ جوں جوں جنازہ شیرا کی طرف آتا
جاتا تھا بھیڑ اور زیادہ نظر آتی گئی۔ یہاں تک کہ دور دور آدمیوں
کے علاوہ کچھ نہ دکھائی دیتا تھا۔ خلقت عبدالرشید کے جنازہ
کیسی طرح لے بھاگی تھی۔ شیرا بھی جنازے کی طرف بڑھا اور
کندھا دینے میں شریک ہو گیا۔ اتنے میں سامنے سے پولیس نمودار
ہوئی اور انھوں نے جنازے کو آگے بڑھنے سے روک دیا، اور
کئی ایک آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ ان لوگوں میں شیرا بھی تھا

اور اُسکو اس بلوے میں شرکت کرنیکی بدولت دو سال کی سزا
ہو گئی۔

اب وہ قید بُھگت چُکا تھا، لیکن اُس کے گاہک اب اُسکی
آواز سے ناآشنا ہو چکے تھے، اور اُس کے پاس اتنے پیسے نہ تھے
کہ وہ دوبارہ خوانچہ لگا سکے۔ کچھ لوگوں نے چندہ کر کے اُسے دو
روپے دیدیئے اور اُن سے شیرا نے پھر کام شروع کیا اور اب
چنے بیچتا پھرتا تھا۔ لیکن اب اُس کی آواز میں پچھلا کرارہ پن باقی
نہ تھا، اور مصیبت اور تکلیف اُس کی ہر پکار میں سُنائی دیتی تھی
تاہم بچّے اُس کی آواز سُن کر چنے لینے کو دوڑتے تھے اور وہ
مٹھی سے نکال نکال کر چنے تولتا اور اُنکو دیدیتا تھا۔

ایک اور شخص جو ہمارے محلّہ میں ہر روز رات کو آیا کرتا تھا۔
وہ ایک اندھا فقیر تھا۔ اُس کا قد بہت چھوٹا تھا اور اس کی
کھچڑی داڑھی پر ہمیشہ خاک پڑی رہتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں
ایک ٹوٹا ہوا بانس کا ڈنڈا رہتا تھا جسے ٹیک ٹیک کر وہ آگے
بڑھتا تھا۔ وہ بالکل حقیر اور ناچیز معلوم ہوتا تھا جیسے کوڑے
کے ڈھیر پر مکھیوں کا غول یا کسی مری ہوئی بلّی کا ڈھنچر لیکن
اُس کی آواز میں وہ مایوسی اور درد تھا جو دُنیا کی بے ثباتی کا
نقشہ کھینچ دیتا تھا۔ جاڑوں کی راتوں میں اُس کی آواز سنّاٹے
میں بے بسی پھیلاتی ہوئی جیسے کہیں دور آتی۔ میں نے آج
تک اس سے زیادہ اثر رکھنے والی آواز نہیں سُنی، اور ابھی تک
وہ میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ بہادر شاہ کی غزل اُس
کے مُنہ سے پھر پُرانے شاہی زمانہ کی یاد تازہ کر دیتی تھی جب
ہندوستان اپنی نئی بندشوں میں نہیں جکڑا گیا تھا۔ اُس کی
آواز سے صرف بہادر شاہ کے رنج کا ہی اندازہ نہیں ہوتا تھا
بلکہ ہندوستان کی غلامی کا نوحہ سُننے میں آتا تھا۔ دُور سے
اُس کی آواز آتی تھی سے

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

لیکن محلّے کے شرفا اسکو پیسے دینے سے گھبراتے تھے، کیونکہ وہ غالباً چرس پیتا تھا.......

ایک روز رات کو میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ گرمیوں کی رات تھی اور کوئی دس بجے کا وقت۔ زیادہ تر دوکانیں بند ہو چکی تھیں، لیکن کوابی اور مرزا کی دوکانیں ابھی تک کھلی ہوئی تھیں، سڑک کے دونوں طرف لوگ اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹے تھے۔ کچھ تو سو گئے تھے اور کچھ ابھی تک باتیں کر رہے تھے۔ ہوا میں خشکی اور گرمی تھی اور نالیوں میں سے سڑاند پھوٹ رہی تھی۔ مرزا کی دوکان کے تختے کے نیچے ایک سیاہ بلی گھات لگائے بیٹھی تھی جیسے کسی شکار کی فکر میں بیٹھی ہو۔ ایک شخص نے ایک آنہ کا دودھ لے کر پیا اور آبخورے کو زمین پر ڈال دیا۔ بلی دبے پاؤں تختے کے نیچے سے نکلی اور آبخورے کو چاٹنے لگی۔ اُسی وقت میری کھڑکی کے سامنے سے کلّو گذری اور اس کے پیچھے پیچھے منّو تیز تیز قدم رکھتا ہوا۔ کلّو جوان تھی۔ اس کا رنگ سیاہ تھا لیکن شباب نے اُس کے چہرے پر ایک رونق اور خوبصورتی پیدا کر دی تھی۔ اسکی چال میں ایک بیباکی اور الھڑپن تھا، اور اُس کا جسم زندگی کے اُبھار سے توانا اور سُبک تھا۔ وہ منصف صاحب کے یہاں ملازم تھی جن کی بیوی نے اسکو بچپن ہی سے پالا تھا۔ اب وہ بیوہ ہو گئی تھی، اور اُسے بیوہ ہوئے بھی تین سال گذر گئے تھے۔ لیکن محلّے کے نوجوانوں کی نگاہیں اسکی طرف گڑی رہتی تھیں۔

جب وہ گلی کے نکڑ پر پہونچی تو منّو نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

کلّو جھنجھلا کر چلّائی۔

"ہوا مُشٹنڈا کہیں کا۔ تجھ پر خدا کی سنوار! ایک عورت کو اکیلا دیکھکر ہاتھ ڈالتا ہے۔"

منّو بولا۔

"تیری جوانی پھر کس دن کام آئیگی۔"

"ہٹ دُور ہو موئے میرا ہاتھ چھوڑ۔"

برابر ایک مکان کی چھت پر دو بلیوں کے لڑنے کی آواز آئی۔

اسی وقت کلّو نے زور سے جھٹکا دیا اور اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"جھاڑو پیٹے، جوانامرگ سمجھتا ہے مجھ میں دم نہیں۔ اتنا پٹواؤنگی عمر بھر یاد کریگا۔"

مرزا جو ایک خریدار کو دودھ دینے کے بعد ذرا دیر کے لئے گھر میں چلا گیا تھا اُسی وقت واپس آیا۔ اور کلّو کا آخری جملہ اُسے سُنائی دیا، اور وہ بولا۔

"کیا بات ہے کلّو؟ کیا ہوا؟"

لیکن کلّو بغیر پیچھے مُڑے تیزی سے گلی کے اندر داخل ہو گئی۔

عزیز خیراتی جو اپنی دوکان کے سامنے سو رہا تھا شور سے اُٹھ گیا۔ منّو کو کھڑا دیکھکر پوچھنے لگا۔

"ابے منّو کیا بات ہے؟"

منّو مایوسی اور غصہ سے بھرا کھڑا تھا۔ اُس کا مُنہ خشک ہو کر سُتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں ایک سانپ کی آنکھوں کی طرح زہریلی اور تیز ہو گئی تھیں۔ کوڑے کے ڈھیر پر ایک بلی کی آنکھیں ذرا دیر چمکتی ہوئی دکھائی دیں، لیکن پھر غائب ہو گئیں۔

منّو نے جھینپی ہوئی، نااُمیدی کی آواز میں جواب دیا۔

"کچھ نہیں یار، کلّو تھی۔"

"ابے کچھ سودا بھی پٹا؟"

"نہیں میاں، ہتّے نہیں چڑھی۔ ہاتھ جھٹک کے بھاگ گئی۔ لیکن سُسری جائیگی کہاں؟"

اوپر بلیاں ابھی تک لڑ رہی تھیں وہ ایک بھیانک طریقے سے غرّانے کے بعد زور زور سے چیختی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دوسرے کو کھا جائینگی۔ پھر میاؤں میاؤں کرکے ایک بھاگ نکلی۔

اور بلا غراتا ہوا اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

عزیز خیراتی نے منّو کو اپنے پلنگ پر بٹھا لیا اور سرہانے سے بیڑی نکالکر اُس کی طرف بڑھائی۔ لیکن منّو نے اپنی قمیص کی جیب میں سے ایک چاندی کا سگرٹ کیس نکالا اور عزیز سے کہا۔

" لومیاں تم بھی کیا یاد کروگے، میں تمہیں بڑا بڑھیا سگرٹ پلاتا ہوں "

اور ایک سگرٹ نکال کر عزیز کو دیا۔

" ابے یار میں نے کیا۔ یکے کیس کا مار لایا "

" میاں یاروں کے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ جسکو نہ دے مولا اُسکو دے آصف الدولہ۔ اگر اللہ میاں کے بھروسے پر رہتے تو کام چل لیا تھا "

" میاں ہوش کی لو۔ اِس سے ڈرو۔ دوزخ میں جلوگے۔ توبہ کرو "

" جا یار۔ یہ بھی کیا گدھوں کی باتیں کرتا ہے۔ میں تو یہ جانتا ہوں کھاؤ پیو اور مزے کرو۔ اس سے زیادہ اُستاد نے سکھایا نہیں میں تو مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوں اور پڑے پڑے اینڈتا ہوں۔ کہاں کی دوزخ لگائی۔ اگر ہوئی بھی تو بھگت لیں گے۔ اب کہاں کا روگ پالا "

" بس یار بس۔ کیوں خراب باتیں مُنہ سے نکال رہا ہے۔ سب آگے آگے آجاتا ہے۔ ساری اکڑ دھری رہ جائیگی "

" اچھا یار تو تو اِس طرح کی باتیں کرنے لگا، میں اب چلدیا "

" ذری سُن تو یار۔ ایک بات مجھے دنوں سے حیران کر رہی ہے۔ قسم کھا بتا دیگا "

" اچھا جا کیا یاد رکھے گا۔ اللہ قسم بتا دونگا "

" یہ بتا تو آخر چوری کیوں کرتا ہے "

" بھئی اس کی نہیں بدی تھی "

" دیکھ قول دے چکا ہے "

" اچھا جا تو جیتا میں ہارا۔ جو سچ پوچھو تو بات یہ ہے کہ میں کبھی چوری نہ کرتا۔ تو جانتا ہے میرے رشتہ دار کافی امیر لوگ ہیں "

" جبھی تو میں اور بھی حیران ہو رہا ہوں "

" میرا ایک بھائی لگتا تھا۔ لونڈا نمکین تھا۔ یہ کوئی دس برس کی بات ہے۔ تو میری کچھ اُس سے چل گئی تھی۔ ہم دونوں مدرسے میں ساتھ پڑھتے تھے۔ اُس نے ماسٹر سے میری شکایت کردی اور بینتیں لگوائیں۔ میرے اوپر بھوت سوار ہو گیا۔ میں نے کہا اگر سالے بدلا نہ لیا ہو تو پیشاب سے مونچھیں منڈوا دونگا۔ ایک روز موقع پاکر میں نے سالے کا بستہ چرا لیا۔ اُس کے اندر بڑی بڑھیا بڑھیا چیزیں تھیں۔ اُس سے شروعات ہوئی۔ پھر ایک مرتبہ مجھے ایک ماموں کا سگرٹ کیس پسند آگیا۔ میں اُن سے مانگ تو نہ سکتا تھا، لیکن میں نے پار کر دیا۔ اس کے بعد میں نے سوچا کہ ان حرامزادوں کے پاس روپے بھی ہیں اور اچھی اچھی چیزیں بھی۔ کیوں نہ اُڑا لیا کرو۔ اور پھر تو میرا ہاتھ خوب صاف ہو گیا۔ اور یار سچ پوچھو تو یہ لوگ کبھی غریب کو مر کر بھی کوئی چیز نہ دیں۔ ان سے تو بس اسی طرح چیزیں وصول ہو سکتی ہیں "

" لیکن اگر کدھی پکڑے گئے تو؟ "

" پھر تو نے وہی فضول کی باتیں شروع کر دیں۔ اچھا اب میں چلا نہیں تو گھر میں تو تو میں میں ہوگی " یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور عزیز کی کمر پر زور سے تھپیڑ مار کے روانہ ہو گیا......

ہمارے محلّہ کی مسجد میں حسان الرحمٰن اذان دیا کرتے تھے۔ یہ قوی ہیکل اور مضبوط تھے۔ ان کا رنگ بالکل سیاہ تھا اور اُنکی ڈاڑھی مہندی سے سُرخ رہتی تھی۔ اُن کا سر تا منڈا تھا لیکن پہلوؤں میں گُدّی پر اُن کے سفید بال پڑے رہتے تھے۔ اُن کے ماتھے پر ٹھیک بیچ میں ایک بڑا سا گٹّا پڑ گیا تھا جس کا رنگ راکھ کا سا تھا۔ اور الگ دُور سے چمکتا تھا۔ اکثر وہ میری کھڑکی کے سامنے سے کھنکار نے

ہوئے گذرتے تھے۔ وہ گاڑھے کا ڈھیلی موریوں کا پائجامہ اور گاڑھے کا کُرتا پہنے رہتے تھے اور اُن کے کندھے پر ایک بڑا سُرخ رنگ کا چھپا ہوا رومال پڑا رہتا تھا۔ اُن کی آواز میں ایک ایسا کرارپن، گرمی کے ساتھ ساتھ وہ نرمی تھی جو انسان کو کم عطا ہوتی ہے۔ اُن کی اذان دُور دُور مشہور تھی اور اُس کی آواز کئی محلّوں میں پہونچتی تھی۔ اذان سے پیشتر اُن کی کھنکار بھی بہت دور سے سُنائی دیتی تھی۔ شروع شروع میں ان کی آواز سے اُس پکار کی شان ٹپکتی تھی جو مسلمانوں کو نماز کے لئے بلاتی ہے۔ پھر اختتام کے قریب آواز کی جھنکار میں کمی ہوتی اور اُن کے جملے بل کھاتے ہوئے ایک سنّاٹا اور خاموشی پیدا کرتے ہوئے فضا میں کھوجاتے تھے۔ لوگ حسان الرحمٰن کو حضرت بلالؓ حبشی کہتے تھے، اور اس مقابلہ میں بہت سی باتیں دونوں میں مشترکہ تھیں۔ اُنکی شاندار آوازیں اور اُن کا سیاہ رنگ۔

ایک مرتبہ میں اپنے مکان کی چھت پر اکیلا بیٹھا تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل بچھے ہوئے تھے۔ اور سورج کی روشنی اُن پر پیچھے سے پڑ رہی تھی اور اُن میں ہلکی سی پھیکی روشنی نمایاں تھی، کیونکہ مطلع صاف نہ تھا اور شہر کا گرد اور غبار دور دور ملوں کی چمنیوں کا دھواں ہوا میں پھیلا ہوا تھا۔ شہر کے شور وشغب کی جھنکار مکھیوں کے بھنبھنانے کی طرح آ رہی تھی۔ اور ساری فضا میں ایک دِلشکن مایوسی تھی، وہ تکلیف دہ کیفیت جو ہمارے شہروں کی خاص پہچان ہوتی ہے، جس میں غربت اور غلاظت، زندگی کی حقارت اور بےبسی کا احساس ہوتا ہے گرد و غبار سے میلے اور پھیکے بادلوں میں ایک جنگلی کبوتر اُڑتا ہوا گذرا اور اُن کے ملگجے رنگوں میں غائب ہوگیا۔ دُور سے ملوں کی سیٹیوں اور ریل کے انجنوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شہر کی اونچی ممٹیوں اور میناروں سے کبوتر اُڑتے تھے یا منڈلا منڈلا کر اُن پہ بیٹھ جاتے تھے۔ دُور دُور جدھر نگاہ دوڑتی تھی گندی اور بدنُما میلی کچیلی عمارتیں اور اُن کی چھتیں دکھائی دیتی تھیں۔ دُور دُور جدھر انسان دیکھ سکتا تھا، زندگی کی سرد مہری اور بیکاری کا احساس ہوتا تھا۔ کہیں کہیں کوئی دو منزلہ یا سہ منزلہ مکان بن رہا تھا اور اُس کی پاڑیں آسمان اور نگاہ کے درمیان سدّ راہ ہوتی تھیں، لیکن بانسوں اور بلّیوں کے رنگ نگاہ کو کوئی تکلیف نہ پہونچاتے تھے اور بادلوں کے رنگوں میں مل کر مدہم اور ہلکے دکھائی دیتے تھے۔ اُسی وقت حسان الرحمٰن کے کھنکارنے کی آواز آئی، اور پھر اُنکی اُٹھتی ہوئی سُنہری آواز فضا میں پھیل گئی۔ یہ آواز کچھ ایسی مایوس کُن لیکن تسکین بخش تھی کہ میری کوفت ایک خاموش رنج سے بدل گئی۔ اس آواز میں کوئی عظمت اور بڑائی نہ تھی، بلکہ اُس سے زندگی کی بے ثباتی کا احساس ہوتا تھا، اس بات کا کہ دُنیا مُردار ہے اور اُس کے چاہنے والے کتّے، اس بات کا کہ زندگی حقیر اور ناچیز ہے اسی طرح جیسے بادلوں کے چہرہ پر گرد اور دھواں اور غبار۔ اپنے موہوم خیالات کا شکار میں اذان کو سُنتا رہا یہاں تک کہ وہ اختتام کے قریب آگئی اور حی الی الصلواۃ، حی الی الصلوۃ کی خاموشی پیدا کرنیوالی آواز کانوں میں گونجنے لگی۔ پھر حی الی الفلاح حی الی الفلاح کی آواز سنّاٹا چھاتی ہوئی، دُنیا کی بے ثباتی کا یقین دلاتی ایک لمبی تان کے دھیمے سروں میں ہوتی اِس آہستگی اور دلبستگی سے ختم ہوئی کہ یہ نہ معلوم ہوتا تھا کہ آواز رُک گئی ہے یا ساری دُنیا پر خاموشی طاری ہے، ایک گہری اور عمیق خاموشی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ دُنیا سے پرے کہیں بہت دُور ایک اور دُنیا ہے جس میں ازل اور ابد دونوں ایک ہیں اور یہ دُنیا ہیچ اور موہوم ہے۔ آواز اس طرح فضا میں کھو گئی جس طرح اُفق پر زمین ختم ہوتی ہے اور آسمان شروع ہو جاتا ہے اور تمیز نہیں ہو سکتی کہ زمین ختم بھی ہو گئی یا ہر جگہ آسمان ہی آسمان ہے۔ اسی طرح آواز اِس آہستگی سے رُک گئی کہ آواز اور خاموشی میں امتیاز نہ ہو سکتا تھا۔ آواز کانوں میں گونج رہی تھی لیکن یہی شبہ ہوتا تھا کہ صرف خاموشی

کانوں میں ہیجان بپا کرتے ہے۔

اور میں سوچتا رہا کہ یہ اذان ہماری زندگی کی حقیقت کو کس خوبی سے ظاہر کرتی ہے۔ وہی بےبسی اور مایوسی جو ہماری رگ رگ میں پیوست ہوگئی ہے، وہی ناامیدی اور خارجی حقیقت کا خوف جو ہمکو ایک داخلی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیتا ہے اس اذان میں موجود تھے۔ ہم دُنیا کو چھوڑ کر ازل اور ابد کے خواب دیکھا کرتے ہیں، آدمی کو بھلا کر خدا کی تلاش میں مشغول رہتے ہیں۔ اور ہماری زندگی کی ہر چیز ہمکو اسی بات کی ترغیب دلاتی ہے، ہمارا ہر گیت ہمیں یہی لوریاں سُناتا ہے۔ ہمارے پیروں میں بیڑیاں ہیں لیکن ہم اُنکی رگڑ کے اتنے عادی ہوگئے ہیں کہ وہ ہمکو ایک خارجی حقیقت نہیں معلوم ہوتیں۔ ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہیں۔ ہمارے گلوں میں طوق ہیں، ہماری زبانوں میں قفل ڈالدئے گئے ہیں لیکن ہمکو کسی بات کا احساس نہیں۔ ہمارا جسم سُن ہوچکا ہے، ہماری روح سوگئی ہے، اور ہم اپنی بےبسی میں مگن ہیں اور لاپروائی اور بےحسی کی زندگی گذارتے ہیں حتیٰ کہ موت اپنے پنجے بڑھاتی ہے اور ہمکو اپنی تاریک آغوش میں کھینچ لیتی ہے۔ ہماری نیک نامی اور بدنامی دونوں برابر ہیں، ہماری زندگی اور موت دونوں یکساں ہیں، اور اذان کی آواز کی طرح ہم اس طرح زندگی سے موت میں بدل جاتے ہیں کہ کوئی تمیز نہیں کرسکتا کہ ہم کبھی زندہ بھی تھے یا یہ سب محض ایک وہم و گمان تھا اور ہم، موت کے دُلارے، ہمیشہ سے اُسکی لوریوں سے مخمورِ خواب غفلت کی نیند سویا کرتے تھے......

ایک رات کو مرزا کی دوکان پر تین چار آدمی بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ اُن میں سے ایک تو عزیز تھا ایک کوابی اور ایک آدھ اور جمع ہوگئے تھے۔ اُن کے سامنے حقہ رکھا تھا اور وہ باری باری کش کھینچ رہے تھے۔ اُن میں سے ایک کہہ رہا تھا:۔

"میں تو بار بار ہر ایک چیز میں وس کی شان دیکھ رہا ہوں۔"

اس پر سب کے کان کھڑے ہوتے اور میں غور سے سُننے لگا۔

اتنے میں ایک گاہک آیا اور اُس نے مرزا سے پانچ پیسے کا دودھ مانگا اور ایک طرف کھڑا ہوا۔ مرزا نے ایک آبخورہ اُٹھایا اور دودھ نکالنے کے لئے لُٹیا کڑھاؤ کی طرف بڑھائی۔ اُس آواز نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"پرسے دن میں چاندنی چوک میں سے جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک بچھیا آ رہی تھی۔ وسی جگہ ایک بچہ پڑا وا تھا۔ گائے بچے کے پاس آن کے رُک گئی۔ میں نے سوچا کہ دیکھو اب کیا کرتی ہے۔ جتنے میں صاب وس بچھیا نے اپنے چاروں پیر جوڑ کر ایک فلانگ ماری بچے کو صاف لانگ گئی۔ مجھکو تو وس جناور کی عقل میں وس کی شان نظر آگئی۔"

مرزا کا ایک ہاتھ کڑھاؤ کے پاس تھا، دوسرے میں آبخورہ تھا اور وہ بولنے والے کی طرف گھور رہا تھا۔ عزیز بولا۔

"واہ۔ کیا وِسکی شان ہے۔"

مرزا نے لٹیا میں دودھ لیا اور اُسکو اُچھالنے لگا۔ اتنے میں ایک دوسرا شخص بولا:۔

"ہاں میاں وِسکی شان کا کیا پوچھ رہے ہو۔ ایک مرتبہ حضرت سلیمان کو حکم ملا کہ محل بناؤ۔ تو بس صاحب وانھوں نے تیاریاں شروع کردیں۔ جناتوں نے آنا فانا میں بڑے بڑے پتھر اور سلیں لالا کے جمع کردیں اور مدت لگ گئی۔ تم جانتے ہو جناتوں کا کام کتنی پھُرتی کا ہوتا ہے۔ آج اتنا کل وتنا تھوڑے ہی دن میں محل آسمان سے باتیں کرنے لگ گیا۔ حضرت سلیمان روز وِس جگہ جاکے دیکھا کرتے تھے کہ کوئی کام میں سُستی تو نہیں کر رہا ہے۔ تو بس صاب ایک دن محل کھڑا ہوگیا۔ اب صرف وِس کے اندر کی قلعیں اور فرش صاف کرنے رہ گئے۔ دوسرے روز پھر حضرت سلیمان اپنی لکڑی ٹیک کے کھڑے ہوگئے۔ اور ملبہ باہر پھینکنے کا حکم

دیدیا۔ لیکن دِتّے میں وہاں سے کچھ اور ہی حکم آچکا تھا۔ اب دیکھئے دِس کی شان کہ یہاں تو محل کی صفائی ہورہی ہے اور وہاں وِس لکڑی میں گھُن لگنا شروع ہوگیا۔ لیکن وہ ڈٹے کھڑے رہے۔ یہاں تک کہ گھُن لگتے لگتے مونٹھ تک پہونچ گیا، لیکن وِن کو ذری کبھی خبر نہیں ہوئی۔ اور لکڑی راکھ کی طریوں جھڑ گئی اور وِن کا خود کا دم نکل گیا۔ لیکن میں تو اس بات پہ حیران ہورہا ہوں کہ وِن قتلوں اور فتّروں کو کون صاف کریگا "

عزیز کے ہاتھ میں حقّہ کی نلی اُس کے مُنہ کے برابر رکھی ہوئی تھی اور وہ بولنے والے کی طرف گھُور رہا تھا۔ مرزا کا ایک ہاتھ جس میں لُٹیا تھی اوپر تھا اور آبخورہ والا نیچے، اور وہ قصّہ میں محو تھا۔

میں نے زور سے ایک قہقہہ لگایا لیکن پھر سوچ میں کھو گیا کہ واقعی آخر اُن "قتلوں اور فتّروں" کو کون صاف کریگا۔

ہَوا کا ایک جھونکا زور سے آیا اور مٹّی کے تیل کا لیمپ گُل ہوگیا اور سڑک پر اندھیرا تھا۔ اور اُسی وقت لوگ مرزا کی دوکان سے اُٹھ کر روانہ ہونے لگے، اور میں بھی گھر کے اندر چلا گیا.........

(جملہ حقوق بحقِ مُصنف محفوظ)　　احمد علی؛

حشرِ جذبات

میں مسرور ہوں اُس سے مہجور ہوکر　　کہ مجھ سے ملا وہ بہت دُور ہوکر
کہاں ہے محبّت میں ممکن یہ مجھ سے　　کہ بیٹھوں تری بزم سے دُور ہوکر
تری شانِ جدّت پسندی کے قرباں　　کہ مختار ٹھہرا میں مجبور ہوکر
وہ شکلیں جو دل میں کبھی جلوہ گر تھیں　　نظر آئیں برقِ سرِ طور ہوکر
اُٹھا ڈالے سارے حجابات میں نے　　شرابِ محبّت سے مخمور ہوکر
اُمیدوں کی دُنیا نہ ہوجائے ویراں　　فریبِ تجسس نہ دے دُور ہوکر
ترے قرب سے اب تو بیتابیاں ہیں　　میں خوش تھا ترے قرب سے دُور ہوکر
کشش تھی یہ اک مخلصِ بے ریا کی　　کہ ہسوے میں آیا فتحپور ہوکر

جو ملنا نہ ثاقب سے تم چاہتے تھے
تو کیوں اُس کو آواز دی دُور ہوکر

ثاقب کانپوری

ایک ایکٹ کا ڈرامہ

زلزلہ

(کوہ آتش فشاں سکون وجمود کے عالم میں ہے۔ غالباً وہ عرصہ دراز سے خوابیدہ ہو کیونکہ اس کا جسم پتھرا گیا ہے اور شگافوں میں ببول کے درخت اُبھر آئے ہیں۔ البتہ اس کی زندگی کی شہادت دھوئیں کی اس مسلسل لہر سے ملتی ہے جو چوٹی کے کسی نامعلوم درز سے نکل کر دم بھر کیلئے فضا پر حلقے بناتی اور پھر اوجھل ہو جاتی ہے۔

اس کی ترائی میں آبادی بس گئی ہے۔ چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں کی قطاریں ایسے دکھائی دیتے، ایوان سیاہ جلد پر کوڑھ کے داغوں کی طرح، دور سے نظر آرہے ہیں۔ ان میں سے ایک مکان سے سیلانیوں کی ایک ٹولی، جو چار مردوں اور دو عورتوں پر مشتمل ہے، خراماں خراماں آتش فشاں کی طرف آتی اور وادیٔ کوہ کے ایک مرغزار پر بیٹھ جاتی ہے۔

مردوں میں سے ایک اس ترائی کا زمیندار ہے کیونکہ راہ چلتے گڈریے اور کسان اس کے ایک اشارے پر پیچھے پیچھے چلے آتے ہیں اور اب دست بستہ اس کے حکم کے منتظر ہیں۔ اس کا نام رنبیر ہے۔ باقی میں سے دو کی سوقیانہ آرائش ان کے نودولتے پن کی غمازی کر رہی ہے۔ یہ دونوں بے نام ہیں۔ اس جماعت کا چوتھا رفیق اپنے وطیروں میں سب سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے اُلجھے ہوئے بال، بڑھی ہوئی داڑھی اور بھٹکی ہوئی نظریں بتلا رہی ہیں کہ وہ کوئی مفکر ہے۔ اس کا نام سہراب ہے۔

عورتیں یوں ملبوس ہیں گویا اُنھوں نے اپنے آغوش میں زندگی کے راز کو چھپا لیا ہے، وہ دونوں نام سے بے نیاز ہیں۔

آسمان پر بادلوں کے آوارہ ٹکڑے گھوم رہے ہیں اور سورج اپنی متاع شب کے سپرد کر رہا ہے)

عورت۔ یہ آتش فشاں بظاہر کتنا معصوم اور خاموش ہے۔ کون شبہ کر سکتا ہے کہ اس کے سینے میں لاوے کے دھارے موجیں مار رہے ہیں اور چٹانیں پگھل رہی ہیں۔ یہاں آکر مجھے اسی قسم کی دہشت محسوس ہوتی ہے، جیسی طوفان سے پہلے پرندوں کو۔ او کسان، کچھ پتہ ہے کہ یہ پہاڑ کب سے ساکت اور بیجان ہے؟

کسان۔ یہ پہاڑ ہمارے حل سے زیادہ پرانا ہے اور اس دن سے خاموش ہے جب سے ہم نے اس کی ترائی کو جوتنا بونا شروع کیا تھا۔ کبھی کبھی وہ ایک گہرا سانس لیتا ہے، اس کے دہانے پر شعلے کی ایک لپک دکھائی دیتی ہے، اس کی سلیں چٹخ جاتی ہیں اور اس کی بانہیں لرزنے لگتی ہے۔ پھر وہ بہت دنوں کیلئے چپ ہو جاتا ہے۔

عورت۔ او رنبیر، تم اس کے پڑوس میں رہتے ہوئے ڈرتے نہیں؟ ممکن ہے کبھی یہ پھٹ پڑے!

رنبیر۔ جتنا زیادہ میں اس آتش فشاں کو دیکھتا ہوں، مجھے یقین ہوتا جاتا ہے کہ یہ عورت کا مجسمہ ہے۔ کون جانتا ہے کہ عورت کے دل میں کیا ہے۔ وہ بہتا ہوا پانی ہے، جو محبت کی سوت سے نکل کر نفرت کے ایشیا کی طرف بہہ رہا ہے۔ مگر کیا پتہ کہ اس میں کب مدّ وجزر ہو، کب سیلاب آئے اور کب بھنور پڑے۔ یہی حال اس آتش فشاں کا ہے۔ وہ ساری دنیا کی تپش اور ہیجان کا مخزن ہے۔ پتھر کے اس سخت خول کے نیچے نہ معلوم آگ کی کتنی بھٹیاں دہک رہی ہیں اور گندھک کے کتنے چشمے پیچ و تاب کھا رہے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ دھوئیں کی یہ جھینی جھینی چادر آگ کے کتنے بڑے ذخیرے سے نکل رہی ہے۔ مگر جوں جوں یہ خدشہ بڑھتا جاتا ہے کہ عورت کے سینے میں آندھی امنڈ رہی ہے، میری محبت شدید تر ہوتی جاتی ہے میں کانپتے ہوئے دل سے اس دن کا انتظار کرتا ہوں، جب اس زمین میں زلزلہ آئیگا اور یہ بجلی میرے سر پر ٹوٹ پڑیگی۔ بس اسی طرح اس زرخیز زمین سے نفع حاصل کرتے ہوئے میں تباہی کے اس پرچم کو دیکھتا رہتا ہوں جو دھوئیں کی شکل میں ہوا میں اڑ رہا ہے۔

سہراب۔ دوستو، جس دن اس آتش فشاں پر پہلے پہل نظر پڑی، اسی رات کو میں نے ایک دلچسپ خواب دیکھا۔ میں اسے بھول چکا تھا مگر آپ کی باتوں نے اس کی یاد تازہ کر دی۔ میں نے دیکھا کہ کسان اپنے کھیتوں کو صاف کرنا چاہتے ہیں مگر ان کے نیچے دبی ہوئی ہڈیوں سے ٹکرا ٹکرا کر ہل بیکار ہو جاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر انھوں نے ہڈیوں کو یکجا کرنا شروع کیا حتیٰ کہ ان کا ایک انبار لگ گیا۔ انبار اونچا ہوتا گیا اور بالآخر یہ پہاڑ بن گیا۔ دھوپ اور بارش میں یہ ہڈیاں پستی گئیں اور ان میں پوشیدہ آتش انتقام بوند بوند کر کے تہ میں جمع ہوتی گئی۔ وقت اس آگ میں ایندھن کا کام کرتا گیا اور رفتہ رفتہ دھوئیں کی چادر زیادہ سیاہ اور گہری ہوگئی۔ معلوم نہیں کیوں کر میں اس آتش فشاں کے اندر پہنچ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ خون کے پرنالے کھول رہے ہیں، آنسوؤں کا سیلاب بہہ رہا ہے مگر اس میں اس بلا کی حدّت ہے کہ چٹانیں پارے کی طرح عرق عرق ہوئی جا رہی ہیں۔ صدہا سال کے انسانوں کے پنجر ایک دوسرے سے لپٹے پڑے ہیں اور تپش نہیں لاوے کی شکل میں تبدیل کرتی جاتی ہے۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ جب ان خولوں میں جہاں زندہ انسان کی آنکھیں ہوتی ہیں، آگ کے دو لرزتے ہوئے شعلے گھس جاتے تھے تو کیا کیفیت ہوتی تھی۔ ان پسلیوں میں جہاں گوشت ہوتا ہے چلتے ہوئے سنگ ریزے چمکنے لگتے تھے، تو میرا کیا حال ہوتا تھا۔ اور میں تفصیل میں جانا نہیں چاہتا مگر یہ کہنے سے نہ چوکونگا کہ عورتوں کے پنجر صاف پہچانے جاتے تھے کیونکہ وہ جہنم بداماں تھے۔ گویا دمدار ستارے کی دم کا ایک ایک بال جل رہا ہو۔ یہ تو تھا، مگر سب سے زیادہ حیرت انگیز منظر اور ہی تھا۔

سب۔ وہ کیا؟

سہراب۔ وہ یہ کہ ایک شخص لوہے کی لمبی چھڑ سے اس آگ کو کرید رہا ہے۔ جن چٹانوں تک آگ نہ پہنچی انہیں مشتعل دکھاتا ہوا اور جن میں آگ دہک رہی ہے انہیں ایندھن دیتا ہے۔ پہلے تو میں سمجھا کہ یہ منکر نکیر کے قسم کی چیز ہوگی مگر میرا قیاس غلط تھا۔

نودولتا۔ پھر کیا یہ انسان تھا؟

سہراب۔ ہاں، یہ انسان تھا۔ یہ ابدی انسان تھا۔ جسے مظلومیت نے پیدا کیا تھا اور جو اب انتقام کی چھڑ سے انسانیت کی آگ کو کرید رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تو یہاں کیوں ہے، یہ خون کیسا ہے، یہ ہڈیاں کس کی ہیں؟ اور اس کا جواب در اصل وحشت انگیز تھا!

(سننے والوں کے چہرے فق ہیں۔ کسانوں اور

گڈریوں کے کان کھڑے ہوگئے ہیں۔ اندھیرا بڑھتا جاتا ہے۔ اور تاڑ کے درخت پر بیٹھا ہوا ایک اُلّو اپنے مُہیب نغموں سے شب کا خیرمقدم کر رہا ہے۔)

زبیر۔ اُس نے کہا کہ ؟ واقعی، یہ خواب اتنا دلچسپ ہے کہ اس پر یقین کرنے کو جی چاہتا ہے۔

سہراب۔ جب وہ میری طرف متوجہ ہوا تو اُس کی چھڑ ایک پنجر کی کھوپڑی میں پیوست تھی، جو کسی کونے میں دبک گیا تھا۔ یہ کھوپڑی ہنس رہی تھی، نہ جانے زندگی پر یا موت پر۔ جب وہ پیکرِ مظلومیت میری طرف دیکھنے لگا تو محسوس ہوا کہ میں نے اسے ایک نہیں ہزار بار دیکھا ہے۔ میں نے اسے سڑکوں پر روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کیلئے کتّوں سے لڑتے دیکھا ہے۔ میں نے اسے مسجد کی سیڑھیوں پر ایک ایک پیسے کیلئے نمازیوں کے سجدے کرتے دیکھا ہے۔ میں نے کارخانوں میں مشین کو اس پر ہنستے دیکھا ہے، اس وقت جب مزدور بےخبری کے عالم میں شام کی روٹیوں کے تصوّر میں مگن ہوتا ہے اور ایک تیز پُرزہ قہقہہ مار کر اس کے ہاتھوں پر گرتا ہے، ایک لمحہ اپنی بے بصر آنکھوں سے اس کے کربِ الم کو دیکھتا ہے، پھر اُچھل کر اُس کے جسم کے دوسرے حصّے پر گرتا ہے۔ اور میں نے اس ابدی مظلوم کو چند ٹکوں کیلئے متاعِ نسوانیت بیچتے دیکھا ہے۔

میں اسے اچھی طرح پہچانتا تھا، اتنی اچھی طرح کہ مجھے اُسے دیکھ کر ڈر معلوم ہونے لگا۔ اس نے کہا۔ یہ انسانوں کا خون ہے جسے مٹّی پی گئی تھی اور اب اسے اُگل رہی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ زندہ انسانوں کے پنجر ہیں یا مُردوں کے ہیں انہیں آگ میں جھونکتا ہوں کہ وہ اس میں تپ کر اپنا امتحان کرلیں۔ انہیں تباہی کا پیغام پہنچانا ہے، ان محلوں اور ایوانوں میں جہاں جا کر ہوا کی ہچکی بند ہونے لگتی ہے۔ اور جب تمام دُنیا ریگستان ہوجائے تو انہیں آگ کے اس سمندر میں ایک نئی دُنیا کے گیت گاتے ہیں۔

دوستو، میں نے فلسفہ کے کوچۂ خارزار میں ایک عمر جھک ماری ہے، لیکن سچ کہتا ہوں کہ یہ فلسفہ اس قدر انوکھا تھا کہ میں چیخ کر اٹھ بیٹھا اور میں نے دیکھا کہ لیمپ کسی طرح فرش پر اُلٹ گیا ہے، اُس کے دُھوئیں سے کمرہ بھر گیا ہے، اخباروں کے انبار میں آگ سلگ رہی ہے اور میرا نوکر لوہے کی ایک پچکاری سے مجھ پر پانی اُنڈیل رہا ہے!"

(کسی کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں ہے۔ سب خاموش ہیں۔)

عورت۔ اُف اوہ، سہراب، تم نے کیسا بھیانک خواب سُنایا۔ تمہاری عادت ہے کہ دونوں وقت ملتے اِسی قسم کے منحوس واقعات سُنایا کرتے ہو۔ توبہ، میرا دل دھڑکنے لگا!

نو دولتیا۔ سہراب، اس خواب کی تعبیر پر بھی تم نے غور کیا؟

سہراب۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ میں ان مُہملات پر غور کرتا۔ روح و مادّہ کے تنازع سے مجھے اتنی فرصت کہاں کہ کسان اور اُسکی لوہے کی چھڑ پر سر کھپاؤں۔ البتہ کسی کتاب میں میں نے ایسے ہی ایک خواب کا ذکر پڑھا ہے۔ زمانۂ قدیم میں کوہ آتش فشاں وسیوِوس کے نواح کے ایک غلام نے خواب دیکھا کہ ایسا زلزلہ آیا کہ تمام مکان گر گئے، شہر تباہ ہوگئے اور ہر طرف بربادی پھیل گئی۔ مگر اُس کی تعبیر یہ تھی کہ غلاموں نے اپنے آقاؤں کے خلاف بغاوت کردی، اُن کی ملکیت پر قبضہ کرلیا اور اُلٹے انہیں اپنی خدمت کیلئے مجبور کردیا۔ سوءِ اتفاق کہ یہ خواب دیکھنے والا ان غلاموں کا سردار تھا۔

(آتش فشاں ایک پُراسرار ہیولے کی طرح جلد جلد سانس لے رہا ہے۔ عورت زندگی کی لکیر کی طرح کفِ خاک پر لیٹ گئی ہے)

سہراب۔ اب اندھیرا ہو رہا ہے اور شفق کے دامن کا آخری چھور جو تپتے ہوئے لوہے کی طرح سُرخ ہے، گویا اُس سیّال سے رنگا گیا ہے جو ابھی پوری طرح خون نہیں بنا ہے۔ اور اس سُرخی کے پس منظر اور کہر کے نقاب کے درمیان یہ آتش فشاں کتنا عجیب معلوم ہو رہا ہے۔ اس کے دراز قد پر اُبھرے ہوئے دونوں سرے گویا گھن کے دو پھل ہیں اور ان دونوں کے بیچ میں ایک منحوس ستارہ آنکھ کے اشارے سے دُنیا کو اپنی طرف بُلا رہا ہے۔ یوں سمجھو کہ سُرخ کاغذ پر کسی نے سیاہ لفظوں کا یہ خاکہ بنا دیا ہے۔

عورت۔ ذرا تم زمین سے کان لگا کر سُنو کہ یہ پہاڑ دُنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کیا پیغام بھیج رہا ہو۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ زمین دل ہی دل میں کچھ بُڑبُڑا رہی ہے۔ کبھی یہ آواز مرد کے دل کی دھڑکن کی طرح دھیمی ہو جاتی ہے۔ کبھی عورت کے دل کی طرح مضطرب ہو کر زور زور سے صدا دینے لگتی ہے۔ اپنے محبوب کا ہاتھ لگتے ہی میرے جسم میں جس قسم کی سنسنی دوڑ جاتی ہے، وہی سنسنی میں زمین کے اندر محسوس کر رہی ہوں۔ اور پہلے بوسے کے وقت سانس جتنا تیز و تُند ہو جاتا ہے اُسکی صدائے بازگشت میں بخوبی سُن سکتی ہوں۔ رنبیر، ذرا تم بھی کان لگا کر سنو کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟

رنبیر۔ مجھے تو کچھ نہیں سُنائی دیتا۔ کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہو کہ ان الفاظ اور صداؤں کو سُنوں جن سے زمین کی خاموشی بنتی ہے۔ اس آتش فشاں کی چٹانوں پر لیٹ کر میں نے اس آواز کو سُننے کی کوشش کی ہے، جو زلزلوں کی تقیب ہوتی ہے۔ مگر زمین کو میں نے ہمیشہ کسانوں کی طرح بے زبان پایا ہے۔ پُرانے لوگوں کا بیان ہے کہ ایک بار اس پہاڑ نے کچھ بولنے کی آرزو ظاہر کی تھی، مگر مجھے اس قصّہ پر یقین نہیں آتا۔

نو دولتا۔ وہ کب اور کیسے؟

رنبیر۔ کسی زمانے میں یہ سارا علاقہ ایک بڑے نواب کے قبضہ میں تھا۔ جو نگر پار کہیں رہتا تھا۔ ایک مرتبہ ایسا قحط پڑا کہ دُور دُور تک کہیں کچھ پیدا نہ ہوا۔ برسوں زمین پیاسی رہی اور بھوک پیاس سے ہزاروں لاکھوں غریب مر گئے۔ ماؤں نے ممتا سے مُنہ موڑ کر بچّوں کو بیچ دیا اور جوان بوڑھوں کو کھا گئے۔

پہلے تو کسانوں نے قرض لے کر اور اپنا اثاثہ بیچ کر لگان ادا کیا مگر تا بکے؟ ایک دن ایسا آیا کہ کسی کے پاس کچھ نہ رہا۔ نواب کے کارندوں نے اُنہیں جھونپڑیوں سے نکال دیا اور وہ آسمان کے نیچے آ کر بیٹھ گئے کیونکہ انکے پاس ایک سانس کے سوا اور کچھ اپنا نہ تھا۔

اتنے میں اُنھوں نے سُنا کہ نواب اپنی رعایا کا حال دیکھنے کے لئے آ رہا ہو۔ یہ سُن کر وہ مطلق خوش نہ ہوئے کیونکہ نواب کو اُن کے دُکھ سُکھ کی پروا نہ تھی۔ ہر دوسرے تیسرے سال وہ اِسی طرح حسین لڑکیوں کی تلاش میں نکلا کرتا تھا۔

جب وہ نواب اس قطار کا معائنہ کرنے لگا جس میں کارندوں نے فاقہ زدہ عورتوں کو کھڑا کر دیا تھا، تو اُس کی نظر ایک لڑکی پر پڑی جو ڈر کے مارے اس پہاڑ کی ایک کھوہ میں چُھپ گئی تھی۔ نواب کے آدمی اُسے پکڑنے کے لئے دوڑے اور وہ اُن سے بچنے کیلئے چٹانوں پر دوڑنے لگی۔ یکایک اُس کے پیر ڈگمگاتے اور وہ ایک عمیق غار میں گر پڑی۔ کہتے ہیں کہ اُسی وقت یہ زمین لرزنے لگی، ایک ہیبت ناک آواز سے فضا گونج اُٹھی اور جب یہ پہاڑ پھٹا تو اُس کے اُبلتے ہوئے چشموں میں بستی گم ہو گئی۔ آقا اور غلام، کسان اور زمیندار کی کوئی تفریق نہ رہی، ہر طرف بربادی کے پھریرے اُڑنے لگے جب سنّاٹا ہوا تو زمین نے دیکھا کہ انسان کی تہذیب اونچے اونچے محلوں کے نیچے اور اُس کی زندگی تنگ و تاریک جھونپڑیوں کے نیچے مدفون ہے۔ اس کے باوجود ——

نودولتا۔ (چلاّکر) دیکھو دیکھو، اُس کے دھانے پر یک بیک یہ شعل سی کیسی جل رہی ہے اور اس کا دُھواں سارے آسمان پر چھا گیا ہے!

عورت۔ اور یہ زمین آپ ہی آپ گرم کیونکر ہو گئی۔؟

زنبیر۔ ہم سب کو بھاگنا چاہیئے۔ زمین میں رہ رہ کر خفیف سی حرکت ہو رہی ہے اور اس کی تہہ میں بیٹھ کر جیسے کوئی کراہ رہا ہے۔

(سب میدان کی طرف بھاگتے ہیں۔ زمین زور سے ہل رہی ہے، آتش فشاں کی چوٹی پر بجلیاں سی کوندرہی ہیں، دُھواں زہر آلود ہو رہا ہو جسمیں سانس لینے میں تکلیف ہونے لگی ہو۔ زمین کے اندر جیسے توپیں چل رہی ہیں۔ آبادی کی طرف سے شور و غوغے کی صدا آ رہی ہے جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جاتی ہے۔)

سہراب۔ اب ہمیں ذرا دیر ٹھہر جانا چاہیئے۔ کیوں کہ میرا سانس رُک رہا ہے۔

(سب بیدم ہو کر گر پڑتے ہیں)

نودولتا۔ کیا غضب ہو رہا ہے! شہر کے لوگ بجائے اسکے کہ جان کی حفاظت کیلئے میدان کی طرف بھاگیں مشعلیں لئے ہماری حویلیوں کی طرف جا رہے ہیں۔ ماتم اور کہرام کے بجائے مسرت کے نعرے لگا رہے ہیں۔ آخر یہ ہو کیا رہا ہے؟

سہراب۔ عقل کے اندھو! ابھی بھی نہیں سمجھے کہ کیا ہو رہا ہے! یہ زلزلہ ہے زلزلہ! جب ایک زور کا جھٹکا آئے گا تو یہ جھونپڑیاں اور حویلیاں سب گر پڑینگی اور ان کے نیچے غربت اور امارت دونوں دفن ہو جائیں گی۔ پھر بہت دنوں تک زمین سورج کے اردگرد گھومے گی، تب کہیں آفرینش کی نئی سوت پھوٹے گی۔

زنبیر۔ یہ مصیبت قیامت سے کیا کم ہے۔ آتش فشاں کے پرخچے ہوا میں اُڑنے لگے ہیں۔ ہمارے مکان جس ٹیلے پر تھے، وہاں اب آگ کے شُعلے اُٹھ رہے ہیں۔ یا تو اس پہاڑ کا ایک دھکتا ہوا پتھر ان میں گر پڑا اور یا بھک منگوں نے انہیں آگ کے سپرد کر دیا۔

(زمین، آسمان اور تحت الثریٰ ــــــ ہر طرف ایسا شور برپا ہے کہ کانوں پڑی آواز نہیں سُنائی دیتی۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا ہے، آسمان پر دل بادل اُمنڈ آئے ہیں اور اندھیرا گھپ ہو گیا ہے۔ صرف آتش و برق کی لپک ایک آن کیلئے اُجالا کر دیتی ہے۔ ہوا بہت تیز ہو گئی ہے۔)

سہراب۔ اب بھاگنا لاحاصل ہے کیونکہ موت سے کہیں نجات نہیں مل سکتی۔ آؤ، یہیں بیٹھ کر اُس ساعت کا انتظار کریں جب زندگی ہمیں خیرباد کہے گی۔ زیادہ دیر نہیں ہے کیونکہ پہاڑ ایڑی سے چوٹی تک سُلگ رہا ہے اور اُس کی روشنی میں پگھلے ہوئے سنگ ریزوں کے وہ چشمے صاف نظر آ رہے ہیں جو سیاہ اژدہوں کی طرح دھیرے دھیرے ہماری طرف رینگ رہے ہیں۔

تم ہوا کی زبان نہیں سمجھ سکتے۔ وہ کہہ رہی ہے کہ زمانہ بدل رہا ہے۔ جب سب کچھ مٹ جائیگا تو یہ عورت اپنی قبر سے اُٹھیگی اور آسمان پر جو اکیلا ستارہ رقص کرتا رہیگا وہ نئی زندگی کے راز اُسے بتائیگا۔ پھر ایک نیا انسان پیدا ہوگا جو حدیثِ حیات کے نئے باب کا آغاز کریگا۔

جیسا نام ہے کھونے اور پانے کا۔ جب ہم نے اس دُنیا سے بہت کچھ لیا، تو اسے واپس لوٹاتے ہوئے کیوں دلگیر ہوں۔ آؤ اب مرتے مرتے ہم اِس زمین کو آخری سلام کرلیں ــــــ! (سب پاگلوں کی طرح ایک دوسرے کو گھور رہے

تری تصوّیر

ہیں شفق کے سُرخ دامن پر ستارے جلوہ گر
کُھل گیا ہے یا کوئی گوشہ تری تصویر کا

سُرخ ہو جاتے نِخھے میرے چومنے سے لب ترے
رنگ اُڑا جاتا ہے جانے کیوں تری تصویر کا

آہ یاد آتی ہیں رہ رہ کر وہ رنگیں خلوتیں
ہے قیامت سامنے رہنا تری تصویر کا

اب مرا خلوتکدہ بھی بُتکدہ سے کم نہیں
اب تو میں سچ مچ پُجاری ہوں تری تصویر کا

کچھ تو ہو ان خوگرِ دیدار آنکھوں کے لئے
کام لوں کب تک تصوّر سے تری تصویر کا

جاگ اُٹھیں تاثیرِ ہجراں سے بہاریں حُسن کی
اللہ اللہ جلوۂ غمگیں تری تصویر کا

اور کیا بتلاؤں اپنی خلوتوں کا ماجرا
تر ہے اشکوں سے مرے دامن تری تصویر کا

پیمبر صحابی

سچی کہانی

ساری دُنیا سے نیا غم ہے مری تقدیر کا
حُسن کو سمجھے ہیں مُجرم عشق کی تقصیر کا

آگئیں آنکھوں میں کھنچکر دل کی ساری حسرتیں
اُس نے جب پوچھا نظر سے مُدعا دلگیر کا

چاہنا ہے جُرم، اور پھر وہ بھی تجھکو چاہنا
کُشتنی ہوں میں، مجھے شکوہ ہی کیا زنجیر کا

اُسکے دامن میں بھی گرتے ہیں ستارے رات بھر
حُسن بھی ساقی بنا ہے عشق کی تقدیر کا

اے مرے مجبور! میں تیری خموشی کے نثار
... ...

تیرے اشکوں کے تصوّر سے پھٹا جاتا ہے دل
قہر ہے داغوں سے پُر ہونا تیری تحریر کا

حُسن شیدائے محبّت اور پھر ہجراں نصیب
دیدنی ذوقِ ستم ہے کاتبِ تقدیر کا

اور تڑپائیگا جذبِ دل مرے مہجور کو
آہ کرتا ہوں مگر خواہاں نہیں تاثیر کا

ہائے کیا گزریگی اُس بربادِ اُلفت پر جسے
دردِ دل کہنا ہوا اور یارا نہ ہو تقریر کا

اپنے آغوشِ تمنّا میں تجھے دیکھا ہے رات
کاش میں ہو جاؤں قایل خواب کی تعبیر کا

چارہ گر نا آشنائے درد ہے سمجھاؤں کیا
زخم دکھلائی نہیں دیتا نظر کے تیر کا

حُسن جب مستور ہو، مجبور ہو، مہجور ہو
پوچھنا کیا نامرادِ عشق کی تقدیر کا

پریم پجاری؛

آگ کی منزلیں

انسان کو پیدا ہوئے کافی عرصہ گذر چکا تھا مگر اس کی زندگی بالکل جانوروں کے مانند تھی۔ رات کو غاروں میں سو کر اور دن کو درختوں پر چڑھے رہ کر وقت گذارنا اس کا بہترین مشغلہ تھا۔ قدرت کی فیاضیاں اس کے لئے خورد و نوش کا انتظام کر رہی تھیں جب آبادی بڑھنے کے ساتھ اسے خود کاشتکاری کرنی پڑی تب بھی اس کے کھانے پینے کے طریقے ویسے ہی وحشیانہ رہے۔ مصر میں بعض مقامات کی کھدائی ہوئی تو ایسی چیزیں بھی برآمد ہوئی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم زمانے کے لوگ آناج کو پیس کر گوندھ کر اور پھر پتھروں پر لیپ کر دھوپ میں خشک کر لیتے تھے۔ بس وہی اُن کی روٹیاں تھیں۔ جانوروں کو مارتے اور گوشت کچا کھا لیتے تھے۔ آجکل کے سے مزیدار اور خوش ذائقہ کھانے انہیں کہاں نصیب تھے۔ ان کا امکان بھی کیسے ہو سکتا تھا۔ جبکہ تاریخ بتاتی ہے کہ زمانۂ دراز تک لوگ آگ کے وجود سے لاعلم رہے ہیں۔ ہمیں ماننا پڑیگا۔ کہ آج تہذیب و تمدن کی تمام ترقیاں صرف آگ کی رہینِ منت ہیں۔ زندگی کا کوئی پہلو لے کر انسانی ضروریات پر نگاہ ڈالی جائے تو آگ کا وسیلہ کسی نہ کسی شکل میں کارفرما نظر آئیگا۔ شاید ہی دُنیا کی کوئی شے ایسی ہو جس میں آگ کا عنصر موجود نہ ہو۔ حتیٰ کہ پانی بھی جو آگ سے ایک بالکل متضاد شے کا نام ہے آگ کی گرمی سے بے نیاز نہیں ہے۔ کیونکہ وہ دو گیسیں جن کے ملنے سے پانی بنتا ہے۔ آگ یا تپش کے بغیر تیار نہیں ہوتیں۔

اگر انسان نے عرصۂ دراز تک آگ معلوم نہیں کی تو تعجب کی بات نہیں۔ تاہم اس کی گرمی کو مختلف حالتوں میں اس نے ضرور محسوس کیا اور ساتھ ہی اُس کے فوائد و نقصانات پر غور کیا ہوگا۔ غالباً سب سے پہلے جاڑے کے موسم میں سورج کی شعاعیں اسے بھلی معلوم ہوئی ہونگی۔ اس نے کھلے میدانوں میں بیٹھ کر ان کا لُطف اُٹھایا ہوگا۔ اس کے برخلاف گرمیوں کے موسم میں انہیں شعاعوں سے بچنے کے لئے اُس نے غاروں یا درختوں کے سایوں میں پناہ لی ہوگی۔ پھر اُس کا جی چاہا ہوگا کہ کسی طرح ان پر قبضہ حاصل کر کے انہیں اپنی مرضی کے مطابق کام میں لایا جائے۔ تاکہ جاڑے میں رات کی سردی سے بچنا اور گرمی میں دن کی دھوپ سے محفوظ رہنا بھی ممکن ہو جائے۔ لیکن دوسری مادی چیزوں کی طرح دھوپ کو یا کچھ دیر تک باقی رہ جانے والی تپش کو قابو میں کر لینا آسان کام نہیں تھا۔ چنانچہ اس وقت اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔

انسان کی فطرت ہے کہ وہ ہر سمجھ میں نہ آنے والی چیز کو یا جس سے کوئی نقصان، تکلیف یا دُکھ پہونچتا ہو پرستش کی نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ چنانچہ سورج کی پوجا ہونے لگی۔ اور اسے ایک دیوتا مان لیا گیا۔ پھر اُس نے برسات کے موسم میں آسمان سے بجلی کو گرتے ہوئے دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ وہ درختوں وغیرہ کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ اس میں نہ صرف سورج کی کرنوں سے زیادہ گرمی ہے بلکہ نقصان پہونچانے اور تباہ و برباد کرنے میں بھی زیادہ خطرناک ہے۔ لہذا اس کی پوجا بھی ہونے لگی۔ تاہم آگ برسانے والے پہاڑوں کو سب سے بڑا دیوتا سمجھا گیا۔ کیونکہ ان کے اندر سے بہنے والا لاوا سب سے زیادہ خطرناک اور تباہ کُن تھا۔ چنانچہ ان تینوں دیوتاؤں یعنی سورج، بجلی اور آتش فشاں پہاڑ کا وجود اس کے لئے غور طلب مسئلہ بن گیا۔ ابتدا میں قدرت کے وہ حادثے انسان کے لئے حیرت و استعجاب کا مقام بنے رہے جن میں کسی قدر خوف بھی شامل تھا لیکن رفتہ رفتہ ان سے مانوس ہو کر بے باکیاں یہاں تک بڑھ گئیں۔ کہ اُن سے نکلنے والے شعلوں کو محفوظ

رکھنے کا خیال دل میں پیدا ہو گیا۔ سوچتے سوچتے وہ اس نتیجہ پر پہونچا کہ آئندہ آسمان سے گرنے والی بلائے ناگہانی جب درختوں وغیرہ کو جلائے تو اس ڈھیر میں سے چنگاریاں لیکر سوکھے پتوں، جھاڑیوں اور لکڑی کے ٹکڑوں وغیرہ میں آگ لگادی جائے۔ اس طرح انسان نے آگ کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ جب وہ بجھنے لگی، تو اس میں اور لکڑیاں ڈال دی جاتیں۔ لیکن صرف جاڑے کی راتوں کے لئے تمام سال اُس الاؤ کو جلائے رکھنا دقت طلب تھا۔

اس وقت تک انسان سوائے سردی سے بچنے کے آگ کا کوئی دوسرا مصرف نہیں جانتا تھا۔ لیکن اتفاقیہ طور پر کھیتوں میں آگ لگ جانے کے بعد جب اسے معلوم ہوا کہ اناج نیم سوختہ ہو کر زیادہ مزیدار بن جاتا ہے۔ تو آگ کی قدر بڑھ گئی۔ پھر اسی طرح وہ گوشت کے پارچہ کو بھی بھون کر کھانے لگا۔ اب دہکتے ہوئے انگارے سب سے بڑے دیوتا تھے۔ آتشکدے تعمیر ہوتے۔ اور آتش پرستوں کا مذہب وجود میں آگیا جو آج بھی دنیا میں اسی خوش اعتقادی کے ساتھ برقرار ہے۔ یہ رواج مصر، یونان، اطالیہ، اور ایران وغیرہ میں عام ہو گیا۔ ایسے مشترکہ مقامات قائم کئے گئے جہاں سے ہر شخص بلا روک ٹوک اپنی ضروریات کے لئے آگ لے جاسکتا تھا۔ روم میں بن گھٹوں کے قریب ہی آگ گھر بھی ہوتے تھے تاکہ زندگی کی دوسری سب سے بڑی ضروریات آسانی سے حاصل کر سکیں۔ اگر اتفاق سے آتش خانوں میں آگ بجھ جاتی تو تمام سرکاری اور نجی کام بند ہو جاتے۔ لوگ دیوتاؤں کے سامنے بھینٹ چڑھاتے اور متحدہ طور پر کوشش کرتے کہ کسی طرح بہت جلد ان مُردہ چنگاریوں میں جان ڈال دی جائے۔ بعض کا عقیدہ تھا۔ کہ آگ کے بالکل نیست و نابود ہونے ہی انسانی زندگی کا بھی خاتمہ ہو جائیگا۔ روم میں ریگیا اور یونان میں ڈلفی آگ کے سب سے بڑے مرکز تھے۔ کیونکہ ان مقامات پر دوسرے دیوتاؤں کا بھی مسکن تھا۔

بعض قوموں نے خیال کیا کہ دوپہر کے بعد سورج کی گرمی کم ہونے لگتی ہے۔ لیکن رات کو دیوتا اس میں دوبارہ اتنی ہی حرارت بھر دیتے ہیں۔ اس لئے وہ سرد ہونے نہیں پاتا۔ اسی طرح آگ کی گرمی رفتہ رفتہ کم ہوتی رہتی ہے۔ اگر دیوتاؤں کو خوش نہ کیا گیا تو ضرور ایک نہ ایک دن تمام دہکتے ہوئے انگارے برف کے سرد ٹکڑوں کی مانند رہ جائیں گے۔ چنانچہ موسم گرما کے سب سے زیادہ طویل دن کو ایک زبردست تہوار منایا جاتا۔ اس موقع پر ہر شخص کا فرض ہوتا کہ تھوڑی بہت آگ عبادتگاہ میں بطور نذر پیش کرے۔ اور دیوتا کے سامنے جھک کر التجا کرے کہ آگ کی گرمی کبھی کم نہ ہو۔

یونانی اور رومی فوجیں سرحد کو عبور کر کے کسی دوسری جگہ جاتیں تو سب سے آگے گاڑی پر ایک بڑی انگیٹھی میں بہت سی آگ ہوتی۔ کیونکہ اس چیز کو فتح کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح جب لوگ اپنا مکان بدلتے تو اسباب وغیرہ سے پہلے نئے مکان میں انگیٹھی پہونچائی جاتی تاکہ خیر و برکت رہے۔ جنوبی افریقہ کے بعض قبائل میں قدیم زمانے سے اب تک دستور ہے کہ ہر نوجوان لڑکی کے سپرد ایک انگیٹھی ہوتی ہے جس میں آگ ہمیشہ روشن رکھنا اس کا فرض ہوتا ہے۔ اسی لئے خانہ داری کے سلسلے میں بڑی اہمیت کے ساتھ لڑکیوں کو آگ روشن رکھنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ شادی کے موقعوں پر جہیز کا دوسرا سامان ہو یا نہ ہو مگر دہکتے ہوئے انگاروں کی ایک انگیٹھی لازمی ہے جسکو خود دُلھن اپنی ماں کے گھر سے سسرال لے جاتی ہے۔ تاکہ اگلی پچھلی سب نحوستیں جل کر تمام ہو جائیں۔

آگ کی ابتدائی تحقیق کے متعلق بعض قوموں میں عجیب و غریب روایات مشہور ہیں۔ دلچسپی کی غرض سے چند روایات بیان کرنی ضروری ہیں۔

جزیرہ ٹونگا کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ زمین کے بہت نیچے دوزخ ہے جہاں زبردست آگ ہر وقت جلتی رہتی ہے۔ ایک مرتبہ پہاڑوں کا دیوتا سیر کے لئے دوزخ میں گیا۔ وہاں اُس نے آگ جلانے کا راز معلوم کر لیا۔ اس کے بعد سے وہ خود کبھی کبھی لطف حاصل کرنے کے لئے ان طریقوں پر عمل کرتا ہے۔ اس وقت پہاڑوں کی چوٹیوں پر آگ کے شعلے نکلنے لگتے ہیں۔

نیوزی لینڈ کے باشندوں کا عقیدہ ہے کہ بربادی کی ایک دیوی نے ہاتھ کے انگوٹھے میں سے ایک چنگاری نکال کر اپنے پوتے کو دی کہ اسے دُنیا میں تباہی کی غرض سے ڈال دے۔ پوتے نے زیادہ تیز آگ طلب کی۔ تاکہ اثر اچھا ہو۔ چنانچہ دیوی نے پاؤں کے انگوٹھے میں سے ایک چنگاری نکال دی۔ مگر اُس کی تپش اتنی زیادہ تھی کہ خود اُس کا پوتا جلنے لگا۔ اچانک بارش کا طوفان آگیا جس سے چنگاری کسیقدر بجھ گئی۔ اور اُس نے ڈر کر اسے ایک درخت کی جڑ میں رکھدیا۔ یہی وجہ ہے کہ لکڑی میں جل جانے کی خاصیت پیدا ہوگئی ہے۔

آسٹریلیا کے لوگوں کا خیال ہے کہ ایک دفعہ آسمان کے دیوتا نے سورج کی ایک کھڑکی کھولدی تھی جس میں سے کچھ چنگاریاں انہیں پر گر پڑیں۔ اس وقت سے آگ دُنیا میں موجود ہے۔

فردوسی نے شاہنامہ میں لکھا ہے کہ ایران کے زبردست پہلوان ہوشنگ نے ایک اژدہے کو مارنے کی غرض سے بہت بڑا پتھر اُس پر پھینکا۔ اژدھا اتفاق سے بچ کر بھاگ گیا۔ لیکن پتھر ایک چٹان سے ٹکرا گیا۔ اس رگڑ سے بہت بڑا شعلہ پیدا ہوا۔ اور دُنیا کے لوگ آگ جلانے کے راز سے واقف ہوگئے۔

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ جب حضرت آدم کو دُنیا میں بھیج دیا گیا۔ تو حضرت جبرئیل نے آکر انہیں روٹی پکانے کا طریقہ بتایا۔ اِسی سلسلے میں وہ دوزخ کی چند چنگاریاں لائے۔ جنکو پہلے سات مرتبہ سمندر کے پانی میں بجھا لیا تاکہ ان کی تپش کم ہوجائے ورنہ وہ اس قدر گرم تھیں کہ شاید تمام دُنیا تباہ ہوجاتی۔

فن لینڈ کی بعض نظموں سے آگ کی ابتدا کا حال معلوم ہوتا ہے، اُن کا خیال ہے کہ عذاب کا دیوتا ایک بار تلوار چلا رہا تھا۔ اتفاقاً وہ اُس کے پاؤں کے انگوٹھے سے ٹکرائی۔ اس ضرب سے ایک آتشیں بچہ اُس کے ناخن سے نکل پڑا۔ اُس نے وہ بچہ ہوا کی دوشیزہ بیٹی کو دیدیا تاکہ بطور انّا کے اس کی پرورش کرے۔ لیکن وہ جوان اور الھڑ تھی اُس نے کچھ زیادہ پروا نہ کی۔ ایک روز بچہ اُس کی گود سے نکل کر دُنیا کے سمندر میں جا پڑا۔ وہاں ایک بڑی مچھلی نے اُسے نگل لیا۔ یہی وجہ ہے کہ پانی میں رہنے کے باوجود مچھلی کی تاثیر گرم ہے۔ سورج کے بیٹے کو جب اس حادثے کا علم ہوا تو اُس نے جلدی سے آکر بچے کو مچھلی کے پیٹ سے نکال لیا۔ مگر وہ مرچکا تھا۔ اس کے مردہ جسم سے دُنیا کی آگ پیدا ہوئی۔

یونانی کہتے ہیں کہ دُنیا میں پرومی تھیوس نے اپنی مشعل کے ذریعہ آگ بھیجی۔ جو سورج دیوتا جوپیٹر کی رتھ میں مشعلچی کی خدمت انجام دیتا ہے۔

اِس ترقی یافتہ زمانے میں جبکہ آمد و رفت اور پیام رسانی کے ذرائع بہت وسیع ہیں۔ یہ معلوم کرکے حیرت ہوتی ہو کہ اس دُنیا میں ہزاروں انسان ایسے بھی آباد ہیں۔ جو آگ کے استعمال سے قطعی ناواقف ہیں۔ مہذب ممالک کی ہوا تک اُن کے پاس سے نہیں گذری۔ وہ عہدِ قدیم کے وحشی باشندوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں، اُن کی آبادی جنوبی امریکہ اور آسٹریلیا سے تھوڑے فاصلے پر چھوٹے

چھوٹے جزیروں میں ہے۔ سیاحوں کا بیان ہے کہ وہ لوگ آگ کے وجود سے بھی واقف نہیں ہیں۔ جب ان کے سامنے سگرٹ جلا کر پیا گیا تو وہ حیرت میں رہ گئے۔ وہ شعلے اور دھوئیں کی حقیقت سمجھنے سے قاصر تھے۔ ۱۸۳۵ء میں چارلس ولکی کا گذر جزیرہ بوٹیج میں ہوا تو ایک چیز بھی ایسی نظر نہ آئی جس سے آگ کے استعمال کا پتہ چلتا۔ ہسپانوی سیاح گوبین لکھتا ہے کہ جزیرہ لاجورڈائنا میں میرے ایک ساتھی نے مذاق کے طور پر ایک جھونپڑے میں آگ لگا دی لوگ آتشیں شعلوں کو کوئی مہیب جانور سمجھ کر پہلے تو بھاگے اور پھر لکڑیاں لیکر اُسے بھگانے کی غرض سے آگ میں کود پڑے۔ کوشش کرکے اُنہیں بچالیا گیا ورنہ ضرور ہلاک ہو جاتے۔ یہ لوگ اسقدر قدامت پسند ہیں کہ جب ان سے آگ استعمال کرنے کے لئے کہا گیا تو انھوں نے صاف انکار کر دیا کہ جو چیز ہمارے باپ دادا نے چھوئی تک نہ ہو وہ کس طرح مفید ہو سکتی ہے۔

آگ کی تحقیق سے انسان کو فائدے پہونچ رہے تھے۔ لیکن اسے پورا اطمینان نہیں تھا۔ ہر وقت کی یہ پابندی کہ انگاروں کو روشن رکھا جائے بڑا مشکل کام تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ضرورت کے لحاظ سے جب چاہے آگ جلائے اور جب چاہے بجھا دے۔ مانی ہوئی بات ہے کہ قدرت کا مشاہدہ انسان کے غور و فکر میں بہت مدد دیتا ہے۔ جب اس نے دیکھا کہ دھوپ میں سوکھے ہوئے بعض پتّے وغیرہ آپس میں رگڑ کھا کر جل اُٹھتے ہیں۔ تو اسے ایک زبردست راز معلوم ہو گیا۔ اُس نے خود پتوں کو رگڑنے کی کوشش کی۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ پتے چُور چُور ہو جاتے تھے۔ پھر اُس نے ایک لکڑی کے ٹکڑے کو دوسرے پر رگڑنا شروع کیا۔ کافی محنت کے بعد لکڑی گرم ہو کر جل اُٹھی۔ اس سلسلے میں جدّت سے بھی کام لیا گیا۔ برمے کی طرح لکڑی کے گاؤدم ٹکڑوں کو کمان کے ذریعے ایک دوسری کے سوراخ میں تیزی سے گھمایا جاتا۔ اس طرح شعلہ جلدی پیدا ہوتا۔ اور اتنا تیز کہ گھاس کی پتیوں کو آسانی سے جلا دیتا تھا۔

لارڈ ایوا بری کا خیال ہے کہ پتھر اور دھات کے زمانے میں جب وحشی لوگ شکار کے ہتھیاروں کی دھار بنانے کے لئے پتھر اور لوہے کو گھستے تو اس کے اندر سے شعلہ نکلتا ہوا دیکھ کر ان کا ذہن اس طرف منتقل ہوا ہوگا۔ اور شاید انھوں نے گھاس پھوس وغیرہ رکھکر اس شعلے سے آگ جلائی ہوگی۔ اس کے علاوہ چقماق کا استعمال تو تحقیق شدہ ہے۔ اس خاص پتھر میں سے شعلہ جلدی اور تیزی سے نکلتا ہے۔ آجکل بھی اس کے ٹکڑے سگرٹ لائیٹروں میں استعمال ہوتے ہیں۔ البتہ تمدّن کی ترقیوں کے ساتھ اس شعلے کے سامنے گھاس پھوس کی بجائے پٹرول میں بھیگی ہوئی بتی لگی رہتی ہے۔ جو فوراً جل جاتی ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم زمانے کے لوگوں نے بھی آگ کو برقرار رکھنے کے لئے تیل اور روغن وغیرہ استعمال کئے۔ آتشکدوں میں رات دن برابر چراغ جلتے تھے۔ اب بھی بعض جگہ یہ رواج عام ہے۔

اس کے بعد گندھک نے آگ جلانے میں بڑی مدد دی۔ ایلاسکا کے لوگ بلور کے دو ہموار ٹکڑوں پر بہت سی پسی ہوئی گندھک مل دیتے ہیں۔ پھر اُن ٹکڑوں کو آپس میں رگڑا جاتا۔ شعلہ پیدا ہو کر شیشہ پر اُس وقت تک قائم رہتا جب تک کہ گندھک اُس پر سے جاتی رہتی۔ اس عرصہ میں وہ بآسانی کسی چیز کو اس شعلے سے روشن کر لیتے۔ یہ طریقہ آسٹریلیا۔ تسمانیہ۔ جنوبی امریکہ اور دیگر ممالک میں رائج تھا۔ اور اب بھی بعض ملکوں میں اس کا رواج ہے۔

چین۔ نیوزی لینڈ اور بحر ہند کے اکثر جزیروں میں پھٹے ہوئے بانس سے آگ پیدا کی جاتی تھی۔ کیونکہ اس کی بیچ کی نالی میں دوسرا ٹکڑا اچھی طرح رگڑا جا سکتا ہے۔

قدیم زمانے میں قوسی شیشوں کے ذریعہ بھی سورج کی شعاعوں کو ایک جگہ مرکوز کرکے آگ جلائی جاتی تھی۔ چنانچہ ارسٹوفینز اور ارشمیدس کی کہانیوں میں اس کا ذکر آیا ہے۔

یہاں تک کہ ۱۸۰۵ء میں پیرس یونیورسٹی کے پروفیسر شانسل نے ایک نیا طریقہ معلوم کیا۔ ایک شیشی میں گندھک کا تیزاب کا مرکب ہوتا۔ اس میں ایسی سلائیوں کو غوطہ دیا جاتا جن کے سروں پر پٹاس اور کھانڈ سے تیار شدہ مسالہ لگا ہوتا تھا۔ سلائی تیزاب کے اثر سے جل اٹھتی اور فوراً آگ جلائی جاتی۔ لیکن اس میں یہ دقت تھی کہ اگر تیزاب ہاتھ وغیرہ پر لگ جاتا تو سخت تکلیف پہونچتی۔ اسی قسم کی بعض دیا سلائیوں میں فاسفورس بھی استعمال کیا جانے لگا۔ لیکن وہ طریقہ بھی خطرناک تھا۔ ۱۸۲۷ء میں انگلستان کے ایک سائنسداں جان واکر نے کسیقدر بہتر سلائیاں بنائیں۔ ان کے سرے فاسفورس، سلفیٹ، اینٹیمونی پٹاس اور گوند کے مرکب میں ڈبو کر خشک کرلئے جاتے تھے۔ سو دیا سلائی کو ایک خاص قسم کے کاغذ پر رگڑ کر آگ جلائی جاسکتی تھی۔ سو دیا سلائیوں کی ڈبیہ تقریباً ایک روپے میں فروخت ہوتی تھی۔ فاسفورس چند لحاظ سے صحت کے لئے بہت ہی مضر ہے۔ کارخانے کے اکثر لوگ بیمار ہوجاتے۔ استعمال کرنے والوں کو بھی اس کے دھوئیں سے نقصان پہونچتا تھا۔ لہذا کوششیں جاری رہیں۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۵ء میں سویڈن کے ایک شخص نے سیفٹی ماچیز تیار کیں۔ جن میں پھر کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ یہ دیا سلائیاں آجکل بھی رائج ہیں اور اپنے فوائد کے مقابلے میں بہت سستی ہیں۔ تھوڑے عرصہ سے آگ کی جگہ بجلی سے بھی کام لیا جارہا ہے۔ تاہم بعض ضرورتیں ایسی ہیں کہ ان میں دیا سلائی کے بغیر کام نہیں چلتا۔ ممکن ہو آیندہ زمانے میں دیا سلائی کا استعمال بالکل نہ رہے۔ اور ہر جگہ بجلی ہی کام آنے لگے۔

لوگ آگ پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے سرتوڑ کوششیں کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ آگ دنیا کے لئے تباہی کا باعث بھی بنی رہی۔ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ تمام ملکوں میں آتشزدگی کے ایسے ایسے حادثے گذرے ہیں۔ جن کے خیال ہی سے روح لرز جاتی ہے۔ ایسے واقعات ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ جن میں سے چند کا حال بیان کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

۷۹۸ء میں لندن میں ایسی آگ لگی جس سے تمام شہر بالکل تباہ ہوگیا۔ اسی طرح کئی بار آگ لگی۔ تقریباً پندرہ حادثے ایسے گذرے ہیں کہ ہر دفعہ ڈیڑھ کروڑ روپے کا نقصان ہوا۔ اور دس ہزار آدمی مرگئے۔ ۲ ستمبر ۱۶۶۶ء کو ایسی آگ لگی جو چار دن تک نہ بجھ سکی۔ ابتدا ایک چھوٹی گلی سے ہوئی اور چار سو چھتیس ایکڑ کے رقبے میں تمام شہر میں پھیل گئی۔ چار سو بازار۔ تیرہ ہزار دو سو مکانات۔ سینٹ پال کا بڑا گرجا۔ چھیاسی چھوٹی عبادت گاہیں۔ تمام سرکاری دفاتر، ہسپتال۔ کتبخانے اور شہر کے تین صدر دروازے نذرِ آتش ہوگئے۔

دارالسلطنت فرانس میں سب سے پہلی مرتبہ ۵۸۵ء میں آگ لگی۔ تمام شہر جل کر خاک ہوگیا۔ اسی طرح اور صدہا حادثے گذرے ہیں۔

۶۴ء میں اٹلی کے پایہ تخت روم میں شہنشاہ نیرو کے حکم سے آگ لگائی گئی۔ جو مسلسل آٹھ دن تک تباہی کا باعث بنی رہی۔ کروڑوں روپے کا نقصان ہوا۔ ہزاروں آدمی مرگئے۔

روس میں آگ کے ایسے حادثے بہت کم ہوتے ہیں۔ ۱۸۱۲ء میں جب نپولین بونا پارٹ نے چڑھائی کی تو ماسکو والوں نے

نوجوں کو بھگانے کے لئے شہر میں آگ لگادی۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ یہ طریقہ خود اُن کے لئے نقصان دہ رہے گا۔ پانچ دن تک آگ نہ بجھ سکی۔ تیس ہزار مکان جل کر تباہ ہو گئے۔ نقصان کا اندازہ تقریباً پچاس کروڑ لگایا گیا۔

۱۷۲۹ء میں قسطنطنیہ میں آگ لگی۔ بارہ ہزار مکان اور سات ہزار انسان بھینٹ چڑھے۔ پھر کچھ عرصے بعد ۱۷۵۰ء میں تین مرتبہ آگ لگی۔ ہر بار جان و مال کو بے قیاس نقصان پہونچا۔ غیر ملک کے باشندوں کو ترکی سے نکالنے کے لئے ۵ رجون ۱۸۷۰ء کو آگ لگائی گئی۔ تقریباً سات سو عمارتیں جل گئیں اور آٹھ کروڑ روپے کا نقصان ہوا۔

۱۸۷۱ء میں امریکہ کے شہر شکاگو میں ۸ سے ۱۰ اکتوبر تک آگ لگی رہی۔ دو ہزار ایک سو چوبیس ایکڑ کے رقبہ میں سترہ ہزار چار سو تیس عمارتیں جل کر تباہ ہوئیں۔ ڈھائی سو آدمی مرے۔ اور ساڑھے اٹھانوے ہزار خانماں برباد ہوئے۔ نقصان تقریباً ساٹھ کروڑ روپے کا ہوا۔

اب ذرا ہندوستان کی تاریخ کے ورق اُلٹیے۔ قدیم زمانے کو اور خاص طور پر لنکا کی آتش زدگی کو نظر انداز کر دیا جائے۔ تو مدراس میں ۱۸۰۳ء کی آگ بڑی ہولناک تھی۔ ہزاروں مکان جلے اور سینکڑوں آدمی مر گئے۔ اسی سال بمبئی میں بھی آگ لگی نقصان کا اندازہ ایک کروڑ روپیہ لگایا گیا۔ آجکل بھی ایسے واقعات کی اطلاع عام ہے اور ہمارے شہر دہلی میں تو شاذ و نادر ہی کوئی مہینہ ایسا گذرتا ہے جس میں آگ کے خوفناک حادثہ رونما نہ ہو۔

آگ کے ان ہولناک حادثوں نے انسان کی زندگی پر بہت گہرا اثر کیا۔ خود اس کا دل گرفتار محبت ہو کر ہر وقت آتشکدۂ نمرود بنا رہتا ہے۔ غنیمت ہے کہ شیفتہ نے محبت کے ثبوت میں صرف اتنا کہا ع

ایک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

لیکن بعض شاعروں نے غضب کیا ہے۔ وہ قرصِ خورشید کو عاشق کے آتش زدہ دل کا اترا ہوا چھابہ بتاتے ہیں آتش فشاں پہاڑ کی طرح اس میں سے شعلہ فشانی ہوتی ہے۔ حلوائی کی بھٹی کی طرح دھواں نکلتا ہے۔ دل اور جگر جل جل کر کباب بن جاتے ہیں۔ مگر معشوق کی سرد مہری دیکھیئے کہ وہ نمک چھڑک کر بھی انہیں نہیں کھاتا۔

فضل حق قریشی دہلوی

حزنِ انسان

(افلاطونی عشق پر ایک طنز)

جسم اور رُوح کے آہنگ سے محروم ہے تو،
خستۂ کشمکشِ فکر و عمل،
لذّت اندوزِ دلاویزیٔ موہوم ہے تو!
تجھ کو ہے میری طرح حسرتِ اظہارِ شباب
اور اظہار سے معذور بھی ہے،
گرچہ ہے رُوح تری راہروِ راہِ ثواب،
جسم نیکی کے خیالات سے منفور بھی ہے!
اہرمن دہر میں ارزاں بھی ہے موفور بھی ہے،
اور یزداں پہ ہے چھائی ہوئی سرمستیٔ خواب
اس قدر سادۂ و معصوم ہے تو،
پھر بھی نیکی ہی کئے جاتی ہے،
کہ دل و جسم کے آہنگ سے محروم ہے تو؟

آہ! عشاق کا ہنگامِ وصال
ہے یہی رُوح کی عظمت کیلئے زینۂ نور
منبعِ کیف و سرور
نارسا آج بھی ہے شوقِ پرستارِ جمیل

اور انساں ہے کہ ہے جادہ کشِ راہِ طویل!
(رُوحِ یونان پہ سلام!)
اِک زمستاں کی حسیں رات کا ہنگامِ تپاک
اُس کی لذّات سے آگاہ ہے کون!
عشق ہے اُسکے لئے نغمۂ خام،
جسکے رستے میں ہے حائل ابھی تقدیسِ جمال
جسم اور رُوح میں جسکے ابھی آہنگ نہیں!

جسم اور رُوح کے آہنگ سے محروم ہے تو،
ورنہ شب ہائے زمستاں ابھی بیکار نہیں،
اور نہ بے سود ہیں ایامِ بہار!
آہ انساں کہ ہے وہموں کا پرستار ابھی
رُوح بے چارے کو دھوکا سا دئے جاتی ہے
ذوقِ تقدیس پہ مجبور کئے جاتی ہے
رُوح ہے جسم پر اک بار اگر
جسم اور رُوح میں آہنگ نہ ہو
ٹوٹ جائیں گے کبھی تیرے مزامیر کے تار
مُسکرا دے کہ ہے تابندہ ابھی تیرا شباب
ہے یہی حضرتِ یزداں کے تمسخر کا جواب
کہ زمستاں کی کسی رات کو باہم مِل جائیں،
کہ دل و جسم کے آہنگ سے محروم ہے تو!

ن۔ م۔ راشد

اُردو میں اپنی طرز کا پہلا افسانہ۔

فورسڈ لینڈنگ
Forced Landing.

اُن دنوں کلب میں "نائٹ فلائنگ" (رات کی پرواز) شروع ہوگئی تھی رات کے کھانے کے بعد اکثر ممبر سگار مُنہ میں دبائے اور چوکوبیٹ کی ڈبیاں جیب میں ڈالے ایک پُراطمینان فراغت میں کلب آپہونچتے اور شب ماہتاب میں اگر پرواز نہ کرتے تو پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے، یا ایزی چیئر پر آسائش سے لیٹے چاندنی میں نہائے ہوئے زمین و آسمان کو ایک لذیذ خود فراموشی میں تکتے اور اپنی محویت یا لمبے لمبے وقفوں کی گفتگو سے صرف اس وقت چونکتے جب کسی رخصت ہوتے یا آتے ہوئے جہاز کا شور ایک خوش آئند طور پر ذرا دیر کے لئے سکوت میں خلل انداز ہوجاتا تھا۔

کھانے سے فراغت پانے کے بعد فلائنگ کلب جانے کے لئے میں کار میں سوار ہورہی تھی کہ بوڑھا ڈاکٹر گار اپنی سیاہ لمبی رات کی ٹوپی بغل میں دبائے باغ کی ایک روش سے نکلا اور مجھے رخصت کیلئے تیار دیکھکر بولا "کلب ؟"

مُسکرا کر میں نے کہا "ورنہ شوپنگ ؟"

ڈاکٹر نے تامل کے بعد کہا "سوچتا تھا ایک روز میں بھی تمہارے ساتھ اُڑنے چلوں"

میں بولی "اس مسئلے پر ابھی چند سال اور غور کرنے کی ضرورت ہے"

بوڑھے ڈاکٹر گار کو شاید اپنی توہین محسوس ہوئی اس لئے بولا "میں ان ہوائی کشتیوں کی سواری سے ڈرتا تو نہیں۔ مزید براں دس دس منٹ کو دو تین بار سوار بھی ہوچکا ہوں"

میں نے کہا "تاہم ابھی سواری سے پہلے سوچ بچار کرنے کے مرحلے سے آگے نہیں بڑھنے پائے"

ڈاکٹر کو مجبوراً کہنا پڑا "سوچ بچار کیا ہوتا۔ میں نے تو محض اس وجہ سے اپنی آرزو کا اظہار نہ کیا تھا کہ شاید تم مجھے ساتھ اُڑانے میں تامل کرو"

میں مُسکرا کر بولی "آپ غالباً اتنے وزنی تو نہیں کہ میرے ساتھ جہاز پر بیٹھیں، تو وہ زمین سے اُٹھ نہ سکے"

اپنے موٹر کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا "تو چلوں"

میں بولی "استدعا کیجے۔ دھمکی کے طور پر کیوں کہتے ہیں مگر یہ سمجھ لیجئے کہ میں آج رات کئی گھنٹے اُڑنا چاہتی ہوں۔ دیکھتے نہیں ہو کہ آج کی رات کتنی پیاری اور دل آویز ہے۔ مشرقی ممالک کی ایسی گرم اور حسین راتوں کی تو میں عاشق ہوں۔ انہیں نیند میں کھونا نہیں چاہتی۔ ایسی راتوں میں آدمی یا تو اپنے کتب خانے کی کھڑکی میں بیٹھکر افسانہ لکھے، شعر سوچے، یا پھر آسمان پر اُڑے۔ تو ـــ میں تو آج کئی گھنٹے اُڑتی رہونگی"

یہ سُنکر ڈاکٹر کا عزم متزلزل ہوگیا بولا "اچھا ؟"

میں بیزار ہوکر بولی "کوئی طبی رسالہ پڑھتے ہوئے سو رہیئے"

ڈاکٹر اپنی مردانگی کی ذلت برداشت نہ کرسکتا تھا جواب میں میرے ساتھ بیٹھ کر بولا "خواہ ساری رات اُڑو اس میں ڈر کی کیا بات ہوتی۔ آدمی جیسے وہاں

منٹ اُڑا دیجیے دس گھنٹے اُڑا ؟"

میں نے جواب میں موٹر کی بریک کھینچی اور موٹر چلانے کے لئے اُس کی چابی گھما دی۔

ایک منٹ بعد ڈاکٹر بولا " یہ رَوحی آدھی رات تک تو لوٹ آئیں گے نا ؟"

میں بولی " اب شرطیں کیسی ؟ "

ڈاکٹر بولا " نہیں نہیں شرط ورط کوئی نہیں یہ بات میں نے محض طبّی نقطۂ نظر سے کہی ہے۔ شب بیداری ہر حالت میں مُضر صحت ہے۔ خواہ وہ سنیما یا تھیٹر میں ہو خواہ ہوائی جہاز میں۔"

میں نے بے پروائی سے کار چلاتے چلاتے کہا " جب اُڑتے اُڑتے اُکتا گئے، آجائیں گے "

گار کہنے لگا " خیر اس کے لئے میں دلی شوق سے حاضر ہوں "

بچارے بوڑھے ڈاکٹر گار کو کیا پتہ تھا کہ اُن کے اس " دلی شوق " سے قضا و قدر کو کیا کیا انتقام لینا منظور ہے۔ اور اُن کی اس رات کی اس غیر معمولی دلیری سے کیا کیا خطرناک نتائج برآمد ہونے والے ہیں۔

(۳)

ڈاکٹر گار کو تو آپ جانتے ہی ہیں کہ بہت باتونی مگر بے حد پیارا بوڑھا ہے۔ اکثر ہم لوگوں کو ہمارے بچپن کی بے وقوفیاں اور شوخیاں یاد دلا کر محجوب کیا کرتا ہے۔ کبھی میری شرارتوں کا ذکر، کبھی ہارلی کا سر سلاخوں دار کھڑکی میں پھنس جانے کا تذکرہ، کبھی جسونتی کے نہر میں ڈوبنے کی کہانی، بھیا آیالی کے دیوار پر سے گرنے کا قصہ! انہیں قصوں کو سنتے سناتے اور قہقہے لگاتے ہم دونوں ایرو کلب پہنچے۔

دیکھا تو موسم کو اُڑنے کے بالکل قابل پایا۔ " ونڈ انڈی کیٹر " (ہوائی جھنڈے) ہوا میں آہستہ آہستہ پُرسکون انداز سے لہرا رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد میں نے اُسے اُڑنے کے لئے بلایا۔ وہ بڑے اشتیاق سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

چشم زدن میں ہم تاریک فضا میں اُٹھنے شروع ہوئے۔ اور ذرا سی دیر میں رات کی تیز رفتار چڑیوں کی طرح شہر پر سے گذر گئے۔

شہر کی عمارتیں مدھم روشنی میں چوکور سیاہ دھبوں کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ روشنیاں نور کے نقطوں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ بہت دور دریائے شون کسی سفید لمبے سانپ کی طرح تاریک درختوں کے درمیان بل کھاتے ہوئے سسک رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے ہم پرستان پر پرواز کر رہے ہیں۔

میں اپنے آپ کو بالکل پری محسوس کر رہی تھی۔ کیونکہ خنکی زیادہ نہ تھی اور میں نے کوئی موٹا وزنی کپڑا بھی نہ پہن رکھا تھا۔ ہلکے ہلکے کپڑے تھے اور پریوں کے روایتی لباس کی طرح ہیں! مگر میرے مقابلے میں، بوڑھا ڈاکٹر گار ایک پُرانا دیو معلوم ہو رہا تھا جو چپ چاپ اپنے وزنی لباس میں پیچھے کی سیٹ پر بیٹھا زمین کی طرف جھانک رہا تھا۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ کبھی کبھی ڈاکٹر کے ناک کی ناگوار آواز آجاتی تھی جو نسوار چڑھانے کے سلسلے میں نکلتی تھی (جس کی وہ بچپن سے عادی ہے) ورنہ سوائے ہوائی کشتی کے پروں کے جو بڑی تیزی اور تندی سے ہوا کو کاٹ رہے تھے اور کسی قسم کی آواز نہ تھی۔

بہت دیر ہم چپ رہے۔

رات کے سکوت میں ہمارا جہاز ہوا کو کاٹتا ہوا دَرانہ چلا جا رہا تھا۔ آہ وہ رات! ایشیا کی حسین ترین رات! شہر اور جنگل، گاؤں اور کھیت، شب ماہتاب کے دھندلکے میں مدہوش ناچتے ہوئے ہمارے عقب کی سمت جا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد اس سکوت سے اُکتا کر میں نے کہا " ڈاکٹر تم کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا بات ہی نہیں کرتے "

ڈاکٹر بولا "باتیں کرنے سے تمہارے چلانے میں خلل پڑے گا اس لئے چُپ ہوں"

میں نے ہنسکر کہا "میں کوئی ریاضی کا سوال تو حل نہیں کر رہی۔ اس کام کی عادی ہو چکی ہوں"

ڈاکٹر نے ذرا سے تامل کے بعد کہا "علاوہ ازیں میں ان ہوائی کشتیوں کے سفر کا زیادہ عادی بھی نہیں ہوں"

"تو یوں کہیے" میں نے کہا "تو ایسا کہیے نا کہ خوفزدہ بیٹھے ہیں آپ"

ڈاکٹر نے نسوار کی ڈبیہ پر چُٹکی بجاتے ہوئے کہا "خوفزدہ تو نہیں، مگر میرے خیال میں اب لَوٹ ہی چلنا مُناسب ہوگا"

میں ہنس پڑی جیسی کہ میری عادت ہے" اور ڈاکٹر اتم نے اپنی دلیری کا خوب ثبوت دیا۔ ابھی تو ہم کوئی سو ڈیڑھ سو میل سے زیادہ نہ آئے ہونگے"

ڈاکٹر نگار تردد سے بولا "ایں! سو ڈیڑھ سو میل روحی؟ تو یوں کہو سلطانیہ پہونچنے کا ارادہ ہے۔ آخر آج رات گھر بھی لوٹنا ہے یا نہیں؟"

میں بولی "کیوں نہیں، بالکل اتنی ہی دیر میں واپس جا پہونچیں گے جتنی دیر میں یہاں آئے ہیں"

میں بیفکری سے جہاز کو دریائے شون کے کنارے سیدھا لے جاتی رہی۔ ڈاکٹر تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی بات کرتا جس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ ہوتا کہ مجھے واپس لے چلنے پر آمادہ کرے۔ کبھی کہتا "آدھی رات تو ہو گئی ہوگی" کبھی کہتا "زیادہ دیر اُڑنا اعصاب کیلئے مُضر ہے" کبھی بولتا "ہم تو اُکتا گئے۔ پرندوں کی طرح اُڑتے پھرنا انسانوں کا کام نہیں" کبھی پوچھتا "کیوں روحی تھکی نہیں؟"

آخر میں نے بیزار ہو کر کہا "وہ مینار دیکھتے ہیں آپ؟ جی چاہتا ہے اُس تک ہو کر آجائیں"

بوڑھا ڈاکٹر نگار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا "کونسا؟ کون سا؟ اس ویرانے میں مینار کہاں سے آگیا؟"

میں نے کہا "حکومت سلطانیہ کی کسی عمارت کا مینار ہے"

نگار نے متعجب ہو کر کہا "تو کیا واقعی "سلطانیہ" آگیا؟ اُف! لوٹ چلو روحی۔ پاسپورٹ کے بغیر سلطانیہ میں اس مینار تک جانا نامناسب ہے"

میں نے کہا "میں نے تو اپنی آرزو کا اظہار کیا تھا، وہاں جا تو نہیں رہی"

نگار جُھنجھلا کر بولا "اب آخر بولنے میں تامل کیا ہے؟ بچہ مت بنو روحی، چلو واپس"

میں خاموش تھی! کیونکہ یکلخت مجھے انجن کے پُرزوں میں سے ایک نئی آواز آنے لگی تھی۔

نگار بےصبر ہو گیا۔ بیقرار لہجے میں پوچھا "روحی! اب کیا کر رہی ہو؟ آخر تمہارا مدعا کیا ہے؟"

کچھ تامل کے بعد میں نے کہا "ذرا ٹھیرئے۔ انجن میں کچھ خرابی معلوم ہوتی ہے"

بوڑھے ڈاکٹر نے اُچک کر میرے شانوں پر ہاتھ رکھدئے "انجن میں خرابی؟ کیا معنی اسکے؟"

میں خود کسی قدر پریشان تھی بولی "انجن کے پُرزوں کی ایک نئی آواز آپ کو سُنائی دے رہی ہے؟"

ڈاکٹر نگار نے ایک لمحہ کان آواز پر لگائے۔ پھر گھبرا کر بولا "نہیں۔ مگر کیا جہاز گرنے کو ہے؟"

میں بولی "نہیں نہیں۔ گرتا کیوں۔ لیکن شاید تمہیں یہاں فورسڈ لینڈنگ کرنا پڑے" (مجبوراً اُترنا پڑے)

"فورسڈ لینڈنگ!" نگار کے مُنہ سے چیخ نُما آواز میں نکلا "اوخُدا! یعنی جہاز بگڑ گیا! نیچے گرے گا! روحی! یہ کیا مصیبت آئی۔ یارب! ہم پر رحم کر، ہم نیچے کہاں اُتریں گے؟ اس ہاتھ تو دریا ہے۔ جہاز کو پرے رکھنا میری روحی۔ پرے کو۔ احتیاط سے اُتارنا۔ آہستہ آہستہ۔ زور سے زمین پر گرا تو ہڈی پسلی چکنا چُور ہو جائے گی"

میں نے پریشان ہو کر کہا "او ڈاکٹر ـــــ آپ کی گھبراہٹ اور ہدایتوں نے تو مجھے حواس باختہ کر دیا۔ موت آئی تو آپ تنہا تو اس دُنیا سے سفر نہ کریں گے اُترنے کو وہ سامنے کا کھیت کیسا ہے؟"

ڈاکٹر مضطرب ہو کر بولا "کھیت نہیں، کھیت نہیں۔ اُونچی نیچی جگہ ہوگی" پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر چلّایا "وہ دیکھو، جدھر دریائے شون کا پُل ہے، اُسکے پار ایک میدان نظر آتا ہے۔ وہاں اُتر پڑو"

میں بولی "مگر وہ تو حکومت سلطانیہ کا علاقہ ہے۔ وہاں اُترنے کے لئے وہاں کا پاسپورٹ ہونا ضروری ہے، بہرحال باتوں کا وقت نہیں ہے"

کئی دفعہ مجھے بعض پتھریلی وادیوں کے سُنسان صحراؤں میں فورسڈ لینڈنگ کرنی پڑی تھی۔ مگر اُس رات ڈاکٹر گار کی موجودگی اور رات کی تاریکی نے واقعی مجھے بھی پریشان کر دیا تھا۔

اُترنے کو کوئی مناسب جگہ نظر نہ آتی تھی۔ اے اللہ ـــــ! وہ لمحے! وہ خوفناک لمحے! فضا میں معلق ہونا! ـــــ نہ زمین پر جگہ، نہ آسمان پر مقام! زندگی بچانا بہرحال فرض تھا۔

میں نے کہا "سوائے سرحد سلطانیہ کے کوئی قابل اطمینان جگہ مجھے نظر نہیں آتی۔ کیونکہ اندھیرا بہت ہے۔ اور نظر کام نہیں کرتی ـــــ مجبوراً جرم کرنا پڑے گا۔ سلطانیہ ہی سہی ـــــ انجن بگڑ چکا ہے۔ اب ہم اُتر رہے ہیں"

گار نے بے اختیارانہ چلّا کر "نیچے!" کہا اور منہ ہی منہ میں نہایت تیزی سے دُعائیں پڑھنے لگا۔ اس کے ہونٹوں کی پھڑپھڑاہٹ اب تک آنکھوں میں ہے۔

میں نے اپنی ہوائی عینک کچھ ڈھیلی کر دی۔ یکایک انجن کی آواز بند ہو گئی۔ اور جہاز جانکنی کی حالت میں سرحد سلطانیہ میں مجبوراً اُترنے لگا، بلکہ زمین پر پھینکا جانے لگا۔ میں پوری توجہ اور کوشش سے اس کا توازن قائم رکھ رہی تھی۔

ڈاکٹر گار آنکھوں پر ہاتھ رکھے کانوں کو رومال سے دبائے ایک نیم بیہوشی کی سی کیفیت میں بیٹھا تھا۔

(۳)

نیچے اُتر کر دیکھتے ہیں تو ایک صحرائی میدان ہے جس میں ایک طرف کچھ فاصلے پر تھوڑی بلندی کے بہت سے ٹیلے ہیں۔ اور جس طرف ٹیلے نہیں اُدھر بہت دُور درختوں کی سیاہ قطاریں چودھویں کے آسمان کے کنارے کو خواب ناک بنا رہی ہیں۔

مجھ جیسی خواب اور افسانے کی شیدائی عورت کے لئے یہ سہانا وقت، یہ جادو بھرا سکوت، اور یہ چاند کی زرد روشنی پاگل بنانے کو کافی تھی۔ مگر اُس وقت شاعرانہ احساسات اور رومانوی تخیلات سے لُطف اندوز ہونے کا کسے ہوش تھا؟ ـ ع "ہمیں زمیں کی پُشت کا بوجھ ہوں میں فلک کے دل کا غبار ہوں" کے مصداق ہم دونوں پریشانی کے عالم میں کھوئے ہوئے کھڑے تھے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف تکتے تھے کہ شاید کسی جگہ روشنی کا کوئی دھبہ، یا آبادی کا کوئی سُراغ نظر آ جائے۔ لیکن نظر جہاں تک کام کرتی تھی، تمام منظر چاندنی کی نیند میں آسودہ نظر آ رہا تھا۔ اس رات، دُنیا کفن میں لپٹی ہوئی پُرانی لاش کی طرح چُپ چاپ کھڑی تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں اور کہاں جائیں!

ایسے موقعوں پر جہاز رانوں کی تمام اُمید ٹیلیگراف آفس یا ٹیلی فون سے وابستہ ہوتی ہے کہ کلب میں اطلاع دے کر کسی کو وہاں سے امداد کے لئے بُلا لیا جائے۔ لیکن اس ویرانے میں جہاں آس پاس آبادی تک کا سُراغ نہ تھا یہ توقع فضول تھی کہ کہیں ٹیلیگراف آفس یا ٹیلیفون بھی موجود ہو۔ ہمیں تو یہ بھی علم نہ تھا کہ یہ ملک عہدِ جدید کی ان برکات سے آشنا بھی ہو چکا تھا یا نہیں۔

ذرا دیر بعد ڈاکٹر کی بوڑھی آواز سنائی دی: "اب؟"

ڈاکٹر گار کی پریشانی اور بے بسی دیکھکر باوجود تردد کے مجھے گدگدی سی محسوس ہوئی۔ میں ہنستی ہوئی بولی: "جیسا ارشاد ہو"

ڈاکٹر جل گیا: "توبہ ذرّمی۔ تمہیں بھی کیسے واہیات موقعوں پر ہنسی آتی ہے۔ نہ کچھ سوچتی ہو نہ کچھ کرتی ہو۔ ہنستی ہو اور مجھ سے پوچھتی ہو جیسا ارشاد"

میں بولی: "پھر اور کیا کہوں؟ مجھے کوئی ایسا عمل تو یاد نہیں جس سے جہاز اسی وقت اُڑنے کے قابل ہو جائے۔ دن کی روشنی میں اس کے پُرزوں کو دیکھ سکو گے۔ اس وقت اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ رات یہیں کہیں بسر کی جائے۔ کوئی ٹھکانہ تلاش کرنے میں میری نظر اور عقل آپ سے زیادہ کام نہیں کرسکتی ——"

بوڑھا ڈاکٹر گار غالباً مجھے زیادہ متردد اور فکرمند دیکھنا چاہتا تھا اس لئے بولا: "اور اگر بغیر پاسپورٹ یہاں آنے پر پکڑے گئے تو پھر؟"

میں بولی: "کم از کم رات بسر کرنے کے لئے کوئی جگہ تو مل جائے گی"

ڈاکٹر اس جواب سے اس قدر جل گیا کہ غصّے کے مارے کچھ نہ بولا۔ منہ ایک طرف موڑ لیا اور ذرا دیر کے پس و پیش کے بعد چُپ چاپ سیدھا ایک طرف چل کھڑا ہوا۔

میں لپک کر اس کے قریب پہونچی اور اس کا بازو پکڑ کر بولی: "کہاں جاتے ہو ڈاکٹر؟"

ڈاکٹر نے کچھ جواب نہ دیا۔

میں نے کہا: "اِدھر تو اُفق تک میدان صاف نظر آرہا ہے، ان ٹیلوں کی طرف تشریف لے چلئے۔ ممکن ہے ان کے اوپر یا ان کی آڑ میں کوئی بستی یا گھر نظر آجائے"

ڈاکٹر غصّے میں تھا۔ میری تجویز پر عمل کرنے میں کسرِ شان معلوم ہوئی۔ جوش میں کچھ دُور خاموش چلا گیا۔ مجبوراً میں بھی ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ اس کی وہ چال یاد آتی ہے تو کبھی کبھی آج بھی ہنسی آجاتی ہے۔ نیولے کی طرح تیز! اور میں گلہری کی طرح پُھدکتی ہوئی اُس کے پیچھے! تھوڑی دُور چل کر میری تجویز کی معقولیت آپ پر واضح ہونے لگی۔ بولے: "گھر ٹیلوں کی آڑ میں کون بناتا ہے۔ گھر ٹیلوں کے اُوپر بنائے جاتے ہیں"

میں نے کہا: "کیا ضروری ہے کہ یہاں کے وحشی آپ کی طرح جدید طبّی اُصولوں کے ماہر ہوں"

میرے اس فقرے میں کہیں ڈاکٹر کی تعریف کا پہلو نکلتا تھا۔ غصّہ کسی قدر فرو ہو گیا۔ مُڑ کر بولے: "کس طرف چلنے کو کہتی ہو؟"

"اُدھر" میں نے سنجیدہ صورت بنا کر کہا۔

ہم ٹھوکریں کھاتے ٹیلے کے اُوپر چڑھنے لگے۔ اُوپر پہونچتے پہونچتے دم پُھول گیا۔ ڈاکٹر غریب تو کھڑا ہانپ رہا تھا۔ حواس بجا ہوئے تو ہم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس نئے منظر کو دیکھنے لگے، جو اَب آنکھوں کے سامنے تھا۔ یکلخت میرے مُنہ سے نکلا: "وہ دیکھو وہ"

ڈاکٹر نے "کہاں کہاں؟" کہکر سر میری طرف جُھکا دیا کہ جس چیز کو میں دیکھ رہی تھی اُسے وہ خود میری جگہ سے دیکھ سکے۔ کچھ فاصلے پر مدھم روشنی کی ایک لکیر رہ رہ کر اُبھرتی نظر آرہی تھی۔

میں بولی: "وہ روشنی بہت دُور تو معلوم نہیں ہوتی"

ڈاکٹر نے کہا: "مجھے تو نظر بھی نہیں آرہی"

آخر ہم دونوں اس روشنی کی سمت چل کھڑے ہوئے۔ جیسے جیسے چلتے تھے یہ روشنی دُور ہی دور ہوتی چلی جارہی تھی۔ ایک دفعہ تو یہ خیال آیا کہ

کہیں غول بیاباں نہ ہو۔ میں اک بحت تھم گئی۔ اور ڈاکٹر کے بازو سے چمٹ گئی۔

"چلو بیٹی! غول بیاباں ہی سہی" ڈاکٹر نے جھنجھلا کر کہا۔

ہمیں کافی چلنا پڑا۔ جب کہیں ہم روشنی کے قریب پہونچے۔

(۴)

یہ ایک چھوٹا سا گاؤں معلوم ہوتا تھا جو روشنی ہماری رہنمائی کر رہی تھی وہ ایک خیمے کے دروازے میں سے نکل رہی تھی۔ باقی گھروں پر فرشتۂ خواب اپنے پر پھیلائے ہوئے تھا۔

خیمے کے قریب پہونچکر ہم رُک گئے۔

ڈاکٹر بولا "بیٹی کیا کریں! کیا کہہ کر آواز دیں"

میں نے کہا "کیا معلوم اس خیمے میں کون ہے؟"

ہم دونوں بغیر کچھ کہے دبے پاؤں خیمے کی طرف بڑھے۔ سر آگے کو بڑھا کر کان کسی آواز پر لگا رکھے تھے۔ مگر خیمے میں سے کوئی آواز نہ آ رہی تھی۔ وہاں تو موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ مجھے تو ہر وقت یہ ڈر لگا ہوا تھا کہ خیمے میں سے ان گرم مشرقی ممالک کا کوئی پرانا دیو نہ نکل آئے! اور نکل آتے ہی ہمیں نگل نہ جائے۔

کچھ دیر ہم پس و پیش کرتے رہے۔ پھر یہ رائے ہوئی کہ کسی سوراخ سے جھانک کر اندر کا جائزہ لیں کہ کیا ہو رہا ہے۔

"ایسا کرنا تو جرم ہے۔ بلا اجازت کسی کے خیمے میں جھانکنا!" ڈاکٹر نے کہا۔

میں بولی "ڈاکٹر اب آپ جرم ورم کرتے رہیں گے تو کچھ نہ ہوگا۔ اتنا بڑا جرم تو کر چکے ہو۔ بغیر پاسپورٹ کے یہاں آ گئے ہو"

سانس روک کر ہم نے آنکھ ایک دراز پر رکھی تو عجیب اُداس منظر دکھائی دیا۔ ایک چھوٹی سی گول میز کے گرد ادھیڑ عمر کی تین عورتیں لیس کی ٹوپیاں پہنے چُپ چاپ بیٹھی تھیں۔ اُن میں سے ایک انگلی کے پوروں پر انگوٹھا رکھ کر جیسے کچھ گن رہی تھی دوسری زمین کی طرف دیکھ کر آہیں بھر رہی تھی۔ اور تیسری آنسو بھری آنکھوں سے چُپ چاپ خیمے کی چھت کی طرف تک رہی تھی۔ ان سے کچھ فاصلے پر ایک خوشرو نوجوان گہرے رنگ کا سوٹ پہنے ایک صندوق پر غمگین انداز میں نیم دراز تھا۔ بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ نہایت اُداسی کے عالم میں گہری سانسیں لے رہا تھا۔

ان سب کی اس کیفیت کو دیکھ کر میں گھبرا سی گئی۔ ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ کر اُسے پرے لے گئی اور بولی "یہ تو جنّات کی بستی معلوم ہوتی ہے۔ میں ان شیطان کی پھوپیوں کے پاس نہ جاؤں گی"

ڈاکٹر بولا "شیطان کی پھوپیاں ہوں یا سالیاں، اب تو رات انہیں میں بسر کرنی ہوگی"

میں ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی رہ گئی مگر وہ نہ مانا۔ بولا "پر اب جائیں کہاں روحی! یہاں چند لوگ جاگ تو رہے ہیں۔ ان سے رات کے لئے پناہ مانگنے میں آخر مضائقہ کیا ہے؟"

یہ کہکر ڈاکٹر پہلے کھنکارا پھر بولا "کوئی ہے؟"

ڈاکٹر کی آواز کے پہونچتے ہی اندر ایک ہلچل مچ گئی۔ دبی ہوئی آوازیں اور سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔

اندر سے مرد بولا "کون؟"

ہم جواب نہ دینے پائے تھے کہ اُس نے خود آکر دروازے کا پردہ اُٹھا دیا اور بولا "آجائیے"

ہم نے مجبوراً قدم آگے کو بڑھا دیئے۔ میں بھی دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ڈاکٹر کے ہمراہ اندر چلی گئی۔ ہمارے استقبال کو تینوں عورتیں کھڑی ہوگئیں۔

غمگین نوجوان کی آنکھوں میں جیسے یکلخت مسرت کی روشنی چمک اٹھی۔ بولا "خوش آمدید! آپ یہاں اجنبی ہیں نا؟"

ڈاکٹر نگار بولا "جی ہاں، ہم دونوں ۔۔۔۔۔"

میں ڈاکٹر کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کا جواب سُنکر نوجوان نے سر اٹھاکر مجھے جھانکا پھر مسکراپڑا بولا "کوئی مضائقہ نہیں۔ میرے لئے یہی کافی ہے کہ آپ یہاں اجنبی ہیں۔ آپ عین وقت پر پہونچے ہیں"

یہ سُنکر میں ڈاکٹر کے اور قریب ہوگئی۔ ڈاکٹر حیرانی سے نوجوان کا مُنہ دیکھ کر بولا "عین وقت پر؟"

نوجوان بولا "جی ہاں۔ میں آپ ہی کی راہ دیکھ رہا تھا"

ڈاکٹر اور حیران ہو رہا تھا "ہمارا انتظار؟"

نوجوان بولا "جی ہاں آپ کا بالکل آپ کا" معلوم ہوتا تھا کہ نوجوان کی مسرت لحہ بہ لحہ بڑھتی جارہی تھی۔ میری طرف مخاطب ہوکر بولا "تشریف رکھئے خاتون"

میں کچھ نہ بولی۔ ڈاکٹر کے پیچھے سہمی ہوئی چپ چاپ کھڑی تھی۔ نوجوان میں دیکھتے ہی دیکھتے ایک جوش سا پیدا ہوگیا تھا۔ غمگین نظریں خوشی سے، اور مایوس انداز مستعدی اور اُمید سے بدل چکے تھے۔ اس کے اس تغیر پر ابھی ہم حیران ہو ہی رہے تھے کہ دفعتاً اُس نے سوال کیا۔

"یہ خاتون جو آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کی بیوی تو نہیں؟"

غصے سے میرا تنفس تیز ہوگیا۔ جی چاہتا تھا کہ ایک کرسی اٹھاکر نوجوان پر دے ماروں۔

نگار کا چہرہ بھی غصے سے سُرخ ہو رہا تھا مگر اُس نے وقت کی نزاکت کا خیال کر کے غصے کو بڑے تحمل سے ضبط کیا۔

"یہ میری بیٹی ہو سکتی ہے۔ بیوی کبھی نہیں ہوسکتی لیکن آخر اس سے آپ کا مطلب؟"

یہ سُنکر نوجوان نے فراغت کا ایک لمبا سانس لیا۔ مُسکراکر زمین کو دیکھا پھر میری طرف مخاطب ہوکر بولا "تشریف رکھئے خاتون"

ڈاکٹر نوجوان کو غور کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا "تو کیا آپ کو پہلے سے علم تھا کہ آج کی رات قسمت ہمیں یہاں لاگرائے گی؟"

نوجوان نے بڑھکر ایک کرسی میری طرف بڑھائی۔ بولا "یہ علم تو نہیں مگر آپ جانیے دُنیا بہ اُمید قائم"

ایک بڑھیا جو گلابی رنگ کے لباس میں ملبوس تھی بول اُٹھی "یوں کہیئے ہم دُلہنوں کی قسمت پھوٹ گئی!"

دوسری بوڑھی نے کہا "آپ لوگوں کو آج ہی مہمان بنکر آنا تھا؟"

نوجوان نے کہا "آج ہی کی رات تو ان کی ضرورت تھی۔ یہ لوگ تو خُدا کی طرف سے بھیجے گئے ہیں! ایسے اتفاق زندگی میں کم ہوتے ہیں۔ ایسے اتفاق تو اکثر قصے کہانیوں ہی میں پڑھتے تھے"

ڈاکٹر پریشان لہجے میں بولا "آپ لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا"

"سب کچھ سمجھ میں آجائے گا" نوجوان بدستور مسکرا رہا تھا۔ مجبوراً ڈاکٹر نے اس اُمید میں عورتوں کی طرف توجہ دی کہ شاید وہ کوئی معقول بات کریں۔

مگر ڈاکٹر کو اپنی طرف متوجہ دیکھکر ایک نے شرماکر نیچی نظر کرلی۔ دوسری لجاکر انگوٹھے سے دوسری اُنگلی کے ناخن ملنے لگی۔ تیسری نے گھبراکر بند مُنہ میں زبان کو گھمانا شروع کردیا۔

ڈاکٹر گار بکسی کے لہجے میں بولا "محترم خواتین! ہم دونوں پردیسی مسافر ہیں، رات بھر کے لئے پناہ مانگتے ہیں۔ آپ بجائے اسکے کہ ہمیں سونے کیلئے تھوڑی سی جگہ عنایت فرمائیں معنوں میں باتیں کہتے اور رہم سے پہیلیاں بجھونے لگیں"

عورتوں کو شروع ہی سے ہمارے آنے پر اعتراض تھا بظاہر وہ ہم سے کچھ جلی ہوئی تھیں چنانچہ میری نے چھوٹتے ہی کہا "آپ جیسے ناخواندہ مہمانوں کی تواضع کیسی؟"

مگر نوجوان بولا "جناب! سب انتظام ہو جائے گا۔ بے فکر رہیے۔ یہ نیازمند خود سب انتظام کرے گا۔ مگر ذرا میرا اطمینان تو ہو جائے"

ڈاکٹر بولا "کیسا اطمینان؟"

نوجوان نے قہقہہ لگا کر کہا "آپ تو گھبرا گئے۔ گھبرائیے نہیں۔ بڑا آسان کام ہے۔ اچھا بھلا میرے ایک سوال کا تو جواب دیجیے"

"حاضر ہوں سوال کیجیے" ڈاکٹر نے کہا۔

"آپ شادی شدہ ہیں یا غیر شادی شدہ"

ڈاکٹر نے سر جوڑ کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اپنی سہمی ہوئی نظریں اس سے ملائیں۔ ہم دونوں کے آنکھوں آنکھوں میں یک دوسرے سے کہا کہ دیوانوں کے ہاتھوں میں پھنس گئے۔

نوجوان ہمہ تن انتظار تھا مجبوراً ڈاکٹر بولا "صاحب میری بیوی کا انتقال ہو چکا ہے"

نوجوان کھلکھلا کر ہنس پڑا "انتقال ہو چکا ہے؟ سبحان اللہ، سبحان اللہ پھر تو نجات ہے مکمل نجات!"

ایک عورت نے تیز نظروں سے نوجوان کو دیکھا "دیکھو تم ظلم کرنے پر آمادہ نظر آتے ہو! اس کا نتیجہ خراب ہے"

بڑھیا کی اس بات پر ہم چونکے۔ مگر نوجوان نے کوئی پرواہ نہ کی۔ کہنے لگا "اچھا تو میرے مہربان! ایک بات اور۔ ان تین خواتین کے حُسن کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"

ڈاکٹر گار کا گلا خشک ہو رہا تھا غصے اور ہیبت سے اس کا چہرہ عجیب سا ہو گیا تھا اُس نے روکھائی سے کہا "ان خواتین کی موجودگی میں آپ کا یہ سوال نہایت بیہودہ ہے"

نوجوان بولا "تو آپ کا یہ مطلب ہے کہ یہ خواتین بدصورت ہیں؟"

ڈاکٹر نے بگڑ کر جواب دیا "میں نے ہرگز بدصورت نہیں کہا"

نوجوان ہنسی دبا کر بولا "تو گویا خوبصورت ہیں! واہ وا۔ واہ وا۔ واہ وا۔ اور انہوں نے سروں پر سفید لیس کی ٹوپیاں پہن رکھی ہیں یہ ان کے حُسن کو چار چاند لگا رہی ہیں یا نہیں؟"

ڈاکٹر کچھ نہ بولا۔ نوجوان اسکے قریب آگیا اور بولا "آپ کو میرے ہی قسم، اس سوال کا جواب آپ کو ضرور دینا ہوگا"

ڈاکٹر خون کا گھونٹ پی کر بولا "لگا رہی ہیں"

نوجوان نے بڑھ کر خوشی کے مارے ڈاکٹر کا منہ چوم لیا۔ اور ایک بیخودی کی سی کیفیت میں ناچنے لگا۔ اور بار بار کہتا "اجنبی! مناسب عمر، اشرف، حسن شناس۔ شگفتہ کا قدر داں۔ اللہ میاں تمہارا شکریہ کس طرح ادا کروں؟"

تینوں بوڑھیوں نے چلا کر کہا "تمہیں شرم نہیں آتی۔ اپنی ناموس کا خیال نہیں؟"

"ڈاکٹر نگار نے منہ ہی منہ میں کہا: عجیب مصیبت میں پھنسے! اس سے تو اچھا یہی تھا کہ جہاز کے سائے میں رات کاٹ دیتے۔ آخر یہ کیا تماشہ ہے؟"
میں نے ڈاکٹر کا بازو دبایا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے دبی زبان سے اُسے واپس بھاگ چلنے کے لئے کہا۔ چنانچہ ہم نے نوجوان کو ناچنے میں مصروف دیکھ کر چپ چاپ دروازے کا رُخ کیا۔

(۵)

جوں ہی ہم دروازے کی طرف چلے نوجوان ناچتے ناچتے رُک گیا۔ لپک کر ہماری طرف آیا بولا: "آپ چلے کہاں؟"
ڈاکٹر نے کہا: "ہم نے آپ کو بہت تکلیف دی۔ اب جاتے ہیں کہیں اور جگہ تلاش کریں گے۔"
نوجوان نے مسکرا کر کہا: "بس روٹھ گئے؟ —— توبہ کیجئے اب آپ جا کہاں سکتے ہیں؟ میں آپ کو سر آنکھوں پر جگہ دوں گا۔ حضرت آپ کی جگہ تو میرے دل میں ہے۔ ان تین حسین خواتین کے پہلو میں ہے۔ آپ کہئے تو۔"
ڈاکٹر بے حد غصے میں بولا: "معاف کیجئے۔ آپ پاگل معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیں جانے دیجئے۔"
نوجوان لپک کر خیمے کے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ اور اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر باہر جانے کا راستہ روک دیا۔ اور بولا: "بخدا میں آپ کو نہ جانے دوں گا۔ بس ایک کام ہونے تک آپ ٹھیرے رہئیے۔ پھر آپ کو اختیار ہے۔"
ڈاکٹر نے روکھائی سے پوچھا: "کیا کام؟"
نوجوان نے بڑی بے تکلفی سے جواب دیا: "نکاح۔"
ڈاکٹر نے حیران ہو کر پوچھا: "نکاح؟ کس کا؟"
نوجوان نے بڑے وثوق سے کہا: "جناب کا۔"
ڈاکٹر پاگلوں کی طرح ادھر اُدھر دیکھ کر جھنجھلا کر بولا: "آپ کیا بک رہے ہیں؟"
"بک نہیں رہا ہوں۔" نوجوان نے کہا: "سچ عرض کر رہا ہوں۔ آپ کا نکاح۔ ان تین حسین خواتین سے! اسی لئے تو میں اب تک آپ پر یہ ناگوار جبر کرتا رہا۔"
بڑھیوں کی عجیب حالت تھی۔ غصے سے پھلکی کی طرح ناک پھولی ہوئی تھی۔ تینوں میں جو بہت تیز تھی کہنے لگی: "یہ ظلم ہے تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"
نوجوان بولا: "نہیں وہی کرنا چاہتا ہوں جو تھوڑی دیر پہلے مجھ سے کیا گیا تھا۔"
دوسری بڑھیا بولی: "یہ کوئی زبردستی تھوڑا ہی ہے؟"
نوجوان بولا: "شادی بیاہ کے معاملات میں اس قسم کا انکار نہیں سُنا جاتا۔ یہی باتیں جب میں نے کی تھیں تو سب لوگ مجھ پر ہنس رہے تھے یا نہیں؟"
یہ سُنکر تینوں بڑھیاں غصے سے ہانپتی دوسرے خیمے میں چلی گئیں۔
ڈاکٹر نے انتہائی غصے سے کہا: "یہ سب کیا تماشہ ہے؟ ہم پاگل ہو گئے ہیں یا آپ لوگ جنونی ہیں؟ یا یہ کوئی لمبا خواب ہے؟ میرے کان کیا سُن رہے ہیں؟ اور میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں؟"
"وہی" نوجوان نے ہنسکر کہا: "وہی عجیب باتیں جو میں نے تھوڑی دیر پہلے سُنی تھیں، وہی عجیب منظر جو چند گھنٹوں پہلے میری آنکھوں نے دیکھا تھا۔ اب آپ سُن اور دیکھ رہے ہیں۔"

ڈاکٹر کہنے لگا: "اب ان باتوں کو رہنے دیجئے۔ جناب بدقسمتی سے ہمارا ایروپلین یہاں گر پڑا ہے۔ ہم عزت والے ہیں اور توقع رکھتے ہیں آپ ہم سے عزت کا برتاؤ کریں گے۔"

کچھ سوچکر نوجوان نے جلدی سے پوچھا: "آپ کا ایروپلین یہاں گرا ہے؟ — آپ یہاں کس غرض سے آئے تھے؟"

ڈاکٹر نے کہا "ہماری نیت ادھر آنے کی نہ تھی۔ ہم دریائے شیہون کے دوسرے کنارے پر اُڑنے نکلے تھے۔ اتفاق سے انجن بگڑا اور ادھر آ گرے۔"

نوجوان نے پوچھا "تو غالباً جناب کے پاس پاسپورٹ نہیں ہے"

ڈاکٹر نے میری طرف دیکھا۔ میں ویسی ہی چپ رہی۔ ڈاکٹر نے بھی کوئی جواب نہ دیا۔

"آپ کا ایروپلین ہے کہاں؟"

ڈاکٹر نے کچھ جواب نہ دیا۔ اشارے کے لئے ہاتھ اس طرف کو اٹھا دیا جس طرف سے ہم پیدل آئے تھے۔

نوجوان نے ایک اور سوال کیا "آپ کا جہاز چلا کون رہا تھا؟"

ڈاکٹر نے آہستہ سے میری طرف اشارہ کر دیا۔

"یہ خاتون؟" نوجوان نے اتنا کہا اور نہایت بےفکری سے قدم اٹھاتا لکڑی کے صندوق تک پہونچا اور اس پر اس انداز سے بیٹھ گیا گویا کوئی مطلق العنان حکمران ہے اور ہماری قسمت کا فیصلہ سنانے کو ہے

(۶)

نوجوان نے کہنا شروع کیا "میرے معزز مہمان! اب آپ کے لئے اسکے سوا چارہ نہیں کہ آپ شادی کر لیں۔ کیونکہ —"

ڈاکٹر کا رقوتِ ضبط کھو چکا تھا۔ چلا کر کہا "یہ پاگل آدمی! کیا واہیات رٹ لگا رکھی ہے۔ شادی! شادی! کس کی شادی۔ کیوں شادی! تم کون ہوتے ہو یہ لفظ منہ سے نکالنے والے؟"

نوجوان آدمی نے کہا "آپ کو بھولنا نہیں چاہیئے کہ آپ مجرم ہیں۔ آپ بغیر پاسپورٹ کے ایروپلین اس ملک میں لائے ہیں۔ حکام کو اس جرم کا علم ہو جائے تو آپ گرفتار کئے جا سکتے ہیں۔ اگر آپنے یہ جرم نہ کیا ہوتا تو شادی جب بھی آپ کو کرنی ہی پڑتی۔ اب آپ کی خاطر میں اتنی رعایت کر سکتا ہوں کہ آپ چپ چپاتے شادی پر رضامند ہو جائیں تو آپ کو قید وبند کی مصیبت سے بچا لوں"

ڈاکٹر جھنجھلا کر بولا "جائیے، آپ حکام کو خبر کر دیجئے۔ آپ سے نامعقول شخص سے واسطہ پڑنے سے یہ بہت بہتر ہے کہ ہم گرفتار کر لئے جائیں۔"

نوجوان نے ہلکی ہنسی کے بعد کہا "لیکن حکام بھی آپ کو اور کوئی سزا دیں یا نہ دیں آپ کی شادی ضرور کر دیں گے۔ ان خواتین سے نہ کریں گے تو ان کی سی چند اور خواتین آپ کیلئے منتخب کر لی جائیں گی۔"

ڈاکٹر نے غصے سے کہا "حکام آپ کی طرح دیوانے نہیں ہو سکتے۔"

نوجوان نے ہنسکر کہا "آپ کو غالباً علم نہیں کہ گذشتہ چند سالوں کی جنگ میں سلطانیہ کے بیشمار مرد میدان میں کام آئے۔ اور اُن کی تعداد بیحد گھٹ گئی ہے۔ بمقابلہ مردوں کے عورتوں کی تعداد بے حد زیادہ ہے۔ حکومت کے آگے یہ مسئلہ درپیش تھا کہ زائد عورتوں کا کیا کیا جائے اور ملک کی گھٹی ہوئی آبادی کیونکر بڑھائی جائے۔ اسکے سوا چارہ نظر نہ آیا کہ تعددِ ازدواج کا قانون پاس کر دے۔ آجکل سلطانیہ کے ہر گھر میں کئی کئی خواتین راج کر رہی ہیں۔ ہر مجرم اور ہر اجنبی کے لئے یہ حکم ہے کہ کم از کم تین عورتوں سے فوراً اس کی شادی کر دی جائے۔ حسنِ اتفاق سے آپ اجنبی بھی ہیں اور

مجرم بھی۔ چنانچہ آپ اپنے متعلق قانون کے اس فیصلے کو اٹل سمجھئے کہ آپ کو یہاں کی کم از کم تین خواتین کے شوہر بننے کا فخر حاصل ہوگا۔"

یہ سُنکر میں اور ڈاکٹر ششدر رہ گئے۔ اب ہم پر نوجوان کی بہکی بہکی باتوں کا راز بہت کچھ کھل چکا تھا۔ میں نے حالات پر غور کرکے آہستہ سے ڈاکٹر کے کان میں کہا "خیر ڈاکٹر شادی کرہی لو۔" میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

ڈاکٹر بُت بنا حالات سُن رہا تھا۔ "ستم ستم! بیٹی روحی! اب کیا کیا جائے! اخبارات میں حکومت سلطانیہ کے حالات پڑھنے تمہیں بھی یاد ہوں گے۔ یہ سب مصیبت کا سبب کوثر تی اگر میں نے جہاز میں بیٹھنے سے انکار کردیا ہوتا! اب عین وقت پر تم بھی بدل گئیں اور کہتی ہو کہ شادی کرلو۔"

نوجوان کہنے لگا "دور اندیش خاتون ہیں۔ اسکے سوا چارہ نہیں، آپ بُرے پھنسے۔"

ڈاکٹر نے چنگھاڑ کر کہا "میں کیوں پھنستا؟ یہ بھی کوئی زبردستی ہے؟"

نوجوان نے کہا "جی ہاں۔ بالکل زبردستی۔ اس میں رضامندی یا خوشی کا خفیف سا بھی دخل نہیں ہے۔ تھوڑی ہی مدت ہوئی یہی صورت حالات مجھے پیش آئی تھی۔ مجھے کیپاس کے ایک تاجر نے بھیجا تھا کہ سلطانیہ میں پٹرول پمپ لگانے کے متعلق حکومت سے معاملہ کروں۔ مجھے جدید قانون کا علم نہ تھا۔ یہاں پہونچتے ہی دھر لیا گیا۔ اور سرکاری طور پر میرے نکاح کی بات چیت ان تین حسین خواتین کے بزرگوں سے ہونے لگی جنہیں آپنے ابھی ابھی دیکھا ہے۔ میں نے بہتیری عرضیاں دیں! افسروں کی منتیں خوشامدیں کیں بہتیرا یقین دلایا کہ میں شریف اور معزز آدمی ہوں۔ اور اُن کا یہ سلوک میرے ساتھ نہایت واہیات ہے۔ لیکن کچھ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ قانون کے آگے کس کی چلتی ہے؟ اور پھر یہاں کے قانون کے آگے اجنبی کی بھلا کیا چلے؟ میرے لئے صرف اس قدر رعایت کی گئی کہ اگر میں دو ہفتے کی مدت میں اپنی بجائے کوئی اور مرد بہم پہونچا دوں تو مجھے یہاں سے تنہا رخصت کی اجازت مل جائے گی۔ میرے گذشتہ چودہ دن کیپاس کے لوگوں کو چٹھیاں لکھتے گذر گئے۔ رشتہ داروں دوستوں سے خوشامد کی کہ خدارا میری بجائے کوئی دوسرا شادی کا خواستگار یہاں روانہ کردو۔ مگر کسی خدا کے بندے کو میری حالت زار پر ترس نہ آیا۔ اجنبیوں کی تلاش میں پھرتے پھرتے میری جوتیاں گھس گئیں۔ لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ یہاں تک کہ آج کا اندیشناک دن آگیا۔ آج ہی میری تقدیر نکاح کے ذریعے ان خواتین سے وابستہ کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آج ہی میری مشکل کشائی کو آپ یہاں وارد ہوگئے۔"

یہ تفصیل معلوم کرکے ڈاکٹر کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ میں بھی کانپنے لگی۔ رہ رہ کر آنسو خشک کر رہی تھی۔

ڈاکٹر نے بیکسانہ انداز میں کہا "روحی اب کیا ہوگا؟ ــــ یہ سب تمہاری شرارت ہے۔ ناحق مجھے یہاں لا پھنسایا۔ دیکھئے اب ان مصیبتوں سے نجات کیونکر ملتی ہے۔ عین وقت پر تم بھی بدل گئیں۔"

میں بولی "ڈاکٹر پھر کیا کروں؟ میں نے بے حد مجبوری سے یہ صلاح دی تھی۔ میری تو بھی آرزو ہے کہ مالک تمہیں ان مصائب سے آزاد کردے۔"

نوجوان نے مترحم نگاہ سے دیکھکر کہا "غریب اجنبی! اور قابل رحم لڑکی! ــــ مجھے دلی افسوس ہے کہ میں انتہائی خودغرضی پر کمربستہ ہوگیا ہوں۔ لیکن معاف کیجئے صورت حالات ہی کچھ ایسی ہے۔ میں آپ سے زیادہ قابل رحم ہوں۔ آپ بہرحال بزرگ ہیں۔ میں نوجوان ہوں۔ زندگی میرے لئے ایک خوشرنگ شراب ہے۔ میں نے ابھی اس شراب کو چھوا بھی نہیں۔ آپ کا نشہ اُتر چکا ہے۔ چنانچہ میں اس بات کا زیادہ مستحق ہوں کہ اس سے جان چھڑا کر بھاگ نکلوں۔ میں ان خواتین کو آپ سے وابستہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں انہیں الگ کئے دیتا ہوں۔ اب آپ کے لئے اسکے

سو اکوئی چارہ نہیں کہ یا تو ان حور وش خواتین کو میرے ہاتھ سے قبول فرمائیے۔ اور یا قانون کے شکنجے میں پھنسکر علاوہ تین خواتین کے کچھ سزا بھی پائیے۔

ڈاکٹر غریب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

سپیدۂ سحر کے نمودار ہونے میں دو تین ہی گھنٹے باقی ہونگے کہ اس جنجال کا قطعی فیصلہ دن کی روشنی پر اٹھا رکھکر نوجوان نے ہمیں آرام کرنے کی دعوت دی۔ اس خیمے سے لگے ہوئے دو اور خیمے تھے جن میں پلنگ اور بستر موجود تھے۔ نوجوان نے بتایا کہ یہ تین خیمے اس کی دلہنوں کے بزرگوں نے اس کے لئے بہم پہونچائے ہیں۔

ایک خیمے میں تو دلہنیں جا چکی تھیں۔ دوسرا مجھے دیدیا گیا۔ لیکن ڈاکٹر گار کو فقروں سے الجھل کرنا مناسب نہ سمجھا گیا۔ اس لئے ڈاکٹر گار کو اسی خیمے میں نوجوان کے ساتھ رہنا پڑا جس میں یہ سب ڈراما ہوا تھا۔

نیند تو کسے آتی! مگر وحشت اور پریشانی نے اعصاب کو مضمحل اور کمزور کر دیا تھا کہ جوں ہی میں اپنے خیمے میں گئی لیٹ گئی۔ آخر کروٹیں بدلتے بدلتے آنکھ لگ ہی گئی۔

ابھی میں پوری طرح سوئی بھی نہیں تھی کہ یکلخت مجھے محسوس ہوا کسی نے میری چارپائی زور سے دھکیلی۔ چارپائی خیمے کی دیوار کے ساتھ ہی لگی ہوئی تھی۔ دھکیلنے والا ضرور باہر تھا۔

میں وحشت زدہ ہوگئی اور بستر سے کود کر باہر بھاگی۔ دیکھا تو نوجوان وہاں کھڑا تھا۔ اور انگلی ہونٹوں پر رکھکر مجھے چپ ہونے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میں بہت سخت ڈری ہوئی تھی۔

میرے قریب آکر آہستہ سے بولا "خوف نہ کیجئے۔ ادھر آئیے۔ یہ بتائیے آپکے ہوائی جہاز میں خرابی کیا ہوگئی ہے؟ کوئی معمولی سا نقص ہے یا بڑا نقص ـــــــ؟"

میں آہستہ سے بولی "چند گھنٹے ہوئے بالکل درست تھا۔ غالباً کسی ڈھیلے پرزے کو کسنے کی ضرورت ہوگی۔ آپ کے پاس کوئی ڈرن سکرو ہوگا"

نوجوان نے کہا "صبح نمودار ہو رہی ہے۔ کوئی معمولی سا کام ہے تو میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ اس وقت چپکی چلی چلئے۔ ورنہ بستی جاگ اٹھی تو طرح طرح کی الجھنیں پڑ جائیں گی"

نوجوان کا سنجیدہ اور متردد چہرہ دیکھکر مجھے مناسب معلوم ہوا کہ فوراً اسکی ہدایت پر عمل کیا جائے۔

بیساختگی میں میری زبان سے نکلا "ڈاکٹر؟"

نوجوان نے اسی سنجیدگی سے کہا "روتے روتے ابھی آنکھ لگی ہے۔ مجھے ان پر بیحد ترس آرہا ہے۔ خاتون ہیں۔ وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ پہلے جہاز کو ایک نظر دیکھ لیجئے۔ نجات کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ جہاز کو اڑنے کے قابل بنایا جائے"

میں بولی "یہ اچھا ترس ہے کہ ڈاکٹر کو یہاں تنہا چھوڑ دیا جائے۔ یہ مجھ سے ہرگز نہ ہوگا"

نوجوان نے بےچین ہو کر کہا "آپ دیر لگا رہی ہیں۔ ہم میں سے کسی ایک کا یہاں رہنا ضروری ہے۔ اگر خالی خیمے کسی نے بھی دیکھ لئے تو ذرا سی دیر میں یہاں ایک ہلچل مچ جائے گی۔ دوسروں کے اطمینان کے خیال سے فی الحال انہیں یہیں رہنے دیجے"

میں نے بگڑکر کہا "اور آپ کو جہاز میں واپس اڑا لے جاؤں؟"

نوجوان نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا "آپ وقت ضائع کر رہی ہیں۔ باتوں کا وقت نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر آپ نے چند منٹوں کی بھی دیر لگائی تو آپ کا بھی وہی حشر نہ ہو جو ہمارا ہوا ہے۔ مزید برآں جہاز درست ہو گیا تو ڈاکٹر کو ساتھ لے چلنا ہمارے لئے کچھ دشوار نہ ہوگا"

ہم دونوں جہاز کی طرف بھاگے۔

۸

پون گھنٹے کی دیکھ بھال اور مسلسل محنت کے بعد مجھے خیال ہوا کہ جہاز درست ہو گیا ہے لیکن جب تک اس کی آزمائش نہ کر لیتی کیا پتہ لگ سکتا تھا۔

چنانچہ میں پائلٹ کی سیٹ پر بیٹھ گئی اور نوجوان سے کہا "آپ براہِ کرم جہاز کے بلیڈ گھما دیں اور انجن کو رواں کر دیں۔ میں ذرا اپنا اطمینان کرنا چاہتی ہوں"

لیکن اُس نے ابھی بلیڈ گھمانے کے لئے ہاتھ اُٹھائے ہی تھے کہ ٹیلے کے اُوپر سے ڈاکٹر کی چیخیں سنائی دینے لگیں "روحی! روحی! مجھے اکیلا چھوڑ آئیں؟ مجھے بچاؤ۔ خدا کے لئے مجھے بچاؤ"

یہ کہتا ہوا وہ اندھا دھند ٹیلے سے ہماری طرف اُترنے لگا۔ کہیں پھسلتا کہیں ٹھوکریں کھاتا۔ لیکن پیچھے مُڑ کر دیکھتا اور پھر بھاگ کھڑا ہوتا تھا وہ پچاس گز بھی نہ بڑھنے پایا تھا کہ ٹیلے کے اُوپر تینوں دلہنیں مع چند مردوں کے نمودار ہوگئیں۔ وہ غُل مچا رہی تھیں۔ اور پیچھے مُڑ مُڑ کر یوں دیکھ رہی تھیں جیسے اور لوگوں کو امداد کے لئے پکار رہی ہیں۔

نوجوان چلایا "ہائے بھانڈا پھوٹ گیا! اب پکڑے گئے! ہم دونوں کا نکاح ایک ایک درجن عورتوں سے پڑھایا جائیگا"

وہ جلدی سے بلیڈ گھما کر جہاز میں سوار ہو گیا اور بولا "خاتون! جلدی کرو —— جہاز چل پڑا تو بچ گئے۔ ورنہ تقدیر!"

انجن کے بلیڈ پھرتے دیکھ کر ڈاکٹر کی بے قراری کا ٹھکانا نہ رہا۔ پاگلوں کی طرح بگٹٹ دوڑا۔

"روحی! مجھے چھوڑ کر نہ جانا —— چھوڑ کر نہ جانا"

پیچھے سے آوازیں آ رہی تھیں "پکڑنا —— پکڑنا۔ جانے نہ دینا۔

اور پتہ نہیں کیا کیا خوفناک جُملے تھے جو جہاز کے انجن کی آواز کے سبب سنائی نہ دیتے تھے۔ اب تعاقب کرنے والوں میں اور ڈاکٹر میں بیس گز کا فاصلہ نہ رہا تھا۔

میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

ایک طرف ڈاکٹر کی فکر، دوسری طرف انجن کا تردد کہ اگر جہاز اُڑ نہ سکا تو کیا ہوگا۔

ڈاکٹر بکلخت دھم سے آکر جہاز سے ٹکرایا اور فوراً بیہوش ہو گیا۔ نیچے گرا ہی چاہتا تھا کہ فوراً نوجوان نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور اُسے اُوپر کو گھسیٹا۔ میں دھڑکتے ہوئے دل سے ڈاکٹر کے یہاں پہونچنے کا انتظار کر رہی تھی۔ نوجوان کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ آنا تھا کہ میں نے جہاز کا انجن آدھا کھول دیا اور بریک آہستہ سے اپنی طرف کھینچ لی۔ نوجوان نے پوری طاقت سے کام لیکر لٹکتے ہوئے ڈاکٹر کو اندر کھینچ لیا۔ ساتھ ہی دعائیں مانگنے لگا کہ "خدایا جہاز اُڑنے لگے۔ خدایا جہاز اُڑنے لگے"

جہاز جگہ سے سرکا ہی تھا کہ تعاقب کرنے والے وہاں آ پہونچے۔ اور جہاز کے پیچھے بھاگنے لگے۔ پتھر اُٹھا کر اس پر پھینکنے لگے۔

میرا دل سینے میں اُڑا جا رہا تھا۔ ساری توجہ اس طرف لگی ہوئی تھی کہ جہاز اُڑنے میں کامیاب ہوتا ہے یا نہیں۔ نہ ہوا تو گیا ہوگا۔ میں نے پورا انجن کھول دیا۔ یکلخت جہاز نے صعود کیا۔ اور پھر چشم زدن میں بریک کے کھینچتے ہی فضا میں پرواز کرنے لگا۔ میرے اور نوجوان کے مُنہ سے ایک قہقہہ نکل گیا۔

(۹)

اب ڈاکٹر گار مندرجہ ذیل قسمیں کھا چکے ہیں:-

(۱) ہوائی جہاز میں کبھی سوار نہ ہوں گے۔

(۲) جہاں کہیں تین عورتیں یکجا نظر آئیں وہاں پل بھر کے لئے کبھی نہ ٹھیریں گے۔

(۳) کبھی کسی خیمے میں نہ جائیں گے!!!

حجاب امتیاز علی

تجلیات

ہم ہوش و بیخودی میں سموئے ہوئے سے ہیں
اس انجمن میں ہیں بھی تو کھوئے ہوئے سے ہیں

دامن ترا گواہ ہے خونِ شہید کا
کچھ داغ ہیں لہو کے جو دھوئے ہوئے سے ہیں

قلب و جگر کے پار ہوئی وہ نگاہِ ناز
اک تیر میں یہ دونوں پروئے ہوئے سے ہیں

رودادِ غم نہ پوچھ کہ ہم جوشِ اشک سے
دامن کو خونِ دل میں ڈبوئے ہوئے سے ہیں

موجِ خرامِ ناز سے بیدار ہوں تو ہوں
فتنے جو اُن کی راہ میں سوئے ہوئے سے ہیں

کچھ مایۂ سکوں تو ہے گریہ مرے لئے
اشکوں سے زخمِ دل مرے دھوئے ہوئے سے ہیں

تابش کہاں وہ حُسن و محبت کا امتیاز
میں اُن میں اور وہ مجھ میں سموئے ہوئے سے ہیں

تابش دہلوی

تاروں بھری رات

تاروں کے سوا فلک پہ کیا ہے ::: تابندہ انہیں سے یہ فضا ہے
پھیلاؤ انہیں کا عشرت آگیں ::: ترتیب انہیں کی خوشنما ہے
جس وضع کو دیکھیے نرالی ::: جس نقش کو جانچیے نیا ہے
ترصیع سے ہو رہا ہے دل خوش ::: تشبیہ ہر ایک جانفزا ہے

استادہ کہیں اسد کہیں ثور
جوزا کی حسین کمر کا یہ طور!

میں کاہکشاں کو دیکھتا ہوں ::: پروین و پرن سے آشنا ہوں
یہ طلعت و رفعتِ ثریا! ::: حیران ہیں اس پہ ہو چکا ہوں
قدرت کے کمال کا ہوں قائل ::: فطرت کے جمال پر فدا ہوں
مست ان کی جھلک بنا رہی ہے ::: خوش اُن کی چمک سے ہو رہا ہوں

بینش مجھے رہ دکھا رہی ہے
دانش مجھے کچھ جتا رہی ہے

تاروں کے یہ دلکشا نظارے ::: انداز یہ اُن کے پیارے پیارے
ہر ایک حرکت لطیف اُن کی ::: دلچسپ ہیں اُن کے سب اشارے

پانی میں سلگ رہے ہیں تیر اک یا ٹوٹتے جا رہے ہیں تارے
تارے نظر آ رہے ہیں یا پھول یہ پھول ہیں یا حسیں شرارے

معلوم نہیں حقیقت ان کی
تکتا ہوں میں پھر بھی صورت ان کی

دیکھو یہ عجیب سینری ہے زینت دہِ چرخِ چنبری ہے
کہتے ہیں جسے نظامِ شمسی یہ اُس کی ہی جلوہ گستری ہے
مرّیخ و عُطارد و زُحل میں زُہرہ ہے قمر ہے مشتری ہے
بالائے نظر ہیں آ کے دیکھیں میری تو نگاہ سرسری ہے

بڑھ جاؤں گا میں بس اتنا کہکر
دلکش ہے یہ نُور پاش منظر

میرا سببِ حیات کچھ اور تاروں کی ہے کائنات کچھ اور
کس رنگ میں ہیں وہ کس کو معلوم ہیں میرے تخیلات کچھ اور
خاص اُن کی ہے انجمن مگر ہیں سمجھا ہی نہیں نکات کچھ اور
بے ربط ہیں پستی و بلندی میں اور ہوں اُن کی بات کچھ اور

یاں رہ کے سناؤں کیا وہاں کی
نسبت ہے زمین و آسماں کی

علی منظور حیدر آبادی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فاؤسٹ

ابتدائیہ

تاریکی کے دروازے کھلے اور ابلیس نے اُن میں سے دُنیا پر نظر ڈالی۔ اُس کے سر پر سینگ تھے اور وہ بھیانک تھا۔ اور اُس نے دُنیا اور دُنیا کے سرمایہ آب پر اپنا ایک لمبا سانس چھوڑا۔ بنیِ آدم خوف سے اس کے آگے سرنگوں ہوئی۔ کیونکہ اس کا سانس عذاب تھا، موت اور تباہی تھا۔ اور اُس نے اپنے کارنامے کو دیکھا اور قہقہہ لگایا۔

اور پھر ایک زرد کی سرسراہٹ سُنائی دی اور خیرہ کُن چمک پیدا ہوگئی۔ اور لو! ایک سحاب منور پر ایک فرشتۂ نور کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھے سے خوف آتا تھا۔ اسکے دونوں ہاتھوں میں ایک دہکتی ہوئی تلوار تھی۔ اور تلوار پر ایک لفظ لکھا تھا ـــــ صدق ؎

اور فرشتۂ نور نے اپنے لب وا کئے اور اس طرح بولا جیسے بانسری بجتی ہو۔

"دُنیا کے باشندوں پر تو جنگ، طاعون اور قحط کا عذاب کیوں نازل کر رہا ہے؟"

او ابلیس نے جواب دیا "دنیا میری ہے"

یہ کہکر وہ ہنسا اور اُس کی ہنسی ایسی تھی جیسے پتیل ڈھالوں کے ٹکرانے سے جھنکار پیدا ہوتی ہے۔

اس کے بعد فرشتۂ نور پھر بولا "اس وقت تک دُنیا تیری کبھی نہیں ہو سکتی جب تک کہ انسان تلاشِ صدق ترک نہ کردے۔ نیکی اور بدی میں امتیاز کرنے کی قوت ہر انسان کو بخشی گئی ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ خدا کو فراموش کر بیٹھے اور تو دُنیا پر چھا جائے"

پھر ابلیس نے اُونچی آواز میں کہا "سب انسان بد ہوتے ہیں اور ہوا نفس کے غلام ہوتے ہیں"

فرشتۂ نور نے اُس کے جواب میں کہا "فاؤسٹ معلم کو دیکھ اور اس کی بات سُن!"

یہ کہکر اُس نے اپنی دہکتی تلوار کی ایک ضرب لگائی اور لو! اُن کی آنکھوں کے سامنے فاؤسٹ آگیا۔ جو بیٹھا دُنیا کے جوانوں کو عقل کی باتیں سکھا رہا تھا۔

پھر ابلیس چیخ کر بولا "فاؤسٹ بھی سب کی طرح بدکردار ہے۔ وہ اپنے لبوں سے نیکی کا درس دیتا ہے مگر اس کے ہاتھ بدی میں مشغول رہتے ہیں۔ اس کے دل میں مال و دولت کی ہوس ہے۔ اُسے پارس پتھر کی تلاش ہے جو ہر چیز کو سونا بنا دیتا ہے۔ میری سنو! میں قسم کھاتا ہوں کہ فاؤسٹ کی رُوح خدا سے چھین کر رہوں گا" یہ کہتے کہتے غرور سے اُس کا سر اُونچا ہوگیا، ایک ہاتھ آگے بڑھا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں خوفناک طور پر چمک رہی تھیں۔

پھر فرشتۂ نور نے اپنی تلوار کی ایک اور ضرب لگائی اور اس سے ایک تیز سفید روشنی کا بڑا سا شعلہ نکلا اور ابلیس نے اپنی آنکھیں چھپالیں۔ کیونکہ وہ اس شعلے کو دیکھنے کی تاب نہیں لاسکتا تھا۔

اور فرشتہ بولا "اس مقدس چنگاری کو جو فاؤسٹ میں چمکتی ہے اگر تو غارت کردے تو دُنیا تیری ہو جائے گی"

پھر ابلیس نے اپنا ایک ہاتھ اُوپر اُٹھایا جو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تاریکی کا ایک مینار ہے اور زور سے چیخ کر بولا "ابلیس کی تابِ مقاومت کوئی نہیں لاسکتا۔ اپنے قول پر قائم رہنا"

اور فرشتۂ نور رخصت ہوا اور اس کے جانے میں ایسی آواز پیدا ہوئی جیسے پیچ و تاب کھاتے پانی کی گڑگڑاہٹ، اور روشنی کی چمک اس کے ساتھ معدوم ہوئی۔ اور تاریکی کے دروازے پیتل کی سی جھنکار کے ساتھ بند ہوئے۔ اور دروازوں کی دوسری طرف سے شیاطین کے قہقہوں کی آواز گونجتی سُنائی دی۔

چمکی کی ایک جھلک

ناچ یا ڈرامہ

ایک روز کا ذکر ہے کہ دفتر سے آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ پلنگ پر سنہری اور روپہلی گوٹے کا ایک پھیلاوہ ہے۔ چھوٹی بی چمکی کے لئے جوڑا بنا رہی تھی وہ جو اُس نے چوروں کی فتح کے انعام میں بنانے کو کہا تھا! یہ جوڑا کیسا تھا؟ اتنا گوٹا ٹھپہ کہ سر سے پیر تک چمکی بیچ بیچ چمکی ہو جائے جوڑا دیکھتے ہی معلوم ہو جائے کہ پہننے والی کا نام چمکی ہے۔ واقعہ دراصل یوں ہو کہ یہ تو بہانہ تھا ورنہ مقصد اصل یہ تھا کہ ناچ گانے کے لئے کوئی ایسا جوڑا ہونا چاہیئے۔ گویا ویسے پہننے میں نہیں آئیگا۔ میں دیکھتے ہی سمجھ گیا۔ اور اسی دن رات کو چمکی کھانا لا رہی تھی۔ تب اس نے رازدارانہ لہجہ میں بتایا کہ یہ جوڑا کس لئے ہے اور یہ کہ پرسوں گانا بجانا زور سے ہوگا "اور تو سامنے ناچے گی" سر ہلا کر مسکرا کر اُس نے کہا۔ "ہاں" مجھکو یقین نہیں تھا کہ چھوٹی بی مجھے یہ تماشا دکھائیگی۔ اور واقعی چھوٹی بی کا بھی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن چھوٹی بی کی ایک سہیلی کے بھائی کی شادی تھی اور تجویز یہ تھی کہ چمکی کو زنانخانہ میں نچائیں۔ یہ اسی کی تیاریاں تھیں اور مجھ سے چھوٹی بی نے پوچھا تھا تو میں نے دبی زبان سے ہوں ہاں کرکے اس کی مخالفت کی تھی۔ خود سوچئے میں یہ کیسے گوارا کر لیتا کہ میری منکوحہ عورت پرائے جلسوں میں جا کر ناچے۔ میری مرضی خلاف پا کر چھوٹی بی نے یہ سوچا کہ مجھے راضی کرے۔ میرے عذرات لنگ یہ تھے کہ آخر چمکی کے ناچ میں کیا خصوصیت ہے اور یہ کہ وہ ایسی باتوں سے تنگ آ کر بھاگ جائیگی۔ ابھی اُسکو دن کے ہوئے ہیں۔ وہ جب گھر کے گھر میں گاتے ناچتے شرماتی ہے تو اسکو خواہ مخواہ دق کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اور آج جب رات کو پھر باتیں ہوئیں تو چھوٹی بی نے مجھے چمکی کے ناچ اور گانے کی خصوصیات بتائیں اور بتانے کا وعدہ کیا کہ میں خود دیکھ لونگا، یہ بھی ظاہر ہو جائیگا کہ وہ نہیں شرماتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہو جائیگا کہ وہ تو خود رضامند ہے۔ مگر میں ان شرعی حیلوں پر جما ہی رہا۔ اور بے اعتنائی کا اظہار کرتا رہا۔

سنیچر کا دن تھا اور چھوٹی بی نے بچوں کو جلدی سے کھانا کھلا کر سُلا دیا۔ اور جب بچے سو گئے تو چھوٹی بی نے ناچ کی تیاری کی۔ واضح رہے کہ میں اخلاقیات کا درس ہرگز نہیں دے رہا ہوں۔ مگر قبل اسکے کہ میں ناچ کا ذکر کروں کچھ اسکے بارے میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

مجھکو نہیں معلوم تھا کہ ناچ کسکو کہتے ہیں۔ اور آپکو بھی غالباً نہیں معلوم ہے۔ جی ہاں نہیں معلوم ہے۔ ایک تو وہ ناچ ہے جو برسوں کی محنت و مشقت کے بعد پیشہ ور عورتوں کو آتا ہے اور ایک اصلی اور قدرتی ناچ ہے۔ غیر فطری ناجائز اور حرام اور فطری اور قدرتی جائز۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ انجن اسٹیم سے چلتا ہے اور لوگ اسکو دھکیل کر بھی لے جاتے ہیں۔ یعنی اسٹیم کے جوش سے اور ہاتھوں کی قوت سے۔ دونوں طرح چلتا ہے بجنسہ یہی ناچ کا حال ہے۔ محبت کے زور سے اور روپیہ پیسہ کے زور سے۔ دونوں طرح دیکھئے۔ حرکت وہی ہے۔ پیشہ ور عورت پیسہ کے زور سے حسب فرمائش فراقیہ اور عشقیہ گیت گاتی ہے درحالیکہ اس نیک بخت کو نہ تو دُنیا میں سوائے پیسہ کے کسی سے عشق ہوتا ہے اور جہاں تک فراق کا سوال ہے اس لفظ کا مفہوم کو سمجھنے سے قاصر۔ مگر واہ رے مشق۔ اور واہ رے تصنع۔ اور واہ رے ہنر! جی نہیں چاہتا۔

عذر یہ عذر کر رہی ہے لیکن حاضرین جلسہ کے اصرار سے اسکو ہجر و فراق کے سین مع گانے اور ناچ کے دکھانا پڑتے ہیں مصنوعی طور پر وہ آواز بھی دردناک بنالیتی ہے چہرہ بھی غمگین بنالیتی ہے۔ جذبات کی بھی خوب نقل کرتی ہے۔ حرکات و سکنات بھی پیدا کرلیتی ہے اور حاضرین جلسہ خوب ہی تو داد دیتے ہیں۔ میں اسکو بغیر اسٹیم کا انجن کہا کرتا ہوں۔ اور مجھ ایسے بد مذاق کے لئے دراصل اس قسم کا گانا ایک کُتّے کے بھونکنے سے بعد تحقیقات بہتر ثابت ہوچکا ہے لیکن یہ مسئلہ ہنوز زیر بحث ہے کہ آیا خوشی کے موقعہ پر ناچ کی غرض سے حضرت اونٹ کی خدمات لطیف سے مستفیض ہونا بہتر ہوگا یا ایک پیشہ ور عورت۔ خیر اسکو تو ہم ایسے بد مذاقوں کے متعلق ایک جملہ معترضہ سے زیادہ اہمیت نہ دیجئے۔ میں اصل قصہ پر آتا ہوں۔ آیئے میں آپ کو ایک عجیب و غریب ڈرامہ دکھاؤں۔

چھوٹی بی نے ناچ گانے کی تیاری کی۔ سنگار والی میز جس کمرے میں تھی وہ بند کرلیا۔ میں باہر برآمدے میں بیٹھا ہنستا رہا۔ تھوڑی دیر بعد برابر والے کمرے کی طرف کا دروازہ جو کُھلتا معلوم ہوا تو اِدھر گیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ چھوٹی بی ایک بڑا سا آسمانی رنگ کا صافہ باندھے ہوئے! چوڑیاں وغیرہ اُتار دی تھیں! گنوار و فیشن کا گاڑھے کا نیم آستین اور اُسپر گاڑھے کی ایک گنوار و فیشن کی مردانہ دھوتی! دونوں کانوں میں بجائے بندوں کے بڑے بڑے پیتل کے مُندرے۔ سُرمہ سے نہایت ہی واہیات اور بھدّی مونچھیں بنی ہوئیں۔ مجھے دیکھتے ہی بھاگی جو ہنسکر تو میں نے جھپٹ کر پکڑلیا۔ اور اپنے "عالیجاہ" کو کلیجہ سے لگا کر...... مگر جھمکی نے دوڑ کر چُھڑا لیا "میرا عالیجاہ...."

لاحول ولا قوۃ۔ چھوٹی بی کا پگھڑا الگ گرا۔ ہم سب کا مارے ہنسی کے بُرا حال تھا۔ چھوٹی بی "عالیجاہ" بنی تھی جھمکی اپنے بھڑکیلے لباس میں تھی۔ اور اس کا ایک جوڑا اب میرے لئے حاضر تھا۔

"یہ کیا ہے" میں نے کہا جب چھوٹی بی کپڑے لیکر بڑھی۔

معلوم ہوا کہ خیر سے یہ لباس میرے لئے ہے۔ چھوٹی بی عالیجاہ ہیں۔ جھمکی اُس کی معشوقہ اور میں اس کی سوت! اِنّ للّٰہ و اِنّ الیہ راجعون۔

واللہ! عورتیں بھی کسقدر شریر اور پُرفسوں چیز ہیں چھوٹی بی کی نوجوان آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ یا میرے اللہ میرے کلیجہ میں اُس کے حُسن و جمال کی برچھیاں سی گُھسی جاتی تھیں۔ اسکے گورے گورے ہاتھ۔ ننگے پیر۔ دھوتی کا نیم برہنہ لباس چمکتی ہوئی پنڈلیاں بلور کی طرح چہرہ پر مسکراہٹ لوٹ رہی تھی اور میں کہہ رہا تھا "یہ کیا حماقت ہے"! مجھے جھمکی کا لہنگا پہنایا گیا۔ اوڑھنی اور شلوکہ اور پھر میرا یہ حلیہ دیکھکر چھوٹی بی اور جھمکی مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ گئیں۔ چھوٹی بی نے جھمکی کے چہرہ پر خوب پوڈر ملا۔ سُرخی لگائی۔ ایسی کہ پیچ مچ ناٹک کی پری بن گئی جھمکی کا بقدر زیور بھی میں نے پہن لیا۔ اب ہم تینوں گانے کے کمرے میں آئے۔

چھوٹی بی کو چنگ بجانا نہیں آتا تھا اور جھمکی گاؤں کی رہنے والی۔ چنگ خوب بجاتی ہتی بہیرا سے اُس نے چنگ منگایا تھا۔ مجھے خبر ہی نہ ہوئی۔ چھوٹی بی نے جھمکی کی طرف سے خط ڈالدیا تھا اور مجھے معلوم ہی نہ ہوا کب چنگ آیا۔

چھوٹی بی اور میں ایک جگہ پاس پاس بیٹھ گئے۔ میں نے ہارمونیم لیا۔ پاس چھوٹی بی عالیجاہ بن کر بیٹھی۔ جھمکی نے اپنا چنگ لیا اور پیروں میں گھنگرو باندھ کر زرق برق کپڑے پہنکر چنگ سے پیر کا تال سُر ملانا شروع کیا۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد اپنے دیہاتی گیت کی تان کھینچی۔ چھما چھم۔ گانا اور ناچ! ——— انتہا سے زیادہ بیہودہ! فحش اور لغو! مگر انتہا سے زیادہ عجیب و غریب گیت تھا۔ اُس کے فحش اور بیہودہ حصّہ کو چھوڑتا ہوں چنگ اور گھنگرو کے ساز پر اُسنے شروع کیا، گیت مجھکو یاد نہیں۔ جگہ جگہ

سے مفہوم اُس کا یاد ہے ؎

گیت

میرے عالیجاہ - عالیجاہ - عالیجاہ -

(اس کی مخاطب چھوٹی بی تھی - وہ جھوم جھوم کر چنگ
بجا کر چھوٹی بی کو مخاطب کرتی تھی)

"بستر کے مہکتے ہوئے پھولوں کی خوشبو اور میری اٹھتی ہوئی جوانی۔

میرے شباب کی سوندھی سوندھی خوشبو۔
اور میری تمام خواہشات کی گرمی ۔
میرا دھڑکتا ہوا دل۔
میرے نوجوان سینے کی گرمی۔

اے میرے عالیجاہ یہ سب تیرے لئے۔
(پھر میری طرف جھمکی چنگ لے کر بڑھی)

"تو آوارہ عورت ہو جسنے میرے عالیجاہ کو چھین لیا
خدا تجھکو اور بدصورت کردے۔ (اسپر خوب ہنسی ہوئی)
میرے حسن کو دیکھ۔
میری آنکھوں کو۔
میری خوبصورت ناک کو۔
میری چمکتی ہوئی پیشانی کو۔
میری سرمگیں اور نشیلی آنکھوں کو۔
میرے رخساروں کی نرمی۔
میری سانس کی گرمی۔
اری کمبخت - سوتوں کی ماری - کیا تجھکو کوئی بوڑھا نہیں ملتا"

(یہ کہتی ہوئی جھمکتی بل کھاتی گنگناتی گٹکریاں لیتی چھوٹی بی کے پاس پہنچکر گھٹنوں کے بل گاتی ہے ؎)

اے میرے عالیجاہ تم اس بدصورت کو چھوڑ دو (یعنی مجھکو)
اے میرے عالیجاہ تم اس ہرجائی کو چھوڑ دو۔

اور پھر اونڈھی سیدھی گالیاں! میری طرف انگلی اٹھا اٹھا کر ایسی کہ چھوٹی بی کا اور میرا ہنسی کے مارے بُرا بُرا حال ہوگیا۔ چھوٹی بی نے کہا "مردی یہ گالی گلوج رہنے دے .... شرم نہیں آتی تجھکو۔"!

جواب میں جھمکی کی آنکھوں کی چمک اور بڑھ گئی ابروؤں کو جنبش ہونے لگی۔ اور اُس نے پھر تان کھینچی ؎

"عالیجاہ - عالیجاہ -
تمہاری سانس کی گرمی اب بھی میرے رخساروں کے رونگٹوں کو گرماتی ہے۔
تمہارے باہوں کا خم میری گردن پر اب بھی محسوس ہو رہا ہے۔
تمہارے آغوش کا دباؤ یہ سینہ اب بھی محسوس کرتا ہے۔
اور تمہارے بوسوں کی گرمی سے میرے ہونٹ سُرخ ہوگئے ہیں۔
اے میرے عالیجاہ - اے میرے عالیجاہ میں اپنے ماتھے کی بندی اب بھی ڈھونڈتی ہوں"

میں اس جنگلی لڑکی کے حرکات و سکنات اور جنبشوں پر مر مٹا۔ اس کے حرکات میں کس قدر صداقت تھی - وہ ناچ رہی تھی یا بیچ بیچ چنگ کو چھوڑ کر نیچے جھٹکنے لگتی تھی تو بجائے ناچ کے وہاں تو حقیقت کی جلوہ گری سامنے تھی۔ پھر اُس نے شروع کیا ؎

اے میرے عالیجاہ - عالیجاہ
میں تم کو کلیجے سے لگاؤنگی۔
میں تمہارے سینے سے چمٹ کر بڑی بڑی سانسیں لونگی۔
میں تمہاری گردن میں مُنہ چھپاؤنگی۔
میں اپنے کاجل سے تمہارا کندھا سیاہ کردونگی۔
میں تمہارے آغوش میں پھنس جاؤنگی۔
اے میرے عالیجاہ تم میرے ساتھ آؤ۔

کس مزے سے اور کس طرح بتا بتا کر جھمکی نے کھڑے ہوکر بیٹھکر بل کھا کھا کر

چھوٹی بی کے آگے گھٹنے ٹیک ٹیک کر اور چنگ کی صدا پر ناچ ناچ کر یہ گیت گایا ہے کہ مجھے تو لُٹا لُٹا دیا۔
اسکے بعد پھر میرے اوپر تنزل کرا اور پھر وہی مجھے مغلظات گالیاں اور پھر اپنے عالیجاہ پر غصّہ۔
اے میری نفسانی خواہشوں کے مرکز (چھوٹی بی کو مخاطب کرکے) ظالم اور بدقماش دیوتا۔
جھوٹے دلبر۔
اے بدقماش اور آوارہ عاشق۔
اے بیوفا اور ظالم انسان۔
اے سچّے لوہے کے کھانڈے۔
تجھکو شرم نہیں آتی۔ شرم نہیں آتی۔
اے میرے عالیجاہ خدا تیری ڈاڑھی سو توں میں تقسیم کرے۔
اور یہ کہکر مصنوعی طور پر اُس نے چھوٹی بی کی ڈاڑھی نوچنے کا جو سین دکھایا ہے تو بس نہ پوچھئے۔ چنگ پھینک کر خود بھی ہنسی کا گول گپا بن گئی۔
پھر اس کے بعد مجھ سے کہا گیا کہ گھونگھٹ نکالوں لاحول ولاقوۃ۔ میں نے بگڑ کر کہا تم دونوں احمق ہو۔ مگر توبہ کیجئے۔ عورت بُری بلا ہے۔ مرد ہے کون چیز۔ یہ دونوں بہت جلد یہ بحث کر رہی تھیں کہ جتنا گھونگھٹ میں نے نکالا اُتنا ہی کافی ہوگا یا اور پھر اُس کے بعد مجھے یہ خیال کرکے تسلّی ہوئی کہ یورپ میں مرد خود ناچتے ہیں اور ویسے واجد علی شاہ خود زنانہ کپڑے پہنکر ناچتے تھے۔
خدا بچائے جوانی اور خوبصورت جوروں سے۔ اچھے احمق بنا دیتی ہیں۔ قصّہ مختصر رات کے دو بجے تک یہی ہنسی کھیل کرتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جس وقت چھوٹی بی نے صافہ باندھا مردانہ لباس پہنا مجھ سے مسکرا کر گلے میں باہیں ڈالکر پوچھا ہے تو میں نے اپنے "عالیجاہ" کو پھر گلے سے لگا لیا اور قائل ہوگیا کہ واقعی چمکی کا ناچ ہی عجیب و غریب چیز ہے اُتم اسکو جہاں چاہو بیچاؤ اور نچاؤ۔ مگر اسوقت تو خدا کے لئے میرے کلیجے سے لگ جاؤ۔ اور میں نے اپنی پیاری اور خوبصورت بیوی کو خوب سا کلیجہ سے لگایا۔ دعائیں دیں کہ کیا مزہ کا تماشہ دکھایا ہے واللہ جورو ہو تو ایسی۔ اور یہ واقعہ ہے کہ میں اسقدر دوار رفتہ ہو رہا تھا کہ دیر تک چھوٹی بی کو کلیجہ سے لگائے بیکل سا رہا۔ اور چمکی؟ نہ پوچھئے چھوٹی بی تو کلیجہ سے لگی ہے اور وہ ظالم دور ہی سے دل میں ہے کہ ایسی چُٹکیاں لے رہی ہے کہ چین نہیں پڑتا۔
چمکی کپڑے بدلکر چلی بھی گئی۔ لیٹ بھی رہی۔ برابر یہ کہتی گئی تم مر مٹکر۔ اور ہم دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کی محبت میں سرشار چمکی کے ناچ کی تعریف کر رہے تھے۔ عورت کو نہیں معلوم کہ مرد مجسم غداری ہو۔ کہاں چھوٹی بی اور کہاں وہ گنواری چمکی۔ ایک نور تھا کہ اُس کے سامنے ایک بیوہ کا منحوس چراغ۔ کہاں گلاب کا پھول اور کہاں ہٹ کٹھیا کا کانٹا! بھلا چھوٹی بی سے اور چمکی سے کیا نسبت۔ علی ؑ کے پسینے اور گلاب کی بو میں فرق ہے۔ بہت!

عظیم بیگ چغتائی

چغتائی نمبر

جس میں مرزا عظیم بیگ چغتائی کے کم و بیش بیس نہایت پاکیزہ مضامین شامل ہیں۔ مزاحیہ افسانوں اور ڈراموں کے علاوہ اس میں بیش بہا کتابیں "شہزوری" اور "سوانہ کی روحیں" بھی شامل ہیں۔ تقریباً دو سو صفحے کا نہایت قیمتی مجموعۂ مضامین ہے۔
قیمت صرف ایک روپیہ مع محصولڈاک۔
ملنے کا پتہ :- ساقی بُکڈپو۔ دہلی۔

کہانی سے ہوئی جو فوہو فطرت کو معبود قرار دینے سے ظہور میں آئی۔ وہ فلسفی اور مُحقق جو فطرت کے راز ہائے سربستہ معلوم کرنے میں مُنہمک رہتے تھے۔ اُنکے متعلق عوام کا یہ خیال ہوجاتا تھا کہ انہیں فوق الفطرت قوتیں حاصل ہوگئی ہیں اور انہیں جادوگر یا ساحر سمجھنے لگتے تھے۔ سولھویں صدی میں مجوسی روایت فاؤسٹ سے وابستہ ہوگئی۔ فاؤسٹ کی شخصیت تاریخی زیادہ اور روایتی کم ہے۔ اور جرمن ادب العوام کا نو اسے ہیرو سمجھنا چاہیئے۔ اس میں شک نہیں فاؤسٹ نامی ایک شخص ابتدائی سولھویں صدی میں موجود تھا اور اس میں چند غیر معمولی صفات بھی تھیں لیکن اس کے متعلق توہمات کی وہ کثرت ہوئی کہ اس کی اصلی شخصیت فراموش ہوگئی۔ اِس روایتی فاؤسٹ کے متعلق طرح طرح کے قصے لکھے گئے جن کا ذکر یہاں غیر ضروری سا ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ کرسٹو فر مارلو نے اِس کہانی کو منظوم ڈرامہ کی شکل میں پیش کیا اور یہ ڈرامہ اپنی شاعرانہ خوبیوں کے لحاظ سے شیکسپیئر کی شاعری سے کسی طرح کم نہیں کہا جاسکتا۔ مگر فی الحقیقت گوئٹے نے فاؤسٹ کو غیر فانی عظمت و شُہرت دی ہے۔ اس سے پہلے فاؤسٹ کو جادوگر یا مسخرہ بناکر پیش کیا جاتا تھا لیکن گوئٹے نے اسے ایک پُر وقار شخصیت کا مالک بنایا اور اپنے میفسٹوفلیس (شیطان) کو بھی وجیہہ اور عظیم کردار بنایا۔ گویا اِس پامال کہانی کو زمین سے اُٹھا کر آسمان پر پہونچایا۔ جرمن ڈرامہ نگار لسنگ کی طرح گوئٹے نے بھی اس خیال کو پیشِ نظر رکھا ہے کہ آخیر میں فاؤسٹ ملعون و مردود ہوکر نہ مرے بلکہ اس کی نجات ہوجائے۔ یہی خیال ہیٹر پرسٹن اور ہنری سے وج کی اس کہانی میں بھی قایم رکھا گیا ہے جسکا ترجمہ اِس پرچے میں پیش کیا جارہا ہے۔

مسٹر ظفر قریشی نے ایک ایسے تاریخی کردار پر مضمون لکھا ہے جس پر کم لکھا گیا ہے۔ صادق الخیری صاحب نے گذشتہ سال ساقی کے لئے نہایت سرگرمی سے مضامین لکھے اور اِس سال کی ابتدا بھی ایک عُمدہ افسانے سے کر رہے ہیں۔ محترمہ فرخندہ اختر بیگم نے اب کے "ڈنٹزنٹین" کا ترجمہ کیا ہے لیمب کی یہ کہانیاں انگریزی میں بہت وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ اُمید ہے کہ اُردو میں بھی مقبول ہونگی۔ قیسی صاحب کے افسانے نہایت لطیف و دلچسپ ہوتے ہیں۔ انکے افرادِ افسانہ شوخی و ظرافت میں ڈوبے ہوتے ہوتے ہیں۔ پروفیسر مرزا محمود بیگ صاحب نے نفسیاتی مضامین لکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اُردو میں اِس قسم کے مضامین بہت کم ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ یہ سلسلہ بہت پسند کیا جائیگا۔ چغتائی صاحب اپنی علالت کی وجہ سے سالنامہ کیلئے کچھ نہیں لکھ سکے۔ اُن کی ایک نئی کتاب ساقی بکڈپو سے شائع ہورہی ہے۔ اِسی کا ایک باب اِس پرچہ میں شائع ہورہا ہے۔ مسٹر طاہر قریشی کا مضمون اچھے ترجمے کا نمونہ ہے۔ اِس افسانے کے دو ترجمے ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں مگر اُن میں اصل کی کوئی خوبی ہمیں نظر نہ آئی۔ اِس لئے طاہر صاحب کا ترجمہ شائع کیا جارہا ہے۔

حصّۂ نظم ہم نے جان کر کم رکھا ہے۔ اس میں آپکو بیکار غزلیں اور نظمیں نظر نہ آئیں گی۔ آغا شاعر، فانی بدایونی۔ امینِ حزیں۔ اثر صہبائی۔ کوکب شاہجہانپوری۔ سیّد علی منظور۔ ن۔م۔ راشد۔ ثاقب کانپوری۔ تابش دہلوی۔ مجاز (علیگ) یہ سب وہ حضرات ہیں جن کا کلام مُستند سمجھا جاتا ہے۔

ہمیں بہت افسوس ہے کہ غیر معمولی ضخامت کی وجہ سے سالنامہ میں چند مضامین شریک نہ کرسکے۔ یہ مضامین آئندہ پرچے میں شائع کئے جائیں گے۔

شاہد

اڑتالیس ستاروں والا کمرہ

جیسا کہ ہنگری کے ایک خاندانی شریف زادے کے شایانِ شان ہے، میں نے پیرس پہنچتے ہی بڑے ناچ گھر کی راہ لی اور ایک سالم بکس اپنے لئے مخصوص کرا لیا۔

آئینہ دیکھنے اور ہوٹل اسٹاف کی درزنوں کی پُراشتیاق نگاہوں سے مجھے اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہوچکا تھا کہ میں کسی حد تک خوبصورت ہوں اور اس پر مجھے ناز بھی تھا۔ چنانچہ میں چشمے لگائے اور اس خیال کو دل میں لئے تماشائیوں کی صفوں کو چیرتا ہوا گزر گیا، کہ بکس کی ایک ایک عورت، ایک ہی گھنٹے کے اندر اندر میری محبت میں ازخود رفتہ ہوجائے گی۔ مگر یہ دیکھکر مجھے افسوس ہوا کہ جو عورتیں مجھ سے نیچے اور اوپر کی نشستوں پر بیٹھی تھیں، مجھے دیکھنے سے قاصر تھیں۔ لیکن اس نقصان کی تلافی ان حسین فرانسیسی لڑکیوں نے کردی جو میرے پاس ہی جلوہ افروز تھیں اور مجھے ایک گونہ اطمینان ہوگیا۔

مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میرا جادو کس قدر کامیاب رہا۔ آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے! امیرزادیوں اور شہزادیوں کی اُلفت بھری پُراشتیاق نگاہیں مجھ ہی پر اُٹھتی تھیں۔ میں بھی ان کی قابلِ داد نگاہوں اور حقیقت سے دزدیدہ تبسم کا جواب اسی انداز میں دے دیتا تھا۔

مجھے انتظار رہی تھا اور یکایک ایک شہزادی میری محبت کے جال میں پھنس گئی۔ وہ میرے سامنے والی نشست پر بیٹھی تھی۔ وہ ایک پری تھی۔ اور فیتوں سے آراستہ کیا ہوا ریشمیں لباس پہنے ہوا میں اُڑ رہی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک ہیروں ہی ہیروں میں ملبوس نظر آتی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے رات کی چاندنی اپنے تمام ستاروں سمیت اس نسوانی پیکر میں سمٹ کر نمودار ہوگئی ہے۔

کھیل کے دوران میں اس کی نگاہیں میرے ہی بکس پر جمی رہیں۔ اسے مطلق خبر نہ تھی کہ سٹیج پر کیا ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ دنیاوی یا روحانی کیفیات کا کوئی بڑے سے بڑا ماہر بھی اس کی حیرت انگیز ازخود رفتگی کو نہیں سمجھ سکتا۔

کھیل ختم ہونے پر میں جلد ہی اُس برآمدے میں پہنچا، جہاں سے اس کو گذرنا تھا۔ مجھے زیادہ دیر تک اس کا انتظار نہ کرنا پڑا وہ جلد ہی وہاں پہنچ گئی۔ قریب سے وہ کہیں زیادہ دلکش معلوم ہوتی تھی۔ میں نسوانی حُسن پر فوراً ہی مر مٹنے کا عادی نہیں۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ عورتیں کس طرح نمائشی پوڈروں اور موتیوں کی زیب و زینت سے چہرے کی دلکشی کو دوبالا کرلیتی ہیں۔ پھر بھی اس کی معصومیت اور اس کی سادگی نے میرے دل پر سیمابی اثر پیدا کردیا۔

اُس کا حُسن اس درجہ دلفریب تھا کہ نہ کسی شاعر نے اسے اپنے شعر میں کبھی بیان کیا ہے اور نہ کسی معشوق نے حسین خواب میں اسے دیکھا ہے۔

جونہی وہ میرے پاس سے گذری، میرے ہاتھ کو خفیف سی جُنبش محسوس ہوئی جب مجھے ذرا ہوش آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قیمتی زنجیر میں لپٹا ہوا ایک خط میرے ہاتھ پر پڑا ہے، اس کے ہوشربا حُسن اور اُس کے نازک ہاتھ کے لمس نے یکایک میرے حواس کو کچھ اس طرح معطل کردیا تھا کہ اس وقت میں یہ بتانے سے قطعاً قاصر تھا کہ مجھے کیا ہوگیا ہے۔

مُلاقاتی کارڈ پر اس کا نام اور پتہ درج تھا۔ اور اس کے نیچے موتیوں جیسے خوبصورت حروف میں "کل بارہ بجے" لکھا تھا۔

کارڈ پر کی زنجیر بڑی بیش قیمت معلوم ہوتی تھی۔ کم ازکم پانچ سو فرانک کی ہوگی۔ میں نے محسوس کیا کہ میری قسمت پلٹنے والی ہے یقیناً وہ کوئی کم ظرف عورت نہ تھی جس نے محبت کی پہلی دعوت کے ساتھ ہی پانسو فرانک کی گراں قیمت چیز ایک اجنبی کے حوالے کردی تھی۔ یقیناً کسی بڑے خاندان سے ہوگی۔ شاید اسے مجھ پر پورا اعتماد تھا کہ میں پہلی ملاقات کے اس تحفے کو کسی جوہری کی دکان پر نہیں بیچ ڈالوں گا۔ وہ مجھے ہنگری کا ایک شہزادہ سمجھتی ہوگی۔

یہ ملاقات میرے لئے بے حد مسرت کا پیغام تھی۔ صبر آزما انتظار کے بعد بارہ بجے۔ میں نے صبح کا بہترین لباس پہنا۔ اور شوفر کو کہا کہ مجھے فلاں جگہ تک لے چلے۔ وہ اس کے مکان سے اچھی طرح واقف تھا۔ اور اس نے فوراً ہی مجھے وہاں پہنچا دیا۔ باغ میں سے گذرتا ہوا ایک راستہ اس کے مکان تک چلا گیا تھا۔ جہاں کرائے کی گاڑی سے جانے کی ممانعت تھی۔

ایک بے حد موٹا دربان میرے استقبال کو آگے بڑھا۔ اُس کا چہرہ خونخوار اور ہیبت ناک تھا۔ مگر جونہی اس کی نگاہ زنجیر پر پڑی، اس کے ہیبت ناک چہرے پر ایک دلنواز تبسم دوڑنے لگا۔ اُس نے گھنٹی بجائی۔ فوراً عمدہ لباس میں ایک نوکر نمودار ہوا۔ اس نے مجھے جھک کر سلام کیا۔ اور ایک دوسرے نوکر کے حوالے کر دیا جس کا لباس اس سے بھی زیادہ آرائشی تھا۔ ہم دونوں ایک درجن بے حد شاندار کمروں، دالانوں، اور دیوان خانوں میں سے گذرتے گئے۔ جو شاہانہ ساز و سامان سے آراستہ تھے۔ انہیں دیکھکر آنکھوں میں چکاچوندسی پیدا ہو جاتی تھی۔

میں نے بہت سے شاہی محل اور آراستہ حویلیاں دیکھی ہیں، مگر مارچیز کے مکان سے زیادہ تکلف، اور پردوں حاشیوں اور تصویروں سے زیادہ آراستہ جگہ میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ میری نظر اس جگہ کی چوندھیا دینے والی روشنی سے کچھ پریشان سی ہو رہی تھی۔

بالآخر ہم ایک ڈرائینگ روم میں پہنچے۔ یہ ایک چھوٹا سا خوشنما تھیٹر معلوم ہوتا تھا۔ اور اس درجہ آراستہ تھا کہ میرا تصور بھی وہاں تک پہنچنے سے قاصر ہے۔ جا بجا سنگ مرمر کے مجسمے رکھے ہوئے تھے، کہیں امریکہ کے بنے ہوئے خوشنما پھول اور ریشمین پردے لٹک رہے تھے۔ کہیں ہزار سال پہلے کی دریاں بچھی تھیں اور کہیں سنہری فریموں میں جڑی ہوئی اور ماہرین فن کے ہاتھوں کی بنی ہوئی صناعانہ تصویریں مزین تھیں۔ ان اڑتالیس تصویروں میں سے ہر ایک پر ہاتھ کی ہتھیلی کے برابر استاروں کے مانند سیاہ شیشے لگے ہوئے تھے۔

یقیناً یہ ایک بے مثل کمرہ تھا۔

مجھے ان عجیب و غریب چیزوں سے لطف اٹھانے کے لئے بہت تھوڑا وقت ملا۔ جلد ہی دروازہ کھل گیا۔ اور میری حور وش محبوبہ نہایت سادہ انداز میں اندر داخل ہوئی۔ آج وہ گذشتہ رات سے بھی زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بچوں کی سی معصومیت کی جھلک دکھائی دیتی تھی اور فرط حیا اور انکساری سے جھکی ہوئی تھیں۔ اُس کی حرکات میں شریفانہ انداز نظر آتا تھا۔ اس کی بڑی بڑی دلکش آنکھیں اور ہونٹ حد درجہ ارتعاش انگیز تھے۔ وہ مسکرا اٹھی، صرف مجھے خوش کرنے کے لئے، کیونکہ وہ مجھے دیکھکر بہت خوش ہوئی تھی۔ وہ میرے استقبال کو آگے بڑھی، اپنے خوبصورت مخملیں ہاتھ کو جنبش دی اور مجھے قریب کے پھولدار ریشمین گدیلوں والے صوفے پر بیٹھ جانے کو کہا۔ اُس نے اپنی نگاہیں مارے شرم کے نیچی کرلیں، اور مجھ سے درخواست کی کہ میں گذشتہ رات والی فوری ملاقات کو جو اس کے جذبات پر قابو نہ پانے کا نتیجہ تھی، اس کی کم ظرفی پر محمول نہ کروں۔ میں گھٹنوں کے بل اس کے سامنے جھک گیا۔

اور اقرار کیا کہ میں اسے دل وجان سے چاہتا ہوں۔ وہ ان محبت بھرے الفاظ سے حیران سی رہ گئی اور اپنی جگہ سے اُٹھکر کچھ فاصلے پر جا کھڑی ہوئی اور پریشانی کے عالم میں بڑی بڑی معصوم آنکھوں کے ساتھ میری طرف دیکھنے لگی۔ یکایک مجھے محسوس ہوا کہ میں نے حد سے زیادہ گرمجوشی کا اظہار کیا ہے۔ اس لئے میں نے ارادہ کیا کہ ذرا اعتدال سے کام لوں۔ میں نے اسے اپنے پاس بٹھالیا۔ یکایک اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ کہنے لگی۔ "اس سے پہلے کوئی ایسا شخص نہیں ملا جو میرے جذبات کو اچھی طرح سمجھ سکا ہو"۔ میں نے قسم کھا کر کہا کہ میں اس کے دل کی گہرائیوں تک پہنچ چکا ہوں۔ اس کے بعد میں نے اسے شعر پڑھکر سنانے شروع کئے۔ اس نے اپنے آنسو پونچھ لئے اور ایک دلکش تبسم اس کے چہرے پر رقص کرنے لگا۔ اُسنے میری مہربانی کو بے صلہ نہ جانے دیا اور آگے کو جھک کر میری پیشانی پر والہانہ اُلفت کے ساتھ ایک بوسہ دیا۔ میں نے اس کے کنول جیسے سفید ہاتھ کو اپنے سینے پر رکھکر دبایا اور اس قدر گرمجوشی کے ساتھ اسکے ہونٹوں کو چوما کہ اس کی سانس پھول گئی اور وہ میری طرف ذرا خفگی سے دیکھنے لگی۔ وہ مجھے "ننھا رومیو" کہہ کر پکارتی تھی۔ اور میں اُسے "میری جولٹ" کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو رومیو جولٹ کہکر ان جیسی رُومانی محبت اپنے اندر پیدا کرلی۔

پھر ہم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ میں چلنے کو تیار ہی تھا کہ میری محبوبہ میرے کان میں کہنے لگی۔ "کل دوپہر کیوقت پھر آنا"۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں پھر اُسی جوش کے ساتھ اسے چوموں۔ اس لئے ذرا پرے ہٹ کر کمرے کے دوسرے کونے سے اپنا ہاتھ ہلاتے ہوئے کہنے لگی۔ "میرے رومیو"!

میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "میری جولٹ، میری پری"! اور دیوانے رومیو کی طرح افسردگی کی حالت میں ہی وہاں سے چلا آیا۔

میں نے یقیناً اپنے دماغ کا توازن کھو دیا تھا۔ اور یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے کہاں سے آئی ہے اور کس قوم سے ہے۔ وہ عام انسانوں سے کوئی بالاتر ہستی تھی۔ اس کو مجھ سے حقیقی محبت تھی۔ ایسی محبت میں نے آج تک کسی عورت میں نہیں دیکھی اس نے مجھے کُشتہ ہی کر ڈالا تھا۔ اور میرے دماغ کی ازسرتاپا کایا ہی پلٹ دی تھی۔ اب پھر میرے دل میں یہ اُمنگ تھی کہ کب دن ختم ہو اور اُسے پھر دیکھوں۔ میں کل دوپہر تک منٹ گن گن کر وقت گذار رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب میرا رہا سہا ہوش بھی جاتا رہے گا۔

شام کو وقت گذارنے کی غرض سے اور اس خیال سے کہ شاید پھر مجھے اس کی ایک جھلک نظر آجائے، میں نے "بڑے ناچ گھر" کی طرف قدم اُٹھائے۔ راستے میں کونٹ آرتھر سے مُلاقات ہوگئی۔ یہ میرا ہم وطن اور بے تکلف دوست تھا۔ ہم دونوں پیرس میں کئی سال اکھٹے رہ چکے تھے۔ اس لئے غیر متوقع طور پر ایک دوسرے سے مِلکر بے حد خوش ہوئے۔ ایک دوسرے کی خیریت پوچھنے کے بعد ہم سوچنے لگے کہ شام کا وقت کہاں گذارا جائے۔ میں نے ناچ گھر دیکھنے کی تجویز پیش کی۔

اُس نے مجھ سے اتفاق نہ کرتے ہوئے کہا۔ آجکل ناچ گھر میں کون جاتا ہے۔ ایسی جگہ جانا کونسی عقلمندی ہے جہاں آدمی محبت کو حقیقی طور پر محسوس کرنے کے بجائے صرف اس کے گیت گاتے اور بے حقیقت چیزوں کے راگ الاپتے رہتے ہیں۔ جہاں محبت کے حریف بھی تصنع سے کام لیتے ہیں۔ چلو اس جگہ چلیں جہاں ہر ایک چیز حقیقی رنگ میں رنگی ہوئی ہو، جہاں ایکٹروں کو یہ محسوس ہو کہ وہ جان پر کھیل رہے ہیں اور حقیقی چیزوں سے دوچار ہو رہے ہیں۔ یہ ہے وہ جگہ جہاں حقیقی کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ آج وہاں "اوتھیلو" کا کھیل ہوگا اور وقت خوب گذرے گا۔

میں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا بھائی جہاں چاہو لے چلو"۔

اندر داخل ہونے کے لئے سو فرانک کا ٹکٹ خریدنا پڑتا تھا۔ ہم بے شمار اندرونی کمروں میں سے گذر کر ایک تاریک صحن میں پہنچے۔ جہاں کچھ سیڑھیاں چڑھکر ہم نے بکنگ آفس سے دو سو فرانک ادا کرکے دو ٹکٹ لئے۔ پھر حاجب ہمیں ایک مختصر سے کمرے میں لے گیا جہاں صرف ایک آدمی کے لئے جگہ تھی۔ اندر کوئی روشنی نہ تھی۔ صرف شیشے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا لگا ہوا تھا جس پر آنکھیں رکھکر آدمی اندر کی طرف دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اس میں سے ایک نظر اندر ڈالی۔ مجھ پر لرزہ انگیز حیرت طاری ہوگئی۔ یہ وہی آراستہ کمرہ تھا جو میں گذشتہ رات دیکھ چکا تھا۔ جولیٹ، میری محبوبہ انگریزی وضع کے ایک آدمی کے پاس صوفے پر بیٹھی تھی اور تصویروں پر لگے ہوئے اڑتالیس ستاروں میں سے دو دو آنکھیں اندر جھانک رہی تھیں۔ وہ حور وش لڑکی: وہی جس کے ساتھ میں رومیو کا پارٹ ادا کر چکا تھا۔ اب ایک انگریز کو محو حیرت بنا رہی تھی۔ وہ غریب اس وقت ایک عجیب بیوقوف معلوم ہوتا تھا۔ مگر میری محبوبہ اسی طرح نہایت حسن و خوبی سے اپنا پارٹ ادا کر رہی تھی جس طرح اس نے میرے ساتھ جولیٹ کا ادا کیا۔

حقیقتہً یہ کامیڈی سو فرانک ہی کے قابل تھی۔

میں نے مارچیز سے اسی ستاروں والے کمرے میں دوسرے روز ملنے کا خیال چھوڑ دیا۔ اور گاڑی پر سوار ہوکر پیرس کو خیرباد کہا مبادا کوئی آکر مجھ سے طنزاً یہ کہے "معافی چاہتا ہوں، میں رومیو کا پارٹ ادا کرنے کی تمہیں داد نہیں دے سکتا"

طاہر قریشی، بی اے

سالنامہ شاہجہاں دہلی

جنوری ۱۹۳۷ء سے شاہجہاں ترقی پسند مُصنّفین کی انجمن دہلی کے انتظام سے شائع ہوا کریگا۔ اب اس پرچے کی خصوصیت یہ ہوگی کہ اسمیں صرف وہ مضامین شائع ہونگے جو دلی اور باہر کی ترقی پسند مُصنّفین کی انجمنوں میں پڑھے جائینگے۔ یعنی آئندہ سے شاہجہاں میں صرف ایسے مضامین شائع ہونگے جنکے موضوع حیاتِ انسانی کے غور طلب مسائل ہونگے اسمیں صرف وہی ادب پیش کیا جائیگا جسکے پڑھنے سے آپکے دل میں عمل کا جذبہ پیدا ہوگا۔ یہ مضامین اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نئی چیز ہونگے فضول افسانے اور بیکار غزلیں اس میں شامل نہ ہونگی۔

جنوری کا شاہجہاں سالنامہ کی صورت میں پیش کیا جارہا ہے اور اسکے مضامین وہی ہیں جو ترقی پسند مُصنّفین کی انجمن دہلی میں پڑھے گئے ہیں انکے علاوہ اور مضامین بھی اسمیں ہیں مگر انمیں بھی جدت و ترقی کا جذبہ کارفرما ہے۔

ضخامت ۲۰۰ صفحات قیمت صرف ۸ر سالانہ چندہ تین ۳ روپے۔

ساقی کے خاص نمبر رعایتی قیمت پر

خاص نمبر	اصلی قیمت	رعایتی قیمت
جاپان نمبر۔ (جنوری ۱۹۳۶ء)	عمہ	عہ
ظریف نمبر۔ (اپریل ۱۹۳۶ء)	۱۰ر	۸ر
افسانہ نمبر۔ (جولائی ۱۹۳۶ء)	۱۲ر	۹ر
راشد الخیری نمبر۔ (ستمبر ۱۹۳۶ء)	۸ر	۶ر
سالنامہ۔ (جنوری ۱۹۳۵ء)	عمہ	عہ
ظریف نمبر۔ (اپریل ۱۹۳۵ء)	۱۰ر	۸ر
افسانہ نمبر۔ (جولائی ۱۹۳۵ء)	۱۲ر	۸ر
چغتائی نمبر۔ (اکتوبر ۱۹۳۵ء)	عہ	۱۲ر
سالنامہ (جنوری ۱۹۳۴ء)	عہ	۱۲ر
افسانہ نمبر۔ (جولائی ۱۹۳۴ء)	۱۰ر	۸ر
دلی نمبر۔ (اکتوبر ۱۹۳۴ء)	۱۰ر	۸ر
دلی نمبر۔ (اکتوبر ۱۹۳۲ء)	۱۲ر	۸ر
افسانہ نمبر (جولائی ۱۹۳۲ء)	۱۰ر	۸ر
سالنامہ (جنوری ۱۹۳۱ء)	عہ	۱۲ر
ظریف نمبر۔ (اپریل ۱۹۳۳ء)	۱۰ر	۸ر
ناصر نمبر۔ (ستمبر ۱۹۳۳ء)	۱۲ر	۸ر

فسانۂ زمستان

کسی زمانے کا ذکر ہے کہ جزیرۂ صقلیہ میں ایک بادشاہ لیونطیز حکومت کرتا تھا. اس کی ملکہ کا نام ہرمیونی تھا. ملکہ نہایت حسین اور عفت مآب خاتون تھی۔ دونوں بڑی محبت و اُلفت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ لیونطیز ملکہ کے عشق میں سرشار رہتا اور ایسی حسین ملکہ کے ہوتے ہوئے اب کوئی آرزو یا تمنا دل میں باقی نہ تھی البتہ اپنے بچپن کے یار اور ہم مکتب پولیزینیز کو کبھی کبھی یاد کیا کرتا تھا۔ پولیزینیز اُس زمانے میں ملک بوہیمیا کا بادشاہ تھا۔ اس پُرانے دوست سے ملنے کی ضرور آرزو رہتی تھی اور دل چاہتا تھا کہ اپنے اِس عزیز دوست کا تعارف ملکہ سے بھی کرائے۔ لیونطیز اور پولیزینیز دونوں کی تعلیم و تربیت بچپن میں ایک ہی جگہ ہوئی تھی۔ مگر دونوں کو اپنے اپنے باپ کے انتقال کے بعد زمامِ حکومت ہاتھ میں لینے کو اپنی اپنی قلمرو میں جانا پڑا۔ اس وجہ سے برسوں سے انہیں ایک دوسرے سے ملنا نصیب نہ ہوا تھا۔ اگرچہ خط و کتابت، پیغام و سلام، تحفے تحائف کا سلسلہ برابر جاری رہا تھا۔ آخرکار لیونطیز کے متواتر اصرار سے پولیزینیز کو بوہیمیا سے دربار صقلیہ میں اپنے دوست سے ملاقات کیلئے آنا ہی پڑا۔ پولیزینیز کے آنے سے لیونطیز کی خوشی اور شادمانی اور بھی بڑھ گئی اور اُس نے اپنی ملکہ سے اصرار کیا کہ ــــــــ کہ وہ اُسکے بچپن کے دوست اور رفیق پر خاص طور سے نظرِ التفات رکھے. پولیزینیز جیسے پُرانے ساتھی اور عزیز دوست کی موجودگی میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ لیونطیز کی مسرت اور راحت انتہا کو پہونچ گئی ہے. اکثر دونوں بیٹھے پُرانے وقتوں کا تذکرہ اور طالب علمی کے پُرلطف زمانے اور جوانی کی ترنگوں کو یاد کیا کرتے تھے. اور انہی باتوں کو ہرمیونی کے سامنے بھی دوہراتے تھے۔ ملکہ بھی اُنکی یہ باتیں خوش ہو کر سنتی تھی۔

ایک کافی عرصہ قیام کے بعد پولیزینیز نے رُخصت چاہی مگر لیونطیز نے جانے کی اجازت نہ دی اور چاہا کہ تھوڑے دن اور قیام کر کے اُنہیں مسرور رہنے کا موقع دے۔ ملکہ ہرمیونی نے بھی اپنے شوہر کے مشورے اور خواہش کے مطابق پولیزینیز سے قیام کرنے کو کہا۔

غرض یہ زمانہ تھا کہ جب سے اس نیک نہاد ملکہ کی تکلیفوں کا دَور شروع ہوتا ہے. پولیزینیز نے لیونطیز کی درخواست کو تو منظور نہ کیا مگر ملکہ کے شریفانہ اصرار سے متاثر ہو کر اپنی روانگی کچھ عرصے کیلئے ملتوی کر دی. لیونطیز عرصۂ دراز سے اپنے دوست پولیزینیز کی صداقت، محبت اور شریفانہ خصائل سے اور نیز اپنی عفیفہ اور پاکدامن ملکہ کی اعلیٰ ترین فطرت سے بھی بخوبی باخبر تھا. مگر باوجود اس کے اب وہ ایک غیر مغلوب حسد اور رقابت کا شکار ہو گیا. پولیزینیز کی خاطر تواضع پر ملکہ کی توجہ و التفات محض شوہر کے کہنے اور اُسکی خوشنودی کے لئے تھا مگر اس نے بادشاہ کی آتشِ غضب اور بدگمانی کو اور بھڑکایا. نتیجہ یہ ہوا کہ لیونطیز ایک سچے محب اور دوست کے رُتبے اور ایک مہربان عاشقِ زار شوہر کے عالی منصب سے گذر کر ایک وحشی اور خونخوار درندہ بن گیا. چنانچہ اُسنے اپنے دربار کے ایک امیر کیمیلیو نامی کو بلا بھیجا اور اپنے مہمان دوست کے متعلق جو شبہ اور بدظنی ہوئی تھی اُسکو ظاہر کر کے کیمیلیو کو حکم دیا کہ وہ پولیزینیز کو زہر دیدے۔

کیمیلیو بڑا شریف آدمی تھا وہ جانتا تھا کہ لیونطیز کے رشک و رقابت کی فی الحقیقت کوئی بُنیاد نہیں. پس اُس نے پولیزینیز کو زہر دینے کے بجائے بادشاہ کے حکم سے آگاہ کر دیا. کیمیلیو اس بات پر رضامند ہو گیا کہ وہ بادشاہ بوہیمیا کے ساتھ خود بھی صقلیہ سے فرار ہو جائے. غرض پولیزینیز، کیمیلیو کی معاونت سے جان سلامت لیکر اپنے ملک یعنی بوہیمیا میں پہونچ گیا. کیمیلیو اب صقلیہ واپس نہ گیا اور اُسوقت سے بادشاہ بوہیمیا کے دربار میں رہنے لگا اور بادشاہ کا سب سے بڑھکر وفادار، مقرب اور منظورِ نظر مصاحب ہو گیا۔

پولیزینیز کی فراری نے بادشاہ صقلیہ کی آتشِ حسد کو اور بھی تیز کر دیا. چنانچہ وہ فوراً اپنی ملکہ کے کمرے میں گیا. اُس وقت یہ نیک بخت خاتون اپنے بیٹے میمیلیوس کو لئے بیٹھی تھی اور یہ معصوم بچہ ماں کے جی بہلانے کو ایک دلچسپ کہانی شروع کرنے والا تھا. بادشاہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بچے کو ملکہ سے چھین لیا. اور ملکہ کو قیدخانے بھجوا دیا. میمیلیوس ابھی بہت چھوٹا تھا مگر ماں سے اُسے بڑی محبت تھی. اُس نے ماں کی یہ بے حُرمتی دیکھی اور جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ وہ اس سے علیحدہ کر کے قیدخانے بھیجی گئی ہے تو اس معصوم کے دل پر بڑی چوٹ لگی اور وہ افسردہ دل اور پریشان خاطر رہنے لگا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اندر ہی اندر گھلنے لگا. بھوک اور نیند جاتی رہی. نوبت یہانتک پہونچی کہ اُسکی جان کے لالے پڑ گئے۔

بادشاہ نے جب ملکہ کو قید کر دیا تو اپنے دربار کے دو امیروں یعنی کلیومینز اور دایون کو حکم دیا کہ وہ دلفوس جا کر ہیکلِ اپولوس میں ملکہ کی بیوفائی

متعلق آریکل سے استخارہ کریں ۔ ملکہ ہرمیونی کو قیدخانے میں رہتے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ اُس کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ۔ ملکہ کے غمزدہ دل کو ایسی خوبصورت بچی دیکھکر مسرت ہوئی ۔ اور اپنی بچی سے پیاری پیاری باتیں کرتے کرتے کہنے لگی " اے میری غریب چھوٹی سی بندھیا میں ایسی بے گناہ ہوں جیسے کہ تو معصوم ہے " ملکہ کی ایک بڑی مہربان نیک طینت سہیلی یولینیا تھی جو صقلیہ کے ایک امیر اینٹی گونس کی بیوی تھی ، یہ سنتے ہی کہ ملکہ کے ہاں بچی پیدا ہوئی ہے فوراً اس قیدخانے میں گئی جہاں ملکہ مقید تھی ۔ اور ملکہ کی خادمہ ایمیلیا سے کہنے لگی کہ " اے ایمیلیا میں تجھ سے ایک درخواست کرتی ہوں اور وہ یہ ہے کہ میری طرف سے ملکہ کے حضور جاکر عرض کر کہ اگر ملکۂ عالم مجھ پر اعتماد کرکے اپنی نوزائیدہ شہزادی کو میرے سپرد کرسکتی ہیں ۔ میں اُس کو بادشاہ سلامت کے پاس لیجاؤنگی ۔ نتیجہ جو کچھ ہو وہ خدا پر روشن ہے ۔ ممکن ہے کہ باپ کا دل اپنی معصوم بچی کو دیکھکر پسیجے " ۔

ایمیلیا نے جواب دیا کہ " اے خاتونِ عالی نصب آپ جو اس شریفانہ خدمت کو انجام دینے کے لئے تشریف لائی ہیں اسکی اطلاع میں ملکہ کو کرتی ہوں ۔ ملکہ تو خود آج اس بات کی آرزومند تھیں کہ اُن کا کوئی دوست ایسا ہو جو اس بچی کو بادشاہ کے سامنے لے جانے کی ہمت کرے " ۔

یولینیا نے کہا " ملکہ سے اتنا اور عرض کر دینا کہ میں بڑی جرأت کے ساتھ بادشاہ کے حضور میں اُنکی سفارش اور حمایت کرونگی " ۔

ایمیلیا نے کہا " جو خلوص اور محبت آپنے ملکہ کے ساتھ ظاہر کی ہے خدا آپکو اسکی جزائے خیر دے اور آپ پر ہمیشہ اپنا فضل و کرم رکھے " ۔

ایمیلیا ہرمیونی کے پاس گئی اور سارا ماجرا بیان کیا ۔ ملکہ نے بڑی خوشی سے اپنی بچی کو یولینیا کے سپرد کر دیا ۔ کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ کسی اور میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ اس بچی کو بادشاہ کے سامنے لے جائے ۔

یولینیا نے بچی کو اُٹھا لیا اور بادشاہ کے حضور میں مع اس بچی کے درانہ پہونچ گئی ۔ حالانکہ اُس کا شوہر بادشاہ کے غصّے سے خوف دلاکر اُسے روکنا چاہتا تھا ۔ پہونچتے ہی اُس نے بچی کو بادشاہ کے قدموں میں ڈال کر ایک پُراثر تقریر ملکہ کی بے گناہی کے بارے میں کی ۔ اور بادشاہ کو اُس کی سنگدلی اور بیرحمی پر ملامت کرکے درخواست کی کہ وہ اپنی بے گناہ اور پاکدامن ملکہ اور اس معصوم بچی پر رحم کرے ۔ مگر یولینیا کی اس عرض معروض اور دادخواہی نے بادشاہ کے غصے اور نفرت کو اور تیز کیا ۔ اُس نے یولینیا کے شوہر اینٹی گونس کو حکم دیا کہ وہ اپنی بیوی کو بادشاہ کے سامنے سے دُور کرے ۔

یولینیا نے جاتے وقت بچی کو اُس کے قدموں میں دانستہ اس خیال سے پڑا رہنے دیا کہ شاید بادشاہ عالمِ تنہائی میں اُسے دیکھکر اسکی بیکسی اور معصومیت پر رحم کرے ۔ مگر یہ نیک دل یولینیا کی غلط فہمی تھی کیونکہ اُسکے جاتے ہی بے رحم باپ نے یولینیا کے شوہر اینٹی گونس کو حکم دیا کہ وہ بچے کو اُٹھائے اور سمندر پار لیجاکر ساحل پر جہاں کوئی صحرا ملے وہاں اُسے ڈالدے تاکہ وہ ہلاک ہوجائے ۔

اینٹی گونس نے نیک طینت کیمیلیو کے برعکس لیونطیز کے حکم کی پوری تعمیل کی ۔ اُسنے فوراً بچی کو اُٹھالیا اور جہاز پر سوار ہوکر سمندر پر اس ارادے سے چل پڑا کہ ساحل پر جو پہلا ویران اور بربادمقام ملے وہاں بچی کو ڈالدے ۔ بادشاہ کو اپنی ملکہ کے گناہ کا اس درجہ یقین تھا کہ اُس نے کلی فیز اور دالیون کی واپسی کا بھی انتظار نہ کیا جنہیں پولوس کے ہیکل میں آریکل سے استخارہ کرنے کو بھیجا تھا ۔ ملکہ ابھی اپنی پیاری اور حسین بچی کی روح فرسا جدائی سے سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ اُس کو تمام اُمرا اور شرفا کے سامنے دربار میں علانیہ روبکاری کے لئے طلب کیا گیا ۔ تمام رؤسائے عظام اور اعیانِ سلطنت اور اراکینِ عدالت ہرمیونی کے مقدمے کی سماعت کے لئے جمع تھے اور بدقسمت ملکہ اپنی ہی رعایا کے سامنے ایک مُجرم کی حیثیت سے اُن کا فیصلہ سُننے کی منتظر تھی ۔ اِسی حال میں کلی فیز اور دالیون اجلاس میں داخل ہوئے اور بادشاہ کی حضور میں آریکل کا جواب سربمہر پیش کیا ۔ لیونطیز نے مُہر توڑنے اور آریکل کے جواب کو باوازِ بلند پڑھنے کا حکم دیا ۔ آریکل کے الفاظ یہ تھے ۔

" ہرمیونی بے گناہ ہے ۔ پولیزینیز الزام سے پاک ہے کیمیلیو ایک وفادار ملازم ہے ۔ لیونطیز حاسد اور ظالم بادشاہ ہے ۔ جو کچھ کھویا ہے اگر وہ نہ ملا تو بادشاہ بغیر وارثِ تاج و تخت زندہ رہیگا " ۔

بادشاہ نے آریکل کے جواب کا کچھ اعتبار نہ کیا اور کہا کہ " یہ سب جھوٹ ہے اور ملکہ کے دوستوں کی کارستانی ہے " ابھی بادشاہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ ایک شخص آیا اور خبر دی کہ شہزادہ میمیلیوس یہ سُنکر کہ اُس کی ماں کا یوں برسرِعام اظہار لیا جارہا ہے تاکہ اُس کی زندگی اور موت کا فیصلہ کیا جائے ، صدمے اور شرمندگی سے دفعتاً مرگیا ۔

ہرمیونی اپنے پیارے اور محبت کرنے والے بچے کے مرنے کی خبر سُنتے ہی یہ خیال کرکے کہ اُس نے اپنی جانِ عزیز اپنی ماں کی بدقسمتی کے غم میں دیدی بیہوش ہوگئی ۔ لیونطیز کا دل بھی اس خبر سے پاش پاش ہوگیا ۔ ملکہ کو بیہوش ہوتے دیکھ کر اُسکے دل میں ——— رحم آیا اور اُسنے یولینیا اور دیگر خادماؤں کو حکم

ویکہ وہ ملکہ کو اٹھالے جائیں اور اُس کو ہوش میں لانے کی تدبیر کریں۔ پولینیا اور خادمائیں ملکہ کو اٹھا کر لے گئیں لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد پولینیا دربار میں حاضر ہوئی اور بادشاہ سے عرض کیا کہ ملکہ ہرمیونی نے دُنیا کو خیرباد کہا۔ بادشاہ ملکہ کے انتقال کی خبر سُنکر اپنے ظلم و ستم پر سخت نادم ہوا اور سوچنے لگا کہ واقعی اُسکی بدسلوکیوں نے ہرمیونی کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے اور وہ یوں میری سختیوں اور زیادتیوں کی تاب نہ لاکر دُنیا سے چل بسی اب بادشاہ کو ملکہ کی عفت و عصمت کا یقین آیا اور اُس نے خیال کیا کہ واقعی آریکل کا جو بیان تھا کہ جو کچھ لکھا ہے اگر وہ نہ ملا تو اُس سے مُراد اُس کی بچی تھی جسے میں نے ہلاک ہونے کے لئے پھکوا دیا اور آریکل کا یہ جملہ کہ بادشاہ بغیر وارث کے زندہ رہیگا اُس کی تعبیر سمیلیس کی موت ہے۔ اب بادشاہ کی یہ حالت ہوئی کہ گمشدہ بیٹی کو اگر کوئی ڈھونڈلائے تو ساری سلطنت اُس کی نذر کر دے۔ لیونطیز اب بہت پشیمان تھا۔ اور اسکے لیکر برسوں تک بیوی اور بچوں کے ماتم میں رہا۔ اور اپنے گذشتہ مظالم پر اشکِ ندامت بہاتا رہا۔

اینٹی گونس جس جہاز پر ملکہ کی شیرخوار بچی کو لئے سمندر پر سے گزرتا تھا وہ طوفان خوردہ ہوکر بوہیمیا کے ساحل سے جالگا۔ جہاں نیک دل بادشاہ پولیزینیز کی سلطنت تھی۔ یہاں اینٹی گونس اُترا اور چھوٹی بچی کو زمین پر ڈال چلتا بنا۔ مگر اینٹی گونس کو صقلیہ پہونچکر لیونطیز کو یہ خبر دینی نصیب نہ ہوئی کہ اُسنے بچی کو کہاں پھینکا ہے۔ کیونکہ جونہی بچی کو زمین پر ڈال کر جہاز کی طرف واپس چلا تو ایک ریچھ نے جنگل سے نکل کر اُس پر حملہ کیا اور چشم زدن میں اینٹی گونس کے پرخچے اُڑا دئے۔ درحقیقت لیونطیز کے اس ظالمانہ اور پُراز معصیت حکم کی تعمیل کرنے کی وجہ سے وہ ایسی ہی سزا کا مستوجب تھا۔ بچی نہایت نفیس لباس اور بیش بہا جواہرات پہنے تھی۔ کیونکہ ملکہ نے بادشاہ کے پاس بھیجنے کے وقت نہایت خوبصورتی کے ساتھ آراستہ کیا تھا۔ اینٹی گونس نے ایک پرچہ لکھکر بچی کی شال میں ٹانک دیا تھا۔ اس پرچے پر پرڈوٹی تا لکھا ہوا تھا۔ یہ الفاظ مخفی طور پر بچی کی عالی نسبی اور بدقسمتی دونوں کی طرف اشارہ کرتے تھے۔

بچی صحرا میں پڑی تھی کہ ایک گڈریا اُدھر سے گذرا۔ یہ بڑا رحم دل تھا۔ اُس نے ننھی سی پرڈوٹی تا کو اُٹھالیا اور اپنے گھر بیوی کے پاس لے گیا۔ گڈریے کی بیوی نے بڑی شفقت اور محبت سے اُسے پالا۔ گڈریا غریب آدمی تھا اُسے خوف ہوا کہ مبادا بچی کے ساتھ جو جواہرات تھے اور جو اُس کے ہاتھ لگے ہیں اُسکا راز دوسرے کو معلوم ہوجائے۔ لہذا اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ جہاں وہ اس وقت رہتا تھا اُسے چھوڑکر کسی دوسرے مقام پر آباد ہوجائے۔ جہاں کسی کو یہ شُبہ نہ گزرے کہ اتنی دولت اُسکو کہاں سے ملی۔ اُس نے پرڈوٹی تا کے جواہرات میں سے تھوڑے سے جواہرات بیچ کر بھیڑوں کا ایک بڑا گلّہ خریدا اور رفتہ رفتہ وہ ایک مالدار گڈریا بن گیا۔

پرڈوٹی تا کو اُس نے اپنی اولاد کی مثل پالا اور یہ لڑکی بھی بجز اس کے کچھ نہ جانتی تھی کہ وہ ایک گڈریے کی بیٹی ہے۔ پرڈوٹی تا جوان ہوکر طرفہ دلفریب حسینہ نکلی۔ اس کی تعلیم و تربیت گڈریوں کی بیٹیوں کی طرح ہوئی تھی۔ لیکن فطرتی خوبیاں جو اُسکو اپنی ماں ملکہ کی طرف سے خون میں ودیعت ہوئی تھیں وہ اُس کے غیر تربیت یافتہ دل میں اس طرح روشن اور تاباں تھیں کہ کوئی شخص اُس کے انداز و اطوار دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اُس کے تربیت کسی بادشاہ کے دربار میں نہیں ہوئی ہے۔

بوہیمیا کے بادشاہ کا ایک اکلوتا بیٹا تھا جس کا نام فلوری زیل تھا۔ ایک مرتبہ یہ نوجوان شہزادہ گڈریے کے گھر کے آس پاس شکار کھیلتا تھا کہ یکایک اُس کی نگاہ بڈھے گڈریے کی بیٹی پر پڑی اور پرڈوٹی تا کے حُسن و جمال، شرم و حیا، شاہانہ وضع و انداز کو دیکھتے ہی ہزار جان سے اُس پر فدا ہوگیا۔ اُس نے فوراً اپنا اصلی نام بدل کر ڈوریکل رکھ لیا اور ایک شریف آدمی کا بھیس بدلکر گڈریے کے گھر آنے جانے لگا۔ فلوری زیل جب دربار سے اکثر غیر حاضر پایا گیا تو پولیزینیز کو فکر ہوا اور فوراً جاسوس لگا کر معلوم کرلیا کہ اُسکا بیٹا ایک گڈریے کی خوبصورت بیٹی کا اسیرِ محبت ہوچکا ہے۔

پولیزینیز نے کیمیلیو کو بلا بھیجا۔ یہ وہی وفادار کیمیلیو تھا جس نے پولیزینیز کو صقلیہ کے دربار سے فرار ہونے میں مدد کی تھی۔ اور خود بھی لیونطیز کے قہر و غضب کے ڈر سے بوہیمیا میں رہ پڑا تھا اور پولیزینیز ہی کے دربار میں رہنے لگا تھا۔ قصہ مختصر پولیزینیز نے کیمیلیو سے کہا کہ وہ اُسکے ہمراہ گڈریے کے گھر تک چلے یعنی پرڈوٹی تا کے نام نہاد باپ کے گھر تک۔

بادشاہ بوہیمیا اور کیمیلیو دونوں بھیس بدلے ہوئے گڈریے کے گھر میں آئے۔ یہاں بھیڑوں کے اُون کاٹنے کی تقریب میں عام ضیافت کا اہتمام ہورہا تھا۔ پولیزینیز اور کیمیلیو اگرچہ ناخواندہ مہمان تھے مگر ایسے موقع پر ہر مہمان کے لئے دروازہ کھلا ہوتا ہے۔ غرض گھر والوں نے خوشی سے اُن کا خیر مقدم کرکے اُن کو بھی ضیافت میں شریک ہونے کے لئے کہا۔ اس وقت خوشی اور مسرت کا ہر طرف دور دورہ تھا۔ میزیں لگی تھیں اور ایک دہقانی ضیافت کی اعلیٰ پیمانے پر تیاریاں ہورہی تھیں۔ گھر کے سامنے ایک میدان تھا جہاں گھاس کے ہرے ہرے تختے پر زندہ دل اور خوش باش لڑکے لڑکیاں

ناچ رہے تھے۔ کچھ جوان لڑکے ایک پھیری والے بساطی سے گھر کے دروازے پر فیتے، دستانے اور اسی قسم کی اور چیزیں مثلاً کھلونے وغیرہ خرید رہے تھے۔

ایک طرف تو یہ دلکش نظارہ تھا دوسری طرف فلوری زیل اور پرڈوی تا علیحدہ ایک گوشے میں آرام سے بیٹھے سرگرم راز و نیاز تھے۔ انہیں یہ خواہش نہ تھی کہ وہ آس پاس والوں کی تفریحوں میں دلچسپی لیں۔

بادشاہ نے بھیس اس خوبی سے بدلا تھا کہ شہزادہ باپ کو بالکل نہ پہچان سکا۔ اس لئے بادشاہ بلا تردد آگے بڑھا کہ دونوں کی گفتگو سن سکے۔ پرڈوی تا کا فلوری زیل سے اندازِ گفتگو نہایت لطیف، دلفریب، شستہ اور پاکیزہ تھا۔ یہ دیکھکر پولیز ینیز نے متعجب ہوکر کیمیلیو سے کہا کہ "طبقہ ادنیٰ میں ایسی حسین لڑکی میری نظر سے آج تک نہ گذری تھی اُس کا ہر قول و فعل، اُس کی حیثیت اور درجے سے کہیں بڑھکر معلوم ہو رہا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ جگہ اُسکے لئے موزوں نہیں۔ وہ اس سے کہیں اعلیٰ و ارفع ہے"

کیمیلیو نے کہا کہ "واقعی وہ دودھ اور بالائی سب سے بڑھکر ہے"

بادشاہ نے گڈریئے سے پوچھا "مہربان یہ تو بتاؤ کہ یہ خوبصورت لڑکا جو تمہاری بیٹی سے باتیں کر رہا ہے کون ہے؟"

گڈریئے نے جواب دیا "اُس کا نام ڈورکل ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ میری بیٹی سے اُسے محبت ہے۔ اور سچ پوچھئے کہ دونوں کی محبت کا اندازہ کرنے میں یہ بتانا مشکل ہے کہ کس کو زیادہ محبت ہے۔ بہرکیف اگر نوجوان ڈورکل اس کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے تو اُس وقت میں اُس کو ایک ایسی چیز دوں گا جس کا اُسے خواب میں بھی خیال نہ آیا ہوگا" گڈریئے کا اشارہ پرڈوی تا کے بقیہ جواہرات کی طرف تھا جو اُس نے بھیڑوں کا گلہ خریدنے کے بعد پرڈوی تا کی شادی کے لئے بڑی احتیاط اور حفاظت سے رکھ چھوڑے تھے۔

اب پولیز ینیز اپنے بیٹے سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا "اے نوجوان کیسے ہو تمہارا دل تو کسی اور ہی خیال میں غرق معلوم ہوتا ہے۔ ضیافت کی طرف سے تم نے اپنا خیال دوسری طرف کر رکھا ہے۔ جب میں جوان تھا تو جس سے محبت رکھتا تھا اُس کو انواع و اقسام کے تحائف سے گراں بار کر دیتا تھا مگر تم نے تو بساطی کو یونہی جانے دیا اور اپنے منظورِ نظر کیلئے کچھ نہ خریدا"

نوجوان شہزادے کو مطلق خیال نہ تھا کہ اس کا باپ اُس سے گفتگو کر رہا ہے۔ اُس نے یہ جواب دیا کہ "میری محبوبہ کی نگاہ میں ان چیزوں کی کچھ قدر و قیمت نہیں ہے۔ پرڈوی تا کو جن تحائف کی مجھ سے ملنے کی اُمید ہے وہ میرے گوشۂ دل میں محفوظ ہیں" پھر پرڈوی تا کی طرف مخاطب ہوکر کہا کہ "اے پرڈوی تا جو کچھ میں عشق و الفت کے اس آزمودہ کار شریف کے سامنے کہہ رہا ہوں اُسے سُنو۔ یہ شریف خود بھی کسی زمانے میں گرفتارِ محبت رہ چکا ہے اور جو اقرار میں اس وقت کرتا ہوں وہ یہ شریف بھی سُنیں گے" پھر فلوری زیل نے اس سن رسیدہ شریف (پولیز ینیز) سے کہا کہ "آپ میری شادی کے مقدس معاہدے سے جو میں پرڈوی تا سے کرتا ہوں شاہد و گواہ رہیں گے"

بادشاہ اتنا سُنتے ہی آگ بگولا ہوگیا اور کہنے لگا کہ "اے نوجوان میں تمہارے عقد کا نہیں بلکہ طلاق کا شاہد رہوں گا" اس کے بعد بادشاہ نے ایک ادنیٰ طبقہ کی لڑکی کے ساتھ شادی کا معاہدہ کرنے پر بیٹے کو نہایت سخت و سُست کہا۔ اور پرڈوی تا کو گڈریئے کی چھوکری اور گڈریئے کا کانٹا اور ایسے ہی اور ذلیل ناموں سے اُسے موسوم کیا اور پرڈوی تا کو دھمکایا کہ "اگر تو نے کبھی ہمارے فرزند کو اس گھر میں ملاقات کی اجازت دی تو ہم تجھے اور تیرے باپ گڈریئے کو بڑی اذیت اور تکلیف دے کر مروا ڈالیں گے"

جب بادشاہ چلا گیا تو پرڈوی تا کی شاہانہ فطرت اور غیرت بادشاہ کے لعن طعن پر حرکت میں آئی اور دل میں کہنے لگی کہ "گو ہمارے ساتھ بڑی بدسلوکی کی گئی ہے۔ مگر جو باتیں بادشاہ نے کہی ہیں اُن سے مجھے کچھ زیادہ خوف نہیں ہے۔ دو ایک مرتبہ بے اختیار جی چاہا کہ بادشاہ سے کہوں کہ وہی چمکتا سورج جو آپکے بادشاہی محل کو اپنی روشن کرنوں سے منور کرتا ہے وہ ہماری اس جھونپڑی کو بھی روشن کرتا ہے۔ اس کے بعد نہایت افسوس اور رنج کے لہجے میں کہنے لگی "مگر اب مجھے اس خواب سے بیدار کر دیا گیا ہے اور میں آئندہ اس کی کچھ پرواہ نہیں کروں گی۔ بس مجھے چھوڑو، مجھے اپنی بھیڑوں کا دودھ دوہنے جانا ہے۔ اور اب دودھ دوہوں گی اور روؤں گی"

رحم دل کیمیلیو، پرڈوی تا کی اس ہمت اور موزوں طرزِ عمل سے بہت خوش ہوا اور یہ دیکھکر کہ نوجوان شہزادہ اس کم سن ماہ وش کی محبت میں اسقدر ڈوبا ہوا ہے کہ اپنے باپ بادشاہ کے حکم سے بھی اپنی محبوبہ سے دست بردار نہیں ہوسکتا۔ کیمیلیو کے ذہن میں ایک بات اس وقت آئی اور وہ یہ تھی کہ ان دونوں چاہنے والوں کی رفاقت کرے اور کوئی ایسی تدبیر عمل میں لائے جس سے کہ یہ دونوں عاشق و معشوق اپنی مُراد کو پہنچیں۔

کیمیلیو کو عرصے سے خبر تھی کہ لیونطیز بادشاہِ صقلیہ سچے دل سے اپنے گناہوں سے تائب ہوچکا ہے۔ اور کیمیلیو اگرچہ وہ اس وقت بادشاہِ بوہیمیا کا نہایت معتمد مقرب مصاحب تھا تاہم اُسے آرزو تھی کہ ایک مرتبہ اور اپنے پُرانے آقا لیونطیز بادشاہِ صقلیہ اور اپنے گھربار اور وطن کو دیکھے۔ اس لئے اُس نے فلوری زیل اور پرڈوی تا کو یہ رائے دی کہ وہ اُس کے ساتھ صقلیہ چلیں۔ اور وہاں پہونچکر کیمیلیو بادشاہِ صقلیہ سے اس بات کا اقرار کروائے گا کہ بادشاہ اِن دونوں کو اپنی حفاظت میں سوقت تک رکھے جب تک کہ پولیزینیز اِن دونوں کو باہم شادی کرنے کی اجازت دیدے

فلوری زیل اور پرڈوی تا نے کیمیلیو کی اس تجویز کو بخوشی منظور کیا۔ اب کیمیلیو نے ان دونوں کی فراری کا ہر طرح سے بندوبست کیا اور بوڑھے گڈریے کو بھی ساتھ چلنے کے لئے کہا۔

گڈریا اپنے ساتھ پرڈوی تا کے بقیہ جواہرات اور اُس کی شیرخوارگی کے کپڑے اور وہ پرچہ جو اُس کی شال میں ٹکا ہوا ملا تھا یہ سب چیزیں ساتھ لیتا گیا۔ آخر کار اُن کا سفر بخیر و خوبی ختم ہوا۔ اور فلوری زیل، پرڈوی تا، کیمیلیو اور بوڑھا گڈریا بادشاہ لیونطیز کے دربار میں پہونچ گئے۔ لیونطیز ابھی تک اپنی ملکہ کے غم میں سراپا سوز اور اپنی گمشدہ بیٹی کے ماتم میں تباہ حال تھا۔ جب کیمیلیو سامنے آیا تو وہ اپنے اس پُرانے جاں نثار سے بہت مہربانی سے پیش آیا۔ اور فلوری زیل کی بڑی خاطر و مدارات کی۔ فلوری زیل نے پرڈوی تا کو اپنی شہزادی کہکر بادشاہ سے تعارف کروایا۔ جیسے ہی بادشاہ کی نظر پرڈوی تا پر پڑی تو اُسے محسوس ہوا کہ اُس کی کل توجہ پرڈوی تا کی طرف مبذول ہوگئی۔ پرڈوی تا میں اپنی ملکہ سے جو مرچکی تھی ایک خاص مشابہت دیکھی اور اُس کے دل کے دیرینہ زخم پھر ہرے ہوگئے اور بے اختیار اُس کی زبان سے نکلا کہ "اگر میں نے اپنی بیٹی کو اس قدر ظلم کے ساتھ ہلاک نہ کروادیا ہوتا تو شاید وہ آج ایسی ہی حسین اور دلفریب لڑکی ثابت ہوتی"۔ پھر فلوری زیل سے کہا "افسوس میں نے تمہارے بہادر باپ کی دوستی، اُلفت و صحبت کو اپنے ہاتھ سے کھودیا اور اب میں پھر اُس کے دیدار کا اپنی جان اور زندگی سے زیادہ خواہشمند ہوں"۔

جب بوڑھے گڈریے نے دیکھا کہ بادشاہ نے پرڈوی تا کی طرف اسقدر توجہ فرمائی ہے اور یہ بھی سُنا کہ بادشاہ کی ایک بیٹی تھی جو شیرخوارگی ہی کے زمانے میں خطروں میں پڑکر گم ہوگئی ہے تو اُسنے پرڈوی تا کو جسوقت جنگل میں پڑا دیکھا تھا اُسوقت کے حالات یاد کرنے شروع کئے۔

پرڈوی تا کو جس طرح جنگل میں پڑا پایا تھا اور پھر اُس کے جواہرات اور دیگر علامات جو اُس کے عالی نصب ہونے کی دلیل تھیں۔ ان باتوں کو سوچکر گڈریا اس نتیجے پر پہونچا کہ پرڈوی تا اور بادشاہ کی گمشدہ بیٹی درحقیقت ایک ہی ہیں۔ فلوری زیل، پرڈوی تا، کیمیلیو اور وفادار پولینا کی موجودگی میں بڈھے گڈریے نے بادشاہ سے بیان کیا کہ کس حال میں اُس نے اس بچی کو پڑا دیکھا تھا۔ اینٹی گونس کی موت کا واقعہ بھی سُنایا کہ کس طرح ریچھ نے جنگل سے نکل کر اُس پر حملہ کیا پھر وہ نفیس شال پیش کی جس میں پولینا کو یاد آگیا کہ ہرمیونی نے بچی کو لپیٹا تھا۔ گڈریے نے ایک جواہر پیش کیا جو پولینا کو یاد تھا کہ ہرمیونی نے پرڈوی تا کے گلے میں ڈالدیا تھا۔ گڈریے نے وہ پرچہ بھی پیش کیا جو شال میں ٹکا ہوا ملا تھا۔ اِس پرچے کو دیکھتے ہی پولینا نے فوراً کہہ دیا کہ اُس پر جو کچھ لکھا ہے وہ اُس کے شوہر کے ہاتھ کا ہے۔ اب مطلق شک و شبہ کی گنجائش نہ رہی کہ پرڈوی تا لیونطیز کی بیٹی ہے۔ بغرض اس وقت شریفانہ رنج و مسرت کی کشمکش جو پولینا کے دل میں ہوگی اُس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اِدھر شوہر کی موت کا صدمہ اُدھر آریکل کی پیشین گوئی پوری ہوجانے کی مسرت سے جذبات میں کیا کچھ تلاطم پیدا نہ ہوا ہوگا۔ آریکل نے بادشاہ کے وارث تخت کے بارے میں جو خبر دی تھی وہ بھی حرف بحرف پوری ہوئی۔ بادشاہ کی عرصے سے گمشدہ بیٹی بھی مل گئی۔ جب لیونطیز نے سُنا کہ پرڈوی تا اُسی کی لخت جگر ہے تو اُس کے رنج و الم کی کوئی حد نہ رہی۔ رہ رہ کر دل میں ایک ہوک اُٹھتی تھی کہ اگر آج کو ہرمیونی زندہ ہوتی تو اپنی بیٹی کی اِس موہنی مورت کو دیکھکر کیسی نہال ہوجاتی۔ اس صدمے کا بادشاہ پر اسقدر اثر ہوا کہ بہت دیر تک اُسکے مُنہ سے سوائے اِس جملے کے "ہائے بیٹی تیری ماں، ہائے بیٹی تیری ماں"، اور کچھ نہ نکلا۔

پولینا نے اس مسرت انگیز مگر غم آلود نظارے کا رنگ لیونطیز سے یہ کہکر بدلا "جہاں پناہ میرے پاس ایک بُت ہے جس کو حال ہی میں اٹلی کے نادر روزگار بُت تراش جولیو رومنیو نے تیار کیا ہے، یہ بُت ملکہ سے اس قدر مشابہت رکھتا ہے کہ اگر جہاں پناہ میرے غریب خانے پر اُسے دیکھیں تو فوراً خیال کریں کہ ہو نہ ہو یہ ملکہ ہرمیونی ہے"۔

یہ سُنکر سب کے سب وہاں گئے۔ بادشاہ اپنی ہرمیونی کے اِس ہم شبیہ بُت کو دیکھتے ہی بیتاب ہوگیا۔ پرڈوی تا بھی جس نے اپنی ماں کو نہ دیکھا تھا ماں کو دیکھنے کی بڑی آرزومند تھی تاکہ معلوم کرے کہ ماں کی شکل صورت کیسی تھی۔ پولینا نے بُت کے سامنے کا پردہ اُٹھایا تو بُت ہرمیونی سے اسقدر مشابہ نظر آیا کہ اُسے دیکھکر بادشاہ کا سارا غم و رنج از سرِ نو تازہ ہوگیا۔ دیر تک اُس میں بات یا جنبش کرنے کی طاقت نہ تھی۔

یولنیا نے اِس سکوت کو یہ کہکر توڑا "خداوندِ نعمت آپ کی اس خاموشی کا میرے دل پر اچھا اثر ہے کیونکہ یہ چیز آپکے تعجب اور تحیر کو اور بھی واضح کرتی ہے۔ حضور فرمائیں کیا یہ بُت آپ کی ملکہ سے ملتا جُلتا نہیں ہے؟"

آخر کار بادشاہ نے کہا "ہاں یولنیا، وہ اِسی طرح عزت و وقار اور متانت کے ساتھ اُس وقت کھڑی تھی جبکہ میں نے پہلے پہل اُس سے اظہارِ اُلفت کیا تھا، مگر تاہم یولنیا، ہرمیونی ایسی عمر رسیدہ نہ تھی جیسی کہ اس مورت سے معلوم ہوتی ہے۔"

یولنیا بولی "حضور، بُت تراش کا یہ اور بھی کمال ہے کہ اُس نے بُت کو ایسا بنایا ہے کہ اگر ہرمیونی آج کو زندہ ہوتی تو اُس کی یہی شکل و صورت ہوتی۔ اچھا جہاں پناہ آپ مجھے پردہ ڈالنے دیجئے کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ گمان کرنے لگیں کہ یہ بُت حرکت بھی کرتا ہے۔"

بادشاہ نے جواب دیا "یولنیا پردہ ہرگز نہ گراؤ۔ کاش میں آج کو زندہ نہ ہوتا۔ کیمیلیو ذرا دیکھو تو، کیا تمہارا خیال نہیں ہوتا کہ یہ مورت سانس لے رہی ہے اور اُس کی آنکھوں میں حرکت بھی معلوم ہوتی ہے۔"

یولنیا نے کہا "جہاں پناہ مجھے پردہ گرانے دیجئے۔ حضور تو فرطِ مسرت میں اس قدر بے خود ہوئے جاتے ہیں کہ کہیں یہ یقین نہ کرنے لگیں کہ بُت زندہ ہے۔"

بادشاہ بولا "پیاری یولنیا، مجھے تو بیس برس تک یہی خیال کرنے دو کہ میری ہرمیونی زندہ ہے۔ مجھے تو اس بُت کی طرف سے ہوا کا ہلکا ہلکا جھونکا آتا محسوس ہوتا ہے۔ یہ کس بُت تراش کا دستِ ہنرمند تھا جس نے بُت میں یہ کمال دکھایا ہے کہ وہ سانس بھی لیتا معلوم ہوتا ہے۔" بادشاہ نے کہا "اب چاہے کوئی کیسا ہی میرا مضحکہ اُڑائے میں تو اِس بُت کو بوسہ دیتا ہوں۔"

یولنیا بول اُٹھی "نہیں آقا ایسا ہرگز نہ کریں۔ بُت کے لبوں کی سُرخی ابھی تازی ہے۔ بوسے میں آپ اپنے لبوں کو رنگ و روغن سے آلودہ کرلیں گے۔ حضور کیا میں پردہ ڈالدوں؟"

بادشاہ نے جواب دیا "نہیں، نہیں، بیس برس فرقت میں گذرے ہیں، اتنے ہی دن اور اِس صورت کو دیکھ لینے دو۔ اس پر پردہ نہ ڈالو۔"

پرڈوئی تا جو اِس وقت تک گھٹنے ٹیکے فرش پر کھڑی تھی اور خاموشی کے ساتھ تعریف و تحیر کی نگاہوں سے اپنی پیاری ماں کی مورت کو دیکھ رہی تھی کہنے لگی کہ "اگر یہی میری پیاری اماں ہے تو میں اُن کی صورت اِسی طرح کھڑی عمر بھر دیکھنے کو تیار ہوں۔"

یولنیا نے لیونطیز سے کہا کہ "یا تو آپ اپنی اِس حالتِ بیخودی کو دُور کریں یا مجھکو پردہ گرا دینے کی اجازت دیں یا پھر آپ اس سے بھی زیادہ تعجب اور حیرت انگیز نظارے کے لئے اپنی طبیعت کو آمادہ فرمائیں۔ میں واقعی اِس بُت کو حرکت میں لاسکتی ہوں۔ اور اس سے زیادہ یہ کہ بُت جس ستون پر کھڑا ہے وہاں سے اُتر کر آپکے ہاتھ میں ہاتھ دیدے۔ لیکن اُس وقت شاید آپ یہ خیال کرنے لگیں کہ میں کوئی ساحرہ ہوں یا کوئی خبیث رُوح میرے تابع ہے۔ حالانکہ نہ میں کوئی جادوگرنی ہوں اور نہ کوئی رُوح میرے قبضے میں ہے۔"

متعجب و متحیر بادشاہ نے کہا کہ "آپ جس طرح اس پیاری مورت کو جنبش میں لائینگی میں دیکھونگا اور جو کچھ آپ اسکی زبان سے کہلوائینگی تو میں اُسے سُنونگا۔ کیونکہ اُس کی زبان سے کچھ کہلوانا ایسا ہی آسان ہے جیسا کہ اُسے حرکت میں لانا۔"

اب یولنیا نے دھیمی لے میں ایک پُر اثر اور مناسب حال گانا گانے کے لئے حکم دیا جو اُس نے خاص اِسی موقع کے لئے تیار کروا رکھا تھا۔ اور پھر دیکھنے والوں کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُنہوں نے دیکھا کہ بُت جس ستون پر کھڑا تھا وہاں سے اُترا اور لیونطیز کے گلے میں اپنی باہیں ڈال دیں اور پھر اُس نے بولنا شروع کیا اور اپنے شوہر اور بچے کے لئے خُدا سے رحمت و برکت کی دُعا مانگی اور یہ بچہ پرڈوئی تا تھی جس کو اُس نے ابھی دیکھا تھا۔ بُت کا اپنا سر لیونطیز کے شانوں پر رکھنا اور اپنے شوہر اور بچے کے حق میں دُعائے خیر کرنی کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ کیونکہ یہ بُت فی الحقیقت بُت نہ تھا بلکہ خود ہرمیونی تھی جو واقعی زندہ تھی۔

یولنیا نے بادشاہ کو ہرمیونی کی موت کی خبر غلط دی تھی کیونکہ اُس وقت اِسی میں مصلحت دیکھی تھی کہ بادشاہ کے ظلم سے ملکہ کی جان بچانے کیلئے یہ غلط خبر دی جائے اور یہی ذریعہ یولنیا کے ذہن میں اُس وقت آیا تھا۔ اُس وقت سے غمزدہ ملکہ شریف اور نیک دل یولنیا کے ساتھ رہا کی مگر اِس طویل عرصے میں یہ مناسب نہ سمجھا کہ وہ بادشاہ کو اپنے زندہ رہنے کی اطلاع دیتی۔ لیکن جب پرڈوئی تا کے مل جانے کی خبر سُنی تو پھر نہ رہا گیا۔ ملکہ کو جس قدر تکلیفیں لیونطیز نے پہونچائی تھیں، عرصہ ہوا تھا کہ اس نیک بخت ملکہ نے اُنہیں معاف کر دیا تھا لیکن جو ظلم و ستم اُس نے اپنی معصوم بچی پر کیا تھا

سے معاف نہ کرسکی تھی۔ اب جب ملکہ کو خبر پہونچی کہ اُس کی جگر گوشہ یعنی کم سن بچی مل گئی ہے تو ملکہ نے فرطِ مسرت سے بیتاب ہوکر اپنے کو ظاہر کر دیا۔

لیونطیز کی مُردہ ملکہ پھر زندہ ہوگئی اور بیٹی جو بچپن سے ہی گُم کر دی گئی تھی جس کے غم میں وہ اس قدر اشکبار اور سینہ فگار رہتا وہ بھی مل گئی تو اب اس فرقت نصیب لیونطیز کی مسرت کی کوئی حد نہ رہی اور اُس کا ضبط کرنا غیر ممکن تھا۔ اب چاروں طرف سے مبارک سلامت کا غلغلہ بلند ہوا دفترِ غم لپیٹ دیا گیا اور داستانِ محبت از سرِ نو شروع ہوگئی۔ اب کامران اور شادمان والدین نے فلورزی ذیل کا شکریہ ادا کیا جس نے اُن کی تحتِ جگر سے اظہارِ محبت کیا تھا اور یہ وقت وہ تھا جبکہ پرڈوٹا ایک ادنیٰ طبقے کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ والدین نے بوڑھے گڈریے کو بھی دُعا دی جس نے اُن کی بچی کی پرورش اور حفاظت کی تھی۔ پولینیا اور کیمیلیو کی خوشی اور مسرت کی بھی انتہا نہ تھی اور وہ خُدا کا ہزار ہزار شکر ادا کرتے تھے کہ اپنی وفادارانہ خدمت کا مبارک انجام دیکھنے کے لئے زندہ رہے۔ اس اثنار میں یہ عجیب اور غیر مترقبہ مسرت درجۂ تکمیل کو اس طرح اور پہونچی کہ بادشاہ بوہیمیا، پولیزینیز دربار میں داخل ہوا واقعہ یہ تھا کہ جب پولیزینیز کا بیٹا اور کیمیلیو، بوہیمیا میں تلاش کرنے پر بھی نہ ملے تو پولیزینیز نے سوچا کہ کیمیلیو عرصے سے صقلیہ واپس جانے کی خواہش رکھتا تھا۔ اس بنا پر خیال ہوا کہ یہ دونوں فراری کچھ عجب نہیں کہ صقلیہ میں ملیں۔ اس لئے نہایت سرعت کے ساتھ اُن کا تعاقب کیا اور حُسنِ اتفاق دیکھئے کہ وہ ایسے مسرت کے وقت پر آن پہونچا۔ جو لیونطیز کی زندگی میں خوش ترین حصۂ عمر تھا۔

پولیزینیز نے جشن اور عالمگیر مسرت میں شرکت کی اور اپنے دوست لیونطیز کے اس قصور کو کہ ملکہ کے معاملے میں اُس نے بادشاہ بوہیمیا کو اپنا رقیب سمجھا تھا سچے دل سے معاف کر دیا اور پھر یہ دونوں بادشاہ از سرِ نو اسی سرگرمی اور دفورِ جذبات سے جو لڑکپن میں رکھتے تھے ایک دوسرے سے محبت و اُلفت کرنے لگے۔

اب اِس بات کا کیا خطرہ ہوسکتا کہ پولیزینیز، فلورزی ذیل اور پرڈوٹا کی شادی کا مخالف ہوکر شادی کی اجازت نہ دے گا۔ پرڈوٹا اب گڈریے کی چھوکری یا گڈریے کا کانٹا نہ رہی تھی بلکہ صقلیہ کے تاج و تخت کی وارث اور حقدار ہوگئی تھی۔

غرض خُدا نے عرصہ دراز سے گرفتارِ مُصیبت ملکہ ہرمیونی کے صبر و نیکیوں کا اجر اس طرح پر دیا جو اوپر بیان ہوا۔ یہ اعلیٰ اور نیک خاتون برسوں زندہ رہی۔ اور اُسے اپنے شوہر لیونطیز اور اپنی بیٹی پرڈوٹا کے ساتھ بخوشی رہنا سہنا نصیب ہوا اور اپنے زمانے کی نہایت خوش ماں اور ملکہ تھی۔

(لیمب)　　فرخندہ اختر بیگم

بہترین لٹریچر کی کتابیں

نورا

(نرس کی چارہ گری)

وہ نوخیز نورا وہ اِک بنتِ مریم … وہ مخمور آنکھیں وہ گیسوئے پُرخم
وہ ارضِ کلیسا کی اِک ماہ پارا … وہ دیر و حرم کے لئے اِک شرارا
وہ فردوسِ مریم کا اِک غنچۂ تر … وہ تثلیث کی دُخترِ نیک اختر
وہ اِک نرس تھی چارہ گر جسکو کہیئے … مداوائے دردِ جگر جس کو کہیئے
جوانی سے طفلی گلے مل رہی تھی … ہوا چل رہی تھی کلی کھل رہی تھی
مری حکمرانی ہے اہلِ زمیں پر … یہ تحریر تھا صاف اسکی جبیں پر
وہ پُر رعب تیور، وہ شاداب چہرہ … متاعِ جوانی پہ فطرت کا پہرہ
کوئی اُس کو چھیڑے یہ جرأت نہ ہوتی … نظر بھر کے دیکھے یہ جرأت نہ ہوتی
سفید اور شفّاف کپڑے پہن کر … مرے پاس آتی تھی اِک حُور بن کر
وہ اِک آسمانی فرشتہ تھی گویا … کہ انداز تھا اُس میں جبریل کا سا
وہ اِک جامِ نوریں مرے میکدے کا … بُتِ مرمریں میرے آذر کدے کا
وہ تسکینِ دل تھی سکونِ نظر تھی … نگارِ شفق تھی جمالِ سحر تھی
وہ شعلہ، وہ بجلی، وہ جلوہ، وہ پرتو … سلیماں کی وہ اک کنیزِ سُبک رو
وہ انجیل پڑھ کر سُناتی تھی مجھکو … ہنساتی تھی مجھکو رُلاتی تھی مجھکو
وہ سیب اور انگور لے کے آتی … کبھی خود نہ کھاتی مجھی کو کھلاتی
مرض سخت تھا، اور میں مر رہا تھا … فقط ان پھلوں پر گذر کر رہا تھا
نقاہت کے عالم میں جب آنکھ اُٹھتی … نظر مجھکو آتی محبت کی دیوی
وہ اُسوقت اِک پیکرِ نور ہوتی … تخیل کی پرواز سے دُور ہوتی

گھڑی چُپ، گھڑی کرنے لگتی تھی باتیں
سرہانے مرے کاٹ دیتی تھی راتیں

عجب چیز تھی وہ عجب راز تھی وہ
کبھی سوز تھی وہ کبھی ساز تھی وہ

دوا اپنے ہاتھوں سے مجھکو پلاتی
"اب اچھے ہو" ہر روز مژدہ سُناتی

سرہانے مرے ایک دن سر جُھکائے
وہ بیٹھی تھی تکیہ پہ کہنی ٹکائے

خیالاتِ پیہم میں کھوئی ہوئی سی
نہ جاگی ہوئی سی نہ سوئی ہوئی سی

جھپکتی ہوئی بار بار اُس کی پلکیں
جبیں پُرشکن بے قرار اُس کی پلکیں

وہ آنکھوں کے ساغر چھلکتے ہوئے سے
وہ شفّاف عارض دمکتے ہوئے سے

لبوں میں تھا لعل و گہر کا خزانہ
نظر عارفانہ ادا راہبانہ

مہک گیسوؤں سے چلی آرہی تھی
مرے ہر نفس میں بسی جا رہی تھی

مجھے لیٹے لیٹے شرارت کی سُوجھی
جو سُوجھی بھی تو کس قیامت کی سُوجھی

ذرا بڑھ کے کچھ اور گردن جُھکا لی
لبِ لعل افشاں سے اِک شے چُرا لی

وہ شے جسکو اب کیا کہوں کیا سمجھئے
بہشتِ جوانی کا تحفہ سمجھئے

شرابِ محبّت کا اک جامِ رنگیں
سُبو زارِ فطرت کا اِک جامِ رنگین

میں سمجھا تھا شاید بگڑ جائیگی وہ
ہواؤں سے لڑتی ہے، لڑجائیگی وہ

میں دیکھونگا اسکے بپھرنے کا عالم
جوانی کا غصّہ بکھرنے کا عالم

میں سمجھا تھا مجکو جھنجھوڑیگی ظالم
مجھے کچھ سزا دے کے چھوڑیگی ظالم

اِدھر دل میں اک شورِ محشر بپا تھا
مگر اُس طرف رنگ ہی دوسرا تھا

ہنسی اور ہنسی اس طرح کِھلکِھلا کر
کہ شمعِ حیا رہ گئی جِھلملا کر

نہیں جانتی ہے مرا نام تک وہ
مگر بھیج دیتی ہے پیغام تک وہ

یہ پیغام آتے ہی رہتے ہیں اکثر
کہ کس روز آؤ گے بیمار ہوکر

مجاز
(بی، اے، (علیگ)

دو حادثوں کے درمیان

"بیٹی ذرا میرا بازو تھامنا" ایک فربہ اندام بڑھیا نے انٹر کلاس کے پائیدان پر پیر رکھکر ہانپتے ہوئے مجھے دیکھکر کہا۔ اور ساتھ ہی ایک بڑا سا بقچہ بغیر اس خیال کے کہ کسی پر پڑ گیا تو گھونسے کا کام دے جائیگا ڈبّہ میں پھینکدیا۔

ایک جھنکار ہوئی اور ریزگاریوں کا بھرا ہوا بٹوہ ہمارے سامنے آگرا۔

"اے روپے" میری ایک سہیلی نے بھرے ہوئے بٹوے کی طرف حریصانہ دیکھکر کہا۔

"اٹھالو" نسیمہ نے چپکے سے کہا۔

"ہشت" میں نے دونوں کو ڈانٹا۔

"یہاں جگہ نہیں ہے اماں" نسیمہ نے بڑھیا کی پندرہ سیکنڈ کی لگاتار کوشش، جس میں وہ ایک حد تک ڈبّہ میں چڑھنے میں کامیاب ہو چکی تھی، مسترد کرکے کہا۔

آجانے دو۔ تمہارا کیا لیتی ہے" میں نے بڑی بی کی دونوں کہنیاں پکڑکر سہولت سے انکو اندر گھسیٹتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی قلی نے اپنا وزن اس صفائی سے ہلکا کرنا شروع کیا کہ ہر وزنی چیز ہمارے پیروں کو توڑنے سے ذرا بچاتی ہوئی فرش پر گیند کی طرح لڑھک لڑھک کر بے ترتیبی سے ایک ڈھیر کی شکل اختیار کرتی گئی۔

"یہ کیا بیہودگی ہے" رضیہ نے غصّہ سے کہا۔ اس کی دو چوڑیاں ٹرنک کی "انجن در ڈبّہ" حرکت سے شہید ہو گئی تھیں۔ "تمام میرا ہاتھ ننگا کر دیا"

"مجبور ہیں بیبی" قلی نے اپنے گراں فرض سے سبکدوشی کے بعد تقاضا کرنا شروع کیا۔

"ایک نہ دیجیے۔ جب تک یہ کمبخت یہاں آکر سامان قرینے سے نہ جما دے" رضیہ نے اپنی سفید کلائی پر ملال آگیں نظریں ڈال کر کہا۔

"دیوانی ہوئی ہو۔ زنانہ ڈبّے میں قلی کو بلا رہی ہو" میں نے کہا۔

"اے واہ بی۔ بڑی آئی مردوے کو گاڑی میں بلانے والی" ایک ادھیڑ عمر کی لکھنوی نما خاتون نے کہا۔ انجن نے سیٹی دی اور گاڑی چلدی۔

"پیسے صاب پیسے" قلی نے پائیدان پر کھڑے ہوکر ڈبّہ کے اندر اطمینان سے سر ڈالکر مطالبہ کیا۔

بڑی بی نے ایک چوّنی پلیٹ فارم پر پھینکدی اور اپنے بکھرے ہوئے سامان سے کھینچ تان کرنے لگیں۔ مگر اسکو ترتیب سے جمانا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ پھر بھی وہ اسباب کے پہاڑ کو ایک ہموار پلیٹو کی شکل میں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ کبھی وہ پسینہ صاف کرکے ہمکو بھی امداد طلب نظروں سے دیکھنے لگتی تھیں۔ مگر ہم میں سے کوئی ٹس سے مس نہوا۔ صاف بات تو یہ تھی کہ ہم لوگ نہایت قیمتی لباس پہنے ہوئی تھیں جو کسی طرح اس مہم میں شامل ہونے کی ہم کو اجازت نہیں دیتا۔ لیکن مجھ سے نہ دیکھا گیا کہ بڑھیا اس قدر مصیبت اٹھائے اور ہم بیٹھی رہیں۔ چنانچہ میں نے اپنی امداد پیش کی۔ مجھے دیکھکر باد لِ نخواستہ نسیمہ نے بھی ہاتھ بٹایا۔ لیکن معزز و رضیہ اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ وہ اپنی چوڑیوں کا انتقام بڑھیا سے لے رہی تھی۔

تھوڑی دیر کی تگ و دو کے بعد جب سامان درست ہوگیا تو میں نے بڑی بی سے دریافت کیا کہ وہ کہاں جا رہی ہیں۔ انھوں نے ایک بڑی سی گلوری کلّے میں دبائی مٹھی بھر چھالیہ

مُنہ میں ڈالی۔ اس کے بعد بٹوے کے دوسرے خانے میں سے زردہ کی چٹکی لیکر کھالی۔ اور چند منٹ تک پان کو چبا کر پیک مُنہ میں بھر کر بیٹھ گئیں۔

بڑی بی باوجود بڑھاپے کے سُرخ و سفید تھیں۔ اُن کا لباس صاف ستھرا تھا۔ شکل سے معلوم ہوتا تھا کہ اچھے دن دیکھے ہوئی ہیں۔ خیر جب وہ زردہ کا مزا لے چکیں تو فرسٹ طبقہ کی ہوئی گاڑی کی کھڑکی کھول کر پیک باہر تھوکی۔ پیک کیا تھوکی گویا اُگالدان لوٹ دیا۔ ڈبہ کے اس سرے سے اُس سرے تک خاصی افشاں ہوگئی۔ چند چھینٹیں لکھنوی نما خاتون کے بستر پر بھی آ کر پڑیں لیکن شکر ہے وہ اس وقت مصروفِ استراحت تھیں۔

"بیٹی میں لکھنؤ جارہی ہوں۔ اور تم؟" بڑی بی نے گلوری کی "گلوگیر" آفت سے نجات پا چکنے کے بعد کہا۔

"ہم بنارس جارہی ہیں۔ لکھنؤ کی سیر کرنے کا بھی ارادہ ہے۔ کیا آپکا دولت خانہ لکھنؤ ہی ہے؟"

"ہاں اسے لکھنؤ ہی سمجھو۔ جہاں انسان کا روزگار ہو وہی اُس کا وطن ہے"

"تو وہاں آپکا کیا روزگار ہے؟" نسیمہ نے بھی سوال کیا۔

"میرا روزگار؟" بڑی بی نے ہنسکر کہا "میرا روزگار کیا ہوتا بیٹی۔ میرے لڑکے کی فرنیچر کی دوکان ہے اللہ اُسکی عمر میں برکت دے بڑا محنتی اور کماؤ بچہ ہے۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد نوکری کا خیال تک نہ کیا۔ بڑھئی کا کام سیکھا دو تین سال تک اپنے ہاتھ سے کام کرتا رہا اب خدا کے فضل سے پانچ دس نوکر ہیں مگر پھر بھی باریک کام خود کرتا ہے" بڑی بی نے یہ تقریر نہایت فخر کے ساتھ کی۔

گھنٹہ آدھ گھنٹہ بعد زردہ کا خمار کم ہونا شروع ہوا تو بڑی بی نے لمبی لمبی جمائیاں لینی شروع کیں۔ تکیے پر سر رکھدیا اور دراز ہوگئیں۔ رات کے دس بجے ہونگے۔ مجھے بھی نیند آنے لگی۔ چنانچہ میں بھی کھسک کر اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔

ہم لوگ اپنی ایک عزیز سہیلی کی شادی میں میرٹھ جارہی تھیں۔ یہ ظاہر کرنے کی تو چنداں ضرورت نہیں کہ اس پُرنشاط تقریب کا شادی بخش پروگرام کسقدر مملو از مسرت تھا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ہندوستان میں شادی کے مواقع پر کسقدر غیر ضروری طور پر روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ اس اسراف سے جسقدر دلچسپی کے سامان خریدے جاتے ہیں اُس کا نہ تو نفسِ نکاح سے کوئی علاقہ ہوتا ہے نہ دولھا دُلہن کی آیندہ زندگی کا نظام اس سے ترتیب پاتا ہے۔ صرف مراسم کے نباہ کی خاطر یہ فضول خرچیاں کی جاتی ہیں۔ میں اگرچہ ان تمام باتوں کے خلاف تھی لیکن انسان کا دل کمبخت چونکہ مسرت پسند واقع ہوا ہے باوجود ان تمام پراگندیوں کو سمجھنے کے جی چاہتا تھا کہ دل کھولکر تمام خوشیوں میں شرکت کیجائے۔ شادی بار بار نہیں آتی۔

رضیہ تو بڑی بی کی صورت سے جلی بیٹھی تھی چنانچہ وہ تو انکے پاس آکر تک نہ بیٹھی۔ نسیمہ بھی ان کی گفتگو میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ وہ بھی رضیہ کی گود میں سر رکھکر اونگھنے لگی۔ میں نے بھی بسیر دراز کر دیے۔ غرض سب پر غنودگی طاری ہوگئی۔

ابھی گھنٹہ بھر بھی اس حالت میں نہ گذرا ہوگا کہ ہمارے ڈبہ میں ایک دھماکا ہوا اور اس کے ساتھ ایک انسانی چیخ! سب بے اختیار چونک پڑے۔ اف عجیب دردانگیز نظارہ تھا۔ بڑی بی کا ٹرنک جسکو انھوں نے باوجود میری مزاحمت کے مچان پر رکھدیا تھا زور سے گرا۔ عین اُن کے اوپر۔ وہ سینے تک اس کے نیچے دبی ہوئی تھیں اور اُن کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ بجلی کی طرح ہم تینوں اٹھیں اور ہاتھوں پر ٹرنک کو اٹھا کر بڑھیا کو اس کے نیچے سے نکالا۔ وہ بیہوش تھیں اُن کے سینے پر جا بجا خون نکل آیا تھا۔

اور ہنسلی ٹوٹ گئی تھی!

"کیا مرگئی؟ زنجیر کھینچو" لکھنوی نما خاتون نے سراسیمگی سے کہا۔ نسیمہ نے لپک کر زنجیر کھینچی۔ اسقدر کہ بندریا کی طرح اس سے لٹک گئی۔ ریل ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ دفعتہً دھیمی ہوئی اور تقریباً دو منٹ میں بالکل رک گئی۔ شور و غل۔ ہلڑ۔ چیخ پکار بچوں کا رونا۔ عورتوں کی خوف زدہ آواز اور تقریباً کئی زبانوں سے نکلا ہوا ایک سوال "کیا بات ہے؟" ایسا لرزہ خیز منظر پیش کر رہا تھا کہ ہمارے دل دہل اٹھے۔ متحرک و منوم دنیا میں ایک دیو قامت انجن کے رکتے ہی زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ خواب کی پریاں ڈبوں سے نکل بھاگیں اور خوف کے عفریتوں نے مسافروں کے دلوں پر قبضہ کر لیا۔

"کوئی ڈبہ سے باہر نہ نکلے" ڈیوٹی پر کے سپاہی کی خواب آلودہ آواز آئی۔ گارڈ نے اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے ادھر ادھر لالٹین چمکائی اور ہراس زدہ لیکن منچلے مسافروں نے ہمارے ڈبے کا رخ کیا۔ چند سکینڈ بعد ہماری گاڑی کا دروازہ اور گارڈ کی انگریزی ٹوپی اور سپاہی کا صافہ نظر آیا۔ ہم نے برقعے گھسیٹ لئے اور دبک کر بیٹھ گئیں۔ میرا خیال تھا کہ بھائی صاحب بھی گاڑی رکتے آئیں گے۔ مگر وہ نیند کے بڑے متوالے ہیں، شاید پڑے سو رہے ہونگے۔

گارڈ نے موقع دیکھتے ہی حادثہ کا اندازہ لگا لیا اور بڑی بی کے بےحس جسم کو ٹٹولکر گلے کی ٹوٹی ہوئی ہڈی کا معائنہ کیا۔ اس کے بعد جن خطرات کی پیش بینی کے ساتھ وہ یہاں آیا تھا اس کی نفی کر کے ذرا مطمئن لہجہ میں بولا "ویل یہ بڈھی ٹرنک کے نیچے کیسے آگیا؟" اس سوال کو مکرر دھرایا گیا جس میں سپاہی صاحب نے بھی اپنی اردو دانی کے ثبوت میں شرکت فرما کر کہا "بتاؤ خواتینو کہ ٹرنک کس طرح گر گیا؟" لیکن ہماری جانب سے کوئی جواب نہ تھا۔ آخر لکھنو نما خاتون نے کہا۔

"ہمکو کیا خبر کیسے گر گیا۔ منع کیا تھا کہ نہ رکھو صندوق اوپر"

"تم ہے انکا آدمی؟" گارڈ نے خاتون سے پوچھا۔

"میں آپکو آدمی نظر آتی ہوں کیا؟" لکھنوی نما خاتون نے جواب دیا۔

"صاحب کی یہ مراد ہے کہ کیا آپ انکے ساتھ ہیں؟" سپاہی نے کہا۔

"ان کے ساتھ صرف یہ لڑکی ہے" لکھنوی نما خاتون نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔

"بی کچھ ہوش میں ہو" نسیمہ نے پہلی دفعہ کہا "یہ تمہارے سامنے تنہا پچھلے اسٹیشن سے گاڑی میں بیٹھی ہیں۔ تم میری بہن کو ان کے ساتھ کیسے بتا رہی ہو؟"

لکھنوی نما خاتون نسیمہ کے اعتراض سے خاموش ہوگئی۔

گارڈ نے آخر کہا "پھر ہوسپٹل میں اس کی دیکھ بھال کون کریگا؟" اس سوال پر سب خاموش ہوگئیں۔

"میں!" بے اختیار میری کپکپاتی آواز نکلی۔ اس کے بعد فوراً ہی شادی کی تقریب کی متوقع دلچسپیاں اور رنگ رلیاں میری نظروں کے سامنے آگئیں۔ آہ میں اب ان کا لطف نہیں اٹھا سکونگی۔ مجھے ایک بیمار بڑھیا کی نرس بننا پڑیگا۔ لیکن پھر خیال آتا تھا کہ تقریب کی دلچسپیاں مجھے مادی طور پر کیا شے بخش سکتی تھیں؟ ایک وقتی خوشی اور بس۔ لیکن ازراہ خداترسی اس بڑھیا کی تیمارداری فرض انسانی ہے۔ انسان کی زندگی کی قیمت، شادی کی شرکت کے مقابلے میں اپنی تمام مسرتوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ میں اپنے اس مبارک فیصلہ پر مستحکم ہوگئی۔

"ہوسپٹل میں اسکو نرس مل سکتا ہے۔ مگر زیادہ کمفرٹ پاس کے آدمی سے ملیگا" گارڈ نے کہا۔

نسیمہ و رضیہ بلا کی طرح میرے پیچھے پڑ گئیں۔ شاباش بٹو

تیرے سوا گروسے کو شفاخانہ میں اپنی چہیتی کی تیمارداری کرے گی، اپنے بھتیجے سے بھی پوچھا ہے۔ بڑی خود مختار بنی ہے۔ میاں سپاہی ذرا ان کے بھائی کو تو پچھلے کسی ڈبہ میں سے بلالاؤ۔ خدا تمہارا بھلا کریگا۔" رضیہ نے سپاہی سے کہا۔

لیکن دفعتہً دیکھتی ہوں کہ بال پریشان قمیص کے بٹن کھلے ہوئے۔ چہرے سے سخت سراسیمگی عیاں۔ بھائی صاحب اندر داخل ہوئے اور بے اختیار لپٹے "کیا معاملہ ہے؟" انکو دیکھکر مجھے تقویت ہوگئی۔ جب انکو تمام حادثہ سے آگاہی ہوگئی تو ذرا اطمینان ہوا۔ لیکن رضیہ نے پھر آگ لگادی۔ انکو مخاطب کرکے بولی "بھائی ذرا نجو کو سمجھاؤ۔ یہ دیوانی اس بڑھیا کے ساتھ اس کی تیمارداری کے لئے شفاخانہ جارہی ہے۔"

مجھے رضیہ کے روکھے پن پر نہایت غصہ آگیا۔ بگڑ کر بولی "دیکھو رضی میری حمیّت اسکی مقتضی نہیں کہ اس بے یار و مددگار ضعیفہ کو جسکو ایک تیماردار کی اشد ضرورت ہے۔ یوں تنہا شفاخانہ میں سڑنے کو چھوڑ دوں، شادی میں شریک نہ ہونے کا بیشک مجھے افسوس ہوگا لیکن اس افتادزدہ عورت کی خبرگیری میں مجھے زیادہ مسرت محسوس ہوگی۔ انسانی ہمدردی بھی آخر کوئی چیز ہے" بھائی صاحب مجھے حیرت سے دیکھتے رہے۔ وہ بھی بڑے رحمدل و نیک نفس انسان تھے۔ میرے عزم بالجزم سے متاثر ہوئے اور بولے "نجو کا کہنا درست ہے رضی۔ ہم جانوروں تک پر رحم کرتے ہیں تو یہ تو پھر انسان ہے۔ تم لوگ حمید (نسیمہ کا بھائی) کے ساتھ بنارس جاؤ۔ میں اور نجو اس ضعیفہ کی تیمار داری کیلئے یہیں اُترے جاتے ہیں۔"

چنانچہ ہم اس اسٹیشن پر اُتر گئے اور بڑھیا کو ایک آسالم وہ اسٹریچر پر لٹا کر شفاخانہ میں پہنچادیا اور ہم بھی اس کے ساتھ آگئے۔ صبح تک بڑی بی کو ہوش آچکا تھا۔ باہوش ہوکر اوّل تو وہ بہت چکرائیں کہ کہاں آگئیں۔ پھر یکے بعد دیگرے انکو تمام واقعات یاد آگئے۔ مجھے اور بھائی کو اپنے قریب دیکھکر متعجب ہوئیں۔ میں نے ان کی رفع حیرانی کے لئے جب اپنی موجودگی کی وجہ انپر ظاہر کی تو انھوں نے مادرانہ محبت سے ہم دونوں بہن بھائی کو پیار کیا اور بے شمار دعائیں دیں۔ بھائی نے اُن کے لڑکے کا پتہ معلوم کرکے ایک تار فوراً اُسکو بھی دیدیا۔

دوسرے روز تین بجے کے قریب بھائی بازار گئے ہوئے تھے تو ایک شریف صورت نوجوان زنانہ وارڈ کو دریافت کرتا ہوا آیا اور ایک نرس کی رہبری پر دراتا ہوا کمرے میں آگھسا۔ مجھے اتنا بھی موقع نہ دیا کہ اپنا دوپٹہ تو سنبھال لیتی۔ اس کی اس حرکت پر پہلے تو مجھے بڑا غصہ آیا۔ لیکن وہ اپنی ماں کی خیریت معلوم کرنے کے لئے اس قدر بیقرار تھا کہ بغیر اِدھر اُدھر دیکھے اُس نے دیوانہ وار بڑھیا کے کوچ کا رُخ کیا۔ میں نے بھی اسکی اس لغزش معصوم کو معاف کردیا۔

وہ نظارہ بڑا ہی رقت خیز تھا جبکہ نوجوان نے اپنا وجیہ چہرہ اپنی ماں کے ماؤف سینے پر رکھدیا تھا۔ بڑی بی اُس کے مُنہ کو اپنے لبوں تک لیجاکر ماں کی مخصوص محبت کے ساتھ چوم رہی تھیں۔ مجھے اس پُرمحبت نظارہ کا زیادہ موقع نہ ملا۔ نوجوان سنبھلا اور کرسی گھسیٹ کر کوچ کے قریب بیٹھ گیا۔ دفعتہً اُسکی نظریں میرے سمٹے ہوئے جسم پر بھی پڑیں اور اُس نے کسقدر حیرت سے دریافت کیا۔ "امّی یہ آپ کے کمرے میں کون خاتون ہیں؟" بڑی بی اس وقت میری موجودگی کو بالکل بھول گئی تھیں۔ خیال آتے ہی اُنھوں نے ہماری حقیر خدمات کا بڑے مبالغہ کے ساتھ بیٹے سے ذکر کیا۔ پھر مجھ سے بولیں "بیٹی تمہارے بھائی کہاں ہیں؟ انہیں وحید سے ملاؤ نا۔" میں لیکن شرم سے چپ چاپ بیٹھی رہی۔

نوجوان نے ایک گہری نظر سے میری جانب دیکھا۔ میں نے اپنے جسم کو اور چھپالیا۔ چند سیکنڈ تک وہ دیکھتا رہا۔ پھر اپنی

ماں سے بولا۔ "دنیا میں اب بھی ایسے ہمدرد و غمگسار انسان بستے ہیں جو اجنبیوں کے اس طرح بیغرضانہ کام آتے ہیں۔ محترم خاتون میں بصمیم قلب آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں آپکو میری وجہ سے تکلیف ہو رہی ہے اس لئے میں باہر جا بیٹھتا ہوں"

یہ کہہ کر وہ اٹھکر دروازے کی طرف چلدیا۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے اُس کے خوشنما بُشرے کو دیکھا لیکن وہ نیچی نظریں کئے نہایت شرافت سے باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد بھائی صاحب باہر سے آگئے۔ اور وحید سے ملاقات کرکے وہ بھی بہت خوش ہوئے وحید کے آجانکے بعد بڑی بی کو اب ہماری خدمات کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ چنانچہ اُنھوں نے لاتعداد دعاؤں کے ساتھ ہم دونوں کو رُخصت کیا۔ بھائی میں اور وحید میں بھی کافی دوستی پیدا ہو گئی تھی۔ کیونکہ دونوں تقریبًا ہم مذاق ہی تھے۔ رُخصت ہوتے وقت وحید نے ایک اُچٹتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی اور میں نے بھی اسکو گوشۂ چشم سے دیکھا۔ اسکے بعد ہم چلدئے۔

اس واقعہ کو دو سال گذر گئے۔ میرے حافظہ میں بڑی بی کا اور اُن کے حادثہ کا خیال بھی دُھندلا پڑ گیا تھا، بظاہر کوئی وجہ بھی نہ تھی کہ میں اس واقعہ کو یاد رکھتی۔ میری شادی کے مدت سے مختلف مقامات سے پیغام آ رہے تھے۔ ان پیغامات نے مجھے اپنے مستقبل کی سوچ میں ڈالدیا تھا۔ رات دن سوچتی تھی کہ شوہر کن صفات کا ہونا چاہیئے جس کے ساتھ پُرمسرت زندگی بسر ہو سکے۔

ایکدن بھائی صاحب میرے لئے ایک سنگار میز لائے۔ ابّا کو ان چیزوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ میرے لئے کپڑا کتابیں اور اسی قسم کی دیگر اشیا ہمیشہ بھائی صاحب ہی لایا کرتے تھے۔ دراصل ان کا اور میرا مذاق بالکل یکساں تھا۔ بس ایک بات میں انکے اور میرے درمیان اختلاف تھا۔ وہ اُردو شاعری پڑھتے تھے بلکہ خود بھی اچھے شاعر تھے اور میں تمام رنگین قسم کے اشعار سے جلتی تھی، سُوا یہ بھی کوئی مذاق ہے کہ ننھے ننھے بچے، محلہ کے تمام چھوکرے گا رہے ہیں عاشقانہ چیزیں۔ گلی میں سے گذر رہے ہیں تو "یا الٰہی مٹ نجائے دردِ دل"۔ الاپ رہے ہیں۔ بازار جا رہے ہیں تو "مُربجان مانگی تو کیا تم نے مانگا!" کی تانیں اُڑائی جا رہی ہیں۔ اگر کوئی غیر قوم اور غیر ملک کا انسان ہمارے محلوں میں آکر آباد ہو جائے اور ہماری اس لغو شاعری پر کبھی غور کرے تو وہ دل میں یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوگا کہ ہندوستانی نہایت ہی پُرہمیت لوگ ہیں اور ان میں یورپ سے بھی زیادہ عشق و عاشقی کا رواج ہے۔ "ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا" کی قسم کی نظمیں اسقدر کم ہیں کہ وہ سنجیدہ طبقہ سے منتقل ہوکر کبھی عوام تک آتی ہی نہیں ہیں۔

خیر تو بھائی صاحب میز لائے۔ بڑی نفیس تھی جب میں نہایت شوق و انہماک سے اس کا معائنہ کر رہی تو کمپنی کی مُہر پر میری نظر پڑی۔ ایک پیتل کی خوشنما تختی تھی جس پر "وحید اینڈ کو لکھنؤ" کندہ تھا۔ "وحید...... لکھنؤ؟" بے اختیار میری زبان سے یہ دو نام نکل گئے۔ اس کے بعد ریل کا سفر، بڑی بی، حادثہ، شفاخانہ اور آخر میں وحید ——— وحید مع اپنی وجاہت کے میری نظروں کے سامنے تھا۔

"وحید اینڈ کو۔ لکھنؤ۔ یہ میز وحید کے کارخانہ کی ہے۔ اُن کی والدہ نے کہا تھا کہ نازک کام وہ ہمیشہ اپنے ہاتھ سے کرتا ہے۔ ممکن ہے یہ اس کے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی ہو" آہستہ آہستہ میری زبان سے نکلا۔ میں نے مناسب جگہ میز کو رکھدیا اور فورًا ہی اُسکو ضروری اشیا سے سجا دیا۔ اس کے بعد اُسکے سامنے کھڑی ہوکر نامعلوم کیا کیا سوچنے لگی۔ اب بڑی بی اور حادثہ دونوں کا خیال فرسودہ سا ہو چکا تھا لیکن اس میز کے بنانے والے کا خیال بالکل ہی نیا تھا اور ہلکی ہلکی لذت بخش رہا تھا۔

جس قدر میں اس خیال میں پختگی محسوس کرتی تھی اسیقدر لذّت میں اضافہ اور سرور میں زیادتی پاتی تھی۔ یہ دونوں باتیں غیر اختیاری تھیں۔ میں بالعمد میز کے کاریگر کے خیال میں منہمک نہیں ہو رہی تھی بلکہ میز مجھے اپنے صنّاع کے تصوّر میں غرق کئے دے رہی تھی۔ وہ اس کا شفاخانہ میں ڈرتا ہوا چلا آنا اور اپنی مادرِ مہربان کے سینے پر پیار سے سر رکھ دینا۔ اس کے بعد میری تکلیف کے خیال سے شریفانہ باہر چلا جانا۔ یہ تمام باتیں اس وقت میری نگاہوں کے سامنے تھیں۔

رات کو سوئی تو اسی کیف آور تصوّر کیساتھ۔ جیسے میز کے سامنے کھڑی ہوں اور اسے دیکھے جا رہی ہوں۔ وحید مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ یہ میز تم کو پسند ہے نا۔

اسی خیال میں سو گئی۔ خواب میں دیکھتی ہوں کہ امّی چیخ رہی ہیں اور بھائی صاحب کو کوس رہی ہیں کہ ایسی ردّی میز کے لئے پیسے برباد کرتا پھرتا ہے۔ انہوں نے کچھ جواب دیا تو امّی کو تاؤ آ گیا۔ اٹھا کر صحن میں پھینکدی۔ لیکن بھائی صاحب نے فوراً اسکو ہاتھوں پر سنبھال لیا۔ یوں میری محبوب میز ٹوٹنے سے بچ گئی۔

صبح اٹھتے ہی فوراً کمرے میں گئی اور ایک سفید کپڑے سے اسکو نہایت احتیاط سے صاف کرنے لگی بجائے اس کے کہ اس کے سامنے بیٹھ کر سنگار کرتی۔ الٹا میز کا سنگار کرنا شروع کیا۔ غرض کئی روز میری یہی حالت رہی۔ ایک روز صبح اس کے سامنے کھڑی ہوئی چوٹی گوندھ رہی تھی۔ ہیئر کلپ لگا کر جو اپنے چہرے کو دیکھتی ہوں تو بالکل قریب، بہت ہی پاس کیا دیکھتی ہوں کہ وحید کھڑے ہوئے مسکرا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی حسین ٹھوڑی ہلکے سے میرے شانے پر رکھ رکھی ہے اور اپنے دونوں ہاتھوں کا حلقہ بناتے مجھے اُن کے بیچ میں لئے کھڑے ہیں۔ میں نے گھبرا کر جو پیچھے دیکھا تو کچھ نہ تھا۔ میں اکیلی کھڑی تھی اور چوٹی کا سرا میرے ہاتھ میں تھا۔

اِس طلسمِ خیال کے ٹوٹنے کا بڑا افسوس ہوا۔ پھر آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر بہتیرا چاہا کہ وحید پھر میرے پاس اسی طرح آ کر کھڑے ہوں۔ مگر اب وہ شاید میری اگلی حمقانہ سراسیمگی سے ناخوش ہو گئے تھے۔ نہیں آئے۔ شام کو گلی میں سے ایک بچہ گاتا ہوا گزرا۔ میں کبھی اِن شہدوں کے گانے اور الاپنے پر دھیان نہیں دیتی تھی لیکن آج یہ ناشدنی ایسا شعر گا رہا تھا گویا مجھ ہی سے باتیں کر رہا ہو سے

اسقدر تیرا تصوّر کبھی بڑھ جاتا ہے
آئینہ دیکھوں تو مُنہ تیرا نظر آتا ہے

سچ کہتا ہے کمبخت۔ اور آج سے پہلے جو کچھ یہ لوگ بک چکے ہیں سب سچ تھا!

میں نے ابھی تک بھائی صاحب سے بھی نہیں کہا تھا کہ یہ میز کہاں کی بنی ہوئی ہے۔ کئی بار جی میں آئی کہ ان سے تو کہدوں کہ یہ میز آپ کے دوست وحید کے کارخانے کی بنی ہوئی ہے۔ شاید اسی طرح میری وحشت میں کچھ کمی آ جائے۔ مگر پھر خیال آتا کہ ایسا نہ ہو وہ کہیں شک گرفتہ ہو جائیں۔ اس خیال سے چپ ہو گئی، دوپہر کو جب وہ میرے لئے ایک کتاب لائے تو میں نے بلا ارادہ ان سے کہدیا "بھائی صاحب یہ میز تو بہت اچھی ہے۔ آپ نے یہ بھی دیکھا کہ وہ کہاں کی بنی ہوئی ہے؟"

"نہیں تو۔ یہاں فرنیچر کی ایک نئی ایجنسی قائم ہوئی ہے، چنانچہ میں اور قاسم (رضیہ کا بھائی) ایک ایک سنگار میز خرید لائے۔ تمہاری رضیہ کے پاس بھی ایسی ہی میز ہے۔ لاؤ دیکھوں کس کمپنی کی بنی ہوئی ہے" یہ کہہ کر وہ دیکھنے اٹھے۔ اور بیتر پڑھ کر ایک دم چونک اُٹھے۔ "ایں وحید؟ واہ رے کاریگر۔ لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ یہ اسی نے بنائی ہو۔ تم نے خوب خیال رکھا ناظرہ۔ میں کل ہی اسکو خط لکھتا ہوں کہ تمہارے کارخانے کی ایک حسین میز ہم نے بھی خریدی ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ میں بھی عجیب

نسہان کا انسان ہوں۔ مدت سے اسکو کوئی خط ہی نہیں لکھا ہے" یہ کہتے ہوئے وہ چلے گئے۔

وحید کو خط لکھنا تو مجھے چاہیئے کیونکہ میز میری تھی اور پسند بھی مجھ ہی کو زیادہ آئی تھی مگر حیا مانع تھی۔ وہ دل میں کیا کہیں گے کہ عجیب بے باک لڑکی ہے۔ اس خیال سے چپ ہو گئی۔

بعض دفعہ میں اپنی حالت کا خیال کر کے خود بخود شرمانے لگتی۔ وحید میں آخر ایسی کونسی بات تھی کہ میں اپنی خرم زندگی کے آزاد لمحات اس کے خیال میں مٹ کر مکدر کئے جا رہی تھی۔ بظاہر کوئی خاص نہ تھی۔ میں نے دل پر جبر کرنا شروع کیا، ضبط سے کام لیا، عقل کو کام میں لائی اور جذبات کی بودی دنیا سے روگردانی کی، میرے اندر ایک قسم کی تسکین سی پیدا ہونے لگی اور چند روز بعد وحشت میں بھی ایک گونہ کمی آگئی۔ اگر کوئی شخص جذبات کی غلط رہبری سے منحرف ہونے میں کامیاب ہو جائے تو وہ بھی میری طرح سکون حاصل کر سکتا ہے۔ اب مجھے اپنی شادی کی فکر بھی اس قدر نہیں رہتی تھی جس قدر پہلے تھی۔ کہیں بھی ہو جائے۔ میں سمجھونگی کہ جہاں دنیا میں اسقدر حشرات الارض پیدا ہوتے ہیں اُن میں ایک میں بھی ہوں چاہے مجھے کوئی پیر سے کچل ڈالے چاہے زندہ رہنے دے۔ لیکن بشریت۔ یہ میرے غرور بشری کو ٹھیس لگاتی۔ نہیں اسکو اکساتی اور میں سوچنے لگتی کہ جب میں انسان پیدا ہوئی ہوں تو مجھے انسان ہی کی سی زندگی گذارنی چاہیئے۔ جانور کی سی نہیں۔ لیکن کس کے ساتھ؟ کسے باشد۔۔۔ نہیں صرف وحید باشد!

بہر نوع میں نے وحید کی دراندازِ تصور کی اب اگلی سی پذیرائی کرنی ترک کر دی تھی۔ کبھی کبھار خیال آجاتا تھا لیکن جب آتا تھا تو ماسوا اپنے اثرات کے دل کے گوشے گوشے میں سے ضبط و تحمل، تعقل و خودداری کے ذرات کو نکال باہر کرتا۔ میں اس جذباتی آندھی سے مدتوں نہیں سنبھلتی۔ خدا خدا کر کے پھر اگلا سکون حاصل کرنے میں کامیاب ہو پاتی تھی۔

چھ ماہ اسی دار و گیر میں گذر گئے۔ الہ آباد میں ایک عظیم الشان آل انڈیا سودیشی نمائش ہونیوالی تھی۔ بڑے زوروں کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ آخر وہ دن بھی آگیا۔ نمائش شروع ہوئے چوتھا روز ہو گا کہ بھائی صاحب نے شام کو اصرار کیا کہ میں بھی ان کے ہمراہ چلوں۔ میں نے رضیہ و نسیمہ کو بھی بلوا لیا غرض رات کو بھائی صاحب قاسم۔ حمید۔ نسیمہ۔ رضیہ اور میں نمائش میں پہنچے۔ بڑا اژدھام تھا۔ نہایت عمدہ عمدہ دوکانیں تھیں نسیمہ ایک ایک چیز کی تعریف کر رہی تھی اور ساتھ ہی اپنے بھائی سے خریدنے کے لئے ضد بھی کئے جا رہی تھی۔

ہم شیشے کا سامان دیکھتے ہوئے ایک کپڑے کی دوکان کی طرف جا رہے تھے کہ پیچھے سے کسی کے بھاگتے ہوئے آنے کی آواز آئی۔ اس کے بعد آنیوالا بھائی صاحب کے کوٹ کا کالر پکڑ کر بولا:۔ "ہو تو بڑے نالائق۔ میں نے پچاس آوازیں دے ڈالیں مگر آپ ہیں کہ کانوں میں انگلی دیئے چلے جا رہے ہیں"۔

بھائی صاحب نے حیرت سے پیچھے مڑ کر دیکھا اور ارے کہہ کر وحید سے لپٹ گئے۔ رضیہ و نسیمہ بھی اپنے اپنے برقعہ میں کلبلائیں اور اس برہنہ سر صرف قمیص و پاجامہ پہنے ہوئے نوجوان کو حیرت سے دیکھنے لگیں۔ میرے منہ سے ایک مسرت و حیرت کی چیخ نکلنے والی تھی لیکن میں نے جلدی سے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ ارے یہ یہاں کہاں؟ بھائی صاحب نے قاسم و حمید سے بہت زوردار الفاظ میں وحید کا تعارف کرایا اور ادھر چپکے سے میں بھی اپنی سہیلیوں کو بتایا کہ وہ کون ہے۔

"کیا تم بھی اپنی دوکان لائے ہو وحید؟"

"نہیں تو جیب کترنے یہاں آگیا ہوں" وحید نے کہا۔

"تم ہو تو نرے کودن۔ دیکھتے نہیں ہو یہ محض قمیص میں ہیں ایسا ایٹ ہوم دوکان والا ہی ہو سکتا ہے"۔

قاسم نے بھائی صاحب سے کہا۔

"آپ تو ہیں بوچ۔ غ۔ د۔ کیا ایک بھٹیارا نہیں ہو سکتا قمیص میں؟" بھائی صاحب نے کہا۔

"مگر سرخیل بھٹیاراں کیا بھٹیارے کے دوکان نہیں ہوتی؟" وحید نے بھائی صاحب سے کہا۔ غرض اُن کو سب نے ملکر خوب بنایا۔

دفعتہً وحید نے ہم تینوں (جو ان سے علیحدہ جا کھڑی ہوئی تھیں) کی طرف دیکھکر کہا "میں ان خواتین کی خدمت میں آداب بجا لاتا ہوں اور اگر ان میں ہماری محسنہ صاحبہ بھی شامل ہیں تو اُن کی خدمت میں ایک رکوع ممنونیت ــــــ"

وحید کو اپنی "محسنہ" پہچاننے میں اب دقت نہ رہی تھی اُس کے ان الفاظ کیساتھ ہی میرے جسم میں سرور کا تشنج و مسرت کی کپکپی پیدا ہوگئی اور میں شرما کر اپنی سہیلیوں کے پیچھے جا چھپی۔

وحید ہم سب کو اپنی دوکان میں لے گیا۔ اُس کے شوروم میں گاہکوں کا اجتماع تھا۔ لیکن وہ ہم کو اپنی پرائیویٹ جگہ میں لے گیا۔ کرسیوں کی تو کمی ہی نہ تھی۔ قیمتی صوفوں سے لیکر معمولی اسٹول تک موجود تھے۔

"کیا پیوگے؟" وحید نے بھائی صاحب کے شانوں پر زور دیتے ہوئے دریافت کیا۔

"پہلے سگریٹ پھر از قسم ٹھنڈا پانی۔" انھوں نے کہا۔

"اس کے یہ معنی کہ تم کو پیاس ہی نہیں ہے۔ ورنہ پہلے پانی مانگتے۔" وحید نے کہا۔

"نہیں جناب۔ مفت راجہ گفت کے خیال سے انھوں نے پانی کا نام دیا ہے۔ انھوں نے سوچا کہ آپ اتنے تو کیا بداخلاق ہونگے کہ محض پانی پر ٹال دینگے۔ پلائینگے تو سوڈا آئس کریم یا لیموں جوس۔" قاسم نے ہنستے ہوئے وحید سے کہا۔

"وحید تم اس کے چکمے میں نہ آنا۔ یہ اس وقت میرے کندھے پر رکھکر بندوق چھوڑ رہا ہے۔ اپنی خواہش آئس کریم کا گس

مزے سے اُس نے اظہار کیا ہے۔ اُمید ہے تم باوجود بیوقوف ہونے کے سمجھ گئے ہو گے؟" بھائی صاحب نے کہا۔

غرض چھ گلاس آتے۔ تین ہمارے اور تین ہمارے بھائیوں کے لئے۔

"اور تم؟" بھائی صاحب نے وحید سے دریافت کیا۔

"ہم نہیں۔" اس نے انہیں چھینکتے ہوئے جواب دیا۔ "بڑے زور کا نزلہ ہو رہا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا ویکس کا رومال ناک سے لگا لیا۔

میں جرعہ جرعہ اپنا گلاس ختم کر رہی تھی۔ میرے سامنے ایک بڑا سا شیشہ تھا جس میں وحید کا ہر رخ صاف نظر آرہا تھا۔ اور وہ ہر رخ سے اس وقت نہایت ہی وجیہ نظر آرہا تھا۔ میں دیوانہ وار اُسکو شیشے میں دیکھے جا رہی تھی۔ نسیمہ نے چپکے سے کہا بھی کہ کیا اپنی بھین شیشے میں دیکھ رہی ہو؟" اس خیال سے کہ کہیں وہ نہ آمرے میرے نزدیک میں نے جواب ہی نہیں دیا۔

مجھے کیا معلوم تھا کہ وحید کے سامنے بھی کوئی آئینہ ہے اور اس میں وہ میری اشتیاق کی دنیا کو بلتا ہوا دیکھ رہا ہے۔ نہ میں بھائی صاحب کی طرف دیکھوں نہ مجھے معلوم ہو کہ یہ جو کبھی کبھی آئینہ میں نظریں ملجاتی ہیں دراصل یہ ان کا اصلی معانقہ ہے پھر تو میں نے گھبرا کر آنکھیں نیچی کر لیں اور ذرا کھسک کر بیٹھ گئی۔

جب ہم کو یہاں آدھ گھنٹہ ہو گیا تو بھائی صاحب نے کہا "تو میاں اب ذرا کالش کی سیر کریں۔ چلو وحید تم بھی۔"

"ان کا کیوں ہرج کرتے ہو۔" حمید نے کہا۔ اس کے بعد اُس نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا "چلو بھئی اٹھو تم لوگ بھی۔"

نسیمہ لیکن تھک گئی تھی اُس اپنے بھائی سے کہدیا کہ وہ بہت تھک گئی ہے۔ میری تو دلی تمنا تھی کہ اب یہاں سے اٹھوں ہی نہیں چنانچہ دل ہی دل میں نسیمہ کو دعائیں دینے لگی۔

"ان لوگوں کو تو کبھی ساتھ لانا ہی نہیں چاہیے۔" حمید نے کہا۔

"کیوں کیا ہوا تھک گئیں۔ خیر انکو یہاں آرام کرنے دو۔ آؤ ہم ہی ذرا چکر لگا آئیں" قاسم نے کہا۔

"کیوں بھائی ہم جائیں تم کو کوئی عذر تو نہیں" بھائی صاحب نے ہم سے پوچھا۔ ہم نے بیک زبان نہیں کہدیا۔

ان لوگوں کے ساتھ ہی وحید بھی باہر چلا گیا۔ ہم نے برقعے سر سے سرکا لئے اور اطمینان سے بیٹھ گئیں۔

"ناظرہ وحید ہے تو شکیل" نسیمہ نے مجھ سے کہا۔

"پھر کیا! ارادہ ہے؟" رضیہ نے اس سے پوچھا۔

"یہ تو اسی سے پوچھو" نسیمہ نے جواب دیا۔

"تم تو ہو دونوں دیوانی — مجھے —— ہیں —— وہ" مگر میں اس پیام مسرت کی تردید میں کچھ نہ کہہ سکی۔

"کچھ لکھا پڑھا ہے؟" نسیمہ نے پھر کرید کرنی شروع کی۔

"ذرا جی سا معلوم ہوتا ہے" رضیہ نے مجھے چھیڑنے کو کہا۔

"تمہارا سر گریجویٹ ہے" میں باوجود ضبط کے تفاخر نہ چھپا سکی۔

"اچھا جی؟" نسیمہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"خوب! یہ میری ننھی کو کس طرح پتہ چلا؟" رضیہ نے اسکے تمسخر میں شرکت کرتے ہوئے کہا۔

"تم دونوں تو ہو کوڑھ مغز۔ تم کو یاد نہیں بڑی بی نے ریل میں خود کہا تھا کہ وہ ——"

دفعتہً دونوں کو یاد آ گیا۔ مگر یہ کب ماننے والیاں تھیں، پھر میرے چٹکی لینے لگیں۔

اس محفوظ جگہ میں گرمی سخت تھی۔ ہم پسینے پسینے ہوئی جا رہی تھیں۔ میں ایک ردی اخبار سے اور رضیہ نسیمہ اپنے برقعے کے دامن سے پنکھا جھل رہی تھیں کہ اتنے میں وحید بجلی کا پنکھا لئے اندر داخل ہوئے۔ رضیہ و نسیمہ الماری سے لگی بیٹھی تھیں اس لئے محفوظ تھیں۔ میں ہی کمبخت بالکل سامنے تھی۔ وہ جو آئے تو ہماری چار آنکھیں ہو گئیں۔ میں نے جلدی سے برقعے کا پلو اونچا کر لیا اور میری سہیلیوں نے بغیر یہ جانے کہ کون میری تقلید کی۔

"آپکو اور تو کسی شے کی ضرورت نہیں؟" اس بار انھوں نے براہِ راست مجھ سے دریافت کیا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا کہ کوئی جواب دے مگر وہ دونوں تو گویا منہ سی کر بیٹھ گئیں تھیں۔ آخر میں نے ہی کہا۔ "نہیں۔ شکریہ"

"امی کو معلوم نہ تھا کہ ایسی سعید ساعت بھی آئیگی کہ میں آپ سے ملاقات کر سکونگا۔ ورنہ وہ ضرور آپکو دعا کہتیں۔ ہر دم اُن کی زبان پر آپکا ہی نام رہتا ہے" وحید بولے۔

"آپ میری جانب سے ان سے سلام علیک کہدیجئے" میں نے آہستہ سے کہا۔

رضیہ و نسیمہ میری طرف آنکھیں جھپکا کر مسکرائیں۔ میں اُنسے کچھ اور کہنے والی تھی کہ ان کی اس حرکت سے میری آواز بند ہو گئی۔ چند سیکنڈ انتظار کرنے کے بعد وحید چلے گئے۔

"اماں کی زبان پر ہر وقت آپ ہی کا نام رہتا ہے۔ اور بیٹے کا کیا حال ہے؟" نسیمہ نے وحید کے فقرے کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔ رضیہ نے قہقہہ لگایا اور میں بھی ہنس پڑی۔

گھنٹے آدھ گھنٹے بعد ہمارے بھائی صاحبان بھی آ گئے اور بھائی صاحب وحید کو دوسرے روز اپنے مکان پر مدعو کر کے ہم کو لیکر روانہ ہوئے۔

دوسرے روز وحید دوکان چھوڑ چھاڑ پانچ بجے شام کو آ دھمکے۔ یہاں حمید و قاسم پہلے ہی سے موجود تھے۔ نسیمہ و رضیہ کو بھی میں نے بلا لیا تھا۔ تھوڑی دیر تک برج اُڑتا رہا تھا اس کے بعد وحید نے بھائی سے پوچھا۔ "اچھا اب کھانا کس وقت کھلواؤ گے بھوک لگ رہی ہے"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ تم دعوت کا نام سُنکر صبح ہی سے فاقہ

شروع کردو گے ورنہ جلدی انتظام کرنا" بھائی صاحب نے کہا۔

"آپکو وحید صاحب کچھ شعر و شاعری سے بھی دلچسپی ہے؟" قاسم نے دریافت کیا۔

"بجد" وحید نے کہا "سنایئے کچھ اپنا کلام"۔

"میں تو شاعر نہیں ہوں۔ ہمارے دوست مجید (بھائی صاحب) شاعر ہیں" قاسم نے کہا۔ واقعہ یہ ہو کہ خوب شعر کہتے ہیں"۔

"شعر کہتے نہیں ہیں بلکہ جنتے ہیں" حمید نے کہا۔

"بہر نوع تجھ بانجھ سے تو اچھا ہوں" بھائی نے کہا۔

"لے بی ہم تو تمہارے ہی بال بچوں کو دیکھکر خوش ہولیا کرتے ہیں۔ اللہ تمہارے ہی سہاگ کو قائم رکھے" حمید نے جواب دیا۔ سب ہنسنے لگے۔

"اچھا میاں مجید کچھ سناؤ" وحید نے بھائی سے اصرار کیا۔

"بھئی ہمارے پڑھنے کی طرز اچھی نہیں ہے۔ قاسم سے گواؤ ہمارا کلام" بھائی نے کہا۔

"گواؤ؟ کیا قاسم صاحب گانے سے بھی واقف ہیں۔ یہ تم نے پہلے کیوں نہ کہا۔ اچھا مولوی قاسم صاحب سنایئے۔ مجید کا کلام"

"دیکھو بھئی اگر کلام برا ہو تو میں داد سے محروم نہ کر دیا جاؤں" قاسم نے کہا۔

"تمہارے بھیا گوئیے بھی ہیں؟" میں نے رضی سے کہا۔

"یہ تو خاندان کا خاندان مراثی ہے۔ تمہیں نہیں معلوم؟" نسیمہ نے رضی کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"چپ بھی رہو ذرا۔ بھیا شروع کر رہے ہیں" رضیہ نے اپنی خفت مٹانے کی غرض سے کہا۔

"ذرا سنبھلکر گا بیٹا آپ کا گانا براڈ کاسٹ کیا جائے گا" بھائی نے قاسم سے کہا۔

قاسم نے مسکرا کر بھائی کی ایک غزل گائی اور خوب گائی۔

بہت دیر تک یہی سلسلہ جاری رہا یہانتک کہ کھانے کا وقت آگیا۔

کھانا کھانے کے بعد ہم سب کے سب پھر نمائش میں جا پہنچے۔ پھر مثل سابق وحید کی دوکان پر آرام کیا۔ اور چلتے وقت انھوں نے رقیہ و نسیمہ کو ایک ایک نہایت قیمتی آبنوسی صندوقچہ اور مجھکو ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی سنگار میز دی۔ ہمارے بھائیوں نے بہت انکار کیا مگر وحید کا اصرار سب پر غالب آگیا۔ ایک ہفتہ اسی طرح مسرت سے گذر گیا۔ اس کے بعد وحید چلے گئے۔

ایک روز میں اپنی نئی سنگار میز پر خرافات جما رہی تھی کہ ایک دراز کو جو کھولا تو اس میں باحتیاط ایک لفافہ رکھا دیکھکر سخت حیران ہوئی۔ پہلے تو خیال ہوا کہ شاید وحید کے کاروبار کا کوئی لفافہ غلطی سے اس میں آگیا ہے۔ اسی خیال کے ساتھ اسکو نکال کر پڑھا۔ لیکن یہ دیکھکر کسقدر حیرت ہوئی کہ وہ میرے ہی نام تھا۔ اسمیں تحریر تھا۔

"میری محسنہ

آپ اس خط کو اپنے نام دیکھکر شاید متعجب ہونگی لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے، میں ایک صاف اور سیدھی سی بات آپکی خدمت ناز میں عرض کر دینا چاہتا ہوں۔ اگر آپ میری عزت افزائی میں اپنی کسر شان نہ سمجھیں تو میں بھائی مجید کو آپکی مجھ سے نسبت کر دینے کے متعلق خط لکھوں۔ امید ہے آپ میرے اس روکھے پھیکے خط سے ناراض نہ ہونگی"۔

وحید"

"واقعی کسقدر روکھا پھیکا خط ہے" میں نے خط کو تہہ کرتے ہوئے کہا۔ لیکن پھر صرف اس خیال سے کہ وحید کی تحریر ہے پھر پڑھا۔ پھر پڑھا۔ کئی بار پڑھا۔ دفعتہً میری نظر خط کے کونہ پر پڑی جس کو بیخودی میں میں نے دیکھا بھی نہ تھا۔ وہاں لکھا تھا:۔

"ناظرہ میں تم کو پیار کرتا ہوں، دل وجاں سے تم کو چاہتا ہوں"

اس فقرے کو پڑھکر جسقدر مسرت مجھے ہوئی وہ وحید کے تمام خط سے نہیں ہوئی تھی۔ آہ محبت! کیسا میٹھا بول ہے۔ وحید تم مجھے

چاہتے ہو تو میں بھی تم کو ــــــ" کہتے کہتے میں اپنے آپ سے شرما گئی۔

وحید میرے جواب کا انتظار کر رہے ہونگے۔ مگر میں اُنکو لکھتی تو کیا لکھتی۔ خاموش ہو گئی۔ ایک روز میں امّی، ابّا اور بھائی کھانا کھا رہے تھے کہ ایک تار آیا۔ ہماری امّی بڑی کمزور طبیعت کی انسانی ہیں۔ لقمہ ہاتھ کا ہاتھ میں رہگیا۔ بھائی صاحب نے جلدی سے تار پڑھا اور اُن کی زبان سے ایک اندوہگیں لہجہ میں صرف اسقدر نکلا "افسوس بُرا ہوا"۔ ابّا جواب تک صبر سے تار مضمون کا انتظار کر رہے تھے ضبط نہ کر سکے اُنھوں نے بھی جھپٹ کر تار اُٹھایا اور پڑھکر بھائی سے بولے "یہ وحید کون؟ اچھا وہ تمہارے دوست؟"

ہائے میرا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ کیا خدانخواستہ انپر کوئی اُفتاد آپڑی؟ کس سے پوچھوں کس طرح پوچھوں؟ والدین کی موجودگی قیامت تھی۔ شکر ہے بھائی نے یہ فقرہ کہہ کر میری پریشانی اور اُلجھن کو ہلکا کر دیا "جی ہاں - وہی - اُنکی ہی والدہ کا انتقال ہو گیا"۔

"ایں! بھائی صاحب کیا بڑی بی مر گئیں؟ ہے ہے۔ بڑی اچھی تھیں" میری زبان سے بے اختیار نکل گیا "توبہ" امّی نے لقمہ مُنہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "اچھا تم لوگوں نے مجھے پریشان کیا۔ میں سمجھی کہ اپنے عزیزوں میں سے خدانخواستہ کوئی چل بسا"۔

"امّی وہ بھی بڑی ہی نیک عورت تھیں۔ اگر آپ اُن سے ملتیں تو اپنے عزیزوں کو بھول جاتیں" بھائی صاحب نے کہا۔

مجھے بڑا صدمہ ہوا اور بھائی صاحب کو بھی۔ کھانے سے اُٹھ گئے۔ لاکھ امّی و ابّا نے اصرار کیا لیکن بھوک ہی نہیں رہی تھی۔

شام کو بھائی صاحب نے لکھنؤ جانے کے لئے بستر باندھا۔ ابّا کو جب معلوم ہوا تو وہ بغرضِ تعزیت انکے ہمراہ جانے کو تیار ہو گئے۔ میرا سفر کے لئے اصرار کرنا بھیل سا تھا چنانچہ چُپ ہو گئی۔ وہ تو بھائی صاحب ہی نے پوچھ لیا "تیری طبیعت چاہتی ہو تو تو بھی چلی چل"۔ حالانکہ میرا مطلق جانے کا قصد نہ تھا لیکن اُن کی اس تحریک سے فوراً آمادہ ہو گئی۔ ابّا نے کہا بھی کہ وہ جا کر کیا کریگی۔ خیر شام کو ہم سب روانہ ہو گئے اور وحید کو اپنی آمد کا تار دے دیا۔ وہ اسٹیشن پر موجود تھا۔ نہایت تپاک سے ہمکو اُتارا اور اپنے خوش وضع مکان پر لے گیا۔

دو روز ہم یہاں رہے۔ اس عرصہ میں ابّا اس کے مہذب اطوار اور شریفانہ طور و طریق سے اسقدر متاثر ہوئے کہ اس سے وہ بھی بیحد محبت کرنے لگے۔ دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد میں دوسرے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وحید ذرا بازار گئے تھے۔ ابّا اور بھائی صاحب پاس والے کمرے میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ کیا باتیں تھیں۔ بس اتنا سمجھ لیجئے کہ دونوں باپ بیٹے کی نظر میں وحید بالکل جچ گئے تھے میرے لئے اُن سے بہتر کوئی بَر اُن کو ملنا مشکل تھا۔ ابّا چاہتے تھے کہ وحید کو امّی بھی دیکھ لیں چنانچہ اُن کا غم غلط کرنے کو اُنھوں نے وحید کو الہ آباد چلنے کی ترغیب دی جس کیلئے وہ آمادہ ہوگئے۔

دوسرے روز ہم اسٹیشن پر پہنچے۔ ذرا جلدی آ گئے تھے مجھے زنانہ ویٹنگ روم میں بٹھا دیا گیا جہاں ایک اور معمر ورسی عورت پہلے سے موجود تھی جس کو بھائی صاحب وغیرہ نہیں دیکھ پائے تھے۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی آ گئی۔ اور چند منٹ بعد وہ عورت اپنا بُرقع لادکر چلدی۔ ۲ منٹ ۳ منٹ ۵ منٹ گذر گئے لیکن مجھے لینے کوئی نہ آیا۔ ابھی میں اس حالتِ انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی کہ انجن نے سیٹی دی اور ٹرین روانہ ہوئی۔ میں گھبرا کر باہر نکلی اور بھاگتی ہوئی پلیٹ فارم پر پہنچی۔ مگر میرے سامنے سے تیزی سے گاڑی گذر رہی تھی نہ تو کہیں بھائی صاحب نظر آئے نہ ابّا۔ اتنی ہمّت نہ تھی کہ دوڑکر چڑھ جاتی۔ دفعتہً آگے نکل جانے والے ایک ڈبّہ میں سے کسی کی گھبرائی ہوئی آواز میں مجھے پکارا۔ میں کیا کر سکتی تھی گاڑی میرے سامنے سے نکل چکی تھی۔ بوکھلائی ہوئی اُس کے پیچھے دوڑی۔ ناگہاں رواں گاڑی میں سے کوئی کُود ا ریل کی

رفتار نے اُسکو اسقدر دھکا دیا کہ وہ دور تک پلیٹ فارم پر لڑھکتا چلا گیا۔ آہ! وحید تھے۔ وہ مجھے دیکھکر دوڑتی ہوئی گاڑی میں سے کود پڑے تھے۔ لوگ دوڑ پڑے اور اُن کو جاکر اُٹھایا۔ میں بھی شرم وحیا کو بالائے طاق رکھکر اِس طرف لپکی۔ وہ اب تک زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ میں اُن کے قریب پہنچی اور گھبراکر ان پر جُھک گئی۔ انھوں نے آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھکر اُٹھ بیٹھے۔ "آپکے کہیں چوٹ تو نہ آئی؟" ایک ہمدرد انسان نے اُنسے دریافت کیا۔

"نہیں صرف چکر آگیا تھا" یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے مسکرا کر بولے "فکر نہ کیجئے میں بفضلہ بالکل محفوظ ہوں" اس کے بعد وہ مجھے ویٹنگ روم میں لے گئے۔

"آپ آرام کرسی پر لیٹ جایئے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپکے کوئی چوٹ نہ آئی" میں نے آہستہ سے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ کسقدر مغالطہ ہوا ہے ہمکو" انھوں نے ہنستے ہوئے کرسی لیکر کہا "ہم سب سمجھے کہ تم گاڑی میں بیٹھ چکی ہو۔ کیا تمہارے کمرے میں کوئی اور خاتون بھی تھی؟"

"جی۔ اچھا انکو دیکھکر آپ سمجھے کہ میں ہوں۔ مگر تاہم احتیاطاً آپکو ویٹنگ روم میں آکر دیکھنا چاہیئے تھا" میں نے کہا۔

"کاش مجھے یہ اختیار حاصل ہوتا" انھوں نے حسرت سے کہا۔ واقعی بھائی صاحب اور ابا کی موجودگی میں وہ کس طرح مجھے دیکھنے آتے۔

"ابا اور بھائی صاحب معلوم نہیں مجھے کہاں ملیں گے" میں نے پریشانی سے کہا۔

"گھبرایئے نہیں۔ آپکی آسائش کے لئے میں بھی اپنی جان کا فرض کردونگا۔ میرا خیال ہے وہ دوسری گاڑی سے ابھی واپس یہیں آجائیں گے۔ ابھی ڈاؤن ٹرین بھی یہاں آنیوالی ہے"

"آپکو اس طرح چلتی ریل میں سے نہیں کودنا چاہیئے تھا۔ خدانخواستہ......" میں خاموش ہوگئی۔

"نہیں میں ریل کے نیچے نہیں آسکتا تھا" انھوں نے میرے شُبہ کی تردید کرتے ہوئے کہا۔

چند منٹ تک خاموشی رہی۔ وہ بار بار اپنی کُہنی ٹٹول رہے تھے۔ میں نے جو رُکتے ہوئے دیکھا تو کوٹ وہاں سے پھٹ گیا تھا اور اُن کی کُہنی سے خون نکل رہا تھا۔

"آپ تو کہتے تھے کہ کوئی چوٹ نہ آئی۔ یہ کیا ہے؟" میں نے بُرقعہ میں سے ہاتھ نکال کر اُنکی کہنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"کچھ نہیں خراش آگئی ہے۔ کوٹ کی آستین نے بچا لیا ورنہ زیادہ چوٹ آتی" یہ کہہ کر اُنھوں نے سگریٹ نکالا اور مُنہ سے لگا لیا۔ پھر بولے "نوازش ہوگی اگر آپ ذرا اسکو دیا سلائی بتا دیں گی" یہ کہہ کر اُنھوں نے دیا سلائی کا بکس میری طرف بڑھا دیا۔ لیکن میں اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ آخر اُنھوں نے خود بدقت ایک ہاتھ سے سگرٹ جلایا۔

"خاتون تم میرے سنگاروان والے خط سے ناراض تو نہیں ہوئیں" اُنھوں نے مُسکرا کر پوچھا اور اپنا ہاتھ کوٹ کے گریبان سے اٹکا لیا۔ میں شرما کر چُپ ہوگئی۔ اُنھوں نے مکرر اِس سوال کو دُہرایا اور مجھے جواب کیلئے قسمیں دینے لگے۔

"وہ کیا حرکت تھی آپکی" میں نے آخر دھیمے سے کہا۔

"بالکل جائز حرکت تھی جس کی اجازت شرع بھی دیتا ہے" وہ بولے۔

"اور کیا اس حاشیہ والے فقرے کی بھی اجازت شرع دیتا ہے؟" میں نے غصّے سے پوچھا۔

"اس کے لئے میں نادم ہوں۔ آہ سہ
شکوۂ غم تیرے حضور کیا ؛ ہم نے بے شک بڑا قصور کیا"
وہ بکمال رقّت بولے۔ میں چُپ ہوگئی۔

"ناظرہ۔ میں بالہوس لوگوں میں سے نہیں ہوں لیکن پھر بھی ہوں بشر۔ اپنے جذبات پر غالب نہ آسکا۔ نکل پڑا قلم سے وہ فقرہ

اگر تم واقعی اس کی وجہ سے مجھ سے ناخوش ہوگئی ہو تو میں بمنت تم سے درخواست کرتا ہوں کہ للّٰہ مجھے معاف کردو۔ میں ضبطِ غم کرتا ہوا مر جاؤنگا لیکن آئیندہ پھر کوئی ویسا فقرہ زبان سے نہ نکالونگا"۔ یہ کہہ کر وہ میرے پیچھے ہی پڑ گئی اور لفظ "معاف" میری زبان سے ادا کرا کے رہی۔

چند سیکنڈ تک خاموشی رہی۔ وہ اُٹھکر باہر جانے لگے کہ دفعتہً ایک درد کی سسکی کے ساتھ میز پکڑ کر کھڑے ہوگئے۔ میں نے جو گھبرا کر دیکھا تو کسی طرح اُن کا ماؤف ہاتھ کوٹ کے گریبان سے آزاد ہوگیا تھا اور اب بُری طرح جھول رہا تھا۔

"ہیں! یہ کیا!!" کہہ کر میں بے اختیار کھڑی ہوگئی اور اُن کے لٹکے ہوئے ہاتھ کو جو سنبھالتی ہوں تو معلوم ہوا کہ کُہنی پر سے نکلا ہوا ہے۔ دراصل ہاتھ تو اُن کا گرتے ہی ٹوٹ گیا تھا لیکن میری پریشانی کی وجہ سے مُنہ سے نہ کہا۔ ضبط کئے بیٹھے رہے۔

"آپ عجیب بے پرواہ انسان ہیں۔ ٹوٹا ہوا ہاتھ لئے اسقدر اطمینان سے بیٹھے ہوئے ہیں گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ خدانخواستہ غلط جُڑ گیا تو مصیبت ہو جائیگی"۔ یہ کہہ کر میں نے باہستگی ان کے ماؤف ہاتھ کو سہارا دیا اپنے دونوں رومال ملا کر سلنگ بنائی اور اور اُن کے گلے میں ڈالکر آرام سے ہاتھ کو اُس میں ڈالدیا۔ اسکے بعد فوراً بہرے کو بلایا اور اُس سے ریلوے ڈاکٹر کو طلب کیا۔

بہرا دوڑا ہوا ڈاکٹر کو بلانے چلا گیا۔

"بہت بہت شکریہ"۔ وہ میرے قریب آکر بولے۔ "اچھا اب آپ اپنے حسین جسم کو تو بُرقع میں چھپالیں جو حضور کی سراسیمگی کی وجہ سے بندشِ پردہ سے آزاد ہوکر آسائشِ گیتی بڑھا رہا ہے اور چہرۂ انور کھلا رہنے دیں تاکہ اس شرعی پردہ کے روحانی اثرات سے میں حیات یاب ہوتا رہوں"۔ وحید نے مُسکرا کر میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے گھبرا کر اپنے کو بُرقع میں چھپا لیا۔

ڈاکٹر نے آکر کھپچیاں اور پٹی باندھ دی اور جاتے ہوئے مُسکرا کر اپنے مریض سے بولا "یہ بھی اچھا ہے کہ آپکی اہلیہ آپکے ساتھ ہیں۔ اُن سے آرام ملتا رہے گا۔ اگر آپ تنہا ہوتے تو بڑی مشکل ہوتی"۔

"تھینک یو ڈاکٹر"۔ وحید اس کے ریمارک پر بمشکل ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے بولے۔

جب وہ چلا گیا تو مجھ سے کہنے لگے "حضور نے سُنا؟ وہ مجھے کیا مژدہ سُنا گیا ہے؟ اللہ اللہ ———" وہ مسرت سے تالیاں بجانے لگے اور اس دیوانگی میں پھر ہاتھ سلنگ میں سے پھسل گیا۔ مجھ پر اُن کے اگلے فقرہ کی وجہ سے سخت شرم طاری تھی لیکن اُٹھ کر پھر ہاتھ کو سنبھالا۔ ہم بالکل ایکدوسرے کے قریب کھڑے تھے کہ اتنے میں باہر بھائی صاحب اور اباّ کی آواز سنائی دی۔ میں جھٹ سے بھاگی اور دُور جا بیٹھی۔ اور میرے مکاّر وحید بھی ایسے لیٹ گئے گویا ٹوٹے ہوئے ہاتھ کے صدمے سے دشمن بیہوش پڑے ہیں۔

* * * * * *

فیسی رامپوری

رادھا کے گیت

نوٹ :- "رادھا کے گیت" اپنی نوعیت کے لحاظ سے اُردو میں نئی چیز ہے۔ انہیں "نثر میں نظمیں" (Prose Lyrics) سمجھنا چاہیئے۔ خیالات نئے، پیرایہ بیان نیا۔ پڑھنے والے کے دل پر اِن کا اثر ہوتا ہے۔ یہی اِن گیتوں کی کامیابی کی دلیل ہے۔ اِس قسم کے اچھوتے مضامین آجکل بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ "رادھا کے گیت" عنقریب کتابی صورت میں شائع ہونے والے ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو اُردو میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہوگا۔

"شاھد"

(۱)

سکھی، میری پھلواری میں اب بہار نہیں آئے گی،
شبنم کی کوِیتا آکاس کو سجاتی رہے گی،
گلِ کوتل کو اور کوئل کلی کو ہنساتی رہے گی۔
سکھی، میری پھلواری میں اب بہار نہیں آئے گی۔

(۲)

سکھی، رادھا اپنے پیتم کی ایک نئی "دیوداسی" ہے!!
دیوداسیوں کو جمنا کے پوِتر جل سے پریم ہے،
اور رادھا کو اپنے پیتم کی نٹ کھٹ رسیلی بنسری سے،
دیوداسیوں کو پھولوں کی پوجا پیاری ہے،
اور رادھا کو اپنے پریم کی کملائی ہوئی سنگھاسن۔
سکھی، رادھا اپنے پیتم کی ایک نئی "دیوداسی" ہے!!

(۳)

سکھی، میرا کھویا ہوا پریم مجھے کب ملے گا؟
تارے، آکاس سے روٹھ کر بھی آکاس کے پاس چلے آتے ہیں!!
گیت، کوئل سے جُدا ہو کر بھی کوئل کے پاس لوٹ آتے ہیں!!
سکھی، میرا کھویا ہوا پریم مجھے کب ملے گا؟

(۴)

پیتم، اب تو رادھا کے جیون کا اُجالا بن کے آجاؤ!!
رادھا کی آنکھوں میں رونے کے لئے اب جل بھی تو نہیں رہا،
رادھا کے سریر میں پوچھنے کے لئے اب بل بھی تو نہیں رہا،
پیتم اب تو رادھا کے جیون کا اُجالا بن کے آجاؤ!!

(۵)

رادھا کے پریم کی ساری اُوداسیاں،
رادھا کی جوانی کے سارے گیت،
رادھا کے سریر کا سارا "رُوپ دان"
سکھی، تو جانتی ہے، کس کے لئے ہے!!!؟
رادھا کے اُس بے مکھ کھلنڈرے پیتم کے لئے جو بنسری کی تانوں میں
اپنی پُجاری، رادھا کو بھی تو بھول گیا!!!

(۶)

پیتم کی جُدائی سے تنگ آکر
جمنا کے کنارے رادھا اکیلی نکل آئی
پانی کی لہریں رادھا کو اُداس دیکھکر
بولیں:- "رادھا تیرا پریم بیکنٹھ کا وہ جگمگاتا ہوا آنسو ہے، جو اِندر دیوتا کی
خوبصورت رتھ پر ناچ رہا ہو!!!"

(۷)

سکھی، میرے گیت ابھی پریم کے دُکھ میں نہیں نہائے!!
رادھا کے گیتوں میں اُس وقت رس آئے گا،

جب رادھا کی موت کا سپنا ان گیتوں کے ساتھ ناچے گا!!
رادھا کے گیتوں میں اُس وقت رس نہ رہے گا،
جب رادھا کا کُملایا ہوا جیون ان گیتوں کے ساتھ تڑپے گا!!
سکھی میرے گیت ابھی پریم کے دُکھ میں نہیں نہائے!!

۸

سکھی، میرے ہردے کا پھول میرا پیتم!!
آکاس کے ہردے کا پھول چاند ہے،
اور چاند کے ہردے کا پھول آکاس!
جیون کے ہردے کا پھول دُکھ ہے،
اور دُکھ کے ہردے کا پھول جیون!
سکھی، میرے ہردے کا پھول میرا پیتم ہے!!

۹

رادھا کے پیتم کی بنسری،
رادھا کے ہردے کی مُرجھائی ہوئی کونپل ہے!
رادھا کے پیتم کی بنسری
رادھا کے سر پر کی کانپتی ہوئی جوالا ہے:
رادھا کے ساتھ مل کر رونے والی سکھی، بتا! رادھا کے جیون کا سارا دُکھ
اس بنسری نے کیوں چھین لیا!!!؟

۱۰

سکھی، میرے دُکھ کا دارو دیوتاؤں کے پاس بھی نہیں!
دیوتاؤں سے سنسار کو سب کچھ ملا، مگر ایک رادھا کے من کی کامنا تھی
کہ پوری نہ ہوئی!!
دیوتاؤں نے سب کی جھولیوں کو آشاؤں سے بھر دیا، مگر ایک رادھا کے
جیون کی آشا تھی کہ بے آس رہی!!
سکھی، میرے دُکھ کا دارو دیوتاؤں کے پاس بھی نہیں!

+ + +

عظیم قریشی

قیمت فی پرچہ ۶؍
ساقی کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے
جس میں اُس کے تمام خاص نمبروں
کی قیمت بھی شامل ہے۔

جُرعات

نمونہ کا پرچہ مفت
ساقی میں اُردو کے بہترین انشا پردازوں
کے مضامین شائع ہوتے ہیں اس کا
معمولی پرچہ بھی سَو صفحے کا ہوتا ہے۔

جلد ۵ | ساقی۔ دہلی۔ بابت ماہ فروری ۱۹۳۷ء | نمبر ۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

سالنامہ ساقی میں مولانا عنایت اللہ دہلوی کا ترجمہ "ہیملٹ" شائع ہوا تھا۔ حضرت شہاب مالیرکوٹلوی اسکے متعلق لکھتے ہیں:-

"مولانا عنایت اللہ کے تراجم ہمارے ادب میں بے بہا اضافہ ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ کے ساقی کی ساقی گری ہمارے ادب کیلئے کیمیاگری کررہی ہے۔"

ایسے ساقی کی خوش نصیبی سمجھئے کہ ہندوستان کے سب سے بڑے مترجم کی نگارشات اس کے صفحات کے لئے وقف ہیں۔ زیرِ نظر اشاعت سے مولانائے موصوف کا ایک اور بیش بہا ترجمہ شروع ہوتا ہے۔ یہ ڈاکٹر جانسن کی معرکۃ الآرا تصنیف راسیلاس کا ترجمہ ہے۔ اس کا موضوع اچھوتا اور خیالات لائقِ قدر ہیں۔ ڈاکٹر جانسن نے فلسفیانہ انداز میں زندگی کی الجھنوں کو سلجھایا ہے اور پیرایۂ بیان اتنا دلچسپ ہے کہ اس کے پڑھنے سے طبیعت اکتاتی نہیں بلکہ اور جی لگتا ہے۔ مولانا نے ترجمہ بھی ایسا صاف ستھرا کیا ہے کہ نظیر کہیں نہیں ملتی۔ انگریزی میں ڈاکٹر جانسن کی مشکل عبارت ضرب المثل سی بن گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اس کو سلیس و شگفتہ اردو میں منتقل کیا ہوگا تو مولانا کو کتنی دماغ سوزی اور دیدہ ریزی کرنی پڑی ہوگی۔ ساقی کی پانچ اشاعتوں میں یہ سلسلہ پورا ہوگا۔

سالنامہ ساقی کے متعلق مولانا کی رائے بھی سن لیجئے:- "آپ نے ایک ہی پرچے میں اچھے اچھے مضامین بکثرت شائع کردئے۔ انگریزی سالنامے بھی کسی قدر بڑے ہوا کرتے ہیں مگر وہ تصاویر کی کثرت سے بڑھائے جاتے ہیں۔ مضامین بڑے درجے کے صرف چند ہوتے ہیں۔ مگر آپ نے تو سالنامے میں اتنا مواد بھر دیا ہے کہ پڑھنے والا مہینوں میں ختم کرسکتا ہے۔ ایک صاحب سے اس کا ذکر آیا تو کہنے لگے کہ ہندوستانی رسالوں میں یہ ایک قسم کا کومپیٹیشن ہے کہ بڑے سے بڑا پرچہ کون نکالے۔ دوسرا اعتراض مجھے خطوں کے خفی ہونے پر ہے۔ میں تو کچھ عرصے سے ان آنکھ پھوڑ چنے کی دال پر قل ہو اللہ لکھنے والے کاتبوں سے ایک قسم کا بغض رکھنے لگا ہوں۔ آپ کا فاؤسٹ، بےنظیر ترجمہ، مہینہ بھر کی دماغ سوزی کا نتیجہ ایسے ہی کاتب کے سپرد کردیا گیا جس کا افسوس ہے۔ مضامین سالنامے میں اکثر بڑے پائے کے ہیں، کیا نفسِ مضمون کے لحاظ سے اور کیا لٹریچر کے اعتبار سے۔ مگر کچھ چیز نے بعض کو بےلطف کردیا ہے۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ سالناموں کا یہی طریقہ ہندوستان میں رائج ہوگیا ہے تو خاموش رہا۔ بہرکیف اس باریک نویسی کو آپ اپنے رسالے سے ضرور مستثنےٰ کردیں۔ ضعیفِ بصارت رکھنے والوں کو ضرورت سے زیادہ زحمت اٹھانی پڑتی ہے۔ اس پر ایک قصہ یاد آیا۔ کالج کے ایک لکھنوی دوست ایک مرتبہ مجھ سے دلی ملنے آئے۔ کسی ریاست کے وزیر کے ساتھ دورے پر تھے۔ پُرتکلف کھانے کھاتے کھاتے عاجز آگئے تھے۔ جب میرے ہاں مقیم ہوئے تو کہنے لگے کہ میں صرف ارہر کی کھچڑی کھاؤں گا۔ میں نے کہا بہتر ہے۔ لیکن مجھے یہ علم تھا کہ ان کو سیم کے بیج بہت بھاتے ہیں۔ میں نے ارہر کی کھچڑی اور سیم کے بیج دونوں پکوائے۔ جب دسترخوان پر دونوں چیزیں آئیں تو بیساختہ کہنے لگے: "ہائے دونوں کا مزہ غارت کیا۔" میں ہنسا۔ کہنے لگے: "جب ایک کو کھاؤں گا تو دوسرے میں نیت رہے گی۔ دونوں کا مزہ جائیگا۔" غرض کھانوں میں مینو کا تیار کرنا ویسے ہی رسالے نکالنے والوں میں مضامین کا انتخاب اور اس کو اس طرح پیش کرنا کہ وہ آسانی سے زبان ذائقہ کے ساتھ ایک خاص مدت میں پڑھ لئے جائیں ضروری ہے۔ مقصد یہ ہے کہ مضامین کم چھاپئے مگر جتنے چھاپئے واضح اور روشن ہوں۔ کچھ ان غریبوں کا بھی خیال رہے جن کی عینکیں بیکار ہوچکی ہیں۔"

مولانا کی رائے نہایت صائب اور تجویز لائقِ قدر ہے۔ آئندہ ہم اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں گے۔

نقد و تبصرہ کیلئے جو مطبوعات موصول ہوتی ہیں اُنکے مصنفوں کو اس پر اصرار ہوتا ہے کہ ریویو جلدی اور ذرا طویل کیا جائے۔ افسوس ہے کہ ان دونوں باتوں میں سے ایک بھی ادارۂ ساقی کیلئے ممکن نہیں۔ تبصرہ کیلئے اگر کوئی کتاب بھیجی جائے تو یہ لازم نہیں آتا کہ اسکے ساتھ ایک پرچۂ ترکیبِ استعمال بھی بھیجا جائے اور وہ بھی اس یقین کے ساتھ کہ ایڈیٹر اس پر عمل کریگا۔ ع، رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف۔

شاہد

راسیلاس

مُصنّفہ ڈاکٹر جانسن — مترجمہ مولانا عنایت اللہ

پہلا باب

قصرالوادی کا بیان

ناظرین۔ آپ جو بہل اعتقادی کے ساتھ تخیّل کی سرگوشیوں کو سُنتے ہیں اور بڑے شوق سے اُن خیالی صورتوں کے درپے رہتے ہیں جو اُمید آپکے دلوں میں پیدا کرتی ہے۔ آپ انتظار میں رہتے ہیں کہ پیری جوانی کی توقعات کو پورا کر دکھائیگی اور سمجھتے ہیں کہ تفریط امروزہ کی تلافی افراطِ فردا سے ہو جائیگی تو اب ذرا شہزادہ حبشہ راسیلاس کے سوانح حیات کی طرف ملتفت ہوں۔

راسیلاس اُس زبردست شہنشاہ کا چوتھا فرزند تھا جس کی وسیع سلطنت میں اُم الانہار یعنی رودِ نیل اپنا طولانی رہگذر طے کرتا ہوا اپنے جود و سخا سے نعمتہائے فراواں کے چشمے جاری کرکے مصر کا غلہ نصف دُنیا میں تقسیم کرتا ہے۔

ایک دستور کے مطابق جو شاہانِ منطقۂ حارّہ میں پشتہا پشت سے چلا آتا تھا راسیلاس کو سب سے علیحدہ ایک قصر میں نظربند رہنا پڑتا تھا۔ وہ اور شہنشاہ حبشہ کے اور بیٹے اور بیٹیاں بھی یہاں اُس وقت تک سکونت پذیر رہتے تھے جب تک کہ راسیلاس کی نسبت جانشینی کا فرمان نافذ ہو کر اُسے مستقرِ حکومت میں تخت نشینی کے لئے طلب کیا جائے۔

شہزادگانِ حبشہ کی سکونت کے لئے قدمارِ سلطنت نے اپنی عقل و فراست اور مصلحت ملکی سے جو مقام تجویز کیا تھا وہ ولایت امہارا کی ایک وسیع وادی تھی۔ اس وادی کے ہر طرف اونچے اونچے پہاڑ کھڑے تھے جن کی چوٹیاں اتنی بلند تھیں کہ وسطِ وادی پر جھکی نظر آتی تھیں۔ اِس وادی میں اندر آنے کا صرف ایک راستہ تھا اور یہ بھی چٹانوں کے نیچے نیچے ایک کھوہ میں سے گزرتا ہوا آیا تھا۔ مدت تک یہ مسئلہ زیرِ بحث رہا تھا کہ یہ کھو قدرتی ہے یا انسان کی صنعت کا نتیجہ ہے۔ اِس راستہ کا جو دہن کی وادی کے باہر کھلتا تھا وہ ایک گھنے جنگل میں انسان کی نظر سے پوشیدہ تھا۔ اور جو دہن وادی کے اندر کھلتا تھا وہاں لوہے کا پھاٹک لگا تھا اور یہ قدیم زمانے کے کاریگروں نے ایسا بھاری اور مضبوط بنایا تھا کہ بغیر آلاتِ جرِ ثقیل کے انسان کی طاقت نہ تھی کہ اُسے کھول سکے۔

پہاڑوں سے ہر سمت میں پانی کے چشمے نیچے اُترتے تھے۔ اس کی وجہ سے تمام وادی میں سبزہ اور شادابی رہتی تھی۔ یہ کل چشمے پہاڑوں سے اُتر کر وادی کے بیچ میں ایک جھیل بناتے تھے۔ اس میں قسم قسم کی مچھلیاں موجود تھیں اور رنگ رنگ کے مرغانِ آبی جنھیں فطرت نے پانی میں پر بھگونے سکھائے تھے سیر و تفریح کیلئے آیا کرتے تھے۔ جھیل کا زائد پانی شمال کی جانب پایۂ کوہ میں ایک تاریک مقام پر پہونچکر غائب ہو جاتا تھا۔ اور یہی پانی وادی کے باہر ایک چٹان سے دوسری چٹان پر گرتا شور مچاتا دُور نکل جاتا۔ اور پھر یہ شور بھی رفتہ رفتہ نہ سُنائی دیتا۔

وادی کے اندر کے رُخ پہاڑوں کے دامنوں پر ہرے بھرے بن کھڑے تھے۔ چشموں اور نہروں کے کنارے پھول کھِلتے رہتے، ہَوا کے جھونکوں سے خوشبودار بُوٹیاں اور ہر ماہ میوہ دار درختوں سے میوے زمین پر ٹپکتے۔ چوپائے جنکو گھاس چرنی یا جھاڑی کے پتوں پر جُگالی کرنی آتی تھی خواہ پالتو ہوں خواہ وحشی اس مدوّر وادی کے سبزہ زاروں میں چلتے پھرتے نظر آتے۔ پہاڑوں کے

حلقے نے انہیں باہر کے خونخوار درندوں سے محفوظ کر رکھا تھا - وادی کے جس حصّے میں چراگاہ اور مرغزار تھے وہاں بھیڑ بکریوں کے گلّے دکھائی دیتے - دوسرے حصّہ میں جہاں سبزہ زار تھے ان میں تمام ایسے چوپائے جو شکار کے لئے مخصوص ہیں چوکڑیاں بھرتے پھرتے - یا بزکوہی کے چُست و چالاک بچے قلانچیں مارتے ایک چٹان کی چوٹی سے دوسرے چٹان کی چوٹی پر اُترتے نظر آتے - اور یہیں کہیں اونچے درختوں کی چھاؤں میں کوئی بھاری بھرکم ہاتھی متانت کی مجسم تصویر بنا جھوم رہا ہے - دُنیا بھر کی مختلف چیزیں اور فطرت کی تمام برکتیں اور بھلائیاں اُن کی بُرائیوں کو دُور کرکے یہاں مہیا کی گئی تھیں -

یہ وادی نہایت وسیع شاداب اور ثمر خیز تھی - اور اس میں وہاں کے رہنے والوں کے لئے تمام ضروریاتِ زندگی مہیا تھیں - ہر سال جب شہنشاہ حبشہ اپنے بچوں کو دیکھنے یہاں آتا تو اور بھی آرام و آسائش کے سامان یہاں مہیا کئے جاتے ، لوہے کا پھاٹک موسیقی کی صداؤں میں کھولا جاتا - شہنشاہ کے ہشت روزہ قیام میں باشندگانِ وادی کو حکم تھا کہ یہاں کی تنہائی کو لُطف سے بسر کرنے کے لئے وہ بھی اپنی طرف سے مسرّت آفریں مشاغل ایجاد کرکے اضافہ کریں - تاکہ جن چیزوں کو طبیعت دیکھتے دیکھتے اُوکتا گئی ہے اُن کی جگہ نئی نئی چیزیں توجہ کو مائل کریں - اور وقت کے یکساں گزارنے کی تکلیف دُور ہو - جس چیز کی خواہش کسی کے دل میں پیدا ہو وہ فوراً مہیا کردی جاتی - سامان عیش و طرب کے موجدوں کو اس موقع پر طلب کیا جاتا کہ وہ اپنا اپنا کمال دکھا کر مسرت میں افزونی اور نیرنگی پیدا کریں - گانے بجانے والے راگ اور نغموں کی قوت کو بڑھا کر پیش کرتے - ناچنے والے اپنا کمال شہزادوں اور شہزادیوں کے سامنے اس اُمید میں دکھاتے کہ وہ بھی اس زندانِ دلشاد میں اپنی باقی زندگی کے دن بسر کریں - ایسے لوگوں میں صرف وہی باکمال ہوتے تھے جن کے مشاغلِ عیش و تفریح میں ایک قسم کی جدّت و ندرت ہوتی - اس وادی میں خوشی اور سلامتی کے ایسے سامان موجود تھے کہ جن کے لئے یہ چیزیں نئی ہوتیں وہ ہمیشہ اُنہیں حاصل رکھنا چاہتے اور جن پر اس وادی کے دروازے ایک مرتبہ بند ہوگئے پھر وہ باہر نہ نکل سکتے تھے - اسلئے شروع میں اُنہیں علم نہ ہوتا تھا کہ یہاں زیادہ رہنے کے بعد دل پر کیا اثر ہوگا - اِس طرح ہر سال عیش و نشاط کے نئے نئے سامان اور نئے نئے صاحبِ کمال اس وادی میں رہنے کے شائق موجود ہوجاتے -

قصر ایک اونچے مقام پر جو جھیل کی سطح سے ۳۰ قدم بلندی پر تھا واقع تھا - عمارت کی تقسیم مربع صحنوں میں تھی - ہر صحن کی عمارت کی شان و شوکت جس حیثیت کے لوگ اُس میں رہتے تھے اُن کے مطابق تھی - چھتیں بڑے بڑے پتھروں کی محرابی تھیں - پتھروں کو ایسے مصالحہ سے جوڑا تھا جو زمانہ گزرنے سے زیادہ مضبوط ہوتا جائے - یہ عالیشان عمارت صدیوں سے قائم چلی آتی تھی - موسم معتدل النہار کی بارشیں اور اس زمانے کے طوفان جبکہ آفتاب برج سرطان یا جدی میں ہوتا ہے اس پر کچھ اثر نہ کرتے تھے - کبھی اس سنگین عمارت میں مرمت کی ضرورت نہیں ہوئی -

اِس قصر کا نقشہ طرح طرح کی بدگمانیوں اور شکوک نے تیار کرایا تھا - ہر کمرے میں آنے کا ایک راستہ ظاہر اور دوسرا پوشیدہ تھا - ایک صحن سے دوسرے صحن میں پہنچنے کے راستے بھی یا تو اوپر کی منزلوں سے خفیہ زینوں اور سیڑھیوں سے تھے یا نیچے کی منزلوں میں تہ خانوں اور مجور رستوں میں سے گزرتے تھے - عمارت کے اکثر ستون اندر سے کھوکلے تھے - ان میں شاہانِ حبشہ کا ایک وسیع سلسلہ اپنی دولت بھرتا چلا آیا تھا - ستونوں کے مُنہ سنگِ مرمر کی سلوں سے ڈھکے تھے - یہ سلیں اپنی جگہ سے کبھی نہ ہٹائی جاتی تھیں - اِلا ایسے موقعوں پر جبکہ سلطنت پر کوئی نازک وقت آتا - ہر بادشاہ جس نے اپنی دولت اِن ستونوں میں رکھی تھی اُس نے ایک یادداشت کی کتاب میں اُس کی تفصیل درج کردی تھی اور یہ کتاب خود ایک بڑے مستحکم بُرج میں محفوظ رہتی تھی - اِس بُرج میں سوائے بادشاہ کے یا بادشاہ کے ہمراہ اُسکے ولی عہد کے دوسرا نہ جاسکتا تھا -

دوسرا باب

وادی یمن و مسرت میں شہزادہ راسیلاس کا غمگین اور دلگیر رہنا

شہنشاہ حبشہ کے بیٹوں اور بیٹیوں کے لئے جو اس وادی میں رہتے تھے عیش ہی عیش مقدر تھا۔ اگر اس میں کوئی انقلاب یا تبدیلی پیش بھی آتی تھی تو وہ بھی عیش و راحت کی ایک نیرنگی ہوتی تھی۔ ہر چیز جو خوش رکھنے کا ذریعہ ہو سکے اور تمام ایسی چیزوں سے جو حواس کی لذتوں کا موجب ہوں یہ شہزادے اور شہزادیاں بخوبی سیر رہتے تھے۔ شمیم جانفزا سے مہکتی ہوئی پھلواریوں میں چہل قدمی اور امن و عافیت کے قلعوں میں استراحت کرتے۔ کوئی فن اور ہنر ایسا نہ تھا جو انہیں خوش رکھنے کے لئے کام میں نہ لایا جاتا ہو۔ جو دانشمند اور فرزانہ اُستاد وہاں رہتے تھے وہ شہزادوں اور شہزادیوں سے کہا کرتے کہ عامۃ الناس کی خدمت کرنے میں سوائے تکلیف اور عذاب کے دوسری بات نہیں اور اُنکو بتاتے کہ پہاڑوں کے دوسری طرف جو کچھ ہے وہ سوائے رنج و عذاب کے دوسری چیز نہیں۔ وہاں ہر وقت فتنہ و فساد برپا رہتا ہے اور آدمی آدمی کو اپنا شکار بناتا ہے۔

اس خیال کو قوی رکھنے کے لئے کہ جسقدر مسرت اور انبساط اُنہیں میسر ہے وہ کسی اور کو نہیں وہ رقص و سرود کی محفلیں گرم رکھتے۔ روز غزل سرائیاں اور قصیدہ خوانیاں ہوا کرتیں اور مضمون ان سب کا یہی وادی یمن اور اس کا عیش و نشاط ہوتا۔ مختلف قسم کی لذتوں کو بیان کر کے اُن کی اشتہا تیز کرتے۔ صبح سے تا شام ہر ساعت اور ہر گھڑی عیش و نشاط کے جلسے ہوتے رہتے۔ شہزادوں اور شہزادیوں کو خوش رکھنے کے لئے یہ کُل طریقے نہایت کامیاب ثابت ہوئے اور اُن کے دل میں کبھی وادی سے قبل از وقت باہر جانیکی خواہش پیدا نہ ہوئی۔ بلکہ اس وادی میں اس یقین کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے کہ فطرت اور انسان کا ہنر جسقدر نعمتیں بخش سکتا تھا وہ سب انہیں میسر ہیں۔ اور ان لوگوں کے حال پر اُنہیں ترس آتا جن کے مقسوم نے اُنہیں اس وادی یمن و عیش سے خارج رکھا ہے، اور سمجھتے کہ جسقدر لوگ اس وادی سے باہر رہتے ہیں وہ آلام و مصائب کے ہاتھ کا کھیل اور رنج و تکلیف کے غلام ہیں۔

غرض یہ بادشاہ زادے اور بادشاہ زادیاں ایک دوسرے سے اور خود اپنے سے خوش، صبح اُٹھتے اور رات کو سو جاتے۔ لیکن شہزادہ راسیلاس جس کی عمر اب ۲۶ برس کی ہو گئی تھی اب کھیل تماشوں سے بچکر تنہا چہل قدمی اور خاموش فکر کرنے میں خوش معلوم ہونے لگا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ دسترخوان پر بیٹھا ہے۔ دُنیا بھر کی نعمتیں وہاں چُنی ہیں۔ لیکن جو چیز سامنے لائی جاتی ہے اُسے چکھنا تک بھول جاتا ہے۔ محفل رقص و سرود گرم ہے اور شہزادہ یکایک وہاں سے اُٹھکر تیزی سے قدم مارتا کہیں اتنی دُور چلا جاتا ہے کہ گانے بجانے کی آواز کانوں میں نہ آئے۔ شہزادے کے ملازم آقا کی اس حالت کو تاڑ گئے اور وہ اس کوشش میں ہوئے کہ شہزادے کو پھر عیش و عشرت کی طرف راغب کریں۔ اُنھوں نے پابندی ضوابط کی طرف متوجہ کرنا چاہا مگر شہزادے نے نہ مقامی دستور اور نہ ملازمین کی نظروں کی کچھ پروا کی۔ جن جلسوں میں اُنھوں نے شہزادے کو مدعو کیا وہاں شریک نہ ہوا۔ اب وہ نہروں اور چشموں کے کنارے جہاں سایہ ہوتا دن دن بھر گزار دیتا۔ کہیں بیٹھا درختوں کی شاخوں میں پرندوں کے چہچہے سُنتا۔ کہیں پانی میں مچھلیوں کے اچھلنے کودنے کی بہار دیکھتا۔ کبھی کبھی اُن چراگاہوں اور پہاڑیوں کی طرف نگاہ ڈالتا جہاں کوئی چوپایہ گھاس پر اور کوئی جھاڑی کی اوٹ میں پڑا آرام کرتا ہو۔

راسیلاس کے مزاج میں یہ تبدیلی ایسی پیش آئی تھی کہ ہر شخص اس کی طرف متوجہ رہنے لگا۔ اساتذہ پیرانہ سال میں سے ایک

اُستاد ... کی تقریر اور گفتگو میں راسیلاس کو خاص لُطف حاصل تھا ایک دن شہزادے کے پیچھے پیچھے اس غرض سے چلا کہ شہزادے کی اس شور مزاجی کا حال معلوم کرے۔ راسیلاس کو معلوم تک نہ ہوا کہ کوئی اُس کے قریب پیچھے پیچھے چلا آتا ہے۔ کچھ دیر پہاڑوں پر بکریوں کو دیکھکر جو وہاں چرتی تھیں اپنی حالت سے اُنکی حالت کا مقابلہ کرکے آپ ہی آپ کہنے لگا۔

"وہ کیا چیز ہے جو انسان میں اور باقی مخلوقات ذی حیات میں فرق پیدا کرتی ہے۔ ہر حیوان جو میرے قریب چلتا پھرتا نظر آتا ہے اُس کی جسمانی ضروریات کُل وہی ہیں جو میری احتیاجیں ہیں۔ بھوک لگی۔ گھاس چرنے لگا۔ پیاسا ہوا چشمے پر جاکر پانی پی لیا۔ اس طرح بھوک اور پیاس دونوں رفع کرلیتا ہے۔ جب تھک گیا تو سو رہا۔ سوکر اُٹھتا ہے تو پھر بھوک لگتی ہے۔ پھر کچھ کھاکر سو رہتا ہے۔ مجھے بھی بھوک اور پیاس اُسی کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ لیکن میں اپنی بھوک پیاس رفع کرنے کے بعد اُس کی طرح آرام نہیں کرسکتا۔ اگر بھوک اور پیاس رفع نہ ہوتی تو میں بھی اُسی کی طرح تکلیف اُٹھاتا ہوں۔ لیکن اِن چیزوں سے سیر ہونے پر میں اُس کی طرح مطمئن اور خوش نہیں ہوتا۔ اشتہا او سیری کے درمیان کا زمانہ بسر کرنا دشوار اور طولانی ہوجاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پھر اشتہا محسوس ہو کہ قوتِ ارادہ میں تیزی پیدا ہو۔ پرندے درختوں میں بیٹھے پھل کھاتے ہیں یا زمین پر اُتر کر دانہ چگتے ہیں۔ پھر اُڑکر درختوں میں جا بیٹھتے ہیں۔ اور شاخوں پر بیٹھے بظاہر خوش و مسرور معلوم ہوتے ہیں۔ اور وہ اپنی تمام عمر ایک ہی سی بولیوں اور چہچہوں میں ضایع کرتے ہیں۔ میں بھی نغمہ و سرود کے بڑے بڑے اُستادوں کو طلب کرتا ہوں۔ مگر کل جن نغموں نے دل خوش کیا تھا آج وہ ناگوار گذرتے ہیں۔ اور کل جب پھر انہیں کو سُنونگا تو اور زیادہ شاق گزرینگے۔ کوئی قوتِ احساس اپنے میں ایسی نہیں پاتا جو اپنی متعلقہ مسرت سے معمور نہ ہو۔ لیکن اس پر بھی میں خوش نہیں رہتا۔ انسان میں کوئی مخفی قوتِ ادراک ایسی ہے جسے یہ جگہ خوش نہیں کرسکتی۔ یا یہ کہ چند خواہشیں اس احساسِ مسرت سے اتنی بالاتر اور ممیز ہیں کہ جب تک وہ پوری نہ ہوں انسان خوش نہیں رہ سکتا۔"

اتنا کہہ کر شہزادے نے سر اُٹھایا اور یہ دیکھکر کہ چاند طلوع ہو رہا ہے وہ قصر کی طرف چلا۔ جب کھیتوں میں سے گزرنے لگا تو چوپایوں کو اپنے قریب دیکھکر کہنے لگا۔ "ہاں تم خوش ہو۔ مگر مجھے تمہاری اِس خوش حالت پر رشک نہ کرنا چاہیئے۔ تم میں جو کوئی زندگی کا بارِگراں دوش پر رکھے چلتا پھرتا اور خوش رہتا ہے تو کیوں وہ خوشی جو تمہیں نصیب ہے انسان کی خوشی نہیں۔ میری بہت سی تکلیفیں اور پریشانیاں ایسی ہیں جو تمہیں نہیں ستاتیں۔ درد یا تکلیف جب نہیں ہوتی پھر بھی اُس کا خوف مجھ پر طاری رہتا ہے۔ بعض وقت محض تکلیفوں کو یاد کرکے میں سہم جاتا ہوں۔ اور بعض وقت آیندہ تکلیفوں کا خیال مجھے ڈرا دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پروردگارِ عالم نے خاص خاص اذیتوں اور خاص خاص مسرتوں کو میزان میں رکھکر اُن میں توازن پیدا کردیا ہے۔

راسیلاس اِن خیالات سے دل بہلاتا اور انہیں نحیف اور غمگین آواز سے ادا کرتا ہوا قصر کو واپس آرہا تھا۔ لیکن اُسکی آنکھوں سے اپنی اس باریک بینی اور نازک خیالی پر ایک طرح کی مسرت بھی ظاہر ہوتی تھی اور وہ اپنی اس دقتِ نظر پر زندگی کی مصیبتوں میں ایک قِسم کی راحت محسوس کرتا تھا۔ اور جن فصیح و بلیغ الفاظ میں وہ انہیں بیان کرتا تھا، اُن سے بھی ایک قِسم کی تسکین ہوتی تھی۔ آج شب کے جلسوں میں وہ خوش ہوکر شریک ہوا۔ اور یہ محسوس کرکے کہ اسوقت دل ہلکا ہے وہ خوش ہوا۔

تیسرا باب

اُس شخص کی ضروریات جسے کسی بات کی احتیاج نہ ہو

دوسرے دن راسیلاس کا بڈھا اتالیق یہ سوچکر کہ شہزادے کی افسردگی مزاج یعنی دماغی مرض کا حال تو کھل ہی گیا ہے اس اُمید میں کہ نصیحت اور ہدایت سے اسکی شکایت رفع ہوجائیگی۔ شہزادے سے باضابطہ طریقے سے ملاقات کرنے آیا۔ اس بُوڑھے اتالیق کی نسبت راسیلاس کا مدّت سے خیال تھا کہ عقل و دانش جو کچھ اُس کے پاس تھی وہ سب صرف ہُوچکی ہے۔ اُس سے ملاقات کرنے پر خوشی سے آمادہ نہ ہوا اور دل میں کہنے لگا کہ یہ بڈھا تو میرے اوقات میں خواہ مخواہ مخل ہوتا ہے۔ اور یہ کہ کیا میں اس اتالیق کے پڑھائے ہوئے سبقوں کو کبھی نہ بھولوں گا جو نئے ہونے کے وقت دل خوش کرتے تھے اور اب پھر انہیں نیا بنانے کے لئے انکو پہلے بھول جانا ضروری ہے۔ شہزادہ اُٹھا اور ایک گھنے جنگل میں چلا گیا۔ اور وہاں پہنچکر پھر اپنے انہی خیالات میں مصروف ہوا۔ ابھی خیالات نے کوئی خاص صورت نہ اختیار کی تھی کہ دیکھا اُس کا بڈھا اُستاد پہلو میں کھڑا ہے۔ دیکھتے ہی خیال ہوا کہ آگے بڑھ جائے۔ لیکن معًا یہ خیال بھی آیا کہ ایسے اُستاد کو آزردہ کرنا جس کی ایک زمانہ میں دل سے عزت کرتا تھا اور اب تک اُس سے محبت ہی درست نہ ہوگا پس اُس نے اُستاد سے کہا کہ میں ایک چشمے کے کنارے جا رہا ہوں۔ آپ تشریف لائیں اور جہاں میں بیٹھوں وہیں آپ بھی تشریف رکھیں۔

چشمے کے کنارے بیٹھتے ہی اُستاد نے شہزادے کی حالت پر جو کچھ عرصے سے بہت تبدیل ہوگئی تھی افسوس ظاہر کیا۔ اور دریافت کیا کہ قصر وادی میں جو عیش و آرام موجود ہیں اُن سے شہزادے کو کیوں گریز ہے۔ تنہائی اور خاموشی کو وہ اتنا کیوں پسند کرنے لگے ہے۔ شہزادہ بولا کہ "مسرت اور شادمانی سے اب میں اسوجہ سے گریز کرنے لگا ہوں کہ ان چیزوں سے اب مجھے خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ اور تنہائی اس لئے پسند کرتا ہوں کہ افسردہ دل اور پریشان خاطر رہتا ہوں اور اس حالت میں جلسوں میں اپنی شرکت سے دوسروں کی خوشی کو مکدّر نہیں کرنا چاہتا۔" اُستاد کہنے لگا کہ "شہزادے تم پہلے شخص ہو جنے اس وادیِ امن میں تکلیف و رنج کی شکایت کی ہو۔ یقین مانیئے کہ آپکی شکایتوں کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ جسقدر نعمتوں اور برکتوں کا مہیّا کرنا شہنشاہ حبشہ کے اختیار میں تھا وہ سب یہاں مہیّا کردی گئی ہیں۔ اور ان نعمتوں اور برکتوں سے آپ متمتع ہیں۔ یہاں نہ محنت ہے نہ مشقت جو اُٹھانی پڑے۔ اور نہ کوئی خطرہ ہے جس کا خوف ہو۔ اسپر بھی وہ تمام چیزیں جو محنت یا مشقت یا خطرے جھیل کر پیدا کی جاتی ہیں سب میسّر ہیں۔" اُستاد نے چاروں طرف نظر پھیر کر کہا۔ "بتایئے تو وہ کونسی ضرورت ہے جو یہاں مہیّا نہیں ہے۔ اگر کوئی ضرورت ایسی نہیں ہے جسکے رفع کرنے کا سامان یہاں موجود نہو تو پھر آپ ناخوش کیوں رہتے ہیں"؟ شہزادے نے جواب دیا کہ "میری ناخوشی کی وجہ یہی ہے کہ میں کوئی ضرورت نہیں رکھتا۔ یا یہ سمجھیئے کہ جس چیز کی مجھے خواہش ہے اُسے نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے۔ اور یہی امر میری شکایت کا سب سے بڑا باعث ہے۔ اگر اپنی کسی ضرورت کا مجھے علم ہوتا تو اُس کے لئے سامان مہیّا کرنے کی مجھے خواہش ہوتی۔ پھر یہ خواہش مجھے سعی اور کوشش کی طرف آمادہ کرتی۔ پھر مجھے یہ دیکھکر افسوس نہ ہوتا کہ آفتاب روشن ہوکر مغرب کے پہاڑوں کی طرف کیوں اسقدر سُست رفتاری سے جاتا ہے اور صبح بیدار ہوتے ہی کیوں سبات کا غم کرتا کہ اب خواب میری ہستی بیدار کو مجھ سے پوشیدہ نہ کریگا۔ جب میں بکریوں اور بھیڑوں کے بچّوں کو ایک کے پیچھے ایک کو دوڑتا ہوا دیکھتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ اگر مجھے بھی کسی بات کے درپے ہونیکی ضرورت ہوتی تو میں اُنہی کی طرح خوش رہتا۔ لیکن چونکہ تمام ضروریات مہیّا ہیں اس لئے مجھے دن اور دن کی ہر گھڑی، پہر گھڑی دن سے بھی زیادہ طولانی معلوم ہوتی ہے۔ اب آپ اپنے تجربہ سے کوئی بات ایسی بتائیں کہ دن ایسا ہی

چھوٹا معلوم ہونے لگے جیسے کہ بچپن میں معلوم ہوا کرتا تھا جبکہ فطرت مجھ میں تر و تازہ تھی۔ اور ہر لمحہ اور ہر گھڑی کوئی چیز ایسی دکھاتی تھی کہ پہلے نظر سے نہ گزری تھی۔ خوشی اور مسرت بہت اُٹھا چکا ہوں اب تو کوئی بات ایسی بتایئے جسکی میں خواہش کروں۔"

بڈھا اُستاد اس نئی قسم کے آزار کو سُنکر حیرت میں گیا اور شہزادے کے سوال کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ لیکن خاموش رہنا بھی نہ چاہا۔ کہنے لگا۔ "جناب والا اگر آپ نے دُنیا کی مصیبتوں اور تکلیفوں کو دیکھا ہوتا تو پھر آپکو اپنی موجودہ حالت کی قدر ہوتی"۔ اس پر شہزادہ بولا کہ "اے شریف اُستاد آپ نے مجھے ایک بات ایسی بتادی جس کی میں خواہش کروں اور وہ یہ کہ اب مجھے دُنیا کی تکلیفوں اور مصیبتوں کے دیکھنے کی خواہش اور آرزو پیدا ہوگئی۔ کیونکہ ان کا دیکھنا خوش رہنے کے لئے ضروری ہے۔"

چوتھا باب

شہزادہ اپنے اُسی رنج اور فکر میں مبتلا رہتا ہے

عود اور چنگ کی آوازیں سُنکر معلوم ہوا کہ کھانے کا وقت آگیا ہے۔ اُستاد اور شہزادے کی گفتگو ختم ہوئی۔ بڈھا اتالیق اپنے رستے چلا۔ سوچتا جاتا تھا کہ اس وقت کی گفتگو میں جو دلائل اُس نے پیش کئے اُن سے وہی نتیجہ پیدا ہوا جسے وہ ہرگز پیدا نہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جب عمر زیادہ ہوجاتی ہے تو رنج یا ندامت دیرپا نہیں رہتا۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہوتی ہے کہ جس چیز کو برداشت کرتے ہوتے ایک مدت ہو جاتی ہے، اُس کا برداشت کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ یا اسکا سبب یہ ہوتا ہے کہ بڑھاپے میں دیکھا جاتا ہے کہ بڈھوں کی پرواکسی کو نہیں ہوتی۔ . . . . یا یہ کہ ایسی مصیبتوں کی پروا کم ہوجاتی ہے جنہیں سمجھتے ہیں کہ موت جلد آکر اُن کا خاتمہ کردیگی۔

اُمید کی پہلی شعاع قلب میں روشن ہوتے ہی جوانی کی سُرخی رُخساروں پر جھلک اُٹھی اور آنکھوں کی چمک دوبالا ہوئی۔ اب ہر وقت دل میں یہ خواہش رہنے لگی کہ کچھ کرنا چاہیئے۔ گو ابھی تک اپنی خواہش کے ذرائع اور وسائل کا علم اُسے صاف طور پر نہ تھا۔ لیکن اب وہ کم آمیزی اور طبیعت کی افسردگی باقی نہ رہی۔ بلکہ یہ سمجھکر کہ خوشی و مسرت کے ایک بڑے خزانہ کا اب میں مالک ہوگیا ہوں اسبات کو دوسروں سے پوشیدہ رکھکر تفریح و تفنن کے جلسوں اور مشاغل میں اپنا شریک ہونا ظاہر کرنے لگا۔ اور اس کوشش میں ہوا کہ دوسروں کو اُس حال میں جس سے خود بیزار رہوا تھا خوش کرے۔ خوشی اور مسرت کے سامان مہیا کرنے میں بھی زندگی کے اوقات کچھ ایسے بچ رہتے ہیں جن میں کوئی کام نہیں ہوتا۔ رات اور دن میں بہت سا وقت ایسا ملتا تھا کہ بغیر اس کے کہ دوسروں کو کسی قسم کا شُبہ گزرے وہ کسی ایک بات پر غور و فکر میں مصروف رہے۔ زندگی کا بوجھ بہت کچھ ہلکا ہوچلا تھا۔ تفریح کے مجمعوں اور جلسوں میں شوق سے شریک ہونے لگا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ ان جلسوں میں اپنے مقاصد کے لئے بھی شرکت ضروری ہے جلسوں سے جب رُخصت ہوتا تو کہیں تنہائی میں خوش بیٹھ کر غور و فکر میں مصروف ہوتا۔ وجہ یہ تھی کہ اب اسکو فکر و غور کے لئے ایک مضمون ہاتھ لگ گیا تھا۔

اب سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ اس کا یہ ہوگیا کہ اُس دُنیا کا نقشہ اپنے ذہن میں قائم کرے جسے اُس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ بہت سی مختلف حالتوں میں تصور باندھکر بہت سی خیالی مشکلات میں مبتلا اور نہایت سخت اور دشوار معرکوں میں شریک ہو۔ لیکن طبیعت میں فیاضی اور نیکی اتنی تھی کہ جو منصوبہ سوچتا اُس کا انجام دوسروں کی تکلیف اور مصیبت کا رفع کرنا یا مکر و کید کو طشت از بام کرنا یا ظلم و تعدّی کو شکست دیکر دُنیا میں مسرت اور شادمانی کی اشاعت کرنا ہوتا۔

اس طرح راسبلاس کی عمر کے بیس ماہ گزر گئے۔ خیالی معرکہ آرائیوں میں ایسی شد و مد سے مصروف ہوتا کہ اپنی تنہائی کا خیال تک دل سے دور کر دیتا اور انسانی معاملات کی مختلف شکلوں میں شریک ہونے کی تیاری وہ اس درجہ کرتا کہ وہ ان باتوں سے بھی غافل ہو جاتا جو بنی نوع انسان سے ملنے اور ان کے حال میں شریک ہونے کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہیں۔

ایک دن ایک چشمے کے کنارے بیٹھے بیٹھے یہ تصوّر بندھا کہ ایک بن ماں باپ کی جوان لڑکی اپنے دغاباز عاشق سے بھاگ رہی ہے۔ اور اس دغاباز عاشق نے جو کچھ اس لڑکی کے پاس تھا سب چھین لیا ہے اور یہ لڑکی چیختی چلاتی اُس کے پیچھے دوڑتی ہے کہ کوئی تو اُسکا انصاف کرے۔ یہ شکل صورت شہزادے کے ذہن میں کچھ ایسی جمی کہ وہ واقعی اس لڑکی کو اُس کے ڈاکو عاشق سے بچانے دوڑ پڑا۔ خوف نے اس مُجرم عاشق کی رفتار میں تیزی پیدا کی۔ اور باوجود کوشش کے راسبلاس اُسکو پکڑ نہ سکا۔ لیکن یہ ارادہ کر لیا کہ اپنی ثابت قدمی سے اُسے دوڑتے دوڑتے تھکا کر گرفتار کر لونگا۔ گو اس مکّار مجرم سے دوڑ میں آگے نکل نہ سکو تو کیا ہے۔ غرض شہزادہ برابر دوڑتا رہا حتیٰ کہ ایک پہاڑ کے سامنے آجانے سے وہ رُکا۔

اب شہزادہ ہوش میں آیا اور اپنی اس فضول تگ و دو پر بے اختیار ہنسا اور پہاڑوں کی طرف دیکھکر کہنے لگا کہ بس یہی رکاوٹ ہے جو حصول مسرت اور نکوکاری میں مخل اور مانع ہے۔ کب تک یہ حال رہیگا کہ میری آرزوئیں اور خواہشیں زندگی کے اس حصار سے اُڑ کر باہر جائینگی اور یہ حصار وہ ہے جس سے باہر اب تک قدم نہیں نکال سکا ہوں۔

اِس خیال نے دل پر کچھ ایسا اثر کیا کہ بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ جس دن سے مجھے اپنی اس قید سے آزاد ہونیکا خیال آیا ہے آفتاب آسمان پر دو مرتبہ اپنی سالانہ گردش پوری کر چُکا ہے۔ اس حالت پر اُسے اتنا افسوس ہوا کہ کبھی کسی بات پر نہ ہوا تھا۔ دل میں کہنے لگا کہ یہ زمانہ جسنے گزرنے میں اپنی کوئی علامت پیچھے نہیں چھوڑی ہے اتنا تھا کہ میں بہت کچھ کر لیتا۔ شہزادے نے ان بیس مہینوں کا مقابلہ انسان کی عمرِ طبعی سے کیا اور کہنے لگا کہ انسان میں طفلی اور نادانی کا زمانہ چھوڑ کر ایک مدّت چاہیئے کہ ہم میں غور و فکر کی قابلیت پیدا ہو اور اسپر بھی عقل کی قوت جلد زائل ہو جاتی ہے۔ انسان کی زندگی کی حقیقی مدّت چالیس سال کا زمانہ تصوّر ہونا چاہیئے۔ اس چالیس سال کا چوبیسواں حصہ تو میں ضائع کر چکا۔ جو کچھ ضائع کیا وہ یقینی ہے کیونکہ وہ میری چیز تھی۔ اور اب جو چوبیس ماہ آئینگے اُن کی نسبت کوئی نہیں بتا سکتا کہ اُن میں کیا پیش آئیگا۔

اپنی معذوری اور حماقت کا یہ علم رنج کے ساتھ کلیجے کے پار ہوا جاتا تھا۔ یہ صدمہ ایسا تھا کہ بڑی دیر کے بعد طبیعت کو سکون ہوا۔ کہنے لگا کہ جو زمانہ زندگی کا اب تک گزرا وہ بزرگوں کی غلطی اور ملک کے نامعقول اور رواج کی وجہ سے ضائع ہوا جب سوچتا ہوں تو اس حال پر نفرت معلوم ہوتی ہے گو پشیمانی یا افسوس نہیں ہوتا۔ لیکن جو زمانہ اس وقت سے کہ نئی روشنی دل پر چمکی تھی اب تک گزرا ہے اور جس میں خوش رہنے کا ایک منصوبہ بھی میں نے سوچا تھا، افسوس وہ زمانہ خود میری غلطی سے ضائع ہوا۔ میں نے وہ کچھ کھویا ہے کہ پھر حاصل نہ ہو سکے گا۔ بیس مہینے تک میں سورج کو نکلتے اور ڈوبتے دیکھ چکا آسمان کے اس نور کو ایک بیکار انسان کی طرح دیکھتا رہا۔ اور یہ زمانہ اتنا تھا کہ پرندوں نے اپنی ماؤں کے آشیانے چھوڑ دئے اور اُڑ کر درختوں یا فضا میں پہنچ گئے۔ بکری کے بچے نے ماں کے تھن سے دودھ پینا چھوڑ دیا۔ اور خود چارہ حاصل کرنے کی فکر میں پہاڑوں پر رفتہ رفتہ چڑھنا سیکھ لیا۔ صرف میں ہی ایسا ہوں جس نے کچھ ترقی نہیں کی۔ اور اب تک نادان و نابالغ رہا۔ ماہتاب نے بیس مرتبہ سے زیادہ اپنا چہرہ بدل کر انقضائے زندگی اور مرورِ

عمر کا مجھے سبق دیا۔ اور پانی کا یہ چشمہ جو میرے قدموں کے نیچے بہ رہا ہے میری کاہلی پر مجھے متنبہ کرتا رہا ہیں عقل و ادراک کے خوانِ نعمت پر بیٹھا لُطف اُٹھاتا رہا۔ نہ اس زمین کی مثالوں اور نہ آسمان پر سیاروں کی ہدایات سے کوئی سبق لیا۔ اور بیس ماہ یونہی گزر گئے۔ رنج اور افسوس کے یہ خیالات اُس کے دل پر ایسے حاوی ہوئے کہ چار مہینے اس سوچ بچار میں اور گزار دیئے کہ اب بیکار قصد اور ارادے میں وقت ضائع نہ کرونگا۔ ایک دن ایک ماما کے ہاتھ سے چینی کا ایک پیالہ ٹوٹا اور جب اُسکے مُنہ سے سُنا کہ جو چیز ٹوٹ کر پھر نہ بن سکے اُسکے ٹوٹنے کا افسوس کرنا بیکار ہے تو شہزادے میں زیادہ ہمت اور قوت سے کام کرنے کی بیداری پیدا ہوئی۔

ماما کا قول یاد کر کے راسیلاس اپنے تئیں بُرا بھلا کہنے لگا اور سوچنے لگا کہ پہلے ہی سے یہ بات کیوں معلوم نہ ہوگئی کہ میں اُس پر غور کرتا۔ دیکھئے تو مفید باتیں کس طرح اتفاق سے معلوم ہو جاتی ہیں۔ اور انسان کی طبیعت اپنے جوش اور ولولے میں دُور کی چیزوں کے خیال میں تو مصروف ہو جاتی ہے اور اُن حقائق سے ناآشنا رہتی ہے جو سامنے واضح و آشکارا ہوتے ہیں۔ اس افسوسناک خیال پر شہزادہ چند گھنٹے تک تاسف کرتا رہا۔ پھر اُس نے اپنی عقل و فہم کو اس طرف متوجہ کیا کہ اس وادی پُر امن و مسرت سے باہر نکلنے کی کوئی تدبیر نکالے۔

پانچواں باب

شہزادہ راسیلاس وادی سے فرار ہونیکی تدبیر سوچتا ہے

اب راسیلاس پر روشن ہوا کہ کسی مقصد کی تکمیل جسے پہلے آسان سمجھا جائے کس قدر مُشکل ہوتی ہے۔ جب چاروں طرف نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ قدرت کی بنائی ہوئی سنگین دیواروں میں گھرا کھڑا ہے۔ اور یہ دیواریں ایسی مستحکم ہیں کہ کسی کے توڑنے سے نہیں ٹوٹ سکتیں، اور اندر والا آہنی پھاٹک بھی باہر نکلنے میں حائل ہے۔ اور یہ دروازہ وہ ہے جس سے ایک مرتبہ جو اندر آگیا پھر باہر نہ جاسکا۔ غرض کئی ہفتے شہزادے نے اس مشقت میں گذارے کہ پہاڑوں پر کبھی چڑھتا کبھی اُترتا تھا اور غرض یہ تھی کہ وادی سے نکلنے کا راز ہاتھ لگے۔ اور اس تلاش میں ہوا کہ کہیں کسی جھاڑی میں تو باہر نکلنے کا راستہ چھپا نہیں ہے۔ آخرکار معلوم ہوا کہ پہاڑوں میں سے راستہ نکالنا یا آہنی دروازے کا کھولنا غیر ممکن ہے۔ اس دروازے کو بند کرنے میں انسان کا تمام علم و ہُنر ہی صرف نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ پہرے والے بھی وہاں ہر وقت موجود رہتے تھے۔ اور اُس کا موقع اور محل بھی ایسا تھا کہ وہ ہر وقت باشندگانِ وادی کے پیشِ نظر رہتا تھا۔

اب راسیلاس نے اُس کھو کو دیکھنا شروع کیا جہاں سے جھیل کا پانی وادی سے باہر نکلتا تھا اور ایک مرتبہ اس مقام کو اسوقت دیکھا جبکہ باہر والے دہن پر آفتاب کی تیز روشنی پڑ رہی تھی۔ اس وقت یہ نظر آیا کہ پانی کے اس تنگ رہگذر میں جابجا چٹانوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ایسے پڑے ہیں کہ اگر کوئی جسیم چیز اندر گئی بھی تو یہ چٹان اُس کے آگے بڑھنے میں حائل ہو جائیں گے۔ غرض راسیلاس یہاں بھی نااُمید ہوا۔ اور افسردہ خاطر ہو کر واپس آیا۔ مگر اُمید کی برکت اُسے مل گئی، اور اُس نے جی میں ٹھان لی کہ کبھی کسی بات سے نااُمید نہ ہوگا۔ اِن بیکار کوششوں اور زحمتوں میں دس ماہ اور گزر لئے۔ لیکن یہ زمانہ خوشی سے بسر ہوا۔ ہر صبح ایک نئی اُمید دل میں لئے بستر سے اُٹھتا اور شام کو دن بھر کی کوشش و کاہش کی خود ہی تعریف کرتا۔ اور رات کو دن بھر کا تھکا ہارا آرام کی نیند سوتا۔

چونکہ تفریح کی ہزارہا چیزیں موجود تھیں محنت اور مشقت کا وقت آسانی سے گزر جاتا۔ اور طرح طرح کے خیالات دل میں پیدا ہوتے رہتے جانوروں کی عقل حیوانی کی مختلف مثالیں اور نباتات کی مختلف خاصیتیں اس زمانہ میں دریافت ہوتی رہیں۔ اور ہر مقام ہزارہا عجائبات قدرت سے معمور نظر آیا۔ اور سوچتا رہا کہ اگر وادی سے فراری کی کوئی صورت نہ نکلی تو پھر یہ عجائبات اتنے ہیں کہ اُن پر غور کرنے میں دل کو تسکین و تشفی ہوتی رہے گی۔ اور سوچتا تھا کہ گو وادی سے نکلنے کی کوشش اب تک بیکار ثابت ہوئی ہے لیکن تحقیق و تلاش کیلئے کافی سرمایہ بہم پہنچ گیا ہے۔

لیکن در اصل جس بات کا شوق تھا اُس میں ابھی تک کمی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ اُس کی دلی تمنّا یہ تھی کہ دُنیا میں انسان جن طور طریقوں سے زندگی بسر کرتا ہے وہ کسی طرح معلوم ہو جائیں۔ یہ آرزو برابر قایم رہی گو اس کے پورے ہونیکی توقع کم ہوتی گئی۔ اب اُس نے اپنے اس قید خانے کی دیواروں کو دیکھنا اور جانچنا شروع کیا۔ اور یہ کوشش جس کو وہ اب عبث سمجھنے لگا تھا ترک کی۔ کہ پہاڑ کہیں سے باہر نکلنے کو کٹا ہوا مل جائیگا لیکن اپنے اصلی خیال کو ہمیشہ مدِنظر رکھا۔ اور سمجھ لیا کہ اس مقصد کو حاصل کرنے میں کوئی وسیلہ جب کبھی بھی ملا تو اُسے فوراً اختیار کریگا۔

چھٹا باب

فن پرواز پر ایک مقالہ

بعض ماہرینِ فن اس وادی یمن و مسرت میں خوش زندگی بسر کرنے کے لالچ میں چلے آتے تھے۔ اس میں ایک غرض اُنکی یہ بھی تھی کہ وادی کے رہنے والوں کے لئے آسایش اور تفریح کی نئی نئی چیزیں تیار کرکے پیش کرتے رہیں گے۔ انہی میں ایک شخص تھا جو فن میکانیک (جرثقیل) میں ید طولےٰ رکھتا تھا۔ اُس نے مفید کاموں اور انسان کی تفریح کے لئے بہت سی کلیں اور آلات ایجاد کئے تھے۔ منجملہ ان کے ایک چرخ ایسا بنایا تھا جو خود پانی کے زور سے گردش کرکے پانی کو ایک بلند برج میں پہنچا دیتا تھا اور پھر وہاں سے پانی قصر کی تمام عمارتوں میں تقسیم ہوتا تھا۔ باغ میں ایک خوبصورت بارہ دری بنائی تھی جس کے چاروں طرف مصنوعی بارش سے ہوا سرد رہتی تھی۔ ایک سرسبز نخلستان میں جو مستورات کے لئے مخصوص تھا ہوا کے پنکھے لگائے تھے جو ایک آبجو ... سے برابر حرکت میں رہتے تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ایسی کلیں کھڑی کی تھیں جن سے ہر وقت نغمہ و سرود کی دلکش آوازیں آتی رہتی تھیں۔ کسی میں آلات موسیقی ہوا سے اور کسی میں پانی کے بہنے سے بجا کرتے۔

اِس ماہرِ فن میکانیک کے پاس راسیلاس اکثر آنے لگا۔ شہزادے کا حال یہ تھا کہ کسی علم یا فن کے متعلق کوئی بات ہو اُسے دریافت کرکے خوش ہوتا تھا۔ اور سمجھتا تھا کہ اسوقت اس قسم کی معلومات جسقدر بہم پہنچا لونگا وہ اُسوقت کام آئینگی جبکہ دُنیا کی سیر و سیاحت کو نکلونگا۔ ایک دن حسبِ معمول جب شہزادہ اُس سے ملاقات کو آیا تو دیکھا کہ یہ کاریگر ایک بادبانی رتھ کے بنانے میں مصروف ہے جو بادبانوں میں ہوا بھرنے سے پانی کی سطح پر چلیگا۔ شہزادے نے دیکھا کہ اس قسم کے رتھ کا چلنا صرف ہموار سطح پر ممکن ہے۔ شہزادے نے کاریگر کے اس کام کی بہت تعریف کی اور کہا اُسے جلد ختم کیا جائے۔ شہزادے کی زبان سے اپنے کام کی تعریف سُنکر کاریگر خوش ہوا اور چاہا کہ جتنی تعریف شہزادے نے اسوقت کی ہے وہ اس سے بھی زیادہ کا مستحق اپنے کو ثابت کرے۔ شہزادے سے کہنے لگا "فن جرثقیل جو جو باتیں پیدا کرسکتا ہے اُن میں حضور نے بہت کم چیزیں ابھی تک دیکھی ہیں۔ مدت سے میری رائے ہے کہ نقل و حرکت کے لئے انسان جو سست ذرایع مثلاً رتھ اور جہاز استعمال کرتا ہے ایک زمانہ ایسا آئیگا کہ ایک نہایت تیز رو طریقہ نقلِ مکان کا پروں کے ذریعہ سے اختیار کیا جائیگا۔

اور یہ کہ فضا میں ہوا کے وسیع میدان انسان کے سیاحت اور پرواز کے لئے کھلے پڑے ہیں۔ پھر یہ جاہلوں اور کاہلوں کا کام رہ جائیگا کہ وہ زمین پر کیڑے کی طرح رینگا کریں۔"

اتنا اشارہ راسیلاس کے لئے کافی تھا کہ پھر ان پہاڑوں سے باہر نکلنے کی خواہش اُس کے دل میں اُبھر آتے۔ اِس کاریگر نے جسقدر آلات اور مصنوعات ایجاد کئے تھے اُن کو شہزادہ دیکھ چکا تھا۔ اب شہزادے کو خیال ہوا کہ یہ کاریگر اپنے سب پہلے کاموں سے بھی بڑھ کر کوئی کام کر سکتا ہے۔ راسیلاس نے اُس سے اور باتیں تحقیق کرنا چاہیں۔ پیشتر اس سے کہ اُمید نا اُمیدی کی تکلیفیں پہنچائے شہزادہ اُس ماہرِ فن سے کہنے لگا "میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے خیال اور تصور آپ کے ہنر اور فن پر غالب آگیا ہے۔ اور آپ مجھ سے اس وقت وہ بات کہتے ہیں جو محض آپکی ایک آرزو ہے مگر وہ کیونکر پوری ہو اس کا آپکو علم نہیں۔ ہر ذی حیات کے لئے اربعہ عناصر میں سے ایک عنصر مخصوص ہے۔ مثلاً طیور کے لئے ہوا، انسان اور چوپایوں کے لئے خاک۔" اسپر وہ کاریگر بولا "درست ہے مچھلیوں کا عنصر آب ہے۔ مگر بعض اور جانور بھی قدرتی طور پر تیرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ اور انسان بھی سیکھ کر تیر سکتا ہے۔ جو شخص تیر سکتا ہے اُسکو اُڑنے کی طرف سے نا اُمید نہ ہونا چاہئے۔ تیرنا رقیق مادہ کثیف میں اُڑنے کے برابر ہے۔ اور اُڑنا رقیق مادہ لطیف میں تیرنا ہے۔ جس مادہ میں سے ہم کو گذرنا ہے اُس کی کثافت کے اعتبار سے ہم میں قوت دفاع ہونی لازمی ہے۔ اگر آپ ہوا پر کسی قوت کو اتنی تیزی سے کام میں لاتے رہیں گے کہ اس قوت سے ہوا پیچھے ہٹتی رہے تو ہوا آپکو اپنے اوپر سنبھالے رکھے گی۔"

اسپر شہزادہ بولا "تیرنے کی ورزش میں بڑی قوت اور محنت کا صرف ہے اور مضبوط سے مضبوط ہاتھ پاؤں بھی تیراکی میں جلد تھک جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُڑنے میں اس سے بھی زیادہ مشقت درکار ہوگی۔ اور اگر جتنی دُور ہم تیر سکتے ہیں اُتنی ہی دُور اُڑ نہ سکے تو پھر آپکے مصنوعی پر بیکار ثابت ہونگے۔"

کاریگر بولا "اِس میں شبہ نہیں زمین سے اُٹھنے میں بڑی قوت اور محنت درکار ہوگی۔ جیسا کہ ہم گھریلو پرندوں میں جو بھاری اور بھدے جسم کے ہوتے ہیں دیکھتے ہیں۔ لیکن جسقدر ہم اونچے ہوتے جائینگے اُسی نسبت سے زمین کی کشش اور مرکز ارض کی طرف جسم کا انجذاب رفتہ رفتہ کم ہوتا جائیگا۔ اور پھر ہم ایسی فضا میں پہنچ جائیں گے جہاں ہم ہوا میں اس طرح تیرتے رہینگے کہ کوئی میلان نیچے گرنے کا نہ ہوگا۔ اُس وقت آگے بڑھنے میں مطلق تردد کی ضرورت نہ ہوگی۔ اور نہایت خفیف قوت کو کام میں لاکر ہم آگے بڑھتے رہینگے۔ آپ جنکا شوقِ تحقیق درجہ انتہا کو پہنچا ہوا ہے آسانی سے تصور کر سکتے ہیں کہ جب ایک فلسفی شانوں پر پر لگائے ہوا میں اُڑتا ہوگا تو وہ زمین اور اُسکے رہنے والوں کو اور زمین کی روزانہ گردش میں خطِ استوائے متوازی منطقہ میں جسقدر ملک واقع ہونگے ان سب کو باری باری سے کس حیرت و تعجب سے معائنہ کرتا ہوگا۔ اور اس ہوا میں معلق فلسفی کو گردش کرتی ہوئی زمینوں اور سمندروں صحراؤں اور شہروں کو دیکھکر کس قدر لطف میسر ہوتا ہوگا۔ اور خود تمام خطروں سے محفوظ دُنیا کی بڑی بڑی تجارت گاہوں، لڑائی کے میدانوں، پہاڑوں کو جن میں وحشی قومیں آباد ہیں اور شاداب اور زرخیز ملکوں کو جو طرح طرح کی نعمتوں سے مالا مال، خوش اور آباد ہیں۔ اور جن پر امن و سلامتی کی برکتیں نازل ہیں، ان سب کو دیکھکر کیسا مسرور اور محظوظ ہوتا ہوگا۔ اس حالت میں ہم دریائے نیل کے سرچشموں کا سراغ لگا سکیں گے۔ رہگذر کا پتہ چلا سکیں گے۔ کہ یہ دریا کیسی کیسی وسیع اقلیموں میں سے بہتا نکلا ہے۔ اور فطرت کی فیاضیوں کو دُنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تحقیق کر لیں گے۔"

شہزادہ کہنے لگا "یہ سب باتیں جو آپ نے کہی ہیں اُن کے دیکھنے کو دل بہت چاہتا ہے لیکن خوف اِسکا ہے کہ فضا میں اتنی بلندی پر جسکا تصور آپ نے باندھا ہے اور جہاں امن و سلامتی کا دَور دورہ ہے کوئی انسان سانس نہ لے سکیگا۔ سُنتا ہوں کہ بہت اونچے پہاڑوں پر تنفس مشکل ہوتا ہے۔ ہماری وادی کے ان پہاڑوں کی بلندی گو اتنی زیادہ ہے کہ ہوا وہاں کسقدر لطیف ہوگئی ہے اس لئے احتمال ہے کہ اُڑنے والا آسانی سے نیچے گر جائیگا۔ پس شُبہ نہیں کہ کسی ایسی بلندی سے جہاں زندہ رہنا ممکن ہو وہاں سے تیزی کے ساتھ نیچے گرنے کا احتمال قطعی ہے"۔

اتنا سُنکر کاریگر کہنے لگا "یُوں تو ہر مہم کے اگر تمام مخالف پہلو پہلے سے سوچے جایا کریں تو دُنیا میں کوئی بڑا کام نہ ہوسکے۔ اگر حضور میری اِس تحریک کو بہ نظر لُطف دیکھیں گے تو میں اپنی جان پر کھیل کر پہلی پرواز آپکو دکھا سکتا ہوں۔ میں تمام پرندوں کی ساختِ جسمانی پر غور کر چُکا ہوں۔ چمگادڑ کے پَر کچھ اس خوبی سے کُھلتے ہیں اور بند ہوتے ہیں کہ اسی وضع کے پَر انسان کے شانوں پر آسانی سے لگائے جاسکتے ہیں۔ اور اسی نمونے پر خدا نے چاہا تو میں کل سے اپنے لئے پَر بنانے شروع کرونگا اور اُمید ہے کہ ایک سال کے اندر ہوا میں اتنا اونچا پرواز کرونگا کہ انسان کی عداوت رشک و حسد سے بالا تر ہو جاؤں۔ لیکن یہ کام اس شرط سے شروع کرونگا کہ میرے اس فن کا راز دوسرے پر فاش نہ ہو۔ اور حضور سوائے ہم دونوں کے کسی تیسرے کے پَر تیار کرنیکی مجھ سے فرمایش نہ کرینگے"۔

شہزادے نے کہا "کیوں آپ اتنے بڑے فائدے سے دوسروں کو محروم رکھنا چاہتے ہیں۔ ہر فن اور ہُنر کا مقصد اصلی یہی ہے کہ جو ترقی اس میں کیجائے وہ کُل بنی نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے ہو۔ ہر انسان دوسرے انسان کا زیر بار احسان ہے۔ پس اس کا فرض ہے کہ جو احسان اُس پر کئے گئے ہیں۔ وہی دوسروں پر وہ کرے"۔

اس پر کاریگر بولا کہ "اگر کُل انسان نیک ہوتے تو میں نہایت تن دہی سے سب کو اُڑنا سکھا دیتا۔ لیکن اس کا کون ضامن ہے کہ اس بھلائی کے بدلے مجھے بھلائی ملے گی۔ اگر بُرے آدمیوں نے چاہا کہ آسمان سے دوسروں پر حملہ اور فوج کشی کریں تو پھر اس کا علاج کیا ہوگا۔ ایسے لشکر کے مقابلہ میں جو شمال کے وحشیوں کا بادلوں میں اُڑتا نظر آئیگا۔ تو پھر اس سے نہ کوئی قلعہ نہ پہاڑ اور نہ سمندر پناہ دیگا۔ اور اُڑتے اُڑتے جب وہ ایک شاداب اور زرخیز ملک کے پایۂ تخت پر بغیر اس کے کہ کوئی طاقت اسے روک سکے آن اُترے گا تو پھر اس سے پناہ کی کیا صورت ہوسکے گی۔ پھر تو یہ وادی بھی جو شہزادگانِ حبشہ کے رہنے کی جگہ ہے اور جہاں ہر وقت خوشی اور شادمانی کا دَور دورہ ہے اُس کے بارے میں بھی اندیشہ ہوسکتا ہے کہ بحرِ جنوب کے ساحلوں پر جو برہنہ وحشی قومیں آباد ہیں ایک دن آسمان سے اُس پر بھی دھاوا کر بیٹھیں"۔

آخر کار شہزادے نے کہا کہ "میں آپکی اس تحریک کو اپنے ہی تک رکھونگا" اور اب راسیلاس اس دن کا منتظر ہوگیا جبکہ یہ جرثقیل کا ماہر پَر لگا کر ہوا میں پرواز کریگا۔ شہزادے کو اس میں کسی قدر کامیابی کی اُمید بھی ہوگئی۔ جب کاریگر پَر بنانے میں مصروف ہوا تو شہزادہ اکثر اس کے پاس آتا۔ وہ خود بھی پرواز میں آسانی پیدا کرنے کے لئے پَروں کو ہلکا اور مضبوط رکھنے کی ترکیبیں بتاتا۔ کاریگر روز خوش ہوتا کہ میں ایسے پَر بناؤنگا کہ عقاب اور کرگس بھی پرواز میں اُس سے پیچھے رہ جائیں۔ اور اسی اعتبار اور بھروسے کا متعدی مرض شہزادے کو بھی لگ گیا۔

ایک سال کے اندر پَر تیار ہوگئے اور ایک دن صبح کا وقت مقرر کرکے کاریگر ایک اونچے پہاڑ پر اُڑنے کے لئے تیار نظر آیا۔

ہوا بھرنے کے لئے کچھ دیر تک پَروں کو جُنبش دیتا رہا۔ پھر جہاں کھڑا تھا وہاں سے کودا اور آناً فاناً میں وہ جھیل میں آگرا۔ پَروں نے ہوا میں تو کچھ کام نہ دیا مگر پانی پر اُسے سنبھالے رکھا۔ شہزادے نے آگے بڑھکر اُسکو پانی سے نکالا۔ خوف اور ندامت سے کاریگر کی آدھی جان رہ گئی۔

ساتواں باب

شہزادے کی ملاقات ایک عالم سے ہوتی ہے

پروازمیں ناکامی پہ شہزادے کو کچھ زیادہ افسوس نہ ہوا۔ جب وادی سے نکلنے کی کوئی صورت ممکن نہ ہوئی تو دل میں ایک ایسی اُمید قائم ہوئی جو خوشتر واقعہ کی خبر دیتی تھی۔ اب راسیلاس کوئی ایسی تدبیر زیادہ غور اور توجہ سے سوچنے لگا جس میں پہلا موقع ملتے ہی وہ اِس وادی امن ومسرت سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوجاتے۔

واہمہ ذہن سے معطل ہوئی۔ دُنیا کے سیر وسفر کی کوئی توقع نہ رہی۔ طبیعت کو تسکین وتشفی دینے کی ہر طرح کوشش کی مگر ناامیدی کی کوفت رفتہ رفتہ بڑھتی گئی اور ہجوم یاس وناامیدی میں سلسلہ خیال ٹوٹنے لگا۔ یہاں تک کہ بارش کا موسم آگیا۔ بارش اِن ملکوں میں اوقات مقررہ پر ہوا کرتی ہے۔ اس وجہ سے شہزادے کا اب جنگلوں میں گشت لگانا بند ہوا۔

بارش کا سلسلہ مدت تک جاری رہا۔ اور مینہ ایسے دھواندھار برسنے شروع ہوئے کہ کبھی ایسے نہ برسے تھے۔ اردگرد کے پہاڑوں پر بادل ٹوٹ پڑے۔ ہر سمت میں بلندیوں سے پانی کی دھاریں نیچے وادی میں اِس کثرت سے اُترنی شروع ہوئیں کہ جس کھوکے رستے وادی کا پانی باہر نکلتا تھا وہ اب پانی باہر نکالنے کے لئے بہت تنگ ثابت ہوئی۔ جھیل میں پانی اتنا بڑھا کہ کناروں سے گزر گیا۔ وادی کے مسطح قطعات پر پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ وہ بلند مقام جس پر قصر تھا یا ایسے ہی چند اور مقامات پانی سے باہر دکھائی دیتے تھے۔ باقی سب طرف سیلاب ہی سیلاب تھا۔ گلے اور ریوڑ چراگاہوں کو چھوڑ کر کہیں چلے گئے۔ درندے بھی پہاڑوں میں جا چھپے۔

سیلاب کی وجہ سے تمام شہزادے اور شہزادیاں ایسے مشاغل میں مصروف ہوئے جو قصر کے اندر ہی ممکن تھے۔ اِسی زمانے میں املاک شاعر نے ایک نظم پڑھی جس میں انسان کی مختلف حالتوں کا بیان تھا۔ راسیلاس کو یہ نظم بہت پسند آئی۔ شاعر کو حکم ہوا کہ خلوتگاہِ خاص میں حاضر ہوکر اپنا یہ کلام شہزادے کو پھر سُنائے۔ شاعر حاضر ہوا۔ شہزادے نے اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور دل میں خوش ہوا کہ ایسا آدمی تو ملا جو دُنیا میں انسان کی مختلف حالتوں اور خطروں سے واقف ہے اور زندگی کے مرقعوں میں خوب رنگ بھر کر دکھا سکتا ہے۔ شہزادے نے صدہا سوالات شاعر سے کئے۔ یہ سوالات ایسے تھے جنکے جوابوں سے ہر انسان واقف تھا۔ لیکن ہمیشہ سے قید میں رہنے کی وجہ سے شہزادہ اُن سے قطعی لاعلم تھا۔ شاعر کو شہزادے کی لاعلمی پر رحم آیا اور اس کے شوق تفحص وتجسس پر تعجب ہوا۔ اور شہزادے سے اُسے محبت معلوم ہونے لگی۔ شہزادے نے اب روزانہ شاعر کو اپنے پاس بُلانا شروع کیا۔ شاعر دُنیا کی عجیب عجیب باتیں اور عجیب عجیب طریقے بیان کر کے شہزادے کا دل خوش کیا کرتا۔ شہزادے کو اُس کی باتیں ایسی بھلی معلوم ہوتیں کہ نیند کا آنا تک ناگوار گزرتا اور رات بھر اس انتظار میں رہتا کہ کب صبح ہو اور شاعر کی صحبت پھر نصیب ہو۔

ایک دن دونوں بیٹھے باتیں کرتے تھے کہ راسیلاس نے املاک سے کہا کہ آپ اپنی زندگی کی سرگذشت بیان کریں اور بتائیں کہ وہ کیا چیز تھی جس نے آپکو اِس وادی میں مقید ہوکر زندگی ختم کرنے پر مجبور کیا۔ جب اِملاک اپنا حال عرض کرنے پر تیار ہوا تو راسیلاس نے ایک

باقی آئندہ

گہرہائے خیال

انجم روشن جبیں گردوں کے شیریں خواب ہیں اور گلِ رنگیں ضمیرِ خاک کے دلکش خیال
تیرا پیکر شاہدِ فطرت کا خوابِ — دلفریب لالۂ دلکش میری تخیل کا تیرا جمال

کس قدر جلوے نمایاں محفلِ انجم میں ہیں سینکڑوں صبحیں درخشاں اِک ادبِ شب میں ہیں

زندگانی غنچۂ نوخیز کی اُمید ہے، زندگانی طائروں کی عشرتِ پروانہ ہے
زندگانی کوہ کی خاموشیوں میں ہے سرود زندگانی شورشِ چشمہ کا شیریں ساز ہے

موڑتی ہے پیکرِ انساں میں جو بن کر لہو رنگ و بو ہے لالہ و گل میں وہی موجِ حیات
شوخیاں جس کی مچلتی ہیں صبا کے رقص میں زمزمہ ہے روحِ بلبل میں وہی موجِ حیات

چاہتا ہے لذّتِ تازہ زندگانی کا — مزاج جستجو نے آبِ حیواں میں چلا ہے پھر خضر
دیکھنا ہے بطنِ گیتی سے عیاں ہوتا ہے کیا چشمِ شاعر اِک نئی تخلیق کی ہے منتظر

فکر میرا بلند بال، اور یہ جہاں تار و تنگ خود تو نیا جہاں بنا یا مجھے اِذن کار دے

آہ اے دِل کس لئے تو صورتِ سیماب ہے؟ دشتِ اِمکاں میں تو کس شے کیلئے بیتاب ہے؟
اِس جہانِ تنگ میں ہائے تجھے تسکیں نہیں یہ تپش اصلاً کشادِ وسعتِ کمیاب ہے،

اپنی تنہائی سے نہ گھبرا تو مردِ تنہا مقام کرتے ہیں
گر ترے پاس ہو دلِ آگاہ تو تجھ سے بھی کلام کرتے ہیں

سعید احمد اعجاز

الف لیلہ

اُردو قصہ کہانی کی کتابوں میں کوئی کتاب اس کتاب سے زیادہ مشہور نہیں جس کے متعلق چند باتیں کہنے کے لئے آج میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ لیکن اس کتاب کی اصل اُردو نہیں بلکہ عربی ہے عموماً اس کو الف لیلہ اور بعض لوگ الف لیلہ کہتے ہیں۔ اور اگرچہ یہ تلفظ غلط ہے لیکن اس قسم کی عام غلطیاں فصیح تصور کی جاتی ہیں اور اگر ہم بھی اس بارے میں محاورہ دہلی کی تقلید کریں تو چنداں مضائقہ نہیں۔ الف لیلہ کی شہرت اُردو زبان تک محدود نہیں، اس کی کہانیاں تقریباً تمام مہذب زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں خصوصاً یورپ کی زبانوں میں جو مقبولیت اس کتاب کو نصیب ہوئی ہے وہ سوائے مسیحی بائبل کے ایشیا کی کسی اور کتاب کو نصیب نہیں ہوئی۔ یہ کہنا دشوار ہے کہ قصہ کہانیوں کا یہ مجموعہ عربی زبان میں کب مرتب ہوا۔ خیال ہے کہ عباسی حکومت کے آخری دَور یعنی آج سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے اس کی اکثر حکایتیں راویوں یعنی داستان گویوں کے ذریعے سے عوام میں کافی رواج پا چکی تھیں۔ الف لیلہ کا عباسی خاندان سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس خاندان کے مشہور حکمران خلیفہ ہارون الرشید کا کئی کہانیوں میں ذکر آتا ہے۔ اور بعض حکایتیں صرف اس بادشاہ کی ذات اور ان واقعات سے متعلق ہیں جو کہا جاتا ہے اُس کو اپنی زندگی میں پیش آئے تھے۔ کہتے ہیں کہ بعض اور مشہور ایشیائی بادشاہوں کی طرح اس خلیفہ کا یہ معمول تھا کہ راتوں کو بھیس بدلکر روز اپنے وزیر جعفر اور اپنے حبشی غلام مسرور کو ساتھ لیکر اپنی رعیت کے حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اُن کے خیالات کو اپنے کانوں سے سُننے کیلئے اپنے دارالخلافہ بغداد کے گلی کوچوں میں گشت لگایا کرتا تھا۔ اسی شبانہ کوچہ گردی میں اُسکو جو عجیب وغریب تجربات حاصل ہوتے تھے۔ ان پر الف لیلہ کی بہت سی کہانیاں بنائی گئی ہیں۔ لیکن اُن حکایتوں کو تاریخی سمجھنا غلط ہوگا۔ کیونکہ بالکل اسی قسم کی کہانیاں دُنیا کی اور زبانوں میں بعض اور بادشاہوں کے متعلق سُنی جاتی ہیں۔ الف لیلہ کی اور کہانیوں کا بھی یہی حال ہے۔ ان سے ملتی جلتی کہانیاں دوسرے ملکوں خصوصاً ایران، ہندوستان اور چین میں پائی جاتی ہیں۔ اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ الف لیلہ کو کس حد تک عربی ذہانت کا کرشمہ خیال کیا جاسکتا ہے، اس سوال کا مختصر طور پر یہ جواب ہے کہ یورپ کے بعض عالموں کا خیال ہے کہ الف لیلہ سے قبل فارسی میں کوئی اس قسم کا مجموعہ حکایات موجود تھا جس سے الف لیلہ کی کہانیاں بہت حد تک اخذ کی گئی ہیں۔ لیکن چونکہ اس مفروضہ فارسی کی کتاب کا اب تک کوئی سراغ نہیں ملا اس لئے یورپین علما کے اس خیال کو صحیح مان لینے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ انسانی فطرت ہر ملک اور ہر زمانے میں کم وبیش یکساں رہتی ہے اور انسانی تخیل بھی بعض حدود کا پابند گویا لکیر کا فقیر ہے۔ اسلئے جس طرح انسانوں کی بنائی ہوئی اور چیزیں ایک دوسرے سے مشابہ ہوتی ہیں۔ لازمی ہے کہ یہ مشابہت اس کے من گھڑت قصہ کہانیوں میں بھی پائی جائے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی ماننی پڑتی ہے کہ جس طرح اس زمانے میں مختلف ممالک آپس میں تبادلہ خیالات کرتے رہتے ہیں اسی طرح اگلے زمانے میں ایک ملک کی کہانیاں مسافروں کے قافلوں اور سوداگروں کے کاروانوں کے ساتھ دُور دراز ملکوں میں پہونچ جاتی تھیں۔ اور جس ملک میں جاتی تھیں وہاں کی مقامی کیفیت سے متاثر ہوکر ایک نیا رنگ و روپ اختیار کرلیتی تھیں یعنی اُن کا قالب تو وہی رہتا تھا مگر اُسکو ایک نئی پوشاک پہنادی جاتی تھی۔ آج سے دو ڈیڑھ سو سال قبل الف لیلہ کا

نام بھی بہت کم لوگوں نے سُنا تھا اور اس کی حکایات سے لوگ اس قدر نا آشنا تھے کہ جب مشہور فرانسیسی عالم و سیاح (Galland) نے ان حکایتوں کو مصر و شام کے راویوں کی زبانی سُنکر ان کا ایک فرنچ ترجمہ شائع کیا تو اکثر لوگوں نے یہ خیال کیا کہ وہ خود اُس کی اپنی ایجادیں ہیں اور عربی سے ترجمہ کرنے کا دعویٰ محض اپنی تصنیف کو بڑھانے اور عوام کے شوق کو تیز کرنے کی غرض سے کیا گیا ہے۔ لیکن الف لیلہ سے اس عام نا آشنائی کے باوجود گالان (Galland) سے کئی سو سال پہلے مشہور اطالوی افسانہ نویس بوکاچیو ایک کہانیاں ایسی لکھ چکا تھا جن کے پلاٹ بظاہر الف لیلہ کی حکایات سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ جو غالباً مسیحی جاتریوں یا جنگہائے صلیبین کی عیسائی افواج کے ذریعے سے اس قدیم زمانے میں یورپ تک پہونچ چکی تھیں۔ اسی طرح بہت سی جانوروں کی کہانیاں یونانی مجموعہ حکایات الیسپن فیبلز اور سنسکرت پنچ تنتر میں کسی قدر بدلی ہوئی شکل میں موجود تھیں۔ بدھ مذہب کے بعد مذہبی روایات مناسب تغیر و تبدل کے بعد مسیحی و اسلامی جماعتوں میں رواج پا گئی ہیں۔ اس بارے میں ہم کو یہ ضروری بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ کسی قصہ یا کہانی کی خصوصیت و خوبی کا اندازہ کرنے کیلئے محض اس کی ترکیب یعنی پلاٹ پر انحصار نہیں کیا جا سکتا اکثر افسانوں کے پلاٹ ایک دوسرے سے مشابہ ہوتے ہیں۔ سب سے بڑی چیز اسلوبِ بیان ہے۔ اور ایک نہایت اچھی کہانی کو اگر بُرے پیرائے میں بیان کیا جائے تو اُس کی دلچسپی غائب ہو جاتی ہے۔ اور اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو الف لیلہ کو خالص عربی فصاحت و بلاغت کا کرشمہ اور عربی ادبیات کا صحیح نمونہ قرار دینے میں کوئی شک شبہ باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ الف لیلہ کا پیرایۂ بیان اور رنگِ تحریر ایرانی۔ ہندی اور یونانی داستان گوئی سے بالکل جداگانہ ہے۔

دُنیا کی اکثر اور مشہور کتابوں کی مانند الف لیلہ بھی کسی ایک شخص کی تصنیف نہیں۔ اس عظیم الشان قصرِ خیال کی تعمیر میں بہت سے ہاتھوں نے حصہ لیا ہے اور اس کے لئے عمارتی سامان بھی مختلف ملکوں سے فراہم کیا گیا ہے۔ لیکن اس کی موجودہ مکمل شکل میں کوئی چیز انمل یا بے جوڑ نہیں معلوم ہوتی اور ایک خوش قطع عمارت کی مانند اس کا ہر ایک حصہ اپنی اپنی جگہ بالکل موزوں اور سڈول نظر آتا ہے۔ قصہ کی ترکیب یہ ہے کہ ان میں بہت سی کہانیاں ہیں جن میں سے ہر ایک بجائے خود ایک مکمل افسانہ خیال کی جا سکتی ہے۔ لیکن ان سب کہانیوں کو اس طرح پیوند کر دیا گیا ہے کہ ایک کہانی میں سے دوسری کہانی پھوٹ آتی ہے اور تمام داستان ایک شاخ در شاخ درخت کی مانند ہو جاتی ہے۔ قصہ کی بنیاد یہ ہے کہ شہریار نامی ایک بادشاہ ایک ناگوار تجربے کی وجہ سے عورتوں کا اس قدر دشمن ہو گیا تھا کہ ہر روز ایک نئی عورت سے شادی کرتا تھا اور دوسرے دن اس عورت کا سر کٹوا دیتا تھا۔ جب بہت سی بیگناہ عورتیں اُس کے ظلم کا شکار ہو چکیں تو اُس کے وزیر کی بیٹی شہرزاد جو بہت ہوشیار اور پڑھی لکھی لڑکی تھی اس بات پر آمادہ ہوئی کہ خود بادشاہ سے شادی کر لے اور ایک تدبیر سے اپنی اور بہنوں کو اس مصیبت سے بچائے۔ شہرزاد نے جو تدبیر سوچی وہ یہ تھی کہ اوّل رات سے بادشاہ کو ایک قصہ سُنانا شروع کر دیا اور صبح تک اُس کو ناتمام رکھا۔ چونکہ بادشاہ کو قصّے میں دلچسپی پیدا ہو گئی اور اُس کے انجام کو معلوم کرنے کا شوق غالب تھا اُس نے یہ خیال کیا کہ شہرزاد کا سر کٹوانے میں ایک دن کی دیر کا کوئی مضائقہ نہیں دوسری رات شہرزاد نے پھر اپنے سلسلۂ کلام کو ناتمام رکھا اور ایک دن کی مہلت اس کو اور مل گئی تیسری رات پھر یہی ہوا اور شہرزاد کا اب یہ معمول ہو گیا کہ ہر شب اپنی داستان کو نامکمل چھوڑ دیتی اور بادشاہ ہر روز اُس کے قتل کو دوسرے دن تک ملتوی کر دیتا تھا۔ غرض کہ شہرزاد نے اس داستان گوئی کو اس قدر طول دیا کہ ایک ہزار ایک راتیں گزار دیں اور اس عرصے میں شہریار اُس کا اس درجہ گرویدہ ہو گیا کہ اسکو مروا دینے کا خیال ہی باقی نہ رہا اور وہ بے رحمی کا سلوک جو اس نے عورتوں کے حق میں اختیار کیا تھا خود بخود ترک ہو گیا۔

الف لیلہ کی اکثر کہانیاں خلافِ عقل باتوں پر مبنی ہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ جو بات ذوقِ سلیم کو گراں گزرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں فحش اور ہزل کا بھی خاصہ دخل ہے۔ لیکن ان عیوب کے باوجود خیالات کی بلند پروازی واقعاتِ افسانہ کی ندرت اور فطرتِ انسانی کی گہرائیوں کا مشاہدہ ایسی خوبیاں ہیں جو پڑھنے والے کے دل پر ضرور اثر پیدا کرتی ہیں اور جن کی داد زمانۂ ماضی میں Tennyson نے اور زمانۂ حال میں E. M. Forester جیسے اہلِ نظر نے دی ہے۔ ہر ایک قصے کے تفصیلات کو اس قدر شرح و بسط و یقین کیساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ناممکن پر ممکن کا گمان ہو جاتا ہے۔ اور بار بار ہوا تخیلات واقعیت کا وزن پیدا کر لیتے ہیں۔

انیسویں صدی سے قبل الف لیلہ کا کوئی مکمل اور مستند ایڈیشن موجود نہ تھا۔ غالباً ہر ایک ہندوستانی کو اس واقعہ پر فخر و مسرت کا موقع ہے کہ یہ بے نظیر کتاب مناسب صحت و اہتمام کے ساتھ سب سے پہلے ہمارے ملک میں چھپی۔ یہ ایڈیشن انیسویں صدی کے آغاز میں کلکتہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرپرستی میں شائع ہوا تھا۔ اور میکناٹن ایڈیشن کے نام سے علمی حلقوں میں معروف ہے۔ اس کے خریداروں کی فہرست میں مہاراجہ رنجیت سنگھ اور محمد علی بادشاہ خدیو مصر جیسے نامور اشخاص کے نام ہیں۔ اس کے بعد اور ایڈیشن برسلا اور قاہرہ میں شائع ہوئے جو چھپائی کی خوشنمائی کے لحاظ سے میکناٹن ایڈیشن پر فوقیت رکھتے ہیں۔ لیکن صحت و تکمیل کے اعتبار سے بہتر نہیں انگریزی زبان میں الف لیلہ کے ترجمے موجود ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ جدید اور سب سے زیادہ شگفتہ وہ ترجمہ ہے جسکو (Mr. Powys Mathers) نے (Dr. J. C. Mardrus) کے فرنچ ترجمے اور دیگر یورپین ترجمے کی مدد سے تیار کیا ہے۔ اور کاسانووا سوسائٹی نے بہت زیب و زینت کے ساتھ چھپوا کر شائع کیا ہے۔ اُردو زبان میں الف لیلہ کا کوئی ایسا ترجمہ موجود نہیں جو علمی اور ادبی پہلو سے کافی تصور کیا جاسکے۔ سب سے پہلے مترجم نے خود اقرار کیا ہے کہ چونکہ اُسے اصل عربی کتاب کا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہو سکا اس لئے انگریزی ترجمے کی مدد سے اُس نے اپنا کام نکال لیا غالباً اسکے پیشِ نظر لین (Lane) کا ترجمہ تھا جو کئی حیثیت سے نامکمل خیال کیا جاتا ہے۔ دوسرے اُردو مترجمین نے عربی یا انگریزی کتاب کو دیکھنے کی بھی تکلیف غالباً گوارا نہیں کی۔ بلکہ اس پہلے ترجمے کو سامنے رکھکر وہی حکایتیں ایک نئے پیرائے اور مختلف عبارت میں لکھدیں۔ یہ مترجمین بھی اُردو ادبیات میں کوئی پایہ نہ رکھتے تھے۔ لیکن ان کو قدیم داستان گوئی کا ڈھنگ ضرور آتا تھا۔ اور بحیثیت مجموعی اُن کی کہانیاں دلچسپی سے خالی نہیں۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے ان کہانیوں کو ناول کی طرز پر لکھنے کی کوشش کی جو دراصل صحیح ادبی وجدان سے کسی قدر بیگانہ تھی، چنداں کامیاب ثابت نہیں ہوئی اور ان کا سحر نگار قلم الف لیلہ کی حکایتوں میں ناول کا رنگ بھرنے سے قاصر رہا۔ مرزا حیرت دہلوی نے بھی الف لیلہ کی ایک جلد مرتب کی تھی۔ جس میں زیادہ تر اُن حکایات کو شامل کیا تھا جو اُن سے پہلے ترجمہ کرنے والوں نے نظر انداز کر دی تھیں۔ ایک الف لیلہ منظوم بھی موجود ہے جسکو تین شاعروں نے ترتیب دیا ہے۔ ان میں نسیم دہلوی اور شایاں لکھنوی کم و بیش مشہور ہیں۔ الف لیلہ کی بعض حکایات خصوصاً علی بابا اور علاء الدین کا عجیب و غریب چراغ ناٹک کے پیرائے میں مشرق و مغرب دونوں جگہ خاصی مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ اور یہ ناٹک بچوں کے لئے اس قسم کی تفریحات میں بہت موزوں خیال کئے جاتے ہیں۔ الف لیلہ کا ہندی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ لیکن مجھے اسکی خوبی و ہردلعزیزی کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ان سب ذرائع سے الف لیلہ کو اُردو میں اتنا فروغ حاصل ہو چکا ہے کہ اسکو اُردو کی مشہور کتابوں کی ذیل میں شمار کرنا بالکل جائز ہے۔ لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ اُردو میں ابتک کوئی ایسا ترجمہ موجود نہیں جس سے اس بینظیر کتاب کی عظمت و شان کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ ترجمہ کرنیوالوں نے صرف داستان کی دلچسپی کو ملحوظ رکھا ہے۔ الف لیلہ کی ادبی خوبیوں کو اُردو میں منتقل کرنے کی کوشش نہیں کی! اور اس میں علمی لطافت، تاریخی حکایات اور شعر و سخن کا جو ذخیرہ موجود ہے اس سے

(بہ اجازت ڈائرکٹر صاحب آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن) ―――― (پروفیسر) مرزا محمد سعید ایم۔ اے

بادۂ سرجوش

(۱)

اسرارِ زباں کھول رہے ہیں کہہ دو
نشّے کو مرے تول رہے ہیں کہہ دو
اے نغمہ گرانِ بارگاہِ ساقی
جبریل ابھی بول رہے ہیں کہہ دو

(۲)

مشکل ہے مرا فریب کھانا زاہد
تو اور معارف کا فسانا زاہد
پہلے یہ سمجھ فرش کے حقائق تو بتا
پھر عرش کے اسرار بتانا زاہد

(۳)

ہر شے میں نہاں خیر کا جوہر دیکھا
ہر خار کے پہلو میں گلِ تر دیکھا
جب چاک کیا ذرۂ تاریک کا دل
خورشیدِ ازل کو جلوہ گستر دیکھا

(۴)

اس زہد پہ اور پیروِ باطل ہونا
اس علم کے باوجود جاہل ہونا
حوروں کا تجھے خلد میں ملنا اے شیخ
شیطاں پہ ہے قرآن کا نازل ہونا

جوشؔ
ملیح آبادی

نفسِ تحت الشعوری

میں نے اکثر احباب سے دریافت کیا کہ رات کو خواب دکھائی دینے کی کیا وجہ ہے تو عام طور پر یہی جواب ملا کہ انسان میں دو روحیں ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جو اُس کے جاگتے ہوئے دیکھتی ہے سوچتی ہے اور محسوس کرتی ہے اور دوسری سیلانی روح جو دن والی روح کو نیند کی حالت میں چھوڑ کر رات کو جب ہم سو جاتے ہیں تو دور دور علاقوں میں جا کر عجیب عجیب قسم کی چیزیں دیکھتی ہے۔ کبھی اُڑتی ہے کبھی اونچے اونچے میناروں پر سے کودتی نظر آتی ہے۔ کبھی عجیب عجیب شکلیں بنا کر سامنے آتی ہے۔ اور اس سیلانی روح کی کارگزاریاں ہی ہوتی ہیں جو سپنے بن کر ہم کو سوتے وقت دکھائی دیتی ہیں۔ بلکہ ایک صاحب نے تو از راہِ ہمدردی یہ بھی بتایا کہ رات کو بغیر پانی پیئے سونا نہیں چاہیئے۔ کیونکہ پیاسی سیلانی روح جسم سے نکل کر پانی کے کھلے ہوئے مٹکوں میں چلی جاتی ہے اور اگر کوئی اوپر سے ڈھکنا ڈھک دے تو سیلانی روح وہاں بند ہو جاتی ہے اور آدمی سوتے چلا جاتا ہے۔ اسی طرح ہسٹریا کی مریض عورتوں سے جو اکثر عجیب حرکات سرزد ہوتی ہیں اور مختلف آوازیں اُن میں سے آتی ہیں اُس کی وجہ بھی یہ بتائی گئی کہ کوئی غیر روح اُن کے جسم پر قبضہ پا جاتی ہے۔

اب ذرا ماہرانِ نفسیات کو بھی سُن لیجیے کہ اُن کا کیا خیال ہے۔ یہ تو ناممکن تھا کہ انسانی زندگی سے اتنا قریبی تعلق رکھنے والے اور انسان کے دل و دماغ پر اتنا گہرا اثر ڈالنے والے واقعات پر ماہرانِ نفسیات کی نظر نہ پڑتی اور وہ اُن کی اصلیت معلوم کرنے کی کوشش نہ کرتے۔ لہذا اپنے اپنے دائرہ علم کے ماہرانِ واقعات کی تحقیقات میں عرصے سے مصروف ہیں اور اُن کی تحقیق اور تجسس کے نتائج (Psycho-analysis) اور (Psychiatry) کے نام سے عوام کے سامنے آتے ہیں۔

ماہرانِ نفسیات کا خیال ہے کہ ہمارے شعور کے یا (Conciousness) کے مختلف درجے ہوتے ہیں۔ آپنے چاند ماری کا تختہ تو دیکھا ہوگا اُس کا تصور کر لیجیے یا بہتر تو یہ ہے کہ ایک کاغذ لے کر اُس کے بیچ میں روپے کے برابر ایک دائرہ بنا کر اُس کو اندر سے پنسل لے کر سیاہ کریں اور اُس پر نمبر ۱ ڈال دیں۔ اس چھوٹے سے سیاہ دائرہ سے ایک انچ کے فاصلے پر ایک اور حلقہ بنا کر اس پر نمبر ۲ ڈال دیں۔ اسی طرح اس کے باہر ایک انچ کا فاصلہ چھوڑ کر ایک اور حلقہ بنا کر اُس پر نمبر ۳ ڈال لیں۔ اور باقی جو کاغذ بچ جائے اُس پر نمبر ۴ ڈال دیں۔ اب نمبر ۱ تو گویا ہمارے شعور یا (Conciousness) کا وہ درجہ ہے جس کو توجہ کی حالت کہا جا سکتا ہے۔ اس حالت میں ہم جو کچھ دیکھتے ہیں یا سُنتے یا سوچتے ہیں وہ صاف اور واضح ہوتا ہے۔ مثلاً اس وقت آپکی توجہ ریڈیو سٹ پر ہے (یہ تقریر میں تھا کیونکہ سُننے والے کی توجہ ریڈیو سٹ پر تھی۔ آپ ریڈیو سٹ کی بجائے ساقی کا صفحہ پڑھ لیجیے) اور آپکے کان جو آواز اُس سے آ رہی ہے اُس پر لگے ہوئے ہیں۔ گویا ریڈیو سٹ اور اُس کی آواز آپکے شعور کے درجہ نمبر ۱ میں ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ کمرے میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کی طرف آپکی توجہ نہیں ہے لیکن بہت تھوڑی سی کوشش سے آپ ریڈیو سٹ سے توجہ ہٹا کر اُن کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں یا اُنکی کوئی تبدیلی مثلاً کسی کا کمرہ میں داخل ہونا یا کمرے سے چلا جانا۔ یا کسی صاحب کا جُھکنا یا کھڑا ہونا آپکو اُنکی طرف متوجہ کر دیگا۔ یہ چیزیں گویا حلقہ نمبر ۲ کے شعور میں داخل ہیں۔ یعنی یہ دائرہ توجہ سے زیادہ دُور نہیں۔ انکے علاوہ موجودہ شعور سے دُور ہمارے شعور کا ایک اور درجہ ہے جس پر توجہ ڈالنے کے لئے ہم کو زیادہ کوشش کرنی پڑتی ہے۔ اس درجے میں ہماری زندگی کے پُرانے

واقعات کی یاد ہے۔ جو کچھ ہم نے کیا ہے یا دیکھا ہے یا سُنا ہے یا سوچا یا پڑھا ہے یا جو کچھ ہم پر گذرا ہے وہ سب حلقہ نمبر۲ میں سمجھئے۔ یہ پُرانے واقعات ہر وقت ہمارے شعور میں اس تازگی کے ساتھ نہیں رہتے جیسے کہ وہ چیزیں جن پر ہماری توجہ ہوتی ہے۔ ہاں جس وقت ہمیں وہ باتیں یاد آجاتی ہیں تو گویا یہ واقعات نمبر۳ سے نمبر۱ میں آجاتے ہیں اور پھر ہماری توجہ اپنے سامنے کی چیزوں سے ہٹ کر ان پر پڑتی ہے اور بعض وقت جب ہم اپنے خیالات میں محو ہوتے ہیں تو اگر کوئی کمرے میں داخل ہو تو بھی اُس کی خبر نہیں ہوتی اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارا کمرہ اس حالت میں حلقہ نمبر۱ کے شعور میں نہیں بلکہ حلقہ نمبر۲ کے شعور میں ہوتا ہے اور حلقہ نمبر۱ کے شعور میں ہمارے گذشتہ واقعات ہوتے ہیں جو دراصل حلقہ نمبر۳ کے مکین ہیں۔

اب باقی کاغذ کو لیجے جس پر آپ نے نمبر۴ ڈالا ہے۔ اس درجہ شعور میں ہماری زندگی کے وہ واقعات، تاثرات، خواہشات اور وہ چیزیں ہوتی ہیں جن سے ہم کو خطرہ ہوتا ہے۔ اکثر دفعہ بہت سی باتیں ایسی ہوجاتی ہیں کہ ہوتے وقت ہماری توجہ اُن کی طرف نہیں ہوتی اور اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ فلاں واقعہ ہوا تو ہم یہی جواب دینگے کہ نہیں کیونکہ ہم اُنہی واقعات کو یاد کرسکتے ہیں جن کی طرف ہم متوجہ ہوئے ہوں۔ مثلاً فرض کیجیے کہ ایک پنجابی عورت ریسٹورنٹ میں چاء پی رہی ہے۔ اُسی کمرے میں ذرا فاصلے پر دو مدراسی آدمی اپنی مدراسی زبان میں گفتگو کر رہے ہیں۔ نہ تو یہ عورت مدراسی زبان سمجھتی ہے نہ اُس طرف متوجہ ہے۔ ہاں آوازیں اُس کے کان میں ضرور داخل ہو رہی ہیں۔ ریسٹورنٹ سے نکلنے پر اگر اس سے سوال کیا جائے کہ کیا وہاں دو مدراسی بھی تھے تو شاید یہ یقین کے ساتھ نہ کہہ سکے۔ اب اگر اس عورت کو ہسٹیریا ہوجائے اور بہکتے وقت یہی مدراسی الفاظ اس کی زبان سے نکلیں تو دیکھنے والے تو یہی کہیں گے کہ کسی مدراسی بھوت نے اس پر قبضہ پا لیا ہے لیکن حقیقت صرف اتنی ہے کہ وہ مدراسی گفتگو جو کسی وقت درجہ نمبر۴ کے شعور میں تھی، اب کسی نہ کسی طرح موقعہ پاکر درجہ نمبر۱ کے شعور پر غالب آکر اپنا اثر دکھا رہی ہے۔

بالکل یہی حال ہماری خواہشات کا ہے۔ اکثر ایسی خواہشیں ہمارے دل میں پیدا ہوتی ہیں جن کا اظہار کرنے سے ہم کو شرم آتی ہے اور چونکہ وہ ہم کو خود ناپسند ہوتی ہیں اس واسطے ہم اُنکو اپنے ذہن سے اُتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن یہ خواہشات گو جاگتے ہوئے دب جائیں مگر رات کو جب ہم سو جاتے ہیں اور بُرے بھلے میں تمیز کرنے کی طاقت جس کو انگریزی میں (CENSOR) کہتے ہیں کمزور پڑجاتی ہے تو وہی خواہشات ہمارے شعور پر غالب آجاتی ہیں جن کو ذہن سے اُتارنے کی کوشش کی تھی اور خواب کی صورت اختیار کرلیتی ہیں۔ مثلاً فرض کیجیے کہ ایک غریب آدمی کا بچہ ہے جسکو اپنے ہمجولیوں میں کھیلتے ہوئے اپنی غریبی کا احساس تنگ کرتا ہے۔ اس کے دل میں ایک ہلکی سی خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنے سب ہمجولیوں سے زیادہ امیر ہوجائے۔ اگر کھیلتے وقت آپ اُس سے دریافت کریں تو وہ فوراً انکار کردیگا کہ ایسی خواہش اُسکے دل میں پیدا ہوئی کیونکہ یہ خواہش حلقہ نمبر۱ کے شعور میں یعنی توجہی مرکز میں نہیں ہے۔ مگر رات کو یہی خواہش جب توجہی مرکز کمزور پڑجائیگا ایک خواب کی صورت اختیار کریگی، جس میں یہ بچہ بادشاہ بنا ہوگا اور جن لڑکوں سے اس کی دوستی ہوگی وہ وزیر اور جن سے اس کی دشمنی ہوگی وہ چور وغیرہ بن کر اُس کے سامنے پیش ہونگے جن کو یہ دل کھول کر سزا دیتا ہوگا۔

یہی حال ہمارے خطرے کے جذبات کا ہے۔ چھوٹے بچوں کو اگر چوروں یا دیو پریوں کی کہانیاں سُنائی جائیں تو وہ رات کو سوتے ہوئے ڈرتے ہیں کیونکہ یہی چیزیں اُنکو خواب میں دکھائی دیتی ہیں۔ اور چھوٹے بچوں پر ہی کیا منحصر ہے ہم سب کا یہی حال ہے۔ جہاں سپنے میں

دن میں پوری نہ ہوسکنے والی خواہشات پوری ہوتی ہیں وہاں وہ خیالات جو دن میں محض ایک خطرے کی صورت رکھتے ہیں رات کو ایک اصل واقعہ کی صورت میں نہایت بھیانک صورتیں پیدا کرکے ہمکو ڈراتے ہیں۔

اِس قسم کے جذبات، خیالات، تاثرات، خواہشات اور خطرات جن کا جاگتے وقت ہم کو بالکل علم نہ ہو بلکہ ہم اُنکی موجودگی تک سے مُنکر ہوں اور جو اس طرح موقعہ پاکر ہمارے سپنے میں یا ہماری حالت میں ہم سے ظاہر ہوں اُنکو مختلف ماہرانِ نفسیات نے غیر شعوری (un-concious) یا (sub-concious) جنکو ہم تحت الشعوری کہہ سکتے ہیں کے نام سے پکارا ہے۔ یہ نفسِ تحت الشعوری ہماری زندگی پر سوتے اور جاگتے نہایت گہرا اثر ڈالتا ہے۔ یہاں تک کہ بیماریاں جنکو دماغ کی خرابی یا بھوت پریت کا اثر خیال کیا جاتا ہے اُن میں سے اکثر اِس تحت الشعوری نفس کے اثر کا نتیجہ ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب جاگتے وقت ہم کو اس تحت الشعوری کا علم نہیں ہوتا تو پھر یہ ہماری زندگی پر کسی طرح اثر انداز ہوسکتا ہے۔ اس کا جواب سمجھنے سے پہلے اپنے ایک دفعہ توجہی مرکز کے شعور یعنی شعور درجہ نمبر ۱ اور اُس کے گرد کے شعور پر ایک اور نظر ڈالیں۔

آپکو یاد ہوگا کہ حلقہ نمبر ۱ کے شعور کو ہم نے توجہ کا درجہ قرار دیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس حالت میں ہم جو کچھ دیکھتے ہیں یا سُنتے ہیں وہ سب کچھ واضح ہوتا ہے۔ اور کسی چیز یا خیال کو ہم اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک اُس پر ہماری توجہ نہ پڑی ہو۔ یعنی جب تک اُس کا علم درجہ نمبر ۱ کی شعوری کیفیت میں نہ ہوا ہو۔ اور لطف یہ ہے کہ ایک وقت میں یہ دائرہ توجہ زیادہ وسیع نہیں ہوسکتا۔ ریڈیو سٹ کے علاوہ اگر ری اور چیز کی طرف آپ متوجہ ہونگے تو ریڈیوسٹ آپکے خیال سے اُتر جائیگا۔ اگر پچھلے واقعات کو یاد کرینگے یعنی اگر گذشتہ واقعات کو توجہی مرکز میں جگہ دینگے تو آمنے سامنے کی چیزیں آپکے خیال سے اُتر جائیں گی۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی عمل کے ظہور میں آنے کے لئے یا کسی شے یا خیال کا واضح طور پر علم ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ توجہی درجے میں آئے۔

شعور کے مختلف درجوں میں سے نکل کر توجہی مرکز میں آنے کی اشیا یا خیالات کے لئے مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔ یا تو ہم ارادتاً ایک چیز سے توجہ ہٹا کر دوسری چیز یا خیال موجودہ یا گُزشتہ کی طرف اپنی توجہ کریں۔ یا اُسی چیز یا خیال میں اتنی طاقت پیدا ہوجائے کہ خواہ مخواہ ہمارے ارادے کے بغیر وہ ہماری توجہ اپنی طرف کھینچ لے۔ جیسے بلند آوازیں یا جسمانی تکالیف یا عجیب و غریب چیزیں۔

نقل و حرکت مابین الشعوری کے اس اُصول کو سمجھ لینے کے بعد ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ حلقہ نمبر ۲، نمبر ۳ اور نمبر ۴ کی تحت الشعوری کیفیات میں کیا فرق ہے۔

جیسے کہ عرض کیا جاچکا ہے حلقہ نمبر ۲ اور نمبر ۳ کی تحت الشعوری کیفیات ہماری توجہی زندگی سے زیادہ دُور نہیں۔ اس واسطے ان میں جو نشو و نما یا تبدیلی ہوتی ہے اُس کا ہم کو علم رہتا ہے اور جب یہ کیفیات توجہی مرکز میں داخل ہوتی ہیں تو ہم ان کو نہایت آسانی سے پہچان لیتے ہیں کہ ہاں یہ ہمارا گرد و نواح یا ہمارے گذشتہ واقعات ہیں۔ آپکو اپنے کمرے کی کُرسیاں یا کتابیں دیکھ کر تعجب نہیں ہوتا اور نہ ہی اپنے گذشتہ واقعات کے بارے میں یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ آپکی زندگی سے تعلق بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ سب چیزیں اور یہ سب واقعات ہماری جاگتی شخصیت سے وابستہ ہیں۔

اس کے برعکس حلقہ نمبر ۴ کی کیفیات (جن پر عام طور سے (sub-concious) یا تحت الشعوری کا اطلاق ہوتا ہے)

کی نشوونما ہمارے علم میں نہیں ہوتی اور یہی وجہ ہے کہ جب یہ کیفیات خواب کی صورت میں یا بیماری کی حالت میں توجہی مرکز میں آتی ہیں تو ہم اُن کو پہچان نہیں سکتے اور ہم کو اپنے خواب اور ہسٹیریا کی مریض عورتوں کی حرکات اپنی اور اُن کی شخصیت سے مختلف اور دُور معلوم ہوتی ہیں۔

دوسرا فرق جو قابلِ غور ہے وہ حلقہ نمبر ۱ اور نمبر ۲ کی تحت الشعوری کی کیفیات اور حلقہ نمبر ۳ کی کیفیات کے نشوونما میں ہے۔ ہمارے گرد و نواح کی چیزیں اور ہمارے گذشتہ واقعات ایک زمانہ گزر جانے کے بعد بھی زیادہ تبدیل نہیں ہوتے، یہ ممکن ہے کہ گذشتہ واقعات ہم کو پوری طرح سے یاد نہ رہیں لیکن یہ نہیں ہوتا کہ اگر ہم نے اپنی میز پر کوئی چیونٹا چلتا دیکھا تھا تو آج ہم کو یاد آئے کہ ہم نے اپنی میز پر ہاتھی چلتا دیکھا تھا جسکو ہم نے اپنی قلم سے اُٹھا کر پھینک دیا تھا۔ یعنی یاد کرنے میں واقعات کی صورت نہیں بدلتی۔ اس کے برعکس حلقہ نمبر ۳ کی کیفیات عام طور پر نشوونما پاکر عجیب عجیب صورتیں اختیار کر لیتی ہیں۔ اگر کسی شخص کے دل میں معمولی سی بھی خواہش ہو کہ وہ طاقتور بن جائے تو جب یہ خواہش نمبر ۳ کے تحت الشعور سے نمبر ۱ کے توجہی مرکز میں آئیگی تو وہ اپنے کو رستم زماں محسوس کریگا۔ اور اگر یہ کیفیت بہت قوی ہو جاتے تو جاگتی حالت میں بھی وہ اس کا دعوے کریگا اور شاید آگے پہنچ کر بھی اس پر قائم رہے۔ ہمارے سپنوں کے اکثر دلچسپ اور بھیانک واقعات ایسی ہی تبدیلی اور بہروپ کا نتیجہ ہوتے ہیں جو ہمارا نفس تحت الشعوری اختیار کر لیتا ہے۔

تیسرا فرق جو نہایت اہم ہے وہ یہ ہے کہ حلقہ نمبر ۱ و نمبر ۲ کی کیفیات توجہی مرکز میں معمولی سی تبدیلی یا معمولی سی کوشش سے آسکتے ہیں۔ لیکن حلقہ نمبر ۳ کی کیفیات کے طاقت اور اثر اختیار کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ توجہی مرکز کا شعور نہایت کمزور ہو جائے اور یہ صورت صرف نیند میں یا بیماری کی حالت میں یا کمزوری دماغ کی حالت میں پیدا ہو سکتی ہے۔ اور جب ان کو اوپر آنے کا موقع مل جاتا ہے تو پھر خواب میں عجیب عجیب چیزیں دیکھنا یا عجیب عجیب کام کرنا یا بولنا یا سوتے ہوئے چلنا یا بیماری کی حالت میں بکنا یا آوازیں نکالنا یا عجیب عجیب حرکتیں کرنا سب کچھ ظہور میں آتا ہے۔

بعض دفعہ یہ دیکھا گیا ہے کہ ایک شخصیت کے دو حصے ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے ایک شخص ایک وقت اپنا اصلی نام بتاتا ہے اور حسبِ معمول حرکتیں کرتا ہے۔ اور بعض وقت بالکل عجیب نام بتاتا ہے اور بالکل مختلف حرکتیں کرتا ہے۔ ایک سچا واقعہ بیان کیا جاتا ہے (راوی امریکہ کا مشہور فلاسفر اور ماہرِ نفسیات ولیم جیمس ہے) کہ امریکہ کے ایک شہر میں ایک چودہ برس کی لڑکی لورینی نام نے ایک دن اپنے والدین سے کہا کہ میں میری ہوں۔ جب اس پر اظہار تعجب کیا گیا تو لڑکی نے جو اپنے کو کسی حالت میں لورینی ماننے کے لئے تیار نہ تھی رنج اور اضطراب کا اظہار کیا۔ اب لطف یہ ہے کہ میری جس لڑکی کا نام وہ بتا رہی تھی اور جس کا اتہ پتہ بھی دے رہی تھی یہ کہہ کر کہ میرا گھر وہاں ہے اور میرے والدین یہ ہیں۔ بارہ سال پہلے مر چکی تھی۔ اور نہ لورینی نے اور نہ لورینی کے والدین کو کبھی میری یا میری کے والدین کو دیکھا یا اُن کا نام سُنا تھا۔ لورینی کے والدین نے آخر تنگ آکر لورینی کو (جو اپنے کو میری کہہ رہی تھی) اُسکے بتائے ہوئے پتہ کے مطابق میری کے والدین کے ہاں پہنچا دیا۔ یہاں پہنچ کر لڑکی نے اس طرح رہنا شروع کر دیا گویا وہ اس ہی گھر کی لڑکی تھی اور میری کے والدین کو اپنا باپ اور ماں پکارنا شروع کر دیا۔ اور اپنے حقیقی باپ کو ایک اجنبی سمجھ کر دُور ہو گئی۔ اس نے میری کے والدین سے کہا کہ میں تمہاری فوت شدہ لڑکی میری کی روح ہوں اور بارہ سال کے بعد میں نے لورینی کے جسم کو مستعار لیا ہے۔ چودہ ہفتے تک میں رہونگی پھر چلی جاؤنگی۔ پورے چودہ ہفتے تک یہ لڑکی میری کے گھر میں بالکل میری کی طرح رہتی رہی۔ جب چودہ ہفتے ختم ہو گئے تو ایک صبح اُس نے اُٹھ کر پوچھا میں کہاں ہوں اور میری کے والدین کو (جن کو ایک رات پہلے تک یہ اپنے ماں باپ کہتی رہی تھی)

اجنبی سمجھ کر اُن سے دُور ہوگئی۔ جب اُنھوں نے یقین دلایا کہ تو میری کی روح لورینی کے جسم میں ہے تو اُس نے میری ہونے سے قطعی انکار کیا اور کہا کہ میں لورینی ہوں۔ مجھے میرے والدین کے ہاں پہنچا دو۔ اس واقعہ کے بعد وہ بحیثیت لورینی کے اپنی زندگی بسر کرتی رہی۔ اس واقعہ کو پڑھنے کے بعد اکثر اصحاب کہیں گے کہ یہ بیّن ثبوت ہے ارواح کے وجود اور اُن کے کرتوت کا۔ لیکن اکثر ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ یہ باتیں بھی جن کو عام طور پر بھوت پریت کا اثر خیال کیا جاتا ہے نفسِ تحت الشعوری کا ایک کرشمہ ہیں۔

مرزا محمود بیگ ایم۔ اے

اسرارِ بیخودی

"مے ولا" بھی خراباتِ ہی میں پی میں نے　　نہ کی کبھی ہوسِ "جنگ زرگری" میں نے
مُناقشات سے ابتک کبھی نہ رکھا کام　　بڑے مزے میں گزاری ہے زندگی میں نے
مُکابرات کے آثار جب نظر آئے　　نگاہ ساقیٔ مہوش کی دیکھ لی میں نے
بھُلا دئے ہیں وہ بیجا مُظاہراتِ غرور　　کہا تھا جن کو کسی وقت "واجبی" میں نے
"خودی پرست" بہت فائدہ اُٹھائینگے　　بتا دئے ہیں کچھ "اسرارِ بیخودی" میں نے
"فریب خوردۂ آثار" نے کہا مجھے مست　　کہ "دیدنی" کو بھی جانا شنیدنی میں نے
دقیقہ رس مجھے "خوش فہم فلسفی" نے کہا　　کہ اس کو دی نہیں دادِ سخن رسی میں نے
ہمیشہ ساتھ دیا ذوقِ بیخودی نے مرا　　لیا ہے کام خودی سے کبھی کبھی میں نے
خلوصِ نیت و حُسنِ سلوک و لُطفِ خیال　　یہاں نہ پائی کسی چیز کی کمی میں نے
کسی نے میری برائی کبھی نہیں چاہی　　کسی کے حق میں برائی کبھی نہ کی میں نے

مُعاملات کو دلچسپ استعاروں میں
کیا ہے پیش بہ عنوانِ میکشی میں نے

علی منظور حیدرآبادی

بھلائی ہوئی محبت!

نوٹ:- یہ افسانہ فرانس کے مشہور رومانی افسانہ نگار بالزیک کی ایک کہانی کا ترجمہ ہے۔ میں نے اسے فرانس کی بجائے ہندوستانی اسمارا شخاص اور مقامات کے نام دیدئے ہیں۔ میں جانتا ہوں بعض حضرات کو یہ افسانہ اچھا نہ لگے گا کیونکہ ہمارے علمار اخلاق میں سے بعض نے کہا ہے کہ نوجوان لڑکیوں کو قرآن پاک کی سورۂ یوسف تک نہ پڑھنے دینا چاہیے۔ مگر ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہمارے مکتبوں میں سورۂ یوسف ہی نہیں یوسف زلیخا بے جامی درسی کتابوں میں رہی ہے اور اب طالبوں کے فارسی کورس میں داخل ہے۔ علاوہ ازیں میں اس افسانہ کی اشاعت کی تائید میں یہ بھی کہونگا کہ اگر ہم چاہیں تو اس افسانہ سے درس عبرت حاصل کرنے کے لئے ان حقائق کو مدنظر رکھ سکتے ہیں۔ (۱) اکثر بے جوڑ شادیاں بری ہوتی ہیں۔ (۲) بعض دفعہ غیر کفو میں شادیاں محبت کے جذ کے ماتحت ہو جاتی ہیں مگر آنکھیں کا زور کم ہوتے ہی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں چکمہ کھا گئے۔ عورت نے مرد کو یا مرد نے عورت کو غلط سمجھا تھا (۳) اگر عورت و مرد میں قانونی یا شرعی پیوند قائم نہ ہو تو عورت و مرد کی بڑی سے بڑی قربانیوں کے بعد فریقین یا دونوں میں سے کوئی ایک آسانی سے دوسرے سے چشم پوشی کر سکتا یا ترک تعلق کر کے من مانی کارروائیاں کر سکتا ہے اور فریق مظلوم کیلئے بجز گھٹ گھٹ کر مرجانے یا ذلیل ہو کر رہنے یا خودکشی کر لینے کے سوا کوئی ذریعہ دادرسی کا باقی نہیں رہتا۔ (۴) یہ کہانی فرانسیسی سوسائٹی کے متعلق ہے مگر ذرا دیکھئے تو آپ کی مشرقی سوسائٹی میں ایسے ایسے حوادث ہوتے ہیں یا نہیں اگر ہیں تو ان کی اصلاح کی ضرورت ہے یا آنکھیں بند کر کے ہونے دینے کی ضرورت ہے۔

"شہاب"

اپریل کے آخری ایام تھے اور بہار کا شباب۔ کہ بمبئی کے چند مشہور ترین ڈاکٹروں کو ایک نوجوان رئیس کے طبی معائنہ کے لئے طلب کیا گیا، جو ایک عجیب و غریب حالت میں مبتلا تھا۔ باوجود کوشش کے یہ لوگ مرض کے اسباب دریافت نہ کر سکے کہ آیا ان کے مریض کا مرض کثرت مطالعہ کے باعث تھا یا رہنے سہنے کی دوسری بے اعتدالیوں کے سبب تاہم انہوں نے فیصلہ یہی کیا کہ اُسے مہابلیشور کے مقام پر تبدیل آب و ہوا کیلئے بھیج دیا جائے۔ ڈاکٹروں نے مریض کو تاکید کی کہ اسے مکمل آرام لینا، پرہیزی غذا کھانا۔ اور بکثرت صاف اور تازہ ہوا میں سانس لینا چاہیئے۔ اسلئے وہ سمندر سے بہت دور فاصلہ پر دیوالی میں ایک دور کے رشتہ دار کے پاس چلا گیا جنہوں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اسکی آمد کو اسی طرح نعمت غیر مترقبہ سمجھا جو گنجان آبادیوں سے دُور تنہائیوں میں رہنے والوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسے دور دست مقامات پر رہنے والوں کے ہاں مہمان جبتہ کم آیا جایا کرنے ہیں اسی لئے آنے والے مہمانوں کو مغتنم سمجھا جایا کرتا ہے۔ اور پھر یہ قصبہ تھا ہی کتنا بڑا؟

اپنی رشتہ دار سینیہ بیگم کے ہاں جانیکے دو تین روز بعد ہی اس نے اُس چھوٹے سے قصبہ کے سب قابل ذکر لوگوں سے ملاقات کر لی اور اسے معلوم ہو گیا کہ یہ لوگ تنہائی پسند ہونیکے ساتھ شہریوں کی اصطلاح میں "بدذوق" بھی ہیں۔ جیسا کہ شہریوں کے نزدیک دیہاتی اور قصباتی عموماً ہوا کرتے ہیں۔

بہرحال اسی حلقہ شرفا و امرا میں ایک سربرآوردہ شخص ایسے بھی تھے جو پوتڑوں کے امیر اور سیر و شکار کے بڑے شوقین بزرگوار تھے جنہوں نے جوں توں کر کے تا یم مطلق العنانی کے خیالات کے مقابلہ میں موجودہ طرز حکومت کو، کڑوا گھونٹ سمجھکر گلے سے اُتار لیا تھا۔ آپ کونسل اور بلدیہ کے تمام ممبروں کو جو اُن کے نزدیک "شرفا" میں سے نہ ہوتے تھے۔ بہت ہی نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔ اگرچہ آپ بلدیہ کے ٹیکسوں کو ادا تو کیا کرتے تھے مگر اسی طرح جس طرح اپنی خدائی منوانے والے بادشاہ کو دور انقلاب میں سولی پر چڑھنا ہوتا ہے۔ آپ کی بیگم صاحبہ ہمیشہ بڑی بڑی باتیں کیا کرتی تھیں اور امیرانہ شان سے تکلم فرمایا کرتی تھیں۔ پیروں فقیروں کو بہت مانتی تھیں، مزارات پر جا کر اپنی چوٹی سے جھاڑو دیا کرتی تھیں۔ مگر اپنے بچوں کی بڑی آتالیق تھیں۔ ان کو آپ نے ایسی اُٹھان اُٹھایا تھا کہ خدا دشمن کے بچوں کو بھی اس رنگت سے بچائے۔ بیگم صاحبہ جزرسی و دنائت کی حدتک پہنچ چکی تھی۔ بڑی ہی تنگدل اور پرانی لکیر کی فقیر خاتون تھیں۔ وہ اپنے محل میں کسی نئے رواج کو پرانے رواجات کے مقابلہ میں قدم رکھنے نہ دیتی تھیں۔ ان کے کمرے سامان آرائش سے خالی تھے جو سامان تھا بھی وہ بہت کہنہ اور قدیم تھا اس محل میں رہنے والا ہر شخص پرانے زمانے کی تراش و خراش اور وضع قطع ہی کا لباس پہننا پسند کرتا تھا۔

اس قدیم دولتمند خاندان کے علاوہ یہاں ایک اور خاندان بھی بستا تھا۔ یہ لوگ نسبتاً زیادہ خوش حال تھے۔ مگر ان کا سلسلۂ نسب کسی قدیم چنگیز اور تیمور

نہیں ملتا تھا۔ یہ دونوں میاں بیوی باقاعدہ ہر مہینہ بمبئی کا ایک چکر ضرور لگایا کرتے تھے اور ہر دورے میں عہد جدید کے نئے نئے خیالات و رجحانات کے تحفہ ہمراہ لایا کرتے تھے۔ بیوی کا لباس موزوں و مناسب ہوتا تھا اور ان بیگم کی خواہش تھی کہ اپنے بچوں کو ضروریات زمانہ کے مطابق اچھی تعلیم و تربیت دلوائیں۔ رہے ان کے خاوند انہوں نے شاہی کے انقلاب کے بعد۔ جدید سیاسی اصلاحات کو خندہ پیشانی سے قبول کرلیا تھا حتی کہ ان کے موجودہ حکومت کے اکثر وزراسے بھی دوستانہ مراسم تھے۔ جو قدیم نقطۂ نظر کے ماتحت۔ خاندانی نواب نہ تھے۔ بلکہ عوام ہی سے اپنی اپنی استعداد کے مطابق آگے بڑھے تھے۔

ان لوگوں کے علاوہ ایک خاندانی پیر صاحب بھی تھے ان کے بعد کم اہمیت کے لوگوں میں کچھ بری و بحری افواج کے پنشن یافتہ افسران تھے۔ جنکے مشاغل چوسر و شطرنج کی بازیاں لگانا تھا۔ البتہ ان لوگوں کا پسندترین مشغلہ یہ تھا کہ مختلف خاندانوں میں باہمی شادی بیاہ اور رشتہ داریاں کرادیا کریں۔ ان لوگوں میں سے بعض کی بیویاں امراکی بیگمات سے بھی زیادہ دون کی لیا کرتی تھیں کون تھا جو انکی زبان کی کاٹ سے بچا ہو۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ یہ خود عزت و آبرو سے رہتی تھیں اور یہی وہ بات تھی جسکی وجہ سے انکے نام ونسب کی کمیاں چھپ جاتی تھیں۔ ان کے لئے جب بھی ممکن ہوتا تھا بمبئی جایا کرتے تھے اور واپسی پر نئی نئی قسم کی ساریاں لاتے تھے۔ جن کو دیکھ کر خاندانی امیروں کو بھی رشک آجاتا تھا۔ ان سب لوگوں کے بعد تین بوڑھی نجیب و شریف خواتین بھی تھیں جنہوں نے انقلاب سلطنت کو دعاؤں کے بعد پایا اور باہمی مبارکباد کے ساتھ قبول کرلیا تھا۔ چند نو دولتوں نے اپنے تنہائی کے دلچسپ مشغلوں کیلئے خاندانی امیرزادیوں کو انکی تنہائیوں میں ڈھونڈ نکالا تھا۔ اور جب یہ موخرالذکر لوگ اپنی تنہائیوں سے گھبرا جاتے تھے۔ تو اپنے نو دولت دوستوں کو اپنے بنگلوں پر دعوتیں دیا کرتے تھے۔ اس وقت ان کا انداز کچھ ایسا ہی ہوتا تھا جیسا کہ ایک ہوٹل والے کا ہوتا ہے۔ وہ سوداگر جو اپنے کاروبار سے تنگ آگیا ہو اور چاہتا ہو کہ اپنے باسی کھانوں میں مرچ مسالہ ڈال کر کچھ رد و بدل کرتا رہے۔ جب کوئی اجنبی ان کے مکانوں میں داخل ہوتا تو وہ تعریفاً کہتے کہ ہمیں خوف ہے کہ آپ بمبئی کے مقابلہ میں اس کو رہ کو بہت ہی مردہ بستی پائیں گے اور ان میں سے ہر ایک کوشش کیا کرتا تھا کہ ثابت کردے کہ تنہا وہی ایک دانا اور فہیم شخص ہے۔

وہیں تو ایسی کوشش کرنا کہ یہاں کے حالات میں کچھ بلندی پیدا ہوجائے۔ لیکن جیسا کہ آپ ملاحظہ کررہے ہیں۔ سب بیکار۔ اب اگر اجنبی زمانہ ساز ہے اور چاہتا ہے کہ ... سے بنائے رکھے۔ تب تو وہ ان امراکی سوسائٹی میں دوبارہ باریاب ہوسکتا تھا اور اگر وہ صاف گو ہوتا اور بے لاگ کھری کھری باتیں کہہ اٹھتا تو دفعتاً اسکے متعلق مشہور ہوجاتا کہ یہ کوئی بمبئی کا بگڑا ہوا آدمی ہے۔

مگر جب ہمارا غیاث یار جنگ اس فضا میں ظاہر ہوا تو اُسے نہایت فراخدلی سے خوش آمدید کہا گیا اسلئے اسکی بنت عم سفینہ بیگم نے پہلے ہی سے لوگوں کو ہموار کرلیا تھا۔ اس نے لوگوں کو یقین دلا دیا تھا کہ غیاث کتنا دولتمند اور بارسوخ آدمی ہے۔ اور اسکے تعلقات کا حلقہ کس قدر وسیع ہے۔ بہرحال اس کا استقبال ایک نوجوان شریف زادے کی طرح ہوا اور ظاہر ہے کہ ان حالات میں اکثر مائیں جنکی لڑکیاں جوان اور شادی کے قابل تھیں۔ مختلف طریقوں سے چاہتی تھیں کہ وہ مہمان تازہ کی نظر میں خوش خلاق ٹھیریں۔

مشہور یہ تھا کہ غیاث کا باپ اپنی ساری دولت اور قدیم خاندانی محل اسی کو ترکہ میں دے گیا۔ یہ محل قدیم بہت اچھی حالت میں تھا۔ ان کے کھیت سرسبز و شاداب تھے لہذا اس نوجوان کا مستقبل بہت درخشاں اور کامیاب نظر آرہا تھا۔

یہ سب باتیں تو وہ اپنے چچیرے بھائی غیاث کے متعلق کہتی ہی تھی۔ مگر اس بارے میں ایک لفظ بھی اسکی زبان پر نہ آتا تھا کہ غیاث کا ایک بڑا بھائی بھی موجود ہے۔ اگرچہ وہ سل میں مبتلا ہو کر موت کی آمد کی گھڑیاں گن رہا تھا۔

پہلے پہل تو غیاث اپنے آپ کو ان لوگوں میں پاکر کسی قدر حیرت زدہ سا رہا۔ وہ روزانہ اپنی یادداشت میں انکی حرکات و سکنات کو لکھتا جاتا تھا ان لوگوں کے متعلق اس کا خیال تھا کہ یہ اس چڑیا کیطرح چہکتے ہیں جو اپنے گرد چکر کاٹتی اور اسی کو ساری دُنیا سمجھکر رات دن اسی میں چہچہاتی رہتی ہے۔ اسے انکی زندگی تارک الدنیا فقیر کی سی نظر آتی تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ اپنے نئے ماحول میں رہنے سہنے کا عادی ہوگیا۔ اور پھر تو اسے انہی لوگوں میں ایک قسم کا مزا سا آنے لگا۔ کہ ذمہ داری کچھ نہیں کام دھندا کوئی نہیں۔ کھانے پینے کی بےفکری۔ گرد و پیش کے دیہات میں پُرسکون سیر و گردش۔ غرض من بھاتا کھانا اور جب تک جی چاہے سونا نتیجہ ظاہر ہے کہ غیاث کی صحت بہت اچھی ہوگئی اور اسکے کمزور پھیپھڑے چند ہی روز میں خاصے مضبوط اور تندرست ہوگئے۔

ایکدن شام کے وقت ایسا ہوا کہ غیاث مکان کے ایک بڑے کمرے میں بیٹھا تھا۔ جہاں صاحب خانہ کے خاندان کی تصاویر دیواروں پر آویزاں تھیں۔ وہیں پر ایک مولوی نما بزرگ اور ایک معمر خاتون بھی تشریف رکھتی تھیں۔ اور اسی مکان کے ایک اور حصہ میں سولہ سترہ افراد کچھ گپ شپ میں مشغول اور کچھ تاش وغیرہ کھیلنے میں

معروف تھے۔ غیاث نے سیر ہو کر کھانا کھایا اور اب اُونگھ رہا تھا کہ اب اسکے سوا اور کام ہی کیا تھا۔ اسکی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ گئی تھی کہ یہ لوگ کیوں انہی پرانے رسوم اور مشاغل کے پابند ہیں۔ اسلئے کہ یہاں سکون تھا۔ سادگی تھی۔ اور یہی پرانی چیزوں کے قائم رہنے کا فلسفہ تھا۔ اسکے مقابلہ میں بمبئی کی حالت بالکل جداگانہ تھی۔ وہاں کی ہر چیز میں طوفانی کیفیت تھی۔ اور مجنونانہ سرعت۔ وہاں کے لوگ ہر چیز کی نقالی میں کامل۔ غیاث نے اسی جگہ یہ بھی محسوس کیا کہ وہ نوجوان لڑکی جو اسکے نو وارد ہونے کے زمانہ میں اسے بیوقوف اور غیر جاذب نظر آتی تھی اب جاذب نظر اور دلچسپ دکھائی دینے لگی تھی

ہاں تو جب وہ ایسے خیالات میں اُونگھ سا رہا تھا۔ دفعتہً اسکے کانوں میں چند خاص الفاظ ایسے پڑے کہ جن کے سنتے ہی وہ ہمہ تن توجہ ہو گیا۔ اس نے سنا کہ ایک معمر خاتون اسی علاقہ کے ایک شریف اور امیر ترین خاندان کے سربراہ سے کہہ رہی تھی۔

"کیا آپ کل "رفیعہ بیگم" سے ملنے نہیں گئے تھے؟"

اس شخص نے جواب دیا کہ "میں آج صبح گیا تو دیکھا کہ وہ ایسی بیمار اور اتنی نحیف تھیں کہ میں انہیں یہاں ہونے والی کل کی ضیافت میں شریک ہونے پر مجبور نہ کر سکا"

بوڑھی خاتون نے حیرت زدہ ہو کر کسی قدر چلا کر کہا کہ:۔

"کیا شمسیہ بیگم کے ساتھ؟"

بوڑھے امیر نے سکون کے ساتھ جواب دیا کہ:۔

"ہاں میری بیوی کے ساتھ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ رفیعہ بیگم دور ہی سے سہی مگر ہے تو خاندان "نواب بلند نظر" کی ایک فرد۔ اور یہ خاندان ابتک عزت و شہرت کے لحاظ سے عام طور پر معزز شمار ہوتا ہے اور یوں بھی میری بیوی کو رفیعہ بیگم سے محبت ہے اسلئے بھی کہ وہ غریب سب سے الگ تھلگ رہتی ہے"

اتنا کہہ کر بوڑھے نواب نے کسی قدر ضدی پن سے ارد گرد دیکھا۔ کہ گویا چونکانے رفیعہ کا حالت و شان کا صحیح اندازہ کر لیا ہے۔ دوسرے اسکی پیروی کریں۔ لیکن تمام عورتیں جو وہاں موجود تھیں ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھنے لگیں اور کمرے بھر میں سکوت چھا گیا۔

غیاث نے اپنی قریب بیٹھی ہوئی خاتون سے دریافت کیا کہ کیا رفیعہ بیگم وہی خاتون تو نہیں جنکا نام نقدیر یار جنگ بہادر کے قصہ میں بہت مشہور ہو چکا ہے۔

"جی ہاں!" اس خاتون نے جواب دیا "نواب نقدیر یار جنگ بہادر" سے شادی کے بعد سے بیگم یہیں رہنے لگی ہیں۔ مگر ایسے کہ ہر شخص نے ان سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ چونکہ بیگم خود بھی مغرور ہیں۔ اسلئے اب اگر کوئی شخص ان سے ملنا بھی چاہتا ہے تو وہ ملنے سے انکار کر دیتی ہیں ۔۔۔۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم لوگوں کا اعتقاد ہے کہ کسی شخص کو ایسی عورت سے نہیں ملنا چاہیئے جو اپنے خاوند سے الگ رہتی ہو۔ اور یہ بھی تو کھلی ہوئی بات ہے کہ غلطی بیگم ہی کی ہے۔ مگر وہ کسی کی سنتی کب ہیں؟ ۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔ حالانکہ خاوند ہی بیوی کیلئے سب سے مرغوب متاع ہوتا ہے، کم از کم ہم تو یہی مانتے ہیں ۔۔۔۔۔"

غیاث بولنے والی خاتون کی ان باتوں کی طرف متوجہ نہ تھا۔ کیونکہ وہ تمام عالم خیال میں اسی عورت کے متعلق سوچ رہا تھا۔ کہ وہ کیسی عورت ہوگی جسنے علاقے کے مرکزی شہر میں ہنگامہ برپا کر دیا تھا اس میں کیا شک ہے کہ وہ خوبصورت ہوگی۔ اور کم سن بھی۔ اور اگر کم سنی کی حدود سے متجاوز بھی ہوگی تو بھی نسبتاً جاذب نظر ضرور ہوگی۔ چونکہ وہ اچھے اور خوشحال خاندان کی فرد تھی اسلئے معاملہ جلدی دب دبا گیا۔ یہ بات اگر کچھ تھی بھی تو ایسی نہیں جسکی بنا پر کسی کو آوارگی کا جامہ پہنایا جا سکے۔ اور اگر اسکی بھول ہو تو بس یہی تا کہ اس نے مثلاً ایک کوچوان یا دربان سے جس نے نواب کا جامہ پہنا ہوا تھا۔ شادی کر لی تھی۔

نوجوان غیاث کے دل میں استعجاب کیساتھ ساتھ رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اس خاتون سے ملاقات کیجئے۔ وہ جانتا تھا کہ ایسا ہونا کچھ آسان نہیں کیونکہ اس راستہ میں جو رکاوٹیں تھیں۔ وہ ان کو دور نہ کر سکتا تھا۔ لیکن وہ اتنا ضرور محسوس کرتا تھا کہ بہر حال وہ ایک عورت ہے۔ کوئی بے جان شئے نہیں۔ رسوم قدیم کی پرستار اور قیدی ہونے کے ساتھ سطحی خیالات کی پابند وہ عورتیں ہیں۔ جو اسی کمرہ میں موجود ہیں۔ ورنہ رفیعہ بیگم میں زندگی ہوگی۔ وہ برف کی سل اور فولاد کا ٹکڑا نہ ہوگی ——

اب اس نے عالم خیال میں اسکی تصویر کشی شروع کی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جس میں وہ غیاث کے رومان میں برابر کا حصہ لے رہی تھی ۔۔۔۔۔

انہی خیالات میں غیاث کچھ کھویا سا گیا اور اپنی میزبان خاتون کے سوالات کے جوابات بے تکے پن سے کبھی ہاں کبھی نہیں کی صورت میں دینے لگا وہ سوچ رہا تھا کہ

سے ملاقات کا کونسا بہانہ یا عذر پیدا کیا جائے۔ اگرچہ اسے اس وقت تو کوئی راستہ نہ ملا تھا۔ مگر اس نے سنا تھا کہ بیگم بذلہ سنج ہونیکے ساتھ رسوم کی چنداں پابند بھی نہیں۔ بس اسی بات میں اسے اپنی مطلب براری کی صورت نظر آئی لیکن، دوسری صبح کو جب غیاث ٹہلتا ہوا، خاتون۔ محصونہ کے بنگلے کیطرف جا نکلا تو کھڑکیوں بنگلے کی سامنے کی کھڑکیوں کی طرف جنکی جھلملیاں بند تھیں، دیکھتا ہوا ادہر سے اُدہر اور اُدہر سے اِدہر پھرتا۔ تاکہ شاید شاہد مقصود کی ایک ہی جھلک نظر آجائے۔

وہ کئی دن تک ہر صبح یہی کرتا رہا۔ مگر بے سود۔

کیونکہ اس خاتون نے ایکبار جذبات کا شکار ہوکر اپنے آپ کو انسانی رسائی سے دُور پہونچا دیا تھا۔ کہ کسی گریز پائی اور ناآمیزی نے بھی ہمارے نوجوان غیاث کے سمندِ خیالات واحساسات پر ایک اور تازیانہ کا کام کیا تھا۔ وہ جوان تھا، اور جوان اُمیدوں سے شاداب سینہ رکھتا تھا۔ اس نے بھی طے کر لیا تھا کہ حالات خواہ کیسے ہی کیوں نہ پیش آئیں چاہے قسمت ہی سے جنگ کیوں نہ کرنا پڑے۔ وہ رفیعہ کے خیال سے دست بردار نہ ہوگا۔

مگر اب سوال یہ تھا کہ کیا اسے خط لکھا جائے۔ لیکن جو شخص کسی عورت کو نہ جانتا ہو نہ اس نے اسے دیکھا ہو۔ وہ اس کے متعلق کیا کہہ سکتا ہے۔ پھر یہ خیال بھی اسکے لئے ناقابل برداشت تھا کہ وہ خط لکھنے کو تو لکھ دے لیکن اگر بیگم کی طرف سے جواب میں خاموشی مطلق رہی تو! شباب کی خودبینی نے اسے دکھایا کہ گویا اس نے خط لکھا۔ یہ جوش و ارمان سے لکھا ہوا خط بیگم کے ہاتھوں آگ کے شعلوں کی نذر ہو گیا۔ جیسا کہ لکڑی کا کوئی ٹکڑا یا ردی کاغذ کا ایک ٹکڑا آگ میں جھونکا جاتا ہے۔

اسی سوچ بچار اور متواتر کئی گھنٹوں کی دماغ پاشی کے بعد آخر غیاث کو خیال آیا کہ پریوں کی فرضی کہانیوں سے انسان کی روزمرہ کی زندگی چنداں مختلف نہیں ہوتی۔ کہا کیا ہے کہ قسمت بہادروں اور جی داروں ہی کا ساتھ دیا کرتی ہے۔ ایک جانباز کیلئے اسی کی ضرورت ہے کہ وہ کسی شاہزادی کی خوابگاہ ناز تک رسائی حاصل کرے۔ پھر عورت خواہ شہزادی ہو یا پری۔ تو اسی کی ہوتی ہے جو اس تک رسائی پانیکے راستہ سے واقف ہو۔

اِدہر اس کا تو یہ حال تھا اُدہر رفیعہ بیگم اسی عالم تنہائی میں، اپنی زندگی کے دن بسر کر رہی تھی، اور اسکو ان حالات اور سازشوں کا کچھ علم نہ تھا جو غیاث کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے جسکی سربازی اور رومان پسندی میں رفیعہ کی سرگذشت اور دوسری عورتوں کی بدسلوکیوں نے خاص ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ اُس نے تو رفیعہ کو ایک دیوی کا درجہ دے رکھا تھا۔ اب جس قدر مشکلات زیادہ اسکے راستہ میں آتی جاتی تھیں۔ اسی قدر اس کا جوش طلب وشوق ترقی پذیر تھا۔ پس ایکدن غیاث اپنے جذبۂ محبت کے کمال پر بھروسہ کرتے ہوئے جو عالم تحریر سے بے نیاز ہے عورت ذات کے متعلق تنوع پسندی کے قدرتی جذبہ کے ماتحت۔ نواب شمس الدولہ کے ہاں پہونچا اور ان سے کہا ہوا کہ "مجھے رفیعہ بیگم کو ایک نہایت اہم اور نازک پیغام پہونچانا ہے۔ چونکہ میں اُن سے واقف نہیں اسلئے ممکن ہے کہ وہ مجھ سے ملنے سے انکار کر دیں لہٰذا یہی صورت ہے کہ کوئی دوسرا شخص میرا تعارف کرا دے............ نادیدہ محبوب کی محبت نے غیاث کو بڑا ہوشیار بنا دیا تھا۔ اس لئے اس نے بوڑھے امیر شمس الدولہ کی مدح وستائش کے پل باندھنا شروع کر دئے اور آپکی قابلیت کے گیت گانا شروع کئے جنکی علاقہ بھر میں دھوم تھی۔ خصوصاً آپکے شکاری کتوں اور گھوڑوں اور تاکستانوں کی بڑی ہی تعریف کی اور باتیں غیاث نے کچھ ایسے انداز میں کیں کہ بوڑھے نواب صاحب کو ایک لحہ کیلئے بھی یہ گمان نہیں ہوا کہ غیاث کسی قسم کی مطلب براری کے لئے تملق سے کام لے رہا ہے یا رفیعہ بیگم سے ملنے میں اس کا کوئی خاص مقصد ہے بہرحال بوڑھے امیر کو تجسس تھا نہ اسکے خیال میں رفیعہ بیگم میں کوئی ایسی بات تھی جسکی وجہ سے اسکی ذات سے کسی شخص کو دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اس لئے وہ سیدھے رفیعہ بیگم سے ملنے تشریف لے گئے۔ اور جاتے ہی نوجوان امیرزادہ غیاث الدولہ کی ملاقات کیلئے راستہ تیار کر دیا۔

پہلے پہل تو رفیعہ بیگم نے چاہا کہ اس نوجوان سے ملنے سے انکار کر دے۔ کیونکہ وہ کبھی "نوجوان" سے ملتی ہوئی گھبراتی تھی۔ اگرچہ اسکی معاشرتی اور تمدنی حالت کتنی ہی عمدہ اور بلند تھی۔ کیونکہ آجکل جو مرد اس سے ملتے تھے۔ وہ ایک زہر آلود اور تمسخر آمیز احترام کی روش لئے ہوئے ہوتے تھے۔ اور خیال کرتے تھے کہ بیگم سے نارسا توقعات وابستہ کیجا سکتی تھیں۔ اسلئے کہ گویا وہ ایک عام جنس ہو کر رہ گئی تھی۔ حالانکہ وہ اپنے آپ کو اس سے بلند سمجھتی تھی کہ کوئی اسکی یوں ہتک کرنے کی جرأت کرتا۔ اور اسکے مقابلہ میں نازجوئی کا نسوانی جذبہ بھی تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آخر وہ کونسا پیغام ہے جو غیاث اسے پہونچانا چاہتا تھا اور اس پیغام کا اسکی ذات سے کیا تعلق ہے۔

اُدہر بوڑھے نواب صاحب خود بڑے معمہ بن گئے تھے اُنکے خیال میں بیگم غیاث کی ملاقات کی غایت سے آگاہ تھی۔ فرمانے لگے "کیوں نہیں۔ یہ کہنے کی مجھے مشکل ہی سے ضرورت پڑیگی۔ کہ یہ معاملہ ایسا نازک ہے ——— ۔ ——— خیر ——— میں اسکے متعلق زیادہ نہیں کہونگا"۔

بوڑھے نواب صاحب کے ان الفاظ سے بچاری بیگم اور حیران وپریشان ہو گئی۔ نہیں چاہتی تھی کہ اس معاملہ کی تہ تک پہونچنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ بیگم کے ذاتی افسانے کیطرف ادنیٰ سے ادنیٰ اور ہلکے سے ہلکا اشارہ بھی اسکے۔ لئے باعث رنج تھا لہٰذا اس نے نواب صاحب سے کسی قدر غصہ محسوس کرتے ہوئے غیاث سے ملنے کا اقرار کر لیا۔

واقعہ یہ ہے کہ غیاث اپنے اندازوں میں حق بجانب تھا اس تمام رازداری نے خاتون موصوفہ پر کسی نے انا نامہ شوق سے کہیں زیادہ گہرا اثر پیدا کیا غیاث کی خوشی کا کیا اندازہ ہو سکتا تھا۔ جب اسکو معلوم ہوا کہ اسے باریابی کی اجازت مل گئی۔ مگر خوشی تو رہی ایکطرف، اس نے اپنے آپ کو یہی تو ایک قید میں ڈال لیا تھا۔ وہ اس بات کے سوچنے کی جرأت بھی نہ کر سکتا تھا کہ جب اُسکے خود ساختہ راز کا بھید کھلیگا۔ تو رفیعہ بیگم کے غصہ سے کیونکر محفوظ رہ سکیگا۔ تاہم اس نے سوچا کہ خیر ہوا کرے۔ ایکدفعہ مجھے بیگم سے ملاقات تو نصیب ہو جائیگی۔ باقی اور جو کچھ ہونا ہے وہ خود بخود ہو رہیگا۔ اگر قسمت اچھی ہے تو سب ٹھیک ہو جائیگا۔ ملاقات کو جانے سے قبل اس نے اپنا بہترین لباس غیر معمولی توجہ اور احتیاط سے زیب تن کیا۔ اس کا اعتقاد تھا کہ اس بارے میں ادنیٰ ترین بے احتیاطی مثلاً نکٹائی کی ادنیٰ سی سلوٹ یا کسی بٹن کا ڈھیلا یا کھلا رہنا اسکی قسمت کا فیصلہ کر دیگا .... ہاں اس بات کو تو وہ بھول ہی گیا تھا کہ وہ نوجوان اور خوبصورت بھی ہے۔ اور یہ وہ صفات ہیں جو اپنی سفارش آپ ہوا کرتی ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ اس خاتون پر اس ملاقات کا اچھا اثر پڑے۔ مگر نا تجربہ کاری کا بُرا ہو اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ خواہ حالات کیسے ہی ہوں پہلی ملاقات کے پانچ ہی منٹ میں کوئی شخص اپنے دل کا حال کسی سے نہیں کہہ دیا کرتا۔ بلکہ کچھ نہ کچھ آئندہ مواقع کیلئے بھی اٹھا رکھتا ہے۔ بہرحال زندگی کی مثال شطرنج کی سی ہو اور محبوب کی مثال اس انعام کی سی جسے جیتنا ہی چاہیئے۔ اگر جیت لیا جائے تو ہوشیاری سے اسے قبضہ میں بھی رکھنا چاہیئے۔

غیاث حاضر جواب، بذلہ سنج، نرم دل، پرجوش اور ایثار پیشہ نوجوان تھا۔ اسکی شخصیت بھی اپنی مثال آپ ہی تھی جسکی وجہ سے اسکے معمولی لفظوں اور نیم نگاہیوں کو بھی خاص اہمیت حاصل ہو جاتی تھی۔ وہ صاف گو سونے کی طرح کھرا رومانی طبیعت کا بھرپور نمونہ تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود جب وہ اپنی تمناؤں کے بر آنے کی دہلیز پر کھڑا تھا خوف و ہراس کے باعث نیم غشی کا سا عالم محسوس کر رہا تھا۔

پس اب جب کہ وہ رفیعہ بیگم کے باغ کی روشوں پر سے ہوتے ہوئے محل کی ڈیوڑھی پر پہونچا تو اسکی یہی حالت تھی۔ یہانتک تو اسے کامیابی ہوئی کہ اسکی تدبیر کارگر ہوئی .... لیکن سوال یہ تھا کہ آگے کیا ہونے والا تھا ....؟ ملاقات کے کمرہ کا دروازہ کھلا اور خادم نے اسکے آنے کی اطلاع کی "جناب نواب غیاث الملک غیاث الدولہ بہادر"۔

غیاث آہستگی اور سکون کے ساتھ اندر داخل ہوا کہ یہ بھی ایک بڑا مشکل کام تھا کیونکہ وہ کمرہ جس میں بیس عورتیں ہونا چاہیئے تھیں۔ وہاں صرف ایک ہی عورت موجود تھی ... وہ بھی ایک صوفے پر بڑے ہی بے ساختہ پن مگر پُر وقار انداز سے بیٹھی تھی۔ یہی رفیعہ بیگم تھی۔ اس نے شاندار مگر ایک قسم کا سیاہ ماتمی لباس پہن رکھا تھا۔ جونہی کہ اس نے غیاث کو دیکھا وہ سامنے رکھی ہوئی چھوٹی سی گول میز پر، وہ کتاب جو پڑھ رہی تھی، رکھنے کیلئے کسی قدر مڑی، پھر اٹھی، اور اس نے ہمارے نوجوان غیاث کے سلام کا جواب گردن کے ہلکے سے خم کیساتھ دیا پھر اس نے اپنے نازک خوبصورت سفید ہاتھ کے ساتھ جس میں کوئی انگوٹھی نہ تھی، سامنے پڑی ہوئی کرسی کیطرف اشارہ کر کے کہا "تشریف رکھیئے" جب وہ بیٹھ گیا تو رفیعہ بیگم نے ایک مستبصرانہ نگاہ سے اسے دیکھا۔

غیاث اول تو مرعوب ہو جانیکے باعث بول ہی نہ سکا۔ وہ بیگم کو اس طرح دیکھ رہا تھا کہ گویا اس پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ کیونکہ اسکی ہر ادا اور ہر حرکت وقار اور عزلت نشینی کا کچھ ایسا مرکب تھی۔ جو اسے غیاث کو اس طرح مسحور کرتی چلی جاتی تھی کہ جسکے بیان سے لفظ عاجز ہیں۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر آتشدان کیطرف چلی کہ اسمیں کچھ ایندھن ڈالدے۔ اسکی رفتار نرم تھی مگر لچکدار جسوقت وہ آگ میں ایندھن ڈال رہی تھی، اسکے سفید مرمریں ہاتھ کا ہلنا۔ اور آگ کی روشنی کا اسپر پڑنا ایسا نظر آتا تھا کہ گویا بجلی کوند رہی ہے، ان سب باتوں نے ملکر غیاث پر یہ اثر کیا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس کا سانس رک رہا تھا۔ اللہ اللہ یہ عورت دوسری عورتوں سے کس قدر مختلف ہو .... ہائے یہ سامنے کیا آئی بجلی کے منظر سامنے آگئے .... کمرے میں ایک اعلیٰ قسم کا ایرانی قالین بچھا تھا۔ دیہاتی و قصباتی اُمرا کی اعلیٰ سوسائٹی کے آداب ملاقات میں تصنع او تکلف ہوتا ہے۔۔ ہے بمبئی کے خاص خاندانی لوگ اُنکے اخلاق و آداب میں سادگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے، اس حد تک کہ سچ انہی کو کہنا چاہیئے، یہ کمرہ کتابوں اور پھولوں سے بھرا ہوا تھا اور آرائش کی چیزیں اپنی اپنی جگہ قرینہ سے سجی ہوئی تھیں۔ غیاث کی نگاہ کمرے میں گھوم پھر کر اسی پر پڑتی تھی۔

بیگم حسین تھی اس کا رنگ سفید اور جلد نازک اور نرم تھی۔ اسکی آنکھیں شربتی اس کا انداز غیر معمولی، مگر کسی قدر پُرجوش اور اپنے اندر ضدی پن لئے ہوئے تھا وہ ایسی معلوم ہوتی تھی کہ گویا اپنی حفاظت کیلئے کافی مضبوط اور توانا ہے اور وہ نہ صرف اپنے لئے بلکہ دوسروں کے بچاؤ کیلئے بھی اپنے اندر کافی قوت رکھتی ہو۔ اسی کے ساتھ نرم دل تھی، جہاں اسکے دل کا معاملہ ہے وہ مطیع اور فرمانبردار ہے اسکے ماتھے کی غیر محسوس سی شکنوں سے درد و کرب کی تلخیوں کے آثار ظاہر تھے ہمارا نوجوان اس عجیب و غریب عورت کے ایسے عظیم الشان مکان میں تنہائی کے سبب ہی سے مرعوب ہو گیا۔

رفیعہ بیگم مسکرائی۔ مگر اپنے کو سے دبے ہوئے۔ گو اسکی زندگی کا وہ بڑا تغیر جس نے اسکی روشِ حیات کو کچھ سے کچھ کر دیا تھا، اسکی نظر میں معمولی سی بات تھی۔ وہ نہ

بیوی تھی، نہ ماں۔ اور اس دوسرے انسان سے بھی الگ تھلگ رہ رہی تھی جس نے اسکی محبت حاصل کرلی تھی۔ اس لئے غیاث کا خیال یہ تھا کہ اسے ان سب ناخوشگوار حالات میں اپنی قوت فہم وجودت ذہن پر بھی بھروسہ کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ موت کی متمنی تھی .... اسلئے کہ نہ وہ مسرت کو حاصل کرسکتی تھی نہ اس سے دست بردار ہوسکتی تھی۔ یہی باتیں ایک عورت کیلئے سراپا ملال ہیں۔ غیاث اس شاہانہ حسن محزون سے زبان خاموش اور دل مدلل ہوکر جہاں تھا وہیں ٹھٹھک کر رہ گیا۔

رفیعہ بیگم نے تبسم کناں یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ بڑھایا کہ "میں نے نواب شمس الدولہ سے سنا ہے کہ آپ مجھے کوئی پیغام پہونچانا چاہتے ہیں۔ کیا میں آپ سے دریافت کرسکتی ہوں کہ اس پیغام کا مفہوم کیا ہے؟ کیا وہ پیغام ...."

یہاں پہونچکر اسکی آواز تھرتھرا گئی۔ اور لفظ زبان پر آنے سے پہلے ہی فنا ہوگئے .... غیاث کو اس وقت یقین ہوا کہ اس نے بھی عورت کو خودغرضی سے دھوکا دیا ہے جو ابتک اپنی غلطی کی بنا پر تکلیف اٹھا رہی ہے۔ اس لئے اس نے رقت بھری آواز میں کہا کہ "بیگم صاحبہ میں اس کا مستحق نہ تھا کہ مجھے آپکو دیکھنے سے مسرت حاصل ہوتی کیونکہ میں نے نہایت ہی نامناسب طریقہ سے آپ کو دھوکہ دیا ہے۔ اگرچہ میرا ارادہ خواہ کتنا ہی مخلصانہ کیوں نہ ہو پھر بھی اسکے یہ معنی نہیں کہ میں ان طریقوں کو سراہوں جن سے کام لیکر میں آپکی خدمت میں بار پا سکا۔ اب مجھے صاف طور پر نظر آرہا ہے ...."

بیگم نے اس پر ایک ایسی نگاہ جو سرزنش محض تھی ڈالی۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور قریب رکھی ہوئی گھنٹی کو چھوا جس کی آواز سنتے ہی خادم اندر آیا۔

"یعسوب! ان صاحب کو باہر پہونچا دو۔" یہ کہکر اس نے غیاث کے سلام کے جواب میں سرد مہرانہ انداز میں سر کو حرکت دی لیکن غیاث اپنی جگہ سے نہیں ہٹا۔ خفت کے غصہ اور ناامیدی نے اس کا رنگ زرد کردیا تھا۔

بیگم صاحبہ نے بے صبری سے مرمریں فرش پر اپنا پاؤں مارتے ہوئے کہا "خوب!" یہ آواز سنتے ہی غیاث کا قدم باہر کیطرف بڑھنے لگا لیکن جونہی کہ وہ ہال کے قریب پہونچا تو اُسکے خیالات میں ایک عجیب قسم کا مایوسانہ تلاطم سا پیدا ہوگیا اور اس نے اپنے دلمیں کہا کہ اگر اب اور اس وقت میں اس گھر سے باہر چلا گیا تو مجھے یقین ہے کہ پھر میں کسی طرح بھی اس گھر میں بار نہ پاسکونگا ....

بہرحال ایک عورت اپنی جگہ پر اس سے کم کچھ نہیں کرسکتی .... اتنا تو اسے کرنا ہی چاہیئے تھا .... شاید اب اسے بھی افسوس محسوس ہو رہا ہو ...."

غیاث نے دفعتاً خادم سے کہا کہ "میں اندر ایک چیز بھول آیا ہوں۔ اسے لینے واپس اندر جاتا ہوں۔"

اس کا یہ بات کہنے کا طریقہ کچھ ایسا معصومانہ اور سیدھا سادا تھا کہ خادم کو شمہ بھر شبہ نہیں ہوا۔

غیاث الدولہ ڈرائنگ روم کے قریب پہونچا اور دبے پاؤں اندر داخل ہوا۔ بیگم صاحبہ نے یہ خیال کرکے کہ خادم واپس آیا ہے اپنی نظر اٹھائی تو دیکھا کہ نوجوان غیاث اندر کھڑا ہے .... غیاث نے نظر بھر کر بیگم صاحبہ کو دیکھا اور کسی قدر مسکرایا .... نوجوان بیگم جو اس وقت اپنی تنہا اور ناشاد زندگی کا احساس کر رہی تھی اسی کے ساتھ اس واقعہ نے طبیعت میں کسی قدر شوخی کا رنگ بھی پیدا کرکے نسوانی خودبینی نے بھی کچھ اشارہ کردیا تھا کہ ایک نوجوان اتنی مشکلات برداشت کرکے محض اسے ایک نظر دیکھ لینے کیلئے یہاں تک آیا ہے۔ تو کیا ہوا؟ .... آخر وہ بولی۔

"بہت اچھا .... آپ تشریف رکھیئے" غیاث نے تعمیل ارشاد کی جسکی آنکھوں میں مسرت کی وہ آگ روشن تھی کہ بیچاری بیگم اسکی نگاہوں سے دوچار نہ ہوسکی اور اس کا سر جھک گیا۔ اسکی نسوانیت میں یہ تاب کہاں تھی کہ مردانہ راز پرستیدگی نگاہوں سے بیگانگی کو جاری رکھ سکتی

غیاث الدولہ "کاش آپ کو صرف اتنا معلوم ہوتا کہ میں اس وقت کتنا خوش ہوں۔" وہ اپنا ابھی فقرہ پورا بھی نہ کرسکا تھا کہ بیگم صاحبہ نے اپنی انگلی ہونٹوں پر خاموش رہنے کیلئے رکھی۔ اور گھنٹہ کی رسی دیکھتے ہوئے کہا "احتیاط جناب" کبھی وہ وقت بھی تھا کہ میں بغیر کسی خوف وخطر کے آپ سے مل سکتی تھی اور آپکی اس جانبازانہ مہم پر ہنس بھی سکتی تھی۔ لیکن اب میں بہت محتاط ہوں۔ آپ آج یہاں آئے کس لئے ہیں؟ کیا محض میری تنہائی پسندی پر صرف استعجاب ہی یہاں لے آیا ہے؟ نہیں اس وضع کے تو آپ معلوم نہیں ہوتے .... تو کیا آپ اس عورت سے جسے آپ نہیں جانتے۔ بشدت محبت کرتے ہیں؟ یا کوئی جذبہ رحم آپ کے آمد کے ارادہ کے پیچھے مستور ہے؟ یا ارادہ ہتک؟ بہرحال میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ مجھے کسی قسم کی ہمدردی، یا کسی کے ترس کھانے سے زیادہ یہ پسند ہے کہ کھلم کھلا مجھ سے نفرت کیجائے کیونکہ مجھے کسی کے رحم وکرم اور محبت وہمدردی کی ضرورت نہیں۔"

"آپ نے یہاں آنے میں جو کچھ بھی رویہ اختیار کیا ہے اس کا مجھے صدمہ ہے۔ غالباً آپ اتنے کم عمر ہیں کہ اس بات کو بھی نہیں سمجھ سکتے کہ یہاں آنے میں آپنے کتنی غیر مآل اندیشی سے کام لیا ہے۔ لیکن میں آپ کو معاف کرتی ہوں اور اس معافی میں مطلق تلخی کا شائبہ نہیں۔ ہاں خدا کے واسطے پھر یہاں نہ آئیے ....

کیا آپ اس کا وعدہ مجھ سے نہ کریںگے ۔میں آپ سے صرف ایک درخواست کر رہی ہوں ۔ حالانکہ میں آپ کو حکم بھی دے سکتی ہوں .... میں تنہا رہتی ہوں اور اگر آپ پھر یہاں آئینگے تو خدا جانے لوگ کیا سے کیا بات کا بتنگڑ بنا ڈالیں گے .... اس نزاکت حالات کو تو آپ یقیناً خوب سمجھتے ہونگے"

غیاث الدولہ :۔"میں سمجھتا ہوں .... آپ باور کیجئے کہ میں یقیناً ان امور کو سمجھتا ہوں .... لیکن صاف بات یہ ہے کہ میرے دل میں ایک پُرزور جذبہ تھا کہ مجھے آپ سے ملنا چاہیئے .... آپ نہیں جانتیں .... " اب وہ اپنی داستان سنانے لگا ۔ کہ کب اور کس طرح اسکے دلمیں بیگم صاحبہ سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی اس نے اپنی تنہائی کی سیروں میں بیگم صاحبہ کے گھر کے گرد متواتر چکر لگانے کی کیفیت بیان کی ۔ اس نے اپنی یہ داستان کچھ اس طرح کہی کہ جس سے رفیعہ بیگم کا پندار نسوانی متاثر ہوئے بغیر نہ رہا ۔ ایک عالم بے خبری میں وہ یہ بھی بتا گیا کہ وہ خود کتنا دلکش شخص ہے جس میں مردانگی اور جذبہ رومان عجیب طور پر سموئے گئے ہیں ۔

رفیعہ بیگم کو ایک زمانہ دراز کے بعد ایک ایسے دلچسپ شخص سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا اس لئے یہ قدرتی امر تھا کہ اسکے خیالات میں رجعت پیدا ہوئی ۔ اور پھر ایسے شخص کی ملاقات جیسا کہ غیاث تھا ۔ اس کو غنیمت معلوم ہوئی کیونکہ وہ سوسائٹی کا بگڑا ہوا نہ تھا ، اسلئے دُنیا اور اسکی سیاہ کاریوں کی وسعتوں کے باوصف وہ اس قابل ہو سکیگا کہ محبت کو ایک مقدس شے بنا دے ۔ اگر ایسا ہو تو یہ کیسا دلکش منظر ہوگا .... اس نے دلمیں خیال کیا کہ اب وہ پھر کبھی اسے نہیں دیکھ سکیگی ۔ چنانچہ اس نے غیاث سے خودداری مگر آزادانہ پُرمسرت کسی قدر بے تکلفی کی گفتگو شروع کردی ۔ فی الواقع وہ اس قدر بذلہ سنج اور دلکش تھی کہ بے اختیار غیاث کی زبان سے نکل گیا کہ "بیگم صاحبہ یہ کیسے ممکن تھا کہ کوئی شخص آپ کو بھلا سکے ۔

نوجوان بیگم نے اس کا کوئی جواب نہ دیا ۔ اس پر ایک لحظہ تک تو غیاث کو ایسا محسوس ہوا کہ گویا زمین اُسکے پیروں تلے سے نکل گئی کہ اُسنے بھُولی ہوئی بات بیگم کو یاد دلا کر اسکے دل کو مجروح کردیا ۔ لیکن واقعہ ہوا قطعاً اسکے برخلاف ۔ اس فقرہ نے غیاث کے حق میں ایسی سفارش کا کام کیا جو مہینوں کی ملاقات کے بعد بھی کسی کو کم میسر ہوا کرتی ہے ۔ غیاث نے اپنے ہی خیال کے زیر اثر بے خود ہوکر کہا کہ "بیگم صاحبہ خدا کیلئے میری ناسمجھی یا غیرارادی بے اخلاقی کی وجہ سے معتوب نہ ٹھیرایئے اور مجھے اپنی حضوری سے محروم نہ کیجئے "

بیگم مُسکرائی وہ حیران ہوگیا ۔بیگم بولی "چونکہ آپ کو دیر سویر جانا ہی ہوگا اسلئے کیوں نہ آپ ابھی سے تشریف لیجائیں ۔ اسلئے کہ یہ تو بڑی ہی بدقسمتی ہوگی کہ آپ میرے خیال کو اپنے دلمیں جگہ دیں "

اس نے جواب دیا "انتظار کی کیا ضرورت ہے؟ بدقسمتی تو آہی پہونچی" ۔بیگم نے نہایت سنجیدگی سے کہا "یہ مت کہیئے ۔ اگر میری پوزیشن اس سے مختلف ہوتی تو میں بڑی خوشی سے آپ کی پذیرائی کرتی لیکن موجودہ حالات میں صاف کہنا چاہتی ہوں کہ میں دوبارہ ہرگز آپ سے ملاقات کرنا نہیں چاہتی .... میں نے اپنی زندگی میں صرف ایک غلطی کی ہے ۔ اگر میں احتیاط سے کام لوں تو اپنی کھوئی ہوئی زندگی دوبارہ پاسکتی ہوں ۔ اب بھی کسی قدر کھویا ہوا رتبہ حاصل کرچکی ہوں ۔ ہوسکتا ہے کہ میری پوزیشن پھر محفوظ ہوجائے ۔ اس مقصد کے حاصل کرنیکے لئے ایک ہی شرط ہے کہ مجھے کامل احتیاط سے کام لینا چاہیئے ۔ اور اپنے آپ کو امکانی خطرے سے بچانا چاہیئے ۔ لوگوں کے سینہ تو پھٹے جاتے ہیں ۔ ان کو ذرا موقع ملا اور اُنہوں نے الاپنا شروع کیا ۔ کہ ایکبار کا چور سدا کا چور ، واقعہ بھی یونہی ہے ۔ میں نے تو معاملہ کو ہلکا کر دکھایا ہے ، ورنہ ہوگا یہ کہ میں خود اپنی نگاہوں سے گرجاؤنگی ، حالانکہ میری پہلی بھول کے موقع پر لوگ مجھے ایک "شریف عورت" باور کرنے پر تیار تھے ۔ اگرچہ میں مستحق تھی کہ مجھے بُرا خیال کیا جائے ۔ میں نے "محبت" کے کارن "شادی" کے قوانین کو ٹھکرا دیا لیکن کبھی نہیں ہوسکتا کہ میں عظمت رفتہ حاصل کرنیکے لئے ایسی شادی پر آمادہ ہو جاؤں جس میں محبت کا دخل نہ ہو ۔ ہاں اگر میں ایک بچہ کی ماں ہوتی ۔ تو وہ کچھ نہ ہوتا جو ہوگیا لیکن کون جانتا ہے؟ بہرحال میں نے مسرت کی تلاش کی لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ فطرت ہی کا منشا ہے کہ میں ایسا کروں اب آپ ہی بتایئے کہ کیا یہ بات بھی کوئی ایسا بڑا جرم تھی ، خصوصاً اس شخص کیلئے جو نوخیز اور نوجوان بھی ہو ۔ اور خوبصورت بھی .... میں چاہتی تھی کہ مجھ سے محبت کی جائے ، اور مجھ سے محبت کی بھی گئی ۔ لیکن طرفۃ العین کیلئے" .... وہ ایک لحہ کیلئے ٹھیر گئی .... اور پھر ایک آہ سرد کیساتھ گویا ہوئی "میرا خیال تھا کہ ایک مرد ہرگز کسی عورت سے اس حال میں بے وفائی نہیں کریگا جس میں میں تھی لیکن میں خیال کرتی ہوں ۔ کہ محبت نے مجھی کو اندھا بنا رکھا تھا یا میری توقعات بڑھی ہوئی تھیں .... میں فیصلہ نہیں کرسکتی .... لیکن میری خودداری نے اس بات کی اجازت نہیں دی کہ میں اس سے محبت کی بھیک مانگتی ۔ وہ جانا چاہتا تھا ۔ میں نے بھی اس کا پیچھا نہیں کیا ۔ میں دُنیا کی ریت رسم سے ناواقف ہوں میں نہیں جانتی تھی کہ ایک مرد کو کیسے قابو میں رکھا جاسکتا تھا اور زندگی کا قاعدہ ہے کہ ناتجربہ کاری کی بھی وہی سزا دیا کرتی ہے ۔ جو کسی جانے بوجھے گناہ کی سزا ہوا کرتی ہے ۔ میں اسکو رشک وحسد سے جلاسکتی تھی ۔ لیکن میں اسکی باندی بنی رہی ۔ میں اسکو پوجا کراسکتی تھی لیکن اسکی بجائے میں اسکی پجارن بنی رہی کہ میں کیسے ان دھڑکوں کو

برداشت کرسکی ۔ چونکہ میں بہت زیادہ دُکھ اٹھا چکی ہوں ۔ اسلئے میں ڈرتی ہوں کہ پھر مجھے کسی ایسی ہی بلا سے دوچار نہ ہونا پڑے ۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ دودھ کا جلا چھاچھ کو پھونک پھونک کر پیتا ہے ۔ اگر کامل تین سال تک تنہا ، سب سے الگ زندگی بسر نہ کرچکی ہوتی تو مجھ میں گذشتہ صدمات کی بنا پر اتنی طاقت بھی نہ ہوتی کہ اپنی داستان آپ کو سنا سکتی ۔"

جس وقت یہ گفتگو ہو رہی تھی ۔ وہ اپنی ملاقات کے چھوٹے سے دلکش کمرے میں بیٹھی تھی جس کی وضع کسی ایسے کمرہ کی تھی ، جو کسی پیر کے اپنے مریدوں کو توجہ دینے کیلئے خاص طور پر بنا لیا گیا ہو ۔ لیکن یہاں کوئی مرشد موجود نہ تھا ۔ گفتگو کرتے وقت وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت نظر آتی تھی ۔ ملال و قلق نے اسکے چہرے پر ایک عجیب کے آثار پیدا کردئے تھے ، اور آنسوؤں نے طوفان کے پیچھے وہ اس طرح دب رہے تھے جیسے کنول کا خوبصورت پھول بارش کے تقاطر کے نیچے دبا ہوا ہو ۔

اس نے کہا " آپ نے دیکھا کہ میں تجربہ گذشتہ کے بنا پر اپنے لئے زندگی کا یہی طریقہ پسند کرلیا ہے کہ میں تنہا رہوں ۔ اور محبت سے محروم رہوں اور اسکے سوا میرے لئے اور کوئی چارہ کار بھی تو نہیں ۔"

غیاث نے محسوس کیا کہ کاش وہ اسکے قدموں پر گر جاتا ، اور اسکی پرستاری کرتا ، اور مردانہ ہمدردیوں کے بہترین جذبات واحساسات نچھاور کرڈالتا ۔ اس نے لرزاں آواز میں کہا " بیگم صاحبہ آپنے جو کچھ بیان کیا ، اسے سن کر میرا دل چاہتا ہے کہ آپ سے صاف صاف کہدوں کہ میں کس طرح آپ کے ستائش کی حسیات سے اپنے دل کو معمور پاتا ہوں اور آپکے غم فراواں میں آپ سے ہمدردی رکھتا ہوں ۔ اگر میں یہ بات عملاً ثابت کرسکتا اور اپنی تمام عمر اسی کوشش میں صرف کرڈالتا کہ آپکو تسلی وتشفی دیکوں اور کوشش کرتا کہ آپ اس حادثہ کو دل سے بھلادیں ۔ تو میں ...... "

رفیعہ بیگم نے کہا " بس ! بس !! ہم دونو کہاں سے کہاں پہنچ گئے ۔ میں نے تو اپنی سرگذشت آپکو اسلئے سنائی تھی تاکہ میں آپ اپنے ناگزیر فیصلہ کی تلخی کو کسی قدر کم کردوں ۔ یاد رکھئے ۔ بہت زیادہ بہتر و مناسب یہ ہے کہ ہم دونوں آیندہ مرتے دم تک اجنبی محض ہی رہیں ۔ ورنہ اب نہیں تو آیندہ چلکر آپ بھی سمجھ لیں گے کہ ایسے رشتے قائم کرنا ۔ جو بہرحال درد سے جلانے والے ہوں ۔ کیا رکھتا ہے ۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑی ہوئی یہ ظاہر کرنیکے لئے کہ بس ملاقات ختم ہوچکی ، غیاث الدولہ کو بھی مجبوراً ساتھ ہی اُٹھ کھڑا ہونا پڑا ۔

اب غیاث الدولہ ، ایسے دبدبے کی حالت میں سوچ رہا تھا کہ وہ بیگم سے ملنے کے بعد اس سے اتنا ہی دُور رہا جتنا کہ وہ ملنے سے پہلے تھا ۔ خیر تاہم اس نے دیکھ تو لیا ۔ بیگم اس سے کہیں زیادہ خوبصورت اور حیرت زا تھی ۔ جتنا کہ غیاث نے تصور کیا تھا ۔ ہاں وہ اسکی طبیعت کو اب تک نہیں سمجھ سکا تھا ۔ اور وہ سمجھ بھی کیسے سکتا تھا ؟ وہ ایک عورت تھی ، اور عورت بھی وہ جو ایکبار دکھ اٹھا چکی تھی اور ستم رسیدہ ہونیکے باوجود ۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ ایسی شاندار اور صاحب تجمل اور پھر نرم کیوں ہے ۔ غیاث کو اسکے قوت قلب پر بھی حیرت تھی ۔ وہ اسے فراموش نہ کرسکتا تھا ، ابتک اسکی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی اور اس کا چہرہ اسکی نگاہوں سے اوجھل نہوتا تھا ، وہ اسے پیار کرتا تھا ، اس نے محسوس کیا کہ خود اسکا بیگم کے بغیر جینا محال و ناممکن ہے ۔ اور اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ گویا وہ تو اسکی "بیوی" ہی ہوچکی ہے اور غیاث نے اسے وہ کچھ دے ہی دیا جو کچھ وہ اُسے دے سکتا تھا ۔ جوانی کیلئے تو کوئی بات بھی ناممکن نہیں ہوتی ۔ غیاث کی روح جوان اور توانا تھی ۔ اسکے جذبات جوان تھے ، اسکی روح حیات پرور تھی ۔ اور وہ ایک ایسے طلسم افسوں (عشق) کے زیر اثر تھا جو صرف جوانی ہی پر اپنا کام کیا کرتا ہے ۔ اس لئے اسکی نیند بھی غائب تھی کبھی اُمید اُسے سبز باغ دکھاتی تھی ۔ اور کبھی ناامیدی سارے دروازے بند کرکے سب چراغ گل کردکھاتی ہے ۔ یہ سب کچھ اسکی نوجوانی کا کرشمہ تھا ۔ اور واقعہ یہ ہے کہ وہ تھا بھی بہت نوعمر اور نوخیز ۔

اس نے بیگم کو بہت سے خطوط لکھے ۔ مگر انہیں بھیجنے کی بجائے ، ان کو آپ ہی ضائع کرتا ، عالی طبیعت کے لوگ تو اسے تعجب کی نظر سے دیکھیں گے ۔ آخر بہت سے خطوط ضائع کرنیکے بعد رفیعہ بیگم کو ذیل کا خط لکھا ۔

بیگم صاحبہ ! آپکی ملاقات کا مجھ پر اتنا عجیب اور گہرا اثر ہوا ہے کہ میں دوبارہ آپ کو دیکھے بغیر جی نہیں سکتا ۔ مہربانی فرماکر میرا یہ خط پڑھ لیجئے ۔ لیکن پڑھ کر یا بے پڑھے اسے ضائع نہ کیجئے ۔ میں نوجوان ہوں اور اتنا ہی جانتا ہوں کہ محبت کیوں کیجاتی ہے ۔ میں تیز فہم اور چالاک بھی نہیں ۔ اسلئے یہ بھی نہیں جانتا کہ عورت کو کیسے رجھایا اور چالاکی سے اپنا بنایا جاتا ہے ۔ میں یہ بھی نہیں سمجھتا کہ میں آپکے قابل ہوں اور میں یہ بھی باور نہیں کرتا کہ مجھ میں ان قابلیتوں کا بیسواں حصہ بھی ہے ، جن کے ذریعہ آپ کو اتنا خوش کیا جاسکتا ہے جتنا میں چاہتا ہوں کہ آپ خوش رہیں ۔ لیکن میرے لئے دنیا میں ایک ہی عورت ہے جس سے میں نے محبت کی ہے اور .... اگر میری آپ سے دوبارہ ملاقات محال یا ناممکن ہے تو مجھے بے درنگ یہاں سے چلے جانا چاہیے ۔ اسلئے کہ پھر مجھے آپکی یاد نہیں دلائی جائیگی ۔ اور یہاں سے کہیں دور جاکر بیچارہ کہیں بھی آپکی کیطرح اپنا لخت جگر کھاتا اور خون دل پیتا رہوگا ۔ اگر آپ کی محبت میری قسمت میں نہیں تو پھر کم سے کم اپنی دوستی سے تو محروم نہ کیجئے اتنی تو اجازت دیجئے کہ کبھی کبھی آپکی

خدمت میں باریاب ہوکر۔ زندگی کی چند ساعتیں اسی فردوسی ماحول میں گذار لیا کروں۔ جیسا کہ کل میری قسمت نے یاوری کی تھی۔ آپ کو خوفزدہ ہونے کی کیا بات ہے۔ آپ اس رسوائی کی سبکی ہونا گوارا نہیں کرتیں جس نے آپ سے بدسلوکی کی ہے۔ حالانکہ آپ کو اس سے نفرت کرنا اور اس پر تھوکنا چاہیئے۔ اگر میں آپ کو بھول جاؤں یا کسی دوسری عورت سے محبت کروں۔ تو اس وقت آپکی موجودہ روش بجا اور درست سمجھی جائیگی لیکن اگر اس کے مقابلہ میں یہی میری اصلی محبت اور زندگی بھر کی نسبت ہو۔ تو پھر کیا آپ کو اپنی موجودگی پر افسوس نہیں ہوگا۔ خیر اگر آپکو میری التجاؤں کے قبول کرنے میں ابھی انکار ہی ہے۔ تو بہرحال میں آپکے فیصلے کے آگے سرتسلیم خم کرونگا "

"غیاث"

خط بھیجنے کے بعد جواب کے انتظار میں کہ دیکھیئے رفیعہ بیگم کے ہاتھوں اسکی قسمت کا فیصلہ لیا ہوا ہے غیاث پر سب دہشت کی تمام گھڑیاں گذر گئیں جو ان لڑکوں کو جو ناواقف نوجوانوں پر گذرا کرتی ہیں۔ اس نے خیال کیا کہ بیگم اس کا خط پڑھ رہی ہوگی، اور ایسی محبت پر زہر خند تبسم کر رہی ہوگی جس پر اس کو اعتماد نہیں .... پھر یہ سوچکر اس نے سوچا کہ کاش اس نے خط بھیجا ہی نہ ہوتا، پھر اس نے سوچنا شروع کیا اگر کوئی بات نکل جائے وہ پڑھ کر کہتا یا اس کے خط کے غلط معنوں سے کیا کیا میرے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں .... شکوک و شبہات کے متعلق سوالات وغیرہ کے تجزیہ سے اسے قریباً پاگل بنا ڈالا تھا تو اس نے دل میں ٹھانا کہ اس خط کا خیال ہی چھوڑ دے۔ مگر یہ اسکے بس کی بات نہ تھی۔ گرچہ کے لحاظ سے وہ تیس سال ہی ہوا ... کی گذران لہو ولعب یا پرستی کی رفیقہ قدیم شراب نوشی سے غم غلط کرنے کی کوشش کرتا۔ یا اگر چالیس سال کا ہوتا تو فلسفیانہ نتائج تک ... لیکن ... چھبیس برس کا نوخیز لڑکا تھا۔ اور عشق نے اسے دیوانہ بنا رکھا تھا۔

آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوگئیں اور غیاث کو ایک سربمہر خط ملا جس پر خط طغرئی میں ریاست ... کا نام و نشان چھپا ہوا تھا۔ خط ایک نہایت باریک و لطیف کاغذ پر لکھا ہوا تھا، اور ہلکی ہلکی خوشبو میں بسا ہوا تھا۔ خط ملتے ہی غیاث اپنے کمرے میں گیا اور دروازہ بند کرکے اسکے مطالعہ میں مصروف ہوگیا۔

خط کا مضمون یہ تھا :-

" صاحب۔ میں نے نرمی سے آپ پر وہ اسباب واضح کر دیئے تھے جنکی بنا پر میں آپ سے ملنا نہیں چاہتی۔ مگر میری نرمی کی سزا یہ ہے کہ آپ مجھ سے نہایت سختی کا سلوک روا رکھتے ہیں۔ میں نے آپکی مردانگی اور سخاوت قلبی پر اعتماد کیا تھا لیکن میں دیکھتی ہوں کہ یہ میری ایک غلطی تھی۔ میں نے آپ سے صاف صاف گفتگو کی، اور اگر اس کا خیال کیا جائے تو وہ ملاقات پہلی تھی تو بہت ہی زیادہ صفائی سے کام لیا تھا لیکن کرتی کیا۔ مجھے بھی آپ سے کچھ دلچسپی ہی ہوگئی تھی۔ طبعاً میں ایک نرم خو اور ... کی انسان ہوں، لیکن زندگی کے حالات ہی ایسے ہیں کہ جنہوں نے مجھے کسی قدر تلخ و تند بنا دیا ہے۔ میری بجائے اگر کوئی اور عورت انہی حالات میں ہوتی تو آپ کے خط کو نذر آتش کر دیتی۔ مگر میں نے اسے پڑھا اور اب اس کا جواب بھی لکھ رہی ہوں۔ میں آپکے جذبات لطیف سے بہت متاثر ہوں۔ جو معلوم ہوتا ہے کہ میری وجہ سے آپ میں پیدا ہوگئے ہیں۔ لیکن میں بھی اسی انداز سے متاثر ہوکر ان کا جواب صحیح صحیح پیش کر سکنے سے بہت دور اور ارفع ہوں آپ دیکھیں گے کہ میں مخلص ہوں۔ آپ فرماتے ہیں کہ میرا آپ پر کوئی اثر ہے۔ بہت خوب میں ہی اسکو اپنے طور پر اول اور آخری طور کام میں لانا چاہتی ہوں کہ آپکی آنکھوں پر سے بے خبری کی پٹی کھول دوں۔

سنیئے عنقریب میں تیس برس کی ہو جاؤنگی۔ اور صاحب آپکی عمر اس وقت صرف ۲۵ ہی برس کی ہے۔ آپ ابھی یہ بھی نہیں جانتے کہ آپ میری عمر کی زیادتی کے بارے میں کیا محسوس کرینگے۔ آگے چلکر جب آپ کی عمر بڑی ہوگی۔ یہی قسمیں اور عہد و پیمان جو آپ بغیر مطالبہ خود بخود کر رہے ہیں۔ آپ کو بھاری معلوم ہونگی۔ میں بخوشی اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں کہ آپ آج بغیر تاسف اپنی تمام زندگی میری نذر کرنے کیلئے آمادہ ہیں۔ اور اگر ضرورت پڑی تو آپ اپنی جان بھی قربان کر دینگے۔ تاکہ خوشی و مسرت کو حاصل کیا جائے لیکن تجربہ کے چند سال آپ کو روزانہ میرے سامنے ایسی قربانیاں کرتے دیکھیں گے جن کو قبول کرتے چلے جانا میرے شرف نفس سے بعید در بعید ہوگا۔ اس قدرت اور معقولیت کا آپ سے مطالبہ کرونگی کہ آپ مجھے چھوڑ چھاڑ دیں۔ اور میں .... میں "معلقہ" ہونیکی ذلت سے دوبارہ دوچار ہونے پر موت کو ترجیح دونگی ۔

آپ دیکھتے ہیں کہ مصائب نے مجھے کس قدر معقول و مدبر اور مآل اندیش بنا دیا ہے۔ اب میں جذبات کے سیلاب میں بہہ نہیں سکتی۔ آپ مجھے مجبور کرتے ہیں کہ میں اقرار کرلوں کہ "مجھے آپ سے مطلقاً محبت نہیں"۔ ہاں میں ابداً نہیں چاہتی کہ آپ سے محبت ورزی کا گناہ کروں۔ مجھے انسانوں میں کسی "انسان" پر قطعی اعتماد نہیں اگر کچھ ہے تو محض خدا کی ذات پر۔ اب اتنی عقل مجھ میں ضرور آگئی ہے کہ انسانی طبیعت اور افتاد و روش کو اس خوبی سے پڑھ سکتی ہوں کہ میری ایسی محبت دوستی سے ابا کرتی رہوں جیسی آپ میرے لئے تجویز کرتے ہیں ۔

معاف کیجئے۔ آپ تو کچھ اپنے ہی دل کے ہاتھوں فریب خوردہ معلوم ہوتے ہیں۔ اور آپ بجائے "دل کی قوت" "دل کی کمزوری" کا سہارا لئے ہوئے ہیں اس لئے میں آپ کو حکم دیتی ہوں کہ آپ میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ اس میں آپ کا بھی بھلا ہوگا اور میرا بھی۔ آپ کا بھلا ان معنوں میں کہ میں وہ عورت نہیں جو آپکے لئے

بنائی گئی ہو۔ اگر میں آپ کی زندگی میں دخیل ہوجاؤں۔ تو تمہیں مصائب سے دوچار رہنا پڑیگا۔ رہا میرا بھلا۔ سو وہ یہ ہے کہ مجھے امن وآمان اور سکون وخوشی کی ضرورت ہے۔ آپکی یہ محبت اور سوزش عشق دیر سویر گذر جانے والی چیز ہے ؎

لمحہ دت کوئی دم ہیں ابھر جائے گی چڑھی ہے یہ آندھی گزر جائیگی!

پھر اسے یونہی کیوں نہ گذر جانے دیا جائے۔ آگے چلکر کیدن جب آپ کو زندگی کا زیادہ وسیع علم حاصل ہوگا تو آپ میرے شکر گذار ہونگے۔ اور اُسی وقت میری اس بات کی قدر وقیمت سمجھ سکیں گے جسکو اس وقت آپ میرا ایک ظالمانہ فعل قرار دے رہے ہیں۔

اسوقت نہیں، اُسوقت۔ سالہا سال کے بعد آپ میرے پاس تشریف لاسکتے ہیں۔ اور میری دوستی کا مجھسے مطالبہ کرسکتے ہیں۔ جب میں ایک بوڑھی اَدھوڑی عورت ہونگی ابھی تنہائیوں۔ اور مسلسل دعا واستغفار نے میری نفلی خواہشوں کو دھوکر مجھے پاک وصاف بنادیا ہوگا۔ اسی وقت میں اور میری دوستی آپکے لئے مفید ہوں گے۔ اور نہیں آپ پر کوئی اپنا اثر ڈال سکونگی۔ اس دوران میں مجھے تنہائی کی دولت اور سکون کی خوشی سے محروم نہ کیجئے۔ بلکہ براہ کرم مجھے بھلا دیجئے۔ یا کم از کم اپنے قریب نہیں اپنے سے کالے کوسوں دُور تصور فرمائیے"۔

غیاث نے مندرجہ بالا پڑھتے ہی قلم برداشتہ ذیل کا خط لکھا۔

"بیگم صاحبہ! اگر میں آپسے محبت کرنا چھوڑدوں۔ جیساکہ آپ یہ ظاہر چاہتی ہیں کہ میں آپ سے بیگانہ ہوجاؤں۔ تو میں بھی ان بے شمار انسانوں میں سے ایک ہونگا جو بے وفا اور گھٹیا قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ تب تو گویا میں آپکی اس روش کو صحیح ثابت کردونگا۔ جو آپ نے میرے متعلق قائم کی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو بیشک میں اسی بدقسمتی کا مستحق ہونگا جو میرے لئے تجویز کی جارہی ہے۔ نہیں میں اس بارے میں آپکا حکم نہیں مانونگا۔ اور ہاں آپ کے سامنے قسم کھاتا ہوں کہ میری آپ سے محبت ابدی محبت اور سرمدی چاہت ہوگی۔ لیجئے یہ میری زندگی ہے جو آپکی نذر ہے۔ اسے قبول کیجئے۔ لیکن اگر آپ ہی کا یہ خیال ہو کہ آپ کو بعد میں پچھتانا ہوگا۔ تو اور بات ہے"۔

...

غیاث کا خدمتگار جس وقت اس کا پیغام دیکر واپس آیا تو غیاث نے اس سے پوچھا۔

میرا رقعہ تم نے کس کو دیا؟

خود بیگم صاحبہ کو۔ حضور!

تم نے ان کو کہاں دیکھا۔

حضور! وہ اپنی گاڑی میں سوار ہورہی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے اس مکان کو جس میں رہتی تھیں چھوڑ دیا ہے"۔

اچھا تو وہ یہاں سے کسی اور جگہ چلی گئی ہیں ......

خیر یہ تو کوئی بات نہیں۔ کیونکہ اگر ضرورت پڑے تو غیاث زمین کے آخری کنارے تک انکا پیچھا کریگا ؎

جائینگے ہم سے چھپ کے وہ ایسے کہاں کے ہیں!

لیکن سوال یہ تھا کہ آخر بیگم صاحبہ نے وہ جگہ کیوں چھوڑدی۔ بس یہی خیال دلمیں لئے ہوئے۔ وہ اسکے نقش قدم پر اسی کی ہمراہی میں سفر کررہا تھا۔ جس کا بیگم کو علم نہ تھا۔

وہ دل ہی دل میں اترا رہا تھا کہ کچھ بھی ہو بیگم اسے اتنا خطرناک ضرور خیال کرتی ہیں جس سے وہ بچ نکلنے کیلئے سفر کرنے پر مجبور ہوگئیں۔ اس لئے اس نے اپنے دلمیں ٹھان لیا کہ بیگم جہاں جائینگی ان کا تعاقب کریگا حتیٰ کہ کشمیر میں جہاں دشمنوں اور بدبینوں کی زہریلی خاردار نگاہیں ان کا پیچھا نہ کرینگی۔ اُمید ہے کہ بدخواہ دشمنوں کی نگاہوں سے اتنی دور پرے رہ کر بیگم اس سے محبت کرنے لگیگی۔

کشمیر میں پہنچ کر بیگم نے ایک جھیل کے کنارے پر فضا موقع پر ایک چھوٹا سا کاٹیج کرائے پر لے لیا۔ بیگم کے وہاں قیام کے چندہی روز بعد۔ ایک عمدہ شام کے وقت جبکہ تاروں کی روشنی جھلملا رہی تھی غیاث وہاں پہونچا۔ اور اپنا کارڈ خادم کے ہاتھ اندر بھیجکر بغیر جواب کا انتظار کئے۔ ان کے روبرو پہونچا اور آداب بجالایا۔ بیگم صاحبہ نے جب نگاہ اُٹھاکر دیکھا۔ تو غیاث کو اپنے قریب کھڑے پایا۔ کتاب جو وہ پڑھ رہی تھیں ان کے ہاتھ سے گر گئی۔ حیرت نے انہیں ششدر بنادیا بیگم صاحبہ کی اس حیرت میں غالباً ایک

قسم کی چھپی ہوئی مسرت بھی تھی۔ بیگم صاحبہ کی لکھنوی خادمہ اگر اس موقع پر حاضر ہوتی تو غیاث اور بیگم کی ملاقات کا منظر دیکھکر ضرور مسکراتی۔ کہ اتنی سی بات کے لئے یہ کیا اہتمام ہے جو ایک ہی دن اور ایک ہی نگاہ میں انجام پا سکتی تھی۔ لیکن واقعہ نگار اپنے افسانہ کے افراد کو اتنا سریع السیر خیال نہیں کرتا۔

غیاث عمر کے لحاظ سے اس حد پر تھا کہ چاتر عورتوں کے قدموں میں بھی اپنے آپ فدا کر سکتا تھا۔ یعنی وہ نوجوان تھا نا تجربہ کار تھا۔ اس پر مرض دل کا مریض۔ چونکہ عورتیں بھی محسوس کیا کرتی ہیں کہ ایک توانا اور شدید الجذبات مرد کے آگے جھکنا ہی چاہیئے۔ وہ اپنے عاشقوں پر جہاں اور جب تک ممکن ہے حکم چلایا کرتی ہیں۔ لیکن اسی حد تک جہاں تک ان میں تاب ضبط ہوتی ہے۔ اسکے مقابلہ میں ایک بڑی عمر کے مرد کی حالت جداگانہ ہوتی ہے۔ وہ معاشقہ کی سست رفتاری سے گھبراتا ہو لیکن بڑی عمر کی عورتیں جلنے والوں کے ہاتھ سے نکل جانے کے ڈر سے جلد مفتوح ہو جایا کرتی ہیں۔ ہاں یہ واقعہ ہے کہ مرد کو تجربہ کار ہو جانیکے بعد ہی مسرت ملا کرتی ہے۔ اور مرد جسوقت نوجوان ہوتا ہے اور کریم الطبع۔ اور اپنی بہترین متاع عزیز بھی محبت پر نثار کرنے کو آمادہ ہوتا ہے۔ تو اسے تمام اپنی نذر کے بدلے یا تو کچھ نہیں ملتا۔ اور اگر کچھ ملتا بھی ہے تو بہت کم۔

بہرحال شادی ہو کر رہی۔

بیگم اور غیاث کشمیر میں جھیل کے کنارے کے کاٹیج میں تین سال تک رہے۔ وہ دونوں ساری دنیا سے الگ تھلگ رہتے تھے کسی بیرونی سے ملاقات نہ کرتے تھے گرگشتی میں سیر کو بھی جاتے تو نور ظہور کے وقت .... انکی مسرت شیریں خواب کی مسرت تھی۔ وہ مسرور تھے۔ اسی طرح جس طرح دلی مسرتوں پر مسرور ہوا کرتے ہیں جس مسرت کا ہم خواب دیکھ لیا کرتے ہیں۔ انکی چھوٹی سی کاٹیج سفید پتھر سے تعمیر کی گئی تھی۔ اس کے کواڑ سبز رنگ کے تھے۔ مکان سادگی سے آراستہ کیا گیا تھا۔ اس میں سفید غالیچے بچھائے گئے تھے۔ کمروں میں سفید اور کہیں سنہری رنگ کیا گیا تھا .... ان سامانوں کو دیکھتے ہوئے کہنا ہوگا کہ گھر دو محبت کرنے والے انسانوں کے لئے موزوں گھر تھا۔ دریچوں میں سے دیکھنے پر جھیل ایک اور ہی دلربا منظر پیش کیا کرتی تھی۔ اونچے اونچے برف سے ڈھکے ہوئے سفید پہاڑ نگاہوں کو اپنی طرف دعوت نظارہ دیتے تھے۔ الغرض رفیعہ اور غیاث ایک پُر تبسم خواب میں عیش و مسرت کے ملہار گا رہے تھے۔

لیکن اب ایسا ہوا کہ غیاث کو یکایک بمبئی واپس جانا پڑا۔ اسکے والد اور بھائی کا انتقال ہو چکا تھا۔ خانگی ضروری امور نے کشمیر کے کنج تنہائی سے اسکو واپس کھینچ بلایا۔ بیگم بھی اسکے ساتھ گئی۔ اس نے غیاث کی موروثی جائداد کے قریب ہی ایک دیہاتی بنگلہ خرید لیا جہاں دونوں رہتے تھے اور زبان خلق پر ہنسی اڑاتے ہوئے باہم خوش و خرم رہتے تھے۔ وہ لوگوں سے الگ اپنی تنہائیوں میں ایسے خوش تھے جیسے کشمیر کے زعفران زاروں میں خوش رہا کرتے تھے۔ انکی باہمی مسرت ایسی تھی جو کہانی کے آخر تک اچھی طرح سمجھ میں آسکے گی۔

لیکن بیگم کا قانونی دعوٰی شوہر ابھی تک زندہ تھا۔ تندرست اور توانا۔ جیسا کہ عموماً ان لوگوں کے بارے میں ہوا کرتا ہے جنکی موت کی دوسرے دعائیں کیا کرتے ہیں وہ ایک ایسا شخص تھا جسکے جذبات مواج نہیں بلکہ ساکن سمندر کیطرح ہوا کرتے ہیں غالبًا یہی وجہ تھی کہ اسکی زندگی کی کشتی بغیر حادثہ کے آگے بڑھتی چلی جارہی تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو ایک عورت کے سامنے اپنی محبت کا دعوٰے اسی طرح پیش کر سکتے اور یقین دلا سکتے ہیں جیسا کہ ایک خادم یہ کہے کہ "میں خدمت کے لئے حاضر ہوں"۔

بیگم کے لئے یہ قطعًا ناممکن تھا کہ وہ غیاث کیساتھ شادی کرے۔ اسلئے اس معاشقہ کی ابتدا میں جیسی گزر داری پائیدار تھی۔ اس نو سال کی مدت گذر جانیکے بعد بھی ویسی ہی کمزور اور پادر ہوا سی تھی۔ ہوا یہ کہ غیاث کی ماں ایکبار بھی اس عورت سے ملنے کیلئے راضی نہ ہوئی جسکے ساتھ اسکا بیٹا رہتا تھا۔ برخلاف اسکے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی کہ اس کا بیٹا اس عورت سے دست بردار ہو جائے جس کے ساتھ موجودہ تعلقات اسکے نزدیک صریحًا بداخلاقی اور الحاد پر مبنی تھے۔

ایسے ہی حالات کی بنا پر رفیعہ بیگم بھی قریبًا یہی پسند کرتی تھی کہ غیاث اور وہ بمبئی کا مکان چھوڑ چھاڑ کر پھر کشمیر میں آباد ہو جائیں لیکن مصیبت یہ تھی کہ غیاث کے دل میں بمبئی کے موجودہ مکان سے ایک قسم کا عشق سا ہو گیا تھا۔ وہ اسکے بنگلے اور اسکے گرد و پیش کے باغات میں تغیر و تبدل کرتا رہتا تھا۔ عورتوں کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنے خاوندوں یا چاہنے والوں کو اپنے ارد گرد کے کھیت اور باغ میں گھرے ہوئے ہونا پسند کیا کرتی ہیں اسی لئے بیگم کا بھی دل نہ چاہتا تھا کہ وہ غیاث کو یہاں سے کسی اور جگہ لیجائے۔

اسی زمانہ میں ایک اور محترمہ اُنکے پڑوس میں آکر آباد ہوگئیں۔ جو ایک نوجوان اور متمول خاتون تھیں جنکے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ بہت خوبصورت بھی تھیں۔ غیاث صبح کے وقت جب اپنے گھوڑے پر سوار سیر کو جایا کرتا تو ان سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ ان خاتون کا وردو تمنوں شخصوں سے خاص تعلق رکھتا تھا جیسا کہ ذیل کے خط سے ظاہر ہوگا۔ جو ایکدن غیاث کو علی الصباح اسکی محبوبہ کی طرف سے دیا گیا۔

میرے پیارے غیاث!

میں جسے ناقابل بیان مسرت حاصل ہے۔ جسے آپکے ساتھ ایک ہی مکان میں رہنے کی مسرت اور آپ کا قرب حاصل ہے جسکو آپکی محبت اور یگانگت بھی ملی ہوئی ہے یہ خط آپ ہی کو لکھ رہی ہوں۔ اس سے آپکو حیرت ہو تو تعجب کی بات نہیں لیکن کچھ ایسی باتیں بھی ہیں جنہیں عورت اس مرد پر ظاہر کرنا پسند نہیں کرتی جس سے وہ محبت کرتی ہے کیونکہ ان کے بیان کرنے کا خیال ہی اس کو خوفزدہ کرنے اور اسکا رنگ رُخ اڑا دینے کے لئے کافی ہے .... لیکن اسکے باوجود میں ان باتوں کو جنہیں محسوس کرتی ہوں آپ سے کہے بغیر آپ کے سایہ کے پاس بھی پھٹک نہیں سکتی۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے ہر خیال میں آپ شریک ہوں۔ گو یہ کہے اس طرح بے پروایانہ انداز میں سیکھ گذر جائے دنیا کتنا پرسکون اور آرام دہ ہے۔

سنیئے .... پیارے غیاث! میں چاہتی ہوں کہ آپکے سامنے اقرار کروں کہ آپکی محبت نے میرے تمام پہلے زخموں کو مندمل کر دیا۔ اور ان تمام خطرات سے جنہوں نے میری زندگی کو آپ کی پہلی ملاقات کے وقت گھیرا ہوا تھا۔ نجات مل گئی۔ اس لئے میں تسلیم کرتی ہوں کہ قدرت نے آپ کو میری نجات ہی کے لئے بھیجا تھا۔ تمہیں نے مجھے بتایا ہے کہ حقیقی محبت کسے کہتے ہیں۔ اگرچہ محبت کے بارے میں بہت خودغرض اور محبت بسیار خواہ عورت ہوں لیکن تم نے مجھے اس سے زیادہ دیا جسکی میں امید کیا کرتی تھی میرے زخمی دل کیلئے تمہارے ایسی نوجوان اور پاک محبت ہی کی ضرورت تھی۔

محبت کے گذشتہ دو سال کے دوران میں ایکبار بھی ہماری مسرتوں کا آفتاب ابر آلود نہیں ہوا۔ اس مدت میں نہ کبھی ایکدوسرے کے متعلق بدظنی ہوئی نہ کبھی حاسدانہ شکر رنجی۔ ہم دونوں تمام قسم کے خیالات و حالات پر برابر کے شریک و سہیم رہے .... سچ تو یہ ہے۔ ہاں سچ تو یہ ہے کہ مجھے وہ مسرت حاصل رہی جو شاید ہی کسی دوسری عورت کو نصیب ہوئی۔

لیکن ایک عورت کے دل میں بہت سے عمیق در عمیق اسرار ہوا کرتے ہیں۔ اور آج سے پہلے خود مجھپر میرے دلکی حالت ظاہر نہ تھی نہ مجھپر یہ ظاہر تھا کہ میرا دل کہاں تک محبت کر سکتا ہے .... اور اب جب یہ کچھ مجھ پر روشن ہوا تو میں خوفزدہ ہو کر رہ گئی ہوں۔

یہ بات مجھ پر روشن ہونے لگی ہے کہ آپ کی عمر ۲۰ سال کی ہے۔ اور میری عمر ۲۸ سال کی۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ عورت مرد کے مقابلہ میں زیادہ سرعت سے بوڑھی ہو جایا کرتی ہے .... یہی نہیں بلکہ اگر ہم دونوں تیس تیس برس کے بھی ہوتے تو میں یہی محسوس کرتی .... کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ تم نے میرے لئے کتنی بڑی قربانی کی ہے۔ تم نے اپنی شادی ہونے اور بیوی پانے اور بچوں کے حصول اور دنیا میں معزز متاہلانہ طریق سے رہنے کا موقع کھو دیا۔ اگر بچے ہوتے تو وہ تمہارے وارث ہوتے ...... غالباً یہ خیالات آپکے دل میں بھی پیدا ہوئے ہونگے لیکن آپ نے انہیں میری خاطر سے مردانگی اور وفاداری سے دبا دیا ہوگا۔ اور یہ بات تمہارے عہد و پیمان کی پختہ دلیل ہے .... میری یہ بدگمانی اور خیال کچھ بھی ہو میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔ لیکن میں آپ کے رحم و کرم کی بنا پر یہ محبت قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ میں محبت کی ایسی بھیک قبول کر کے آپ کے پہلو میں جگہ لینے کی بجائے اسے پسند کرونگی کہ تم اپنے ہاتھ سے مجھے ذبح کر ڈالو۔

کل آپ نے محبت و ملاطفت مجھ سے میری آزردگی کا سبب دریافت کیا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ میں نے آپکی ایک ایک بات اور ایک ایک حرکت و سکون اور قول و فعل کو دقت نظر سے دیکھنا شروع کیا محض یہ دیکھنے کے لئے کہ آپکی یہ عنایات میری کسی زبردستی کا تو نتیجہ نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ مرد بہت زیادہ ہوشیار نہیں ہوتے۔ بہت جلد انکی حرکات سے خستگی اور تکان ظاہر ہو جایا کرتی ہے .... میں نے بھی اس بات کو محسوس کر لیا۔ میں نے دیکھا کہ آپ ہوگئے میں آپکی نگاہیں کہہ رہی تھیں "میری بچاری رفیعہ ......" میں آپ سے علیحدہ ہو کر تنہائی میں اپنے کمرے میں جا کر اپنے آنسو بہانے لگی۔ یہ وہ پہلے آنسو تھے جو میں نے آپ سے چھپا کر بہائے۔ میں نصیبوں جلی اتنی خوددار بھی ہوں کہ مجھے یہ گوارا نہ تھا کہ آپ پر بھی اپنی کمزوری ظاہر کرتی۔ پیارے ا ..... لیکن میں تم کو الزام نہیں دیتی نہ کسی طرح کی بے وفائی یا برائی تمہاری طرف منسوب کرتی ہوں .... اب میرا فیصلہ یہ ہے کہ میں آئندہ آپ کی جوانی یا زندگی کا کوئی حصہ قبول کرنیکے لئے تیار نہیں آپ ابھی جوان ہیں اور مرد۔ میری محبت کا تماشا ختم ہو چکا۔ میری تکلیف اور میرے کرب کا خیال کیجیے کہ عالم خیال میں میں نے غلط طور پر کیا کیا دیکھا۔ اور فضول دکھ اٹھاتی رہی اب میں یہ متذبذب حالت نہیں برداشت کر سکتی۔ اگر میں غلطی پر ہوں مجھے آگاہ کیجیے اور سزا دیجیے۔ اور اگر میں صحیح کہتی ہوں تو یہ بھی مجھے بتا دیجیے۔ تاکہ میں یہ تو جان لوں

میں مضبوط چٹان پر کھڑی ہوں یا ریت کے ڈھیر کے اوپر اور غار کے کنارے۔ اور آئندہ میری حالت اور حیثیت کیا ہوگی۔

آپ اکثر اپنی والدہ سے ملتے ہیں اور انہیں خوب جانتے ہیں۔ اور اتنا میں بھی جانتی ہوں کہ وہ میری مخالف ہیں۔ علاوہ ازیں اب آپ کی نوابزادی محترمہ صبیحہ بیگم سے بھی ملاقات ہوتی رہتی ہے جسکی بنا پر رشک و حسد کی آگ میں جل رہی ہوں .... میں فریب سے جانیسے تکلیف اُٹھانے کو ترجیح دیتی ہوں .... غیاث مجھے صاف صاف کہدو ...... بے رو رعایت کہدو کہ اب تمہارے دل میں کیا کیا جذبات و احساسات ہیں۔ خوف نہ کھایئے اگر آپ کے دل میں کسی اور کا دھیان ہے۔ اور میرا بھی خیال ہے تو میں آپکو اپنی طرف سے آزاد کرتی ہوں۔ آپ میری قسمت کی طرف سے افسردہ یا بدمزہ نہ ہوں میں اپنے لئے کوئی نہ کوئی راہ پیدا کر ہی لونگی ....

ہاں میں اب نہیں چاہتی کہ آپ کو پھر دیکھوں "آپ کو پھر دیکھوں" اس خیال سے ہی میری حرکت قلب بند ہوئی جاتی ہے۔ جبکہ یہ الفاظ میرے قلم سے نکل رہے ہیں پھر بھی آپ ہی سچے اور بے تصنع ہیں..... علاوہ ازیں آپ مجھے بھی جانتے ہیں .... آپ جانتے ہیں کہ میں سچائی کو ترجیح دیتی ہوں۔ اگرچہ وہ سچائی کتنی ظالمانہ کیوں نہ ہو...... آپ اس کا بھی خوف نہ کیجئے کہ علیٰحدگی کے زمانہ میں آپکی یاد کسی قسم کی تلخیاں پیدا کر دیگی۔ میں نے ایک بہترین انسان سے وہ کچھ حاصل کیا جو وہ خود بھی کسی دوسری عورت کو نہ دے سکیگا۔ آپ نے جس قدر مجھے دیا ہے۔ میں جانتی ہوں اور میں اسی پر قانع ہوں۔ اب میں دوسری عورت کو ایک ایسا انسان دے رہی ہوں جو عاقل فرزانہ ہوگا۔ قابل ہوگا۔ ذی شعور اور معاملہ کا پکا انسان ہوگا۔ لیکن مجھے اس انسان یا مرد کی عمر کا وہ حصہ ملا جو بچپن یا شاید عہد طفولیت کہلائیگا۔ ملا۔ اور یہ خیال کہ وہ مرد مجھے ہر چیز پر مقدم رکھتا تھا۔ اس کا فیصلہ میرے لئے مشکل ہے کہ اکثر عورتیں کسی مرد کی ان دونوں حالتوں میں سے کونسی حالت کو ترجیح دینگی۔

غالباً بہتر یہی ہے کہ اب یہ معاملہ ختم ہو جائے۔ قبل اسکے کہ آپ غصہ میں آکر مجھے کوئی بات کہیں۔ یا قبل اسکے میں لڑاکا ہو جاؤں اور آپ سے کچھ مطالبات کروں یا ہم عمر میں اور آگے بڑھیں۔ جیسا کہ میں نے آپ کو خوش رکھا۔ مجھے یقین ہے۔ دوسری عورت آپ کو خوش نہیں رکھ سکیگی۔ میرا دل اور میری روح کہنے کو میری اور درحقیقت آپ ہی کا مال ہیں۔ آئندہ بھی یہ دونوں چیزیں کسی اور کی نہیں ہو سکتیں۔ اب میں اپنے اس دور مسرت و کامرانی کی یاد میں خاموشی مگر مسرت سے جینے کی کوشش کرونگی اور اب تک جو کچھ کر چکی ہوں اس سے بہتر کام کرنے میں ساری مساعی صرف کر دونگی۔

لیکن اگر پیارے! اس سارے معاملہ میں غلطی خوردہ ہوں۔ اور میں تمہیں اتنی ہی محبوب اور عزیز ہوں جتنی کہ بتک رہی ہوں۔ تو میں آپکے انتظار میں چشم براہ بازو کشادہ بیٹھی آپ ہی کا نام جپ رہی ہوں۔ پیارے! آیئے! میری طرف دوڑیئے!! نہیں اُڑ کر آیئے!!! اگر ایسا ہو تو میں آپسے اتنی محبت کرونگی جو اس نو سال کے عرصہ میں بھی میں نے نہیں کی۔ جب کہ ہم اکیسا تھ رہے۔ کرب و اضطراب کے ان ایام کے بعد یہ محسوس کرنا کتنا حیرتناک ہوگا کہ میں برسر غلط تھی۔

ہاں شرط یہی ہے کہ آپ صفائی سے کام لیں۔ آپکو معلوم ہے کہ آپکی مسرت مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز اور محبوب ہے۔ آپکا جو بھی فیصلہ ہو وہ میرے مستقبل کے کسی قسم کے خیالی تاثر کا نتیجہ نہیں ہونا چاہیئے۔ جب آپ میرے پاس نہ ہونگے مجھے یقین ہے کہ خدا مجھے تسلی دیگا۔ غیاث! میں خوشیوں میں سرشار رہ چکی ہوں "

غیاث کو مندرجہ بالا خط دینے کے بعد رفیعہ ایک عجیب دلشکنی کی حالت میں مبتلا ہو گئی۔ جس سے نکلنے کی اسے ہمت جرات نہ تھی۔

غیاث نے تنہائی میں جاکر رفیعہ بیگم کا خط پڑھا۔ واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک رفیعہ بیگم کا تعلق ہے اس میں ایک تغیر واقع ہو چکا تھا۔ اسکی ماں مسلسل بیٹے کو اپنے حقوق مادری یاد دلایا کرتی تھی۔ کہ ماں کے حقوق ہر دوسری عورت سے مقدم ہیں۔ اور اس بات کا بھی آہستہ آہستہ اثر ہو رہا تھا۔ پھر کو نوابزادی صبیحہ ناقابل التفات نازیب جوان عورت تھی۔ اس کا رنگ مرمریں تھا۔ منہ کیلوں اور مہاسوں سے بھرا ہوا تھا۔ آپ اوّل تو بولتی ہی کم تھیں۔ لیکن جب کبھی لب کشائی کرتی تھیں تو بے سلیقگی اور بھونڈے پن کا بے عیب نمونہ پیش کرتی تھیں۔ جیسا کہ جوان قابل شادی لڑکیوں کے متعلق خیال کیا جاتا ہے۔ ان کمیوں کے باوجود اگر کوئی چیز اسکی موافقت میں گویا نی ہوئی تھی تو وہ اسکے چالیس ہزار پونڈ کا سرمایہ تھا۔ یہ بیچاری ان عورتوں میں سے تھی جو بیوی کا پارٹ ادا کرنے کے لئے خلق ہوتی ہیں کہ محبوبہ دلنواز کا۔ غیاث کی ماں اس خواہش میں زمین آسمان ایک کئے دے رہی تھی کہ یہ لڑکی اسکے بیٹے سے شادی کر لے۔ اس بارے میں غیاث کی ماں بڑی ہوشیاری، خوشامد اور بھسلاہٹ سے کام لیتی اور سبز باغ دکھا رہی تھی ...... اسی زمانہ میں رفیعہ بیگم کا خط غیاث کے نام آیا جب کہ وہ عاشقانہ قسموں اور عہد و پیمان اور مالی حقوق اور دنیاوی ترقیات کی جنگ میں مبتلا تھا۔

خط آیا اور اس جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔ اس نے ٹھان لیا کہ بیگم سے دست برداری کر کے بس شادی رچالے۔ اس نے دل ہی دل میں کہا کہ" انسان کو زندگی کی جنگ سے دوچار ہونا چاہیئے "

اب وہ محسوس کرنے لگا کہ جدائی کی صورت میں اسکی محبوبہ کے دل پر کیا گذر جائیگی۔ اس لئے اس نے یہ بھی تہیہ کر لیا کہ وہ امکان بھر کوشش کریگا کہ اسکی محبوبہ اس زخم کو کم سے کم دردناک محسوس کرے۔ . . . . اب اس نے ایک ایک لفظ کے بارے سوچنا شروع کیا کہ وہ کس کس طرح اور کون کونسی نرم اور مہربانی آمیز باتیں کہے گا اور وہ تمام نرم اور پرحلم طریقے جنکے ذریعہ اپنا ارادہ بیگم پر ظاہر کریگا۔ خیر یہ سب باتیں تو ملاقات کے وقت دیکھی جائینگی۔ لیکن اس دوران میں بیگم کے خط کا جواب تو لکھ دینا چاہیئے +

بیگم نے اپنے خادم یعقوب کو ایک چھوٹا سا تہ کیا ہوا خط ایک طشتری میں رکھے لاتے دیکھا۔ یہ دیکھتے ہی تقریباً وہ بیہوش ہو گئی اور ایک تیر خوردہ پرندہ کیطرح لرزنے اور تڑپنے لگی . . . . . . آہ ! جو ہونا تھا وہ ہو گیا . . . . اگر غیاث کو اس سے محبت باقی ہوتی تو وہ اسے ہرگز خط نہ لکھتا۔ بلکہ وہ خود آتا۔ اس کا پہلے رنگ زرد ہوا ہوتا۔ پھر غصہ سے تمتمایا ہوا۔ دل دماغ درد و کرب سے بھرے ہوئے . . . . ہاں ہاں وہ غیاث کو اپنے خط کے جواب میں اسی شان سے آتا دیکھنا چاہتی تھی۔ جیسا کہ تمام محبت کرنے والی عورتیں خیال کیا کرتی ہیں . . . . آہ ایک ایسی عورت کو جو محبت کرتی ہو مار ڈالنے کے لئے ایک نہیں بہت سے کاری زخموں کی ضرورت ہوتی ہے۔

خادم قدیم نے واپس ہوتے ہوئے باادب و نرمی عرض کیا کہ "حضور میں کوئی خدمت بجا لا سکتا ہوں"

"شکریہ ! نہیں . . . ." بیگم نے جواب دیا۔

یہ محسوس کر کے کہ نوکر نے اسکی مصیبت کو بھانپ لیا ہے وہ شرما سی گئی۔ پھر اس نے اپنی آنکھوں سے آنسو پاک کرتے ہوئے۔ لفافہ چاک کیا اور خط پڑھنے لگی۔

"میری پیاری ! تم کن اوہام میں مبتلا ہو . . . ."

ان ابتدائی الفاظ ہی کی مسرت نے اسکے چہرے کو ارغوانی کر دیا . . . . . . لیکن افسوس یہ ارغوانی رنگ بہت تھوڑی دیر قائم رہا۔ کیونکہ خط مصنوعی الفاظ اور پر تکلف فقرات و امثال و عبارات سے بھرا ہوا تھا جن میں نہ وہ قدیم جذبہ تھا۔ نہ وہ روح تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ غیاث اتنا وحشی نہیں ہو سکتا کہ ساری حقیقت کہدے۔ اس لئے اس نے ساری سچائی کی بجائے آدھی سچائی کے اظہار سے کام لیا تھا . . . . . . اس خیال کے آتے ہی اس نے خط جو اسکے ہاتھ سے گر رہا تھا سنبھالا۔ پھر مروڑا تروڑا۔ آخر پھاڑا اور ٹکڑے کرتے ہوئے کہا ". . . . . وہ میرے پاس اسکے بعد بھی آ رہا۔ جبکہ اسے مجھ سے محبت نہیں رہی تھی۔ آہ میں کس قدر ذلیل کی گئی ہوں" یہ کہتے کہتے وہ خستگی سے نیم مردہ حالت میں اپنے پلنگ پر گر پڑی۔

غیاث جب شام کے وقت بہت دیر میں گھر واپس آیا تو یعقوب نے اسے ایک خط دیا۔ جبکہ وہ دروازے کی سیڑھیوں پر بیگم سے ملنے کیلئے کھڑا تھا۔ کہ "بیگم صاحبہ مکان پر تشریف نہیں رکھتیں . . . ."

غیاث نے خادم سے خط لے لیا۔ اور یہ وہی خط تھا جو خود اسی نے چند گھنٹہ پہلے بیگم کے نام لکھا تھا۔ رفیعہ نے اسی کی پشت پر یہ الفاظ لکھدئے تھے۔

"جناب ! آپ آزاد ہیں۔"

اب غیاث اپنی والدہ ہی کے ساتھ "قدیم محل" میں رہنے لگا تھا۔ اس واقعہ کے ایکماہ بعد اسکی شادی رفیقہ بیگم سے ہو گئی۔

ادہر رفیعہ بیگم قطعی طور تنہائی میں رہتی تھی۔ نہ کسی سے ملتی تھی نہ کہیں آتی جاتی تھی۔ صرف اسکے قدیم ملازم ہی اسکے سامنے جا آ سکتے تھے۔ تمام وقت گھر میں رہتی تھی، ہاں ہفتہ میں ایکبار ایک اہل امہ مجلس وعظ میں چھپ چھپا کر چلی جایا کرتی تھی۔ وہ بزرگ بھی کبھی اسکے گھر پر نہ آتے تھے۔ اگر انہوں نے اسے دیکھا بھی تو اسی وقت اور اسی طرح جب وہ انکے وعظ میں لپٹی لپٹائی الگ تھلگ جا بیٹھی ہوتی تھی۔

غیاث صاحب شادی ہوتے ہی گھر گرہستی بن کر رہنے سہنے لگے۔ انکی ماں اپنی ملنے والیوں سے کہا کرتی تھی کہ "میرا بیٹا تو بہت خوش و خرم ہے" رہی غیاث کی بیوی سو اس میں اور دوسری بے شمار بیویوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہ نرم خو، بے زبان، صابر و شاکر، مگر سست اور کاہل الوجود تھی۔ شادی کے ایک مہینہ بعد بیگم غیاث نے آثار امید دیکھے۔ غیاث کی ماں تو اس خوشخبری سے پھولی نہ سماتی تھی۔ خود غیاث بھی اپنی بیوی سے اچھا برتاؤ کرتا تھا۔ ہاں کبھی کبھی وہ کچھ کھویا کھویا اور عالم خواب میں چلتا پھرتا نظر آیا کرتا تو دیکھنے والوں کو اسکی ماں کہا کرتی تھی کہ "یہ کوئی نئی بات نہیں۔ میرا بیٹا تو ہمیشہ سے ایسا ہی ہے"

اسی طرح سات مہینے گذر گئے ۔ اس مدت کے بعد چند خاص باتیں ظہور پذیر ہوئیں، جو بظاہر کم اہم اور حقیقۃً بہت ہی اہم نتائج سے بھرپور تھیں ۔ واقعہ یہ ہے کہ ایکدن غیاث اپنے اور اپنی بیوی کے کھیتوں میں شکار کے دوران میں گھوڑے پر سوار اپنے راستہ سے کسی قدر ہٹ گیا ۔ اور اس نے اپنے آپ کو رفیعہ بیگم کے دیہاتی مکان کے دروازہ پر پایا ۔ اب اسکے دل میں بیگم سے ملاقات کی زبردست خواہش پیدا ہوئی لیکن وہ جانتا تھا کہ "فن حرب سے" واقف ہوئے بغیر یہ ملاقات ممکن نہیں ۔ اس لئے اس نے اس دن کا سارا شکار یعقوب کو اس اصرار کیساتھ دیا کہ وہ بیگم کو غیاث کا نام نہ بتائے بلکہ یہ کہدے کہ شکار خود بیگم ہی کے شکاری نے کیا ہے۔ یعقوب کے دل میں بھی اپنے پہلے آقا کی کسی قدر محبت باقی تھی ۔ اس نے یہ بات مان لی اور ایسا ہی کیا جیسا کہ غیاث نے چاہا تھا ۔

...:...

غیاث نے گھر جاکر یہ عذر پیش کیا کہ آج کا دن خالی گیا کوئی شکار ہاتھ نہیں آیا ۔

اس بات پر بھی ایک ہفتہ گذر گیا تب غیاث نے بیگم کو ایک خط بھیجا ۔

یہ خط یونہی بند کا بند اسے واپس مل گیا لیکن ایکدن شام کے وقت جب کہ اسکی بیوی پیالوں کے پردوں کو مردوں کی صفوں میں لٹا رہی تھی ۔ غیاث نے اپنی ان گھریلو دلچسپیوں کو اپنے لئے ناقابل برداشت پایا ۔ وہ سرعت سے اٹھا ۔ اس نے اپنی ٹوپی اٹھائی ۔ اور یہ کہہ کر چلا کہ جو ہو سو ہو ۔ وہ اپنی محبوبۂ قدیم سے ملاقات ضرور کریگا ۔ غیاث نے رفیعہ بیگم کے خانہ باغ تک پہونچنے کے لئے ایک لمبا چکر کاٹا اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا ۔ جسے سکون دینے کے لئے تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد وہ ٹھہر جاتا تھا آج سے پہلے تو اس نے کبھی یہ جرأت دکھائی نہ تھی ۔ مگر آج کسی نہ کسیطرح آنکھ بچاکر مکان میں داخل ہوگیا ۔ وہ دوڑکر سیڑھیوں پر چڑھ گیا ۔ اور اپنے آپ کو بیگم کے کمرۂ خواب کے باہر کی طرف چھپالیا ۔

اس نے یہاں تک آنے میں ذرا بھی آواز پیدا نہ کی تھی ۔ اب چابی لگانے کے سوراخ میں کمرے کے اندر نگاہ کی ۔ دیکھا کہ بیگم کا رنگ زرد تھا ۔ وہ تھکی ہوئی تھی ۔ اور بے پروایانہ انداز سے آرام کرسی پر بیٹھی تھی ۔ وہ اتنی تھکی ہوئی نظر آتی تھی کہ پڑھ بھی نہ سکتی تھی ۔ بیگم کے چہرے کی اداسی اور پژمردگی اسکے دل کو زخمی کرگئی ...... کیا وہ غیاث ہی کا خیال کر رہی تھی .... اچانک ایک آہ غیاث کے منہ سے نکل گئی ۔ ایک بے اختیارانہ حرکت ، ایک جذبۂ بے پناہ کی ایک آہ بلند ہوگئی ۔ بیگم نے پلٹ کر دیکھا آہستگی سے دروازہ کھلا اور اسنے خود کو اپنے پہلے محبت کرنے والے سے رو دررو پایا ۔ اب غیاث تیزی سے آگے بڑھا ۔

بیگم نے زرد ہوکر کہا کہ "اگر آپ نے ایک قدم بھی میری طرف بڑھایا ۔ تو میں خود کو دریچہ سے باہر گرادونگی "

.... پھر چلا کر کہا "اگر آپ یہاں سے نہ چلے گئے تو میں بالاخانہ سے نیچے پھاند جاؤنگی "۔

غیاث نے مکان کے حصۂ زیریں میں ملازموں کی گڑبڑ اور آواز سنی تو پلٹا اور بیگم کے مکان سے ایک مجرم کیطرح باہر نکل گیا ۔

جونہی کہ وہ گھر پہونچا اس نے بیگم کے نام خط لکھا جس میں ملاقات کی درخواست تھی اور کہا تھا کہ "اس ملاقات کا فیصلہ زندگی اور موت کا فیصلہ ہے" جب وہ اپنے ڈرائنگ روم میں گیا تو اس نے دیکھا کہ اسکی بیوی کپڑے رہی الاپ رہی تھیں ۔ وہ بیٹھ گیا اور جواب کا انتظار کرنے لگا ۔ ایک گھنٹہ بعد جب میاں بیوی ایکدوسرے کے سامنے خاموشی سے بیٹھے تھے ۔ بیوی موزہ بن رہی تھی ۔ اور غیاث عالم خیال میں چپ چاپ بیٹھا خون جگر پی رہا تھا کہ اتنے میں خادم ایک خط لایا جو کسی غیر کا نہ تھا جو تھوڑی دیر پہلے اس نے بیگم کے نام بھیجا تھا اور اب بے کھولے جوں کا توں اسکے سامنے موجود تھا ۔

غیاث آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی سیڑھیوں پر چڑھا ۔ اس نے بندوق اٹھائی اور چشم زدن میں اپنے دل ہی کو نشانہ بنالیا ۔

...:...

غیاث اور رفیعہ بیگم میں گذشتہ نو دس سال کچھ ایسا ربط ضبط رہا کہ اب دونوں کے لئے ایک دوسرے کے بغیر جینا ناممکن تھا ۔ آئندہ ذلت کا خیال بھی موجودہ حالات میں ناممکن تھا ۔ غیاث میں محبت کرنے اور چاہنے کی ایک غیر فانی صفت تھی جس میں مادیت کیساتھ روحانیت بھی شامل ہوا سے اتفاق سے ایسی عورت مل گئی تھی جو اسکی اس طبعی آگ کو روشن رکھ سکتی تھی ۔ لیکن افسوس اب جبکہ وہ اسکے ساتھ نہ تھی تو اس کا جینا بیکار اور فضول تھا اسے یہ بھی معلوم تھا کہ رفیعہ جیسی دوسری عورت اسکے مقدر میں اب نہیں ۔ چنانچہ جدائی کے بعد ہی اسنے محسوس کرلیا تھا کہ اس نے رفیعہ بیگم کو کھوکر کتنی بڑی دولت کھوئی ہے ۔

بیگم اتنی اچھی۔ اتنی لطیف اور اتنی بہار تھی کہ وہ خود اسکے مقابلہ میں گویا کچھ بھی نہ تھا۔ اس لئے غیاث نے اس سے علیحدگی اختیار کر کے حماقت کا ارتکاب کیا تھا۔ جب اس نے غیاث کی ملاقاتوں میں اجنبیت کا ہلکا سا بھی رنگ پایا تو اس نے خود اُسے چھوڑ دیا۔ اس نے دل میں سوچا کہ وہ اپنی حرکات کی وجہ سے کیسا وحشی تھا۔ اب وہ گم شدہ اور ہلاک شدہ آدمی تھا اور بیگم کا یہ خیال بجا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بیگم اس سے کوئی تعلق نہ رکھ سکتی تھی۔ چاہے یہ کہیں دفان ہو۔

اب مجبوراً اسے بھی دو چیزوں میں سے ایک کو اختیار کر لینا چاہیئے تھا یا تو ایک ناہموار۔ عامیانہ محض مادی اور بے کیف زندگی پر راضی ہو جانا چاہیئے۔ یا روحانی محبت۔ سے لذت آشنا ہو چکنے کے بعد مرجانا چاہیئے اور اسی پر قناعت کرنا چاہیئے۔ غیاث نے جس کا خمیر ہی روحانی تھا۔ موجودہ ادنیٰ حالت اور صرف گزشتہ کی یاد پر جیتے رہنے سے انکار کر دیا

رہی بیگم۔ سو کسے گمان ہی بھی نہ تھا کہ ایک مرد اس سے اتنی پرستارانہ محبت کریگا کہ اسکے لئے جان تک دیدیگا خصوصاً وہ آدمی جو عیش و عاشقی کے خیالی ہی نہیں عیش و عشرت کے مزے بھی لے چکا ہو۔ اب اگرچہ بیگم کو اس سے کچھ واسطہ نہ تھا اور آئندہ کیلئے کوئی امید نہ تھی پھر بھی اسکی موت کا خیال بعید از قیاس تھا کیونکہ مرد عموماً جینے کے شائق ہوتے ہیں ....

اس میں شک نہیں۔ بیگم کا خیال اس بارے میں مصیبت تنہا اسی کو برداشت کرنا ہوگی لیکن اس نے اپنی محبت کو جو اسے غیاث سے تھی ذلیل کرنے۔ اور گرا دینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ راضی نہ تھی کہ محبت کی کسی ادنیٰ حیثیت پر قانع ہو جائے۔ اگرچہ وہ غیاث کی غیر منکوحہ بیوی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ کوئی بیوی بھی اس سے زیادہ اپنے خاوند سے محبت نہیں کر سکتی تھی جتنی نفیسہ نے غیاث سے کی ؎

(بالزک) مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی

وجدانیات

فروغِ حسنِ محبت چراغِ بالیں ہے
نگاہِ شوق خود اپنے چمن کی گلچیں ہے

عذابِ زیست "محبت" میں ناگوار نہیں
یہ تلخوش بھی حقیقت میں کتنی شیریں ہے

جنوں نے توڑ دیں آخر قیودِ ہجر و وصال
شرابِ شوق سے ہر سانس کیف آگیں ہے

نہ اب ملالِ تغافل نہ شکوۂ دُوری
تمہاری یاد سے مرقع میں خواب نوشیں ہے

اب اور کچھ نظر آتا نہیں سوائے جمال
فروغِ حسن سے جیبِ خیال زریں ہے

وہ اپنے دامنِ رنگیں سے دے رہی ہیں ہوا
نفس نفس مرا موجِ شمیمِ نسریں ہے

نہ عرضِ شوق نہ شکوہ نہ التجا نہ سوال
اسیرِ عشق سہی — دل وقار آئیں ہے

وہ جانتے ہیں انہیں علم ہر حقیقت کا
جہانِ دل کے لئے اضطراب تسکیں ہے

خیال میں بھی وہ آئے ہیں کس تکلف سے
لبوں پہ خندۂ بسمل نظر میں تمکیں ہے

نہیں نہیں مجھے ہرگز نہیں مجالِ "نگاہ"
حضورِ حسن میں یہ اک خموش تحسیں ہے

سما گیا ہے وہ جانِ بہار آنکھوں میں
مری نگاہ میں ہر گُل نقابِ رنگیں ہے

کسی حسیں کا تصور ہے اور دلِ کوکب
یہ خاکسار بھی اب ہمکنارِ پرویں ہے

کوکب (شاہجہانپوری)

بھاشا سُمَن[1]

جب سنسکرت اور پراکرت ارتقائی منازل طے کر کے روبزوال ہونے لگیں، تو اُن کی شاخوں نے اِدھر اُدھر پھیلنا شروع کیا، پھر جِس حصّے میں جو میدان آیا اُس نے وہاں اپنے ہم زبانوں کی بستی بسا دی، گویا مختلف السنہ کے زیرِ اثر ہندوستان کے علاقہ وارانہ حصّے بخرے ہو گئے۔

اِن زبانوں میں سے ایک نے کنہیا جی کے دُیار پہ بھاپ میں جنم لیا، متھرا کی گلیوں میں اُٹکلاتی پھری، جمنا کے خوش منظر گھاٹوں پر نکھری، گوالوں کی بانسریوں میں گُنگنائی، پنہاریوں سے لڑی، یاتریوں سے اِٹھی، پروہتوں ججمانوں کی ترجمان بنی، اور بتدریج "برج بھاشا" کے نام سے زبان زد خلائق ہوئی۔

چند صدی اِس کا بڑا دور دورہ رہا، ہزار ہزار کوس دُہائی پھر گئی، آخر جس عمارت (سنسکرت) کے ملبہ سے یہ تعمیر ہوئی تھی، ڈھ جانے والی یعنی سنسکرت کی طرح آہستہ آہستہ یہ بھی ٹوٹنے لگی۔ اور رفتہ رفتہ وہ وقت آیا جس سے دُنیائے فانی میں کسی کو مفر نہیں۔

اَب برج بھاشا ہی کیا اس سے ملتی جُلتی دوسری زبانیں بھی کچھ کی کچھ ہو گئی ہیں۔ ہندی اُدبا اور بہی خواہان بھارت ماتا کو ایک نئی زبان —— "ہندوستانی بولی"[2] بنانے کی دُھن ہے، کوئی "کھڑی بولی" پر غش ہیں، واللہ اعلم اُنکے ذہن میں کون سا مستقبل ہے۔

کیونکہ میں اِن فضولیات اور ناحق کی اُلجھنوں میں پڑنا نہیں چاہتا، میرا مقصد اُس دَور کے بیش بہا جواہر پارے پیش کرنا ہے، جسکے واپس آنے کی توقع نہیں۔

بنتے (مناجات)

(مہاکوی مہاتما سُور داس جی)

میرے پربھو! اوگن چِت نہ دھرو!
سم درشی[3] ہے نام تمہارو، سو ہی پار کرو!
میرے پربھو.............

اِک ندیا اِک نار کہاوت، میلو نیر بھرو،
دو جب جائے ملے گنگا میں سُرسری نام پرو
میرے پربھو.............

اِک لوہا پوجا میں راکھت، اِک گھر بدھک پرو
سو دُبدھا پارس نہیں جانے، کنچن کرت کھرو
میرے پربھو.............

اِک مایا اِک برہم کہاوے، سُور شیام جھگرو
کے یا کو نروار کرو، کے پرنشر جات ٹرو
میرے پربھو.............

. . . .

آقا! میرے اعمال پر نظر نہ ڈالیے!!
آپ کا نام تو رب العلمین ہے، میرا بیڑا پار کیجیے!
آقا! میرے اعمال پر.........

ایک کو ندی ایک کو نالہ کہتے ہیں، دونوں کا پانی میلا ہے
جب دونوں گنگا میں جا ملے، تو وہ سُرسری کہلائے گنگا بن گئے
آقا! میرے اعمال پر.......

---

[1] بھاشا کے پھول۔
[2] جو دراصل اُردو کا ستیاناس ہے۔
[3] سب کو ایک نظر دیکھنے والا۔

ایک لوہا پوجا میں رکھا جاتا ہے، دُوسرے کی چھری بنتی ہے
پارس کو اس بات سے کچھ غرض نہیں، دونوں کو خالص کُندن بنا دیتا ہے
آقا! میرے اعمال پر . . . .

ایک ناسوار (بندہ) اور ایک حق (معبود) ٹھہرا، سوُرداس اور کرشن میں تفرقہ ہو گئی
آقا! میرے اعمال پر . . . .

یا تو اس (سوُرداس) کو نباہئیے یا آپ کا عہد ٹوٹتا ہے
آقا! میرے اعمال پر . . . .

. . . .

سُورداس جی ہندی شعرا کے سرتاج مانے گئے ہیں، مذہبًا اشٹ چھاپ[۱] ہونے کی وجہ سے کرشن جی کے مداح تھے، آپ سے بہتر زبان کوئی نہ لکھ سکا، اسی خصوصیت کے سبب سے آپ کی زبان نے "سوُربینی" لقب پایا۔ جو نہایت شیریں اور بیحد دِلآویز ہے۔

اِنتظار

(پنڈت مت رام)

جمنا کے تیر بہے سیتل سمیر، جہاں مدھوکر، مدھر کرت شور ہے۔
کب مت رام جہاں چھب سی چھبیلی بیٹھی، انگن میں پھیلت سوگندن جھکجھور ہے
پیتم بہاری کے نہارہے کی باٹ، ایسی جھوٹہلا رویرگ دِرگن کرتی اڈور ہے،
ایک اورین منو، ایک ورکنج پنج، ایک ورکھن، چکور ایک اور ہے۔

. . . .

جمنا کنارے سکوں بخش پانی کی لہریں رواں دواں ہیں، اور جہاں بھونروں کی سُہانی سہانی گونج چھائی ہوئی ہے۔
مت رام کہتے ہیں، وہاں وہ خوش ادا سراپا ناز بنی ٹھنی بیٹھی ہے، اُسکے عضو عضو سے خوشبو کی لپٹیں اُڑ رہی ہیں۔

[۱] ولبھ اچاریہ نے یہ فرقہ نکالا تھا۔

پیارے کرشن کے اشتیاق دید میں، اُس نے کچھ اس طرح ہر چہار سمت تارِ منظر پھیلا دئے ہیں۔
جیسے اِدھر مچھلی، اُدھر کنول، ایک طرف دھوبن چڑیا، دوسری جانب چکور۔

. . . .

آنکھ کی چاروں ہندی تشبیہات کس خوبی سے جچائی ہیں، منتظر کو تماشہ بنا دیا، یہی کہنے کو جی چاہتا ہے ؎

ندیدے تمہاری منظر کے کھڑے ہیں
جوانی کا صدقہ اِدھر دیکھ لینا!

(مضطر خیرآبادی)

کلامِ کبیر

ہم دیکھت جگ جات ہے، جگ دیکھت ہم جاتہہ
ایسو کو ؤنا ملیو، پکر چھُڑاوے بانہہ

ہمارے دیکھتے دُنیا جا رہی ہے، دُنیا کے سامنے ہم سدھارتے ہیں، ایسا کوئی نہیں جو بازو پکڑ کر اس مصیبت سے نجات دلائے۔

مُورکھ کے سمجھاوتے گیان گانٹھ کو جائے
کوئلا ہوئے نہ اوجرو، سومن صابن لائے

جاہل کو سمجھانے سے اپنی عقل بھی ماری جاتی ہے۔ کوئلا اُجلا نہیں ہوتا خواہ سومن صابن سے دھوئے۔

برہ جلتی میں پھروں مو ہے برہ کو دُکھ
چھانہہ نہ بیٹھوں ڈرتی، مت جل اُٹھے رُدکھ

آتشِ فراق میں جلتی پھرتی ہوں، مجھے جدائی کی تکلیف ہے اس خوف سے سایہ میں نہیں بیٹھتی مبادا درخت میں آگ لگ جائے۔

بُرو جو دیکھن میں چلیو، بُرو نہ ملیو کوئے
جب من کھوجو آپنو، مو سو بُرو نہ ہوئے

میں نے جو بُرے کی جستجو کی تو کسی کو بُرا نہ پایا۔ جب اپنے آپ پر نظر ڈالی تو مجھ سے بُرا کوئی نہ تھا۔

مقولہ شاہ ظفر ارم آشیانی ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر، تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

پانچن کے بس من پرا، من کے بس نہیں پانچ
جت دیکھوں تت دون لگے، جت بھاگوں تت آنچ

پانچوں (حواس خمسہ) کے تابع دل ہوگیا، یہ پانچ دل کے قابو میں نہیں، اس جبر طرف نظر ڈالتا ہوں آگ لگی ہوئی ہے۔ جدھر بھاگوں بھڑکتی آگ پاتا ہوں۔

ایسو سنگی کو نہیں، جیسو جیو اور دیہہ
چلتی بریاں رے نرا، ڈار چلبو کر کھیہ

جسم و جان سے زیادہ کوئی رفیق نہیں۔ دم واپسیں یہ (جان) بھی خاک کر کے ڈال چلی۔

یا دنیا میں آئے کے چھوڑ دے تو اینٹھ
لینو ہونے سو جلد لے، اٹھی جات ہے پینٹھ

اس دنیا میں آکر (اے غافل) تو اینٹھ اکڑ چھوڑ دے! جو کچھ لینا لوانا ہو جلد لے لے ورنہ بازار بڑھا جاتا ہے۔

گگن شور برسے امی، بادل گہر گمبھیر
چہو دیہہ دس دمکے دامنی بھینجے داس کبیر

آسمان پر شور کر کے برس رہا ہے امنڈ گھمنڈ کر گھنا بادل آب حیات کا۔ چاروں طرف بجلی کوندتی ہے، اور کبیر داس کھڑا بھیگ رہا ہے۔

گھائل کی گت اور ہے، اورن کی گت اور
پریم بان ہردے لگا، رہیو کبیر اٹھور

زخمی کی کچھ اور ہی بات ہے، دوسروں کے معاملات اور ہیں۔ کبیر کے دل پر جو خدنگ عشق لگا تو بیچارہ وہیں کا وہیں رہ گیا۔

ماس گیو پنجر رہیو تاکن لاگے کاگ
صاحب اجھوں نا ہیں آئے مند ہمارے بھاگ

گوشت پوست گھل کر پنجر رہ گیا، کوے تاکنے لگے۔ صاحب اب بھی نہ آئے۔ بدقسمتی ہماری۔

برہ تپ تن میں تپے انگ سب اکلائے
گھٹ سونوں جیوں پیو میں کال ڈھونڈ پھر جائے

آتش فراق تن بدن میں بھڑک رہی ہے، کسی پہلو چین نہیں۔ قالب سونا ہے، دھیان محبوب میں، موت ڈھونڈ ڈھونڈ کر پلٹ جاتی ہے۔

آج کال کے بیچ میں جنگل ہوئے گو باس
اوپر اوپر ہل چلیں، ڈھور چریں گے گھاس

آج کل آج کل کرتے جنگل میں بسیرا ہو جائیگا۔ جہاں ادھر ادھر ہل چلیں گے اور مویشی گھاس چرتے ہونگے۔

انکھیاں میں جھائیں پری پنتھ نہار نہار
دسنا میں چھالو پڑو، نام پکار پکار

راستہ دیکھتے دیکھتے آنکھوں میں آندہ آگئی۔ ہائے! چھالا پڑ گیا ہے زبان پر تیرا نام پکارتے پکارتے۔

ہر چند کہ آدھ سنت کبیر داس جی ایک تارک الدنیا موحد تھے، لیکن اُن کا کلام نری رہبانیت یا خشک فلسفہ نہیں، نہایت رنگین، دلآویز اور عام فہم واقع ہوا ہے، آپ نے شعبات زندگی کے گوناگوں پہلو کچھ اس طرح روشن کئے ہیں کہ اردو، ہندی کے علاوہ ملک کی اور بھی کتنی ہی زبانوں میں بجنسہ یا ترجمے کی صورت میں یہ کلام ضرب المثل ہو گیا۔

جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس مضمون کو ذرا اور طوالت دوں مگر کیا کروں دوسرے کویشروں کے چمتکار بھی دکھانے ہیں۔ افسوس! کچھ ارمان نہیں نکال سکتا۔

عین کنڈلی

(حضرت عین اللہ[1] شاہ صاحب المعروف بہ سوامی عینانندجیؒ)

---

[1] قلعہ گوالیار کے جنوبی دامن میں آپ کا مزار ہے۔

پنڈت دامن راؤ جی کا قول ہے کہ عین صاحب نے اندازاً پانچ لاکھ کنڈلیاں کہی ہیں، میرے بچپن تک لشکر گوالیار میں کتنے ہی بزرگوں کو ہزاروں یاد تھیں، پھر ادھر انہوں نے لاپروائی کی، اُدھر دوسرے بھی کچھ متوجہ نہ ہوئے، اس طرح وہ دولت سینہ مرنے والوں کے ساتھ دفن ہو گئی۔

چند سال ہوئے کوئی ڈھائی سو ایک کنڈلیوں کا مجموعہ "برہم بلاس" کے نام سے جے پور میں چھپا تھا، سو کبھی کا ختم ہو گیا، اب وہ نسخہ ناپید ہے۔

میں نے گوالیار جا کر صاحب موصوف کے کلام کا کھوج لگایا، و سخت جستجو کے بعد معلوم ہوا کہ صرف کنڈلیاں ہی نہیں، عین صاحب نے دوہے، چوپائیاں اور فارسی میں بھی بہت کچھ کہا ہے، بڑی مشکلوں سے یہ کلام کہیں کہیں ملا، سو سو منتوں، ہزار ہزار خوشامدوں سے تھوڑا بہت لینی اچھا خاصہ دفتر نقل کر لایا، اس ذخیرے میں سے ذرا سا نمونہ حاضر کرتا ہوں۔

کوئی گردھر داس کی کنڈلیوں کے مداح ذرا یہ چیز ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ کس سادگی سے حقائق و معارف کا اظہار کیا گیا ہے۔

تم بن میرے کون ہے، کس سے کہوں حجور
دلیت آپ ہی آپ ہیں روم روم بھرپور
روم روم بھرپور، آتما صاحب تائیں
میرے من کا حال چھپا کچھ تم سے نائیں
جو چاہو کرو، عین سبھے منجور
تم بن میرے کون.......

تمہارے سوا میرا کون ہے، حضور! میں کس سے عرض معروض کروں؟ آپ ہی آپ نظر آتے ہیں، رونگٹے رونگٹے میں بسے ہوئے۔ رونگٹے رونگٹے میں بسے ہوئے آقا! جی جان میں سمائے ہیں آپ، میرے دل کا حال آپ سے مخفی نہیں ہے۔
جو چاہے کیجئے، عین کو سب کچھ منظور ہے
تمہارے سوا میرا.... ......

یار ہمارا وہی جو ہر دم رہوے سنگ
دن دونی پریت بڑھے کبھو نہ آوے زنگ
کبھو نہ آوے زنگ، پریت جگ ساتھ نباہی
جان اَجان، ہر گھٹ، گُپت، سب ہی ایکساہی
اُس کا میرا سب طرح اَن ملا ہو رنگ
یار ہمارا وہی...........

وہی ہے مطلوب ہمارا جو ہر دم ہمارے ساتھ رہتا ہے۔ روز بروز محبت ترقی پذیر ہے، اس میں کبھی میل نہیں آتا۔ کبھی میل نہیں آتا، ہمیں تمام مخلوق سے ہمدردی ہے۔ جانا انجان، ظاہر و باطن، میرے لئے یکساں ہیں۔
مجھ میں اور اس میں جو یگانگت ہو گئی،
وہی ہے مطلوب ہمارا.......

بڑے جو سر پر آ پڑا، گُن رہوے دھن جائے
جو گُن رہوے پاس تو دھن پھر ہو جائے
دھن پھر ہو جائے گُنی اُستاد کہاوے
سب مجلس کے بیچ گُنی اونچا پد پاوے
عین ہنر پیدا کرو جیسے بڑک پن چائے
بڑے جو سر پر آ پڑا.........

سر پہ مصیبت نازل ہو تو ہنر رہتا ہے، مال و زر نہیں رہتا دولت دوبارہ مل جاتی ہے، ہنر پاس ہو تو دولت دوبارہ مل جاتی ہے، ہنرمند اُستاد کہلاتا ہے ہر مجلس میں پاتا ہے ہنرمند بلند مرتبہ۔
عین جو بڑائی کا طالب ہو ہنر پیدا کرے
سر پہ مصیبت نازل ہو تو......

جوں لوں ٹھٹھری موڑ پے رام رام ہے ست
مانس بیٹھ مسان میں کتھیں گیان البت
کتھیں گیان البت، رہا نہ رہے گا کوئی
رہے رام کا نام، رہے جگ میں خوشبوئی
نہائے دھوئے کے چلدئے، غین گیان بھوگلت
جوں لوں ٹھٹھری موڑ پے . . . .

جب تک سر پر جنازہ رکھا ہے، رام رام ست ہو رہی ہے، لوگ مرگھٹ میں بیٹھکر ضرور معرفت کی باتیں کرتے ہیں۔ ضرور معرفت کی باتیں کرتے ہیں، یہاں کوئی رہا ہے نہ رہ جائیگا رہے نام سائیں کا، یا اعمال نیک کی — خوشبو جب نہا دھو کر چلدئے، تو غین وہ ساری معرفت عنقا ہو گئی۔

جب تک سر پر جنازہ رکھا ہے . . . .

جوں دکان رنگریج کی تیسا ہے ست سنگ
جیسا کپڑا ہوگا ویسا — آوے رنگ
ویسا آوے رنگ، سوت موافق چڑھ جائی
ململ، خاصہ، کھیس، ایک سا رنگ نہ آئی
غین بیٹھ ست سنگ ہیں، ڈھونڈ سبھی کے رنگ
جوں دکان رنگریج کی . . . .

[...]ں رنگریز کی دوکان کے نیک صحبت ہے۔ [...]با ہی رنگ آتا ہے، جیسا کپڑا ہو۔ [...]یسا ہی رنگ آتا ہے، سوت کے مطابق۔ [...]ں، خاصہ، کھیس، سب پر یکساں نہیں چڑھتا۔ غین نیک صحبت میں بیٹھکر تمام رنگ دیکھ مثل رنگریز کی دوکان . . . .

. . . .

یہ برج بھاشا نہیں، وہ زبان ہے، جو ابھی تک کسی قدر ردوبدل سے گوالیار کے بعض خاندان برتتے ہیں۔

التجا

(گھن آنند جی)

ایرے بیر پون! تیرد سب اور گون، تاسوں تیرے سم کون، میرے بین سن کان دے۔
جگت کے پران، چھوٹے بڑے کے سمان، دھن آنند ندان سکھ دکھیان دے
اُوپ ارن گھان، سکھ دان سب سجان پیارے، اب ہوتے اموہی بیٹھے پیٹھ کے مدان دے۔
برہ بتھا کی مور، راکھوں بور ہا تن پائن کی دھور نیک آن دے

. . . .

ہمدم ہوا! تیری ہر جگہ رسائی ٹھہری، بھلا تیری برابری کون کرسکتا ہے، میری فریاد سن!!
دُنیا جہان کی جان، خورد و کلاں کو یکساں، دردمندوں کو دولتِ تسکین بخش!
حسن ولطف کے مخزن، اُن راحت پہونچانے والے دانا و بینا نے مجھ سے رُخ پھیر لیا ہے۔
آلامِ فرقت میری آنکھوں میں بھرے ہیں، ہاہا ذرا اُن قدموں کی خاک اِدھر آنے دے!

. . . .

کیونکہ گھن آنند جی فارسی کے فاضل تھے، آپ کے کلام میں کچھ عجیب ہی کیف پایا جاتا ہے، یہ بات بھاشا داں شعرا کے یہاں نہیں ملتی ہے۔

* * *

کیفیات چشم

(حضرت رتن ندہ)

نیہی درگ ۔ یونی جب تیں کیسو تھاپ
روپ سند پہ کرتی ان بھوپتل چھاپ

محبت کی آنکھ کے دیوان نے جب سے اپنا تسلط جمایا حُسن کی مسند پر راجہ کام دیو (شاہ شباب) کے تل کی مُہر لگا دی

درگ ستیا گھائل دسے جوٹا نیچے لٹ جات
پیتم ہو اُسا سن ٹوٹ ٹوٹ سب جات

آنکھ کا معالج زخمی دل پر جوٹا نیچے لگاتا ہے، وہ مفارقت کی اُکھڑی ہوئی سانسوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر رہ جاتے ہیں۔

جو بدہ ان درگن کو نا دیتو بنکھ لگائے
ہوں ہی چل تو ہے دیکھتو، تو ہے نہ کہتو آئے

اگر خالق ان آنکھوں کو پر لگا دیتا۔ تو میں خود حاضر ہو کر تیرا دیدار کرتا تجھ سے قدم رنجہ کرنے کی نہ کہتا۔

ہیرا بن ہیرا کنی کہوں بیدھو جائے
مو ہیرا تب کنول درگ سہجے بیدھو آئے

ہیرے کی کنی بغیر ہیرے میں سوراخ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن تیری کنول جیسی آنکھوں نے میرے دل کو بڑی آسانی سے چھید لیا۔

من پنچھی یہ جگت ہو، تو تل دانے چار
تنہیں بسواسی کیوں چلتو، نین بان سوں مار

مرغ دل تیرے خال رُخ کے چار دانے چُگ رہا تھا۔ اے بھروسے والے! اسکو خدنگ نگاہ سے کیوں مار چلا۔

آسک اور محبوب میں انترا تو سُجان
انکے درگ انسواں بھرے، بے چھپ پو گمان

عاشق اور محبوب میں اتنا فرق ہے، اے عاقل! کہ اسکی آنکھیں پُر آب ہیں اور اس کی حُسن و ادا پر نازاں۔

پیتم آوت جان کے ہنستی نین شتاب
تہنہ لگ میں کر دیت ہیں انسوؤں کو چھڑکاب

اُس دل رُبا کی آمد آمد سُنکر آنکھوں کے سقے جلدی سے، راستے میں آنسوؤں کا چھڑکاؤ کر دیتے ہیں۔

. . . .

حضرت رتن ندہ مذہبًا مسلمان بالخصوص آنکھ کے تلازمہ پر بکلی قادر تھے، آپکے کلام کا ایک قلمی مجموعہ موسوم بہ "رتن ہزارہ" بعض علم دوست خاندانوں میں پایا جاتا ہے۔

رجز

(پروہت لال کوی)

نکست میان تیں منو کھیں پرسے بھان کیسی پھاریں تم تو مرگیندن کے جال کوں
لگت ہے لپٹ لپٹ ارناگن سی، ایش پہ بھاوے دیوے منڈن کی مال کوں
لال بھوپال چھتر سال رن رنگ دھیر کہاں لوں بکھان کروں تیری کرپال کوں
پرت بھٹ کٹک کٹیلے کوٹ کاٹ کیتے کالکا سی کلک کلیو دیت کال کوں

. . . .

نکلتی ہے نیام سے طلوع آفتاب کی شعاعوں کی مانند چکا چوند پیدا کرتی، گھنے اندھیرے کو ہاتھیوں کی قطاروں کی طرح پھاڑتی ہوئی۔
ناگن کی مانند لپک لپک کر لپٹ جاتی ہے کلیجے سے، کھوپڑیوں کے ہار چڑھا کر مہا دیو جی کو فریفتہ کر لیتی ہے۔
لال کہتے ہیں، اے شہریار چھتر سال، اے جنگجوئی میں رنگے ہوئے مستقر مزاج (بہادر) تیری تلوار کی کہاں تک توصیف کروں!

اس نے کالکا (جنگ کی دیوی) کی سی دھاڑیں مار مار کر کروروں بڑے بڑے سرکشوں نا بکار کاٹ کاٹ کر عزرائیل کو کھلا دیئے ہیں۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہمارے یہاں میر انیس اور میرزا دبیر کی رجز جیسی مقبول و بلند پایہ ہیں مخفی نہیں، یہاں ہندی رجز کا رنگ دکھانے کی غرض سے "چھتر پرکاش" کے مصنف پروہت لال کوی کی ایک چیز جو حقیقتاً اپنی جگہ خوب ہے، ٹانک دی گئی۔

رامائن

(گوسوامی تلسی داس جی)

آپ کا اصلی نام تو پنڈت تلا رام تھا، لیکن اپنے گرو ہری داس جی کے اسم گرامی سے نسبت قائم رکھنے کے خیال سے آپ نے خود کو "تلسی داس" موسوم کیا۔

مذہبی شاعر ہونے کے باوجود تلسی داس جی کے کلام میں تغزل کا عنصر بہت زیادہ ہے، آپ معاملہ بندی و جذبات نگاری میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

یوں تو صاحب موصوف نے چھوٹی بڑی چھبیس کتابیں تصنیف کیں، لیکن چونکہ آپ رام چندر جی کے بھگت تھے، اس واسطے بڑ چھندوں میں رام بھگتی کا رنگ دکھانے پر قناعت نہ کر کے بالخصوص پانچ رامائنیں لکھیں۔

(۱) سنگیت رامائن یا گیتاولی۔ (پدوں میں)

(۲) بروے رامائن۔ (بروے)

(۳) رام ولنود۔ (مختلف چھند)

(۴) رام چرتر مانس رامائن۔ (چوپائی)

(۵) کنڈلیا رامائن۔ (کنڈلیوں میں)

ان تمام میں گوسائیں جی کی تصنیف رام چرتر مانس رامائن کو جو مقبولیت حاصل ہوئی، عقیدت مند سناتنی اس کا پاٹھ (تلاوت) عبادت کے طور پر کرتے ہیں۔ اہلِ فن کو اس کی مضامین خیزی سے استفادہ ہو رہا ہے، علم دوست طبقہ نے بلا لحاظ مذہب و ملت اس کو عجوبۂ روزگار تصنیف مانا۔ سنسکرت، بنگلہ، گجراتی، اڑیا، ہندی، اردو اور کھڑی بولی میں رام چرتر مانس رامائن کے چربے اتارے گئے۔ المختصر اس تصنیف کی بنا پر گوسائیں جی کو وہ قابل رشک ہر دلعزیزی حاصل ہوئی جس کا جواب نہیں۔

رام چرتر رامائن کی ایک چوپائی ملاحظہ فرمایئے!

بن باس کو روانہ ہونے کے بعد اثنائے راہ میں ایک جگہ رام چندر جی نے قیام فرمایا، تو کیا ہوا؟ اس وقت مخلوق کی یہ حالت تھی سہ

ایک کلس بھر آدیں پانی،

اپنچے ناتھ! کہیں مردبانی

ایک پانی کا کلس بھر کر لائے۔ اور نہایت شیریں زبان سے عرض پرداز ہوئے، مہاراج! نوش جان فرمایئے!!

سن پربھ بچن پریت اَت دیکھی

رام کرپال سشیل بسیکھی

میٹھی باتیں سنیں اور بےحد محبت دیکھی۔ تو مہربان رام مسرور ہوئے۔

جانی سرمت سیہ من ماہیں

گھڑی بلمب کین بٹ چھائیں

ادھر سیتا جی کو تھکا ہوا سمجھ کر ایک ساعت کے لیے برگد کی چھاؤں میں ٹھہر گئے۔

برن نہ جائے منوہر جوڑی

سبھا بہت مورمت تھوڑی

اس من موہنی جوڑی کی خوبصورتی بیان کرتے نہیں بنتی محاسن بہت ہیں اور میری سمجھ نہ کچھ ہے۔

رام لکھن سیہ سندرتائی — سب جتو ہیں چت من مت لائی

رام لچھمن اور سیتا جی کا حسن و جمال۔ سب (گاؤں والے) ہوش و حواس گم کر کر کے دیکھ رہے تھے۔

- - - - - - - - - -

ادھر یہ معاملہ گذرا، اُدھر کیا کیفیت تھی ؎

سیہ سیپ گرام نیہے جب آئیں
پوچھت اَت سنیہ سکچائیں

گاؤں کی عورتیں حاضر خدمت ہوکر استفسار حال کرتے شش و پنج میں مبتلا تھیں، کہنے لگیں ؎

راجکماری! بنتے ہم کرہیں
تیئے سبھاؤ کچھو پوچھت ڈرہیں

راجکماری! ہم کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن زنانہ فطرت کے مطابق کہتے ہی ڈرتا ہے۔

راج کنور دو ؤ سہج سلونے
ان تین لہی دُت کرکت سونے

بیساختگی و ملاحت کے مجسمے یہ دونوں شہزادے جن سے نیلم اور سونے کو خوبی حاصل ہوئی ہے۔

کوٹ منوج لجاون ہارے
سومکھ کہو کو آہیہ تمہارے؟

کروروں کام دیوں (جوش شباب) کو شرمندہ کرنیوالے۔ اے پیارے پیارے مکھڑے والی ذرا بتاؤ، تمہارے کون ہیں؟۔

سُن سنیہہ من منجل بانی
سکچ سیہ من میں مُسکیانی

اُنکی محبت بھری صاف بات سیدھے سبھاؤ سُنی۔ تو سیتا جی شرماکر دل ہی دل میں مُسکرائیں۔

سکچ سپریم بال مرگ نینی
بول مدھر بچن پک بینی

محبت سے شرماکر ہرنی کے بچوں جیسی آنکھوں والی (سیتا) نے پپیہے کی سی آواز میں کہا۔

سہج سبھاؤ سبھگ تن گورے
نام لکھن لگھو دیور مورے

سادہ لوح گورے گورے بدن والے لکشمن ہیں۔ میرے چھوٹے دیور ہے۔

بہر بدن بدھ آنچل ڈھانکی
پیئے تن چتے بھوں کر بانکی

پھر نہایت سلیقے سے اپنی چاند سی صورت آنچل سے ڈھانکی۔ اور بھوئیں بانکی کرکے ذرا کن انکھیوں سے دیکھا۔

کھنجن منجھ تر یچھے نین
نج پت کہیو تنہ تیئے سین

پھر دھوبن چڑیا کی سی آنکھوں سے ترچھی نظر ڈال کر، اپنے سرتاج کو لطیف کنایہ میں ظاہر کیا۔

- - - - - - - - - -

کس احترام و تہذیب سے ہندی معاشرت اور زنانہ فطرت کے مطابق کیسا لطیف منظر کھینچ دیا، یہ کمال ہندی میں سوائے تلسی داس جی کے دوسرے کو کہاں نصیب۔

اقتباس

(بہاری ست سئی)

کوی ور چوبے بہاری لال جی میرے ہم وطن یعنی گوالیاری تھے گو میری طرح وطن کا آب و دانہ اُن کی تقدیر میں بھی نہ تھا، تھراپیں شادی ہوئی سسرال چلے گئے، پھر قدر شناس مہاراجہ جے سنگ والی جے پور نے اپنے پاس بلالیا۔ اسی آنگ وو میں زندگی کے ساٹھ سال تمام ہوئے چوبے جی کے کلام میں، گوالیار، بندھیلکھنڈ، عربی، فارسی وغیرہ زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں، اپنے رنگ میں صاحب طرز تھے، دوہے

میں تغزل پیدا کیا ہے، بلند پروازی، جذبات نگاری، وسعت معنوی، رعایات، استعارات اور محاکات میں ثانی نہیں رکھتے۔

یہ وجوہ ہیں کہ زندگی میں مقبول انام ہے، اور آج ان کی "ست سئی" پر پنگل (سنسکرت عروض) کے مطابق النکار اور نائکہ بھید لگا لگا کر شارحین[1] لوگوں سے اپنی قابلیت کا لوہا منوا رہے ہیں۔

چاہ بھری، ات رس بھری، برہ بھری سب بات

کور سندیسے دو ہن کے، چلے پور لوں جات

محبت میں ڈوبے، پُر کیف، اور درد فراق سے لبریز، کروروں پیغامات دونوں (طالب و مطلوب) کی ڈیوڑھی تک چلے جاتے ہیں۔

بھوشن بھار سنبھار ہی، کیوں وہ تن سکھمار

سُودھے پگ نہ دھر پرپ سوبھا ہی کے بھار

زیورات کا بار وہ نازنین بھلا کیا سنبھال سکے گا۔ اُسکے پاؤں تو مارے نزاکت کے سیدھے نہیں پڑتے۔

تیئے اکیت کینتی پڑھی، درگ سر بھونہہ کمان

چل چت بیدھو چُکت نہیں، بنک بلوکن بان

محبوبہ! تونے یہ تیر اندازی کس سے سیکھی، کہ بھوؤں کی کمان سے خدنگ منظر چھوڑ کر، دلِ مضطر جیسے متحرک نشانہ کو چھید نے میں نہیں چُوکتی۔ حالانکہ دیکھنے میں تیر بھی ترچھا ہے۔

جب جب اُوہ سُدھ کیجیے، تب سب ہی سُدھ جا ئیں

آنکھ آنکھ لاگی رہیں، آنکھ ہو لاگت ناہیں

جب جب اُس کا خیال کیجئے، سب کچھ فراموش ہو جاتا ہے، وہ آنکھیں ہر وقت آنکھوں میں سمائی رہتی ہیں، آنکھ نہیں لگتی۔

اچھونہ آئے سہج رنگ برہ دُو بَرے گات

اَب ہی کہا چلا سے للن چلن کی بات

پیاسے! ہنوز ہجر کا گھلا ہوا بدن بحالی پر نہیں آیا۔ اسے لالہ ابھی سے جانے کا ذکر کیوں چھیڑتے ہو!۔

بام بانہہ پھر کت ملیں، جو پت جیون مُو ر

تو تو ہی سوں بھینٹ ہوں، راکھ داہنی دُور

بائیں بازو! جو تیرے پھڑکنے سے زندگی کا سہارا میرے سرتاج آملیں تو سیدھا بازو دُور رکھ کر تجھ ہی کو اُن سے چھوا دُنگی!!

ان دُکھیا انکھیاں کوں سکھ سرجو ہی ناہیں،

دیکھت بنے نہ دیکھتے، بن دیکھے اکولا ئیں،

ان دکھیا آنکھوں کے نصیبوں میں سکھ ہے ہی نہیں۔ دیکھوں تو دیکھے نہیں بنتی، اور نہ دیکھوں تو کمبخت بیچین ہوئی جاتی ہیں

. . . .

بس یوں ہی چلے جائیے سات سو دوہوں تک میدان بدلتے جائیں گے، اور تخیل ختم نہ ہوگا۔ بھی کیا کہوں بہاری لال بھی عجیب انسان تھے اہل دل پہ نہا ہی ڈال کر چلتے ہوئے

بھجن

(شریمتی میرا بائی جی۔)

بسو میرے نین میں نندلال

موہنی مورت ساونری صورت، نیناں بنے بشال

بسو میرے نین . . . .

اَدَھر سُدھا رَس مُرلی راجت، اُر بیجنتی مال

بسو میرے نین . . . .

کھشو در گھنٹکا کٹ تٹ سو بھت، نُپُر شبد رسال

بسو میرے نین . . . .

میرا پربھو سنتن سکھدائی، بھگت بچھل گوپال

بسو میرے نین میں نندلال

. . . .

---

[1] ۔ تین سو شرحیں لکھی جا چکی ہیں۔

میری آنکھوں میں نند کا لال (کرشن) بسا ہوا ہے۔

دلفریب مکھڑا سانولی سلونی صورت، پُرعظمت آنکھیں

میری آنکھوں میں . . . .

لبوں میں آبِ حیات، سر پر بانسری کی زیبائش گلے میں جگمگاتا ہار،

میری آنکھوں میں . . . .

کردھونی میں ننھے ننھے گھنگھرو، پیروں میں پیجن ہیں۔

میری آنکھوں میں . . . .

میرا عقیدتمندوں کو راحت پہونچانیوالے ہیں، عاشقوں کے محافظ کرشن گوپال!

میری آنکھوں میں نند کا لال (کرشن) بسا ہوا ہے

گویا شکِ مسرت کے طوفان میں ساری کائنات بہی جا رہی ہے آہ الفاظ نہیں ملتے ترجمے میں اصل چیز کا اثر کہاں سے لاؤں۔

رحمن دوہاولی

(ارشادات خانخاناں)

شہنشاہِ اکبر کے نورتن نواب میرزا خان عبدالرحیم خاں خانخاناں ایک اولوالعزم سپہ سالار یا وزیر باتدبیر ہی نہیں، عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت اور ہندی وغیرہ کے فاضل اجل، نہایت علم دوست، بڑے خوش مذاق سخن فہم، اور قادر الکلام شاعر بھی تھے۔

خانخاناں موصوف نے کچھ عجیب ہمہ گیر طبیعت پائی تھی کہ خوں ریز معرکوں میں زندگی گذارنے کے باوجود مختلف زبانوں میں کتنی ہی نظم و نثر تصانیف چھوڑیں جن سے ہمیں گوناگوں اسباق ملتے ہیں۔

ہندی میں آپ رحیم اور رحمن تخلص کرتے تھے۔ کبت، سورٹھا، سوتیا، منجھ، بردے، دوہا وغیرہ پر آپ کو قدرت حاصل تھی، کتنا کمال ہے کہ ایک ترک امیر بھاشا پر اس درجہ قادر ہو سکا کہ اہل زبان نے دُھر ندر مان لیا اور آج تک سرراہ رہے ہیں۔

یوں رحیم جس ہوت ہے اپکاری کے رنگ
بانٹن بارے سوں لگے، جیوں مہندی کو رنگ

رحیم اس طرح استفادہ ہوتا ہے فیض مآب ہستیوں سے جیسے اپنے پیسنے والے کو مہندی رنگ دیتی ہے۔

رحمن، پر گھر جان میں، کہ نہ ہے پچھتات
سمپت کے سب جات ہیں، بپت سبھے لیجات

رحمن، پرائے گھر جاکر کون نہیں پچھتاتا۔ (مگر کیا کیا جائے) دولت کے پاس جانا ہی پڑتا ہے مصیبت زدہ، اہلِ حاجت وہاں پہونچتے ہیں

دیکھ رحیم بڑین کوں، لگھو نہ دیجئے ڈار
جہاں کام آوے سوی، کہا کرے تلوار

رحیم! بڑی چیز دیکھکر چھوٹی کو نظر انداز نہ کر دینا چاہئے۔ کیونکہ جہاں سوئی کی ضرورت ہے وہاں تلوار کا کیا کام۔

رحمن جیوری پریم کی مت تورو جھٹکائے
ٹوٹے پا چھے جرے نہیں، جرے گانٹھ پڑ جائے

رحمن! محبت کی رسی کو جھٹکا دے کر نہ توڑ۔ ٹوٹنے پر یہ نہیں جڑتی اور جُڑے بھی تو گانٹھ پڑ جاتی ہے۔

جیسی پرے سو سہہ رہو، کہو رحیم یہ دیہہ
دھرتی ہی پے پرت ہیں سیت، گھام او مینہہ

اے رحیم اس تن پر جو پڑے سہار۔ سردی، گرمی اور بارش آخر زمین پر ہی تو اثر انداز ہوا کرتے ہیں۔

کام کچھو آوے نہیں، مول نہ کوؤ لے
باجو ٹوٹے باج کو، صاحب چارو دے

نہ جو کچھ کام آئے، اور نہ جس کا کوئی خریدار۔ ایسے بازو ٹوٹے باز کو مالک رزق پہونچاتا ہے۔

اب رحیم مشکل پڑی گاڑھے دوؤ کام

سانچے میں تو جگ نہیں جھوٹے ملیں نہ رام

رحیم! ۔ سیڑھی اُڑی، دونوں معاملے بڑے ہوتے ہیں یعنی راستی اختیار کیجئے تو دنیا ہاتھ سے جاتی ہے، اور جھوٹ میں خدا نہیں ملتا۔

کاگج تھورا بہت گھنو، کیسے لکھوں بنائے
ساگر یا جل بہت ہے گاگر میں نہ سمائے

کاغذ تھوڑا داستانِ اُلفت طویل اب کیونکر لکھوں۔ سمندر میں بہت پانی ہے گھڑے میں نہیں سماتا۔

جن رحیم تن من دیا کیو ہیئے بیچ بھون
تن سوں دُکھ سکھ کہن کی رہی تھا اب کون

رحیم جنہوں نے تن من سب کچھ دیا پھر دل بیچ میں جگہ کی کیا ان کو بھی اپنا دکھڑا رونے کی مصیبت باقی رہ گئی؟

- - - - - - - - - -

بقول غالب ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کیوں جناب! خانخاناں کے دوہے اس شعر کے مصداق ہیں کہ نہیں، بھلا اس سے زیادہ اور کیا کامیابی ہوگی۔

صبح عروسی

(کوی پدماکر)

آرت سوں آرت نہ کہیں پٹ گجب گجارت گر بین کی دھار پر
کہیں پد کنگن سم ہائے کہیں بتھر براجے کہیں ہیرن کے ہار پر
چھر چھبیلی اٹھ چھر چھر کے چھور کھور اُٹھ آئی کیل مندر کے دوار پر
ایک پگ بھیتر سو ایک دیہری پے دھرو، ایک کر کنج ایک کر ہے کوار پر

. . . .

مسکین سے مسکین بھی نہیں سنبھل سکتا غریبوں کے حال پر غضب ڈھاتی ہے۔ پدماکر کہتے ہیں، سر سے پاؤں تک خوشبو میں شرابور، اس سج دھج سے کہ بال ہیروں کے ہار پر بکھر گئے ہیں۔ سورج کی کرنیں پھوٹتے پھوٹتے وہ شوخ و شنگ دامن چھڑا کر عشرت کدہ کے دروازے پر آکھڑی ہوئی۔ اس انداز سے، ایک قدم اندر، ایک دہلیز پر، ایک ہاتھ میں کنول کا پھول، دوسرا کواڑ پر رکھا ہوا

- - - - - - - - - - - -

اور کیا غریبوں پر غضب تو ڈھایا ہی جائیگا، جب یہ ٹھاٹ ہو، لیکن بیان کرنے والے کی اُستادی میں کسر نہیں۔ تخیل کا مجسمہ دکھا دیا، جی چاہتا ہے ہاتھ سے چھو لو۔

بات میں بات نکلی چلی آتی ہے، اور میرا دل سیر نہیں ہوتا، ممکن ہے دوسرے صاحبان اُکتا جائیں، اس واسطے لگے ہاتھ اپنے مکرم راول پال سنگھ صاحب چترکار (گوالیاری) کے چند تازہ دوہے اور پیش کردوں تاکہ تسلی ہو کہ اب بھی ملک اہل کمال سے خالی نہیں۔

پاس وضع

(موہن کوی)

دیبو کہا دبیں مال کو موہن، لیبو کہا جب دین ہووے مانگبو
پران گئے رس پیبو کہا اگ چھبیو کہا، جب پریم نہ پاگیو
نار کہا کل کان تجی، گر کیبو کہا، جب بھیم نہ بھاگیو
جا جگ میں پھر جیبو کہا، جب لوگ انگوری لے سارن لاگیو

- - - - - - - - - - - -

اے موہن! دباؤ کی داد و دہش کیا، کسی سے کیا لینا جب منہ در سے مانگنا پڑے، جان گنوا کر حظ حاصل ہوا تو کس کام کا، بغیر محبت و عقیدت کے قدم چھونے سے کیا فائدہ۔ وہ عورت کیا جس نے خاندان کی عزت کو بٹا لگایا، مرید ہونا فضول ہے

جب وہم دور نہ ہو۔

اس دنیا میں جینا بے کار ہے، جب لوگ باگ انگشت نمائی کرنے لگیں۔

. . . .

موہن کوی بندھیلکھنڈی زبان کے شاعر ہیں، انکا چھنا بھی کلام نظر سے گذرا بہت خوب ہے۔ مجھے تو پنڈت جی بڑے نفیس مزاج اور نہایت اچھے طرز طریق کے لوگ معلوم ہوتے۔

گن گیتا

(راؤ صاحب کے دوہے)

آپ سنجوے سموتے سو، ٹھور ٹھور درساتے
جانے ان جانو ہو آپ ہی آپ سماتے

خود روشن ہوا (کائنات میں) گھل مل گیا، جا بجا منظر آیا (بکھر بھی) جانتے ہوئے وہ ان جانا رہا، آپ ہی آپ میں سمایا ہوا۔

کھیوٹ دیٹھ نہ آوھی، نین ناو رے مور
اچھرت، ڈوبت، ڈگمگت، پریم سندھ برجور

ناخدا منظر نہیں آتا میری آنکھوں کی کشتیوں کو۔ اچھلتی ہیں ڈوبتی ہیں، محبت کے طوفان خیز سمندر میں۔

گرد بہونی ہے اَل بَل اکاس بکاس
مدت کمودن سر سرن سیتل سُر بھ بلاس

بغیر گرد وغبار کی زمین، صاف شفاف آسمان کھلا ہوا کھل رہی ہے کمودنی[1] تال تلیوں میں فرحت بخش ہوا کا دور دورہ ہے۔

یا برہاں اُس بن کھان پان کہہ بھاگ
چرن ادوک بہت ہو نہ جل درگ بجوگ کی آگ

آہ اس وقت بستر پوشاک اور کھانے پینے کی تواضع تو قسمت میں کہاں۔ قدم دھلانے کو آنسو بھی نہ رہے، آتش فراق میں جل گئے۔

پردیسی کو نام سو بسرو جی اکلات
سو نہ سُرت لکھ یا وہی کھوج کھوج تھک جات

(اس) پردیسی کا نام جو فراموش ہوگیا۔ تو یاد کو نہیں ملتا ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک رہی۔

انور اگے لاگے اری! دکھ پاگے بے چین
نین اَبھاگے، بپتے برہ، جاگت پل لاگے ن

عشق کا روگ لگ جانے سے آہ سہیلی! درد مند بےچین ہوں۔ بدنصیب آنکھیں محبوب کے فراق میں جاگتی ہیں، پلک سے پلک نہیں لگتی۔

من جانی اپنی کھری، جن جانی سو تو ن
سانچی سانچے ہو نہ سو، میری میری کون

دل نے اپنی چیز ٹھیک سمجھی، مگر لوگوں کو نہ جچی۔ اس صورت میں سچ تو یہ ہے کہ ٹھیک ہونے پر بھی (وہ) کچھ نہیں۔

. . . .

راؤ صاحب نے اسی پایہ کے صدہا دوہے کہے ہیں، جنکی میں نے اردو میں تشریح کی ہے، اور اسکے اکثر اجزاء مختلف اخبارات و رسائل کے ذریعے سے شائع کر چکا ہوں، موجودہ ماحول پر نظر ڈال کر فیصلہ کیجئے، کیوں میرے دوست کی ذات کہاں تک مغتنم ہے!؟

. . . .

فی الحال "بھاشا سمن" کی یہ مختصر سی ڈالی نذر گذران کر معافی چاہتا ہوں، بشرط زندگی، ہوئی موج فقیر کی تو آئندہ دیکھا جائیگا

...... خدا حافظ!۔

میرزا فہیم چغتائی

[1] پانی کی ایک بیل۔

مرزا قربان علی بیگ خاں کے چند ملفوظات

خانصاحب اللہ بخشے بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ پچھلے سال گرمیوں میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ کوئی کہتا ہے کہ لُو لگی، کوئی گردن توڑ بخار بتاتا ہے، بہرحال ہوا یہ کہ تین دن میں چٹ پٹ ہو گئے۔ بڑے زندہ دل آدمی تھے، ہر وقت ہنستے ہنساتے رہتے تھے، ہمیشہ بے پر کی اُڑاتے تھے۔ بس آپ اُن کی ہر بات پر صاد کرتے جایئے تو خوش ہیں اور جو ذرا سی بھی مخالفت کی تو پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتے تھے۔ پھر وہ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ کوئی بُرا ماننے والا ہے، بچہ ہے یا بڑا ہے، امیر ہے یا غریب ہے۔ جان کو آجاتے تھے۔ مجھ پر ذرا مہربان تھے وہ اس لئے کہ میں بہت سمجھ کر اُن کا ایک آدھ کام کر دیا کرتا تھا۔ کوئی خط آیا تو پڑھ دیا یا کچھ لکھ لکھا دیا۔ لکھنا پڑھنا وہ بھی جانتے تھے مگر جب سے اُن کی آنکھوں میں پانی اتر آیا اور انھیں بنوائیں تو ایک تو خراب ہی ہو گئی دوسری سے بھی ذرا کم دکھائی دینے لگا۔ بس جب کبھی انہیں کچھ لکھنے لکھانے کی ضرورت ہوتی کسی بچے کو بھیج دیتے کہ جاؤ میاں عباس کو بلا لاؤ۔ میں جاتا تو پہلے تو ذرا گرم ہوتے، "شکل ہی نہیں دکھاتے۔" "آن ہی کے نہیں پھرتے۔" پھر خود ہی مسکرا کر کہتے "آؤ آؤ بھئی بیٹھو بیٹھو۔"

اب یہ باتیں لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ خانصاحب مرحوم کی جو باتیں لکھ رہا ہوں بہت سے لوگ خیال کرینگے کہ من گھڑت ہیں۔ لیکن خانصاحب کی طرح کے لوگ ہوتے ضرور ہیں اور اب بھی ہوں گے تو جن صاحبوں کو ایسے لوگوں سے واسطہ پڑا ہے وہ ضرور یقین کر لیں گے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ جو لکھ رہا ہوں انہی کے منہ کے نکلے ہوئے الفاظ ہیں مگر اتنا ضرور کہتا ہوں کہ باتیں ساری کی ساری اُن ہی کی ہیں۔ میں فقط الفاظ کا جامہ پہنا رہا ہوں۔

خاں صاحب سے میری ملاقات ۱۹۲۰ء میں ہوئی تھی۔ میرے ایک دوست اُن کی بہت تعریفیں کیا کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ اس قدر زندہ دل آدمی ہیں کہ روتوں کو ہنسا دیتے ہیں۔ بیچارے اچھے خاصے خوش حال آدمی تھے جوانی میں بہت سی جائداد تباہ کر دی، اب صرف تین مکان رہ گئے ہیں۔ ایک میں خود رہتے ہیں۔ دو کرائے پر دے رکھے ہیں۔ بیس پچیس روپے کرائے کے آجاتے ہیں۔ اسی میں گذارا کرتے ہیں۔ اولاد کوئی ہے نہیں دو بڈھے بڑھیا ہیں۔ افیم کی لت ہمیشہ سے ہے۔ پانچ روپے مہینہ اس پر خرچ ہوتا ہے، باقی میں گذارا کرتے ہیں۔

خاں صاحب مجھ پر خاص طور سے مہربان تھے۔ پیار سے "باسی میاں" کہتے تھے اور میں سمجھتا ہوں میرا لحاظ بھی بہت کرتے تھے۔ اکثر قاضی جی کہہ کر بات کرتے تھے مگر پھر بھی میں اُن کی نظریں دیکھتا رہتا تھا کہ کہیں بگڑ گئے تو سنبھالے نہیں سنبھلیں گے۔ ایک دن میں نے انہیں بہت ہی خوش اور بشاش دیکھ کر کہا۔

"خانصاحب! کئی دن سے ایک بات پوچھنے کا ارادہ کر رہا ہوں مگر ڈر لگتا ہے!"

"کاٹ کھاؤں گا نہ" خانصاحب نے بغیر دانتوں کا غار نما منہ کھول کر قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"میں تو جناب کو انسان سمجھتا ہوں" میں نے عاجزی سے کہا۔

"آدمی کہو آدمی۔ انسان اس دُنیا میں بہت کم ہیں" خانصاحب نے فلاسفر کی طرح پیشانی پر شکنیں ڈال کر کہا۔

"اُن کم ہی انسانوں میں سے آپ کو ایک سمجھتا ہوں" میں نے یقین دلانے کے طور پر لفظ "ایک" پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"میاں بس بناؤ نہیں۔ بات کہو بات" خانصاحب نے فیصلہ کُن طریق پر کہا۔

"آپ کا اسم مبارک مرزا قربان علی بیگ خاں ہے" میں نے آہستہ سے کہا۔

"اس میں دریافت طلب کیا بات ہے سب ہی جانتے ہیں" خانصاحب نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ مرزا ہیں یا خان یعنی آپ مغل ہیں یا پٹھان؟" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"تمہاری سمجھ پر تو پتھر پڑ گئے ہیں۔ اتنے عرصے سے ہمیں دیکھ رہے ہو۔ آخر کیا اندازہ لگایا۔ تمہاری نظروں میں ہم مرزا جچتے ہیں یا خان؟" خانصاحب

نے تن کر کہا۔ [illegible] عمر میں آ گیا۔

"ایمان کی بات تو یہ ہے کہ آپ پورے خان جچتے ہیں" میں نے اپنی آنکھوں میں تعریف کی چمک پیدا کرکے کہا۔

"تو پھر تم خان کیوں [illegible] کا فکر کرو" خانصاحب نے ہنسکر کہا۔

"بیشک بیشک، خان تو آپ ہیں ہی، مگر اک ذراسی بات یہ ہے کہ آپ کے نام کے الفاظ مرزا اور بیگ چغلی کھاتے ہیں" میں نے بھی ہنسکر جواب دیا۔

"اچھا، یہ بات ہے۔ آپ کو بھی ان [illegible] سے مغالطہ ہوا" خانصاحب نے گردن ہلاکر کہا۔

"جی ہاں" میں نے [illegible] دیتے ہوئے کہا۔

"میاں سنو! یہ [illegible] الفاظ [illegible] اور سید بھی۔ سادی مثال تو میں یہ دیتا ہوں کہ مسلمانوں میں سب سے زیادہ تعظیم کا لفظ "خان" ہے تم کہو گے کہ سید سب سے زیادہ قابل عزت [illegible] معاملات اور واقعات سے تم اپنی بات کو وزنی نہیں بنا سکتے۔ تم روزمرہ دیکھ رہے ہو کہ مغل ہے تو شیخ ہے تو اور سید ہے تو، جسے پٹھان بننے پر ادھار کھائے بیٹھا ہے، پٹھان ہی بننے کی فکر میں دن رات غلطاں پیچاں ہے۔ اسی کیلئے لوگوں کی خوشامد درآمد کرکے اور ہزاروں روپے خرچ کرکے میونسپل کمشنر بنتا ہے۔ پھر ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی کے تاوے کاٹتا ہے۔ دعوتیں دیتا ہے۔ سوغاتیں پہونچاتا ہے آخر کار خانصاحب بن جاتا ہے۔ [illegible] نہیں کرتا بلکہ "خان بہادر" بن کر رہتا ہے۔ اور ہم سے جو پوچھو تو بھائی بہادر تو کیا وہ تو نرا خان بھی نہیں بنتا۔ یاد رکھو خان ہمیشہ پیدائشی ہوتا ہے کوئی بننے بنانے سے نہیں بنا کرتا۔ جس میں بہادری نہ ہو، جس میں غصہ نہ ہو، جس کے بدن میں خون جوش نہ مارتا ہو، جس کا خواہ مخواہ لڑنے کو دل نہ چاہے، جو ذرا ذراسی بات پر الجھ نہ پڑے، جو ہر وقت ماش کے آٹے کی طرح اینٹھتا نہ رہتا ہو، وہ خان نہیں خان کی کاغذی تصویر ہے۔ اور ناموں کا کیا ہے جو ماں باپ نے رکھ دئے بس وہی عمر بھر کے لئے ہو گئے۔ نام فقط پہچان کے لئے ہوا کرتے ہیں کہ سمجھنے سمجھانے میں آسانی ہو ورنہ آدمی افعال سے، عادات سے پہچانا جاتا ہے۔ تم ہی ایمان سے کہو، سیدوں کو شراب پیتے نہیں دیکھا؟ عیاشی کرتے نہیں دیکھا؟ [illegible] گرم کرتے ہیں اور پھر سید کے سید۔ تو ایسے سیدوں کو تم سردار کہو تو کہو ہم تو سرے سے انہیں مسلمان ہی نہیں سمجھتے۔

اب تمہاری بات کا جواب دیتا ہوں۔ ماں باپ نے میرا قربان علی بیگ نام رکھا۔ ہم نے اپنی طبیعت کو دیکھکر اور اندازہ لگا کر "خان" اور بڑھا دیا۔ ہم پٹھان وٹھان تو جانتے نہیں، اتنا ضرور جانتے ہیں کہ ہم خان ہیں بلکہ خان بہادر ہیں۔ روپیہ خرچ کرتے تو سرکاری خان بہادر بن جاتے مگر نقلی۔ اب غیر سرکاری ہیں مگر اصلی۔ ہمارے اس عمر میں بھی یہ دم خم ہیں کہ تم جیسے چار چھٹے بھی مقابلے پر آجائیں تو ہم دم بھر میں دھجیاں اڑا دیں" خانصاحب نے گرجتے ہوئے اپنی تقریر کو ختم کیا۔

اس گفتگو کے بعد چونکہ خاں صاحب کا پارہ ذرا تیز ہو گیا تھا میں نے زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ جانا اور اٹھکر چلا آیا۔ اب تک جو کچھ میں نے لکھا ہے اس سے آپ نے خانصاحب کو مرد معقول سمجھا ہوگا۔ خانصاحب کی یہ باتیں تھیں بھی خاصی وزنی مگر اب جو کچھ لکھتا ہوں اسے پڑھکر آپ میری رائے نہ طلب کیجئے گا جو کچھ آپ کا جی چاہے سمجھ لیجئے گا۔

حالاتِ حاضرہ پر خانصاحب کا تبصرہ

جنگِ عظیم شباب پر تھی۔ اخبار والوں کو اچھا خاصہ مشغلہ ہاتھ آ گیا تھا۔ روز نئی نئی خبریں چھپتی تھیں۔ رائیوٹر ایجنسی تو بے پر کی اڑانے میں مشہور تھی ہی مگر ہمارے خانصاحب اس سے بھی دو قدم آگے تھے۔ بیٹھک میں آٹھ دس نئی روشنی کے لوگ جمع ہیں، بیچ میں خانصاحب بیٹھے ہیں، سامنے حقہ رکھا ہے، ہاتھ میں افیم کی پیالی ہے، ایک طشتری میں ریوڑیاں رکھی ہیں، دو تین پوریاں گنّے کی بھی موجود ہیں، افیم گھولتے جاتے ہیں، ایک دو کش حقے کے لگائے، ایک چسکی افیم کی لی، دو تین ریوڑیاں منہ میں ڈالیں، گھلاتے جاتے ہیں، گنا چھیلتے جاتے ہیں۔ مزے مزے کی باتیں کر رہے ہیں، سب ہنس رہے ہیں، قہقہے لگا رہے ہیں، خانصاحب ہیں کہ نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ واقعات سنا رہے ہیں۔

"جانتے ہو یہ ایمڈن کون ہے؟" خانصاحب نے حقے کا کش لگاکر کہا۔

"شاید کوئی جہاز ہے جرمن کا" میرے دوست عبدالمجید صاحب نے جواب دیا۔

"جرمن کے چچازاد بھائی کا نام ہے۔ ایمڈن اُس نے ایک ویل مچھلی کو سدھا رکھا ہے۔"

"ویل مچھلی" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں ہاں ویل مچھلی۔ یہ مچھلی ساری مچھلیوں کی باوا آدم ہے، یا یوں کہو اماں حوا ہے۔ اُس کی نسل قطب شمالی میں بستی ہے۔ ایک دفعہ ایمڈن جہاز میں جا رہا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ ایک بہت بڑی مچھلی کا سر دو چٹانوں میں پھنسا ہوا ہے اور وہ تڑپ رہی ہے۔ بڑے زور زور سے دُم مار رہی ہے۔ پانی میں جھاگ ہی جھاگ ہو رہے ہیں۔ ایمڈن دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہ ویل مچھلی ہے۔ کیونکہ وہ اکثر قطب شمالی میں جایا کرتا تھا اور ویل مچھلیاں دیکھا کرتا تھا۔ اُس نے ان دونوں چٹانوں کو بارود سے اُڑا دیا۔ مچھلی نکل آئی اور اُس کے جہاز کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ ایمڈن نے پہلے تو سمجھا کہ جہاز کے ٹکر مارے گی مگر جب وہ منہ اونچا کر کر کے اُسے اس طرح دیکھتی جیسے کوئی شکریہ ادا کرتا ہے تو یہ سمجھ گیا اور جہاز روک کر کھڑا ہو گیا۔ مچھلی اُس کے پاس آن کر ٹھہر گئی اور منہ کھول کھول کر جھکانے اور اچھالنے لگی۔ بس یہ وہی مچھلی ہے جو ایمڈن کے اشارے پر چلتی ہے۔ دشمنوں کے جہازوں کو آناً فاناً میں تباہ کر دیتی ہے۔ گھنٹوں پانی میں غوطہ لگائے رہتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جرمن کی مدد اللہ ہی کر رہا ہے۔"

"یہ تو آپ نے خوب بات سنائی۔ اچھا تو یہ ایمڈن جہاز نہیں ہے؟" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"تم لوگ اخبار پڑھتے ہو جو کچھ غلط سلط لکھا ہوتا ہے اس پر یقین کر لیتے ہو۔ میں کوئی بات بغیر تحقیق کے منہ سے نہیں نکالتا۔ تمہارے پاس تعلیم ہے اور تھوڑی سی عقل بھی ہے مگر تجربہ خاک نہیں۔ اور ہو بھی کیسے؟ تم تو بچے ہو نادان۔ تمہارے کھیلنے کھانے کے دن تھے۔ ماں باپ نے مدرسے میں ٹھونس دیا۔ رہی سہی عقل بھی خاک میں مل گئی۔ میاں میرے، تجربہ ایسی چیز نہیں جو مدرسے میں سکھایا جائے۔ یہ تو ٹھوکریں کھا کر حاصل ہوتا ہے اور عمر کے ساتھ بڑھتا ہے۔" خانصاحب نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

"تو آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ ویل مچھلی ہے؟" میں نے بڑی مشکل سے ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے اپنے چہرے پر آثار حیرت پیدا کر کے کہا۔

"یہ راز کی باتیں ہیں" خانصاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور ایک چسکی افیم کی لی۔

"تو جرمن بہت طاقتور ہے؟" میرے دوست صلاح الدین نے پوچھا۔

"طاقتور! ارے اُس میں تو ساری دنیا کی طاقت سمٹ کر آ گئی ہے۔ اُس کے پاس وہ وہ چیزیں ہیں کہ تم سنو تو مارے حیرت کے تمہارا منہ پھٹا کا پھٹا رہ جائے۔ سنو! یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ آدمی اَن کا کیڑا ہے۔ بغیر کھائے نہیں رہ سکتا۔ اور یہ جو لاکھوں کی فوج اِدھر سے اُدھر جاتی ہے تو ان سارے آدمیوں کے کھانے پینے کا انتظام کچھ ہنسی ٹھٹھا ہے؟ سب سے بڑی دقت لڑائی میں رسد کے انتظام میں ہوتی ہے۔ دشمن ہمیشہ حریف کی رسد کا سلسلہ منقطع کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے کہ فوجیوں کو جب کھانا پانی ہی نہ ملے گا تو لڑیں گے کیا خاک۔ اس کے لئے چھکڑے گاڑیاں، بیل، خچر، اونٹ، اللہ جانے کس کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ جرمن نے یہ جھگڑا ہی مٹا دیا۔ فوج کے ہر آدمی کو ایک ایک چھوٹا سا بکس دے دیا ہے جس میں تین تین سو گولیاں ہیں سفید رنگ کی جیسی کونین کی گولیاں تم نے دیکھی ہوں گی۔ آدھ سیر پانی پتیلی میں ڈال کر گرم کر لیا اس میں ایک گولی ڈال دی۔ بس کوئی پندرہ منٹ میں دودھ نان پاؤ تیار ہے۔ وقت کی الگ بچت ہے۔ ایندھن کی الگ بچت ہے۔ نہ رسد بند ہونے کا خدشہ ہے نہ چھکڑے اور گاڑیوں کا جھگڑا۔ جس پیٹی میں کارتوس ہیں اسی میں یہ چھوٹا سا بکس بھی بندھا ہوا ہے اور لو ٹلی ٹلی فوج اڑی چلی جا رہی ہے۔ جب ہی تو کہتا ہوں جرمن سے کون جیت سکتا ہے اس کی تو اللہ مدد کر رہا ہے۔"

"یہ تو آپ نے بڑی عجیب بات سنائی" میں نے اظہار تعجب کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"عجیب باتیں ہم نہ سنائیں گے تو اور کون سنانے آئے گا۔ یہ راز کی باتیں ہیں۔ تمہیں کسی اخبار یا رسالے میں نہیں ملیں گی۔ ایڈیٹر لوگوں کی تو زبانیں بند کر دی گئی ہیں۔ وہ ایسی باتیں لکھیں تو اُن کی ہزاروں کی ضمانتیں ضبط ہو جائیں۔ اور ہم سے کون آنکھ ملا سکتا ہے۔ ہم تو خان ہیں مگر پھر بھی تم اپنے ہی تک رکھنا، خدا بُری گھڑی سے بچائے۔ اور سنو۔ ایک دن جرمن بنے شہر کے باہر پہاڑی پر بیٹھا تھا۔ ایک پادری صاحب بھی کہیں سے سیر کرتے کراتے وہاں آ نکلے اور اس سے پوچھنے لگے کہ "بادشاہ سلامت آپ یہاں کیسے بیٹھے ہیں؟" جرمن نے ہنس کر کہا "یوں ہی سیر کرنے چلا آیا تھا آپ

آپ کو ایک تماشہ دکھاؤں!" یہ کہکر اُس نے جیب میں سے ایک چھوٹا سا آئینہ اور ایک پنسل کے برابر کالی لکڑی نکالی۔ آئینے کو زمین پر رکھکر پادری صاحب سے کہا کہ "اس میں دیکھتے رہیئے" پھر پوچھا "کچھ نظر آیا؟" پادری صاحب نے کہا "کچھ نہیں۔ فقط اپنی شکل دکھائی دے رہی ہے" جرمن نے وہ کالی لکڑی آئینے پر پھرائی۔ اب اس میں دکھائی دیا کہ ایک پہاڑی ہے۔ اس پر زار روس بیٹھا اپنے کتے سے کھیل رہا ہے۔ جرمن نے پادری صاحب سے کہا "لو، دیکھو میں زار روس کے کتے کو مارتا ہوں۔" یہ کہکر اُس نے وہ کالی سی لکڑی کتے کی تصویر سے لگا دی۔ یا تو کتا اُچھل کود رہا تھا یا ایکدم سے گر پڑا اور مر گیا۔ جرمن نے پادری صاحب سے کہا کہ "اب تم شہر میں جا کر ٹیلیفون کر کے زار روس کا حال پوچھو۔"

پادری صاحب بھاگم بھاگ شہر میں گئے اور ٹیلیفون کیا تو معلوم ہوا کہ زار روس کا کتا کھیلتے کھیلتے ایک دم سے مر گیا۔ زار اُس کے غم میں پریشان ہے۔ پادری صاحب گھبرائے ہوئے پہاڑی پر آئے اور جرمن سے کہا کہ "کتا تو سچ مچ مر گیا۔ یہ تم نے کیا کیا؟" جرمن نے پھر جو آئینہ دکھایا تو دیکھتے کیا ہیں کہ زار روس اپنے محل میں سرنگوں بیٹھا ہے۔ اب جرمن نے پادری صاحب سے کہا کہ "کہو تو زار روس کے اوپر بھی لکڑی رکھدوں ابھی وہ بھی مرجائے گا۔" پادری صاحب نے منت سماجت کر کے جرمن کو روکا۔ "تو بھائی جس کے پاس ایسی ایسی چیزیں ہوں اس سے بھلا کوئی کیا لڑے گا۔ اُسکے تو جنات تابع ہیں جنات۔"

خانصاحب کی شاعری

"آپ کی رائے میں گذشتہ دور کے شعرا میں سب سے قابل کونسا شاعر تھا؟" میرے دوست اصغر نے خانصاحب سے پوچھا۔

خانصاحب بولے "تم نے ایک چھوٹا سا سوال کر کے میرے تخیلات میں ہیجان برپا کر دیا۔ خیر تم بھی کیا یاد کرو گے۔ لو آج میں بھی شاعری کے متعلق ایسے ایسے فلسفیانہ نکات بتاتا ہوں کہ تم جس مجلس میں جاؤ گے نام پاؤ گے۔ اب میری زندگی کا بھی کچھ بھروسہ نہیں۔ کیا جانے کب بلاوا آجائے۔ اس لئے جو کچھ کہوں اسے کان دھر کے سنو اور گرہ میں باندھ لو۔ سنو! تقابل کی غرض سے جب ہم شعرائے ماضی پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں صرف ایک دور ایسا نظر آتا ہے کہ جس میں اکھٹے چھ شعرا ایک ہی زمانے میں متفرق ممالک میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ اس زمانے کو مورخ لوگ سنہری زمانہ کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر زمانے میں چھوٹے چھوٹے شعرا بھی حشرات الارض کی طرح ہوا کرتے ہیں۔ ان سب سے قطع نظر کر کے اگر ہم صرف بڑے ہی بڑے شاعروں کو لیں جو اپنے اپنے ملکوں میں ممتاز تھے اور اُن کے کلام کو تنقیدی نگاہ سے دیکھیں اور شاعری کے اصولوں اور قواعد و ضوابط کی ترازو میں تولیں اور زبان و محاورے کی کسوٹی پر پرکھیں تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ کونسا شاعر ہر لحاظ سے سب میں ممتاز تھا۔ اٹھارہویں صدی میں یہ چھ شاعر مختلف ملکوں میں نامور مشہور اور ممتاز ہو گذرے ہیں۔ ہومر چین میں۔ شکسپیر اٹلی میں۔ فردوسی عرب میں۔ شکنتلا اور غالب اور میر تقی سودا ہندوستان میں۔"

"ہائیں! شکنتلا کو آپ شاعر فرماتے ہیں۔ وہ تو عورت تھی خانصاحب!" میں نے آنکھیں پھاڑ کر جلدی سے کہا۔

"تمہیں فغفور چین کی لڑکی کا خیال ہوگا۔ اس کا نام بھی شکنتلا تھا۔ میں اُس کا ذکر نہیں کر رہا۔ میں تو اُس شکنتلا کا ذکر کر رہا ہوں جو ہندوستان کا مایۂ ناز شاعر تھا۔ جس نے کالی داس کا ناٹک لکھکر اردو شاعری کو چار چاند لگائے۔ جس کے بار احسان سے اُردو زبان قیامت تک سبکدوش نہیں ہو سکتی۔" خانصاحب نے جھوم کر کہا۔

"خانصاحب! آپ کیا فرماتے ہیں شکنتلا شاعر اور کالیداس ناٹک؟ ہم نے تو یہ پڑھا ہے کہ......"

"مت بکواس کرو جی۔ تم کیا جانو شاعر کسے کہتے ہیں اور ناٹک کس جانور کا نام ہے۔ جامع المشاعر مطبوعہ نولکشور پریس کے صفحہ ۴۹ پر دیکھو۔ مجھے کتابیں حفظ یاد ہیں حفظ" خانصاحب نے تنکر مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا فرمایئے" میں نے اُنکے غصے سے ڈر کر کہا۔

"ہومر، شکسپیر اور فردوسی۔ ان تینوں کے ہاں گل و بلبل کی شاعری ہے۔ کہیں کہیں قدرتی مناظر کا بھی نقشہ موجود ہے۔ مگر اوّل تو ہمیں یہ موضوع کچھ پسند نہیں۔ دوسرے اُن کی زبان غیر تھی ہم اچھی طرح سمجھ بھی نہیں سکتے۔ بھلا آپ ہی فرمایئے فردوسی کی عربی۔ شکسپیر کی لاطینی اور ہومر کی چینی سے ہم کیونکر لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ مانا کہ یہ تینوں اپنے زمانے کے اُستاد تھے مگر ہمیں کیا۔ ہم نے

تو اس وقت سرسری طور سے ان کا ذکر بھی اس لئے کر دیا کہ جامع المشاعر میں انہیں استاد لکھا ہے۔ لہذا اب رہ گئے تین شاعر جو اپنے ہندوستان کے تھے۔ ان کا کلام اردو میں ہے۔ سبحان اللہ کیا بات ہے۔ صاف ستھری زبان، دلفریب محاورے، موزوں الفاظ، برجستہ مضمون، پاکیزہ ترکیبیں، مرصع بندشیں۔ جسے دیکھو اپنے رنگ میں نرالا ہے، مست کرنے والا ہے۔ اب ہمیں ان سب میں افضل دیکھنا ہے کہ کون بڑا اور ان اچھوں میں سے سب سے اچھا چن کر دکھانا ہے تو سنو۔ شکنتلا نے حیدر آباد سندھ سے لیکر راس کماری تک اپنا ڈنکا بجوایا تھا، تو غالب نے میرٹھ سے سری نگر تک۔ اور میر تقی سودا نے رائے بریلی سے مرشد آباد تک۔ یہ تینوں ہندوستان کی روح رواں تھے۔ ان کے اشعار سنکر چلتا پانی تھم جاتا تھا۔ یہ لوگ برسات میں اشعار پڑھتے تھے تو پرنالوں میں ماہی پشت کا جال بن کر جم جاتا تھا۔ انکے کلام میں جادو تھا۔ یہ لوگ سانڈوں کو لڑا دیتے تھے۔ مگر بھئی میں تو یہ کہونگا کہ غالب غالب ہی تھا۔ ہر لحاظ سے غالب تھا۔ یہی سرسید مرحوم نے بھی اپنی کتاب آثار الصنادید میں لکھا ہے۔ مگر تم یہ نہ سمجھنا کہ میں سرسید مرحوم کی رائے کی پابندی کر رہا ہوں۔ جامع المشاعر پڑھو گے تو تمہاری بھی یہی رائے ہوگی"۔

"خانصاحب! آج تو آپ نے فی الحقیقت ایسے ایسے نکات اور رموز شاعری بیان فرمائے ہیں کہ طبیعت خوش ہوگئی۔ اب جی چاہتا ہے کہ آپ کا اپنا بیش بہا کلام بھی سنکر دل کا سرور حاصل کریں"۔ میں نے منت سے کہا۔

"تم میرا کلام کیا خاک سمجھو گے۔ میری راہ سب سے جداگانہ ہے، اور پھر ایک کی ایک۔ ہر شخص کا یہی خیال ہے کہ خانصاحب کا کلام ہمارے حسب حال ہے مگر در اصل پلے کسی کے کچھ نہیں پڑتا۔ ارے بھائی ہم جیسے آدمی کوئی روز روز پیدا ہوتے ہیں۔ یہ بھی خدا جانے کیا اللہ میاں کے دل میں آگئی تھی جو سرسید۔ منشی ذکاء اللہ۔ ڈپٹی نذیر احمد۔ محسن الملک۔ وقار الملک اور ہم جیسے سب کے سب ایک ہی کھان میں بنا دئیے"۔ خانصاحب نے میری طرف دیکھکر بڑے فخر سے کہا۔

ہم جتنے آدمی وہاں تھے سب ایک دم سے ان کے سر ہوگئے تو آخر انہوں نے اپنا کلام بلاغت نظام یوں سنانا شروع کیا ؎

جدائی میں تیری خار غم کھانے کو ملتا ہے　　مسیحا خود ہی دیوانہ ہے جو دیوانوں سے ملتا ہے
جواں بختی و اقبال مندی ہے شہرت سے حاصل　　کہ تاریکی میں سایہ بھی انسانوں سے ملتا ہے
کاٹ دو یہ سب ذات پات کے بندھن　　کہ پہاڑی نالہ ہمیشہ آبشاروں سے ملتا ہے
سیہ بختی کب کسی کا ساتھ دیتی ہے　　کہ ہر ہر قدم پر آبلہ پا خاروں سے ملتا ہے
پڑگیا ہے اب کے وہ قحط الرجال لوگوں کا　　نہ اچھا دودھ نہ اچھا گھی کسانوں سے ملتا ہے
پھوٹ ایسی پڑی ہے ——— آپس میں　　نہ جام جاموں سے ملتا ہے نہ پیمانہ پیمانوں سے ملتا ہے
ہم بھی علما رہیں اپنے وقت کے مرقیش　　جو سمجھدار ہے وہ سمجھداروں سے ملتا ہے

ہم سب نے اس قدر تعریف کی کہ سارے گھر کو سر پر اٹھا لیا۔

"واللہ خانصاحب لطف آگیا۔ کمال کر دیا آپ نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ کچھ اور ارشاد فرمائیے"۔ ہم سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

"بس اب تم جاؤ بہت دیر ہوگئی۔ مولوی جوہینک آتے ہونگے"۔ خانصاحب نے جلدی سے کہا۔

"یہ مولوی جوہینک کون بزرگوار ہیں؟"۔ میں نے پوچھا۔

"ایک مولوی صاحب ہیں، بڈھے پھونس۔ ناک میں بولتے ہیں اور "وہ جو" ہیں کہ "انکا تکیہ کلام ہے۔" وہ جو" کو جلدی سے کہتے ہیں اور "ہیں کہ" کو کہتے ہیں کھینچکر "ہینک کے"۔ اس لئے ہم نے ان کا نام "مولوی جوہینک" رکھا ہے اچھا ذرا سی دیر ٹھہر جاؤ۔ تم بھی سن لینا۔ مگر ہنسنا نہیں۔ وہ ہیں ذرا ایسے ہی تنک مزاج سے"۔ خانصاحب نے ہنسکر کہا۔

تھوڑی دیر میں مولوی جوہینک بھی آگئے۔ باریک سریلی آواز میں بولتے تھے۔ ہمنے دو چار ہی دفعہ "وہ جو ہینک کے" سنا تھا کہ مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے اور جلدی سے منہ پر رومال رکھتے ہوئے وہاں سے بھاگے۔

قاضی عباس حسین دہلوی

تیرے بغیر

کچھ نہیں ہیں کچھ نہیں کون و مکاں تیرے بغیر ∴ نقشِ باطل ہیں یہ دونوں جہاں تیرے بغیر

اب شکستہ ہے طلسمِ رنگ و بوئے گلستاں ∴ دُھندلا دُھندلا ہے چراغِ آشیاں تیرے بغیر

رُوح میں گرمی نہیں ہے قلب میں سوزش نہیں ∴ منجمد انداز ہے خونِ رواں تیرے بغیر

شورشِ پیہم گئی آیا جمودِ مستقل ∴ اب محبت بن گئی خوابِ گراں تیرے بغیر

اب نہ نالے ہیں۔ نہ آہیں ہیں نہ ہے فریاد و شور ∴ نامُرادی ہے مُرادِ عاشقاں تیرے بغیر

چھیڑتا ہے گو مُسلسل آج تک مضرابِ عشق ∴ بے نوا و بے صدا ہے سازِ جاں تیرے بغیر

غنچہ غنچہ، پتہ پتہ، بے نمو، بے رنگ ہے ∴ حالِ گلشن یہ ہے جانِ گلستاں تیرے بغیر

لفظِ عشرت کی کوئی تشریح ہو سکتی نہیں ∴ نامکمل رہ گئی یہ داستاں تیرے بغیر

آمد و شُدِ نفس گو ہے مگر بے نظم ہے ∴ اب بھٹکتا پھر رہا ہے کارواں تیرے بغیر

سُننے والے طول کیوں قصہ کو دوں کیا فائدہ

الغرض بہزاد ہے بے خانماں تیرے بغیر

میرے بغیر

سحرِ عشق و عاشقی ہے بے نشاں میرے بغیر
ہے فسونِ حُسن بھی وہم وگماں میرے بغیر

اب کہاں گیسوئے مشکیں کی وہ عنبر بیزیاں
تلخ تر ہے وہ لبِ شکر فشاں میرے بغیر

اب کدھر ہے سرمگیں آنکھوں کا وہ اندازِ خاص
ہو گئی بے نور چشمِ گلرخاں میرے بغیر

میرے ہاتھوں ہو گئی ہے سرد پھر نبضِ جمال
حُسن کو ہے سانس بھی لینا گراں میرے بغیر

قلقلِ مینا بھی ہے، بادہ بھی ہے ساغر بھی ہے
پر کہاں وہ نعرہ ہائے میکشاں میرے بغیر

حُسن محکومِ محبت ہے سراسر دیکھ لو
بندہ پرور تم رہے ہو تم کہاں میرے بغیر

زحمتِ گریہ نہ دیجے اپنی چشمِ ناز کو
دل کو عادی کیجے اے مہرباں میرے بغیر

لذتِ خوابِ سُبک بھولا ہوا افسانہ ہے
دیکھتا ہے حُسن اب خوابِ گراں میرے بغیر

اب جہاں میں اک سکوتِ مستقل کا دور ہے
ہو گئی خاموش دُنیا کی زباں میرے بغیر

مجھکو اے بہزاد یہ ہے فخر فطرت کے خلاف
وہ دلِ نازک بنا قلبِ تپاں میرے بغیر

بہزاد لکھنوی

ایک ایکٹ کا ڈرامہ

ہمدردی

طنزیہ

دہلی۔ دسمبر سنہ ۳۵ء کی شب۔ آٹھ بجے کا وقت۔ سارا شہر بقعہ نور بنا ہوا ہے۔ چاندنی چوک میں میلا سا لگا ہے۔ دُلہن کی طرح سجی ہوئی دُکانیں، جن میں روشنی کا سیلاب برپا ہے۔ چلتی موٹروں کی آرجار، ہارن کی دہلا دینے والی چیخیں، تانگوں کی دوڑیں "ہٹو بچو" کا شور ہے کہ کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی ٹھیلوں کی گڑگڑاہٹ، ٹریم کار کی گرج اوسان کھوئے دیتی ہے۔ بائیسکوپوں پر دیوالی کا سا سماں ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں رنگ برنگ کے برقی قمقمے آنکھوں کو خیرہ کئے دیتے ہیں۔ چہل پہل۔ بھیڑ بھڑکا۔ پھیری والوں کی آوازیں۔ رنگ برنگ کے انسان۔ طرح طرح کے لباس پہنے۔ عورتیں بچے، مرد بوڑھے، جوان۔ امیر و غریب۔ جلدی جلدی آجا رہے ہیں۔ ہر شخص اپنی اپنی دُھن میں مگن ہے۔ اوروں کی طرف سے بے پروا۔ ساری دُنیا سے بے خبر۔ اپنے خیال میں مست چلا جا رہا ہے۔ کچھ لوگ خرید و فروخت میں مصروف ہیں۔ دُکانداروں اور گاہکوں کے درمیان حرص و آز، لوٹ کھسوٹ لے بھاگنے کا میچ پوری رفتار سے جاری ہے۔ ایک طرف زیادہ سے زیادہ رقم اینٹھنے کی چالبازیاں ہیں۔ دوسری طرف مفت ہی لے اُڑنے کی حسرت ہے۔ خود غرضی، مکاری اور ہٹ دھرمی کی گرم بازاری ہے۔ کچھ مصروف آدمی اوروں کو دھکا دیتے ہوئے بھاگ نکلنے کی جد و جہد کر رہے ہیں۔ بعض سیلانی رینگ رینگ کر چلنے میں چیونٹی کو مات کئے دیتے ہیں۔ ہٹے کٹے مسٹنڈے فقیروں کی خاص کمائی کا وقت ہے چچڑی کی طرح چمٹ جاتے ہیں کمبخت، اور ڈنڈے کے زور سے پیسہ وصول کر کے ہٹتے ہیں۔ غرض دہلی کے اس طلماتی بازار میں اسوقت وہ رونق ہے، وہ گھما گھمی ہے کہ بیان سے باہر۔ انسانی ترقی کی معراج ہے کہ اُس نے ایک ویران مقام کو اپنی زبردست فتوحات سے سُکھ اور آنند کی آماجگاہ بنا دیا ہے —

جدھر دیکھو روشنی۔ رنگ اور موسیقی کی موجیں تڑپ رہی ہیں۔ ہر چیز میں زندگی ہے، ہر شے میں چمک ہے۔ جوانی ہے، اُمنگ ہے، جوش ہے۔ ایک ٹریموے کار فوارے پر کوتوالی کے آگے رُکتی ہے۔ کچھ لوگ چڑھتے اُترتے ہیں۔ ایک پولیس افسر صاحب سفید براق لباس زیب تن کئے، موٹا سا ڈنڈا ہاتھ میں لئے۔ فرسٹ کلاس میں در آتے ہیں۔ کنڈکٹر غلطی سے اُن کو نہ پہچانتے ہوئے ٹکٹ کے لئے پیسے مانگتا ہے اور فوراً اچھی مقدار میں ڈانٹ دیا جاتا ہے۔ مسکین کنڈکٹر ہاتھ جوڑ کر سلام کرتا ہے۔ ٹریم عن عناتی ہوئی گھنٹہ گھر کی طرف روانہ ہوتی ہے۔ ٹن۔ ٹن۔ ٹنا ٹن۔ ٹنا ٹن ٹنا ٹن۔ ٹن ٹنا ٹن۔ ایک لڑکا دس بارہ برس کی عمر۔ موتی بازار سے پنکھے بیچتا ہوا نکلتا ہے۔ ایک تنومند بابوجی پنکھا خریدتے ہیں۔ قیمت پر کچھ حُجت ہوتی ہے۔ تنومند بابوجی کے پندار کو ٹھیس لگتی ہے۔ لڑکے کو زور سے دھکا دیتے ہیں۔ ٹریم کار گونجتی، گرجتی، گڑگڑاتی، برق رفتاری سے

چل آرہی ہے۔ ایک ڈراؤنی چیخ سُنائی دیتی ہے۔ زبردست دھماکا ہوتا ہے۔ ڈرائیور گلا پھاڑتا رہ جاتا ہے اور لڑکا ٹریم کے نیچے آہی جاتا ہے۔ ٹرین زبردست جھٹکے کے ساتھ رُکتی ہے۔ سوائے پولیس افسر صاحب کے سب اُتر پڑتے ہیں۔ بازاری رونق میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ چاروں طرف سے آدمی جمع ہوتے جاتے ہیں)۔

ایک ننگے سر والا ہندو نوجوان:۔ کیا ہوا۔ کیا ہوا؟؟ ارے! آدمی، ٹریم کے نیچے۔!!

ایک ہندو سوداگر:۔ ارے!! ہے رام رام — لڑکا ٹریم کے نیچے۔!!

ایک بابو جی:۔ اوہو، ارے۔ آدمی۔ ٹریم!.....

دوسرے بابو جی:۔ کیا واقعی؟۔ ارے ہاں! اُفوہ! ٹریم کے نیچے۔ —!!

ایک ترکی ٹوپی والا لمبا آدمی:۔ اوہو۔ کیا مر گیا؟؟

ننگے سر والا نوجوان:۔ کیا معلوم۔

ہندو سوداگر:۔ مر ہی گیا ہوگا۔ اور کیا۔

دوسرے بابو جی:۔ اجی اب اس میں کیا رکھا ہے۔

ایک سکھ جنٹلمین:۔ ہے کدھر؟ نظر نہیں آتا۔

ایک بڑے میاں:۔ ان ٹریموں کا جائے ستیاناس۔ خونی ہیں، ساری کی ساری۔

ایک جوشیلا کارخانیدار:۔ دیکھو تو سہی، سالوں کی حرمزدگی، تیز چلانے کی کیا ماری آئی تھی۔ بازار کا وخت ہے اور پھر رات کا معاملہ اندھے ہو گئے ہیں سالے۔

پہلے بابو جی:۔ ڈرائیور کدھر گیا۔ پوچھو تو سہی بدمعاش سے۔

(دوسری طرف سے شور و غل)

مختلف آوازیں:۔ یہ رہا۔ کہاں ہے۔ یہ رہا۔ یہ رہا۔ کون ہے بھائی۔ لڑکا۔ اُفوہ۔ ٹرام کے نیچے۔ یہ رہا۔ وہ دکھائی دے رہا۔ افوہ!۔ کتنا خون بہہ رہا ہے۔ اسے نکالو کسی طرح۔

(پولیس افسر صاحب فرسٹ کلاس میں بے چینی سے کبھی اُٹھتے ہیں، کھڑے ہوتے ہیں۔ جھانکتے ہیں اور پھر بیٹھ جاتے ہیں۔ کبھی دوسری طرف دیکھتے ہیں۔ کبھی ٹہلنے لگتے ہیں۔ رومال سے بار بار پیشانی پونچھتے ہیں۔ بیچارے بہت پریشان نظر آتے ہیں۔)

دو نو وارد بنگالی:۔ کیا ہوا۔ کیا ہوا؟۔

ہندو سوداگر:۔ (جنہوں نے یہ خدمت اپنے ذمے لے لی ہے کہ ہر نو وارد کو مختصر الفاظ میں حادثے سے آگاہ کر دیں۔) اجی، لڑکا آگیا ٹرام کے نیچے۔

بنگالی:۔ اوہو۔ ارررر۔ کتنا ایک دیری ہوا۔

ڈرائیور کی آواز:۔ اجی، تو میں کیا کروں، بابو جی۔ زور سے گھنٹی دے رہا ہوں۔ چلا رہا ہوں۔ اگلا سُنتا ہی نہیں۔ پھر اتنی جلدی تو میں نے بریک.....

ایک تولیہ بیچنے والا:۔ ارے مر گیا۔!!

پہلے بابو جی:۔ مر گیا کیا؟!۔

سکھ جنٹلمین:۔ اور کیا مر ہی جانا تھا اُسنے۔

ننگے سر والا ہندو نوجوان:۔ ہوا تو چھوڑو۔ پیچھے ہٹو۔ آگے کہاں آرہے ہو بھائی۔

ترکی ٹوپی والا لمبا آدمی:۔ ہٹو بھائی۔ ذرا ذرا پیچھے ہٹ جاؤ۔

بنگالی:۔ ارے یہ لڑکا لوگ کا کتنا بھیڑ ہے۔

جوشیلا کارخانیدار:۔ بھاگو بے لمڈوں۔ چلو یہاں سے، سالوں کیا تمہاری اماں ناچ رہی ہے یہاں پر۔

(پیچھے سے دوسری ٹریم آکر رُکتی ہے۔ اُسکے مُسافر گھبرا کر متوحشانہ انداز میں مجمع میں شامل ہوتے ہیں۔)

بیشمار آوازیں:- کیا ہوا۔ کیا ہوا۔ ارے۔ کیا ہوا۔

ہندو سوداگر:- لڑکا آگیا ٹرام کے نیچے۔

ایک لٹھ بند گنوار:- (پیاؤ والے پیاؤ پر جاکر) کیوں پنڈت جی کیا ہوگیو؟۔

پیاؤ والے پنڈت جی:- چھورا آگیو ٹرام میں۔

لٹھ بند گنوار:- چھورا آگیو۔ ؟!!

ایک دھوتی والے لالہ جی:- ارے چھورا! ٹرام کے نیچے؟

ہندو سوداگر:- ہاں جی، لڑکا آگیا ٹرام کے نیچے۔

ایک ہیٹ والے بابو جی:- دیکھتے نہیں ہو۔ میرا پاؤں کچل دیا۔ آنکھیں پھوٹ گئیں کیا؟

بنگالی:- معاف، دو بھائی۔

ترکی ٹوپی والا آدمی:- نکالنا چاہیئے اسے کسی صورت سے؟

جوشیلا کارخانیدار:- اجی نکلے بھی کسی طریں۔ کتا آدم مغز مار ریا ہے۔ جد توڑی گاڑی کو یہ اوپر کو اٹھا یا جاسے لمڈا نہیں نکل سکتا ہے ای سوچیں۔ (سمجھ میں)

پہلے بابو جی: قصور کیسے نہیں صاحب! ساری خطا ڈرائیور حرامزادے کی ہے۔ تھانے میں بھیجنا چاہیئے اسے۔

ایک لالہ جی ہاتھ میں ڈبے لئے گاتے چلے آتے ہیں—"ہاجم چورن۔ سبک نہک چورن—ہاجم ہے۔ پاچک ہے"۔ ہاجم چورن سبک نہک چورن—" (ایک ایک چٹکی چند آدمیوں کو تقسیم کرتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔)

جوشیلا کارخانیدار:- اور سارے کو دیکھو مکر ریا ہے۔ ایک ریپٹے کا محتاج ہے۔

ایک اور موٹے سے لالہ جی اپنی بیوی اور دو بچوں سمیت مجمع میں داخل ہوتے ہیں "کیا ہوا بھائی؟؟؟"

ہندو سوداگر:- (ادائے فرض کے طور پر) لڑکا آگیا ٹرام کے نیچے۔

لالہ جی کی بیوی:- ہے، رام رام رام— جانے کس مائی کا لال ہوگا۔ دیکھو تو ہے کدھر۔ تم چھوٹے کو گود میں لے لو (لالہ جی چھوٹے بچے کو گود میں لے لیتے ہیں۔ بڑا بچہ چلاتا ہے)

بڑا بچہ:- بابو جی ہم بھی دیکھیں گے۔ بابو جی ہم بھی۔ بوا ہم کو۔ ہمیں گود میں۔ (لالہ جی اسے بھی گود میں لے لیتے ہیں۔)

ننگے سر والا نوجوان:- کس طرح نکلے!

(تیسری ٹرام آکر رکتی ہے۔)

آوازیں، شور و غل۔ کیا ہوا۔ کیا ہوا۔ ارے آدمی۔ لڑکا۔ افوہ۔ وغیرہ وغیرہ۔

دوسرے بابو جی:- دھکا کیوں دے رہے ہو جی۔ کہاں جاؤ گے آگے، کوئی تماشہ ہو رہا ہے۔

سکھ جنٹلمین:- پیچھے ہٹو— ہٹو پیچھے— ہوا چھوڑو۔ چلو ہٹو جو بھائی۔ ذرا ذرا پیچھے۔

ہیٹ والے بابو جی:- تماشہ نہیں ہو رہا تو آپ کیوں گھسے آرہے ہیں آگے۔

دوسرے بابو جی:- میں تو یہاں بہت دیر سے کھڑا ہوں۔

ہیٹ والے بابو جی:- تو کیا یہ جگہ آپ نے ریزرو کرالی ہے۔ ہیں؟؟ تو پھر کیوں بیہودہ بکتے ہیں۔ بس خاموش رہیئے۔

دوسری طرف سے آوازیں:- ارے! یہ رہا۔ یہ رہا۔ وہ دیکھو۔ کدھر ہے۔ ہاں۔ وہی۔ دیکھا۔ پہیئے کے پاس۔ کون۔ ہاں۔ وہی۔ اندر کی دیکھا— وہ— یہ— ہاں— افوہ۔

پہلے بابو جی:- میں کہتا ہوں اس ڈرائیور کو پکڑنا چاہیئے۔ سزا ہونی چاہیئے بدمعاش کو۔ اندھے ہوگئے ہیں سب کے سب۔

ہندو سوداگر:- اجی اس کا کچھ قصور نہیں ہے۔ میں تو دیکھ رہا تھا سب کچھ۔

بچوں والے لالہ جی:- تو صاحب یہ آیا کیسے؟۔

ہندو سوداگر:- پٹری پر چل رہا تھا، گھبرا گیا۔ ڈرائیور گھنٹی دیتا رہا۔

بہت اچھا مگر اس کو سنائی ہی نہیں دیا۔

جوشیلا کارخانیدار :- اجی قضا آگئی تھی وسکی۔ یوں کہو۔ وہ تو موت منڈلا رہی تھی سر پر۔

پیاؤ والے پنڈت جی :- پٹری پر کہاں چل رہا تھا بھیتر اندر گلی میں سے آیا دوڑتا ہوا۔ جھپٹے میں آگیا۔

لالہ جی کی بیوی :- دیکھنا گرمی بہت ہو رہی ہے۔ چلو گھر کو۔

لالہ جی :- ابھی چلتے ہیں، ذرا ٹھہرو۔۔۔ لو تم چھوٹے کو سنبھالو ذرا۔۔۔ ہائے رام رام رام۔

دور سے آواز آتی ہے :- ہر مال ہے ساڑھے تین آنے۔ ہر مال ہے ساڑھے پانچ آنے۔ آئیے بابو جی۔ یہ ادھر والی لین ہیں ساڑھے تین آنے والا مال ہے اور یہ اُدھر ساڑھے پانچ آنے۔ بڑھیا بڑھیا ساڑھے تین آنے۔ ہر مال ہے ساڑھے پانچ آنے۔

چند اور آوازیں :- کیوں۔ کیا ہوا بھائی۔ ارے بچہ۔ اوہو۔ مر گیا۔۔۔؟؟

ایک مولوی صاحب :- کیوں بھائی خ خ خیریت ہے۔ کیا واق ق قعہ ہے؟

ہندو سوداگر :- اجی میاں جی لڑکا آگیا ٹرام میں۔

مولوی صاحب :- ہوں!! اے کیوں بھائی یہ ہندو تھا یا مسلمان؟

ننگے سر والا نوجوان :- نہیں نہیں گاڑی کو ہرگز نہ ہلانا۔۔۔ اور کوئی ڈھنگ۔۔۔

مولوی صاحب :- یہ ہندو تھا یا مسلماں؟؟

ترکی ٹوپی والا لمبا آدمی :- سوائے اس کے اور کوئی تدبیر نہیں ہو کہ گاڑی کو اوپر کو اٹھایا جائے۔ یا پھر تھوڑا سا دھکیل دیا جائے۔

ننگے سر والا نوجوان :- ہندو تھا صاحب!!

مولوی صاحب :- پھر مر گیا کیا؟

سکھ جنٹلمین :- اور کیا مر نہ جاتا تو اور کیا کرتا۔

مولوی صاحب (دبی زبان سے) فی النار والسقر۔

(ایک طرف کو چلے جاتے ہیں۔)

ڈرائیور :- اجی تو کل کیسے سکتا ہے۔ ابھی پہیے کے نیچے نہیں آیا۔ اگر گاڑی آگے چلاتا ہوں۔۔۔

جوشیلا کارخانیدار :- آگے کیسے چلاتے گا سالے۔ مغز پھاڑ دونگا۔ پیچھے ہٹا گاڑی کو۔۔۔ (گالی دیکر)!!

ترکی ٹوپی والا لمبا آدمی :- نہ نہ۔ گاڑی کو پیچھے نہ ہٹانا۔ دس پندرہ آدمی مل کر گاڑی کو ایک طرف سے ذرا سا اٹھائیں۔

ہندو سوداگر :- (پیاؤ پر جاکر) لاؤ جی، پنڈت جی، تھوڑا سا جل دینا۔ ہائے ہائے گرمی کتنی ہو رہی ہے۔

سکھ جنٹلمین :- آگے سے ہٹو۔ چلو۔ بڑھو بھائی آگے نا آؤ کیا رکھا ہے آگے۔

بنگالی :- اسے دیکھو حرامجادے کو بیٹھتا ہے کھالی۔ لوگاں کو ہٹاتا نہیں ہے۔

جوشیلا کارخانیدار :- ہاں جی وہ لاٹ کے جنے کیوں اٹھیں گے۔ یہاں رشوت دینے کون بیٹھا ہے۔

ہیٹ والے بابو جی :- تو آگے کیوں گھسے چلے آتے ہو۔ کیا اب تم بھی مرو گے۔

(چوتھی ٹریم آکر رکتی ہے۔ کیا ہوا۔ کیا ہوا کا پھر غل مچتا ہے)

ایک سوڈے والا (بوتلوں کا ٹھیلہ دھکیلتا ہوا مجمع کے قریب آتا ہے) :- یہ ٹھنڈا میٹھا ایک پیسے کو۔ میٹھے کی شرط ہے۔ بھائی سوئی ڈالیں، سوئی ڈاپرت۔ بائی رف سوڈا۔ ٹھنڈا میٹھا پیسے پیسے۔

دو نوجوان سوٹ پہنے آتے ہیں :- کیا ہوا۔ واٹس رونگ؟

ہندو سوداگر :- لونڈا آگیا ٹرام میں۔

ایک نوجوان :- مر گیا! کیوں پنڈت جی کیا مر گیا؟؟۔

پیاؤ والے پنڈت جی :- ہاں جی۔ دکھے تو ایسا ہی ہے۔

دوسرا نوجوان :- لارڈ! کتنی زبردست ٹریجڈی ہے۔

پہلا نوجوان :- پُور، مائی سول۔!!

دوسرا نوجوان:۔ ٹھہر یار! ذرا دیکھیں گے۔

پہلا نوجوان:۔ ٹھہر کر اب کیا کرے گا۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ کہاں کا فلن تھرا فسٹ بنا پھرتا ہے۔

دوسرا نوجوان:۔ نہیں یار! ذرا دیکھ تو۔

پہلا نوجوان:۔ اوہ! سِلی۔ دیکھ کر کیا کرے گا۔ چل دیر ہو جائے گی۔ پھر ٹکٹ ملنے مشکل ہو جائیں گے۔ (جاتے ہیں)

جوشیلا کارخانیدار:۔ (سوڈے والے سے) لا یار تو ایک کر بوتل بلوا۔ کہاں کی آئی تنا ریری۔ برف کے نیچے والی دیجو پیارے نہیں پیٹ سوخت کر لوں گا۔

سوڈے والا:۔ مجال ہے ٹھنڈا نہ ہو۔ تم نے بھی کیا بات کہی۔ لو ذرا ہاتھ لگا کر دیکھو۔

دوسری طرف سے آوازیں:۔ ارے زندہ ہے۔ زندہ ہے۔ مرا نہیں زندہ۔ پہیئے کے پاس۔ وہ۔ ہاں۔ وہ۔ آواز آئی۔ زندہ ہے۔ مرا نہیں۔ دیکھو ہاتھ ہلایا۔ ارے ہاں زندہ ہے۔

ہیٹ والا نوجوان:۔ ارے زندہ ہے۔ گڈ لَک۔

بنگالی:۔ جندے ہے۔ اچھا۔ (جاتا ہے)

بچوں والے لالہ جی:۔ (اپنی بیوی سے) مرا نہیں۔ زندہ ہے۔ چلو اب گھر چلیں۔ (جاتے ہیں۔)

(پیاؤ والے پنڈت جی پیاؤ بند کر کے مجمع میں داخل ہوتے ہیں)

ترکی ٹوپی والا لمبا آدمی:۔ اب جلدی نکالنا چاہیئے۔ یارو! کوئی تدبیر کرو نا!

پہلے بابو جی:۔ بچ گیا۔ کمال ہو گیا صاحب۔ جو ذرا سا پہیہ اور آگے آجاتا تو بس کام تمام ہو جاتا۔

جوشیلا کارخانیدار:۔ ہاں جی۔ وہ تو مالک کو زندگی وس کی پیاری تھی۔ نہیں کیا بچتا۔ وس کے تو فرشتے تک میدہ بن گئے ہوتے۔ اجی یہ ٹرموے ہے بڑی ظالم چیز۔ بیڑا غرق ہو سالی کا۔

دوسرے بابو جی:۔ ہاں جی، بیسیوں گھر اُجاڑ دیئے اس نے۔

ہندو سوداگر:۔ نہیں صاحب! ڈرائیور کو شاباش ہے۔ کمال کر دیا۔ بہت پھرتی سے بریک باندھا۔

ترکی ٹوپی والا لمبا آدمی:۔ تو بھائی اب کوئی ترکیب کرو نا۔ گاڑی کو ذرا سا اُٹھاؤ۔ پھر کوئی آدمی کھینچ لے۔

ہیٹ والے بابو جی:۔ اور جو ٹرام آپڑے تو وہ بھی مر جائے۔ یک شُد دو شُد۔ کتنے بیوقوف ہو تم سب۔

سکھ جنٹلمین:۔ لوگوں کو تو ذرا پیچھے ہٹاؤ۔ سب گاڑی کے اندر گھُس پڑے۔ ہٹو۔ بھائی۔ چلو، ہٹو۔ پیچھے۔ تھوڑا تھوڑا پیچھے۔

ہندو سوداگر:۔ تو پھر گاڑی کو اُٹھانے کی ترکیب کرنی چاہیئے۔ ابے جھلی والے اِدھر آبے۔ اور دو ایک کو پکڑ لا۔ پَن کا کام ہے۔ جلدی۔

ننگے سر والا ہندو نوجوان:۔ یار ہم سب مل کر کیوں نہ زور لگائیں۔

جوشیلا کارخانیدار:۔ ہاں، ہاں، آؤ بے لمڈو ــــ لو وہ ہیٹ باز بابو جی تو کھسکے۔ انگریزی ٹوپی کی بے آبروئی ہوتی ہے۔ کیوں نہو صاحب تعلیم آفتہ ہیں۔

دو نو وارد:۔ کیا ہوا۔ کیا ہوا؟؟

ہندو سوداگر:۔ لڑکا آگیا ٹرام کے نیچے۔

ایک نو وارد:۔ ارے کب! کیسے! مر گیا کیا۔ ہائے ہائے رے۔ اُفوہ ــــ!!

دوسرا نو وارد:۔ اجی اب تو شہر میں چلنا دوبھر ہو گیا ہے۔ گھر سے نکلنا موت کے مُنہ میں جانا ہے۔

سکھ جنٹلمین:۔ ہاں جی زندہ ہے مگر بچیگا نہیں۔

(پانچویں ٹریم آکر رُکتی ہے۔)

آوازیں:۔ کیا ہوا۔ کیا ہوا۔ ارے لڑکا۔ نیچے۔ کیا مر گیا۔ ہاں اور کیا۔ نہیں جی زندہ ہے۔ ابھی تو آواز آئی تھی۔ ہے کس کا لڑکا۔ کون ہے۔ ہاں زندہ ہے۔ لڑکا۔ نکالو۔ نیچے سے۔

ایک بڑے میاں:۔ کیوں جی کتنا بڑا ہو گا، لڑکا؟؟

ہندو سوداگر:۔ جوان ہے۔ یہی کوئی انیس بیس برس کا۔

دوسرا آدمی:۔ نہیں جی، کوئی چودہ پندرہ برس کا ہوگا۔

پیاؤ والے پنڈت جی:۔ کہاں؟؟ نہیں۔ بالک ہے۔ کوئی نو دس برس کا ہے۔

ہندو سوداگر:۔ نہیں، پنڈت جی، تم بھی کیا بات کر رہے ہو

پیاؤ والے پنڈت جی:۔ نہیں جی، تم کیا جانو۔ میں تو شام سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

ترکی ٹوپی والا لمبا آدمی:۔ ہاں جی آؤ۔ اس پہیئے کو اونچا کرو۔

کارخانہ دار:۔ دوسری طرف بھی آٹھ دس ایک جٹنے لگ جائیں، ہاں لو بھئی شاباش۔

(از سرِ نو غل مچتا ہے۔ ہزاروں آوازیں۔ چیخ پکار۔ شور و شغب کوئی لفظ سمجھ میں نہیں آتا۔ بہ ہزار دقت لوگ پہیئے کو اُٹھاتے ہیں۔ ڈرائیور بہ مشکل تمام لڑکے کو باہر کھینچتا ہے۔ تماشائیوں کا ہجوم بڑھتا جاتا ہے۔ سب کے سب زخمی لڑکے پر یورش کرتے ہیں۔ سکھ جنٹلمین اور ننگے سر والا نوجوان اُسے اُٹھا کر فرسٹ کلاس کے خانے میں لٹا دیتے ہیں۔ اُس کی شکل دیکھے سے خوف آتا ہے۔ آنکھ، ناک، کان، سب غائب، ایک ہاتھ کہنی سے بالکل علیحدہ۔ سر سے خون کا پرنالہ بہتا ہوا۔ بالکل بے دم اور بیہوش۔ لوگ ہوش میں لانے کی تدبیریں کرتے ہیں۔ خون بند کرنے کی جد و جہد ہوتی ہے۔ مشورے ہوتے ہیں۔ بحث و تمحیص ہوتی ہے۔ اس دوران میں خون کی چند چھینٹیں پولیس افسر صاحب کی شلوار پر پڑ جاتی ہیں۔ وہ جلتے بھلتے لڑکوں کو ڈانٹتے ہوئے بطور احتجاج ٹریم سے اُتر کر پیدل منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ جوشیلا کارخانہ دار پوری طاقت سے پنکھا جھل رہا ہے۔ لوگ انبوہ در انبوہ گاڑی میں ٹوٹے پڑتے ہیں۔ سکھ جنٹلمین کا چیختے چیختے گلا بیٹھ جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد شور و غل ذرا کم ہوتا ہے۔)

ترکی ٹوپی والا لمبا آدمی:۔ اسپتال لے چلو۔ تانگے والے۔

جوشیلا کارخانہ دار:۔ او تانگے۔ ورے آبے۔ تیری!!

ہندو سوداگر:۔ اُٹھاؤ جی، تانگے میں ڈالو۔

پہلے بابو جی:۔ اُٹھا بے ڈرائیور، منہ کیا دیکھ رہا ہے۔

تانگے والا:۔ جی میری سیٹیں بالکل نئی ہیں۔ خون میں بھر جائیں گی۔

آوازیں:۔ تو کیا ہوا پھر۔

تانگے والا:۔ پیسے کتنے میں گے بابو جی۔ بولو؟

ترکی ٹوپی والا لمبا آدمی:۔ پیسے! لے لیجو بھائی۔ جو تو مانگے۔

ننگے سر والا ہندو نوجوان:۔ ایک دوانی ملے گی۔

تانگے والا:۔ نہیں جی۔ میں نہیں جاتا۔ میری سیٹ خراب ہو جائیگی۔ کوئی اندھیر ہے۔

جوشیلا کارخانہ دار:۔ تین آنے بھی لے گا۔

تانگے والا:۔ نہیں جی۔ میں نے ابھی تو تانگہ جوتا ہے۔ بوہنی بھی نہیں کی۔

(لڑکے کے مُنہ سے "پانی" کا لفظ نکلتا ہے)

ننگے سر والا ہندو نوجوان:۔ پانی لاؤ۔ پانی۔

ہندو سوداگر:۔ پانی۔ پانی۔ جلدی کرو۔

سب چلاتے ہیں:۔ پانی۔ پانی۔ کہاں ہے۔ جلدی۔ لاؤ۔ یار۔ ذرا جلدی۔ پانی۔ پانی۔ یہاں تو کہیں بھی نہیں۔ کیا نہیں ہے۔ یہ دکاندار زندہ کیسے رہتے ہیں۔ پانی بھی نہیں ہے۔

(ترکی ٹوپی والا لمبا آدمی جلدی سے پیاؤ میں گھس کر لُٹیا بھر لاتا ہے)

پیاؤ والا پنڈت (بیتاب ہو کر چیختا ہے) ہائے رے مُسلمان نے پانی میں ہاتھ ڈال دیا۔ میں لُٹ گیا رے۔ مسلمان نے پیاؤ گندہ کر دیا۔ لوگو دوڑو۔ مسلمان نے دھرم کا ناش کر دیا۔

(مجمع میں ہل چل مچ جاتی ہے۔ امن پسند لوگ چُپ چاپ گھر کو کھسک جاتے ہیں۔ ایک پہلوان قسم کے جاٹ ترکی ٹوپی والے کے زور سے چانٹا مارتے ہیں۔ جواب میں وہ لُٹیا اُن کے مُنہ پر دے مارتا ہے۔ دو ایک اور دھوتی بند ترکی ٹوپی والے سے لپٹ جاتے ہیں۔ جوشیلا کارخانہ دار اُن کی خبر لیتا ہے۔ ہندو نوجوانوں کا ایک غول کا

غولی دونوں کی مرمت میں مصروف ہوتا ہے کہ گھنٹہ گھر کی طرف سے مسلمان لفنگوں کی ایک پارٹی دوڑتی ہوئی آتی ہے۔ دو ہندو نوجوانوں کی پوری پوری تواضع کرتی ہے۔ چند بے فکرے "لڑائی ہو گئی ہندو مسلمانوں کی" کا اعلان کرتے ہوئے دوڑتے ہیں "لڑائی۔ ہندو مسلمانوں کی"۔ بھاگڑ پڑتی ہے دکانیں جلد جلد بند ہونی شروع ہوتی ہیں۔ سرپٹ بند سے آدمی بھاگے جاتے ہیں۔ موٹریں تانگے آناً فاناً میں سب غائب۔ لڑنے والے سورما بھی ایک ایک کر کے کم ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ٹریموے کے ڈرائیور اور کنڈکٹر بھی فرار ہو جاتے ہیں۔ چند ہی سکنڈ میں چاندنی چوک سنسان ہو جاتا ہے۔ قبرستان کی سی خاموشی مسلط ہو جاتی ہے۔

ٹریموے کے فرسٹ کلاس والے ڈبے میں ادھ موئے لڑکے کی ڈراؤنی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ بھیانک آواز مدھم پڑ جاتی ہے۔ دو ایک خوفناک ہچکیاں لیکر لڑکا ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور سیٹ پر سے لڑھک کر ٹرام کے فرش پر آ پڑتا ہے۔ منظر بالکل تاریک ہوتا ہے۔)

(ترقی پسند مصنفین دہلی کی انجمن میں پڑھا گیا)

انصار ناصری۔ بی۔ اے۔

ایک خاتون کے استفسار پر

بتاؤں کیا تجھے اے نازنیں کس سے محبت ہے!
میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اس دنیا کی عورت ہے
سراپا رنگ و بو ہے پیکرِ حسن و لطافت ہے
بہشتِ گوش ہوتی ہیں گہر افشانیاں اُسکی

وہ میرے آسماں پر اخترِ صبحِ قیامت ہے
کہ اس میں طاہرہ کا عزم ہے مریم کی عصمت ہے
مرا ایماں ہے میری زندگی ہے میری جنت ہے
مری آنکھوں کو خیرہ کر گئیں تابانیاں اُسکی

وہ اک مضراب ہے اور چھیڑ سکتی ہے رگِ جاں کو
وہ چنگاری ہے لیکن پھونک سکتی ہے گلستاں کو
وہ بجلی ہے جلا سکتی ہے ساری بزمِ امکاں کو
ابھی میرے ہی دل تک ہیں شررسامانیاں اُسکی

زباں پر ہیں ابھی تک عصمت و تقدیس کے نغمے
وہ بڑھ جاتی ہے اِس دنیا سے اکثر اسقدر آگے
مری تخئیل کے بازو بھی اُس کو چھو نہیں سکتے
مجھے حیران کر دیتی ہیں نکتہ دانیاں اُسکی

جبیں پر سایہ گستر پرتوِ قندیلِ رہبانی

عذارِ نرم و نازک پر شفق کی رنگ افشانی
قدم پر لوٹتی ہے عظمتِ تاجِ سلیمانی
ازل سے معتقد ہے محفلِ نورانیاں اسکی

ادائیں ایسی آئی ہیں وہ فطرت کے خزانوں سے
جگا سکتی ہے محفل کو نظر کے تازیانوں سے
وہ ملکہ ہے خراج اس نے لئے ہیں تتانوں سے
بس اک میں نے ہی اکثر کی ہیں نافرمانیاں اسکی

وہ میری جرأتوں پر بے نیازی کی سزا دینا
ہوس کی ظلمتوں پہ ناز کی بجلی گرا دینا
نگاہِ شوق کی بے باکیوں پر مسکرا دینا
جنوں کو درسِ تمکیں دے گئیں نادانیاں اسکی

وفا خود کی ہے اور میری وفا کو آزمایا ہے
مجھے چاہا ہے مجھکو اپنی آنکھوں پر بٹھایا ہے
مرا ہر شعر تنہائی میں اس نے گنگنایا ہے
سنی ہیں میں نے اکثر چھپ کے نغمہ خوانیاں اسکی

مرے چہرے پہ جب بھی فکر کے آثار پائے ہیں
مجھے تسکین دی ہے میرے اندیشے مٹائے ہیں
مرے شانے پہ سر رکھ دیا ہے گیت گائے ہیں
مری دنیا بدل دیتی ہیں خوش الحانیاں اسکی

لبِ لعلیں پہ لاکھا ہے نہ رخساروں پہ غازہ ہے
جبینِ ناز پر اس کے نہ جھومر ہے نہ ٹیکا ہے
جوانی ہے سہاگ اس کا تبسم اس کا گہنا ہے
نہیں آلودۂ ظلمت سحر دامانیاں اس کی

کوئی اس بارگاہِ ناز تک جا ہی نہیں سکتا
کوئی اس کے لبِ شیریں کی مے پا ہی نہیں سکتا
کوئی اس کے جنوں کا زمزمہ گا ہی نہیں سکتا
چمکتی ہیں مرے اشعار میں جولانیاں اس کی

مجاز
بی۔ اے (علیگ)

(گذشتہ سے پیوستہ)

فاؤسٹ

حصہ دوم

پہلا باب

ایک اونچے پہاڑ پر، دُنیا کے پوشیدہ مقامات میں سے ایک، جہاں نہ تو دن ہوتا ہے اور نہ رات، جہاں کسی پرندے کی چہکار نہیں سُنائی دیتی، اور جہاں حشرات الارض میں سے کوئی رینگنے والا کیڑا نہیں ہوتا، بلکہ جہاں زمین خود لرزتی ہے، کسی ناپاک اژدھے کی طرح بل کھاتی ہے اور زرد طرح کے بخرات کے متعفن بھپکے اس میں سے نکلتے ہیں — یہاں میفسٹو کے ایک ارضی مسکن میں فاؤسٹ مقیم تھا۔

خلا میں نکلی ہوئی ایک چٹان پر فاؤسٹ اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ گھٹنے پر کہنی اور ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹکی تھی اور فضائے بسیط پر نظریں جمی تھیں۔ چہرہ غمناک اور پہلے سے بھی زیادہ شکستہ اور افسردہ تھا۔ اپنے بوڑھے جسم سے نجات پانے کے لئے اُس نے اپنی غیر فانی رُوح کا سودا کیا تھا، مگر موجودہ حالت اور بھی زیادہ غیر مطمئن و پریشان تھی۔ گزشتہ سب تکلیفوں پر اب ناامیدی و مایوسی —— کی تکلیف مستزاد تھی۔ کیونکہ زندگی کو وہ اپنی فوق الفطرت قوتوں کی وجہ سے اپنی آرزوؤں کے مطابق ڈھال تو سکتا تھا مگر مستقبل میں اس کے لئے زندگی کوئی اُمید نہیں رکھتی تھی۔ نہ تو اس کے لئے زندگی کوئی حیرت زائی رکھتی تھی، نہ اُمید و بیم، نہ عداوت اور نہ محبت و اختیار۔ یہ سب باتیں اس کے لئے خاک میں مل چکی تھیں۔

شیطان اُسے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ بولا۔

"فاؤسٹ تو مطمئن کیوں نہیں ہے؟ تُو نے لوگوں کی خدمت کی اور سنگسار کیا گیا! حسین سے حسین اور بڑی سے بڑی عورت سے تُو اپنا دل بہلا چکا۔ ازمنۂ قدیم کی حسین ترین عورتیں تیرے آغوش میں مچل چکیں۔ بادشاہ سلیمان سے زیادہ تیرے پاس عقل و دولت ہے۔ پھر بھی کوئی چیز تجھے مطمئن نہیں کرتی؟"

فاؤسٹ نے افسردہ آواز میں جواب دیا "میں نے ایک فریب کے عوض تیرے اندر اپنی رُوح بیچی ہے"

"کیا تُو اور عورتوں کی خواہش رکھتا ہے۔ جو ان سب سے بھی حسین تر ہوں؟ ..... کوئی حور؟ کوئی پری؟ جو بھی تو حکم کرے میں ماننے کو تیار رہوں"

فاؤسٹ نہ تو ہلا اور نہ کوئی جواب دیا۔ خلا پر نظریں گاڑے بیٹھا رہا۔

"کیا تُو لوگوں کی قسمتوں پر اور بھی زیادہ اپنی طاقت کا مظاہرہ چاہتا ہے؟ جو تو چاہے گا ہو جائیگا، اگر کسی شہنشاہ کا تاج بھی مانگے تو تجھے مل سکتا ہے۔ دیکھ!"

اور میفسٹو کے ہاتھوں میں ایک بڑا سا تاج دکھائی دیا جو جواہرات سے جگمگا رہا تھا۔

"کیا تو کسی عظیم الشان سلطنت کا بانی بننا چاہتا ہے؟"

لیکن فاؤسٹ نے جواب نہیں دیا اور نہ کوئی جنبش کی۔

"فاؤسٹ تو کیا تیرے دل میں کوئی آرزو باقی نہیں رہی۔ ایک بھی —— ؟"

فاؤسٹ نے اپنا غمزدہ چہرہ پھیرا اور شیطان کی طرف دیکھا۔

"صرف ایک آرزو ہے میری، میفسٹو۔ اور وہ آرزو ہمیشہ میرے ساتھ رہی ہے گو میں نے اپنی رُوح کے سب سے گہرے گوشے میں اسے مقید کر دیا تھا"

میفسٹو نے پوچھا "اور یہ آرزو کیا ہے؟" اسکی بھنویں خوفناک حد تک ترچھی ہو گئیں۔

"گھر! اور معصومیت!"

"معصومیت تجھے میسر نہیں ہو سکتی۔ تیری رُوح میری ہے"

فاؤسٹ نے مایوسی سے کہا "میں اپنے گھر و معصومیت چاہتا ہوں۔ ننھے ننھے چونچال چہرے جن سے لالچ، ہوس اور فریب نہ ٹپکتا ہو۔ مجھے میرے وطن لے چل جہاں میں نے اپنے بچپن کے خوشگوار دن گذارے تھے"

میفسٹو مخالفت و ناپسندیدگی سے بڑبڑایا "وہاں خطرہ ہے۔ میں ابتک فاؤسٹ کے عرفانی معجزوں کو پوری طرح غارت نہیں کر سکا"

فاؤسٹ اٹھکر میفسٹو کے روبرو آکھڑا ہوا۔ اور چیخکر بولا۔
"میری خواہش یہی ہے۔ میں تجھے حکم دیتا ہوں، مجھے میرے وطن لے چل، اور جلدی لے چل"

دوسرا باب

روز ایسٹر کا اتوار تھا۔ دن روشن تھا اور سورج چمک رہا تھا۔ مرد، عورتیں اور بچے اپنے اچھے اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور بازاروں میں خوب چہل پہل تھی۔ اطمینان و مسرت کی فضا سب پر چھائی ہوئی تھی۔

ان میں سے زیادہ تر لوگ گرجے کی طرف جا رہے تھے اور ہنستے مسکراتے چہروں کے بچے للی کے پھول ہاتھوں میں لئے خوش خوش چلے جاتے تھے۔

دونو وارد پل پر سے گزر شہر میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک گہرے رنگ کا توانا شخص تھا جو سیاہ چغہ پہنے ہوئے تھا۔ سر کے لباس میں ایک لمبا سرخ رنگ کا پر لہرا رہا تھا۔ دوسرا ایک نوجوان تھا نہایت حسین، متناسب الاعضاء۔ لباس ہلکا بسنتی اور نہایت قیمتی ریشم اور مخمل کا تھا۔ یہ دونوں بازاروں میں سے گزرے۔ نوجوان گھروں اور باغوں کو انتہائی ذوق و شوق سے دیکھ رہا تھا گویا پرانی دوستی کی تجدید کر رہا تھا۔

اس نے کہا "میفسٹو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں زندگی بالکل ساکت ہے۔ اب بھی بالکل وہی ہے جو پہلے تھا"

میفسٹو نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا "کیا اتنے جلدی سب کچھ بھول گئے فاؤسٹ!"

پھر فاؤسٹ کو طاعون کا وہ خوفناک زمانہ یاد آیا جس کو اب ایک پیڑھی گزر چکی تھی اور اس کے خیال سے اس کا دل کانپ گیا۔ اس نے ایک آہ کھینچی اور مسکرا کر میفسٹو کی طرف دیکھا۔

"لیکن زمانے کا پہیہ الٹا گھوم گیا ہے۔ میرے گرد ہر چیز ویسی ہی ہے جیسی میری جوانی میں یہاں تھی، اور میں پھر کچھ اپنے آپ کو وہی محسوس کر رہا ہوں"

ان کے قریب سے بڑوں اور بچوں کی ایک بھیڑ گزری اور انہیں تعجب کی نظروں سے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔ فاؤسٹ نے ایک شخص کو روکا۔ یہ ایک موٹا خوش طبع آدمی تھا اور ایک گدھے پر ایندھن لادے جا رہا تھا۔

"کیوں جناب کیا آج کوئی تہوار ہے جو سب اس قدر خوش ہیں اور عمدہ کپڑے پہنے، للی کے پھول ہاتھوں میں لئے جا رہے ہیں؟"

اس شخص کے چہرے پر تعجب کے آثار پیدا ہوئے اور حیرت سے پوچھنے لگا "کہاں سے آ رہے ہیں آپ؟ کیا آپ ترکستان سے آ رہے ہیں جو آپ نے مقدس ایسٹر کا نام نہیں سنا؟"

یہ کہکر اس نے ایک قہقہہ لگایا اور ہنستا ہوا آگے چلدیا اور آنے والوں کو انکی طرف اشارہ کر کے بتا گیا کہ ان عجیب لوگوں کو دیکھو، یہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ آج مقدس ایسٹر ہے۔

اب پھر فاؤسٹ کے دل میں تکلیف دہ خیالات کا ہجوم ہوا کیونکہ اس نے محسوس کیا کہ فی الحقیقت اس میں کس قدر تبدیلی ہوگئی تھی اور اپنے ہی وطن کے لوگ اس سے کس قدر ناآشنا اور ان کی ہمدردیوں سے وہ کس درجہ محروم تھا۔ اور یہ وہی لوگ تھے جو اس کے بڑھاپے کے زمانے میں ذرا ذرا سے بچے تھے۔ اب اسے وہ نوجوان اور جوان لڑکیاں یاد آئیں جو اسکی بزرگی و احترام کے زمانے میں زندہ تھیں۔ وہ سب اب یا تو بڈھے ٹھڈے ہونگے یا مرکھپ گئے ہونگے۔

یہ دونوں بھی ہجوم کے ساتھ گرجے کی طرف روانہ ہو گئے۔ بچوں کی خوش خوش باتوں کو سنکر فاؤسٹ کا احساس غم کچھ کم ہوا اور ننھی ننھی بچیوں کو دیکھتا رہا کہ کس احترام سے اپنے مظہر پاکیزگی (للی کے پھول) کو اٹھائے چل رہی ہیں۔

تھوڑی دور چل کر وہ خوشنما چھوٹے سے گھر کے قریب سے گزرے جسکی جھکی ہوئی چھت سرخ کھپریل کی تھی۔ اسکے چاروں طرف ایک باغیچہ تھا اور پیچھے کے رخ ایک بڑا سا تاکستان تھا۔ فاؤسٹ نے اسے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور میفسٹو کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ اس ہستی سے کس قدر قریب ہے جس کی قسمت اسکی آئندہ قسمت سے اس قدر وابستہ ہے۔ یہ وہ ہستی تھی جس کے لئے فاؤسٹ کی روح بھوکی تھی اور ہر لحاظ سے اس کی تشنگی روح کو سیراب کرنیکی اہل تھی۔ بلکہ یہ وہ کسوٹی تھی جس پر فاؤسٹ کی روح کا آخری کس لگایا جانے والا تھا۔

یہ حسین مارگریٹ تھی جو اس گھر میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ یہ ایک خوبصورت لڑکی تھی جس کی دو لمبی لمبی سنہری چوٹیاں گندھی ہوئی تھیں۔ شاداب چہرہ جس سے تازگی اور عمدہ صحت ظاہر ہوتی تھی۔ شفاف نیلی آنکھیں جن میں زندگی اور زندگی کی خوشی ناچتی تھی۔ عمر اس کی سترہ سے زیادہ نہ تھی، اور ابھی بچپن کے الھڑپن سے اس کا قطع تعلق نہیں ہوا تھا۔

بچوں کے ساتھ پھرتی، اُن کے ساتھ پھولوں کے ہار گوندھتی۔ گھر میں چلتی پھرتی تو وہ گیت گنگناتی جاتی تھی جو اسکولوں میں گایا کرتی تھی۔ اُس کے لئے زندگی کا پھول ابھی کھلنا شروع ہوا تھا۔ جاگتے کے خواب بھی وہ کثرت دیکھا کرتی تھی۔ اپنی کھڑکی کے پاس بیٹھی رومانی خیالات سے اپنے ذہن کو بساتی۔

آج ایسٹر کی صبح کو وہ اپنی ماں کے ساتھ اُس کمرے میں تھی جس میں سے بازار نظر آتا تھا۔ اس کا لباس سفید تھا اور گرجہ جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ آستینیں چست اور لمبی تھیں جن میں سے اُس کے بھرے بھرے بازوؤں کا سڈول پن ظاہر ہو رہا تھا۔ گلے کے پاس جو جلد نظر آرہی تھی ملائی کی طرح سفید تھی اور ایسی ہی پاکیزہ جیسی اسکی نیلی آنکھوں سے نکلنے والی نظر۔

اُس کی ماں کھڑکی کے پاس بیٹھی سی رہی تھی۔ کمرے کی فضا تازہ و معطر تھی کیونکہ باغ کی خوشبو سے بسی ہوئی ہوا کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ کمرے میں چمکدار لکڑی کا سازو سامان تھا۔ برتن صاف ستھرے اور جگہ جگہ لگے رہتے۔ فرش دُھلا دُھلایا، داغ دھبے کا نام تک نہیں۔ یہ سب چیزیں ایسی تھیں کہ اس مسرور و معصوم لڑکی اور اُسکی شفیق ماں کی اُفتادِ مزاج سے خاص مناسبت رکھتی تھیں۔

کمرہ طے کرکے وہ اپنی ماں کے برابر آکھڑی ہوئی اور کھڑکی میں سے بازار میں سے گزرنے والے ہجوم کو غایت دلچسپی سے دیکھنے لگی۔ پھر بولی:۔

"اماں۔ آج صبح کو گرجہ میں کتنی بھیڑ ہوگی! دیکھئے وہ بڑی بی بوہمی اپنے ننھے کو لئے جارہی ہیں۔ اور خیر سے یہ ننھا اپنی ماں کا کم از کم تین گنا بڑا ہے۔" یہ کہکر وہ خوشدلی سے ہنسنے لگی۔

"اور اماں ذرا اُن دو اجنبیوں کو تو دیکھئے۔ اُن کا لباس کسقدر قیمتی ہے۔ دیکھئے وہ پرے اُس طرف جا رہے ہیں۔ کاش اُن کے چہرے نظر آجاتے۔ وہ نوجوان جس کا چغہ ہلکے بسنتی رنگ کا ہے، وہ تو کچھ اس شان سے چل رہا ہے گویا کہیں کا بادشاہ ہے۔ وہ ضرور بہت خوبصورت ہوگا۔"

ماں نے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا "جلدی کر بیٹی ورنہ تجھے دیر ہو جائیگی۔ پھر بھلا تجھ جیسی شرمیلی بچی گرجہ میں کیسے داخل ہوگی جب سب بیٹھ چکے ہونگے اور خطبہ پڑھا جارہا ہوگا۔"

اتنا کہکر اُس نے لڑکی کو پیار کیا اور بولی "اس سکون اور پاکیزگی کے دن کی برکتیں تجھ پر ہوں۔"

"اور آ یہ پرچی پیاری اماں۔"

مارگریٹ نے ماں کے قریب جو گلدان رکھا تھا اُس میں سے ایک للی کا پھول نکالا اور ماں کو بچوں کی طرح خیرباد کہکر جلدی جلدی سیڑھیوں پر سے اُترکر بازار میں آگئی۔

اُسے ڈر تھا کہ کہیں دیر نہ ہو جائے اس لئے وہ جلدی جلدی قدم اُٹھاتی چلی۔ راستہ میں اُسے گزشتہ سال کا خیال آرہا تھا جب اُس کا بڑا بھائی ساتھ تھا۔ یہ زبردست ہاڑ کا نوجوان تھا جو شاہی سپاہ میں ملازم تھا۔ اُس کی کمر میں ایک چوڑی سی تلوار لٹکی تھی جس سے وہ اُسے ڈرایا کرتا تھا۔ اور اس دن وہ کس قدر فخر و پندار کے ساتھ اُسکے پہلو بہ پہلو گئی تھی۔ اس خیال کے ساتھ ہی اُسے وہ نو وارد یاد آیا جو عجیب شان سے چترمنٹ ہوئے اُسکے گھر کے آگے سے گزرا تھا۔

بچپن کے ایسے ہی خیالات میں منہمک وہ گرجا پہنچی اور صدر دروازے کی سیڑھیوں کی طرف چلی۔ اس سوچ میں کچھ ایسی کھوئی ہوئی تھی کہ میفسٹو سے ٹکراتی ٹکراتی بچی جو سیاہ لباس پہنے بازار کے رُخ سیڑھیوں کے قریب دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ ایک دم سے جو اس کا آمنا سامنا ہوا تو مارگریٹ کے سارے خوشگوار خیالات یکلخت منقطع ہوگئے اور اُس کے چہرے پر خوف سا طاری ہوگیا میفسٹو کے چہرے پر حقارت کے آثار تھے۔ وہ اُچھل کر پیچھے ہٹی اور کچھ ایسا سہم اُس پر سوار ہوا کہ ہاتھ میں سے للی کا پھول چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ فاؤسٹ جو میفسٹو کے پیچھے کھڑا تھا جھپٹ کر آگے آیا اور پھول اُٹھا کر بڑے پُرتپاک طریقے سے پیش کیا۔ وہ کچھ زبان سے بھی کہنے والا تھا مگر لڑکی کے چہرے کو جو دیکھا تو اُس کے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی اور ایسی کہ پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ اُس میں کچھ شائبہ خوف کا تھا اور کچھ وہ احساس شامل تھا جو کسی کو پہچاننے میں ہوتا ہے۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ جس چیز کی اُسے تلاش تھی وہ اُسے مل گئی۔ جسے وہ ساری عمر ڈھونڈتا رہا تھا وہ ہستی اُس کے پیش نظر تھی۔

مارگریٹ بھی فاؤسٹ سے کچھ کم متحیر نہ تھی۔ ایک لمحہ پہلے وہ میفسٹو کو دیکھکر سہم گئی تھی اور اب اُس ہیبت ناک ہستی کی بجائے ایک اور ہی دلکش ہستی سامنے آگئی تھی ـــــ ایک ہستی نور تھی جو حُسن، جوانی، طاقت، اور شجاعت کی مکمل تصویر تھی۔ اِسے وہ اس طرح دیکھ رہی تھی کہ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور لب سے لب جُدا تھا۔

اِن دونوں کے جسم میں ایک کپکپی دوڑ گئی ـــ شدید جذبات کی کپکپی۔ چند لمحے وہ اسی طرح کھڑے رہے اور یہ لمحے اُن کے لئے پھیلکر

ابدیت بن گئے. پھول پر دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے کو چھو رہے تھے، للی کا پھول، معصومیت کا مظہر، انکے درمیان تھا۔

پھر ایک سانس زور سے لیکر اُس نے اس طلسم کو توڑا اور خوفزدہ خرگوش کی طرح وہ سیڑھیوں پر سے اُچھلتی گرجے میں داخل ہوگئی۔

فاوسٹ بُت بنا اُسے دیکھتا رہا، یہانتک کہ میفسٹو کی کرخت آواز نے اُسکے خیالات کا سلسلہ کاٹ دیا۔

"بیوقوف، سادہ لوح چھوکری جو پادریوں کے پاس بھاگی جارہی ہے. یہ تیری محبت کے لائق نہیں"

فاوسٹ نے غصہ سے پلٹ کر دیکھا اور چلّا کر بولا،

"دفع ہو یہاں سے. پیار محبت اور جسم کی خواہشات کا رونا ختم کر. مجھ میں نئی نئی آرزوئیں پیدا ہو رہی ہیں۔ دنیا میں اور طرح کی اُمیدوں کا رنگ جھلک رہا ہے. اس میں وہ حسن ہے جو مجھ پر فنا ہو چکا ہے ___ معصومیت!"

میفسٹو نے تیوری چڑھا کر دیکھا مگر اس کا جواب گرجہ کے باجے کی آواز میں دب کر رہ گیا. سب ملکر حمد گا رہے تھے اور ان سب میں بچوں کی صاف معصوم آوازیں الگ سنائی دے رہی تھیں۔

"خدا کی حمد و ثنا کرو جو زبردست بادشاہوں کا بادشاہ ہے"

میفسٹو نے کانوں میں اُنگلیاں دے لیں. اُس کے چہرے پر نفرت اور خوف کی شکنیں پڑ گئیں اور گرجہ کے قُرب سے بھاگ کھڑا ہوا۔

تیسرا باب

اِدھر تو مارگریٹ اپنے نئے ہیجان کو عبادت میں تسکین دینے کی کوشش کر رہی تھی اور اُدھر اسکی ماں پر بھی ایک غیر متوقع واقعہ کی وجہ سے اِس سے بھی زیادہ ہیجانی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔

وہ کھڑکی کے قریب اپنے کام میں منہمک بیٹھی تھی، ایک لمبا چوڑا نوجوان فوجی لمبی لمبی ڈگیں بھرتا بازار میں سے آ رہا تھا. اُسکے پہلو میں ایک بڑی سی تلوار تھی اور چمڑے کے سینہ بند کی وجہ سے دیو کی طرح سینہ تنا ہوا تھا. ماں نے دیکھا کہ باغیچے کی روش پر آدمی کیا ایک پہاڑ کا پہاڑ چلا آتا ہے. اور پھر دروازہ زور سے کھلا اور ایک گرجدار آواز سنائی دی. دیکھا تو سامنے اس کا بیٹا ویلنٹین اس طرح کھڑا ہے کہ ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں اور خوشی سے آنکھیں چمک رہی ہیں۔

"چھٹّی اماں! چھٹّی. ہو ہو!"

"ویلنٹین! میرے بچے!!"

ماں کے مُنہ سے گھٹی ہوئی آواز میں یہ الفاظ نکلے اور ان میں خوشی، تعجب، محبت اور نہ معلوم کون سب ہی کچھ تھا۔

ایک ہی جھپاکے میں اُس نے اپنی ماں کو گود میں اُٹھا لیا تھا اور اتنا اُونچا کیا کہ چھت سے سر جا لگا۔

"ارے اماں. واللہ تم تو وزن میں کچھ کم ہوتی جا رہی ہو!"

یہ کہکر اُس نے ماں کو زمین پر ٹکا دیا اور خوب ہنسا۔

"میرا بچہ! میرا ننھا بچہ!" اُسنے غمناک مُسکراہٹ سے کہا "میرے اللہ نے مجھے ایسٹر کا کیسا اچھا تحفہ بھیجا ہے"

"اماں پورے تین ہفتے تمہارے اور مارگریٹ کے ساتھ گزرینگے. میری خوبصورت مارگریٹ کہاں ہے؟"

"وہ تو گرجہ گئی ہوئی ہے ایسٹر کی عبادت کے لئے. بس اب آتی ہی ہوگی"

"آہ! کوئی چیز میرے یہاں چُبھ رہی ہے" یہ کہکر اُس نے اپنا ہاتھ سینہ بند میں ڈالا اور کھینچ تان کر کوئی چیز نکالی. پھر اپنی بڑی سارف مٹھی ماں کے دونوں ہاتھوں میں رکھکر کھولی تو اس میں ایک سونے کا بروچ تھا۔

"یہ بڑی دُور سے آیا ہے اماں براندنبرگ سے. اور میرے ساتھ ساتھ اسپر بھی عجیب عجیب واقعات گزرے ہیں"

اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر کچھ بھولی ہوئی باتوں کی یاد اُبھر آئی۔

تھوڑی دیر تک دونوں بیٹھے باتیں کرتے رہے. ویلنٹین اپنے واقعات و سانحات سناتا رہا اور شہر میں جو اُس کے دوست تھے اُنکے حالات پوچھتا رہا۔

اتنے میں باغیچے کے دروازے کا کھٹکا کھلنے کی آواز سنائی دی اور انہوں نے مارگریٹ کے بھاگ کے آنے کی آواز سُنی۔

اُس کی ماں بولی "آج یہ مارگریٹ کو کیا ہوگیا؟ یہ تو جب کبھی گرجے سے واپس آتی ہے تو ہمیشہ مجھے دُور ہی سے آواز دیتی ہے. شاید آج اُس کا جی کچھ ٹھیک نہیں ہے. تم یہیں رہو ویلنٹین. میں اس کے پاس ہو کر آتی ہوں"

مارگریٹ اپنے کمرے میں پہونچکر کُرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اور اپنی کھڑکی میں سے باہر کی طرف اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے کوئی خواب

دیکھا ہو مگر آج اُس کے خیالات کچھ اور ہی تھے۔ وہ نہیں تھے جن میں وہ پہلے کھوئی سی رہتی تھی۔ صبح جو واقعہ پیش آیا تھا اُسکی وجہ سے اُسکے خیالات میں ہیجان تھا۔ دل میں نئے نئے خیالات کا طوفان تھا۔ یہ خیالات بڑے عجیب و غریب تھے۔ وہ اُن سے نا آشنا تھی۔ عبادت کے دوران میں اُس نے کوشش کی تھی کہ اُس شہزادے کو وہ اُسے اپنے دل میں جا کہتی تھی، کے خیال کو دل میں نہ آنے دے مگر اس کوشش میں وہ کامیاب نہ ہوسکی۔ گرجے سے نکلنے کے بعد اُسے پھر وہ باہر نظر آیا تھا اور وہ اس کے قریب سے شرماتی ہوئی جلدی جلدی گزر گئی تھی۔ گھر آتے ہوئے چلنے میں وہ دوڑنے لگی تھی اور یہ خیال دلنشیں ہو رہا تھا کہ شہزادہ اور اس کے ساتھی اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ کھڑکی میں کھڑے ڈرتے ڈرتے اس نے جھانک کر دیکھا۔ مگر جب نیچے اُسے کوئی نظر نہ آیا تو اطمینان کے ساتھ ایک طرح کی مایوسی بھی محسوس کی۔

ماں کمرے میں آئی تو مارگریٹ سیدھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ سر جھک گیا گویا کوئی شرمناک بات اس کے چہرے پر دیکھی جا سکتی تھی۔

ماں نے محبت سے پوچھا "مارگریٹ میری بچی، تجھے کوئی دُکھ درد تو نہیں ہے؟"

اُس نے شرما کر مسکراتے ہوئے جواب دیا "اماں، کچھ عجیب خلجان سا طبیعت میں اس وقت پیدا ہو جاتا رہتا ہے۔"

"اچھا تو نیچے آ جلدی۔ تجھے گود میں لینے کے لئے ایک مرد کھڑا ہے۔"

یہ کہکر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

مارگریٹ کو دھکا سا لگا اور تعجب سے چونک پڑی۔ اُسکے ذہن میں "شہزادے" ہی کا تصور تھا اور وہ اپنی ماں کے پیچھے پیچھے لرزتی کانپتی سیڑھیوں پر سے اُترنے لگی اور سوچنے لگی کہ اگر شہزادہ ہی ہوا تو اُسے دیکھکر بھاگ جائیگی۔ جب دروازہ کھلا اور خوشی کی آواز سُن کر اپنے بھائی کو دیکھا تو ایک لمحہ کے لئے وہ بھونچکی سی ہوگئی اور تعجب سے اُسے اس طرح گھورنے لگی جیسے کسی اُمید کے یکلخت مٹ جانے پر کوئی دیکھے۔ پھر وہ خوشی سے چیختی اپنے بھائی کی طرف دوڑی۔

"ویلنٹین! میرے پیارے بھائی!"

بھائی نے بہن کو گلے لگایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بڑے سے بھورے ریچھ کی آغوش میں کوئی پھول ہے۔ پھر اپنے سے جدا کر کے ایک قدم کے فاصلے پر کھڑا کر دیا اور اُسے دیکھ دیکھکر خوش ہونے لگا اور ہنس کر بولا:-

"واللہ! تو نے وہ جادو کا سیب کھا لیا ہے جس سے حسن بڑھتا ہے۔ یاد ہے نہ تجھے وہ سیب جس کی کہانی بڑا بھیا تجھے بچپن میں سُنایا کرتا تھا۔ اماں۔ روڈا میں اس سے خوبصورت لڑکی تو کوئی اور نہ ہوگی نہیں، اب جلدی ہی اس سے شادی رچانے کے خواہشمند پیدا ہو جائیں گے۔"

مارگریٹ کا چہرہ شرم و حیا سے تمتمانے لگا۔ اتنے ہی میں اُسکے بھائی نے ایک چاندی کی زنجیر اُس کی کلائی میں ڈال دی۔ اس میں ایک ننھا سا صلیب آویزاں تھا۔ اس تحفے کو دیکھکر مارگریٹ خوشی سے چیخنے لگی:-

"بھائی آپ کس قدر مہربان ہیں۔ میں اسے ہمیشہ پہنے رہونگی اور جب آپ چلے جائیں گے تو اسے دیکھکر آپ کی یاد تازہ ہوتی رہے گی۔ بھائی ویلنٹین۔ آپ ہمارے ساتھ کتنے دنوں تک رہیئے گا؟"

"تین ہفتے۔ لیکن ننھی بہن۔ ان تین ہفتوں میں ہم خوب خوشیاں منائیں گے۔ اور ایسی خوشیاں کہ ان دنوں کو ہم ہمیشہ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔"

اس کے بعد ہی ایک حقارت آمیز قہقہے کی آواز بازار میں سُنائی دی گویا اسکے جواب ہی میں یہ قہقہہ لگایا گیا تھا۔ اور کھڑکی میں سے انہوں نے انہی دونوں نوواردوں کو جاتے دیکھا۔ یہ قہقہہ اُس نے لگایا تھا جس کا لباس سیاہ تھا۔

ویلنٹین کو گھر آئے ہوئے کوئی دو گھنٹے ہوئے ہوں گے کہ گھر کے پیچھے باغیچے کی آڑ میں فاؤسٹ اور میفسٹو کھڑے چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے۔

"اس چھوکری کو کسی بیوقوف پادری کے لئے چھوڑ۔ یہ تیرے لائق نہیں ہے۔ میں تجھ سے کہتا ہوں کہ تیرے اس جذبے کا نتیجہ بُرا نکلیگا۔"

میفسٹو فاؤسٹ کے دل میں یہ بات جما رہا تھا۔

فاؤسٹ بولا "یہ کوئی وقتی جذبہ نہیں ہے جو مجھے اُکسا رہا ہے۔ یہ محبت ہے۔ سچی محبت۔ جسے میں نے اپنی زندگی میں پہلی دفعہ اب محسوس کیا ہے۔ اس دُنیا میں مجھے سوائے مارگریٹ کے اور کچھ نہیں چاہیئے۔"

"نہیں۔ یہ نہیں۔ میں اور عورتیں تیری خواہش پوری کرنے کے لئے تلاش کر سکتا ہوں، اور وہ عورتیں اس سے کہیں زیادہ حسین، لائق اور عقلمند ہونگی۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میفسٹو اس لڑکی کی دراندازی کی وجہ سے بہت خائف تھا، گویا اُس کے ارادوں اور تدبیروں میں یہ لڑکی حائل ہو رہی تھی۔

فاؤسٹ نے کہا: "میں مارگریٹ سے محبت کرتا ہوں اور صرف مارگریٹ سے"

"جی ہاں مجھے خوب معلوم ہے" میفسٹو نے ناراضگی سے کہا۔

"مجھے بس یہی لڑکی چاہیئے۔ جو حکم میں تجھے دیتا ہوں وہ پورا کر"

"تو نے حکم دیا ہے اور وہ پورا ہوگا۔ لیکن فاؤسٹ پہلے اپنی طرف دیکھ کیونکہ یہ تیرے لئے اچھی فال نہیں ہے ..... اور لڑکی کے لئے بھی ــ"

یہ کہکر میفسٹو نے اپنے سیاہ چُغہ میں سے ایک سبز سبزی بکس نکالا اور فاؤسٹ کی طرف بڑھایا۔

"دیکھو" اتنا کہکر اُس نے اس کا کھٹکا دبایا اور ڈھکنا اُچھل کر کھل گیا۔ اُس میں ایک سونے کی زنجیر تھی، سیدھی سادی مگر بڑے نازک کام کی۔

میفسٹو بولا: "یہ سُنہری زنجیر اُسے اور تجھے وابستہ کرے گی۔ بس ایک دفعہ اس کے گلے میں یہ پڑ جائے تو پھر تم دونوں کے مقسوم اس میں مقید ہو جائیں گے"

میفسٹو نے بکس بند کر کے پھر اپنے چُغے میں رکھ لیا۔ باغیچے میں سے گزر کر گھر کی کھڑکی کے قریب پہونچا۔ پہلے اندر جھانک کر دیکھا اور پھر دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہو گیا۔ اندر آجانے کے بعد سیڑھیوں پر سے چُپکے چُپکے گزرتا ہوا مارگریٹ کے کمرے تک پہونچ گیا۔ وہاں اُسکے چھوٹے سے صاف ستھرے بچھونے کو دیکھا اور اُس کی برف جیسی چادر کو دیکھکر پیشانی پر حقارت کی شکنیں پڑ گئیں۔ اس کے قریب سے گزر کر کھڑکی کے قریب جو سنگھار میز رکھی تھی اُس کی دراز کھولی۔ اتنے میں سامنے مقدس مریم اور بچہ کا چھوٹا سا مجسمہ نظر آیا۔ میفسٹو کے چہرے پر بل پڑ گئے اور اُس نے اپنی نظریں اُدھر سے پھیر لیں اور اس طرح کترا کر پیچھے ہٹا گویا انتہائی نفرت کی وجہ سے وہ ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ پھر مجسمہ کی طرف سے پیٹھ کر لی مگر اب بھی بےچین تھا۔ جُھک کر اُس نے مارگریٹ کی خاص دراز کھولی اور اُس میں اُس بچی کی عزیز چیزیں دیکھکر ہنسا۔ ایک ایک کر کے اُس نے سب درازیں کھولیں اور بند کر دیں۔ سب سے اُوپر کی دراز میں اُس نے بکس رکھدیا اور اُسے کھُلا چھوڑ دیا۔ اس کے بعد میفسٹو وہاں سے روانہ ہوا اور چلتے چلتے مقدس مجسمہ کو ایک نظر اور دیکھا تو چہرے کے خد وخال سے شدید نفرت ٹپکنے لگی۔

وہ گھر سے باہر نکلا ہی تھا کہ مارگریٹ اُچھلتی کُودتی اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ آج اُس کے جذبات بالکل نرالے تھے۔ وہ خوش تھی لیکن طبیعت میں خلجان بھی تھا۔ بھائی کے غیر متوقع طور پر آجانے سے اور خوشیاں منانے کی جو تجویزیں کی گئی تھیں اُن کی وجہ سے وہ مسرور تھی۔ لیکن شہزادے کا خیال آتے ہی طبیعت میں انتشار پیدا ہو جاتا تھا۔ دل میں اُمنگ پیدا ہوتی مگر اس کے ساتھ ہی وہم ہو کر رہ جاتی تھی۔ ابھی باچھیں کھل رہی ہیں، ابھی مُنہ اُتر گیا۔ ابھی رُوح میں شادابی و تازگی ہے، ابھی خشکی اور پژمردگی۔

کھڑکی کے قریب وہ اپنی کُرسی پر بیٹھنے چلی کہ اُس کی نظر یکدم سے کھُلی ہوئی دراز پر پڑی۔ وہ اُسے بند کرنے کو ہوئی کہ بکس کا کنارہ نظر آیا۔ فوراً ہی اُسے باہر نکال کر تعجب سے دیکھنے لگی۔ اس کا اُسے یقین تھا کہ جب کمرے میں سے گئی تھی تو دراز بند تھی۔ شاید بھائی نے متعجب کرنے کے لئے یہ تحفہ رکھدیا ہو۔ اُس کی کچھ عادت بھی ایسی ہے۔ یا پھر خالہ مارتھا نے اُسے کا تحفہ اس طرح چُپکے سے رکھدیا ہو۔

لیکن اس خود استفساری کے دوران میں اُسے کچھ یقین سا تھا کہ ہو نہ ہو اُسکے شہزادے ہی نے اُسے یہ تحفہ بھیجا ہے گو اُسکے امکان پر غور کرنے کی اُس میں جرأت نہ تھی۔

وہ اُسے کھڑکی کے قریب لے گئی اور اُسکے نقش و نگار کو بڑھتی ہوئی دلچسپی سے دیکھنے لگی۔

ڈھکنے پر زندگی کا درخت بنایا گیا تھا اور اُس کی ذی حیات ٹہنیاں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں اور ان میں سے بن دیویوں اور بن مانسوں کے سر اس طرح نکلے ہوئے تھے جیسے جھانک رہے ہوں۔ مارگریٹ نے بکس کے وزن کا اندازہ ہاتھ سے لگایا اور اُسکے ڈھکنے کو کھولنے کی کوشش کی۔ بکس مضبوطی سے بند تھا۔ پھر یکایک اس پر خوف طاری ہو گیا اور اُس نے گھبرا کر اُسے دراز میں رکھدیا۔ اُسے اپنے گرد بدی کا اثر محسوس ہوا اور یہ بدی ایسی تھی کہ جو پُراسرار بھی تھی اور دلآویز بھی۔ مگر وہ کوشش کے باوجود اُس نامعلوم چیز کی پُراسرار دلکشی کو دور نہ کر سکی جو بکس میں بند تھی۔ اُس نے کھڑکی میں سے باہر دیکھنا شروع کیا تاکہ راہگیروں کو دیکھکر اس کا خیال بٹ جائے لیکن یہ خیال ایک لمحے کے لئے بھی اُس کے دل سے محو نہ ہوا کہ یہ تحفہ اُسی حسین نوجوان نے بھیجا ہے۔ یہاں تک کہ بازار کا منظر اُسکے لئے

بالکل بے معنی ہوگیا روشنی اور زندگی کے دھندلے منظر اس کے ذہن میں ناچنے لگے اور ان سب میں وہ اور شہزادہ ہر جگہ بجا نظر آتے تھے اور وہ مسرت انگیز خلجان جو پہلے خفیف تھا اب شدید ہوتا گیا۔ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور جسم لرز رہا تھا۔ ایک معصوم تیرہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر تھی۔

پھر وہ کپکپانے لگی اور جاگتے کے خواب سے چونکی اور پھر دراز کی طرف نظر ڈالی۔ ٹھٹکی، رکی اور ڈرتے ڈرتے اس نے بھر بکس کو اٹھالیا میز پر الٹ رکھا اور جلدی جلدی ہاتھ پھیر کر اس کھٹکے کو تلاش کرنے لگی جس سے ڈھکنا کھلتا تھا۔ ایک بن مانس کے سر پر جو انگلی کا دباؤ پڑا تو وہ اپنی جگہ سے ہٹا اور ڈھکنا اچھل کر کھل گیا۔ سنہری زنجیر اور اس کے دل کی شکل کے آویزے کو دیکھکر وہ جھجک گئی۔ اس سے پیشتر اس نے کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی تھی۔ جیسے دیکھکر خوشی سے وہ بے آپے ہوگئی ہو۔ وہ دیر تک اسے گھورتی رہی۔ سانس پھولا ہوا تھا۔ سینے پر ہاتھ بھینچے ہوئے تھے۔ خوف و مسرت سے یہ کیفیت کہ جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو۔ بڑی کوشش سے اس نے اپنا سر پھیرا اور بکس کو بند کر دیا۔ بے چین ہو کر وہ اپنے چرخے کی طرف آئی اور بے سوچے سمجھے اسے چند بار گھما۔ پھر جیسے کسی نے مجبور کیا ہو وہ دہکتے چہرے اور چمکتی آنکھوں سے دراز کے پاس گئی اور جلدی سے بکس نکال کر اسے کھولنے لگی۔

اسی وقت سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز سنائی دی۔

اس کی ماں داخل ہوئی اور مارگریٹ نے ڈرے ہوئے بچے کی طرح گھبراکر جلدی سے بکس کو دراز میں ٹھونس دیا اور تیزی سے پلٹ کر پیچھے ہاتھ کئے کھڑی ہوگئی تاکہ آنے والے کو دیکھ سکے اور دراز کو دھکیل کر بند کر دیا۔

ماں کہنے لگی "مارگریٹ۔ میری بچی۔ آج تجھے کیا ہو رہا ہے؟ صبح کو تو خوش تھی اور گا رہی تھی، لیکن اب تو خاموش ہے۔ نہ بولتی ہے نہ کھاتی ہے اور آکر اپنے کمرے میں بند ہو بیٹھی۔ چل۔ ویلنٹین ابھی اپنے دوستوں کے پاس سے واپس آتا ہوگا۔ مٹھاس اسے بچپن سے بھاتی ہے۔ چلکر ذرا اسے چکھ لے۔ آ"

"اماں۔ بھائی کے ایک دم سے آجانے کی وجہ سے طبیعت میں ہیجان ہوگیا، اور ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ اور بھی ہے۔ ذرا میں خالہ مارتھا کو جاکر دیکھ آؤں۔ جنگل کی ہوا سے طبیعت کو سکون ہو جائیگا"

اس نے رک رک کر بات پوری کی اور ماں نے پریشان ہو کر اسکی طرف دیکھا۔ پھر مسکرا کر بولی:۔

"ہاں بیٹی، خوشی سے جاؤ۔ مگر جانے سے پہلے ذرا مٹھاس چکھتی جانا۔۔"

ماں یہ کہکر چلی گئی اور جاتے ہوئے اس نے پلٹ کر مسکراتے ہوئے دیکھا مگر اس کا دل پریشان تھا۔

جب وہ چلی گئی تو مارگریٹ نے جلدی سے دراز میں سے بکس نکالا اور رومال میں لپیٹ لیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنی ماں سے کوئی بات چھپائی تھی۔ دھوکہ دینے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔

سیڑھیوں پر سے دوڑتی ہوئی وہ باغیچے میں آئی اور ڈرتے ڈرتے ایک نظر چاروں طرف ڈال کر سیب کے درخت کی ایک مڑی ہوئی ٹہنی پر بکس والا رومال رکھدیا۔ پھر وہ گھر میں واپس آگئی اور اسے چٹک لگی ہوئی تھی کہ بکس اس پراسرار طریقے پر کمرے میں آیا کیسے! اور پھر پھر کر خیال اسی نامعلوم شہزادے کی طرف جاتا تھا۔

چوتھا باب

خالہ مارتھا بیوہ تھی۔ بڑی خوش دل بیوہ۔ ٹھنگنے قد کی موٹی سی عورت اور اس کی آنکھوں میں بڑی شوخی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ پہلے زندگی بھی شوخ گزاری ہوگی۔

شہر کے عقب میں ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ اس میں وہ رہتی تھی۔ سامنے ہی تھورنگیا کے جنگل کھڑے جھومتے تھے۔ گھر کے ارد گرد بھی باغ اور پھل پھلاری تھی۔ اس کی دیکھ بھال نہیں ہوتی تھی۔ لیکن بہار کا موسم تھا۔ نئے نئے پتوں اور پھولوں کی وجہ سے تر و تازگی تھی۔

اس وقت وہ اپنے باورچی خانے میں تھی اور یہ باورچی خانہ بھی اپنی مالکہ کی خصوصیات کا آئینہ دار تھا۔ کشادہ اور ہوادار، پکا فرش، صاف ستھرا، مگر سامان پھوہڑپن سے رکھا تھا۔ ترکاریوں کے چھلکے اور ٹکڑے پڑے نظر آتے تھے۔ کانٹوں میں گوشت کی بجائے صافیاں لٹکی تھیں۔ دھلے دھلائے برتنوں کے ڈھیر صندوقوں پر لگے تھے۔

اس کے مزاج کی بے پروائی پہلی ہی نظر میں معلوم ہو جاتی تھی۔ طبیعت مہربان اور بڑی اچھی پائی تھی۔ مزاج میں آزادی اور تمسخر۔ زود اثر اور ضدی۔ اور اس سب کے ساتھ فطرت میں ہمدردی بہت تھی۔ سختیوں اور مصیبتوں کی کہانیاں سنکر دل فوراً پسیج جاتا تھا، خصوصاً ان کہانیوں کو سنکر جن میں کام دیو (کیوپڈ) کی جلوہ فرمائی ہوتی تھی۔

ایک موٹے بھدے سے لڑکے نے، جسکی عمر اٹھارہ سے کم معلوم

ہوتی تھی گو ڈیل ڈول مردوں کا سا تھا، دروازہ کھٹکھٹایا، اور منظر بن نیچی کئے کھڑا رہا۔ مارتھا نے دروازے کی طرف دیکھکر کہا: "اندر آجاؤ۔ اندر آجاؤ۔ کارل فنشلے۔ جہاں تم کھڑے ہو وہاں سے میں تمہاری آواز نہیں سن سکتی۔"

وہ کمرے میں بھدے پن سے داخل ہوا۔ کندھے چڑھا ہوا اور کچھ گھبرایا ہوا۔ مارتھا کی طرف اس نے اچٹتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور چہرے پر ایک ایسی مسکراہٹ تھی جیسے کوئی منہ چڑا رہا ہو۔

مارتھا نے کرسی کی طرف اشارہ کرکے کہا "اس پر بیٹھ جاؤ اور جو کچھ تمہیں کہنا ہو کہو۔"

وہ منظر بن جھکائے بیٹھا رہا اور اپنے خیالات ظاہر کرنے کیلئے الفاظ کی تلاش میں طرح طرح بڑبڑاتا رہا

مارتھا نے اس کی ہمت افزائی کے لئے کہا: "تھوک نگل اپنے خیالات۔ دنیا کی کوئی چیز تجھے اس وقت تک نہیں مل سکتی جبتک تو اسے خود نہ مانگے...... اور اس دنیا میں کبھی۔"

باوجود اس حوصلہ افزائی کے وہ اب بھی شرمیلے پن سے گونگا بنا رہا۔

بے صبری سے مارتھا بولی: "میں جانتی ہوں تجھے کیا کہنا ہے۔ وہی پرانا رونا کوئی لڑکی ہوگی۔ ہے نا؟"

اس نے تین چار دفعہ زور زور سے سر ہلایا۔

مارتھا نے کہا: "اور وہ تجھ سے محبت نہیں کرتی۔"

"ہاں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ نہیں۔ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی۔" اس نے بڑی مشکل سے گویا سسک کر کہا۔

مارتھا نے دلاسا دیتے ہوئے کہا: "آہ! میرے پیارے لڑکے، تیری ساری مشکلات کو ختم کرنے کے لئے میرے پاس ایک چیز ہے۔"

یہ کہکر وہ ایک کمرا لماری کے پاس گئی اور اسے کھول کر اس میں سے ایک شیشی نکالی۔ اور لاکر اس کی آنکھوں کے آگے ہلا کر بولی: "دیکھو یہ رہی۔ اس کے تین قطرے اگر تم پی لوگے تو دنیا بھر میں جس عورت کو تم چاہوگے وہ تم سے محبت کرنے لگے گی۔ ابھی پی لو۔ اسی وقت پی جاؤ۔ اس کا دل تمہاری طرف سے نرم ہو جائے گا اور تمہارا بھی۔ اس کا میں تمہیں یقین دلاتی ہوں۔"

اتنا کہکر اس نے ایک پیالے میں تھوڑا سا عرق نکالا اور لڑکے نے بڑے اشتیاق سے ایک ہی گھونٹ میں اسے اتار لیا۔

"میں تجھ سے اسکی کوئی قیمت نہیں لونگی، میرے حسین لڑکے بس صرف ایک بوسہ۔"

یہ کہکر بڑے عشوہ و انداز سے مارتھا نے اس کے گلے میں ہاتھ ڈالدیئے۔ لڑکا اس کی آغوش سے نکلنے کے لئے بھونڈے پن سے تڑپا اور باورچی خانے میں سے نکل کر بے تحاشہ بھاگا اور مارتھا اسے کھڑی نفرت سے دیکھتی رہی کہ باغ میں سے ہگ ٹگ اڑاتا چل جا رہا ہے۔ "خدا جانے کہاں جاکر دم لیا۔" مارتھا بڑبڑائی۔

"ہوں! ہوں! آجکل لوگوں کو کیا ہو گیا ہے! میرے لڑکپن کے زمانے میں اور اب میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔"

کھڑکی میں سے ایک شاداب وادی دکھائی دیتی تھی جس میں اونچے درخت کھڑے جھومتے تھے۔ یہ وادی بڑی حد تک ہموار تھی اس میں ڈھلان کم تھا۔ مارتھا نے آٹھ نو بچوں کو اس میں کھیلتے دیکھا تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ان بچوں کے قہقہوں اور خوشی کی چیخوں کی آوازیں اس کے کان میں آتی تھیں۔ پھر اس کے دیکھتے دیکھتے ان سب نے اپنا کھیل ختم کر دیا اور ڈھلان پر سے دوڑتے اور بھاگتے دکھائی دیئے۔

"مارگریٹ! مارگریٹ!"

مارگریٹ موڑ پر جلدی جلدی آ رہی تھی اور اس کی بغل میں کوئی چیز دبی تھی۔ بچے دوڑ کر اس کے قریب پہونچ گئے اور سب نے اسے گھیر کر کہنا شروع کیا۔

"مارگریٹ۔ آؤ ہمارے ساتھ کھیلو۔ ہم نے ایک نیا کھیل نکالا ہے۔"

"ابھی آتی ہوں ابھی میرے پیارو۔ لیکن پہلے مجھے اپنی خالہ سے کچھ کہنا ہے۔"

وہ باورچی خانے میں داخل ہوئی۔ دوڑ کر خالہ کے پاس گئی اسے پیار کیا۔ پھر اپنی بغل میں سے بکس والا رومال نکالا اور شرما شرما کر اسے کھولنے لگی۔ جب کھول چکی تو خوشی خوشی بولی۔

"دیکھو خالہ میری دراز میں سے مجھے کیا ملا۔"

اتنا کہکر اس نے بکس خالہ کی طرف بڑھا اور اسکا کھٹکا دبا دیا۔

اس کی خالہ نے تعجب و حیرت سے ٹھٹک کر دیکھا۔ پھر اس میں سے سونے کی زنجیر نکال کر اس پر رشک سے ہاتھ پھیرا اور مشتبہ نظروں سے مارگریٹ کی طرف دیکھا۔

"اچھا تو میری ننھی بلی۔ تیرا بھی کوئی دلدار پیدا ہو گیا!"

"نہیں نہیں خالہ! میں نے ابھی ابھی کہا تھا نہ تم سے کہ یہ میری

دراز نہیں۔ رکھا ہوا تھا یہی وجہ ہے کہ میں نے اماں سے بھی ابھی تک کوئی ذکر نہیں کیا کہ کہیں وہ بھی یہ خیال نہ کرلیں کہ میرا کوئی دلچسپیدا ہو گیا ہے۔ اور بھائی ولینٹین سے بھی نہیں کہا۔ یہ تمہارے لئے نئی خبر ہے خالہ کہ بھائی گھر آئے ہوئے ہیں۔ بڑی نانی خبر!"

"ولینٹین گھر آیا ہوا ہے! بڑی عجیب خبر ہے یہ تو!"

"ہاں۔ دیکھو یہ کلائی میں جو چاندی کی زنجیر پڑی ہے وہ میرے لئے لائے ہیں"

"بہت بھلی لگتی ہے تیرے ہاتھ میں۔ اچھا اب ذرا سونے کی زنجیر پہن کر دیکھیں۔ پہلے میں خود پہن کر دیکھتی ہوں"

خالہ مارتھا آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور زنجیر کو اپنے سینے پر مختلف زاویوں سے رکھکر دیکھا اور ملوکانہ تمکنت سے گردن میں خم ڈال ڈال کر دیکھتی رہی۔ اُدھر مارگریٹ اُس کے پیچھے کھڑی بےچینی سے پہلو بدل رہی تھی کہ خود پہن کر دیکھے خدا خدا کر کے خالہ نے زنجیر چھوڑی اور ایک آہ سرد بھر کر بولی،

"لے بچی۔ اب دیکھ تیرے گلے میں کیسی کھلتی ہے"

مارگریٹ نے بڑی پھرتی سے اُسے کپکپاتے ہاتھوں سے اپنے گلے میں پہن لیا اور سانس روک کر اپنا عکس آئینے میں دیکھا۔

"آہا۔ کیسی خوبصورت، کیسی اچھی معلوم ہوتی ہے" مارگریٹ نے ہانپ کر کہا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور خیال اس کے ذہن پر چھا گیا اور وہ یہ تھا کہ اگر شہزادہ اُس کو اسے پہنے ہوئے دیکھے تو کس قدر خوش ہو۔ مسرت کی لہر اس کے سر سے پاؤں تک تڑپتی ہوئی چلی گئی۔ یہ مسرت جسمی بھی تھی اور ذہنی بھی۔ یہ مسرت زندگی کی تھی۔ آج کا دن، یہ لمحہ کس قدر مسرت آفریں تھا۔ اس انکشاف پر کہ وہ ایک نئی مارگریٹ بن گئی ہے۔ ایک ایسی مارگریٹ جو زندگی کی آواز کا جواب دے سکتی تھی۔ جو زندگی کی آواز پر لرز جاتی تھی جیسی اس لمحے اس کی حالت تھی۔ اس میں ایک پُرزور جذبہ موجزن تھا کہ وہ اُن تاثرات کو ادا کر سکے جو اُسے کپکپا رہے تھے۔

باہر بچے گا رہے تھے اور اُسے آوازیں دے رہے تھے: "مارگریٹ! مارگریٹ!"

مارگریٹ بولی: "میں آ رہی ہوں بچو! ابھی آ رہی ہوں" اور لپک کر اُن کی طرف چلی۔ بچوں نے خوشی کی چیخوں سے اُس کا خیر مقدم کیا، اور بن دیویوں کی طرح آنکھیں چمکتی، جسم بہار کی ہوا سے ٹکراتا، سورج اور بادِ خنک کے بوسوں سے بےخبر وہ بچوں کے ساتھ وادی کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔

مارگریٹ کی نئی ہیئت کذائی کو دیکھکر مارتھا حیران ہو رہی تھی اور اسکی کایا پلٹ کا سبب معلوم کرنے کی کوشش میں منہمک تھی کہ ایک بھاری اور گہری آواز نے اُسے چونکا دیا۔

اُس نے پلٹ کر دیکھا تو دروازے میں ایک شخص کھڑا نظر آیا، جو خوش اخلاقی سے مسکرا رہا تھا۔ سر پر ایک سیاہ ٹوپی تھی اور اس میں ایک لمبا سُرخ پر لہرا رہا تھا۔ یہ شخص کمرے میں داخل ہوا۔ بھاری بھرکم آدمی تھا اور اس کا چغہ کالے رنگ کا تھا جسکے حاشیے سُرخ تھے۔ اُسنے کہا۔

"حسین خاتون مجھے معاف کیجئے گا۔ مجھے مسز مارتھا کی تلاش ہے"

اُس کے الفاظ سُن کر مارتھا کا دل اچھلنے لگا۔ غمزہ سے آنکھیں چڑھا کر بولی:۔

"میں ہی ہوں مسز مارتھا۔ گو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ میں شادی شدہ ہوں۔ میرے عزیز شوہر کا انتقال ہو چکا ہے"

"تب تو میں نہایت خوش نصیب رہا حسین ترین خاتون مسز مارتھا کیلئے میں ایک تحفہ لایا ہوں۔ تو یہ آپکے لئے ہے"

اُس نے اپنے چغہ میں سے سونے کا ایک بھاری سا ہار نکالا جو اشرفیوں کا بنا ہوا تھا۔

"لُمبارڈی میں جو آپکے بھائی ہیں یہ اُن کی طرف سے ہے" یہ کہکر اُس نے ہار اس طرح اپنے ہاتھوں میں لیا گویا مارتھا کے گلے میں پہنانا چاہتا ہے۔

اُس نے مایوسی سے نووارد کی طرف دیکھا اور بولی: "لیکن میرا تو کوئی ——"

وہ کہتے کہتے رُک گئی اور اُسکے ہاتھوں میں سے ہار جھپٹ کر آئینہ کی طرف لپکی تاکہ اُسے اپنے گلے میں پہن کر دیکھے پھر خوشی کی چیخیں مارنے کے بعد بولی:۔

"میں تو سمجھی تھی کہ اتنے سال گزر جانے پر بھلا اُس نے مجھے کیا یاد رکھا ہوگا کیسا اچھا بھائی ہے میرا کہ اپنی ننھی مارتھا کو نہ بھولا لیکن یہ تو میں بھی بھول گئی کہ میں میزبان ہوں۔ تشریف رکھیئے اور میرے ساتھ شراب پیجئے"

نووارد کے چہرے پر خوف کے آثار ظاہر ہوئے، اُس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے کہا۔

"شراب؟ میں اُسے چھوتا تک نہیں۔ لیکن اے حسین دوشیزہ

اگر تم مجھے اجازت دو تو میں اپنے پینے کی چیز خود تیار کر لوں؟"

یہ کہکر وہ الماری کی طرف بڑھا جس میں شراب اور پینے کی اور چیزیں رکھی تھیں۔ بڑی پھرتی اور احتیاط سے کئی بوتلوں میں سے اُس نے تھوڑا تھوڑا سا عرق پیالے میں نکالا اور پھر اپنا ہاتھ جام پر رکھکر اُسے خوب زور سے جھکولے دیئے اور بولا۔

"میں نے یہ فن پیڈوا میں سیکھا تھا" یہ کہکر پیالہ میز پر رکھدیا۔ وہ چمک رہا تھا اور مارتھا کا جی اسے دیکھکر للچانے لگا۔ یہاں تک کہ اُس کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہنے لگی۔

"پیڈوا کی اس عجیب وغریب چیز کو میں پینا چاہتی ہوں"

یہ کہا اور ناز و انداز سے اُسے اٹھالیا۔ مہمان نے اسے باز رکھنے کا بہانہ کیا مگر اُس نے ایک بڑا سا گھونٹ لے لیا۔ ذرا سی دیر بعد اُس نے کھانسنا اور ہانپنا شروع کیا۔ تکلیف سے اُس کی آنکھیں ابل پڑیں۔ اُسکو پیٹ میں آگ لگ رہی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ بھڑوں کا چھتہ پھٹ گیا ہے۔ نووارد اسے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

پھر مارتھا کی حالت بدلی۔ کھانسی کا دورہ ختم ہوا۔ غصہ اور ملامت کے آثار چہرے پر سے جاتے رہے اور ان کی بجائے غمزہ و سرخوشی کی علامات نمایاں ہو گئیں۔ اُس نے اپنے جسم پر ہاتھ پھیر پھیر کر سرد آہیں بھرنی شروع کیں۔ پھر وہ نووارد کی طرف جھکی اور کہنے لگی "تمہاری آنکھیں کیسی شریر ہیں"

وہ بولا "ہاں ہاں! یہ تو ہے ہی۔ لیکن اب مجھے اپنے دوست کے پاس جانا ہے۔ وہ دیکھو وہ رہا وہ" اور اسنے خیاباں کی طرف اشارہ کیا۔

مارتھا نے اُس طرف دیکھا تو اُسے ریشمانہ لباس پہنے ایک شخص نظر آیا جو ایک درخت کا سہارا لئے کھڑا تھا اسکا ایک ہاتھ سینے پر زور سے بھنچا ہوا تھا اور وہ مارگریٹ کو دیکھنے میں منہمک تھا جس کے گرد بچے اُچھل کود رہے تھے اور گا رہے تھے۔ وہ درخت کے سائے میں اس طرح کھڑا تھا کہ دیکھنے جانے والے اُسے نہ دیکھ سکیں۔

"وہ ہے میرا دوست۔ کیوں ہے نا حسین؟ وہ ایک شہزادہ ہے۔ اصل نسل شہزادہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو حسین لڑکی کھڑی ہے اُس پر عاشق ہو گیا ہے۔ اُسے اپنی دُلہن کی تلاش ہے اس لئے......"

"یہ لڑکی تو میری بھانجی ہے، اور اس سے زیادہ حسین لڑکی......"

"تمہاری بھانجی ہے؟ تب تو پیاری خاتون تم میرے دوست کی مدد کر سکتی ہو۔ شہزادہ تمہاری بھانجی سے یہاں اس طرح مل سکتا ہے کہ کوئی اور اُن کی باتوں میں دخل نہ دے"

مارتھا کے مُنہ سے صرف اتنا نکلا "شہزادہ! شہزادہ!"

"اس محبت میں مجھے صرف تمہاری امداد کی ضرورت ہے" نووارد نے کہا۔

مارتھا اُسکے ہاتھ کو سہلاتے ہوئے بولی "ہاں ہاں۔ اور تم بھی تو یہاں آیا کرو گے؟"

"ہاں۔ میں تو آتا ہی رہوں گا" اتنا بڑبڑا کر اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کمرے میں سے چلنے کو ہوا۔ پیٹھ پھیرتے ہی انتہائی نفرت سے اُس کا مُنہ بگڑ گیا اور وہ گھر سے رخصت ہوا۔

فاؤسٹ اُچھلنے کودنے والوں کا تماشہ کھڑا دیکھتا رہا۔ اپنی ساری عظیم الشان زندگی میں اُس نے ایسا متاثر کرنے والا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا طلسماتی شان و شکوہ، عیش و نشاط کی مجلسیں۔ شاہی دربار۔ ماضی کی سیر و تفریح۔ زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سحر کے زور سے جو سیاحت کی تھی، سارے حسین، حیرت خیز اور پوشیدہ مقامات جو اُس نے دیکھے تھے۔ غرض سب کچھ اس منظر کے آگے ہیچ تھا۔ یہ منظر کیا تھا پرستان کا نظارہ تھا۔ وادی میں سبز گھاس کا فرش تھا، جگہ جگہ پھولوں کی افشاں چنی ہوئی تھی۔ سفید تنوں والے اُونچے اُونچے درخت پہرہ دے رہے تھے اور بہار کی ہوا چلتی تھی تو مستوں کی طرح جھومنے لگتے تھے۔ ان کے پیچھے شاہ بلوط کے مضبوط درختوں کی فوج کھڑی تھی اور ان کی ٹہنیاں اس طرح پھیلی ہوئی تھیں گویا دیو ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں کہ خبردار کوئی نااہل اس پرستان میں داخل نہ ہونے پائے۔

چونچال بچے پھولوں کے ہار پہنے اس طرح ہنس رہے تھے جیسے چاندی کی گھنٹیاں بجتی ہوں۔ ان سب نے ہاتھ جوڑ کر مارگریٹ کو گھیرے میں لے لیا تھا اور گاتے بجاتے تھے اور چکر کاٹتے جاتے تھے۔ یہ گویا پرستان کے باشندے تھے، سیماب وش، باد پا، کہ ذرا سا اشارہ پاتے ہی درختوں کی ٹہنیوں میں روپوش ہو جائیں۔ مارگریٹ اُن کے بیچ میں سُدھ کھڑی تھی۔ آنکھیں چمک رہی تھیں اور اُن میں سے نور چھن رہا تھا۔ چہرہ خوشی اور زندگی سے تمتما رہا تھا۔ اس کا لباس ملائم اور سفید تھا جس میں سبزہ جھلک رہا تھا۔ ہوا سے اس کے کپڑے پھڑپھڑا رہے تھے اور اسکے نازک حسین جسم سے چپٹے جا رہے تھے۔ یہ گویا بن دیوی تھی جو درختوں اور پھولوں کی محافظ تھی۔

یہ سب مل کر گھیرے کا کھیل کھیل رہے تھے جو پھولوں سے کھیلا جاتا تھا اور غالباً اب سے صدیوں پہلے سے بھی یہی کھیل کسی نہ کسی شکل میں اسی وادی میں کھیلا جاتا رہا تھا۔ بچوں کے گلوں میں پھولوں کے زنجیرے پڑے

ۓ تھے اور ہاتھوں میں پھولوں کے دُنٹھل تھے۔ مارگریٹ کے دونوں ہاتھ
پھیلے ہوئے تھے اور ان پر ایک گجرا رکھا تھا تاکہ جب ناچنے والوں کا گھیرا
ٹوٹے تو جو دوسرا بادشاہ یا ملکہ بنے اُسے اس کا تاج پہنائے۔

فاؤسٹ گھگی جمائے سانس روکے اس پرستان کے منظر
و دیکھ رہا تھا تاکہ اس کے سانس سے یہ تارِ عنکبوت کی طرح ٹوٹ نہ جائے،
س کی نظر اب صرف مارگریٹ پر جمی ہوئی تھی۔ زندگی کے جتنے شُبہات
تھے اب سب فنا ہو چکے تھے۔ اُس کی رُوح اب ایک بار پھر جوان ہو گئی
تھی اور اس میں وہ تمام اُمیدیں اور آرزوئیں پیدا ہو گئی تھیں جو شباب
لطیف کے لئے مخصوص ہوتی ہیں۔ مارگریٹ کی معصومیت اس میں اس طرح
ار فرما ہو رہی تھی جیسے کوئی پاک کرنے والا شُعلہ ہو۔ وہ فاؤسٹ جسے صرف
یش و نشاط، عیاشی و اوباشی کی تلاش رہتی تھی فنا ہو رہا تھا اور اس کی
جائے ایک ایسا فاؤسٹ مُرتب ہو رہا تھا جس میں اُمید اور معصومیت
ی آرزو جاگ رہی تھی۔

بچوں نے اب گھیرے کا گیت گانا شروع کیا اور اپنے ہاتھوں
و خوب پھیلا کر گھیرا بڑا کیا اور مارگریٹ کے گرد گھومنے لگے۔ اس طرح کہ
ن سب کی نظریں اس پر لگی رہیں:۔

دولھا کے لئے اِک پھول
اِک پھول اِک پھول
دولھا کیلئے اِک پھول اور
دُلہن کے لئے اِک گجرا۔

مارگریٹ کے چہرے پر سوچ کے آثار پیدا ہو گئے۔ گویا یہ سیدھے
سادے الفاظ اُسے ایک پیغام پہونچا رہے تھے۔ ایک حوصلہ شکن آرزو
کے پورا ہونے کی اُمید دلا رہے تھے۔

کھیل کے قاعدے کے مطابق اُس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ
لئے۔ یہ گویا گھیرا ٹوٹنے کی تمہید ہوتی تھی، اب بچوں نے پھر گانا شروع کیا
ور دوسری سمت میں چکر کاٹنا شروع کیا:۔

اُوپر ڈھونڈو نیچے ڈھونڈو
اس کے سر پر تاج رکھو
تاج یہ خوشیاں لائیگا لیکن
بوسہ سے پہلے چھُو تو لو۔

تیز چیخوں کے ساتھ گھیرا ٹوٹ گیا اور سب تتر بتر ہو گئے۔ سب
یچھے بھاگ کر درختوں کے سایوں میں جا چھُپے۔ مارگریٹ ابھی تک اپنے
چہرے کو ہاتھوں سے چھُپائے کھڑی تھی۔

فاؤسٹ بے اختیاری میں آگے بڑھا اور مارگریٹ کے قریب
پہونچ گیا۔ آنکھوں میں پرستش کی چمک تھی۔ مارگریٹ کی آنکھیں بند
تھیں اور ہاتھوں میں پھولوں کا ہار لئے قہقہہ لگا کر بولی:۔

"ٹھہرو تو سہی شیطانو، آئی میں ابھی۔ دیکھنا میں اپنا تاج کسے
دیتی ہوں"

اُسکے پھیلے ہوئے ہاتھ فاؤسٹ سے ٹکرائے اور اُسنے جلدی سے
یہ کہکر اُس کا بازو پکڑ لیا کہ "میں نے تجھے پکڑ لیا۔ تو ——"

پھر اس کی یہ حالت ہوئی جیسے کسی نے اُس پر جادو کر دیا ہو۔
سر پیچھے کو جھکا ہوا، حیرت سے آنکھیں پھٹی ہوئیں اور وفورِ مسرت سے
سارے جسم میں تشنج۔ اس کی انگلیوں نے اُس ہاتھ کو آہستہ سے ٹٹول
کر دیکھا تاکہ یقین ہو جائے یہ کوئی فریب نظر یا دل کی گھبراہٹ کا نتیجہ
نہ ہو۔ اُس نے مضبوط گرم ہاتھ کو محسوس کیا، اور جب اس کا یقین ہو گیا
وہ اُسی بے مثل مرد سے لپٹ کھڑی ہے جس کے لئے اُس نے اپنی ساری
زندگی تج دی ہے اور وہ محبت نذر گزران دی ہے جس کا محرک وہ خود
ہوا تھا تو اُس کے چہرے پر گلابی رنگ چھا گیا۔ اُس کی انگلیاں رُک رُک
کر اس کے بازو پر سے پھسلیں اور اس کے ہاتھ پر آکر رکیں۔ شرما کر
اُس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا مگر اُس کے رگ و پے میں بجلی سی کوند گئی۔

فاؤسٹ نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سر نیچا کر کے
اور ایک گھُٹنا ٹکا کر ہلکی متوتر آواز میں بولا۔ "مجھے اپنا تاج دیدو"

صرف ایک لمحے کے لئے وہ ٹھٹکی۔ آہ کی طرح کی ایک آواز
اُس کے مُنہ سے کپکپاتی نکلی، اور اُس نے جُھک کر پھولوں کا تاج فاؤسٹ
کے سر پر رکھدیا۔ اس کی آنکھوں میں پورا پورا اعتماد اور انتہائی مسرت
تھی۔ فاؤسٹ نے بڑی نرمی سے اُس کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور اپنے
رُخسار سے لگا لیا۔

اب اُنہیں معلوم ہوا کہ چونچال بچے اُنہیں گھیرے ہوئے جھک
رہے ہیں۔ اُن سب نے ملکر زور زور سے گانا شروع کیا۔ اور چکر کاٹنے
لگے۔ اب اُنہوں نے اِس کھیل کے گیت کا آخری بند گایا جس میں نئے
بادشاہ یا ملکہ کو تسلیم کیا جاتا تھا۔

ایک، دو، تین۔
تم آزاد ہو۔
ایک بوسہ اُس کے لئے۔
ایک بوسہ تمہارے لئے۔

آنکھ جھپکاتے میں وہ سیدھا کھڑا ہو چکا تھا اور مارگریٹ اُسکی

آغوش میں تھی۔ اُس کی پُرشوق نظریں مارگریٹ کی آنکھوں پر جمی ہوئی تھیں اور اُن میں سے اعتماد اور معصومیت جھانک رہی تھی اور خود اس کے جذبات کا عکس بھی اُن میں نظر آ رہا تھا۔ تمام خوف، شبہ، خطرہ، مارگریٹ کے شعلۂ محبت سے جل چکا تھا۔

گرمجوشی مگر نرمی سے فاؤسٹ نے اُس کے لبوں کو چوما۔ یہ محبت کا پہلا بوسہ تھا جو اُس کے لبوں پر ثبت کیا گیا تھا۔ اس لمحہ اُسنے اپنی رُوح فاؤسٹ کے سپرد کر دی۔

پھر ہانپ کر وہ فاؤسٹ سے علیٰحدہ ہوئی۔ چہرے پر عجیب روشنی تھی۔ چھوٹتے ہی وہ وادی میں سے پھلانگیں مارتی درختوں کے سائے میں روپوش ہو گئی۔ بچے بھی منتشر ہو کر خوشی سے چیخنے لگے گویا جو کچھ ہوا تھا وہ بھی اِس کھیل کا ایک جزو ہی تھا۔

فاؤسٹ بھی اُس کے پیچھے لپکا۔ درختوں کے بیچ میں سے اُسکے سفید لباس کی جھلکیاں دکھائی دے رہی تھیں اور وہ اُڑتی چلی جا رہی تھی بالآخر درختوں کے ایک گھنے جھنڈ کے قریب فاؤسٹ نے اُسے جا لیا۔ تیز دوڑنے کی وجہ سے اس کا سانس پھول گیا تھا۔ ہانپتے ہوئے اُس نے التجا کی "مارگریٹ، مارگریٹ! تو مجھ سے کیوں بھاگ رہی ہے! تیری ہی تلاش میں تو میری ساری زندگی گزری ہے۔ اور اب جبکہ میں نے تجھے پا لیا ہے تو مجھ سے گریزاں ہے۔ ٹھہر مارگریٹ۔"

محبت کی سرخوشی نے اس کے چہرے کو نورانی بنا دیا۔ اُس کے ہاتھ خود بخود فاؤسٹ کی طرف پھیل گئے۔ رُخساروں پر آنسو ڈھلکنے لگے اور لبوں پر لفظ آتے آتے آہیں بن گئے۔ فاؤسٹ نے اُسے سینے سے لگا لیا اور ایک گرم و طویل بوسہ لبوں پر ثبت کیا۔

آہستہ سے بولا "تو میرے لئے مقدس ہے۔ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں مارگریٹ!"

پھولوں کا ہار فاؤسٹ کے ہاتھ میں اب تک تھا۔ اُسے مارگریٹ کے سر پر آراستہ کر کے بولا "دیکھو۔ میں تمہیں یہ تاج پہنا کر اپنی ملکہ بناتا ہوں۔"

اور مارگریٹ نے آہستہ سے کہا "اور تم میرے بادشاہ ہو گئے۔ میں ۔۔۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔"

یہ کہکر اپنے لرزتے ہاتھوں سے فاؤسٹ کا سر جھکایا اور اپنے سینے پر رکھکر بڑی نرمی سے اُسے پیار کیا۔ آنکھوں میں آنسو تھے اور لبوں پر مُسکراہٹ۔

فاؤسٹ نے سرگوشی کے لہجے میں کہا "اور میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ دل و جان سے محبت کرتا ہوں۔ تو کبھی سمجھ ہی نہیں سکتی کہ تو میرے لئے کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ تو میرے لئے اُمید لائی ہے اور ایک نئی زندگی کا پیغام۔ میں تیرا ہوں پیاری۔ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے تیرا۔"

پانچواں باب

رات کا وقت تھا اور دُور سے روڈا کا شہر اس طرح چمک رہا تھا گویا کوئی کھلونا ہے جس میں روشنی ہو رہی ہے۔ بازار میں بھیڑ بالکل نہیں تھی لیکن بازاروں میں سے گزرنے والے راہگیروں کو سراؤں اور شراب خانوں میں سے گانے اور زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں سُنائی دیتی تھیں۔

مارگریٹ کے گھر کے قُرب و جوار میں سناٹا تھا۔ اس کے کمرۂ خواب میں ایک مدھم روشنی نظر آ رہی تھی جو کھڑکی میں سے نکل کر تاریکی کو چیرتی ہوئی سامنے والی دیوار پر پڑ رہی تھی۔ شہر سے تھوڑے فاصلے پر سڑک کی دوسری طرف اندھیرے میں فاؤسٹ کھڑا تھا۔ انگلیوں میں اُنگلیاں پھنسی ہوئی تھیں اور پُر اشتیاق نگاہوں سے کھڑکی کی طرف تک رہا تھا اور اس سائیہ کو بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا جو کھڑکی کے باریک پردے پر متحرک نظر آ رہا تھا۔

اسی سوچ میں وہ ڈوبا ہوا تھا کہ میفسٹو کی آواز اسکے کندھے کے قریب سے سُنائی دی اور اِس آواز نے اُس کے خیالات کو درہم برہم کر دیا۔ فاؤسٹ کو اس کی آواز ایک ناگوار جھنکار معلوم ہوئی۔

"تو اب کس بات سے ڈر رہا ہے فاؤسٹ؟ وہ چھوکری خود تجھے روشنی سے آنے کی راہ دکھا رہی ہے۔"

فاؤسٹ نے غصّے سے کہا "ملعون خاموش رہ۔ یہ نورانی لڑکی اسقدر پاکیزہ ہے کہ تیرے خیالات ہی اس کو ملوث کر دینگے۔ مارگریٹ کو تو کوئی نقصان نہ پہونچا سکے گا۔"

میفسٹو ہنسا مگر اُس کے ہنسنے میں خوشی کو دخل نہ تھا اور فاؤسٹ کو تیکھی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ پھر بولا "میں اِس چھوکری کو نقصان نہیں پہونچاؤں گا۔ وہ تیرے ہاتھوں میں ہے۔ لیکن تو بڑا سست چاہنے والا ہے فاؤسٹ، تو تو بہت جلد باز اور ۔۔۔ دل پھینک تھا۔ تین دن سے تو اِس چھوکری کو جانتا ہے۔ اُسکی خالہ کے ہاں اُس سے اظہارِ محبت کر چکا ہے اور اب بھی تکے ہی جاتا ہے۔"

فاؤسٹ نے غصہ سے پلٹ کر کہا "مارگریٹ میرے لئے مقدس ہے اسکی معصومیت حصولِ سکون کا ذریعہ ہے۔ اپنی بدگوئی کو ختم کر مارگریٹ میری دلہن بنے گی"

"اوہو! اچھا! کیا تو گرجے میں داخل ہوسکتا ہے؟ جب پادری تیرے آگے صلیب لائے گا تو کیا تو اس کی تاب لاسکے گا؟ کیا جتنی بھی دعائیں دے گا اور جتنی بھی مقدس تک بک وہ کرے گا اُس کے آگے سر تسلیم خم کر سکے گا اور اسکی دعائیں قبول کر سکیگا؟ تو کچھ نہیں کر سکتا اور معلوم بھی ہے کہ کب سے نہیں کر سکتا!"

فاؤسٹ نے شکستہ خاطری سے کہا "او میفسٹو تو نے کس بُری طرح مجھے اپنے جال میں پھانسا ہے! تیرے سارے تحفے اور عطیے میرے لئے عذاب بن گئے۔ تیرا دیا ہوا جوانی کا تحفہ! ملعون جوانی!"

فاؤسٹ کے یہ الفاظ درد وکرب کی چیخیں معلوم ہوتے تھے اس نے ایک گہری سرد آہ بھری اور اس میں ناامیدی و نامرادی اور روحانی صعوبت تھا۔

"لیکن میں پھر مارگریٹ سے پھر ملونگا۔ میں اُسکے حیات بخش چہرے کو ایک دفعہ پھر دیکھونگا۔ شاید آخری بار۔ میں اُسے دیکھوں گا۔ ضرور دیکھوں گا"

میفسٹو نے طنز سے تعظیماً جھک کر کہا "جیسی رائے عالی ہو۔ اور اس اثنا میں میں اُس کے بھائی کو لگائے رہونگا" یہ کہکر وہ رخصت ہوا۔

فاؤسٹ آہستہ آہستہ سڑک پر سے گزرا اور اُس کی کھڑکی کو دیکھتا گیا۔ وہ سرد آہیں بھر رہا تھا اور ہاتھ مل رہا تھا، ناامیدی و مایوسی سے بھی اور آرزو و پرستش سے بھی۔

مارگریٹ کا سایہ پھر نظر آیا اور اب کے ذرا زیادہ واضح تھا۔ پھر پردہ ہٹا اور مارگریٹ نے جھانک کر باہر دیکھا۔ اُس نے لمبے لمبے سانس لئے اور ستاروں کی طرف خوابناک آنکھوں سے دیکھا۔

تھوڑے سے تذبذب کے بعد فاؤسٹ چڑھ کر کنگنی پر پہونچ گیا۔ اُس نے اپنا سانس تک روک رکھا تھا۔ مدھم روشنی میں وہ فرشتہ کی طرح کھڑی تھی اور فاؤسٹ دل ہی دل میں اُس کی پرستش کر رہا تھا۔ مارگریٹ نے خوشی کا ایک لمبا سانس لیا اور پھر کھڑکی بند کرنے کو ہوئی۔

پھر ایک ہاتھ روشنی میں نمودار ہوا اور محبت سے اُس کے ہاتھ پر رکھا گیا۔ اور اُس نے اپنے محبوب کی ہلکی مؤثر آواز سُنی جس میں شیریں الفاظ ادا ہو رہے تھے۔ تاریکی میں سے یکایک ہاتھ کے نکل آنے سے وہ ڈری نہیں کیونکہ اس کے خیالات کے سلسلہ کی ایک کڑی یہ ہاتھ بھی بن گیا۔ وہ اپنے عاشق کے خیال میں غرق تھی اور آنکھیں بند کئے وادی کا منظر دوبارہ دیکھ رہی تھی اور یہ منظر وہ تھا جب وہ اپنے آپ کو چھڑا کر بھاگی تھی اور اُس کے عاشق نے اُسے پکڑ لیا تھا۔ اور اسکے بعد خالہ مارتھا کے باغ میں جو ملاقاتیں ہوئی تھیں اُن کی یاد تازہ کر رہی تھی۔ جب اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو منظر اپنے ہی ہاتھ پر پڑی اور اُس کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ اس ہاتھ کو اپنے محبوب کی خاطر چوم لے۔ اُس نے کہا تھا "پیارے ہاتھ۔ خوبصورت ہاتھ" چند گھنٹے پہلے اُس نے اسے چوم کر یہ الفاظ کہے تھے۔ "وہ ہاتھ جو مایوسی کے تاریک سائے میں سے مجھے نکال کر اُمید کی روشنی میں لایا ہے" اس کے بعد ایک سچ مچ کا ہاتھ، خود اس کے محبوب کا ہاتھ اُس کے ہاتھ کو محبت سے تھامے ہوا تھا اور وہ اُس کی پُرشوق آنکھوں میں آنکھیں ڈال رہی تھی۔۔۔

فاؤسٹ نے کہا "میری پیاری۔ تیری آنکھوں کی برکت حاصل کرنے کے لئے میں نے کیسی کیسی آرزو کی ہے!"

اُسنے مارگریٹ کی اُنگلیوں کو چوما۔

سینے پر ایک ہاتھ رکھے مارگریٹ نے آہستہ سے کہا "آہ۔ فاؤسٹ! پیارے فاؤسٹ! میرا دل تمہاری طرف کیسا کھنچ رہا ہے! تم بولتے ہو تو جواب میں میرا دل گاتا ہے۔ تم اس پر سانس لیتے ہو تو یہ دھڑکنے لگتا ہے۔ تم پیار کرتے ہو یہ پگھل جاتا ہے اور میں نیم جان ہو جاتی ہوں۔ تم میرے دل کو اپنے ہاتھوں سے گرما دیتے ہو۔ یہ اب ہمیشہ تمہارے قبضے میں رہے گا"

فاؤسٹ نے اُس کی ہتھیلی کو چوما اور سچے دل سے بولا "اور اس ننھے سے ہاتھ میں فاؤسٹ کی جان ہے"

ایک چھوٹا سا سانس لیکر اُس نے اپنا ہاتھ بادلِ ناخواستہ کھینچ لیا اور فاؤسٹ کو خواب آلود آنکھوں سے دیکھا۔ مارگریٹ کا چہرہ زرد تھا اور سینے میں جذبات کا تلاطم تھا۔ اُس نے ملائمت سے کھڑکی بھیڑنی شروع کی اور آہ بھر کر بولی "شب بخیر پیارے، خدا حافظ" اور اُس کے کپکپاتے ہاتھ سے اشارہ مل رہا تھا کہ وہ اب چلا جائے۔

پھر فاؤسٹ کے دل میں یہ خوفناک خیال آیا کہ آئندہ وہ اپنی محبوبہ کو کبھی نہ دیکھ سکے گا۔ چند لمحوں بعد جب یہ کھڑکی بند ہو جائے گی

توستاروں کی روشنی اور نوزائیدہ اُمیدیں اُس کی رُوح میں مُرجھا جائینگی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غارت ہو جائینگی۔ اپنی محبوبہ کی آواز اُسے ایک بار پھر سُننی تھی اور آخری دفعہ اُسے بوسہ دینا تھا تاکہ اَبَدی محبت کی مُہر اُس کے لبوں پر لگ جائے۔

"مارگریٹ! مارگریٹ! ٹھہرو مارگریٹ!"

فاؤسٹ نے اس طرح یہ الفاظ کہے کہ اُس کی ماں کے کانوں تک ان کی آواز نہ پہونچنے پائے۔ کھڑکی سے لگ کر اس طرح التجا کی اور بڑی آہستگی سے کھڑکی کو دھکیلا۔ اس کے اور مارگریٹ کے ہاتھوں کے درمیان صرف شیشہ حائل تھا۔ اس کے دباؤ سے کھڑکی آہستہ آہستہ کھلنے لگی اور پھر ایک دم سے کھل گئی۔

فاؤسٹ نے پُرجذبہ آواز میں کہا "مارگریٹ جانے سے پہلے صرف ایک بوسہ!"

مارگریٹ نے اپنا ہاتھ اس طرح پھیلایا گویا وہ اُسکو منع کرنا چاہتی تھی۔ فاؤسٹ کی استدعا دل میں اتر جانے والی تھی، چہرے پر التجا، آنکھوں میں جذبات کی چمک تھی۔ اُس نے مارگریٹ کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے اپنی طرف کھینچا۔

فاؤسٹ کی التجا ہزار زبانوں سے طالب رحم تھی۔ مارگریٹ میں انکار کی طاقت نہ رہی۔ وہ فاؤسٹ کے آغوش میں جذب ہو گئی۔ آنکھیں بند، سانس رُکا ہوا، سرخوشی سے نیم غشی کی حالت تھی۔

فاؤسٹ بولا "خدا حافظ پیاری۔ اللہ تجھے معصوم اور تیرے دامن کو پاک رکھے!"

وہ اُسے اپنے سینے سے لگائے رہا اور پیار کیا۔ اور اس ایک بوسے میں محبت، مایوسی اور پرستش سب ہی کچھ تھا۔ مارگریٹ بے اختیاری میں اُس سے چمٹی ہوئی تھی۔ اب اُس کی گرفت ہلکی پڑتی گئی یہانتک کہ فاؤسٹ کے بازوؤں میں بیدم سی ہو کر پڑ گئی۔ چہرہ زرد اور بے جان معلوم ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس آخری بوسے میں اُس نے اپنی ساری زندگی دیدی تھی، پھر اس پر بیہوشی چھا گئی تھی۔

فاؤسٹ اس کی اس حالت سے گھبرا سا گیا۔ کھڑکی میں سے کمرے میں داخل ہو کر وہ اُسے اُٹھا کر اس کے معصوم بچھونے کی طرف لے چلا اور اُس پر لٹا دیا۔ جلدی سے پانی لایا اور اس کی پیشانی پر چھینٹا دیا۔ سر اور ماتھے پر ہاتھ پھیر پھیر کر طرح طرح کی باتیں کہنے لگا۔ اور اس کی رُوح میں ایک طرح کی ویرانی سی چھائی جاتی تھی۔ ذرا جان میں جان آئی۔ مارگریٹ کے ہونٹ تھرتھرائے۔ لب ہلے۔ زرد چہرے پر سُرخی کی جھلک دکھائی دی۔ فاؤسٹ کے دل پر جو بوجھ تھا کم ہو گیا۔ مارگریٹ نے آنکھیں کھول دیں۔ اور اُس کی طرف اپنے ہاتھ پھیلا دیئے۔

گھر کے باہر میفسٹو کھڑا کھڑکی کی طرف خوش ہو ہو کر تک رہا تھا۔

فضا بالکل خاموش تھی اور اس میں صرف اُن خوابناک آوازوں کی دھیمی بھن بھناہٹ سُنائی دے رہی تھی جو کمرے کی کھڑکی میں سے آ رہی تھی۔

اس کے بعد کھڑکی بند ہو گئی اور پردہ کھینچ گیا، اور وہ ہلکی روشنی بھی جو سامنے والی دیوار پر پڑ رہی تھی یکایک معدوم ہو گئی۔

میفسٹو کبھی بیکار نہیں رہتا تھا۔ اور فاؤسٹ سے جدا ہونے کے وقت سے ابتک تو بہت مصروف رہا تھا۔ شہر کے وسط میں اداسٹرنج کا شراب خانہ تھا۔ اُس نے اس شراب اور موسیقی کے مرکز کا رُخ کیا۔ وہ اس طرح چل رہا تھا جیسے کوئی دھاڑی شرابی جھوم کر چلے اور آپ ہی آپ کہتا جا رہا تھا۔

"بس ایک کڑی اور رہ گئی ہے۔ پھر وہ زنجیر پوری ہو جائیگی جو اُس کی رُوح کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تاریکی سے جکڑ دے گی۔" پھر نہایت نفرت وحقارت سے کہنے لگا "پھر تو فرشتہ اعظم میکائیل بھی اس زنجیر کو اپنی آتشیں تلوار سے نہ کاٹ سکے گا۔ اس کے بعد اُسے اس شہر سے نکال لے جانا ہے اور اس ملعون چھوکری سے علیحدہ کرنا ہے۔ فاؤسٹ میں جو نیکی کا عنصر ہے وہ کچلا جا چکا ہوگا۔ اس طرح میں نور کی قوتوں سے اپنی شرط جیت جاؤں گا۔"

اداسٹرنج کا شراب خانہ دُور دُور مشہور تھا اور لوگ جوق در جوق وہاں آتے تھے۔ وہ مسافر جو عُمدہ شراب، گندے اور فحش گیت پسند کرتے تھے اور جنہیں لڑنا جھگڑنا اور مار پیٹ ناپسند نہیں ہوتی تھی وہ شہر سے رُخصت ہونے سے پہلے اس شراب خانے میں ضرور آتے تھے۔ طالب علم بھی یہاں آتے تھے، اور فوجی اور گالی گلوچ کے عادی کام پیشہ لوگ یہاں جمع ہوتے تھے اور شراب خوری کی مقدار کے لحاظ سے ایک دوسرے کو سند دیتے تھے۔ یہ شراب خانہ دراصل ایک اُونچی چھت کا تہ خانہ تھا اور دیواروں کے سہارے سہارے شراب کے اُونچے اُونچے پیپے رکھے تھے۔ ان میں سے بعض تو بارہ بارہ فٹ اُونچے تھے۔ خالی پیپے میزوں کا کام دیتے تھے اور بھدّے اسٹول یا بے ڈول لکڑی کی نشستیں بیٹھنے کے کام آتی تھیں، گو یہاں کے اکثر آنے والے اسے زیادہ پسند کرتے تھے کہ پیپوں سے کمر لگا کر زمین پر

دراز ہوجائیں اور پاؤں ان اسٹولوں یا کرسیوں پر رکھ لیں۔ اِسی حالت میں گھٹنوں پر کہنیاں ٹکائے یہ لوگ رائے زنی کرتے تھے، اور بحثیں کرتے تھے فلسفے پر، سیاسیات پر، مذہبیات اور دُنیا بھر کے علوم و فنون پر، یا پھر مسافروں کو قصے کہانیاں سُنایا کرتے تھے۔ اپنے عشق و محبت کے معرکے بیان کرتے، آوازے کستے، فحش مذاق کرتے یا بدگوئی میں لگے رہتے۔ کبھی کبھی ان میں سے کوئی گانے لگتا اور باقی سب بھی خواہ مخواہ اُسے پسند کرتے اور سبکے سب ملکر اسکی ٹیپ اُٹھاتے تو گویا قیامت کا شور مچ جاتا جو دُور دُور تک گونجتا سُنائی دیتا۔

میفسٹو یہاں عین اُس وقت داخل ہوا جب ایک طالب علم پیپے پر کھڑا اپنا فضول گیت ختم کر رہا تھا۔ یہ گویا اپنے ہی ساتھیوں میں سے ایک پر طعن تھا میفسٹو کے کان میں اسکے آخری الفاظ پڑے۔

"نصف شب کو آہستہ سے کُنڈی کھول
تیرا عاشق جاگ رہا ہے کُنڈی کھول،
صبح ہوتے آہستہ سے کرنے بند؟"

گیت ختم ہوا تو قہقہوں کا شور بپا ہوا۔ ایک دیوزاد فوجی نے ٹھٹھا مار کر کہا۔

"ہا۔ ہا۔ ہا۔ خوب ہاتھ مارا۔ خوب ہاتھ مارا فروش! یہ تجھ پہ ہوا سیبل۔ اچھا تو یہ تُو تھا سیبل کہ رات بھر باہر باغ میں کھڑا رہا، اور وہ بڈھا ڈریسل اندر اُس کے ساتھ مزے اُڑاتا رہا۔ اور پھر تیرے ہی پیپے سے۔ ہو! ہو! ہو!"

سیبل ایک مرجھوڑا سا طالب علم تھا۔ غمناک چہرے میں عاشقانہ طبیعت پوشیدہ رکھتا تھا۔ فوجی سے کہنے لگا "آہ ولنٹین! بعض پیدا ہی دولتمند ہوتے ہیں کہ اُن سے دولت چھین لی جاتی ہے۔ لیکن خدا اِن سب عورتوں کو غارت کرے۔ مردوں کیلئے یہ ایک عذاب ہیں۔ علاوہ تمہاری خوبصورت بہن مارگریٹ کے"

اتنے میں گانے کی ایک گرجدار آواز سُنائی دی۔ یہ کسی سلیقے سے گانے والے کی آواز تھی۔ گہری اور مُتاثر کرنے والی۔ چھت سے ٹکراکر یہ آواز گونجنے لگی اور خالی پیپوں میں اِس کا ارتعاش ہونے لگا۔ سبنے پلٹ کر گانے والے کی طرف دیکھا۔ یہ ایک زبردست ہاتھ پاؤں کا مرد تھا۔ جسم پر ایک لمبا سیاہ چغہ تھا اور سر پر سیاہ ٹوپی میں ایک لمبا سُرخ پر لہرا رہا تھا۔ شراب کے سبسے اُونچے پیپے پر کھڑا تھا اور اس کا پَر چھت سے ٹکرا رہا تھا۔ یہ ایک مذاقیہ گیت گا رہا تھا اور جب کوئی بند ختم ہوتا تھا تو سارے مجمع کے قہقہے سُنائی دیتے تھے۔ یہ ایک بیانیہ گیت تھا جس میں ایک مضحکہ خیز مکھی کی کہانی سُنائی گئی تھی کہ اِس مکھی پر کوئی بادشاہ مہربان ہوگیا اور وہ شاہی لباس زیب تن کرکے دربار میں جایا کرتی تھی۔ اور پھر اِس مکھی کے وہ کارنامے بیان کئے گئے تھے جو شاہی بیگمات کے ساتھ اُسے پیش آئے تھے۔ جب اُس کی ٹیپ آئی تو سبنے مل کر بڑی خوش دِلی سے اُسے اُٹھایا۔

"اور جب وہ ہم کو کاٹتی ہیں
ہم انکو اُڑاتے، مارتے ہیں"

گیت ختم ہوا اور ابھی اُس کی گونج باقی تھی کہ تحسین و آفریں کے نعروں کا ایک طوفان برپا ہوگیا اور سارا شراب خانہ گونج اُٹھا۔

گانے والے نے اُسی بلندی پر سے جھک کر نیچے دیکھا اور اسکے ہاتھ میں جو شراب کا پیالہ تھا بڑھا کر بولا "کاش ایسی مکھی روڈا میں کبھی نہ آئے ورنہ جو لڑکیاں میں نے اس شہر میں دیکھی ہیں ان کے لئے غم کرنیکا زمانہ آجائے گا۔"

اتنا کہکر وہ چُپکا ہوا اور جس طرح کوئی کسی کا جامِ صحت پیتا ہو اپنا پیالہ اُٹھا کر بولا "روڈا کی سب سے حسین لڑکی کے لئے"

سبنے ملکر خوشی خوشی جامِ صحت نوش کیا اور سیبل نے ولنٹین سے کہا "لو بیٹو تمہاری بہن مارگریٹ ہی ہا ہوئی۔"

اور بہت سی آوازوں نے اس رائے پر صاد کیا "ہاں۔ یہ تو ہے ہی"

پھر ایک شور اُٹھا "مارگریٹ کا جامِ صحت۔ مارگریٹ کا جامِ صحت"

گانے والے نے وہیں سے چیخ کر کہا "تو مارگریٹ کا جامِ صحت۔ اور اُن سب لڑکیوں کا جامِ صحت میں پیتا ہوں جو عشاق کو قبول کرتی ہیں۔ کیونکہ نیکی اور حسن کا میل مشکل ہے۔ مارگریٹ اور اس کے سب عزیزوں کا جامِ صحت"

تھوڑی دیر تک ولنٹین کی موٹی عقل میں اِس بولنے والے کا مقصد نہ آیا۔ پھر غصہ کی خوفناک چنگھاڑ کے ساتھ اُس نے اپنے قریب والوں کو اِس طرح ہٹا دیا گویا وہ سب بچے تھے اور اپنی لمبی تلوار سونت کر اُس شخص کی طرف جھپٹا جس نے اِس بے رحمی سے اس کی عزیز بہن کی معصومیت پر حملہ کیا تھا۔ اُچھل کر وہ چند اُونچے پیپوں پر پہونچا اور وہاں سے اُوپر چھلانگ لگانے کے لئے تیار ہوا۔ تلوار تلی ہوئی تھی کہ اُچھلتے ہی بھرپور ہاتھ بھی پڑ جائے۔ للکار کر بولا "شیطان!"

"شیطان؟ یہ تو مجھے کہتا ہے۔ اور میں تجھے کہتا ہوں بیوقوف، میں نے تو سچی بات کہی تھی۔ جلدی کر بیوقوف —— کہیں ایسا نہ ہو کہ اُسکا

عاشق کمرے میں سے ٹشک جائے۔"

اتنا کہکر میفسٹو کرخت آواز کی ہنسی ہنسا جس میں خوشی کا شائبہ تک نہ تھا۔

ویلنٹین دیکا، ارزن تولا اور اُس کے زبردست مضبوط جسم کی پھلیاں اُبھری ہوئی ایسی معلوم ہوتیں تھیں کہ جیسے کوئی پتھر کا عظیم الشان مجسمہ کھڑا ہو۔ چہرے کے پٹھے کھنچے ہوئے تھے۔ اُس کی آنکھیں سمجکر چھوٹی ہوگئی تھیں اور مُنہ سے خونخواری ہُویدا تھی۔ اُس نے چھلانگ لگائی تلوار آگے جھکی اور بایاں ہاتھ پیچھے اُٹھا۔

میفسٹو نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"ایک اور اُچھلنے والی مکھی۔ بے ڈنک کی مکھی۔ خون کی پیاسی مکھی لے یہ رہا تون بترے لئے۔"

ویلنٹین ابھی ہوا میں مُعلق ہی تھا کہ میفسٹو نے اس پر اپنا پیالہ اُلٹ دیا۔

ایسا معلوم ہوا کہ ویلنٹین گویا کسی ربڑ کی دیوار سے ٹکرایا جو اُس کے اور اُس کے حریف کے درمیان حائل تھی۔ اس کے سر نے اس طرح جھٹکا کھایا جیسے کسی نے اُس پر ضرب لگائی ہو اور اس کی تلوار اور ہاتھ پاؤں اس منظر نہ آنے والی دیوار سے ٹکراکر پھیل گئے۔ پھر سُرخ شراب اُس پر گری اور فوراً ہی ایک شعلے نے اُسے ملفوف کر لیا اور اُس کی لپٹ چھت تک پہونچ رہی تھی۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں اور ایک چٹاخہ ایسا سُنائی دیا کہ ان کے کان بھی کچھ دیر کے لئے گنگ ہوگئے۔

ویلنٹین اس طرح گرا جیسے مٹر کا دانہ۔ دیوار سے ٹکراکر اُچٹتا ہے۔ تھوڑی دیر تک سب حواس باختہ رہے۔ گرے ہوئے فوجی کے گرد ڈرے ہوئے لوگوں کی بھیڑ لگنی شروع ہوئی۔ اتنے میں ویلنٹین اُٹھ بیٹھا اور چاروں طرف تعجب سے دیکھنے لگا۔ اُس کی نظروں کے سامنے وہ اُونچا سا پیالہ تھا۔ زور سے چیختا ہوا وہ اُچھل کر اُٹھا لیکن اُس کے غصّے کا شکار غائب ہو چکا تھا۔

مارگریٹ کے کمرۂ خواب کی روشنی گُل ہو جانے کے بہت دیر بعد تک میفسٹو اُس کی کھڑکی کو کھڑا تکتا رہا۔ بازار کے دوسرے سرے پر اُس نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سُنی۔ باغ میں سے گزرتا ہوا وہ لپک کر گھر کی پُشت پر آیا۔ نیچے کے کمرے میں ماں سوتی تھی۔ اُس نے اپنے ہاتھ کھڑکی کے واسے پر رکھے۔ پھر آگے جُھک کر اُس نے بڑے زور کی پھونک ماری۔

کھڑکی کے پٹ زور سے کھلے اور کمرے میں آندھی کا فراٹا گونجنے لگا۔ اُس نے پھر ایک پھونک ماری۔ پردہ پھٹ کر نیچے گر گیا اور پلنگ کے پردے پھٹ پھٹ کر لٹک گئے۔ بڑھیا ماں گھبراکر اُٹھ بیٹھی اور گرتی پڑتی کھڑکی کے قریب پہونچی کہ ایکا ایکی جو آندھی اُٹھی ہے اُسے کھڑکی بند کر کے کمرے میں گھسنے سے روکے، لیکن جونہی وہ کھڑکی کے سامنے پہونچی ایک اور جھونکا کمرے میں گھسا اور دروازہ بھی کھل گیا۔ وہ پلٹ کر دروازے کی طرف دوڑی تاکہ اُسے بند کرے مگر کھلے ہوئے دروازے میں سے وہ اس طرح اُڑی چلی گئی جیسے کوئی کاغذ کا پُرزہ ہو۔

برآمدے میں آندھی کا زور ذرا کم تھا۔ یہاں ذرا سی دیر کھڑی ہانپتی رہی۔ پھر کپکپاتے ہاتھوں سے چقماق ڈھونڈا اور تیل میں بھیگی ہوئی چھوٹی سی مشعل روشن کی۔ اسے ہوا سے بچاتی ہوئی سیڑھیوں پر چڑھی تاکہ بیٹی کے کمرے میں پہونچے۔ دروازے پر کھٹکا ٹٹولا اور جلدی سے اُسے گھماکر کمرے میں داخل ہوئی اور اطمینان کا سانس لیا۔

تھوڑی دیر تک وہ مارگریٹ کے پلنگ کی طرف حیرت و پریشانی سے دیکھتی رہی۔ سامنے مارگریٹ کا زرد اور رحم طلب چہرہ نظر آرہا تھا۔ وہ اُٹھی بیٹھی تھی اور اُس کے قریب ایک نوجوان لیٹا ہوا تھا۔ پھر بڑھیا کے ہاتھ سے مشعل چھوٹ گئی۔ رونے کی ایک گھٹی ہوئی چیخ سُنائی دی اور اس کے بعد رونے کی طویل سسکی۔ یہ ایسی آواز تھی جیسے کسی کی رُوح رو رہی ہو۔ کوئی تباہ و برباد ہو گیا ہو، اُجڑ گیا ہو۔ وہ لڑکھڑا کر واپس چلی، گری اور اس کا سر برآمدے کی دیوار سے ٹکرایا۔

مارگریٹ نے ایک چیخ ماری اور جلدی سے اپنی ماں کے قریب پہونچکر اُس کا سر اُٹھایا۔ فاؤسٹ کمرے کے بیچ میں کھڑا تھا اور اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا۔ چشم زدن میں وہ فردوس کی نغمہ زا بلندیوں سے جہنم کی انتہاہ گہرائیوں میں پھینک دیا گیا تھا۔ اُس کے کان میں ایک تحکم آمیز آواز آئی:۔

"بھاگ بھاگ فاؤسٹ جلدی بھاگ۔ تیری محبوبہ مارگریٹ کیلئے خطرہ ہے۔ اس کا بھائی نیچے آپہونچا ہے۔ بھاگ۔"

فاؤسٹ ایک لمحہ کے لئے مذبذب ہوا۔ پھر برآمدے میں سے ہوتا ہوا بھاگا اور سیڑھیوں پر سے اُتر کر باغیچہ میں آیا۔ ٹوپی غائب تھی اور چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

اُس نے ایک بھیانک للکار سُنی اور پلٹ کر جو دیکھا تو نکڑ پر سے ایک خوفناک دیوزاد انسان اس پر جھپٹتا ہوا نظر آیا۔ یہ ویلنٹین تھا

جو تلوار سونتے اُسکی طرف لپکا تھا۔ چہرے پر صرف ایک جذبہ تھا اور یہ جذبہ تھا قتل کا۔ فاؤسٹ نے پھرتی سے اپنی تلوار کھینچی اور ویلنٹین کا وار اُسکے پہلے وار کو رد کیا۔ اور بولا "ٹھیرو۔ میں تم سے نہیں لڑونگا۔ تم مجھے زخمی نہیں کر سکتے اور میں تمہیں نقصان نہیں پہونچاؤنگا۔"

"اپنے چُپ رہ .... مجھے نقصان پہونچائے گا! لے یہ رہا زہر تیرے لئے۔"

بیل کی طرح ڈکرا کر ویلنٹین نے کہا اور جھونکنے کا ایک زبردست ہاتھ دیا۔ فاؤسٹ اسے پھر بچا گیا۔ لیکن اس میں اسقدر شدت تھی کہ اُسے پیچھے ہٹنا پڑا۔ ویلنٹین کی تلوار اس کے دل کے آس پاس تڑپ رہی تھی۔ فاؤسٹ کلائی کی ہوشیار جنبشوں سے اپنی تلوار سے اس طرح بچاؤ کر رہا تھا کہ ویلنٹین کی تلوار کبھی تو اس کے سر کے قریب سے اور کبھی ران کے قریب سے بال بال بچ جاتی تھی۔ لیکن ویلنٹین کی بھاری ضربیں روکتے روکتے وہ تھک چلا تھا۔ ویلنٹین کی ہر ضرب رد کرنے کے بعد فاؤسٹ کے لئے موقع ہوتا تھا کہ اپنے حریف کے کوئی مُہلک زخم لگائے مگر اِس کا اُس نے ارادہ ہی نہیں کیا۔ یکایک ویلنٹین پیچھے کی طرف اُچھلا اور پھر ایک دم سے آگے چھلانگ لگا کر آیا اور زمین پر اس طرح گرا جیسے کسی کا پاؤں پھسل جائے۔ سیدھا پاؤں آگے کو پھیلا ہوا تھا گھٹنا خمیدہ تھا۔ بایاں پاؤں پیچھے سیدھا پھیلا ہوا تھا اور بایاں ہاتھ زمین پر ٹیکا ہوا تھا۔ اس حرکت کے ساتھ ہی فاؤسٹ کے گلے کی طرف تلوار کا وار کیا۔ یہ پینترا ایسا تھا کہ جو شاذ و نادر ہی کسی کو آتا تھا۔ ویلنٹین نے ایک ہسپانوی تلوار باز سے یہ داؤ سیکھا تھا۔ اس میں درمیانی فاصلہ بہت کم رہ جاتا تھا اور اِس کا توڑ صرف اسی وقت ممکن تھا جب حریف پہلے ہی سے اس کے لئے تیار ہو۔ فاؤسٹ نے بڑی پھرتی سے پیچھے اُچھل کر اِس وار کی تندی کو کم کیا لیکن بچتے بچتے بھی اسکی ٹھوڑی کے نیچے ایک خاصا لمبا زخم پڑ گیا۔ ایسے خوفناک تلوار باز سے محض بچاؤ کرتے رہنا خطرہ سے خالی نہیں تھا۔ فاؤسٹ نے بھی وار پر وار کرنا شروع کیا تاکہ ویلنٹین کو تھکا دے یا اُس کے ہاتھ سے تلوار گرا دے۔

"مار۔ مار فاؤسٹ۔ مار"

اُسے میفسٹو کی آواز سنائی دی۔ اور ویلنٹین کے پیچھے وہ اس طرح کھڑا نظر آیا کہ چہرے سے بدی اور خونخواری ٹپک رہی تھی۔ فاؤسٹ کے حملوں نے ویلنٹین کو پیچھے ہٹانا شروع کیا۔

فاؤسٹ نے چیخ کر کہا "اپنی تلوار روکو۔ میں تمہارا خون نہیں بہاؤں گا"

میفسٹو نے پھر آواز دی "مار فاؤسٹ۔ مار"

یہ کہکر اُس نے اپنی تلوار کھینچی۔ اس کا سرا پکڑ کر کمان کی صورت میں اُسے خم دیا اور اس طرح مسکرا کر جیسے کوئی منہ چڑاتا ہو اور نہایت بے توجہی سے تلوار سیدھی کر ویلنٹین کی پیٹھ میں گھونپ دی۔

ویلنٹین گر پڑا اور میفسٹو جلدی سے اُس پر جھک کر کھڑا ہو گیا اور بولا:-

"بھاگ فاؤسٹ، بھاگ۔ تُو نے اُسے مار ڈالا۔ جلدی گشت والے اب آتے ہی ہونگے!"

لیکن فاؤسٹ بھونچکا کھڑا تھا۔ کبھی گھبرا کر اپنے چاروں طرف دیکھتا تھا، کبھی اپنے قدموں میں ویلنٹین کو پڑے دیکھتا تھا اور کبھی اُس مدھم روشنی کی طرف جو مکان میں دکھائی دے رہی تھی۔

میفسٹو نے ایک نظر فاؤسٹ کی طرف دیکھا۔ پھر بازار کی طرف دوڑا اور منہ پر ہاتھ لگا کر چیختا گیا "قتل! قتل!"

آس پاس کے ہر گوشے میں بھاگ بھاگ کر اُسنے یہی خوفناک آواز لگائی "قتل۔ قتل۔ خون، خون!"

کھڑکیاں زور زور سے کھلیں۔ شب خوابی کی ٹوپیاں پہنے لوگ اُن میں سے جھانکنے لگے۔ گھبرائی ہوئی تیز تیز آوازیں سنائی دے رہی تھیں "کہاں؟ کب؟ کس طرح؟"

اس کا جواب وہی خوفناک آواز تھی جو بار بار گونج رہی تھی۔

"قتل، قتل، خون، خون! دوڑو، دوڑو! قاتل بھاگ رہا ہے، دوڑو!"

اُلٹے سیدھے کپڑے پہنے لوگ گھروں سے نکل نکل کر بھاگے۔ بعض کے ہاتھوں میں لالٹینیں تھیں اور میفسٹو کی آواز ان کی رہنمائی کر رہی تھی "اِدھر۔ اِدھر۔ جلدی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ قاتل بچ کر نکل جائے۔"

میفسٹو تیز دوڑ کر فاؤسٹ کے پاس پہونچا اور اُس کا ہاتھ گھسیٹ کر بولا "بھاگ! بھاگ! دیکھ اُن کے قریب آنے کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ میں اس شہر میں تجھے بچا نہ سکونگا، کیونکہ تُو نے خون کیا ہے۔"

فاؤسٹ نے اپنی محبوبہ کے گھر پر آخری حسرتناک نظر ڈالی اور بڑی دلسوزی سے آواز دی "مارگریٹ۔ مارگریٹ"

میفسٹو نے چپکے سے کہا "اگر تُو یہاں ٹھہرے گا تو اُس پر اور بھی مصیبت پڑے گی۔ چل۔ جلدی کر ابھی، ورنہ سمجھ لے کہ تُو پکڑا گیا اور پھر کبھی اسے نہ دیکھ سکے گا۔"

اتنا کہہ کر فاؤسٹ کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور رات کی تاریکی میں بھاگ کر روپوش ہو گیا۔

ولنٹین کے گرد حواس باختہ مردوں اور چند عورتوں کی بھیڑ لگ گئی۔ سب کے سب نیم برہنہ تھے۔ بعض صرف ایک لمبا لبادہ پہنے تھے اور سب کچھ غائب۔ جلدی میں جو چیز جس کے ہاتھ لگی لے دوڑا۔ کسی کے ہاتھ میں لکڑی تھی، کسی کے کچھ کسی کے کچھ۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ ہوا کیا اور وہ کون تھا جو قتل قتل کی آواز لگا رہا تھا جسے سُن کر وہ اپنے بچھونے چھوڑ چھوڑ کر بھاگ آئے تھے۔ لیکن ایک بات کا علم انہیں ضرور تھا۔ اور وہ یہ کہ باغیچے میں ایک دیوزاد آدمی یا تو مرا پڑا تھا یا دم توڑ رہا تھا۔ اسکے پہلو میں خون کا ایک چھتر تھا۔ اس میں سے جتنا زمین میں جذب ہو رہا تھا اس سے زیادہ سینے اور پیٹھ میں سے بہہ بہہ کر جمع ہو رہا تھا۔

ایک نوجوان نے جس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی آگے بڑھ کر اسکا سر اُٹھا اور بولا "ارے یہ تو ولنٹین ہے۔ اور لو دیکھو کسی نے اُس کے سینے میں خنجر بھونکا ہے۔" پھر اُس نے پیٹھ پر کپڑے ٹٹولے جو خون میں لت پت ہو رہے تھے اور بولا "نہیں یہ تو کسی نے تلوار بھونکی ہے۔ قاتل نے پیچھے سے وار کیا ہے اور تلوار سینے میں سے پار ہو گئی ہے۔"

دروازہ پر شور و غل سُن کر مارگریٹ گھر سے باہر نکل آئی۔ اُسکے چہرے پر ایسی زردی کھنڈی ہوئی تھی کہ دیکھے سے خوف آتا تھا اور اُسکی آنکھیں اس طرح پھٹی ہوئی تھیں جیسے کسی دیوانے کی ہوں۔ وہ کانپ رہی تھی اور جب اُس نے دیکھا کہ ایک بھیڑ کسی کو گھیرے ہوئے نیچے کی طرف دیکھ رہی ہے تو وہ بُری طرح لرزنے لگی اور خوف و غم سے ہاتھ ملنے لگی اور مُنہ سے چیخ نکل گئی۔ ابھی ابھی جو حادثہ اس پر گزر را تھا وہ اس قدر دہشتناک تھا کہ اگر وہ اس پر نہ بیتا ہوتا تو یہی کہتی کہ اس کے بعد زندہ رہنا کیسے ممکن ہے! جب وہ اپنے عاشق سے ہم آغوش تھی دروازے کا ایک دم سے کھلنا، اُس کی ماں کا کمرے میں بجھتی ہوئی روشنی کو لیکر داخل ہونا اور پھر اُس کو دیکھکر ماں کی دردناک چیخ، لڑکھڑا کر واپس جانے کی کوشش میں گرنا اور سر کا دیوار سے ٹکرانا۔ سب کچھ اُس نے دیکھا تھا۔ مارگریٹ نے دوڑ کر ماں کا سر اُٹھایا تھا اور بڑی التجا سے اُسے آواز دی تھی لیکن ماں کی آواز پھر اُسے سُننی نصیب نہ ہوئی۔ نہ تو وہ محبت سے بولی اور نہ خفگی سے کچھ کہا۔ ماں کی آنکھوں نے نہ تو شفقت سے اُس کی طرف دیکھا اور نہ ناراضگی سے۔ مدھم روشنی میں اُس نے جو کچھ دیکھا اُس سے گویا ماں پر بجلی گر پڑی۔ ایک لمحہ میں اس کے سارے سیدھے سادے خیالات، گھریلو مسرتیں، مارگریٹ پر جو اُسے ناز تھا، زندگی بھر اُس کے جو اصول اور عقائد تھے، سب غارت ہو گئے تھے۔ موت نے گویا اس پر ترس کھایا تھا کہ اُس کی زندگی چھین لی تھی ــــ وہ زندگی جو اگر اب باقی رہتی تو موت سے بدتر ہوتی۔

شروع شروع میں مارگریٹ سمجھ بھی نہیں سکی کہ کیا ہو گیا، لیکن جب اُس کے ہیجان زدہ ذہن میں صداقت آشکارا ہوئی تو خوف سے اُس کی چیخ نکل گئی اور وہ گھٹنوں ہی پر جھکی جھکی ماں سے محبت و التجا کے ساتھ طرح طرح کے وعدے وعید کرتی رہی۔ پھر گھر کے باہر شور و غل سُنائی دیا لیکن اُس کے لئے یہ بالکل بے معنی تھا۔ پھر یہ شور اُسے رونے کی چیخیں معلوم ہونے لگا اور اُس کے اپنے سانحۂ اندوہ کا ایک جزو محسوس ہوا۔ "قتل" کا لفظ ہر آواز میں گونج رہا تھا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ خود اُسکے اندر کوئی آواز چیخ کر یہی لفظ دوہرا رہی ہے اور اُسے اس کا مجرم قرار دے رہی ہے کہ اپنی ماں کو ابدی سکوت میں دفن کر دیا۔

بڑھتے ہوئے شور نے آخر کار اُس کے احساس کے بند دروازے کو کھٹکھٹایا۔ ایک خوفناک خیال ایک دم سے اُس کے معطل تخیلہ میں آیا۔ غم و اندوہ! ہر طرف غم و اندوہ! اُس کی ماں ــــ خود، اور اب شاید ــــ اس کا عاشق۔ ماں کے پہلو میں سے بڑی مشکل سے اُٹھی اور گھسٹ کر زینے تک پہونچی۔ اُس پر سے گرتی پڑتی اُتر کر نیچے باغیچہ میں پہونچی۔

مجمع کو نیچے پیروں کی طرف کسی چیز کی طرف تکتے دیکھکر اُسے غش آنے لگا۔ پھر چیخ مار کر وہ مجمع میں گھُس گئی اور دھکا پیل کر کے کسی نہ کسی طرح بیچ میں پہونچی اور خون میں لتھڑے ہوئے دیوزاد نوجوان "میرے بھائی، پیارے بھائی" کہتی ہوئی گر پڑی۔

جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو بھائی کا مُنہ تکتے پایا۔ اُس کی آنکھیں کھُلیں، محبت اور تعجب کی نظروں سے بہن کی طرف دیکھا۔ یقیناً یہ سب کچھ ایک بھیانک خواب تھا۔ بے معنی خواب، جو اُسے سُنائے گا اور پھر دونوں بھائی بہن اس خواب پر بھی اُسی طرح ہنسیں گے جس طرح اور بہت سی بیوقوفی کی باتوں پر ہنسا کرتے تھے۔ نہیں وہ پورا خواب بہن کو نہیں سُنائے گا! نہیں۔ سیاہ لباس والے شیطان نے اُس کی بہن کے متعلق جو کچھ کہا تھا اُس کا ذکر نہ کرے گا اور نہ اُس کے ...... لیکن اسکے گرد یہ بھیڑ کیسی لگ رہی ہے ــــ اور یہ پیٹھ اور سینے میں درد کیسا ....؟

یہاں وہ کیوں .... ؟ ایک دم سے اُس کی یادداشت کارفرما ہوگئی اور اپنی تمام خوفناکی کے ساتھ۔

اُس نے درد سے چیخکر کہا "مجھے ہاتھ مت لگا۔ تیرے عاشق نے میرے جسم کو مار ڈالا مگر تو نے اس سے بھی زیادہ گہرا زخم پہونچایا ہے"

مارگریٹ سرگوشی کی آواز میں صرف اتنا کہہ سکی "آہ! بھائی ولینٹین۔ میرے بھائی!"

وہ نفرت سے مارگریٹ کو ہٹ کر بولا۔ اور اب اُسکی آواز اور بھی نحیف تھی۔ سسک سسک کر بولا "چاندی کی وہ زنجیر جو میں نے تجھے دی تھی .... تیری کلائی میں جو پہنائی تھی .... جس میں یسوع کی صلیب لٹکی ہے ..... رو ڈا کی سی نیک اور معصوم لڑکی کے لئے ! کیا تو اُسے پہنے گی ؟ ہمیشہ پہنے رہے گی جیساکہ تو نے کہا تھا ! اپنے بڑے بھائی کی یاد میں جس کو تو نے قتل کر دیا ہے ؟"

"نہیں۔ ایسی نہیں ایسا نہ کہو" مارگریٹ نے ایک دلدوز چیخ مار کر کہا اور جلدی سے سیدھی کھڑی ہو دونوں ہاتھوں سے اپنا مُنہ چھپالیا۔

ولینٹین نے اپنے بھاری پپوٹے آہستہ آہستہ پہلی مرتبہ کھولے اور اُس کی طرف رحم آمیز نگاہ سے دیکھکر شدت تکلیف سے سانس لیا اور کہا "میرے جھڑکنے کی آواز تو آئندہ کبھی نہ سُنے گی۔ لیکن کیا میری ننھی عزیزہ ماں سے تو اپنی نیلی معصوم آنکھیں چار کر سکے گی ؟"

ایک گھٹی ہوئی چیخ کے ساتھ مارگریٹ بھیڑ کو چیرتی ہوئی اندھا دُھند اپنے گھر کی طرف اُفتاں وخیزاں چلی۔ مجمع میں مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ پیدا ہوئی اور اس میں غیظ وغضب کا جزو بھی شامل تھا۔

ولینٹین پھر بولا لیکن بڑی کوشش سے رُک رُک کر۔

"میرے جنازے کی نماز پڑھوانا۔ پھر اس کے ساتھ وہی سلوک کرنا جو سب بیسواؤں کے ساتھ کیا جاتا ہے .... شکنجہ"

اتنا کہہ کر انتہائی درد و تکلیف سے اپنا ہاتھ تھوڑا سا اُٹھایا اور بولا۔

"مجھے میری تلوار دو"

لاٹھی والے نوجوان نے جلدی سے اُسکی تلوار پہلو میں رکھدی اور اُس کے قبضے پر ولینٹین کی مٹھی بھنچ گئی۔ تھوڑی دیر تک تلوار اُسکے پہلو میں اس طرح کھڑی رہی کہ قبضہ زمین پر ٹکا ہوا تھا۔

ولینٹین کی سسکتی ہوئی آواز سُنائی دی۔ "سپاہیانہ موت نہیں .... مگر اپنی تلوار کے ساتھ ـــــ"

پھر اُس کا منکا ڈھلک گیا اور تلوار ایک جھنکار کے ساتھ زمین پر آرہی۔

(مارگریٹ کا کیا حشر ہوا ؟ فاؤسٹ پر کیا گذری اور میفسٹو کا کیا انجام ہوا ؟ یہ ساقی کی آئندہ اشاعت میں ملاحظہ فرمایئے۔)

"شاہد"

چینی کہانی

ایک چھوٹا سا واقعہ

مجھے گاؤں سے دارالسلطنت میں آئے چھ سال جھپکیوں کی طرح گذر گئے ہیں۔ اِن تمام وقتوں میں بہت سے ایسے واقعات ہوئے ہیں جنہیں سلطنت کے معاملات کہا جاتا ہے اور اِن میں سے بہت سے میں نے خود دیکھے اور سُنے ہیں۔ ان میں سے کسی سے بھی میرے دل پر ذرا سا اثر نہیں ہوا اور اُن کی یاد تو مجھے اور چڑچڑا بنا دیتی ہے اور لوگوں سے رفتہ رفتہ متنفر کرتی جاتی ہے۔ لیکن محض ایک چھوٹا سا واقعہ میرے لئے بہت پُرمعنی ہے اور میں اب بھی اُسے بھُولنے سے قاصر ہوں۔

ریپبلک کے چھٹے سال میں جاڑے کا ایک دن تھا۔ تُند شمالی ہوا تیزی سے چل رہی تھی۔ تلاش روزی کے لئے مجھے سویرے اٹھنا پڑا اور اپنے کام پر جاتے ہوتے میری کسی سے ملاقات نہ ہوئی۔ بڑی مشکلوں کے بعد میں ایک رکشا کرایہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے رکشا والے کو ساؤتھ گیٹ چلنے کو کہا۔

کچھ دیر بعد ہوا کی تیزی اعتدال پر آ گئی۔ سڑکیں گرد سے صاف ہو گئیں۔ رکشا والا تیزی سے دوڑا۔ جیسے ہی ہم ساؤتھ گیٹ پہونچ رہے تھے کوئی ہمارے آگے دوڑ کر آیا اور رکشا سے ٹکرا کر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

وہ ایک عورت تھی۔ اُس کے کچھ بال سفید تھے اور وہ پھٹے کپڑے پہنے تھی۔ وہ یکایک سڑک کے کنارے کسی گلی سے نکل کر آئی تھی اور ہمارے سامنے سے سڑک کو پار کرنا چاہتی تھی رکشا والے نے بچکر نکلنا چاہا لیکن عورت کا پھٹا ہوا کپڑا جو ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا رکشا کے ڈنڈے میں پھنس گیا۔ خوش قسمتی سے رکشا والے نے اپنی چال آہستہ کر دی تھی نہیں تو غالباً وہ بالکل ہی دب جاتی اور بُری طرح زخمی ہوتی۔ جب ہم رک گئے تو بھی عورت گھٹنوں کے بل جُھکی رہی۔ میں نے خیال کیا اسے چوٹ نہیں لگی ہے۔ تصادم کو کسی نے نہ دیکھا تھا اور مجھے یہ دیکھکر سخت کوفت ہو رہی تھی رکشا والا رک گیا اور مصیبت میں پھنسنا چاہتا ہے۔ اس سے میرے سفر میں دیر ہوتی۔

"کچھ نہیں ہوا" میں نے اس سے کہا "آگے بڑھو"

لیکن یا تو اُس نے سُنا نہیں یا پروا نہ کی۔ کیونکہ اُس نے رکشا کو ٹکا دیا اور نرمی سے عورت کو اُٹھایا۔ اس نے اُس کے بازو پکڑے اور پوچھا۔

"کیا ہوا؟"

"چوٹ لگ گئی"

میں نے سوچا "میں نے تمہیں گرتے دیکھا اور تم زور سے نہیں گریں۔ پھر تمہیں چوٹ کیسے لگ گئی؟ تم بہانہ کر رہی ہو۔ یہ ساری بات تکلیف دہ ہے اور رکشا والا خواہ مخواہ اپنے لئے پریشانیاں پیدا کر رہا ہے۔ اب وہ خود ہی ان سے چھٹکارا پائے"

لیکن عورت کے یہ کہنے کے بعد کہ اُسے چوٹ لگی ہے رکشا والا ایک لمحہ کے لئے بھی نہ ہچکچایا۔ اس کا بازو پکڑے ہوئے وہ اُسے لیکر آگے بڑھا۔ اور تب مجھے حیرت ہوئی کیونکہ سامنے نگاہ اُٹھانے پر یکایک ایک تھانہ منظر پڑا اور میں نے دیکھا کہ وہ اُسے وہیں لئے جا رہا تھا۔ باہر کوئی نہ تھا اس لئے وہ اُسے دروازے کے اندر لے گیا۔

جب وہ اندر جانے لگے تو میں نے ایک عجیب کیفیت محسوس کی۔ میں نہیں جانتا کیوں، لیکن اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے اسکی گرد آلود

ہستی بہت بڑی ہوگئی ہے اور جیسے جیسے وہ وُور ہوتا گیا وہ اور بڑا ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ آخرکار مجھے اُس کو دیکھنے کے لئے سر اُٹھانا پڑا۔ اُسی وقت میں نے اپنے اوپر ایک جسمانی دباؤ محسوس کیا جو اس کی طرف سے آ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے یہ مجھ میں سے اس چھوٹے پن کو دبا کر نکال رہا ہے جو میرے رُوئیں دار کوٹ کے نیچے چھپا تھا۔ میں کمزور ہوگیا۔ گویا کہ میری ساری طاقت خرچ ہوگئی، گویا کہ خون مجھ میں جم گیا۔ میں بے حرکت بیٹھا رہا، بے خیال اور ساکت یہاں تک کہ ایک افسر کو میں نے تھانہ سے نکلتے دیکھا۔ جب وہ میری طرف آنے لگا تو میں رکشا سے اُتر گیا۔

"بہتر ہے کہ آپ دوسرا رکشا کر لیں۔ وہ اب آپ کو نہیں لے جا سکے گا۔" اُس نے مجھے بتایا۔

بغیر کچھ سوچے میں نے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا اور مٹھی بھر تانبے کے سکے نکالے ——— "یہ اُسے دے دو" میں نے کہا۔

ہوا ایک دم رُک گئی تھی لیکن سڑک ابھی سُنسان تھی میں چلتے ہوئے سوچ رہا تھا لیکن اپنے بارے میں کچھ خیال کرنے سے تقریباً میں خائف تھا۔ جو واقعہ ہوا تھا اُسے الگ کرتے ہوئے میں نے مٹھی بھر تانبوں کی توجیہہ تلاش کی میں نے کیوں دئے؟ بطور انعام؟ اور کیا اپنی حرکت کے بعد بھی میں اپنے کو اس قابل سمجھتا تھا کہ ایک رکشا کھینچنے والے کے بارے میں کچھ فیصلہ کروں؟ میں اپنے ضمیر کو مطمئن نہ کر سکا۔

ابھی تک اس واقعہ کی یاد میرے حافظے میں تازہ ہے۔ میں اس کا خیال کرتا ہوں اور دُکھ اور جلن سے بیتاب ہو جاتا ہوں۔ اس تمام مدت کا فوجی اور سیاسی ڈرامہ میرے لئے اس کلاسک کی طرح ہے جو میں نے لڑکپن میں پڑھا تھا۔ میں اس کی آدھی سطر بھی نہیں دُہرا سکتا۔ لیکن میری آنکھوں کے سامنے ہمیشہ یہ چھوٹا سا واقعہ دُہرایا جاتا ہے اور مجھے شرم دلاتا ہے، مجھے اچھا بننے کی ترغیب دیتا ہے، میری اُمید اور ہمت کو زندہ کرتا ہے۔ میں اس کی تمام تفصیل صاف صاف اسی طرح دیکھتا ہوں جیسے اُس دن جب یہ ہوا تھا۔

(لوشون) مُترجمہ: تمنائی

ہیملٹ میں چند غلطیوں کی درستی

سالنامہ ساقی کے صفحہ ۵۷، کالم ۲، سطر ۴:

اِس حالت کو شرمناک نہ کہو جب کہ نفس کی مجبوریاں برابر گناہوں کی ترغیب دیتی رہیں اور بڑھاپے کا سرد اور جما ہوا خون جلتا نظر آتا ہو، اور عقل جو ارادے کو روک سکتی ہے شوقِ معصیت کو سیر کرتی ہو۔

اُوپر کے فقرے کی جگہ اس طرح پڑھا جائے:

اس حالت کو شرمناک نہ کہو جب کہ نفس کی مجبوریاں برابر گناہوں کی ترغیب دیتی رہیں۔ یہاں تو بڑھاپے کا سرد اور جما ہوا خون جلتا نظر آتا ہے۔ اور عقل جو ارادے کو روک سکتی ہے شوقِ معصیت کی دلالی کرتی ہے۔

ایضاً صفحہ ۱۰۰ کالم ۱، سطر ۲۳ تا ۲۶ کو اس طرح پڑھا جائے:

.... کیسا کوّے کی طرح کائیں کائیں کرتا ہے۔ لیکن جیسا میں نے کہا ہے، اس کے پاس زمین بہت ہے۔

اوسرک: کرم فرما ...... ایک بات عرض کروں۔

ہیملٹ: ضرور میں اُسے دل و جان سے سُنونگا.....

عنایت اللہ

خمستان

حُسن اور نغمہ

ندیم خاک اپنے سائے کو سمیٹے ہوئے وارد ہوا۔ اور دروازے پر دستک دی۔

جانِ عزیز نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ کُنڈی لگالی اور قفل بھی چڑھا دیا۔

پھر کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا "کون ہو؟ کیا چاہتے ہو؟"

جواب ملا "میں ہوں ندیم خاک! چلو وقت ہو گیا!"

اُس کی رُوح فرسا آواز سے در و دیوار سہم گئے۔

ہوا کے جھونکے آہ و زاری کرنے لگے۔

فضا کسی پرندے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے گونج اُٹھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ لیلائے شب کا دل دھڑک رہا تھا۔

دروازے پر یکے بعد دیگرے وار ہونے لگے۔ حتیٰ کہ وہ چُور چُور ہو کر زمین پر گر پڑا۔

فرشتۂ اجل نے کہا کہ "مجھے جسم کی ضرورت ہے"

جانِ عزیز نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "اس جسم نے اب تک مجھے صرح طرح سے لُطف اندوز کیا ہے۔ اس کے ذرّے ذرّے میں میری اُمنگیں پھڑک رہی ہیں"

اسکی رگ رگ میں سازِ زندگی غزلخواں ہے۔

اے ظالم کیا گھڑی بھر میں اس طلسم کو درہم برہم کر دیگا؟ کیا آنِ واحد میں اس شمع کو گُل کر دے گا۔؟

کیا شب کی سیاہی میں اس روزِ روشن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غرق کر دے گا؟

ندیم خاک نے کہا "خُدا سے قرض لیکر یہ جسم بنایا گیا تھا"

"اب ادائیگی کی گھڑی آ پہونچی۔ آج یہ پیکرِ خاکی پھر سے خاک میں فنا ہو جائے گا"

جانِ عزیز بولی "اپنا قرض تو تم خوشی سے لے سکتے ہو۔ لیکن اس کے زیادہ تمہیں کونسا حق ہے؟"

ندیم خاک کی حیرت کی انتہا نہ رہی "زیادہ کونسی چیز ہے؟"

جانِ عزیز نے کہا "اللہ رے ستم ظریفی۔ تم صرف مٹی لے جا سکتے ہو۔ لیکن یہ حُسن... کیا یہ حُسن بھی تمہارا سرمایہ ہے؟"

ندیم خاک نے ایک قہقہہ لگا کر کہا "یہ بات ہے۔ تو حُسن کو جسم سے نکال کر لے جاؤ"

جانِ عزیز نے پسینہ پسینہ ہو کر کہا "ایک نہ ایک دن یہ ہو کر رہیگا ابھی تم حُسن کی رہزنی آسانی سے کر سکتے ہو۔ لیکن یہ چوری ہمیشہ نہ چلے گی"

تاہم۔ ندیم خاک زمین کا سرمایہ لے گیا۔ اور ساتھ ساتھ حُسن کو بھی۔ بصورت زکوٰۃ اسی طرح لیکر چلتا ہوا جس طرح تڑپتی ہوئی سیتا کو راون سمندر کے پار لے گیا تھا۔

جانِ عزیز نے اپنے دلِ شکستہ کو جمال باری کی بارگاہ میں پیش کیا۔

اس نے دست بستہ عرض کی "اے نورٌ علیٰ نور۔ اے خالقِ حُسن! حقیر مٹی تیرے حُسن کی توہین کر رہی ہے۔ حُسن کی نجات تیرے ہاتھ میں ہے"

یہ کہکر دلِ حزیں مصروفِ نیاز ہو گیا۔ ہزار سال بیت گئے لاکھوں سال گُذر گئے۔

لیکن جانِ عزیز کی فریاد ختم نہ ہوئی۔

اس رہزنی کو کوئی روک نہ سکا۔ دمبدم حُسن مٹی میں ملنے لگا۔ تمام مخلوق کی زبان سے یہی دُعا نکلتی تھی۔

اے حُسن کے دیوتا! اے شیدائے جمال۔ تُو نے اپنے ہاتھوں سے جو یادگاریں دی تھی اُسے بیجان زمین زبردستی چھین لیتی ہے۔ اس کی رہزنی کو روک دے اور اپنے سرمائے کو لوٹا دے۔

زمانے آئے اور چلے گئے۔ آخر کار یہ وحی نازل ہوئی۔

"خاک کے پُتلے کا انجام خاک نشینی ہے۔

اور میرا جمال انجام کار میرے سینے میں سما جاتا ہے۔ بیجان خاک کی کیا مجال جو اُسے فنا کر سکے۔

اچھا حُسن کو مژدہ ہو۔ کہ وہ تمہارے کالبد نوری میں گھر کرے اور تمہاری نظر کے لئے نظارہ کا سامان کرے۔

حُسن پھر لوٹ آیا۔ مسرت کے نغموں سے زمین و آسمان گونج اُٹھے۔

بہارِ حُسن کے رسیا پروانہ وار دوڑے۔

لیکن دنوں کے بعد مہینے اور مہینوں کے بعد سال گذر گئے اور جانِ عزیز کی فریاد کا سلسلہ برابر جاری رہا "اب کیا چاہیئے"

جانِ عزیز نے دست بستہ عرض کی "ندیم خاک آکر گلے میں پھندا ڈالتا ہے اور اس پر اپنی ملکیت جتاتا ہے۔ یہ مٹی کی بانسری اسکی ہو سکتی ہے۔ لیکن نغمہ تو میرا ہے۔

اے موسیقی کے دیوتا بیجان مٹی کس برتے پر تیرے اختیار میں دخل دیتی ہے؟ جو نغمہ ازل و ابد میں رشتہ قائم کر سکتا ہے۔ جو لامحدود کی حدبندی کر سکتا ہے۔

(ٹیگور)

لیے یہ کمبخت کس سے کہ نغمہ بھی خاموش کر دیا جائے
آسمان سے یہ آواز آئی۔
"ہوا کے ناپیدا کنار سمندر کی لاتعداد موجیں بھی نغمہ کا راگ فنا نہیں ہو سکتا۔ دل کی مُراد بر آئیگی۔
گلا مٹی میں مل جائے گا۔ لیکن نغمے کے سرگم کو حیاتِ جاودانی بخشی گئی۔
ندیم خاک جس نغمہ کو خاک نشیں کرنا چاہتا تھا۔ اُسے دل نے لازوال بنا دیا۔
دُنیا میں شادمانی کے نعرے بلند ہوئے۔
جسم کی قید سے آزاد حُسن کے ساتھ جسم کی قید سے آزاد نغمہ کا وصل ہوا کہاں؟ بحرِ حیات کے ساحل پر جسم کے گلبن میں۔

اختر رائے پوری

طیورِ آوارہ

(۱)

"عورت! تو نے اپنے اشکوں کے عمق سے دُنیا کے دل کو (اس طرح) محصور کیا ہے جس طرح کہ سمندر نے زمین کو۔"

(۲)

"تمہارا بُت توڑ کر زمین پر گرا دیا گیا، یہ ثابت کرنے کے لئے کہ خُدا کی خاک تمہارے بُت کی مٹی سے زیادہ طاقتور ہے۔"

(۳)

رات نے آفتاب سے کہا — "چاندنی راتوں میں تو اپنے پریم پتر مجھے بھیجتا ہے۔"

"میں اشکوں کی صورت میں اپنے جواب گھاس پر چھوڑ دیتی ہوں۔"

(۴)

"عورت! جب تو خانہ داری کے کاموں میں اِدھر اُدھر گھومتی ہے تو تیرے عضو (اس طرح) گاتے ہیں جس طرح کہ پہاڑی آبشار چٹانوں کے درمیان۔"

(۵)

ستارے جگنوؤں کی مانند ظاہر ہوتے میں خوفزدہ ہیں۔

(۶)

عورت! تیرے تبسم میں زندگی کے آبشار کا نغمہ مضمر ہے۔

(۷)

"میں تیرا شکر گزار ہوں کہ میں طاقت کی چکیوں میں سے نہیں ہوں بلکہ اُن زندہ مخلوقوں میں سے ایک ہوں جو ان سے کچلے جا رہے ہیں۔"

(۸)

زندگی ہمیں دی جاتی ہے، ہم اُسے دیکر اسے حاصل کرتے ہیں۔

(۹)

ننھی سی کلی اپنی پنکھڑیاں کھولتی ہے اور کہتی ہے — "پیاری دُنیا! مُرجھا نہ جانا!"

(۱۰)

ہر بچہ اپنے ساتھ یہ پیغام لاتا ہے کہ خدا ابھی تک انسان سے مایوس نہیں ہوا ہے۔

(۱۱)

اس نے اپنے ہتھیار اپنے دیوتاؤں کو بنا لیا ہے۔
جب اُس کے ہتھیار فتح پاتے ہیں تو خود اس کی شکست ہوتی ہے

(۱۲)

ممکن ناممکن سے پوچھتا ہے — "بتا! تیرا مسکن کدھر ہے؟"
جواب ملتا ہے "نامردوں کے خوابوں میں"

(۱۳)

اپنے دل کی افسردگی کے پیچھے میں چیزوں کی گھر لوٹ جانے کی صدا سُنتا ہوں —

[illegible] نہیں سکتا۔

(۱۴)

خواب ایک بیوی ہے جو ضرور گفتگو کرے گی۔
نیند ایک شوہر ہے جو خاموشی کے ساتھ برداشت کرتا ہے۔

(۱۵)

پتی جب بات کرتی ہے تو پھول بن جاتی ہے۔
پھول جب پرستش کرتا ہے تو پھل بنجاتا ہے۔

(۱۶)

مجھے خیال کرنے دو کہ ان تاروں کے جھرمٹ میں ایک ایسی ہستی ہے
جو نامعلوم ظلمت میں میری زندگی کی رہنمائی کرتی ہے۔

(ٹیگور) جمیل احمد کنھاتے پوری۔

آخری کنول کی قیمت

تالاب کے پانی کی ننھی ننھی لہروں میں آخری کنول سرما کی تباہ کاریوں سے محفوظ خاموش رقص کر رہا تھا، باغبان سداس نے اُسے توڑا اور فروخت کرنے کیلئے قصر شاہی کی طرف لے چلا۔

راستے میں اُسے ایک مسافر ملا۔ اُس نے دریافت کیا۔

"اِس آخری کنول کی کیا قیمت ہے؟ میں اسے مہاتما بدھ کی خدمت میں پیش کروں گا۔"

سداس:۔ "اگر آپ مجھے ایک ماشہ سونا دیں تو یہ پھول آپ کا ہے۔"

مسافر نے قیمت مطلوبہ ادا کر دی۔

اسی عرصے میں راجہ بھی اپنے محل سے برآمد ہوا، اُس نے پھول دیکھکر اُسے خریدنے کی خواہش ظاہر کر دی، وہ مہاتما بدھ کے درشن کرنے جا رہا تھا، اُس نے خیال کیا اگر سرما میں کھلے ہوئے کنول کو مہاتما کی نذر کیا جائے تو یقینی نفیس تحفہ ہوگا، یہ سوچکر اُسنے دریافت کیا۔

"اِس پھول کی کیا قیمت ہے؟"

سداس:۔ "مجھے اس کے عوض ایک ماشہ سونا مل رہا ہے حضور!"

راجہ:۔ "اچھا مجھ سے دس ماشے سونا لو اور یہ پھول مجھے دے ڈالو۔"

مسافر:۔ "لیکن میں اسکے لئے بیس ماشے سونا دینے کو تیار ہوں۔"

باغبان بے حد طامع تھا، اُس نے اپنے دل میں سوچا اگر میں خود مہاتما بدھ کے پاس لے جاؤں تو شاید زیادہ نفع ہو۔ اُس نے پھول فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔

شہر پناہ سے دور آموں کے جھنڈ کے سائے میں باغبان سداس مہاتما بدھ کے سامنے خاموش اور مؤدب کھڑا تھا۔

مہاتما کے لبوں پر محبت کی خاموشی چھائی ہوئی تھی اور اُنکی آنکھیں آشتی و صلح کے نور سے روشن تھیں۔ اُس ستارہ صبح کے مانند جو شبنم میں نہائی ہوئی فضا میں جگمگاتا ہے۔

سداس نے مہاتما کے چہرے کی طرف دیکھا اور کنول اُن کے قدموں پر ڈال کر سر بہ خاک ہو گیا۔

مہاتما کے لبوں پر تبسم نمودار ہوا اور اُنہوں نے میٹھی آواز سے دریافت کیا: "کیا چاہتا ہے؟ میرے بیٹے"

"صرف آپ کے قدموں کو چھونا!" وفورِ جوش میں سداس چیخ اُٹھا۔

(ٹیگور) مترجمہ سعد منیر کانپوری

نقد و تبصرہ

میری کہانی۔ کتاب کتاب میں فرق ہوتا ہے اور ہر قسم کی کتاب کی پسندیدگی کا معیار جُدا۔ تاریخ اُس وقت تک خوب ہے جب تک کہ مورخ واقعات کو اپنے اصل رنگ میں پیش کرے اور اُن پر اپنی ذات کا رنگ نہ آنے دے۔ اس کے برعکس ایک خود نوشتہ سوانح حیات میں ناظر کی نگاہیں واقعات کی متلاشی نہیں ہوتیں بلکہ واقعات نے مصنف کے دل و دماغ پر جو اثر پیدا کیا اس کے احساسات و جذبات میں جو انقلابات پیدا کئے اُن کا بیان سُننا مقصود ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں دُنیا نہیں بلکہ مصنف کے دل کی دُنیا کی سیر کے لئے اس قسم کے سوانح حیات کو پڑھا جاتا ہے۔ 'میری کہانی' کے لکھنے والے کی یہ خصوصیت ہے کہ اُسکی نیک نیتی اور خلوص کی وجہ سے کتاب نہ صرف اُسکی اپنی زندگی کا ایک سچا مرقع ہے بلکہ ہندوستان کی سیاسی کشمکش کی بھی اس بے داغ آئینے میں صاف اور سچی تصویر کھنچ گئی ہے۔

'میری کہانی' کے ابتدائی صفحات سے یہ احساس شروع ہوجاتا ہے کہ کوئی شخص اپنے دل کی باتیں ہم کو اپنا ہمراز سمجھکر بے کم و کاست بیان کر رہا ہے اور کتاب کے آخری صفحے کے اُلٹ دینے تک یہ احساس نہ صرف قائم رہتا ہے بلکہ کافی ترقی کرچکا ہوتا ہے۔ بعض اوقات نیک نیتی اور خلوص کی وجہ سے وہ تلخ باتیں بھی کہہ گذرتا ہے اور سچائی کا انتہائی جذبہ بعض اوقات بے باکی کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ ایک صاحب نے 'میری کہانی' پڑھ کر اعتراضاً فرمایا! "جواہر لال کو سرمایہ داروں، دیسی ریاستوں کے حکمرانوں اور لبرلوں کے خلاف اس بے باکی سے نہیں لکھنا چاہیئے تھا کہ ملک کی سیاسی جدوجہد میں ان لوگوں سے ابھی کام لینا ہے اور ان کو برانگیختہ کرنا سیاست کے نقطۂ نگاہ سے اچھا طریقِ عمل نہیں"۔ میرا خیال ہے ان صاحب نے 'میری کہانی' کو غلط زاویہ سے دیکھا۔ 'میری کہانی' ایک شخص کا بالکل سچا بیان ہے اُن جذبات کا جو اُس کے دماغ میں مختلف اوقات میں پیدا ہوئے۔ اس کتاب سے سیاسی پروپیگنڈہ مقصود نہیں۔ اگر اس زاویہ نگاہ سے 'میری کہانی' کو نہ پڑھا گیا تو میرا خیال ہے کہ سَنوں میں سے ننانوے جگہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جواہر لال نے یہ نہ لکھا ہوتا تو اچھا ہوتا تھا کیونکہ اس سے فلاں فلاں فرقے کی دلآزاری ممکن ہے۔ مگر یہ زاویۂ نگاہ کانگریس کے Election Manifesto کو جانچنے کے لئے درست ہو تو ہو ایک سوانح حیات کیلئے سرتاسر غلط ہے۔ 'میری کہانی' کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ ایک صاف طینت، نیک نیت، ہمدرد اور پُرخلوص شخص کے دل کا آئینہ ہے۔

عام طور پر مشاہیرِ عالم اور برگزیدہ ہستیوں کے سوانح حیات پڑھنے والے کے دل میں Emulation کی خواہش پیدا ہوا کرتی ہے۔ لیکن 'میری کہانی' کے پڑھنے والے مجھ سے اتفاق کرینگے۔ اگر میں کہوں کہ Emulation کی اس عام خواہش کے علاوہ اس کتاب کے پڑھنے سے نہ صرف رگ و ریشے میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑتی معلوم ہوتی ہے بلکہ ایک نہایت جاندار جذبۂ عمل کا احساس ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی ذات میں شجاعت اور استقلال کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ ہزار ناکامیوں کے باوجود جدوجہد کا اسی طاقت کے ساتھ جاری رکھنا اور ہر نئی ناکامی سے ارادے کا اور قوی ہونا معمولی کام نہیں۔ اور ناکامیاں بھی معمولی ہار جیت نہیں، نفع نقصان نہیں، عزیز ترین دوستوں کا منہ موڑنا، باپ کی ناراضگی، اپنے سیاسی گرو یعنی مہاتما گاندھی سے بسا اوقات سخت سُست سُننا۔ گھر بار تج دینے پر بھی ملک میں بے حسی پانا، ان میں سے ہر ایک ناکامی فرداً فرداً انتہائی مستقل مزاج شخص کی کمر توڑ دینے کے لئے کافی تھی اور پھر اُن کا یکے بعد دیگرے ایک ہی شخص کی زندگی میں واقع ہونا اور اُس کا اپنی جدوجہد کے لئے اُن سے تازیانے کا کام لینا اگر مافوق الفطرت شجاعت اور استقلال کی دلیل نہیں تو اور کیا ہے۔ اکثر جگہ کمر ہمت ٹوٹتے ٹوٹتے رہ گئی ہے۔ اکثر دفعہ اپنی جدوجہد کی futility کا احساس ہوا ہے مگر طبیعت میں بلا کی spring ہے کہ جتنی دبی اُس سے دوچند ابھری۔ اور پھر ان سب واقعات کو اس سادگی سے بیان کیا ہے کہ تکبر چھو تک نہیں گیا۔ مجھ سے کتاب کے یہ حصے خاص طور پر اپیل کرتے ہیں شاید اس وجہ سے کہ جہاں کامیابی سے ہمارا قدم بڑھتا ہے وہاں معمولی ناکامی بھی ہماری ہمت پست کر دیتی ہے۔

کتاب کا ہر صفحہ انصاف اور حق پسندی میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک انسانی کمزوری ہے کہ اپنی یا اپنے ہمدردوں کی خوبیاں

میں مبالغہ سے اور خامیاں بیان کرنے میں بخل سے کام لیتا ہے۔ اسکے برعکس اپنے دشمنوں اور مخالفین کی خوبیاں بیان کرنے میں بخل سے اور خامیاں بیان کرنے میں مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے۔ مجھے "میری کہانی" کی یہ بدعت نہایت بھلی معلوم ہوئی کہ نہایت ایمانداری سے کام لیکر مخالفوں کی خوبیوں کو منظر انداز نہیں کیا گیا اور اپنی خامیوں کی پردہ پوشی نہیں کی گئی۔ بعض بعض جگہ دلی کیفیات اور اپنے محرکات کے تجزیہ میں پنڈت جی نے کمال کر دکھایا ہے اور اسی طرح اپنے احباب اور اپنے ہمدردوں کی طبیعتوں کو سمجھنے میں جس دقیق نظری کا ثبوت دیا ہے وہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس تعریف کو مبالغہ آمیز سمجھکر شاید یہ کہا جائے کہ ایک قائد میں انصاف، استقلال اور دقیق نظری کی خصوصیات کا ہونا لازم ہے۔ اس کے بغیر کوئی شخص قائد کے درجے کو نہیں پہونچ سکتا۔ مگر یہ حقیقت نہیں۔ سوانح حیات میں بغیر ارادے کے اکثر بے انصافی سے کام لیا جاتا ہے۔ مثالیں دینا اچھا نہیں معلوم ہوتا مگر جن اصحاب کو مشہور سوانح حیات پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ مجھ سے اتفاق کرینگے۔ قائد میں چند خصوصیات کا ہونا لازمی ہے۔ لیکن انکے ساتھ ساتھ اور خصوصیات بھی موجود ہوں تو یہ قائد قابل ستائش ضرور ہے۔

ذاتی کیفیات اور ملکی واقعات اور شخصیتوں کے memoirs کے علاوہ کتاب میں مذہبی، معاشیاتی، نفسیاتی، اخلاقی اور سیاسی مسائل پر جو تنقید کی گئی ہے اُس میں وسیع مطالعہ اور دُور رس فہم کو بہت کافی دخل ہے۔ پنڈت جی کا ابتدائی خانگی ماحول، ابتدائی اور ثانوی تعلیم جن کا بڑا حصہ انگلستان میں صرف ہوا، اور پھر اس کے بعد فرصت مجبوری یعنی جیلخانے کی فضا مطالعہ کی ترقی کے لئے خاص طور پر موافق تھی۔ اور اس سے پوری طرح سے فائدہ اُٹھانے کے لئے خداداد ذہانت پہلے ہی سے موجود تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ ہر ایک ہندوستانی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی جس اعتماد و اعتبار کے ساتھ ڈالی گئی ہے وہ قابل رشک ہے۔ اور پھر لُطف یہ کہ ساتھ ساتھ چونکہ پنڈت جی کی اپنی زندگی کی واردات تارو پود کی طرح اس تنقید کے ساتھ بُن دی گئی ہیں اس واسطے یہ تنقید پڑھنے والے کے لئے ایک خاص اثر رکھتی ہے۔ یہ کسی ایسے شخص کی خیالی رائے نہیں ہے جو حقیقت سے دُور اپنی خیالی دُنیا میں تنقید و تبصرہ کر رہا ہو۔ بلکہ ایسے شخص کا اظہار خیال ہے جس نے حقیقتوں اور اکثر تلخ ترین حقیقتوں کے دوش بدوش زندگی بسر کی ہو، یہانتک کہ چھلتے چھلتے اس کے کندھے خونیں ہوگئے ہوں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ پنڈت جی کے فلسفۂ مذہب، یا فلسفۂ معاشیات سے مجھے یا آپ کو کلی اتفاق کرنا لازم ہے۔ اُن کے نظریہ سے اتفاق کرنا ایک بات ہے اور وسیع مطالعہ اور دقیق نظری کی داد دینا بالکل الگ چیز۔ ہر شخص دُنیا کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور اس نقطۂ نظر میں اُسکی خاندانی روایات، اُسکی تعلیم و تربیت، اس کے والدین اور احباب کے اثرات کو کافی دخل ہوتا ہے۔ اس واسطے یہ توقع کرنا کہ اہم مسائل کے بارے میں اتفاق رائے ایک بڑے پیمانے پر ہو جائے فضول ہے اور نہ اس اتفاق رائے کی ضرورت ہی ہے۔ ہاں دیکھنا یہ ہے کہ جو لوگ ہم سے مختلف رائے رکھتے ہیں اُن کی رائے میں نیک نیتی اور غیر جانبداری کو کہانتک دخل ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ایک شخص کی رائے واقعی ایک وسیع مطالعہ اور ایک وسیع تجربے کا نتیجہ ہے تو خواہ اُس کی رائے ہم سے مختلف ہی کیوں نہ ہو ہمیں ضرور اس کی قدر کرنی پڑے گی۔ اس اُصول کو مدنظر رکھ کر اگر پنڈت جی کی مذہب، معاشیات اور سیاسیات پر تنقیدیں پڑھیں گے تو غلط فہمی کا اندیشہ نہ رہے گا۔ اس چھوٹے سے مضمون میں نہایت مشکل ہے کہ ایک ایک کر کے مختلف مسائل پر جو تنقیدیں کی گئی ہیں اُن پر کچھ لکھا جائے۔ اور نہ ہی اس کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ پنڈت جی کی تحریر میں جو مقناطیسی قوت ہے اور اُنکی سادگی بیان میں جو رس ہے وہ اس قسم کی گہری تنقید کے ہتیار ڈلوا دیتا ہے۔

تاہم مذہب اور سوسائٹی کے بنیادی اُصولوں (یا شاید یہ کہنا بہتر ہو کہ جن کو ہم بنیادی سمجھتے ہیں۔) کے متعلق پنڈت جی کی رائے پر ایک نظر دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔

ہندوستان جیسے ملک میں جہاں تقریبًا ہر مذہب کی اصل صورت مسخ ہو چکی ہو پیدا ہونا اور بڑے ہونا اور انگلستان جیسے ملک میں جہاں تعلیم اور مذہب کو الگ الگ رکھا جائے تعلیم پانا۔ ایسی ہی قسم کی رائے کا متقاضی تھا جو "میری کہانی" میں پیش کی گئی ہے۔ پنڈت جی نے ہندوانی اور اسلامی تہذیب (culture کے لئے اور کیا لفظ ہو سکتا ہے) تمدن اور مذہب کے فرق کو چوٹی کی موجودگی یا غیر موجودگی، لوٹے میں ٹونٹی ہونے یا نہ ہونے، اور ٹانگوں میں دھوتی یا پاجامہ کے ہونے تک محدود رکھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اکثر ہندو اور مسلمان اصحاب میں اس سے زیادہ فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ لیکن (essentials) ان فروعات میں موجود نہیں۔ بلکہ ان خصوصیات کا نام ہے جو ایک فرد کے نقطۂ نگاہ' دوسرے فرد کے نقطۂ نگاہ سے مختلف بناتا ہے۔ ایک ہندو جب دُنیا میں اپنے تعلقات، اپنے کاروبار، اپنے لواحقین، اپنے مذہبی پیشواؤں، یا اپنے فرائض

اور حقیقت کی طرف نگاہ ڈالتا ہے تو یہ نگاہ ایک مسلمان کی اِسی نوع کی نگاہ سے کہیں مختلف ہوتی ہے۔ لوٹے میں ٹونٹی ہونا یا نہ ہونا یا سر پر ... نہ ہونا اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتا ہے اور نہ اس پر کوئی اثر ڈالتا ہے۔ اور جن خصوصیات کی وجہ سے نگاہ میں یہ فرق پیدا ہوتا ہے شاید ان کا ... کرنا مشکل ہو۔ لیکن اُن کا سمجھ لینا زیادہ مشکل نہیں۔ خیالات، جذبات، یہاں تک کہ خواہشات میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ سوال ... ہے کہ یہ فرق موجود ہونا اچھا ہے یا بُرا، ہونا چاہیئے یا نہیں۔ مگر حسن و قبح سے قطع نظر جو حقیقت ہے وہ فروعات سے کہیں زیادہ گہری ہے۔

اسی طرح انسانی سوسائٹی نے شاید از ابتدائے آفرینش مختلف صورتیں اختیار کر رکھی ہیں۔ مختلف ذاتیں نہ سہی مختلف درجے ہر حالت میں قائم رہے ہیں اور ہر درجہ کے انسانوں کے ساتھ اپنی اپنی مسرتیں اور اپنی اپنی مصیبتیں لگی رہتی ہیں۔ غریب اور کمزور انسان کی حالت افسوسناک ضرور ہے۔ امیر اور مغرور کی حالت پر غصہ ضرور آتا ہے اور اس تفرقہ پر جو چار سو نظر آتا ہے ہر شخص کا دل بھر آتا ہے۔ لیکن اس کا یہ حل قرار دینا کہ زمین پر ایک ہل چل جائے جس میں سب اونچائیاں ہموار کر دی جائیں، نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی شاید بہترین حل ہے۔ انسان اشرف المخلوقات نہیں بلکہ ارذل المخلوقات ہے۔ اس کی خود غرضی، اس کی ہوس اس کے لئے ہمیشہ ہر حالت میں باعثِ مصیبت رہے گی۔ حاکم ہو یا محکوم، امیر ہو یا غریب، اشتراکی ہو یا غیر اشتراکی، سب صورتوں میں انسان تو آخر انسان رہے گا۔ اپنی انسانیت سے تو الگ نہیں ہو سکتا۔ اور جب انسانیت کی بُنیاد ہی خود غرضی اور ہوس پر ہو تو اس سے بہتری کی توقع رکھنا عبث ہے۔ اس کا اصل یکسانیت نہیں بلکہ یک قلم فنا ہے۔

مبالغہ نہ ہو گا اگر یہ کہا جائے کہ "میری کہانی" میں جہاں ایک طرف ایک جری دل اور دماغ کی کشمکش کو اُس کے مختلف مدارج میں ہمارے سامنے کھول کر پیش کیا گیا ہے وہاں گویا ملک کے سیاسی ارتقا کا گراف بھی پیش کر دیا گیا ہے جس میں سیاسی تحریک میں موافق یا مخالف فریق کے حصہ لینے والوں کی زندگی کے مطالعہ کا بھی موقع ملتا ہے۔ اور یہ سب کچھ ایسے سادہ اور سلیس پیرائے میں ادا کیا گیا ہے کہ پڑھتے وقت انہیں کہانی کی سی لطافت کا احساس ہوتا ہے۔ مکتبہ جامعہ دہلی یا ساقی بکڈپو سے چار روپے میں طلب کیجئے۔

محمود بیگ

محاوراتِ نسواں - محترمہ وزیر بیگم ضیا ادیب فاضل کی تالیف ہے۔ اردو محاوروں کی کتابیں کچھ کم موجود نہیں ہیں۔ اس کتاب کو جو خوبی اور کتابوں سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ اُن سب کا نچوڑ ہونے کے علاوہ جدید محاوروں کی لغت بھی ہے۔ محترمہ خدیجہ بیگم نے دیباچہ میں اُردو کی اس خصوصیت کو نمایاں کیا ہے کہ صرف اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس میں عورتوں کی زبان، اُن کے الفاظ اور محاورے مردوں سے علیحدہ بالکل جُداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ اور سچ یہ ہے کہ عورتوں کی زبان اگر علیحدہ نہ ہوتی تو اُردو میں کوئی نزاکت و نفاست نہ ہوتی۔ وزیر بیگم صاحبہ نے یہ ایک بہت بڑا کام کیا کہ زبان کے اس نفیس عنصر کو چھان بین کر کے علیحدہ پیش کر دیا۔ ہماری خواتین کو چاہیئے کہ ان محاوروں کو اپنی تقریر و تحریر میں باربار استعمال کریں تاکہ بیگماتی زبان زندہ رہے۔ جس طرح ہماری تہذیب و معاشرت سسک رہی ہے اسی طرح ہماری خواتین کی زبان بھی دم توڑ رہی ہے۔ اب یہ ہماری خواتین کے ہاتھ میں ہے کہ اپنی زبان بولیں یا اُسے چھوڑ کر مردوں کی زبان بولنے لگیں۔ "محاوراتِ نسواں" اس سلسلہ میں بہت بکارآمد ثابت ہوگی۔ (۱۰۱) صفحات کی کتاب صرف چھ آنے (۶/) میں۔ گویا کوڑیوں کے مول ہے۔ حکیم مظفر حسین صاحب اندرون موچی دروازہ لاہور سے طلب کیجئے۔

پیلی یاس اور میلی سانڈر - ماریس میترلنک بلجیم کا شہرہ آفاق ڈرامسٹ اپنے تمثیلی پیرایہ بیان کی وجہ سے دُنیا کے مشہور ڈرامہ نگاروں میں خاص وقعت رکھتا ہے۔ اُردو میں اس کے کئی ڈرامے منتقل ہو چکے ہیں۔ جناب تمنائی نے میترلنک کی ایک حزنیہ تمثیل کا ترجمہ کیا ہے۔ جہاں تک ترجمے کا تعلق ہے میترلنک کی عبارت کا ترجمہ مشکل نہیں، مگر اس عبارت میں جو استعارہ یا کنایہ ہوتا ہے اُس کو سمجھ کر ادا کرنا آسان نہیں۔ تمنائی صاحب کی کوشش مستحسن ہے۔ الیاس و ملینہ کے نام سے اسی ڈرامے کا ترجمہ پہلے بھی ہو چکا ہے مگر اچھی کتابوں کے جتنے بھی ترجمے ہوں کم ہیں۔ پروفیسر آرزو جلیلی کا تعارفی مضمون قابل قدر ہے۔ ۱۲/ میں پنجاب بک ڈپو۔ لاہور سے [illegible]

کونٹ الیاس کی موت - محترمہ حجاب امتیاز علی کے پانچ مضمونوں کا مجموعہ ہے۔ ہیبت و اسرار کے افسانے اُردو میں [illegible] بہت ملنے مشکل ہیں۔ سائکو انالیسس (تجزیہ نفس) جیسی جدید سائنس کو افسانے کے پیرائے میں بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ افسانوں کے کردار، اُن کی حرکات و سکنات، ماحول کی مناسبت، زبان و بیان اس لحاظ سے یہ افسانے [illegible]

...یں حجاب امتیاز علی کے افسانے وہی وقعت حاصل کریں گے جو انگریزی میں اڈگر ایلن پو کے افسانوں کو حاصل ہو. لکھائی چھپائی ...بوط جلد۔ ۱۹۲ صفحات. قیمت عہ. دار الاشاعت پنجاب سے طلب کیجئے۔

...وت کی انجمن۔ غالب نے کرشمۂ خیال کے وسیلے سے خلوت کو انجمن بنا یا تھا۔ اس چھوٹی سی کتاب میں محترمہ حجاب امتیاز علی نے خلوت کی انجمن سجائی ہے۔ اس میں چھوٹے چھوٹے دلکش مضامین ہیں۔ انہیں نثر شاعری یا نثر میں نظمیں سمجھئے۔ بلبل، کوئل اور پپیہے کے متعلق آپنے بہت کچھ سنا ہے کمتر کے متعلق چند سطریں سن لیجئے۔

قبروں کے شکستہ پتھروں کے شیدائی آ......

ہم اس سنسان رستے پر زندگی کی کھوئی ہوئی کرنوں کو ڈھونڈیں۔

روح کی گم شدہ مسکراہٹوں کو پالیں"

اس کتاب میں اچھے اچھے فلسفیانہ اور شاعرانہ خیالات آپ کو ملیں گے۔ ضخامت (۴۴) صفحات۔ خوبصورت جلد۔ قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ:۔ دار الاشاعت پنجاب لاہور۔

تمدّنِ عتیق۔ یہ کتاب دو حضرات کی محنت کا نتیجہ ہے:۔ ابو ظفر عبد الواحد۔ ایم۔ اے ؛ اور محمد عطاء الرحمٰن۔ بی۔ اے ؛ مندرجہ ذیل عنوانات پر تحقیق وکاوش سے مضامین لکھے ہیں:۔

(۱) آغازِ گیتی۔ (۲) کرشمۂ حیات۔ (۳) نیاندرطالی انسان۔ (۴) قدیم عصر الحجر۔ (۵) جدید عصر الحجر۔ (۶) ابتدائی تخیلات وعقائد۔ (۷) تحریر کی ابتدا۔ (۸) تمدن کے اولین نقوش (ہندوستان)۔ (۹) سامرستان اور مصر (مذہبی اور ادبی رجحان)۔ (۱۰) سامرستان ومصر (اولین فرمانروا اور طبقاتی نظام)۔ (۱۱) سامرستان ومصر (علوم وفنون اور کاروباری زندگی)۔ (۱۲) سامرستان ومصر (قوانین اور اقتدار شاہی)۔ (۱۳) قدیم آوارہ گرد۔ (۱۴) اولین بحر پیما۔ (۱۵) اوّلین قومی مملکت (مصر)۔ (۱۶) قدیم تریں سلطنتیں (سامرستان)۔ (۱۷) مصر کا عروج (پہلا دور)۔ (۱۸) مصر کا عروج (دوسرا دور)۔ (۱۹) اشوریہ کا عروج۔ (۲۰) اشوریہ کا آخری عروج۔ (۲۱) عبرانی اور انکی قلمرو۔

ضخامت ۳۰۴ صفحے۔ بے تصویر اڈیشن ۔ عا۔ با تصویر اڈیشن سے۔ غالباً مصنفین سے سٹی کالج حیدرآباد۔ دکن۔ سے یہ کتاب منگائی جاسکتی ہے۔

بادۂ سخن۔ ڈاکٹر احمد حسین مائل مرحوم کے کلام موزوں کا انتخاب ہے اور نہایت خوبصورت انتخاب ہے۔ مائل مرحوم دکن میں پیدا ہوئے۔ دکن میں پرورش پائی۔ لیکن زبان وہ پیدا کی کہ دہلی والوں کی محفلوں میں سراہے گئے۔ کلام میں جس قدر ہمارے پیش نظر ہے آمد ہی آمد ہے۔ اگر کہیں کہیں خفیف لغزشیں نہ ہوں اور بندشوں میں سے کچھ غیر مانوس الفاظ نکال دئے جائیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فصیح الملک مرحوم کے صحبت یافتہ ہیں۔ ان کے کلام میں جو بے تکلفی ہے وہ خدا داد ہے۔ اور مقدمے میں دکن کی اُردو شاعری پر جو مقدمہ لکھا گیا ہے وہ تو نہایت بصیرت افروز ہے۔ اس لئے اُردو شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بادۂ سخن میں بہت سی کارآمد چیزیں مل سکتی ہیں۔ قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ ابراہیمیہ۔ حیدرآباد۔ دکن۔

کیفِ سخن۔ سید رضی الحسن صاحب کیفی بھی دکن کے شاعر ہیں اور کیفِ سخن اُن کے پُر لطف کلام کا نہایت لطیف انتخاب ہے۔ ہر شعر ان کے مذاقِ سلیم کا گواہ ہے۔ کلام میں اس قدر رسائی ہے کہ طبیعت پڑھنے سے تھکتی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت سیدھی سادی زبان میں سامنے کے مضامین لکھنے کی زیادہ عادی تھی یا فکر کو دکن کی سطح سے بلند کرتے ڈرتے تھے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہر زبان کے مقلد کی یہی خواہش ہوا کرتی ہے۔

کیفی مرحوم کے کلام کو دیکھکر یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کی شاعری حضرت داغ مرحوم کی عنایت اور جناب مسکین کی صحبت کی رہین منت ہے۔ پنڈت سورج بیھان مسکین تھانہ بھون کے ایک نو مسلم صوفی منش بزرگ تھے اور حیدرآباد میں اُستادانہ درجہ رکھتے تھے۔ کیفی مرحوم کے اشعار میں جو ایک قسم کا درد اور تصوف کی چاشنی ہے وہ جناب مسکین ہی کا صدقہ ہے۔ بہرحال یہ مجموعہ انتخاب زبان، تخیلات، روانی، سلاست اور صفائی وغیرہ ہر لحاظ سے اچھا ہے، خصوصاً جبکہ یہ بھی پیش نظر ہو کہ اس کا کہنے والا ایک ٹھیٹ دکنی ہے جہاں اُردو زبان

اکتسابی زبان ہے۔ قیمت ۱۲ر ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن۔

متاعِ سخن۔ یہ جناب عزیز کا انتخابی کلام ہے مگر نہایت پاکیزہ۔ جذبات سے لبریز اور شاعری کا پورا نمونہ۔ نواب عزیز بہادر عزیز حیدرآباد کے ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں جو پشتوں سے امارت کے ساتھ علم وفضل کی دولت سے بھی مالا مال ہے۔ ان کا شاعرانہ ذوق دیکھکر یہ سمجھ میں آیا کہ حضرت ذوق مرحوم کے دل میں دکن نے کیوں جگہ تھی اور میر انیس مرحوم کس لئے حیدرآباد تشریف لے گئے تھے۔ اگر میرے سامنے جناب عزیز کی صرف شاعری ہوتی اور ان کے احوال سے بے خبر ہوتا تو میں بلا مبالغہ یہ سمجھتا کہ مومن خاں مرحوم کا کوئی شاگرد اُن کی بعض خصوصیات سے علیحدہ ہوکر مرزا داغ کی زبان بول رہا ہے۔ زبان میں ان کی لغزش نہیں۔ بیان میں ان کے زور، بندش اُن کی چست، غرضکہ شاعری کے لئے جس کیفیت کی ضرورت ہے وہ ایک حد تک انکے کلام میں پائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور کا احسان ماننا چاہیئے کہ اُنہوں نے مذکورۂ بالا دکن کے تین قابلِ قدر شعرا کے کلام سے ہمیں روشناس کرایا۔ متاعِ سخن کی قیمت بھی ۱۲ر ہے اور مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن سے ملتی ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں۔ سلیمان ندوی صاحب اتنے مشہور ہیں کہ شاید ہی کوئی پڑھا لکھا آدمی اُن سے ناواقف ہو۔ چونکہ عام طور سے علامہ شبلی مرحوم کے جانشین سمجھے جاتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے انہیں بھی (ہوم گورنمنٹ سے) علامہ کا خطاب مل گیا۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ خیر ادب وانشا میں ان حضرتِ علامہ کا کوئی کارنامہ نہ سہی تاریخ وسیر میں تو ان کی ساکھ اچھی ہے۔ اور چونکہ علامہ ہیں اس لئے فارسی کو چھوڑیئے عربی میں عمدہ استعداد ضرور رکھتے ہوں گے۔ مگر پہلے رسالہ جامعہ نے، پھر نگار نے اور اب مولانا امداد صابری کے ایک پمفلٹ نے حضرت علامہ کے کمالات پر سے پردہ ہٹا دیا۔ پمفلٹ میں یہ دیکھکر بے حد حیرت ہوئی کہ یہ حضرت علامہ خیر سے قرآنی آیات کی تفسیر میں دو چار نہیں متعدد غلطیاں کرتے ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ع۔

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی؟

مولانا امداد صابری نے ۱۷ صفحے کی ایک اچھی خاصی کتاب ان غلطیوں کی مرتب کی ہے اور مفت تقسیم کی ہے۔ اس مجموعہ میں جتنی غلطیاں پیش کی گئی ہیں اُن سے بڑی تعداد ابھی اشاعت کی محتاج ہے۔ دیباچہ میں تحریر ہے کہ سید صاحب نے باوجود تقاضوں کے ان اعتراضات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اور علامہ موصوف کو جواب دینا بھی نہیں چاہیئے تھا۔ عذرِ گناہ بدتر از گناہ۔ معارف کی گزشتہ اشاعت میں ان علامہ نے اپنے خالص مولویانہ انداز میں جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ فی الحقیقت یہ بھی اُن سے ایک غلطی ہوگئی۔ ایک دلیل آپ بھی سُن لیجئے۔ جواب میں فرماتے ہیں کہ یہ غلطیاں مولانا امداد صابری نے نہیں بلکہ کسی اور نے نکالی ہیں۔ اور ان کسی اور کو علامہ صاحب خوب جانتے ہیں۔ ماشاء اللہ۔ سوال دیگر جواب دیگر۔ ماروں گھٹنہ پھوٹے آنکھ۔ یہ ہے حالت ہمارے ایک عظیم الشان مولوی کی۔ اللہ رحم کرے غریب مسلمانوں کی حالت پر۔

مولانا امداد صابری کی تحقیق وتدقیق کے علاوہ اُن کی جرأت بھی لائقِ تحسین ہے کہ اُنہوں نے علامہ کی شخصیت سے مرعوب ہوکر ان اغلاط کے اخفا کی کوشش نہیں کی بلکہ اُنہیں کتابی صورت میں شائع کر دیا اور اسے مفت تقسیم کرنا اُن کا ایک ایسا اجری کارنامہ ہے جس کے لئے وہ عنداللہ ماجور اور عندالناس مشکور ہوں گے۔ ناظم جماعت خدام القرآن، چوڑی والان۔ دہلی سے طلب کیجئے۔

سالنامۂ شاہجہاں دہلی۔ جنوری سے شاہجہاں ترقی پسند مصنفین کی انجمن دہلی کا پرچہ ہوگیا ہے۔ سال کا پہلا پرچہ سالنامے کی صورت میں شائع ہوا ہے۔ ترقی پسند مصنفین کا مقصد یہ ہے کہ وہ ایسا ادب پیش کریں جو ہمیں زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں دکھائے اور اُسے پڑھکر ہم زندگی کے اہم مسائل پر غور وفکر کرنے کے عادی ہوں۔ اس لحاظ سے شاہجہاں کا سالنامہ بہت قابلِ قدر ہے۔ مضمون نگار بھی اعلیٰ درجے کے ہیں۔ مضامین علمی، تنقیدی اور پُر از معلومات ہیں۔ افسانے اور ڈرامے خاص طور پر پڑھنے کے لائق ہیں۔ اداریہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ شاہجہاں میں دلی کی شاخ کے علاوہ اور شاخوں کے چیدہ چیدہ مضامین بھی شائع ہوا کریں گے۔ ہمیں اسکی خوشی ہے کہ اردو رسائل میں کوئی نئی بات لیکر ایک رسالہ تو پیدا ہوا ورنہ تقلید کے علمبرداروں کی گرم بازاری ہے اور تقلید بھی اردو کی بدنصیبی سے بند جیسی۔ شاہجہاں کے سالنامے کی قیمت ۸ر ہے معمولی پرچہ ۴ر ہے

ساقی کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے
جس میں اس کے تمام خاص
نمبروں کی قیمت شامل ہے،
قیمت فی پرچہ ۸؍

جُرعات

ساقی میں اردو کے بہترین انشاپردازوں
کے مضامین شائع ہوتے ہیں اسکا
معمولی پرچہ بھی سو صفحے کا ہوتا ہے۔
نمونے کا پرچہ مفت

جلد ۱۵	ساقی دہلی۔ بابت ماہ مارچ ۱۹۳۷ء	نمبر ۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلین

زیرِ نظر اشاعت میں کئی مضمون بہت قابلِ قدر ہیں۔ "راز سیلاس" میں نہایت اہم مسائلِ حیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مگر اس خشک موضوع کو اس قدر دلچسپ پیرائے میں پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا اس وقت تک اسے ہاتھ سے نہیں چھوڑتا جب تک اسے ختم نہ کرلے۔ مولانا عنایت اللہ صاحب کی سلیس و شگفتہ زبان نے اسے چار چاند لگا دئے ہیں۔ پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب نے گویا گاگر میں ساگر بند کیا ہے۔ ادبیاتِ عالم کا جائزہ لینا یقیناً سمندر کی لہروں کو شمار کرنا ہے مگر اس مختصر مضمون میں اس سے زیادہ اور کیا بھی کیا جاسکتا ہے۔ سید ابوالقاسم صاحب نے ایک گاندھی جی سے بڑے سلیقے سے بات چیت کی ہے اور اس گفتگو میں دادِ تحقیق دی ہے۔ سید صاحب نے جس زبان میں اپنا طول طویل و دلکش مضمون لکھا ہے وہ بہت کٹھن ہے دیکھنے میں سیدھی سادی مگر اس طرز میں لکھنے بیٹھو تو دو سطریں بھی لکھنی مشکل۔ اس اسلوب کو سادہ پُرکار کہنا چاہئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ گاندھی جی کیا کہتے ہیں، اور کچھ کہتے بھی ہیں یا چپ سادھ جاتے ہیں۔ گوئٹے کا فاؤسٹ اس اشاعت میں ختم ہوتا ہے۔ یہ کہانی توقع سے زیادہ پسند کی گئی۔ محترمہ حجاب امتیاز علی کا افسانہ انکے طرز کی خاص چیز ہے۔ محترمہ فرخندہ اختر بیگم نے لیمب کی کئی کہانیوں کے پاکیزہ ترجمے کئے ہیں۔ انگریزی ادبیات میں ان کہانیوں کو خاص وقعت حاصل ہے۔ امید ہے کہ اردو میں ان کے تراجم بھی مفید ثابت ہونگے۔ ساغر جعفری صاحب نے ایک ایکٹ کے ڈرامے کا اچھا ترجمہ کیا ہے۔ اردو میں ڈرامہ پستی کی حالت میں ہے۔ اچھے لکھنے والوں کو اس طرف متوجہ ہونا چاہئے۔

ہر سال کی طرح اس سال بھی اردو رسائل کے اچھے اچھے سالنامے شائع ہوئے۔ اردو کے سب سے بڑے پرچے "ادبی دنیا" کا سالنامہ سب سے بڑا اور سب سے اچھا رہا۔ مولانا منصور احمد صاحب کی ادارت میں اس پرچے نے لائقِ رشک ترقی کی ہے۔ یوں تو اسکے ریاضِ ادب میں ہمیشہ رنگ برنگ کے خوشنما پھول کھلتے رہتے ہیں لیکن نوروز پر اس میں بہار آتی ہے۔ سالنامہ کیا ہے؟ ع۔ دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے! بارہ افسانے، چار ڈرامے، آٹھ علمی مضامین، پانچ تنقیدی مضامین، پانچ ادبی مضامین۔ اور چالیس منظومات۔ چھ سہ رنگی اور سات یک رنگ آرٹ کی تصاویر ہیں اور مضمون نگار حضرات کی تصویروں کا تو کچھ شمار ہی نہیں۔ رنگین نوا سیفو کی ایک طویل نظم کا نہایت پاکیزہ ترجمہ منصور احمد صاحب نے کیا ہے۔ افسانوں میں "دولھا دلہن کی ڈائری"، "خوشبودار خط" گہرے مشاہدے کے کامیاب افسانے ہیں۔ ڈراموں میں "دو مسئلے" بہت قابلِ قدر ہے علمی مضامین میں "مسلمان اور ہندی زبان"، "وقت" کی چیز اور غور سے پڑھنے کے لائق ہے۔ حصۂ نظم میں بہترین شعرا کا کلام شامل ہے۔ میراجی کے اشعار جدید ولندیزی شاعری کے نمونے ہیں۔ سالنامہ ادبی دنیا (۲۳۶) صفحوں پر مشتمل ہے۔ اور اس میں ایک صفحہ بھی ایسا نہیں جسے ہم پڑھنے کے لائق نہ سمجھیں۔

ہمیں افسوس کے ساتھ اعلان کرنا پڑتا ہے کہ اس سال اپریل میں ساقی کا "ظریف نمبر" شائع نہیں ہوسکے گا۔ اردو کے گنتی کے مزاح نگاروں میں سے بھی اکثر نے لکھنا لکھانا چھوڑ دیا۔ بعض کا شوق پورا ہوگیا۔ بعض یہ سوچتے ہیں کہ کیوں لکھیں؟ بعض پیٹ کے دھندوں میں ایسے پھنسے کہ نون تیل لکڑی کے سوا اور کچھ انہیں یاد نہ رہا۔ بعض نے قسم کھائی ہے کہ چاہے ہمارے مضامین معاوضے کے قابل ہوں یا نہ ہوں ہم معاوضہ پر لکھیں گے۔ بعض لکھتے لکھتے بیمار ہوگئے۔ لے دیکر دو چار لکھنے والے رہ گئے جو لکھنے کیلئے آمادہ بھی ہیں مگر ان سے ظریف نمبر کا بھرم پورا نہیں ہوسکتا۔ اسلئے بدرجۂ مجبوری ہمیں "ظریف نمبر" کا خیال چھوڑنا پڑا۔ اسکی کسر انشاء اللہ افسانہ نمبر کے موقع پر نکالدی جائیگی۔

شاہد

(گذشتہ سے پیوستہ)

راسیلاس

آٹھواں باب

املاک کے حالاتِ زندگی

منطقۂ حارہ کے ملکوں میں صرف رات کا وقت ایسا ہوتا ہے جس میں عیش و تفریح کے جلسے ہونے ممکن ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب آدھی رات ہوئی تو شہزادیاں اپنی اپنی خوابگاہ کو چلی گئیں اور گانا بجانا بھی بند ہو گیا۔ اس وقت راسیلاس نے املاک کو اپنے قریب بلایا۔ اور کہا کہ "اب آپ اپنی سرگزشت حیات بیان کریں"

املاک نے عرض کیا "حضور میرے حالاتِ زندگی کا بیان زیادہ طولانی نہ ہوگا۔ جو زندگی تحصیلِ علم میں گزرتی ہو وہ چپ چاپ گزرے چلی جاتی ہے۔ اس میں مختلف قسم کے واقعات کم پیش آتے ہیں۔ شائقِ علم و فضل کا کام یہی ہے کہ عام جلسوں میں شریک ہو کر تقریر اور تنہا بیٹھ کر غور و فکر کرے۔ خود علمی تحقیقات میں مصروف ہو اور لوگ جو کچھ اُس سے دریافت کریں تحقیق کر کے اُن کا جواب دے۔ وہ بلا حشم و خدم دُنیا کی سیر و سیاحت کرتا ہے اور سوائے ایسے لوگوں کے جو اُسی کی مثل ہوں نہ کوئی اُسے جانتا ہے اور نہ کوئی اُن کی قدر کرتا ہے۔

میں گوئی آما کی ریاست میں پیدا ہوا تھا اور میرا مولد سرچشمۂ نیل کے قریب تھا۔ باپ میرا ایک مالدار تاجر تھا۔ وہ افریقہ کے اضلاع اور بحرِ قلزم کے ساحلی شہروں میں تجارت کرتا تھا۔ دیانتدار تھا اور سیدھی سادی عادتیں رکھتا تھا جفاکش اور محنتی تھا مگر خیالات تنگ اور عقل محدود رکھتا تھا۔ صرف مالدار بننے کی آرزو ہر وقت اسکے دل میں رہتی تھی۔ اور یہ کہ اپنی دولت کو دوسروں سے مخفی رکھے تاکہ حاکمِ وقت اسکی دولت اُس سے چھین نہ لے"

اتنا سُن کر شہزادہ کہنے لگا "اگر ایسا ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے مال کو زبردستی لے سکتا ہے تو مجھنا چاہیئے کہ میرا باپ منصبِ شاہی کے فرائض سے غافل ہے۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ سلطنت میں زیادتی و بے انصافی کا جوابدہ بادشاہ ہوا کرتا ہے۔ اگر میں شہنشاہ ہوتا تو اپنی ادنیٰ سے ادنیٰ رعایا پر بھی کوئی بلاوجہ زیادتی نہ کر سکتا۔ جب میں سُنتا ہوں کہ ایک تاجر اپنی کمائی سے جو اُس نے دیانت اور محنت سے پیدا کی ہے اِس خوف سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتا کہ کہیں حکومت اُس کا مال لُوٹ نہ لے تو میرا خُون جوش کھانے لگتا ہے۔ مجھے اس حاکم کا نام بتاؤ جو رعایا کو اس طرح ستاتا ہے تاکہ اُس کے اِس قصور سے شہنشاہ کو آگاہ کروں"

املاک عرض کرنے لگا "حضور یہ جذبۂ عدل و انصاف حضور کی نیک نفسی کا قدرتی نتیجہ ہے۔ اور نیک نفسی میں جوشِ جوانی بھی شامل ہے۔ وہ وقت آنے والا ہے کہ حضور اپنے پدرِ بزرگوار کو ایسی خطا سے بری الذمہ سمجھیں گے اور ایسے حاکم کے کاموں کو بے قراری اور بے صبری سے نہ سُنیں گے۔ حبشہ کی وسیع مملکت میں ظلم و زیادتی نہ تو اکثر پیش آتی ہے اور نہ اس کو گوارا کیا گیا ہے۔ کوئی طرزِ حکومت آج تک ایسا تحقیق نہیں ہوا ہے جس میں ظلم و زیادتی قطعی بند ہو سکی ہو۔ تابعداری میں اگر ایک جانب حکومت اور اختیار ہے تو دوسری جانب انقیاد

اور متابعت ہے۔ اگر حکومت اور اختیار انسان کے ہاتھ میں ہے تو اُسے کبھی بھی ضرور بُری طرح استعمال کیا جائے گا۔ حاکمِ اعلیٰ کی احتیاط و نگہداشت بہت کچھ کر سکتی ہے مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ رہ جاتا ہے۔ تمام جرائم جن کے لوگ مرتکب ہوتے ہیں حاکمِ اعلیٰ کے علم میں نہیں آتے۔ اور جتنے علم میں آتے ہیں اُن میں بھی وہ سب میں سزا نہیں دے سکتا۔"

شہزادہ بولا "یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی لیکن اس وقت مجھکو آپ کے سیر و سفر کے حالات سُننے کا اتنا اشتیاق ہے کہ بحث نہیں کرنی چاہتا آپ اپنے حالاتِ زندگی بیان کریں"

املاک کہنے لگا "میرے والد کا قصد تھا کہ مجھے سوائے کاروبارِ تجارت کے اور کسی قسم کی تعلیم نہ دی جائے اور یہ دیکھ کر کہ میرا حافظہ اور ذہن بہت تیز ہے وہ کہا کرتے تھے کہ ایک زمانہ میں ملکِ حبشہ میں سب سے دولتمند تاجر ہوںگا۔"

شہزادہ نے دریافت کیا کہ "آپ کے والد دولت کی ترقی کے اس قدر خواہاں کیوں رہتے تھے؟ درحالیکہ دولت اُن کے پاس اتنی تھی کہ نہ وہ اسے ظاہر کر سکتے تھے اور نہ کوئی حظ اُٹھا سکتے تھے۔ میں آپ کی راست گوئی میں شبہ نہیں کر سکتا لیکن نقیضین دونوں صحیح نہیں ہو سکتے۔"

املاک نے جواب دیا کہ "یہ درست ہے کہ دو متباین قضئے ایک ہی وقت میں صحیح نہیں ہوتے لیکن جب اُن کا تعلق انسان سے ہوتا ہے تو دونوں صحیح بھی نکل آتے ہیں۔ لیکن اختلاف یا عدم موافقت میں تباین ضروری نہیں۔ ممکن ہے کہ میرا باپ اس اُمید میں ہو کہ زیادہ امن و حفاظت کا زمانہ آنے والا ہے۔ بہرکیف کوئی نہ کوئی خواہش رکھنی ضروری ہے تاکہ زندگی حرکت میں رہے اور جس کی حقیقی ضروریات مہیا ہو چکی ہوں وہ خیالی ضروریات کا محتاج ہے۔"

شہزادہ بولا "یہ بات تو کسی قدر میری سمجھ میں آتی ہے۔ افسوس ہے کہ میں نے آپ کا قطع کلام کیا۔"

املاک کہنے لگا "غرض باپ نے اسی اُمید کے ساتھ مجھے مدرسہ بھیجا لیکن جونہی علم میں ذہانت کی لذت اور ایجاد کا تفاخر میں نے محسوس کیا تو دل ہی دل میں مجھے دولت سے نفرت پیدا ہو چلی اور میں نے ارادہ کر لیا کہ باپ کو اپنی طرف سے ضرور مایوس کرونگا۔ اسکے خیالات کی سقاہت پر مجھے افسوس آنے لگا۔ جب تک میری عمر بیس برس کی نہ ہو گئی محبتِ پدری نے مجھے صعوبتِ سیر و سفر گوارا کرنے کی اجازت نہ دی۔ اس زمانے میں مجھے مختلف اساتذہ نے اپنے ملک کے علم ادب کا بڑا ماہر بنا دیا تھا چونکہ تعلیم کے زمانے میں ہر آن وساعت مجھے کوئی نہ کوئی نئی بات سیکھنی پڑتی تھی اس لئے مجھے ایک تسکین و اطمینانِ خاطر ہر وقت نصیب رہتا تھا لیکن جب عُمر کی منزل میں کچھ آگے بڑھا تو وہ تعظیم و احترام جو اب تک دل میں اپنے اُستادوں کی طرف سے رکھتا تھا اس میں ضُعف پیدا ہونا شروع ہوا۔ کیونکہ جب سبق ختم ہو جاتا تھا تو میں اپنے انہی محترم اُستادوں کو معمولی انسانوں سے زیادہ عاقل اور بہتر نہ پاتا تھا۔ آخرکار میرے والد نے مجھے پیشۂ تجارت میں لگانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے ایک تہ خانہ جس میں وہ اپنی دولت رکھا کرتے تھے کھولا اور دس ہزار اشرفیاں گن کر مجھے دیں۔ اور کہا کہ "بیٹا یہ سرمایہ ہے جس سے تم تجارت کا کاروبار کرو۔ میں نے جب یہ پیشہ اختیار کیا تھا تو اس رقم کے پانچویں حصے سے بھی کم لیکر کام شروع کیا تھا۔ محنت و جُزرسی نے اس رقم کو بڑھایا۔ اب یہ دولت کُل تمہاری ہے۔ چاہے اسے ضائع کرو، چاہے بڑھاؤ۔ اگر تم نے غفلت اور تلون سے اسے ضائع کر دیا تو پھر تم میرے مرنے کا انتظار کرنا کہ میری باقی دولت بھی تم کو مل سکے۔ اگر چار برس میں تم نے ان اشرفیوں کو دوچند کر دیا تو پھر تم تجارت میں میرے برابر کے شریک بن کر میرے ساتھ کام کرنا۔ پھر ہماری بزرگی خُردی ختم ہو جائے گی اور تم میرے ہمسر اور ہم پلہ سمجھے

جائے گے۔

جب ہم نے بزازِ چینیوں کے صندوقوں میں اشرفیاں چھپا کر صندوقوں کو اونٹوں پر بار کیا اور بحرِ قلزم کے ساحل ساحل روانہ ہوئے۔ جب میں نے پانی کی وسیع سطح کو دیکھا تو میرا دل ایسا باغ باغ ہوا کہ جیسے کسی قیدی کو زنداں سے رہائی ہو۔ ہجرت اور تفحصِ اشیا کی طرف طبیعت ایسی راغب ہوئی کہ کسی طرح سیر نہ ہوتی تھی۔ اب میں نے ارادہ کیا کہ تمام عالم کے طور طریقے رسم و رواج دریافت کر ڈالوں اور ان علوم میں دستگاہ پیدا کروں جن سے ملکِ حبش میں کسی کے کان آشنا نہیں۔

مجھے اپنے والد کی نصیحت یاد آئی کہ جو سرمایہ تجارت کے لئے انہوں نے دیا ہے اُسے بڑھاؤں۔ اس نصیحت پر عمل کرنے کا وعدہ میں نے اُن سے نہیں کیا تھا۔ اس لئے نصیحت کو بجالانے پر میں مجبور نہ تھا۔ لیکن اس نصیحت میں ایک صورت نادان یا سزا کی موجود تھی جسے اگر میں چاہوں تو برداشت کروں۔ مجھے اُس وقت سب سے زیادہ شوق سیر و سفر کا تھا پس میں نے سوچا کہ پہلے اُسے پورا کروں۔ علوم کے سرچشموں پر پہنچ کر شوقِ معارف و تحقیق کی تشنگی کو بجھاؤں۔ چونکہ طے پایا تھا کہ باپ سے علیٰحدہ تجارت کا کاروبار کروں اس لئے جہاز کے ناخدا سے رسم و ملاقات پیدا کرنی مجھے آسان ہوئی اور اس کی معرفت مُلکوں میں سیر و سیاحت کا اجازت نامہ مجھے حاصل ہوگیا۔ میں یہ نہیں بتا سکتا تھا اور نہ کوئی ایسی وجہ رکھتا تھا کہ کس مُلک کو اپنے سِیر و سفر کے لئے منتخب کروں۔ میرے لئے صرف اتنا ہی کہنا کافی تھا کہ جس مُلک میں جاؤں وہ ایسا ہو جسے میں نے پہلے نہ دیکھا ہو۔ پس میں ایک جہاز پر سوار ہوگیا جو سورت کے شہر کو جانے والا تھا۔ روانگی سے پہلے میں نے ایک خط اپنے والد کو روانہ کیا اور اپنے ارادے سے انہیں آگاہ کر دیا۔

نواں باب

املاک کی سرگزشت جاری رہتی ہے

جب میں عالمِ آب و امواج میں داخل ہوا اور زمین میری نظر سے غائب ہوئی تو میں نے خوف آمیز مسرت سے اپنے چاروں طرف دیکھا اور اس لامتناہی سطحِ آب کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ میرا قلب وسیع ہوگیا ہے۔ اور میں سمندروں کو بغیر سیر ہوئے ہمیشہ دیکھ سکتا ہوں لیکن تھوڑی ہی دیر میں میں اس بے برگ و بار یکسانیت کو دیکھتے دیکھتے تھک گیا۔ جس چیز کو ایک مرتبہ دیکھ چکا تھا اب برابر اسی کو دیکھنا پڑتا تھا۔ اب میں جہاز کے نیچے کے طبقے میں گیا اور خیال آیا کہ جو چیزیں میں نے آئندہ دیکھنے کے لئے سوچ رکھی ہیں کہیں اُن کا انجام بھی نفرت و مایوسی پر نہ ہو۔ پھر مجھے خیال آیا کہ سمندر اور زمین بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ سمندر میں جو کچھ تنوّع اور نیرنگی ہے وہ سکون و حرکت ہے۔ لیکن زمین پر پہاڑ، وادیاں، صحرا اور شہر ہیں۔ اور آدمیوں سے وہ آباد ہیں۔ جن میں طرح طرح کے طریقے دستور اور رواج، خیالات اور آرا رائج ہیں۔ انسان کی زندگی میں نیرنگی اور بوقلمونی ہے۔ فطرت میں یہ چیز دیکھنے میں نہ آئیگی۔

اِس خیال سے میرے دل کو تسکین ہوئی۔ دورانِ سفر میں کبھی اس طرح دل بہلایا کہ ملّاحوں سے جہاز رانی میں سبق لیا اور کبھی یہ سوچتا رہا کہ مختلف حالات میں کیا طریقے اختیار کرونگا۔ اور یہ مختلف حالتیں وہ ہونگی جن کا تجربہ پہلے مجھے مطلق نہ ہوا ہوگا۔

جہاز رانی سیکھنے سے بھی طبیعت بیزار ہو چلی۔ آخر کار جہاز سورت کے بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا۔ میں نے کچھ روپیہ نکال کر معمولی سامان جس میں نمود اور بھڑک بہت تھی خریدا اور ایک کارواں کے ساتھ مع اس سامان کے چلا۔ یہ کارواں مُلک کے اندرونی شہروں کو جانے والا تھا

میرے ہم سفر کسی نہ کسی وجہ سے مجھے مالدار و متمول سمجھنے لگے۔ اور ان کو خیال ہوا کہ میں ایک بیوقوف سا نووارد ہوں، اور اس وجہ سے انہیں حق حاصل ہے کہ بات بات پر وہ مجھے دھوکا دیں۔ وہ مجھے اپنے معمولی نقصان کے ساتھ مکاری کے فن کا تجربہ حاصل کرتا رہوں۔ ان کے اشارے سے نوکروں نے میرے لئے چیزیں گراں قیمت پر خریدیں اور افسران چنگی نے زیادہ محصول میرے مال پر لگائے۔ مگر یہ میرے ہمراہی کچھ نہ بولے۔ وہ یہ بھی بلا اعتراض دیکھتے رہے کہ لوگ جھوٹی جھوٹی باتیں بنا کر مجھے کیسا لوٹتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میرے اس نقصان میں اُن کا کچھ بھلا نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ ہر بات میں مجھ سے زیادہ واقف رہے۔

یاسیلاس بولا: ذرا ٹھہریئے۔ کیا انسان میں یہ کمینہ پن ہے کہ وہ دوسرے کو بغیر اپنے فائدے کے نقصان پہونچانا گوارا کرے؟ یہ تو میں جانتا ہوں کہ علم و واقفیت میں ہر شخص اپنے کو دوسرے سے بہتر اور افضل مانتا ہے، اور اس پر خوش بھی ہوتا ہے۔ لیکن آپ کی ناعلمی اور وہاں کی باتوں سے ناواقفیت تو محض اتفاقی تھی۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہ تھا اور نہ اس کو حماقت سمجھا جا سکتا تھا۔ پس ان کو اپنے علم و واقفکاری پر کوئی وجہ تعلّی نہ تھی۔ اور جو علم ان کو تھا اور آپ کو نہ تھا اس کا بہترین طریقہ ظاہر کرنے کا یہ ہوتا کہ وہ آپ کو ہر ایسے موقع پر ہدایت کرتے نہ کہ دھوکہ دیتے۔"

املاک بولا: "جو طبیعتیں غرور اور تکبّر رکھتی ہیں وہ نازک خیال نہیں ہوتیں۔ وہ اپنے ذرا ذرا سے فائدے پر خوش ہوتی ہیں۔ یہی حال حسد و رشک کا ہے کہ جب تک وہ دوسروں کو مصیبت و تکلیف میں نہ دیکھیں خوش نہیں ہوتے۔ چونکہ میرے مالدار ہونے پر انہیں رشک تھا اس لئے وہ میرے دشمن ہو گئے اور مجھ پر زیادہ ظلم اسلئے کرنے لگے کہ میں اُن سے کمزور تھا۔"

شہزادے نے کہا: "اچھا آگے فرمائیے۔ جو واقعات آپ بیان کرتے ہیں اُن میں مجھے کسی طرح کا شُبہ ہرگز نہیں، و میرا خیال ہے کہ جو الزام آپ اُن پر لگاتے ہیں وہ خود اُن کی غلط فہمی سے پیدا ہوئے تھے"

املاک بولا "غرض انہی ہمراہیوں کے ساتھ میں آگرے کے شہر میں آیا جو ہندوستان کا دارالسلطنت تھا۔ یہی وہ شہر تھا جہاں مُغل اعظم شہنشاہِ ہند اکثر سکونت رکھتا تھا۔ میں نے ملک کی زبان سیکھی اور چند ماہ میں وہاں کے عالموں سے گفتگو کرنے لگا۔ بعض عالموں کو میں نے تُرش مزاج اور کم آمیز پایا اور بعض کو ایسا جو بے تکلّف گفتگو کرتے تھے۔ بعض عالم ایسے تھے کہ جو علوم انہوں نے خود نہایت مُشکل سے حاصل کئے تھے وہ دوسروں کو سکھانا پڑھانا نہ چاہتے تھے اور بعض ایسے تھے کہ وہ تحصیلِ علم کا مقصد یہی سمجھتے تھے کہ دوسروں کو اس کا درس دینے کی عزت حاصل کریں۔

شہنشاہ کے نوجوان شہزادوں کا اتالیق مجھ پر مہربان ہوا۔ اُس نے مجھے شہنشاہ کے سامنے اس تقریب سے پیش کیا کہ میں غیر معمولی فضل و کمال کا آدمی ہوں۔ شہنشاہ نے مجھ سے میرے وطن و مُلک اور سیر و سیاحت کے متعلق بہت سے سوال کئے۔ مجھے یاد نہیں کہ شہنشاہ نے مجھ سے کوئی بات کی ہو جو معمولی انسان کی قوت سے باہر ہو۔ اُس نے مجھے رُخصت کیا اور میں اُس کی دانائی اور نوازش کا دلدادہ ہوکر رخصت ہوا۔

اب شہنشاہ کے دربار میں میرا رسوخ ایسا بڑھا کہ جو تاجر میرے ہمسفر رہے تھے، اُنہوں نے مجھ سے درخواست کی کہ میں سفارش کر کے بیگماتِ شاہی تک اُن کی رسائی کرا دوں۔ مجھے اُن کی اِس بات پر تعجب ہوا کہ اُنہوں نے کس طرح مجھ پر بھروسہ کر کے ایسی سفارش چاہی۔ راستے میں جو بدسلوکیاں اُنہوں نے میرے ساتھ کی تھیں اب میں نے اُن کو اُن پر بُرا بھلا کہا۔ میری ملامت کو ٹھنڈے دل سے بڑی بے پروائی کے ساتھ

انھوں نے سُنا لیکن اپنی حرکتوں پر کسی قسم کا افسوس یا شرمندگی ظاہر نہیں کی۔

اب انھوں نے اپنی درخواست کے ساتھ بھیجے۔ ثبوت دینے کا بھی وعدہ کیا لیکن جب بات کو میں محض احسان رکھنے کے خیال سے نہ کر سکتا تھا اُس کو روپیہ لیکر کب کر سکتا تھا۔ میں نے اُن کی درخواست منظور کرنے سے قطعی انکار کیا۔ کچھ اس وجہ سے نہیں کہ انھوں نے مجھے نقصان پہونچایا تھا بلکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اب دوسروں کو بھی نقصان پہونچائیں۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ جن لوگوں کے ہاتھ یہ تاجر اپنا مال فروخت کرینگے تو اُن کو میری سفارش کے بھروسے پر ضرور دھوکا دینگے۔

جب آگرے میں اتنے دن رہ لیا کہ اب وہاں کوئی بات حاصل کرنی باقی نہ رہی تو میں نے ایران کی سیر کا قصد کیا۔ یہاں میں نے دبدبۂ گزشتہ اور شوکتِ ماضی کے بڑے آثار دیکھے۔ اور زندگی بسر کرنے کے نئے نئے طریقے میری نظر سے گزرے۔ ایرانی بڑے معاشرت پسند ہیں طرح طرح کی صحبتیں گرم رکھنے والے لوگ ہیں۔ اُن کی محفلوں میں شریک ہو کر مجھے موقع ملا کہ مختلف طبیعتوں اور طریقوں سے واقفیت حاصل کروں۔ اور انسان کی فطرت کو اس کے تمام مدارجِ ترقی میں سے گزرتا دیکھوں۔ ایران سے میں عربستان میں آیا یہاں ایک قوم نظر سے گزری جو گلہ بانی کے ساتھ بڑی جری اور جنگجو تھی۔ اس کے آدمی مستقل سکونت کے لئے مکان نہیں رکھتے اور اُن کی تمام دولت ان کے بھیڑوں اور گھوڑوں کے گلے میں ہے۔ اس قوم نے صدہا سال سے بنی نوعِ انسان کے مقابلے میں ایک جنگ جسے موروثی کہنا زیبا ہوگا جاری کر رکھی ہے گو دوسروں کی دولت کی طمع اُن کو مطلق نہیں ہے۔

دسواں باب

املاک کے بقیہ حالاتِ زندگی اور شاعری پر ایک مقالہ

جس ملک میں سے گزرا یہی دیکھا کہ علوم و معارف میں اعلیٰ ترین درجہ شاعری کو حاصل ہے اور اس کا ادب و احترام لوگوں کے دلوں میں تقریباً ویسا ہی ہے جو ملائکہ کی فطرت و طبیعت کا ہے۔ یہ بات مجھے دیکھکر تعجب ہوا کہ ہر ملک میں اُس کے شعرائے قدیم کا کلام بہترین سمجھا جاتا ہے۔ اسکی وجہ یا تو یہ ہے کہ اور علوم تو سیکھنے پر بتدریج حاصل ہوتے ہیں اور شاعری ایک عطیۂ قدرت ہے جو یکمشت مل جاتا ہے۔ یا یہ وجہ ہو کہ ابتدائی شاعری نے اپنی جدت و ندرت کی وجہ سے انسان کو حیرت میں ڈالا اور حسنِ ظن جو اتفاق سے شعرائے قدیم کو نصیب ہوا اُسے عامہ نے اس کو ہمیشہ کے لئے قائم رکھا۔ یا یہ وجہ ہو کہ شاعری کا احاطۂ تصرف محدود ہے۔ نیچر یعنی کائنات اور انسان کے جذبات و احساسات کے بیان پر جو ہمیشہ ایک ہی سے رہتے ہیں قدیم شعرا نے زیادہ پُراثر مضامین اپنے موضوع بیان کے لئے اور ایسے واقعات جن کے پیش آنے کا زیادہ تر احتمال ہوتا ہے اپنے قصوں اور داستانوں کے لئے منتخب کر لئے۔ اور اپنے بعد کے آنے والوں کے لئے انہی واقعات کی نقل یا انہی تصورات کی مختلف ترکیبوں کے سوا کچھ نہ چھوڑا۔ وجہ جو کچھ بھی ہو مگر اس امر کے سب معترف ہیں کہ ابتدا کے شاعروں نے نیچر (کائنات) پر اپنا قبضہ جمایا اور بعد کے شاعر فن پر مسلط ہوئے۔ قدیم شاعر قوتِ بیان اور اختراع میں بڑھے رہے اور اُن کے بعد کے آنے والے نفاست اور نزاکتِ خیال میں بازی لے گئے۔

میں نے چاہا کہ شعرا کی رفیع المقام و شریف جماعت میں میرا نام بھی داخل ہو۔ میں نے عرب و عجم کے تمام شعرا کا کلام پڑھا حتی کہ شعرائے عرب کے وہ سات فصیح و بلیغ قصیدے جو خانہ کعبہ کے دروازے پر لٹکے تھے اُنہیں بھی ازبر کر لیا۔ لیکن جلد معلوم ہو گیا کہ انسان دوسرے

کی نقل و تقلید سے بڑا آدمی نہیں بن سکتا۔ اس شوق نے کہ شاعری میں مَیں بڑھ جاؤں مجھے مجبور کیا کہ مَیں فطرت (نیچر) اور حیاتِ انسانی کی طرف اپنی توجہ مبذول کروں۔ فطرت میرا موضوعِ سخن ہو اور انسان میرا مخاطب ہو۔ اور سمجھ لیا کہ مَیں کوئی ایسی چیز بیان نہ کروں گا جو میرے مشاہدے سے نہ گزری ہو۔ میں نے اس امر کی توقع نہیں کی کہ میں کبھی اپنے کلام سے ایسے لوگوں میں مسرّت یا خوف پیدا کر سکوں گا جن کا مذاق یا جن کے خیالات میرے فہم و ادراک کے خلاف ہوں۔

چونکہ اب میں نے شاعر بننے کا ارادہ کر لیا تھا میں ہر چیز کو ایک نئی نظر سے دیکھنے لگا اور میرے غور اور توجہ کا میدان یکلخت وسیع ہو گیا۔ علم کیسا ہی ہو اُسے کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ استعارے تشبیہ و بیان کے لئے میں نے اپنے ذہن میں جنگل کے ہر درخت اور وادی کے ہر پھول کی تصویر اپنے صفحۂ دل پر اُتار لی۔ اور بڑے غور و احتیاط سے چٹانوں کی کگروں اور کنگوروں کی شبیہ اپنے قلب میں محفوظ کر لی۔ کبھی میں کسی بہتے چشمے کے خمدار کناروں پر آوارہ پھرتا۔ کبھی گرمی کے موسم میں بادلوں کی بدلتی ہوئی صورتوں کو دیکھتا۔ شاعر کے لئے کائنات کا کوئی منظر بھی بیکار نہیں ہوتا۔ ہر شے جو حسین ہے یا جو دل میں خوف و بیم پیدا کرتی ہے شاعر کا تصوّر اس سے آشنا رہنا چاہیئے۔ ہر شے جو اپنی عظمت، زینت و وسعت دکھا کر دل کو ہلا دیتی ہے اور ہر چیز جو اپنی صغارت کی وجہ سے دل پر اثرِ حُسن پیدا کرتی ہے شاعر کو اس سے مانوس رہنا لازمی ہے۔ باغ کے اشجار۔ صحرا کے وحوش۔ زمین کے معدنیات۔ فلک کے حوادث۔ یہ سب مل کر شاعر کے دل کو اپنا مخزن اور خزانہ بنائے رکھیں۔ اور اس طرح اس کے لئے نیرنگی و بوقلمونی کے وہ وہ سامان مہیا رکھیں جو کبھی ختم ہونا نہ جانیں۔ کیونکہ ہر خیال اور مثال اخلاقی یا مذہبی حقائق کے بیان میں قوت پیدا کرنے یا اس کو زیب و زینت بخشنے میں بکارآمد ہوتا ہے اور اپنے پڑھنے والے کے خیال کو ذرا سے اشارے میں دور کی باتیں سمجھا کر ایسے ایسے سبق دیتا ہے جن کی اُسے توقع نہ تھی اور اس طرح پڑھنے والا خوش ہوتا رہتا ہے۔

پس میں غور و انہماک سے مناظرِ کائنات (نیچر) کی تمام صورتوں اور شکلوں کو مطالعہ کرتا رہا۔ اور جس جس ملک میں گیا اُسنے میری شاعرانہ قابلیت میں کچھ نہ کچھ ضرور اضافہ کیا۔"

شہزادہ بولا: "اتنے وسیع پیمانے پر مشاہدات کرنے میں ضروری امر ہے کہ مشاہدہ کرنے سے کچھ رہ گیا ہو گا۔ میں جوان پہاڑوں کے حلقے میں ایک مدت سے مقید چلا آتا ہوں جب کبھی گھر سے باہر قدم نکالتا ہوں تو کوئی نہ کوئی چیز ایسی نظر آتی ہے جو پہلے نہ دیکھی تھی۔ یا دیکھکر اُس پر غور کرنے کا خیال نہ آیا تھا۔"

املاک کہنے لگا: "شاعر کا کام کسی جنس یا نوع کے فردی پر غور کرنا نہیں ہے بلکہ فی الواقع اس کے عام خواص اور وسیع سے وسیع پیمانے پر اس کی شکل کا بیان کرنا ہے۔ سوسن کے پھول میں جو نازک دھاریاں ہوتی ہیں یا جنگل میں درختوں کی مختلف سبزیوں کو بیان کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اس کو اپنے ہر مرقعِ کائنات میں فطرت کے رفیع الشان اور اہم مناظر اور خطوط دکھانے ہوتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ رسم پاتے ہی طبیعت میں اُن کی اصل کو حاضر کر دیں۔ ایسی فروعات کو جس کی طرف کسی کا ذہن منتقل ہو اور کسی کا نہ ہو اُسے ترک کرنا پڑتا ہے۔ اسکو اُن خصوصیات کا بیان کرنا ہے جو غور سے دیکھنے والے اور بے پروائی سے دیکھنے والے دونوں کو صاف نظر آئیں۔ لیکن محض کائنات کا علم رکھنا شاعر کے کام کو اَدھورا رکھنا ہے۔ اس کو زندگی بسر کرنے کے تمام طریقوں سے بھی آگاہ رہنا ہے۔ جو شخص اُس کا موضوعِ کلام ہو اُسکا حال اس طرح لکھے کہ معلوم ہو کہ انسان کی ہر راحت و تکلیف سے وہ واقف ہے۔ اور انسان کے تمام اوجاع و آلام، ہوا و ہوس اور اُنکی تمام ترکیبوں کا مشاہدہ کر چکا ہے یا اس میں جو تبدیلیاں ملک کے آئین و قوانین یا موسم اور رواج کے اتفاقی اثرات سے بچپن کے زمانہ

جودت سے لیکر بڑھاپے کی افسردگی اور معذوری تک پیدا ہوتی چلی آئی ہیں اُن کی اصل کا پتہ چلائے۔ اپنے مُلک اور زمانے کے اوہام اور تعصبات سے وہ اپنے دل کو خالی کرے۔ حق اور ناحق کو اس کی اصلی اور ناقابلِ تغیر حالت میں دیکھے۔ آج کل کے قوانین اور خیالات کو منظر انداز کرکے عام اور فائق تریں حقائق کی طرف جو ہمیشہ ایک ہی رہتے ہیں بلند ہوتا چلا جائے اور اپنی ناموری کی آہستہ ترقی پر قانع رہے۔ اپنے زمانے اور وقت کی تعریفوں کا خیال نہ کرے بلکہ آنے والی نسلوں کے انصاف پر اپنے حقوق کو چھوڑ دے۔ اور جو کچھ لکھے وہ فطرت (نیچر) کا ترجمان بن کر لکھے اور بنی نوعِ انسان کا شارع اور واضعِ قوانین بنکر قلم اُٹھائے اور سمجھ لے کہ آنے والی نسلوں کے خیالات طور طریقوں کی مجلس پر صدر بنکر لکھ رہا ہے۔

شاعر کا کام اور اس کی محنت یہاں بھی ختم نہیں ہوتی اس کو بہت سی زبانوں اور بہت سے علوم سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ طرزِ تحریر اس کا اُس کے خیالات کی شان کے مطابق ہونا چاہیئے مسلسل مشق سے تقریر کے ہر نازک پہلو اور کلام کی موزونیت سے اپنی طبیعت کو آشنا رکھے"

گیارھواں باب

املاک کی سرگزشتِ زندگی جاری رہتی ہے۔ سفرِ زیارت پر ایک تقریر

املاک کی تقریر میں جوش پیدا ہوا اور وہ شاعری کو تمام علمی مشاغل پر فضیلت دینے لگا۔ شہزادے نے بلند آواز سے کہا: "بس بس زیادہ نہ فرمایئے۔ آپ نے مجھے اس کا کافی یقین دلا دیا کہ شاعر ہونا کسی انسان کی طاقت میں نہیں ہے۔ اب تو آپ اپنی سیر و سیاحت کے حالات بیان کریں"

املاک کہنے لگا: "شاعر ہونا درحقیقت نہایت مشکل ہے"

شہزادے نے کہا: "اتنا مشکل ہے کہ فی الحال میں ایک شاعر کی محنت و جانفشانی کو سننا نہیں چاہتا۔ اب آپ یہ فرمائیں کہ جب ایران کی سیر و سیاحت سے فارغ ہو چکے تو کہاں گئے؟"

شاعر نے جواب دیا کہ "ایران سے نکل کر میں مُلک شام میں سفر کرنے لگا۔ تین برس فلسطین میں قیام ہوا۔ یہاں مجھے یورپ کی شمالی اور مغربی قوموں سے اکثر ملنے اور گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا۔ یہ قومیں وہ ہیں جو آج کل ہر طرح کا علم اور طاقت رکھتی ہیں۔ اُن کے لشکر اور اُن کی فوجیں اس قدر طاقتور ہیں کہ ان کا مقابلہ ممکن نہیں۔ وہ جنگی جہازوں کے بیڑے رکھتی ہیں۔ وہ کُرۂ ارض پر دور دور مُسلط ہیں۔ جب میں یورپ کی ان قوموں سے اپنی قوم یا اُن قوموں کا مُقابلہ کرتا ہوں جو ہمارے مُلک کے قُرب و جوار میں رہتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان میں وہ ایک جُدا نوع ہیں۔ یورپ والوں کے مُلک ایسے ہیں کہ جس چیز کی خواہش ہو فوراً مُہیا ہو سکتی ہے۔ ہزاروں علوم و فنون جنہیں ہم نے کبھی سُنا بھی نہیں ان کی راحت اور آسائش کے سامان مُہیا کرنے میں مصروف ہیں۔ جو چیز اُن کے مُلک میں پیدا نہیں ہوتی اُسے وہ اپنی تجارت کے ذریعے موجود کر لیتے ہیں"

شہزادے نے پوچھا: "آخر وہ کیا اسباب ہیں جن کی بنا پر یورپ کے لوگ اس قدر صاحبِ قوت ہو گئے ہیں اور کیا وجہ ہے کہ جب یورپ والے قاہرہ، ایشیا یا افریقہ میں تجارت یا مُلک گیری کیلئے آ سکتے ہیں تو ایشیا یا افریقہ کے لوگ یورپ کے ساحلوں پر کیوں وارد نہیں ہو سکتے؟

اور جہاں اُن کے بندرگاہ میں وہاں وہ اپنی نوآبادیاں کیوں قائم نہیں کر سکتے؟ اور یورپ کے بادشاہوں کو کیوں اپنے آئین و قوانین کا پابند نہیں بنا سکتے؟ وہی ہوا جو ہمارے مُلکوں سے اُن کو اپنے مُلکوں میں واپس لے جاتی ہے ہمیں کیوں وہاںتک نہیں پہونچاتی؟"

املاک بولا: "وجہ صرف یہ ہے کہ وہ ہم سے طاقت اور قوت میں زیادہ ہیں اور اس زیادتی کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل و دانائی میں ہم سے بڑھے ہوئے ہیں جس طرح انسان حیوانات پر حکومت کرتا ہے اسی طرح علم جہالت پر غالب رہتا ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ دانائی میں ہم سے کیوں بڑھتے ہوئے ہیں تو اس کی وجہ بیان کرنے سے میں قاصر ہوں۔ اور بجز اس کے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ پروردگار عالم کی مرضی و مشیت میں کسی کو دخل نہیں"

شہزادے نے ایک آہ سرد بھر کر کہا: "دیکھئے ہمارا فلسطین جانا کب ہوتا ہے اور کب ان زبردست قوموں کے مجمع میں شرکت نصیب ہوتی ہے۔ جب تک یہ مبارک وقت نہ آئے میں آپ سے وہاں کے حالات سُنکر دل کو بہلاتا رہوں گا۔ فلسطین میں اتنی مختلف قوموں کے جمع ہونے کی وجہ سے میں لاعلم نہیں ہوں اور میں اس مقام کو عقل و ورع کا مرکز سمجھتا ہوں جہاں ہر ملک کے دانشوروں کا وارد ہونا ضروری ہے"

املاک نے کہا: "بعض قومیں ایسی بھی ہیں جو اپنے بہت کم آدمی فلسطین بھیجتی ہیں۔ کیونکہ یورپ کے بہت سے لائق اور فاضل فرقے اماکن مقدسہ کی زیارت کو لغو و باطل سمجھ کر اُس کا مضحکہ کرتے ہیں"

شہزادہ بولا: "آپ کو یہ بات تو ضرور معلوم ہے کہ مجھ کو اپنی زندگی میں مختلف آرا اور خیالات سے واقف ہونے کا کس قدر کم موقع ملا ہے۔ فریقین جو زیارت کرنے کے مسئلہ کے مخالف یا موافق ہیں اُن کی دلائل سُننے میں تو بڑی طوالت ہوگی۔ آپ تو اُنکی دلائل پر غور کر چکے ہونگے۔ پس جس نتیجے پر آپ پہونچے ہیں وہ فرمائیے کیا ہے"

املاک نے جواب دیا کہ "مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کا مطابقِ عقل یا مخالفِ عقل ہونا اُس نیت یا اُصول پر مبنی ہے جس کی رُو سے زیارت کی جاتی ہے۔ تلاشِ حق میں دُور دراز کے سفر کرنے کا حکم نہیں ہے۔ حق جہانتک کہ زندگی کی رہبری کے لئے درکار ہے جہاں کہیں اُسے سچائی اور ایمانداری سے تلاش کیا جاتا ہے وہیں مل جاتا ہے۔ تبدیلِ مقام قدرتاً زہد و ورع کی زیادتی کا موجب نہیں ہوتا کیونکہ ضروری ہے کہ تبدیلِ مقام پریشانی و اسراف کا باعث ہو۔ لیکن چونکہ لوگ اکثر ایسے مقامات کو دیکھنے جاتے ہیں جہاں بڑے بڑے کام ہوئے ہیں اور اُن کاموں کا انسان اپنے دل پر بڑا اثر لیکر واپس آتا ہے اس لئے قدرتی طور پر ہمیں ایسے مقامات کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ جہاں ہمارے مذہب (عیسائی مذہب) کی ابتدا ہوئی ہو۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جو ان عبرت خیز اور خوفناک مناظر کو دیکھکر مشیتِ خداوندی کا یقین وثوق کے ساتھ دل میں نہ پیدا کرتا ہو۔ یہ خیال کہ خدائے برتر و اعلیٰ کے فیض و کرم کا اعتراف بجائے ایک مقام کے دوسرے مقام پر زیادہ سہولت سے ہو سکتا ہے۔ ایک متعصب طبیعت کا وہم محض ہے۔ لیکن یہ بات کہ بعض مقامات کا اثر ہمارے دلوں پر زیادہ قوت سے ہوتا ہے ایسا خیال ہے جو روزمرہ کے تجربے سے ثابت ہے۔ لیکن جو شخص یہ خیال کرکے کہ فلسطین میں رہ کر ترکِ ذمائم میں آسانی سے کامیاب ہوگا وہ بھی غلط راہ پر ہے۔ لیکن جو شخص سمجھتا ہے کہ وہاں جانے سے اُس کے گُناہ معاف ہو جائیں گے تو وہ اپنے مذہب و عقل کی یقیناً توہین کرتا ہے"

شہزادہ بولا: "یہ باتیں اہلِ یورپ کی موشگافیاں ہیں میں کسی اور وقت ان اُمور پر غور کروں گا۔ اِسوقت تو یہ بتائیے کہ علم کے کیا کیا نتائج آپنے دیکھے۔ کیا یہ قومیں ہم سے زیادہ خوش و مسرور رہتی ہیں"

شاعر نے کہا: عدم مسرت دنیا میں اتنی ہے کہ کسی شخص کو اپنے مصائب اور پریشانیوں سے اس قدر مہلت نہیں ملتی کہ وہ اپنی خوشی سے دوسروں کی خوشی کا مقابلہ کر کے کسی بات کا اندازہ کر سکے۔ علم ایک ذریعہ مسرت پیدا کرنے کا ہے جیسا کہ ہر انسان میں اس کی قدرتی خواہش سے ظاہر ہوتا ہے۔ ہر طبیعت اپنے خیالات کو ترقی دینے کی خواہشمند رہتی ہے۔ جہالت عدم سر و سامانی کا نام ہے۔ عدم سر و سامانی وہ ہے جو کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتی۔ جہالت ایک خلاء محض ہے جس میں روح انسانی بے حس و حرکت اور بغیر طبیعت کو کسی طرف رجوع کئے سست اور کاہل رہتی ہے۔ گو میں اس کی کوئی وجہ نہیں بیان کر سکتا مگر جب علم حاصل ہو جاتا ہے تو طبیعت خوش رہتی ہے۔ اور جب علم ذہن سے جاتا رہتا ہے تو افسوس ہوتا ہے۔ پس میں اس نتیجے پر پہونچنے کی طرف مائل ہوں کہ اگر علم کے قدرتی نتائج کو کوئی چیز باطل کرنیوالی نہ ہو تو ہم اپنے علم کی وسعت کو دیکھکر خوش ہوتے ہیں۔

راحت و آرام کی چیزوں کو بیان کرنے میں کہا جا سکتا ہے کہ اہل یورپ زیادہ نفع میں ہیں۔ وہ ایسی بیماریوں اور زخموں کو اچھا کر دیتے ہیں جن سے ہم گھل گھل کر مرتے ہیں۔ موسم کی سختیاں جو ہمیں پریشان کرتی ہیں اُن کو وہ نرم کر دیتے ہیں۔ محنت و مشقت کے کاموں کیلئے اُن کے پاس ایسی کلیں اور آلات ہیں کہ جو کام ہاتھ سے کرنے کے تھے وہ ان آلات اور کلوں سے انجام دیتے ہیں۔ دُور دراز مقامات میں خبر رسانی کے ذرائع اتنے۔ کہتے ہیں کہ ایک دوست کسی دوسرے دوست سے غیر حاضر نہیں کہا جا سکتا۔ اُن کی حکمت عملی ایسی ہے جو عوام الناس کی تکلیفیں دُور کرتی رہتی ہے۔ پہاڑوں کو کاٹ کر انہوں نے سڑکیں نکالی ہیں۔ اور ملک کے تمام دریاؤں پر پل باندھے ہیں۔ اگر اُن کے گھروں میں جا کر دیکھئے تو راحت و آرام کے سامان زیادہ دیکھئے گا۔ جو کچھ اُن کا مال و اسباب ہے اُسے زیادہ حفاظت میسر ہے۔"

شہزادے نے کہا: "یقیناً وہ لوگ ہم سے زیادہ خوش رہتے ہیں۔ انہیں جو سہولتیں حاصل ہیں اُن میں سب سے زیادہ میں اس آسانی کو پسند کرتا ہوں جس میں دو دوست دُور بیٹھے آپس میں بات چیت کر سکتے ہیں۔"

املاک بولا: "اہل یورپ اتنے ناخوش نہیں ہوتے جتنے کہ ہم رہتے ہیں۔ لیکن انکو خوش بھی نہیں کہہ سکتے۔ انسان کی زندگی ہر جگہ کچھ ایسی ہے کہ اس میں تکلیفیں زیادہ ہیں اور خوش ہونے کی باتیں کم ہیں۔"

بارھواں باب

املاک کے سوانح زندگی کے حالات جاری رہتے ہیں

شہزادے نے کہا: میں ابھی تک اس امر کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوں کہ بشر و انام میں مسرت اس درجہ بخل کے ساتھ تقسیم کی گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر طرز زندگی اختیار کرنے پر مجھے قدرت ہوتی تو میں زندگی کے ہر دن گھڑی اور ساعت کو مسرت و شادمانی سے لبریز رکھتا۔ میں کسی انسان کو تکلیف پہونچانا پسند نہ کرتا۔ جس کو تکلیف میں دیکھتا اس کی تکلیف دُور کرتا اور اُس کے معاوضے میں دوسروں کی شکرگزاری کی برکت حاصل کرتا۔ دوستی کے لئے عاقلوں اور دانشمندوں کو منتخب کرتا۔ نیک بخت اور پارسا عورتوں میں سے کسی کو اپنی بیوی بناتا اور اس طرح دغا فریب اور نامہربانی کے خطروں سے پاک رہتا۔ میرے بچے میری نگہداشت میں رہ کر عالم اور پاکباز ہوتے۔ اور بچپن میں جو فائدے مجھ سے اُن کو پہونچتے میرے بڑھاپے میں وہ مجھے واپس کر دیتے۔ اس شخص کو کون تنگ و پریشان کر سکتا ہے جو دیکھتا ہے کہ اسکے گرد و پیش ہزارہا مخلوق ایسی ہے جو اس کے جود و سخا سے فیضیاب ہو اسکے اختیار اور قوت سے مدد پا چکی ہے۔ اس طرح کیوں وہ اپنی نیکیوں کے

بدلے میں اُسے حفاظت و احترام نصیب نہ ہو۔ یہ باتیں اہلِ یورپ سے امداد مانگے بغیر بھی عمل میں آسکتی ہیں۔ یورپ والوں کی نفاستِ تہذیب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تنی مُغبچہ نہیں ہے جس قدر کہ شاندار ہے۔ اچھا اب یورپ والوں کا ذکر چھوڑ کر اپنے سفر کا حال بیان کیجئے"

املاک بولا: "فلسطین سے میں ایشیائے کوچک کے اکثر ملکوں میں سے گزرا یعنی ایسے ملکوں میں سے جو تمدّن میں بڑا درجہ رکھتے تھے۔ میں نے ایک تاجر کی حیثیت اختیار کر رکھی تھی۔ پہاڑوں کی وحشی قوموں میں جب پہونچا تو وہاں اپنے تئیں زائر بنایا۔ آخر کار نوبت یہ آئی کہ اب وطن یاد آنے لگا۔ دل نے چاہا کہ مدت کی سیرو سفر کی خستگی کے بعد کچھ دنوں وہاں رہ کر آرام کروں جہاں بچپن کا زمانہ گزرا تھا۔ اور اپنے پرانے دوستوں کو اپنی جہاں گردی کے حالات سُنا کر خوش کروں۔ اب اُن دوستوں کی صورتیں یاد آکر آنکھوں میں پھرنے لگیں۔ دوست وہ تھے جن کی صحبت میں عہدِ طفلی خوش بسر ہوا تھا۔ اب یہ تصور بندھنے لگا کہ یہ سب پرانے یار رات کے وقت میرے گرد آن بیٹھے ہیں، میرے سیرو سفر کے حالات سُنکر حیرت کرتے ہیں اور ہر بات میں میرے صلاح و مشورے کو غور سے سُنتے ہیں"

جب یہ خیال دل میں جما تو ہر لمحہ جو مجھے حبشہ سے قریب نہ لاتا تھا میں سمجھتا تھا کہ وہ ضائع ہوا۔ ایشیائے کوچک سے رخصت ہو کر میں جلد مصر میں آیا۔ باوجود عجلت کے مجھے ملک مصر میں دس ماہ قیام کرنا پڑا تا کہ یہاں کے عالیشان اور رفیع العظمت آثارِ قدیمہ کو دیکھ کر دل کو متاثر کروں۔ نیز یہ زمانہ وہاں کے علومِ قدیمہ میں جو کچھ باقی بچا تھا اُس کی تحقیقات میں بسر کیا۔ قاہرہ میں میں نے دیکھا کہ تمام قوموں کے ملے جلے مجمعے تحصیلِ علم کے شوق میں سرگرم ہیں۔ بعض دولت پیدا کرنے کی خاطر یہاں آئے ہوئے ہیں اور بعض کی غرض یہاں بود و باش اختیار کرنے میں یہ ہے کہ اپنوں کی نظر سے پوشیدہ جس طرز کی زندگی چاہیں گے بسر کریں گے۔ اور قاہرہ جیسے کثرت سے آباد شہر کی تاریکی میں چھپے بیٹھے رہیں گے۔ اچھی صحبتوں کے ساتھ تنہائی کا لطف بھی نصیب رہیگا۔

قاہرہ سے میں سوئیس میں آیا اور پھر جہاز پر سوار ہو کر بحرِ قلزم میں اُسکے کنارے کنارے چلا حتیٰ کہ اُسی بندرگاہ میں پہونچ گیا جہاں سے بیس برس پہلے روانہ ہوا تھا۔ یہاں ایک کاروان میں شریک ہو کر آخر کار اپنے وطن میں آگیا۔

اب میں متوقع تھا کہ میرے دوست و اقارب مجھ سے خلوص سے ملیں گے اور میرے احباب سب میری واپسی پر مجھے مبارکباد دینگے اور مجھے اُمید تھی کہ میرے والد خواہ دولت کی کتنی ہی عظمت و بندگی اُنہوں نے اپنے دل میں قائم کر رکھی ہو، مگر جب وہ دیکھیں گے کہ اُنکے فرزند نے قوم و ملت کی عزت و مسرّت میں کیا کچھ اضافہ کیا ہے تو وہ خوش ہونگے۔ لیکن جلد معلوم ہو گیا کہ میرے یہ کُل خیالات بیکار و فضول تھے، میرے والد کے انتقال کو چودہ برس گزر لئے تھے۔ مرتے وقت وہ اپنی دولت میرے بھائیوں میں تقسیم کر گئے تھے اور بھائی سب مُلک کے مختلف علاقوں میں آباد ہو چکے تھے۔ میرے ملنے والے دوست احباب اکثر اپنی اپنی قبروں میں جا بسے تھے۔ جو زندہ تھے اُن میں اکثر ایسے تھے جنہیں میری صورت تک یاد نہ تھی، اور بعض ایسے بھی تھے جو سمجھتے تھے کہ غیر ملکوں میں رہتے رہتے میں نے غیر ملکی روش اختیار کر لی ہے۔

لیکن ایسا شخص جس نے زمانے کا گرم و سرد دیکھا ہو وہ آسانی سے افسردہ خاطر نہیں ہو سکتا۔ کچھ دنوں بعد میں اپنی اس مایوسی کو بھول گیا اور اس کوشش میں ہوا کہ اُمراء و اعیانِ سلطنت سے ملاقات پیدا کروں۔ انہوں نے مجھے ضیافتوں میں مدعو کیا۔ میرے سیرو سفر کے حالات سُنے اور رخصت کیا۔ میں نے ایک مدرسہ کھولا مگر اُس میں پڑھانے کی مجھے ممانعت کر دی گئی۔ اب میں نے ارادہ کیا کہ گھر ہی میں رہ کر اُمورِ خانہ داری میں مصروف رہوں۔ چُنانچہ میں نے ایک خاتون سے جو میرے سیرو سفر کے حالات بہت شوق سے سُنتی تھی عقد کرنے کی درخواست کی۔ لیکن جب اُسے معلوم ہوا کہ میرا خاندان تجارت پیشہ ہے تو اُس نے عقد کرنے سے انکار کر دیا۔

آخرکار درخواستیں کرتے کرتے اور نامنظوریاں سنتے سنتے میں تنگ آگیا اور میں نے قصد کرلیا کہ میں دنیا سے قطعی روپوش ہوکر دوسروں کی تلون مزاجیوں اور رائے زنی سے مطلقاً بے پرواہو جاؤں۔ چنانچہ اب میں اُس وقت کا منتظر ہوگیا جبکہ اس وادی مین کا دروازہ کھلے اور میں اُمید وبیم دونوں کو سلام کہہ کر رخصت ہوں۔ غرض وہ دن آیا۔ میرا کلام پسند کیا گیا اور میں نے خوش ہوکر اپنے لئے حبسِ دوام منظور کرلیا۔"

ما ئیلاس نے سوال کیا: کیا آپ کو اس میں خوشی ومسرت نصیب ہوگئی۔ اور یہاں آکر کیا آپ اپنی حالت سے مطمئن ہوگئے یا ابھی تک سفر وسیاحت کا شوق دل میں چلا جاتا ہے اور علمی تحقیقات میں مصروف ہونے کا ذوق باقی ہے۔ اس وادی کے جتنے رہنے والے ہیں وہ اپنی قسمت سے خوش ہیں اور ہر سال جبکہ شہنشاہ یہاں تشریف لاتے ہیں تو وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو یہاں کی مسرت وشادمانی میں شریک ہونے کیلئے بلاتے ہیں:"

املاک نے جواب دیا: "شہزادۂ عالی جاہ۔ یہ ناچیز جو کچھ عرض کرے گا سچ عرض کرے گا۔ حضور کے خدام وملازمین میں ایک متنفس بھی ایسا نہیں جو اُس گھڑی کو بُرا نہ کہتا ہو جس گھڑی اس وادی میں آکر رہنا اُس نے منظور کیا تھا۔ میں تو پھر بھی رنجیدہ خاطر رہنے میں ان لوگوں سے کم ہوں کیونکہ میرے ذہن میں ہر وقت مختلف خیال اور صورتیں حاضر رہتی ہیں جن میں میں خاطر خواہ مختلف تبدیلیاں اور ترکیبیں پیدا کرتا رہتا ہوں۔ تنہائی میں میرا مشغلہ اکثر یہ رہتا ہے کہ جن علوم وفنون کو حاصل کرکے میں فراموش کرنے لگا ہوں ان کو پھر اپنے دماغ و ذہن میں زندہ کروں۔ اور جو زندگی گزر چکی ہے اُس کے واقعات وسوانح کو یاد کیا کروں۔ لیکن یہ کل مسرتیں بھی اس افسردہ کن خیال پر ختم ہوجاتی ہیں کہ جو کچھ میں نے حاصل کیا تھا وہ سب بیکار وفضول ثابت ہوتا جاتا ہے۔ اور جن باتوں سے میں پہلے خوش ہوا کرتا تھا اب وہ مجھے خوش نہیں کرتیں۔ باقی لوگ جنکی طبیعتوں پر سوائے موجودہ حالت کے کوئی دوسرا نقش نہیں رنج وغم وغصہ سے اپنی جان گھلاتے ہیں، یا ایک دائمی خلاء کی تاریکی میں احمق بنے بیٹھے رہتے ہیں۔"

شہزادے نے کہا: "ایسے لوگوں کے دلوں میں غم وغصہ کے کیا خیالات آسکتے ہیں جن کا کوئی رقیب یا حریف مقابل نہ ہو۔ ہم تو ایسے مقام میں رہتے ہیں جہاں عدمِ اختیار وحکومت حسد کرنے کا موقع نہیں دیتا۔ جہاں دوست و دشمن سب ملکر خوش رہتے ہیں اور اس وجہ سے وہاں رشک وحسد کا گزر نہیں ہوسکتا:"

املاک بولا: "دنیا کے سازوسامان پر قبضہ رکھنے میں یہاں شرکت ضرور ہے لیکن محبت اور ایک دوسرے کی قدردانی میں کوئی کسی کا شریک نہیں۔ ممکن ہے کہ ایک شخص دوسروں کو زیادہ خوش کرسکے۔ لیکن وہ شخص جس سے لوگ نفرت وعداوت رکھتے ہیں وہ ہمیشہ دشمن اور حاسد بنا رہے گا۔ اور اس کے اس حسد اور دشمنی میں اور ترقی ہوتی رہے گی اگر وہ مجبور کیا جائے گا کہ انہی لوگوں میں ہمیشہ بودوباش رکھے جو اُسے حقیر وذلیل سمجھتے ہیں۔ رہا یہ امر کہ دھوکا دے کر یہاں کے لوگ اپنے دوستوں کو ایسے مقام میں رہنے کے لئے بلاتے ہیں جس سے وہ خود متنفر ہیں تو یہ سب نتیجہ ہیں اس مایوسانہ حالت کی تکلیف کا جس سے میں سمجھتا ہوں کہ نجات ملنے کی اُمید باقی نہیں رہی ہے۔ اسی تکلیف نے دلوں میں شقاوت پیدا کردی ہے۔ وہ خود اپنے سے اور ایک دوسرے سے بیزار اور رنجیدہ خاطر رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جب کچھ لوگ نئے یہاں آکر رہیں گے تو کچھ دنوں اُن سے دل بہلتا رہیگا۔ اب انہیں اُس آزادی پر رشک آتا ہے جو انہوں نے اپنی ہی حماقت سے تلف کی ہے اور اگر تمام بنی نوعِ انسان اس زنداں میں بند کردئے جائیں تو انکی قید پر یہ لوگ خوش ہونگے۔

اس گناہ سے میں قطعی بری ہوں۔ کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ میرے کہنے یا ہدایت سے کوئی آدمی اس خراب و زبوں حالت میں مبتلا ہوا ہے۔ ہر سال گروہ کے گروہ اس قید خانے میں داخل ہونے کی درخواستیں کرتے ہیں۔ کاش کوئی قانون ایسا ہو تاکہ میں ان لوگوں کو اس خطرے سے آگاہ کر دیتا۔"

شہزادہ بولا: "اے میرے عزیز املاک میں اپنے دل کا سارا حال تم سے کہے دیتا ہوں۔ میں مدت سے اس فکر میں ہوں کہ اس وادی سے کس طرح باہر نکلوں۔ ہر طرف پہاڑوں کو نہایت غور سے دیکھ چکا ہوں لیکن مجھے کوئی راستہ وادی سے باہر جانے کا نہیں ملا۔ اور سمجھتا ہوں کہ میں یہاں سے کبھی باہر نہ نکل سکوں گا کوئی تدبیر ایسی بتاؤ کہ اس قید سے نجات ملے۔ جب میں یہاں سے فرار ہونگا تو تم میرے شریک حال ہوگے اور تم ہی میرے ہادی اور رہبر ہوگے۔ اور جو سرمایہ میرے پاس ہوگا اس میں شریک ہوگے اور طرزِ زندگی کے انتخاب میں تم ہی میرے مشیر اور صلاح کار ہوگے۔"

املاک نے کہا: "جناب والا! حضور کا یہاں سے نکلنا سخت دشوار کام ہے۔ اور آپ کا یہ شوق جلد آپ کو پشیمان کریگا۔ جس دنیا کو آپ سمجھ رہے ہیں کہ اس میں سکون و امن ایسا ہے جیسا کہ اس جھیل کے پانی میں ہے۔ جب آپ دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک سمندر ہے جس کی موجوں میں کف اٹھ رہے ہیں جس پر طوفان آرہے ہیں اور جسکی سطح گرداپوں سے ہر وقت جوش و خروش میں ہے۔ کہیں ظلم و ستم کی موجیں اس میں جوش مار رہی ہیں اور کہیں یہی موجیں دغا و فریب کے چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو رہی ہیں۔ جب آپ اپنے چاروں طرف دیکھینگے کہ بے انصافیاں، دغابازیاں، آزمائشیں اور مقابلے، رشک و حسد اور طرح طرح کی پریشانیاں موجود ہیں تو آپ ہزاروں مرتبہ اس امن و سلامتی کے مقام کو یاد کیا کرینگے اور خوف سے بچنے کیلئے امید سے ہاتھ کھینچیں گے۔"

شہزادے نے املاک سے کہا: "جو کچھ میں نے سوچا ہے اس سے باز رکھنے کی تدبیر نہ کرو۔ میں نہایت بے صبر و بے قرار ہوں کہ جو چیزیں تم دیکھ چکے ہو وہی میں بھی دیکھوں۔ چونکہ تم اس وادی میں رہنے سے بیزار ہو اس لئے ثابت ہے کہ تمہاری پہلی حالت موجودہ حالت سے بہتر تھی۔ جو تجربہ میں کرنا چاہتا ہوں اس کا نتیجہ خواہ کچھ ہی نکلے میری خواہش ہے کہ میں اپنی ہی عقل اور منظر سے انسان کی مختلف حالتوں کی برائی بھلائی کا امتحان کروں اور پھر غور کر کے اپنے لئے کوئی طرزِ زندگی اختیار کروں۔"

املاک نے کہا: "میری باتوں سے بڑھکر کچھ اسباب ایسے بھی ہیں جو آپ کو اپنے اس قصد سے روکیں گے۔ لیکن چونکہ آپ مصمم قصد کر چکے ہیں اس لئے میں کوئی مشورہ حضور کو ایسا نہ دوں گا جس سے آپ کو مایوسی ہو۔ محنت اور توجہ ایسی چیزیں ہیں جو ناممکن کو بھی ممکن بنا کر دکھا سکتی ہیں۔"

تیرہواں باب

شہزادہ وادی سے نکلنے کی تدبیر کر لیتا ہے

شہزادے نے اپنے سچے رفیق املاک کو رخصت کیا کہ وہ جا کر آرام کرے۔ لیکن جو عجیب و غریب باتیں اس کی زبان سے سنی تھیں انہوں نے شہزادے کی طبیعت پر ایک عجیب ہیجان پیدا کیا۔ جو کچھ سنا تھا اس کی ایک ایک بات یاد کر کے بہت سے سوالات پیدا کئے تاکہ صبح ہوتے ہی املاک سے انہیں دریافت کرے۔

راسیلاس کے دل کی بیقراری بہت کچھ رفع ہوگئی تھی کیونکہ اب اُسے ایک ایسا دوست مل گیا تھا جس سے اپنے دل کا حال بیان کر سکتا تھا۔ سوچنے لگا کہ یہ دوست تو ایسا ملا ہے کہ اسکے ساتھ اِس وادیِ یمن و مسرّت میں زندگی آسانی سے قابل برداشت ہو سکتی ہے، اور اگر ایسے ہی رفیق کی ہمراہی میں دُنیا کی سیر و سیاحت کا موقع ملا تو پھر دل میں کوئی ارمان باقی نہیں رہتا۔

برسات ختم ہونے پر وادی میں جس قدر پانی جمع ہوگیا تھا وہ نکل گیا۔ زمین خُشک ہوئی اور اب راسیلاس اور املاک دونوں گھروں سے نکل کر باتیں کرتے ہوئے چہل قدمی کو جانے لگے۔ مگر اس طرح کہ کوئی اُنہیں دیکھے نہیں۔ شہزادہ جو ہمہ وقت وادی سے نکلنے کے خیال میں غرق رہتا تھا۔ ایک دن جب آہنی دروازے کے قریب سے گزرا تو افسُردہ چہرہ بنا کر بے ساختہ کہنے لگا "لے دروازے تو اتنا مضبوط اور اسے انسان تو اس قدر کمزور کیوں ہے؟"

املاک بولا "انسان کمزور نہیں ہے۔ علم طاقت وزور ہے۔ جرِ ثقیل کا ماہر زور و طاقت پر ہنستا ہے۔ مَیں اِس دروازے کو توڑ سکتا ہوں۔ مگر خفیہ طور پر یہ کام نہیں انجام دے سکتا۔ اس لئے کوئی اور تدبیر کرنی ہوگی"

ایک دن پہاڑ کے دامن پر وہ ٹہلتے جا رہے تھے یکایک اُنہوں نے دیکھا کہ ایک جگہ جنگلی خرگوش جو بارش کی وجہ سے اپنے بلوں میں سے نکل کر آئے تھے ایک جھاڑی میں جمع ہیں۔ اور جھاڑی کی پشت پر اوپر کے رُخ ترچھے خط میں انہوں نے ایک سُوراخ بنانا شروع کیا ہے۔ یہ دیکھکر املاک کہنے لگا "پُرانے وقتوں سے یہ خیال چلا آتا ہے کہ انسان نے بہت سے فنون میں جانوروں کی عقلِ حیوانی کو دیکھکر ایجادیں کی ہیں۔ اگر ہم بھی اِن جنگلی خرگوشوں سے کوئی سبق سیکھیں تو اِس میں کوئی بات دقت کی نہیں ہے۔ جس رُخ اِن خرگوشوں نے پہاڑ میں سوراخ کرنا شروع کیا ہے اگر ہم بھی اسی سمت میں سُوراخ کرنا شروع کریں تو ایک دن اِس وادی سے باہر نکل سکتے ہیں۔ اور ہم یہ کام پہاڑ کی اس چوٹی کی سمت میں شروع کریں گے جو وسطِ وادی پر جھکی نظر آتی ہے۔ ہم نیچے سے اُوپر کے رُخ سُرنگ لگاتے چلیں گے اور جب سُرنگ چوٹی تک پہونچ جائیگی تو ہم پہاڑ کے دوسری طرف نکل آئیں گے"

راسیلاس نے جونہی یہ بات املاک کی زبان سے سُنی تو اُس کا چہرہ بشاش ہوگیا۔ یہ کام چنداں دُشوار نہ تھا اور اُس میں کامیابی کی پوری توقع تھی۔

اب وقت ضائع کرنا مناسب نہ تھا۔ دوسرے دن صبح ہوتے ہی وہ پہاڑ پر گئے اور سُرنگ لگانے کے لئے کوئی اچھا موقع تلاش کرنے لگے۔ وہ بڑی محنت و خستگی کے ساتھ جھاڑیوں کو ہٹاتے ہوئے اُوپر چڑھے مگر کوئی موقع جیسا کہ وہ چاہتے تھے تلاش کرنے پر بھی نہ ملا اور گھر واپس آ گئے۔ دوسرے اور تیسرے دن بھی یہی کیفیت رہی۔ چوتھے دن البتہ اُن کو پہاڑ میں ایک چھوٹا سا غار یا دریچہ ملا جس کا دہن ایک جھاڑی میں نظر سے پوشیدہ تھا۔ یہاں سے سُرنگ شروع کرنے کا اُنہوں نے قصد کیا۔

املاک نے چند اَوزار پتھر توڑنے اور مٹی ہٹانے کے بہم پہونچائے۔ دوسرے دن وہ دونوں اِس کام پر زیادہ تر شوق سے نہ کہ محنت و مشقت سے پل پڑے۔ تھوڑی دیر میں دونوں تھک گئے اور گھاس پر بیٹھکر ہانپنے لگے۔ شہزادے کو کسی قدر نااُمیدی پیدا ہوئی۔ املاک نے کہا "گھبرایئے نہیں۔ جب کچھ مشق ہو جائے گی تو اِس کام کو زیادہ دیر تک انجام دیتے رہیں گے۔ ذرا خیال تو کیجئے کہ اتنی ہی سی دیر میں ہم نے سُرنگ کہاں تک بنالی ہے۔ اسی طرح آپ دیکھیں گے کہ ہماری یہی محنت و مشقت ہم کو اپنی مُراد کو پہونچا دے گی۔ دُنیا میں بڑے کام طاقت اور زور کے بل پر اتنے نہیں ہوا کرتے جس قدر کہ استقلال اور ثابت قدمی سے انجام پاتے ہیں۔ یہی ہمارا عالیشان قصر جو سامنے نظر آتا ہے پتھر پر پتھر چُنکر

بنایا گیا ہے۔ مگر آپ اُسکی رفعت و شان کو ملاحظہ فرمائیں۔ وہ شخص جو تین گھنٹے روزانہ مستعدی سے چلیگا وہ سات برس میں اتنا فاصلہ طے کریگا جو ہمارے کرۂ ارض کے دَور کے برابر ہوگا"

اب روزانہ راسیلاس اور املاک اِس سُرنگ کے کام پر آنے لگے۔ کئی دن تک سُرنگ کھودتے کھودتے پہاڑ کے اندر وہ ایک مقام پر آئے جہاں اُسی سمت میں دُور تک ایک قدرتی شگاف تھا۔ اِس شگاف میں وہ دُور تک بغیر کسی رکاوٹ کے پہونچے۔ راسیلاس نے اِسے ایک نیک شگون بتایا۔ املاک بولا "سوائے اُمیدوں اور خوفوں کے جن کی طرف عقل رہنمائی کرے آپ کسی اور خیال سے پریشان خاطر نہ ہوں۔ اگر اچھے شگون سے آپ خوش ہوتے ہیں تو پھر نحس شگون سے پریشان ہونگے۔ اور پھر اوہام باطل کا شکار ہو جائیں گے۔ جو باتیں ہمارے کام میں سہولتیں پیدا کرتی ہیں وہ اچھے یا بُرے شگونوں سے بالاتر ہیں۔ اور وہی ہماری کامیابی کا باعث ہو سکتی ہیں۔ یہ شگون تو وہ خوش کرنے والے اتفاقات ہوتے ہیں جو کسی کام کو شروع کرنے اور اُس کے ختم کرنے کے درمیان پیش آیا کرتے ہیں۔ بہت سی تدبیریں اور منصوبے جو سوچنے میں مشکل ہوتے ہیں عمل میں آسان ثابت ہوتے ہیں۔

چودھواں باب

راسیلاس اور املاک سے ایک شخص کی ملاقات بلاتوقع ہو جاتی ہے

اب شہزادے اور املاک نے سُرنگ آدھی دُور تک کھود لی تھی۔ اور اپنی اِس کاوش و محنت کی اُجرت یہ سمجھ رہے تھے کہ آزادی جلد نصیب ہو جائے گی۔ شہزادہ سُرنگ سے نکل کر باہر تازی ہوا میں آیا ہی تھا کہ کیا دیکھتا ہے کہ اُس کی بہن نیکایہ سامنے کھڑی ہے۔ شہزادہ اِس کی صورت دیکھتے ہی ششدر اور حیرت زدہ ہو گیا۔ وادی سے نکلنے کی تدبیر ظاہر کرتے بھی ڈرتا تھا اور یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ بہن سے بات چُھپی نہیں رہ سکتی۔

چند لمحے اِسی شش و پنج میں گزر جانے کے بعد ارادہ کیا کہ کُل معاملہ بہن پر ظاہر کر دے اور اس بات پر بھروسہ کر کے کہ وہ کسی سے نہیں کہے گی، کُل حالات اُس سے کہہ دیئے۔

شہزادی نے کہا: "بھائی تم یہ خیال نہ کرنا کہ میں کوئی جاسوس یا مُخبر بن کر یہاں آئی تھی۔ میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے اکثر دیکھا کرتی تھی کہ تم اور املاک دونوں ہمیشہ اِسی طرف چہل قدمی کو جایا کرتے ہو۔ میں سوائے اس کے کچھ اور نہ سمجھتی تھی کہ ٹھنڈک یا پھولوں سے مہکتے کسی مقام کی تلاش میں اِدھر آیا کرتے ہو۔ میری غرض اِس طرف آنے کی یہی تھی کہ بھائی سے باتیں کروں گی۔ پس اس میں ذرا شبہ نہیں کہ محض اِس شوق نے کہ بھائی سے مل کر باتیں کروں میں نے تم کو اس کام میں مصروف دیکھا۔ میں بھی تمہاری ہی طرح اِس قید سے بیزار ہوں اور مجھے بھی جس قدر اشتیاق باہر کی دُنیا کو دیکھنے کا ہے وہ آپ کے شوق سے کم نہیں ہے۔ میں بھی دُنیا کی سیر کرنا چاہتی ہوں کہ دیکھوں وہاں رنج و راحت کے کیا کیا سامان ہیں۔ مجھے اجازت دو کہ میں بھی تمہارے ہمراہ اِس بے لُطف و بے مزہ امن و سلامتی سے نکل کر دُنیا دیکھنے چلوں، کیونکہ اگر تم مجھے یہاں چھوڑ کر چلے گئے تو یہاں کا عیش و آرام اور بھی مجھے دوبھر ہو جائیگا۔ مجھے ساتھ لے چلنے سے تم چاہے انکار کر دو لیکن تمہارے پیچھے پیچھے آنے سے تو تم مجھے نہ روک سکو گے"

شہزادے کو اپنی سب بہنوں میں نیکایہ سے زیادہ محبت تھی۔ دل نے نہ مانا کہ بہن کو ساتھ لے چلنے سے انکار کر دے اور اِس کا افسوس

ہوا کہ کیوں خود ہی بہن پر اپنا قصد پہلے سے ظاہر نہ کر دیا۔ اور کیوں ایسا موقع نہ ملا کہ اس سے ساتھ چلنے کو کہہ دیتا۔ چنانچہ اس وقت یہ قرار پایا کہ جس دن شہزادہ خود اس وادی سے رخصت ہو بہن کو بھی ساتھ لے لے۔

آخر کار راسیلاس اور املاک کی محنت و مشقت کے دن ختم ہوئے اور سرنگ کے سرے پر انکو روشنی نظر آئی۔ سرنگ سے نکل کر وہ پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہوئے اور دیکھا کہ دریائے نیل جس کا عرض یہاں بہت کم ہے انکے قدموں کے نیچے اپنے خمدار راستے پر بہتا چلا جاتا ہے۔

راسیلاس نے اپنے ارد گرد بہت خوش ہوکر نظر ڈالی اور پہلے ہی سے ان مقامات کا اندازہ کرنے لگا جہاں کی سیر و سیاحت کرنی منظور تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ راسیلاس ابھی سے اپنے تصور و خیال میں اپنے باپ کی حدود سلطنت سے باہر کی سیر میں مصروف ہوگیا تھا۔ املاک گو قید سے رہائی پر خوش تھا مگر اُسے دُنیا میں خوشی نصیب ہونے کی توقع نہ تھی۔ دُنیا کو وہ پہلے دیکھ چکا تھا اور اُس سے بیزار ہوکر اِس وادی میں آیا تھا۔ راسیلاس نے جب فضا کو اُس کی وسعتِ لامتناہی میں دیکھا تو مشکل سے اس کو پھر وادی میں آنے پر آمادہ کیا گیا۔ غرض شہزادے نے اپنی بہن کو اطلاع دی کہ راستہ کھل گیا ہے اور اب سوائے اس کے کوئی کام باقی نہیں ہے کہ یہاں سے چلنے کی تیاری کی جائے۔

پندرہواں باب

شہزادہ اور شہزادی وادی سے رخصت ہوتے ہیں اور بہت سے عجائب اُنکی نظر سے گزرتے ہیں۔

شہزادے اور شہزادی کے پاس جواہرات کثرت سے تھے کہ جس تجارتی مقام پر وہ جاتے وہاں بڑے دولتمند سمجھے جاتے۔ املاک کے کہنے سے اُنہوں نے اِن جواہرات کو اپنے لباس میں چھپالیا اور دوسرے مہینے جب چودھویں رات کا چاند آسمان پر طلوع ہوا تو یہ سب وادی سے اُسی سرنگ کے راستے باہر نکلے۔ شہزادی کے ساتھ اُس کی ایک بڑی خیر خواہ خادمہ تھی۔ اس خادمہ کو خبر نہ تھی کہ وہ کہاں جارہے ہیں۔

سُرنگ میں سے اُوپر چڑھکر اب پہاڑ کی دوسری طرف اُترنے لگے۔ شہزادی اور اُس کی خادمہ اپنے چاروں طرف دیکھتے تھے اور ڈرتے تھے کہ کہیں اس خلا میں وہ غارت نہ ہوجائیں۔ شہزادی بولی: "مجھے تو اِس سفر سے ڈر لگتا ہے۔ اس کا خاتمہ تو نظر ہی نہیں آتا اور خوف ہے کہیں اِس بیحد و نہایت میدان سے گزرنے میں مجھے ایسے مرد نہ ملیں جنہیں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہے"۔

شہزادے کے دل میں بھی تقریباً یہی خیالات تھے۔ لیکن اِس قسم کی کمزوری کو ایک مرد کی طرح مخفی رکھنا اُس نے ضروری سمجھا۔

املاک شہزادی اور شہزادے کے اِس خوف پر مسکراتا اور آگے چلنے پر اُن کی ہمت بڑھاتا تھا۔ غرض اب یہ سب وادی سے اِتنی دُور نکل آئے کہ پھر وہاں جانا مشکل تھا۔

صبح ہوتے ہی انہوں نے ایک کھیت میں چند گڈریوں کو دیکھا۔ انہوں نے کچھ دودھ اور پھل سامنے لاکر رکھے۔ شہزادی اِس انتظار و حیرت میں تھی کہ اُس کی مہمانداری کے لئے کوئی محل یا قصر موجود نہ تھا۔ اور نہ کوئی میز تھی جس پر لذیذ کھانے چُنے ہوتے۔ لیکن سب تھکے ہوئے اور بھوکے تھے۔ دودھ اُٹھا کر پی لیا اور پھل بھی جتنے تھے سب کھالئے۔ اور اِن چیزوں کو وادی کے دودھ اور پھلوں سے ذائقہ میں بہتر سمجھا۔

اب یہ مُسافر چھوٹی چھوٹی منزلیں طے کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ محنت و مشقت کی عادت نہ رکھتے تھے۔ یہ بھی جانتے تھے کہ والدین لوگوں کو اُن کا خیال آیا ہوگا مگر کوئی انسان نہ ہوگا کہ ان کو تلاش کرنے نکلے۔ چند روز میں وہ زیادہ آباد ملک میں پہونچے۔ املاک اور اُسکے ہمراہیوں نے لوگوں کے مختلف رسم و رواج، مختلف پیشوں، طور طریقوں پر حیرت ظاہر کی۔

اِن مُسافروں کا لباس ایسا تھا جسے دیکھنے سے یہ گمان نہ ہوسکتا تھا کہ وہ کوئی چیز اندر چھپاتے ہیں۔ لیکن شہزادہ جہاں کہیں آتا متوقع ہوتا کہ لوگ اُسکی حکم برداری کرینگے۔ شہزادی نے جب دیکھا کہ جو کوئی اُس کے سامنے آتا ہے وہ ادب و تعظیم سے زمین بوس نہیں ہوتا تو وہ دل میں ڈرنے لگی۔ املاک مجبور تھا کہ شہزادے اور شہزادی کی نقل و حرکت کو غور سے دیکھتا رہے۔ تاکہ وہ اپنی کسی حرکت سے اپنے شاہانہ مرتبے کو ظاہر نہ کردیں۔ چنانچہ دوران سفر میں پہلا موضع جو آیا وہاں املاک نے کئی ہفتے قیام کیا تاکہ شہزادہ اور شہزادی معمولی آدمیوں کی عادت پیدا کریں۔ رفتہ رفتہ اِن شاہی سیاحوں نے یہ بات سیکھ لی کہ کچھ زمانے کے لئے وہ اپنی ملوکانہ شان و عظمت کو دل سے بھلادیں اور دوسروں سے ایسے برتاؤ کے متوقع نہوں جو خود اپنی تواضع اور اخلاق کی وجہ سے دوسرے اُن پر ظاہر نہ کریں۔ املاک نے انکو بہت سی ہدایتیں کردیں تاکہ اگر وہ کسی بندرگاہ میں آئیں تو وہاں غل غپاڑے، ہلچل اور تجارت پیشہ قوم کے ناہموار خلق کو برداشت کرلیں۔ غرض یہ باتیں سکھا پڑھا کر املاک ان کو ساحل بحر کے ایک بندرگاہ میں لے آیا۔

شہزادہ اور اس کی بہن جس کی منظر میں سب چیزیں نئی تھیں انہیں دیکھکر خوش ہوتے تھے۔ کوئی اعتراض کسی چیز پر نہ کرتے۔ کئی ماہ تک وہ اس بندرگاہ میں مُقیم رہے اور وہاں سے روانگی کی نیت نہ کی۔ املاک بھی اُن کے اِس قیام سے مطمئن تھا کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ دُنیا کا تجربہ تو ان کو ہے نہیں، اس لئے تا وقتیکہ کچھ تجربہ پیدا نہ ہوجائے غیر ملک کے خطروں میں انہیں چھوڑ دینا ہرگز مناسب نہیں۔ آخر کار املاک کو ڈر ہوا کہ کہیں وہاں کے لوگوں کو پتہ نہ چل جائے کہ وہ کون ہیں اس لئے اُس نے روانگی کا ایک دن مقرر کیا۔ شہزادے اور شہزادی خود کسی بات کا فیصلہ نہ کرتے تھے۔ پس املاک نے جہاز کے ناخدا سے شہر سوئیس جانے کا بندوبست کیا۔ جب چلنے کا وقت آیا تو نہایت مُشکل سے اُس نے شہزادی کو جہاز میں سوار کرایا۔ سوئیس تک سفر بہت آرام سے ہوا، اور سوئیس پہونچکر وہ خشکی کی راہ سے قاہرہ پہونچے۔

(باقی آئندہ) —————— عنایت اللہ۔ بی، اے؛

"چمکی"

فتوحاتِ عقل

کہتے ہیں کہ آسمان میں ہے — سیارہ ہماری سرزمیں ہے
ہے مہر ہی کی روشنی سے روشن — یہ ماہِ منیرِ خوشہ چیں ہے
اے عقلِ بشر تو دُور بیں ہے!

(۲)

کہتے تھے جسے قدیم سے سب — افشانِ جبینِ لیلیٔ شب
یہ رازِ حسین آسمانی — نکلا ہے نجومِ نو کی ماں اب
اور اک ہزار آفریں ہے!

(۳)

کیا جانیں یہ کیا ہیں برق پارے — نادیدہ بلا ہیں برق پارے
ایمان ہے فلسفی کا لیکن — ہستی کی بِنا ہیں برق پارے
تخئیل ہے یا کہ خورد بیں ہے

(۴)

ہستی کے نظام کا ہے قانون — ہر ذرہ ہے دوسرے پہ مفتون
گردش سے کشش کِشش سے گردش — حیرت کا ہے آئینہ یہ مضمون
شاباش امیں صد آفریں ہے

امین حزیں سیالکوٹی

ادبیات ۱۹۳۶ء میں

پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب۔ ایم۔ اے، آئی۔ ای۔ ایس۔

تمام متمدن دُنیا کی پورے سال بھر کی ادبیات کا جائزہ لینا سمندر کی لہروں کو گننا ہے۔ کیونکہ نئی کتابوں کا کوئی شمار نہیں ہوسکتا۔ اور ادبی تحریکات سیاسی واقعات کی طرح نمایاں نہیں ہوتیں۔ وہ عموماً معاشرت یعنی سوسائٹی کی سطح کے نیچے کام کرتی ہیں اور بہت مدت کے بعد اُبھرتی ہیں۔ سال گذشتہ میں ادبی دُنیا کی کیفیت اور حالات پر سرسری نظر ڈالنے سے کسی ایسی تحریک کا سراغ نہیں ملتا جس کو خاص طور پر اس سال سے منسوب کیا جاسکے۔ اور نہ اس سال کے اندر بڑے مصنفین کی فہرست میں کسی نئے نام کا اضافہ ہوا۔ یورپ میں عام ادبیات کی روش وہی ہے جو جنگ عظیم کے بعد سے رہی ہے۔ جنگ کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ تمام دُنیا کے تجارتی، مالی اور معاشرتی انتظام میں خلل پیدا ہوگیا۔ سوسائٹی کے بعض طبقوں میں افلاس اور بے کاری بڑھ گئی اور اس کی وجہ سے وہ مخالفت جو سرمایہ دار اور مزدور جماعتوں کے درمیان پہلے سے موجود تھی اور زیادہ سخت ہوگئی۔ لیکن تعلیم یافتہ آدمیوں کو جنگ کے نتائج میں سے جس چیز کا سب سے زیادہ خیال پیدا ہوا وہ لاکھوں جانوں کا نقصان تھا۔ اور اس خیال کی وجہ سے ان کے دلوں میں امن پسندی اور صلح جوئی کے جذبات اور قوی ہوگئے۔ چونکہ کتابوں میں وہی باتیں لکھی جاتی ہیں جو انسان اپنے دل میں سوچتے ہیں ان خیالات اور جذبات کا عکس یورپ کے ادبیات میں پایا جاتا ہے۔ ادبی مقاصد مختلف زمانوں میں مختلف ہوتے ہیں۔ اُنیسویں صدی کے آخر میں ادب کو سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی مسائل کی آمیزش سے پاک رکھنے کا خیال بہت عام تھا۔ لیکن اب یہ بات نہیں ہے اور ہر قسم کی ادبی تصانیف یہاں تک کہ شاعری، ناول اور ناٹک میں بھی اِن تمام سوالات سے آگاہی اور دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے جو یورپ کے اپنے معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی زندگی کی جدید تنظیم میں درپیش ہیں۔ اُنیسویں صدی کے مقابلے میں آج کل کے ادبی مقاصد کا ایک اور اہم اختلاف یہ ہے کہ اب عقل اور عقل کے [illegible] سائنس پر اتنا بھروسہ نہیں کیا جاتا جتنا اس وقت کیا جاتا تھا۔ بلکہ عقل کے ساتھ وجدان کو بھی جگہ دی جاتی ہے جس کو ان تمام فطری محرکات کا مجموعہ خیال کرنا چاہیئے جو انسان اور دوسرے حیوانات میں مشترک پائے جاتے ہیں۔ یا جو انسان کیلئے مخصوص ہیں۔ ان محرکات میں ایک نہایت زبردست محرک جلبی کشش ہے۔ یعنی عورت اور مرد کا فطری لگاؤ جس پر یورپ کے مصنف اب ایسے کھلے الفاظ میں گفتگو کرتے ہیں جو اُنیسویں صدی میں خلاف تہذیب اور خلافِ اخلاق خیال کئے جاتے۔ اِس بارے میں جس مصنف کا انگریزی ادبیات پر سب سے زیادہ اثر پڑا وہ D. H. Lawrence ڈی۔ ایچ۔ لارنس ہے۔ لارنس کی وفات کو چھ سال سے زیادہ گزر گئے لیکن اس کی نظم و نثر کا اب بھی بہت چرچا ہے اور ہر سال اس کے متعلق نئی نئی کتابیں نکلتی رہتی ہیں۔ ۳۶ء میں اس کے متفرق مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے جن میں سے اکثر اُس کی اپنی زندگی میں اشاعت سے محروم رہ گئے تھے۔ اس مجموعے کا نام Phoenix ہے اور اسمیں بہت سے ایسے مضامین ہیں جنکو Lawrence کے فلسفۂ حیات اور اسلوبِ بیان کا بہترین نمونہ خیال کیا جاسکتا ہے۔

انگریزی زبان کے ایک مشہور ادیب و شاعر W. B. Yeats کا قول ہے کہ گذشتہ پچاس سال میں انگلستان میں شاعری کا جتنا زور رہا ہے وہ سوائے سترھویں صدی کے نصف اوّل کے اتنی مدت میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ خود Mr. Yeats کے

علاوہ جن شعرائے کلام پر ۱۹۳۶ء میں سب سے زیادہ توجہ کی گئی ہے ان میں Mr. Eliot خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اگرچہ انہوں نے اس سال کے اندر اپنی کوئی نئی اہم نظم شائع نہیں کی۔ لیکن سال کے شروع میں اُن کی نظموں کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا۔ Eliot کی شاعری میں علاوہ بعض فنی جدتوں کے اس زمانے کی تمام ادبی، علمی اور معاشرتی تحریکات کی جھلک موجود ہے۔ اور یہ اثر یورپ اور امریکہ سے گزر کر مشرق میں بھی محسوس ہوا ہے۔ ہمارے ملک میں بنگال کے بعض شاعر جو دیسی شعرا کی بہ نسبت مغربی ادبیات سے زیادہ باخبر معلوم ہوتے ہیں مثلاً سدھندرا ناتھ دتا، مسٹر پریم اندرا ناتھ مترا اور مسٹر سمر سین Eliot کی شاعری سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔

یورپ میں ناول نئے خیالات کی ترجمانی اور اشاعت کا ایک بہت مفید ذریعہ قرار پاگیا ہے۔ اور بہت کم ناول ایسے لکھے جاتے ہیں جن کا قصہ سے زیادہ کوئی مقصد نہ ہو۔ انگلستان میں گزشتہ سال جتنے ناول شائع ہوئے انمیں Morgan کا Sparken broke اور Mr. Aldous Huxley کا Eyeless in Gaza بعض لحاظ سے شاید سب سے زیادہ وقیع خیال کئے جاسکتے ہیں۔

Mr. Morgan کا ناول بظاہر حُسن و عشق کی ایک داستان ہے لیکن اس کے ضمن میں شاعر طبع انسان کی ذہنیت کا جو خاکہ کھینچا گیا ہے وہ بہت سے باریک فلسفیانہ پہلو رکھتا ہے اور Mr. Aldous Huxley کے ناول کے متعلق یہ کہنا دشوار ہے کہ اس زمانہ میں سیاسی، معاشرتی اور معاشی مسائل میں سے کونسا ایسا مسئلہ ہے جس کا کچھ ذکر اس کتاب میں موجود نہ ہو۔ اگرچہ ناول کی ایجاد کا فخر انگلستان کو حاصل ہے لیکن زمانۂ حال میں اس کے بہترین نمونے غالباً اور ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں فرانس اور روس کے ناول نویسوں کی بہت شہرت تھی۔ اس لئے یہ دیکھنا چاہیے کہ ۱۹۳۶ء میں ناول نویسی کے فن میں ان ملکوں کا کیا پایہ ہے۔ فرانس میں Flaubert اور Balzac کے زمانے سے realism یعنی واقعیت کا تسلط رہا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ قصہ کے پیرایے میں روزمرہ زندگی کی تصویر پیش کی جائے جس میں زندگی کا سیاہ و سفید یعنی سب اچھی اور بُری چیزیں یکساں نُمایاں ہوں گزشتہ سال فرانس میں جو معرکۃ الآرا ناول شائع ہوئے ہیں اُن میں یہ رنگ بدستور قائم ہے۔ ان میں شاید سب سے زیادہ دلچسپ ناول Jules Romain کا ضخیم ناول Men of Good will ہے۔ جس کے بعض حصے گزشتہ سال اور بعض اس سے قبل شائع ہوئے تھے۔ جن میں بہت سے مردوں اور عورتوں کے کردار ہیں جن کو اس زمانہ کے شہر پیرس کے باشندوں کی تصویریں خیال کیا جاسکتا ہے، لیکن چونکہ ابھی مصنف نے اپنے قصے کو پورا نہیں کیا اس لئے یہ کہنا دشوار ہے کہ اس کا اصلی مقصد کیا ہے۔ واقعیت کے اس غلبہ کے خلاف بغاوت کے بھی کچھ آثار فرانس میں نمودار ہوگئے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں کئی ایسے ناول بھی شائع ہوئے جن کے مصنفین نے جو عموماً نئی پود کے لوگ ہیں واقعاتِ حاضرہ سے قطع نظر کرکے یا تو محض خیالی افسانے لکھنے کی کوشش کی اور اپنے ملک کی گذشتہ معاشرت اور پُرانی عمارتوں کو اپنے قصوں کی بُنیاد قرار دیا۔ موجودہ دور کی اُلجھنوں سے مخلصی حاصل کرنے کا ایک طریقہ گذرے ہوئے زمانے کی یاد اور دُور اُفتادہ ملکوں کی سیر بھی ہے۔ اور اس پر سفرناموں اور تاریخی افسانوں کی دلچسپی قائم ہے۔ ۱۹۳۶ء کے بہترین تاریخی افسانے غالباً مشہور جرمن مصنف Feuchtwanger اور اس کے ہم وطن Thomas Mann کی وہ تصانیف ہیں جن کا ماخذ یہودیوں کی پُرانی تاریخ ہے۔ یہ دونوں مصنف یہودی نسل سے ہیں جنہوں نے جرمن حکومت کی موجودہ سیاسی روش کے دباؤ سے ترکِ وطن کیا ہے۔ اس سیاسی روش اور فلسطین میں عربوں کی مخاصمانہ جدوجہد کی وجہ سے یہودیوں کی روایات، ان کی تاریخ اور اُنکے

مستقبل میں یورپ کی دلچسپی از سرِ نو تازہ ہوگئی ہے۔ اور ۳۶ء میں یورپ اور امریکہ میں بہت سی کتابیں ان مضامین کے متعلق شائع ہوئی ہیں۔ جن میں سے بعض یہودیوں کے موافق اور بعض اُنکے مخالف ہیں۔

روسی افسانہ نگاری کا آخری مشہور علمبردار Gorky تھا جس کا ابھی حال میں انتقال ہوا ہے۔ گورکی اگرچہ روس کے موجودہ اشتراکی خیالات کا معتقد اور Stalin کا ذاتی دوست تھا لیکن اس کی بہترین تصانیف اس معاشرت اور تمدّن سے متعلق تھیں جس کو بالشویکی انقلاب نے فنا کر دیا ہے۔ انقلاب کے بعد سے روسی ادبیات بالشویکی عقائد کی تبلیغ کے لئے وقف ہوگئی ہیں اور کسی ایسے مصنّف یا تصنیف کا نام لینا دشوار ہے جس نے سالِ گزشتہ میں کوئی خاص امتیاز حاصل کیا ہو۔ دراصل اشتراکیت کسی قسم کے بھی غیر معمولی امتیاز کو پسند نہیں کرتی اور اس کے حامیوں کا یہ خیال ہے کہ اَشیاء اور صنعت و حرفت کے مانند تصنیف و تالیف بھی باہمی تعاون کے اُصول پر کی جائے یعنی یہ کہ کوئی کتاب ایک آدمی کی بنائی ہوئی نہ سمجھی جائے۔ بلکہ اُس کے بنانے میں بہت سے آدمیوں کا ہاتھ ہو۔ جہانتک مزدوروں اور کسانوں کی تنظیم کا تعلق ہے روسی خیالات کا اثر دُور دُور کے ملکوں پر پڑا ہے۔ ۳۶ء کے آغاز سے امریکہ کی ادبیات خصوصًا مختصر افسانوں میں اشتراکی خیالات کا بہت اثر پایا جاتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ غالبًا یہ ہے کہ جنگ سے پہلے امریکہ ایک مالدار ملک سمجھا جاتا تھا لیکن تجارتی اور مالی نظام کی برہمی نے وہاں بھی افلاس اور بیکاری کا ناگوار مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ اور اس لحاظ سے بھی امریکہ کی ادبیات میں وہی سب میلانات پائے جاتے ہیں جن کا یورپ میں سراغ ملتا ہے۔ اس برِاعظم کے مصنّفین میں Eugene O'Neill کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اُس کے مختلف ناٹکوں کی شہرت ۱۹۲۰ء سے سُنی جاتی ہے، لیکن حال میں نوبل پرائز کے مل جانے سے اس شہرت پر مُہرِ ثبوت لگ گئی ہے۔ امریکہ کے مقابل بحرالکاہل کے دوسرے ساحل پر بھی روس کے اشتراکی عقائد کا کچھ پرتو دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ چین کے نوجوان مُصنّفین کے جو ترجمے یورپین زبانوں میں شائع ہوئے ہیں ان میں یہ میلان خاصہ نمایاں ہے۔

انگلستان، فرانس اور جرمنی کے علاوہ یورپ کے اور ملکوں میں بھی ادبیات کو سیاسی، مذہبی اور معاشرتی معاملات سے کافی دلچسپی معلوم ہوتی ہے اور جس طرح تہذیب و تمدن کے ظاہری کوائف کے اعتبار سے مغربی دُنیا کی سب اقوام ایک دوسرے سے مشابہ معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح اُن کے خیالات میں بھی ایک حد تک یگانگت پائی جاتی ہے، انُ ملکوں کے وہ مصنّفین جو گزشتہ بیس پچیس سال میں ادبی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ مثلاً ناروے کی مشہور ناول نویس Sigrid Undset یا اٹلی کا ڈرامہ نویس Hallen ... Kiel ۳۶ء میں بھی بیکار نہیں رہے لیکن اُن کی کوئی تصنیف بھی جو اس سنہ میں شائع ہوئی ہے اُنکے اسلوبِ تحریر میں کسی نئے پیرایے کا آغاز یا اُنکی شہرت میں کوئی خاص اضافہ نہیں کرتی۔

مغربی ادبیات کا ایک رُجحان جو ہمارے لئے خاص طور پر دلچسپ ہے مشرق اور مشرقی خیالات کا ذوق ہے جو اب کئی سمت میں دکھائی دیتا ہے۔ ۳۵ء میں کرنل لارنس کی Seven Pillars of Wisdom نے جو ہلچل ادبی دُنیا میں پیدا کر دی تھی وہ اس ذوق کا بیّن ثبوت ہے اور اس وقت سے لیکر آج تک اس کتاب کی مانگ برابر بڑھ رہی ہے۔ ۳۶ء میں بھی جن سفرناموں نے زیادہ مقبولیت حاصل کی اُن میں مشرقی سیاحت کی کتابوں کی تعداد غالب معلوم ہوتی ہے۔ یورپ میں مشرقیت کا شوق کوئی نئی چیز نہیں لیکن پہلے یہ شوق صرف خاص لوگوں تک محدود تھا۔ اب عوام کو بھی اس سے دلبستگی ہوتی جاتی ہے۔ اس سے بڑھکر

یہ بات ہے کہ یورپ کے بعض ایسے لوگ جن کو جدید ترین خیال کا ترجمان خیال کیا جا سکتا ہے مشرقی نظریات خصوصاً مشرقی روحانیات کو مہذب انسانوں کی دماغی تربیت کے لئے مفید خیال کرنے لگتے ہیں۔ Mr Bernard Shaw اور Mr. Aldous Huxley جیسے ہردلعزیز لکھنے والے بھی اب اپنی تصنیف کو مشرقی سامانِ آرائش سے مزین کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے اور بعض کم عام پسند مصنفین تو مشرقی خیالات کے بہت ہی گرویدہ معلوم ہوتے ہیں۔ مشرقیت کے ذکر نے مجھے Rudyard Kipling کی وفات کی یاد دلا دی جو سنہ ۳۶ء کے شروع دنوں میں واقع ہوئی تھی۔ Kipling اگر چند سال سے تصنیف و تالیف کو عمداً ترک کر چکے تھے تو بھی انگلستان کے ادبی حلقوں اور انگلستان کے باشندوں کے دل میں ان کی خاص جگہ تھی۔ ان کا اکثر ادبی سرمایہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے تجربہ سے فراہم کیا گیا تھا۔ اور اگرچہ اس ملک کی تعلیم یافتہ جماعت اُن کی کہانیوں اور نظموں کو نسلی تعصب کی وجہ سے ناپسند کرتی تھی لیکن ہم کو یہ بات نہ بھولنی چاہیئے کہ ایک مدت تک انگلستان کے طبقہ عوام کو ہندوستانیوں کا جو کچھ بھی علم تھا وہ ان ہی کہانیوں اور نظموں کی بدولت تھا۔

(بہ اجازت ڈائریکٹر صاحب دلّی ریڈیو اسٹیشن)

مرزا محمد سعید۔ ایم۔ اے۔

مُغنّیہ

جس طرح ماہِ منیر کی ہلکی ہلکی ٹھنڈی چاندنی تاروں بھرے آسمان پر مسلط ہو کر ایک کیفیتِ سکون و قرار پیدا کر دیتی ہے۔

اسی طرح تیری میٹھی میٹھی آواز جس میں بلبل کا ترنم، کوئل کی کوک، پپیہے اور قمری کا سوز مستور ہے دل کو مسخر کر لیتی ہے۔

وہ دل جو صدق و صفا کا آئینہ ہے۔

جب ماہتاب اوائلِ شب میں تاریکیوں کے گھونگٹ میں چھپ چکا ہو۔ تارے سکوتِ شب میں بیدار ہو ہو کر عالمِ کون و مکاں کو منور کرتے ہیں۔

اسی طرح تیری دلکش آواز کے زیر و بم سے انسان کی تو بساط ہی کیا،

چرند پرند، شجر حجر پر بھی ایک سرور کی حالت وارد ہو جاتی ہے۔

وہ سرور جس سے ایک فراق آشنا دل۔ ایک بیقرار روح بھی تسکین پاتی ہے!۔

مغنیہ تو گائے جا!

دل اگر تیری لے کے ترنم سے تڑپ تڑپ کر خاموش ہو جائے۔

تیرا ہو جائے! اسی کا نام کمالِ فن ہے!!

گائے جا! گائے جا!۔

تیرا گانا اور تیری آواز سننے والے کو اس دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔

جہاں ـــ نہ امروز کا ڈر! نہ فکرِ فردا!!

ایم۔ اسلم

بادۂ سرجوش

تقوے کی نظر گرچہ بڑی بے ادبی ہے
[illegible] ہے نا سمجھی ہے
پیتے ہیں شاہانِ مغرور
ساقی سرِ نگاہ میں مغرور بھی ہے

اپنی خلوت سرا میں جب آؤں کیونکر
خود آکے اپنی جھلک دکھا آؤں کیونکر
ہے سب سے بڑا فاصلہ تو قرب کمال
اپنی ہستی کا بھید پاؤں کیونکر

دل ہے مرے لئے نصابِ زر و سیم
حاصل ہے مجھے سلطنتِ قلبِ سلیم
سمٹی ہے نگاہوں میں جو آفاق و جہات
میری ہستی ہے اُن کی رصدگاہِ عظیم

اپنی ہی غرض سے جی رہے ہیں جو لوگ
اپنی ہی عبادتیں کئے ہیں جو لوگ
ان کو بھی ہے کیا شراب پینے سے گریز
انسان کا خون پی رہے ہیں جو لوگ

جوش
ملیح آبادی

مہاتما گاندھی سے بات چیت ٹھیٹ اُردو میں

مہاتما جی، پرنام۔ ڈاکٹر تاراچند جی نے آپ سے جو باتیں کہیں وہ سب نے سنی ہونگی۔ انہیں باتوں میں ہمارا سمبر ساہتیہ پریشد" پرچار کی بات چیت بھی ہوئی تھی۔ نہیں پر میں نے اُن سے یہ بھی کہا تھا [illegible] سے الگ [illegible] جب سے آپ تک آپ سے باتیں کرنے کا [illegible] کے دھیان تو آتا رہا۔ پر ادھر اودھر کے بکھیڑوں میں ایک پھندا جو ادھر آنا چاہتے پر کبھی اب تک [illegible] کا [illegible] دنوں سے ان جھمیلوں سے چھٹکارا ملا ہے۔ آج چاہتا ہوں جو کچھ جی میں ہے [illegible] تک نہ کہہ سکا وہ سب ایک سانس میں کہہ ڈالوں۔ پر اتنا کرے آپ ٹھنڈے جی سے اُسے دیکھ سکیں۔ کس نے کہا، اسے دیکھنے والے تو بہت ہیں [illegible] کہا اس کے پرکھنے والے بہت تھوڑے ہوتے ہیں [illegible]۔ کون کہہ رہا ہے اُسے چھوڑ کے کیا کہا جا رہا ہے اُس کو جانچنے اور پرکھنے۔

پہلے یہ جتا دینا چاہتا ہوں دیس کے پیچھے آپ نے اپنا سکھ [illegible] سب کچھ کھو دیا [illegible] آپ نے جگ سادھا۔ [illegible] اس سمے آپ کو جھنجوڑا اور دکھ پہ دکھ دئے۔ دو سرا ہوتا تو مٹ بیٹھا جاتا اور [illegible] بیٹھتا۔ مگر آپ [illegible] سے مس نہ ہوئے اور آپ نے یہ دکھا دیا [illegible] لگتی ہے جونک پتھر کو۔ ایسی سگے سدھرنے کے لئے جو آپ [illegible] ٹھان لی [illegible] اب تک ہے اور اپنا سب کچھ تج کے [illegible] کے پیچھے آپ دھونی رمائے بیٹھے ہیں۔ ایسا مات کا دھنی اور دھن کا پکا [illegible] کھیل نہیں [illegible] کی کہانی ہیں سے یہ آپ کی باتیں کسی کے بھلائے سے بھلائی نہیں جا سکتیں۔ یہ میں نے اس لئے لکھا کہیں آپ یہ نہ سمجھیں لکھنے والا [illegible] تک جو میں نے کیا اُسے مانتا ہی نہیں۔ جو کچھ کہنا ہے وہ تو پھر [illegible] پہلے یہ ایک کہانی سن لیجئے:

اک برہمن، اک چھتری، اک ویش، اک شودر۔ یہ چاروں الگ الگ گھرانوں کے تھے۔ نہ جانے کیسے ایک جگہ اکٹھے ہو گئے جی بہلانے جنگل چلے۔ چلتے چلتے پیاس لگی۔ ادھر اُدھر ڈھونڈنے پہ بھی کہیں پانی کی اک بوند تک نہ ملی۔ اور آگے بڑھے تو سامنے ایک [illegible] دکھائی دی۔ موٹے موٹے اور لمبے لمبے پونڈے کھڑے جھوم رہے تھے۔ دیکھ کر سبھوں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ ایک کے ایک نے [illegible] ایک گنا توڑ لیا۔ دوسرے نے پٹاخ سے دوسرا۔ جو رہ گئے تھے انہوں نے بھی ساتھیوں کی دیکھا دیکھی بڑھ بڑھ کے اپنے اپنے لئے ایک ایک توڑ لیا۔ گنے توڑنے ہی ایک دوسرے کو سراہنے لگا۔ بھئی کیا کہنا اتنا موٹا اور رسیلا گنا ایک ہی جھٹکے میں یوں جڑ سے اکھیڑ پھینکا۔ کیوں نہ ہو، ہو نا برہمن۔ برہمن نے کہا اور تم اپنے چھتری پن کو تو کہتے ہی نہیں کتنا بڑا بانس کا بانس گنا کس بھرتی سے اکھیڑ لیا۔ ویش اور شودر میں بھی ایسی ہی باتیں ہوئیں۔

ایکھ والا ہیں کہیں آڑ میں کھڑا یہ سب سن رہا تھا۔ سنتے ہی جی ہی جی میں کہنے لگا "اچھا، یہ تو سبھی سب الگ الگ گھرانوں کے ہیں۔ ان سے گنے چھین لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ یہ کہہ کے بیلا اور ٹھٹکا۔ پھر کچھ سوچ ساچ کے ایک لمبا سا چکر کاٹ کر ان چاروں کے سامنے آتے ہی ڈنڈوت کی اور ڈنڈوت کر کے ایک سے یہ کہنے لگا:

"آپ تو ہمارے مائی باپ برہمن ہیں۔ دھرم اور اس کی پوجا پاٹ آپ ہی سے ہے۔ آپ نہ ہوں تو جگ میں دھرم پرچار کا اجالا ہی نہ رہے اور پورے سنسار میں اندھیرا گھپ ہو جائے جو ہاتھ سے ہاتھ نہ سجھائی دے۔" پھر چھتری سے بولا "آپ ہی کے بھروسے پر راج جو چاہتے ہیں وہ کرتا ہے۔ آپ ہی کی تلوار کی چھاؤں میں راج پاٹ پھولتا پھلتا ہے۔ یہ چھاؤں نہ ہو تو وہ جھلس جائے۔ آپ لوگوں سے بھلا میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" ویش سے کہا "تمہاری کھیتی باڑی [illegible] دھندا بھی ایسا نہیں جو کوئی اس کا گن نہ مانے۔ اسی سے سارا جگ بھلا چنگا دکھائی دے رہا ہے۔ نہیں تو گھڑی بھر میں ادھ موا ہو جائے۔ میں تم کو بھی کچھ نہیں کہتا۔ تم نے جو کیا اچھا کیا۔

اب اک شودر ہی رہ گیا تھا۔ اُسے گھور کے کہنے لگا "کیوں بے ملیچھ تیری یہ ڈھٹائی۔ تجھے تو کچا ہی چبا جاؤنگا۔ ارے بتا۔ تو نے کیا سمجھ کے گنا توڑا!" یہ کہتے ہی اُسے کھینچتا اور گھسیٹتا ہوا اپنی جھونپڑی میں لیجا ہاتھ پاؤں باندھ کے ڈال آیا۔

چار میں سے ایک کی تو یوں چھٹی ہوئی۔ جو تین بچے وہ اپنے اپنے گنے لئے لمبے لمبے ڈگ رکھتے آگے بڑھ ہی رہے تھے جو ایکھ والا جھپٹ کے ویش کو

نے بھڑ لیا! ڈانٹ کے کہنے لگا "دلی چلانے والے تجھے بھی یہ دن لگے جو ان دہائے یوں!" اکڑ ڈالنے لگا یہ گئے کیا تیرے ماتا پتا کے لگائے ہوئے ہیں۔ برہمن چھتری یہ تو ہمارے مائی باپ ہیں۔ ہم ان کے منگتے اور انہیں کا دیا کھاتے ہیں۔ تو تو نے بھی پیٹ سے پاؤں نکالے اور ان کی ریس کرنے لگا" یہ کہہ کر اسے بھی پکڑ دھکیل کے لے گیا۔

جب وہاں سے دم بہت ہوا تو برہمن، چھتری دونوں کے دونوں —————— یہ کہتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ چلو ہماری تو گرگری نہیں ہوئی یہ کہہ رہے تھے جو دم پھر وہ بڑھتا ہوا آگے بڑھ کے چھتری سے جا بھڑا، اسے روک کر کہنے لگا "کیوں جی کیا تم چھتری ہو۔ چھتری کیا ایسے ہی لٹیرے ہوا کرتے ہیں۔ ہڑپ آنے وہاں سے چھتری بن کے۔ ایسے چھتری وتری بہت سے دیکھے ہیں" یہ کہتے کہتے اس کی بھی کولی بھر لی۔ چھتری نے بہت پھڑپھڑکی اور پنڈت جی نے بھی بہت چھڑانا چاہا پر اس نے کسی کی بھی نہ مانی اور اسے بھی جھونپڑی میں لے جا باندھ بوندھ کے ڈال آیا۔

برہمن کہنے لگے کہ ساتھی گئے تو گئے ہم تو بچ گئے۔ وہ کانئیاں ہتھ چھٹ اور منہ پھٹ ایکھ دالا بھلا ایک کو کیسے چھوڑ دیتا۔ پنڈت جی ہانپتے کانپتے بھاگم بھاگ بڑھے چلے جا رہے تھے جو دم پھر جھونپڑی سے نکلا اور نکلتے ہی وہیں سے للکارا۔ للکارتا ہوا جھپٹا اور جھپٹ کے پنڈت جی کو بھی جا دبوچا۔

کہنے کو تو یہ ایک کہانی ہے پر سمجھ والوں کے لئے اس میں بہت سی سیکھنے کی باتیں چھپی ہوئی ہیں۔ اپنی اپنی پڑی ہونے سے ایک دشمن کے بکے نے اپنے سے چوگنوں کو کیسے باندھ کے ڈال دیا۔ ان میں اتنا ہی ایکا ہوتا جیسے یہ سب مل کے ساتھ آئے تھے تو بھلا ایک تو ایک دو گنے تگنے بھی ایسے جھٹ پٹ ان کا بال بیکا نہیں کر سکتے تھے۔

آج کل دیس میں بھی ایسی ہی آپا دھاپی کی ہونی کھیلی جا رہی ہے۔ راج نے کسی کو ڈھیل دی اور کسی کو جکڑ دیا۔ جدھر ڈھیل آئی ادھر والے اپنے آپے میں ہیں۔ موچھوں کو تاؤ دے دے کے ٹھگے بنکارنے اور ٹوپیاں اچھالنے۔ یہ دھیان ہی نہیں آتا۔ ڈھیل دی تو کیا ہوا، ہیں تو سب کے سب بندھے ہوئے۔ اس کا بھروسہ ہی کیا۔ آج کی ڈھیل کل کھنچ بھی تو سکتی ہے۔ ایک جگہ کا اٹھنا بیٹھنا، رہنا سہنا اس پر آپس میں آئے دن کی دانتا کل کل۔ "ساہتیہ پریشد" میں جو آپ نے کہا کوئی اس سے بڑھ کر بھی کہتا تو اسے کوئی دیکھتا بھی نہیں۔ اچھا تو اسی پر ہے آپ کے منہ سے ایسی ایسی باتیں نکلیں جو کوئی دوسرا کہے تو سب انہیں الٹ پلٹ سمجھیں۔

پہلے تو یہی دیکھ لیجئے۔ دیس کے لئے ابھی کیا کچھ کرنا نہیں۔ آپ برسوں سے نیند کے ماتوں کو جھنجوڑ جھنجوڑ کے جگانا چاہتے ہیں۔ پھر کیا سب کے سب جاگ اٹھے۔ بہت سے بہت ہوا تو یہی، گھوڑے بیچ کے سونے والوں نے آپ کے جھنجوڑنے سے ہوں ہوں کر کے کروٹوں پہ کروٹیں لیں، ہاتھ ادھر جھٹکے پاؤں ادھر پٹکے۔ جمائیوں پہ جمائیاں اور انگڑائیوں پہ انگڑائیاں لیتے لیتے پھر آنکھیں میچیں اور پھر خراٹے لینے لگے۔ اور آپ کا جھنجوڑنا ان کے لئے لوری بن گیا۔

"ساہتیہ پریشد" کی دھوم دھام بتا رہی ہے، دیس کے لئے جو کچھ ہونا چاہیئے تھا وہ سب ہو چکنے سے سب کے سب آنند اور نچنت ہو کر نئی بھاشا کے پرچار میں لگے ہوئے ہیں۔ بھاشا داشا کی دیکھ بھال، جانچ پرتال ناپ تول کا کھٹراگ اس گھڑی کے لئے ہے جب کٹھن باتوں میں سے ایک ایک کر کے سب کی سب پوری ہو چکی ہوں۔

دیس کس جنجال میں پھنسا ہوا ہے۔ کنگلاپن کتنا بڑھتا چلا جاتا ہے اور پورا دیس کیسا اپاہج ہو کے رہ گیا ہے۔ اپنے بل بوتے پر آج تک نہ یہ کچھ کر سکا اور آپس میں یہی تنا تیری رہی تو آگے بھی یہ کچھ کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ جب ابھی دیس کی کسی بات کا بھی ٹھیک ٹھاک نہیں تو سب چھوڑ چھاڑ کے پہلے دیس ہی کو سدھاریئے پھر جو جی چاہے دہ کیجئے۔

گھر میں تو پھوٹ پڑی ہے۔ کہرام مچا ہوا ہے۔ بھیانک چیخوں سے کان پھٹے جا رہے ہیں۔ جیسے بھیڑوں کا ریوڑ تتر بتر ہو کے ادھر ادھر مارا مارا پھرتا ہو۔ ایسے ہی دیس والے بھی ہیں۔ آپس میں جوتی پیزار، گالم گلوج اور بھوگ سنائے جا رہے ہیں۔

ایسے دنوں میں "بھارتیہ ساہتیہ پریشد" کی نیو رکھنا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اس کے پرچار پر اڑنا ایسا ہی ہے جیسے کسی گھر میں تو آگ لگی ہوئی ہو۔ دھڑ دھڑ گھر جل رہا ہو اور اس کے رہنے والے آگ بجھانے کی جگہ نئے گھر کا کینڈا، چھت کی اونچائی، پچھیت کی بناوٹ، انگنائی کی چوڑائی، جھروکوں کھڑکیوں کی لمبائی اور پورے گھر میں کہاں کہاں پھول پتیاں بنائی جائیں گی۔ گھر سجنے کے لئے اور کیا کیا ہونا چاہیئے۔ ایسی ایسی باتیں کھڑے سوچتے رہیں۔ گھر بنے پیچھے اس کے سجنے کے لئے جو چاہیں کریں۔ کوئی ٹوک نہیں سکتا۔ گھر بنا کیسا ابھی تو بھرا گھر اجڑ رہا ہے اور اس کے بننے کی گھڑی آنے تک نجانے ابھی کیا کیا ہونا ہے۔ تو ایسی کھچڑی پکانا آپ کے لئے تو ٹھیک نہیں۔

یہ تو سوچئے۔ آپ کدھر جا رہے تھے اور لوگوں کے بہکانے سے بھٹک کے کدھر چلے آئے۔ چلے آنے میں تو کچھ نہ تھا۔ پر اڑنا اور یہیں جم کے بیٹھ جانا تو اچھا نہیں۔

کوئی بڑا بھکیت، جیالا بھکیت، منچلا سورما اپنا سب کچھ لُٹا کے دُہری تہری بیڑیوں، ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے دیس والوں کے چھڑانے کی دھن میں جھٹ پٹ اُٹھ کھڑا ہوا اور لڑائی کی بھڑکتی ہوئی آگ میں کود کے سوجھ بوجھ اور ست کی گھاتوں سے جم کے ایسا لڑے جو دوسروں کے دانت کھٹے کر دے اور چھکے چھڑا دے۔ پھر وہی بکا ایک لڑائی بھڑائی چھوڑ چھاڑ گھومتا گھامتا بھاشا کے پرچار کرنے والوں میں آ بیٹھے اور اُن کے سنبھالنے بڑھانے سے انہیں کا ساتھ دینے پر اڑ بیٹھ جائے۔ تو اسے یہاں بیٹھا دیکھ کے دیکھنے والے اپنی اپنی سی کہنے لگیں گے۔ کوئی کہے گا لڑائی بھڑائی کے جوکھوں میں پڑنا مُنہ کا نوالہ نہیں جو گپ چاپ نگل لیا جائے۔ دیکھا نا۔ جو کہتے تھے وہی ہوا۔ پہلے کیسی اکڑ بکڑ دکھائی اور پھر ٹائیں ٹائیں فش۔ جب وہاں نہ ٹھہر گیا تو لڑائی سے جی چرا کے یہاں بیٹھنا ہی بُرا دوسرا کہے گا نہیں بھئی یہ بات نہیں۔ لڑائی کو بھی تو بکھو گھنٹے دو گھنٹے، ایک دن دو دن، مہینے دو مہینے کی نہیں برسوں ہو چکے۔ ہاتھ پاؤں کہاں تک چل سکتے ہیں۔ گھڑی بھر انگلی ہلا کے تو دیکھو کتنی سوجتی ہے۔ لڑتے بھڑتے ہاتھ پاؤں تو تھک کے چُور ہو گئے ہوں گے۔ سستانے کیلئے کہیں بیٹھنا بھی کیا بُودا پن ہے۔ تیسرا کہے گا۔ بیٹھنا تو بُودا پن نہیں۔ پر جم کے بیٹھنا ٹھیک نہیں تو پھر کیا ہے۔

جتنے مُنہ اتنی باتیں ہوں گی۔ ساتھ ہی سوجھ بوجھ والے بھی یہی کہیں گے۔ ایسے منچلے کے لئے سب سے پہلے دیس ہی کی سیوا چاہئے۔ دیس کے پورے بندھن جب کھل سکیں تو بھاشا واشا کا پرچار سب کچھ اس سے کہیں بڑھ چڑھ کے ہو سکتا ہے اور جب تک دیس نہ سنبھلے تب تک ایسے الجھاوے میں اُلجھنا نہ چاہیئے۔

بجس کی لڑائی سے ایک بانکے مُنہ موڑ کے چلے۔ دیکھنے والوں نے ٹوکا۔ ہائیں یہ کیا۔ آپ کی بکیتی، بھکیتی کی تو دھوم تھی۔ بڑے بڑے جیالے لوہا مانتے تھے۔ جب آپ ہی نہ جم سکے تو پھر کون جمے گا اور اس گڑھی کو پھر کون جیتے گا۔ اس ٹوکنے پہ بانکے پلٹے اور اور جھنجھلا کے کہنے لگے۔ کیا کہتے ہو۔ تم کیا جانو۔ تمہیں تو یہی آتا ہے جو مُنہ میں آیا بک دیا۔ کیا تمہیں ان آنکھوں نے کیا کیا دیکھ لیا۔ ایسے ایسے پٹھے جو نک سُک سے ٹھیک ڈیل ڈول کے اچھے پورے اور ایسے سجیلے جدھر سے نکل جائیں دیکھنے والوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جائیں اور چھوٹے بڑے سب کی ٹکٹکی بندھ جائے۔ ان میں کا ایک ایک سینکڑوں پہ بھاری پڑتا بھی ہو تو لاکھوں کے ٹڈی دل میں گھس کے دانتوں سے بوٹیاں کاٹ کاٹ کے تھوک دے اور منچلوں کا پتا پانی کر دے۔ ایسے ایسے جیالوں نے دھڑ کو لہلہ کے چھلنی چھلنی ہوتے ہوئے دیکھے۔ اس سب کچھ ہونے پر بھی دیکھنے کی بات یہ ہے۔ جس جگہ ان کے پاؤں جم گئے پھر وہاں سے نہ ہٹے اور وہیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کے ٹھنڈے ہو گئے۔ بھلا یہ بھی کوئی لڑائی ہے۔ اس سے تو ہیجڑوں کی لڑائی اچھی۔ کوس بھر سے دن دن ہوتے تھے اور یہاں جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی۔ تلوار کے دھنی تھے تو مُنہ کیوں چھپایا۔ آمنے سامنے ہو کے دو دو ہاتھ ہمارے بھی دیکھ لئے ہوتے۔ کیسے گگڑیاں جیسے کٹتی ہیں، ایسے ہی گھڑی بھر میں پرے کے پرے کاٹ کے نہ رکھ دیتے تو یہ اپنی موچھیں مُنڈوا ڈالتے۔ اب یہ جگہ منچلوں کے ٹھہرنے کی نہیں اور سچ تو یہ ہے اب جینا دوبھر ہو گیا۔

پہلے کبھی بانکوں کی بڑی دھاک تھی اور ہوتے بھی تھے بڑے تلورے۔ پھر بھی ان میں اُول جلول پن بہت ہوا کرتا تھا۔ پر آپ تو ایسے نہیں۔ آپ میں جو کچھ، سوجھ بوجھ اور اچھی اچھی باتیں پرمیشر نے اکٹھی کر دی ہیں وہ پہلے کے بانکوں میں کہاں۔ آج آپ ہی ہند ماتا کے اکلوتے بانکے ہیں۔ دیس کا اکھاڑا کھدا ہوا ہے اور اس میں برسوں سے راج کے ساتھ آپ کی گتھم گتھا ہو رہی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو رگید رگید کے چت کرنے کی گھات میں لگے ہوئے ہیں دیکھنے والوں کے جتھے کے جتھے اور ٹولیاں کی ٹولیاں پرا جما کے آپ کے اس بھڑنے کو بڑے اچنبھے سے دیکھ رہی ہیں۔ پر کچھ دنوں سے جو آپ اس اکھاڑے سے نکل کے دوسرے دھندے میں لگ گئے۔ اس پر اپنے پرائے سب میں کانا پھوسی ہو رہی ہے اور کہا جا رہا ہے۔ مہاتما جی سیدھے جاتے جاتے یہ کدھر مُڑ گئے۔

آپ کے ادھر آنے سے دیس کی بات کیسی ادھوری ہو کے رہ گئی۔ تو پھر ادھر ہی جائیے نا اور دیس ہی کے لئے جو بن پڑے وہ کیجئے۔ رہا بھاشا کی گتھیاں سُلجھانا اسے پھر کبھی کے لئے اُٹھا رکھئے۔ بھاشا کیا کہیں بھاگی جا رہی ہے جو اس کی روک تھام ابھی ہو سکتی ہے پھر نہ ہو سکے گی۔ جدھر آپ جا رہے تھے اُسکے سامنے بھاشا واشا ہے کیا۔ انند ہو کے ایسے سینکڑوں کھیل کھیلے جا سکتے ہیں۔

گاؤں میں دیکھا ہو گا جو ہاٹ آج بھرا پھر سات دن تک یوں ہی سنسان پڑا رہتا ہے۔ اس سنسار میں جو جو دھندے لوگ کر رہے ہیں۔ کچھ ہی لوگوں کے لئے ان دھندوں سے انہیں الگ رکھا جائے تو وہ پہلے سے نہیں رہتے۔ سینے پرونے والوں سے سلائی، بڑھئیوں سے لکڑی کی چیر چار، لہاروں سے لوہے کی پیٹ پاٹ، کمہاروں سے مٹی کی تھوپ تھاپ، لکھنے پڑھنے والوں سے لکھت پڑھت۔ سوچ بچار بہت نہیں تھوڑے ہی دنوں کیلئے یہ اُن سے

چھیڑا کے دیکھ لیجیے ان میں سے کسی میں بھی پہلے کی سی بات نہیں رہے گی۔

آج جو کہ ناپ اُسے کل کے لئے اٹھا رکھنے پر بات آئی گئی ہو جاتی ہے۔ آج کا دھندا آج ہی کے ساتھ ہے۔ اسے آج ہی پورا ہو جانا چاہیئے۔ کل کا دھندا آج سے الگ ہوگا۔ آج کی بات کل پر چھوڑ دی تو کل کی پرسوں اور پرسوں کی اترسوں پر چھوٹتی رہے گی اور یوں ہی چھوٹتے چھوٹتے پھر وہ بات چھوٹ جائیگی۔ بات اگر ٹھنڈی پڑ گئی تو پھر دھیان بھی ٹھنڈے پڑ جاتا ہے تو آپ ہی وہ بات ٹھنڈی نہیں پڑی ہے۔ یہ سماں ابھی ایسا ہے جب بھاشا واشا کو چھوڑ چھاڑ کے آپ بھی دیس کو دیکھ سکتے ہیں اور اس کے لئے ان دیکھے ناروھوپ کر سکتے ہیں۔ آپ کی دوڑ دھوپ ہی کرنی کا اپل نہیں جو کچھ نہ ہوسکے۔ آج کچھ نہیں ہے تو کل کچھ نہ کچھ ہو رہے گا۔ مینہ اور تنگے بڑھ کر دیکھیں یہ سہانا سماں دیکھیں گی۔

دیس میں میل ملاپ کے جھنڈے کے نیچے تپاسے ہوئے من جن کی گھنی چھاؤں میں پریم جل انگڑائیاں لیتا بہہ رہا ہے۔ ایک من کی ٹہنیاں دوسرے کے من پر کچھ جھکی ہوئی ہیں۔ پیار کی بیل میل جول کے پھیلتے ہوئے پودوں پر چڑھی بہار دے رہی ہے۔ پریم کے پھولوں کے گچھے کے گچھے ادھر ادھر لٹک رہے ہیں۔ نکھرے بیلوں کے پھولوں کی بھینی بھینی باس سے دیس کا دیس بسا ہوا ہے۔ من برسانے والی گھنگھور گھٹائیں سنسار کی آنکھوں میں کاجل لگا رہی ہیں۔ کالے کالے بادلوں سے بھاٹ رہ رہ کے دیس کے گیت گا رہے ہیں۔ کوئل کی کوک، موروں کی جھنکار، پپیہوں کی پکار، ہلکی ہلکی پھوار، سلونی سانولی گھٹاؤں کے اندھیرے میں رہ رہ کے بجلی کی چمک جیسے کسی تیرن کی متوالی کے بیٹھے ہوئے رہاں سکھانے کے لئے جھکنے میں گڈی گھڑی منہ پر آجاتے ہیں۔ ایسے دھن لگے میں دیس کے سپوت آپ کے چرنوں میں جھکے ہیں۔ سے چڑھاوے چڑھا رہے ہیں اور آپ اس کی ہری بھری پھلواری کے منڈوے میں ایسی سب گھڑی کو دیکھ دیکھ کے مسکرا رہے ہیں۔

اچھا، ٹلے ہاتھوں ابھی اُس کی بھاشا کو بھی دیکھیے چلتے۔ جس کے پرچار کی دُھن میں آپ اپنا اب تک کا کیا کرایا سب اکارت کر دینا چاہتے ہیں۔

اُردو میں عربی فارسی لفظوں کی بہتات سے اسے دوسرا ٹھکانا یا جو کلم لگاتا یہ کہہ اُٹھے۔

"اُردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا۔

مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔"

یہ آپ سے کس نے کہہ دیا؟ کہاں مسلمانوں کے دھرم کی بھاشا اور کہاں اُردو۔ دونوں میں کوئی تُک بھی ہے۔ ایسی بات مُنہ سے نکالنے سے پہلے آپ نے پنڈت جواہر لال نہرو ہی سے پوچھ لیا ہوتا۔

ہندی اور اُردو کے جھگڑے پر پنڈت جواہر لال نہرو نے ڈاکٹر سید محمود کو جو ایک لمبی چوڑی چٹھی لکھی تھی اسی میں ایک جگہ پنڈت جی یہ لکھتے ہیں:۔

"عجیب بات تو یہ ہے کہ جانے ہمارے ملک میں کتنی چیزیں ہیں جو فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔ زبان کا مسئلہ بھی مذہبی بن گیا اور بعض نہ معلوم اسباب کی بنا پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ میں بصد ادب عرض کروں گا کہ میں اسے ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اُردو کو اپنی زبان سمجھتا ہوں جسے میں بچپن سے بولتا چلا آیا ہوں"

لیجیے۔ پنڈت جی تو اُردو کو اپنی ایسی بھاشا سمجھ رہے ہیں جسے وہ بچپن سے بولتے چلے آتے ہیں اور آپ اسے مسلمانوں کے دھرم کی بھاشا کہنے پر اڑے ہوئے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے سننے والا کس کا کہا مانے، کسے جھٹلائے اور کسے سچ جانے۔ اسی کے ساتھ ساتھ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے مسلم یونیورسٹی میں اُردو کانفرنس کے اسٹیج پر "اُردو ہماری زبان" کہکر جو لمبی چوڑی اسپیچ دی تھی اُسے بھی کہیں کہیں سے سُن لیجیے۔ پنڈت جی اسی میں ایک جگہ یہ کہتے ہیں:۔

"اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ اُردو قوموں کے میل جول اور دونوں بولیوں زبانوں کے اختلاط سے پیدا تو ہوگئی لیکن کیا بعد بھی ہندو اس کو اپنی زبان سمجھتے رہے اور اس کو استعمال کرتے رہے؟ حضرات میں اس تنقیح کو مُکھم میں رکھنا پسند نہیں کرتا۔ سُنیئے، ہندوؤں میں تبلیغ مذہب تو عرصہ سے بند ہوچکی تھی۔ تقریباً دو ہزار برس کے بعد اب پھر تازہ ہوئی ہے۔ اس واقعہ کو نظر میں رکھکر دیکھنا یہ ہے کہ ہندوؤں میں دھرم پرچار کے سلسلے میں اُردو اختیار کی گئی یا نہیں۔ اگر تحقیق سے اس کا جواب اثبات میں ہے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اُردو کو ہندوؤں نے اپنے ہندو بھائیوں کی دینی ہدایت کے لئے استعمال کیا۔ انیسویں صدی عیسوی کے اوّل برسوں میں اچھوت اُدھار اور سر بجھن کی تبلیغ یا شُدھی کا نام تک کوئی نہ جانتا تھا۔ مگر سنہ ۱۸۱۹ء میں سمریو بھاگوت کا سوال اسکند یعنی باب، اُردو کی ایک ضخیم مثنوی مسمّی "آئینہ مستور" کی

صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یہ کئی سو صفحے کی قلمی کتاب میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ مذہبی اور اعتقادی کتاب، ایک ہندو سپنے ہندو ہم مذہبوں کے لئے ابجی اردو نظم میں تصنیف کرتا ہے"

پھر پنڈت جی نے ہندو دھرم کی لائبریری میں سے ایسی بہت سی چھوٹی بڑی اردو پلکھتوں کا اتا پتا دیا ہے جو پوری کی پوری ہندو دھرم کی باتوں سے بھری پڑی ہیں۔ گھر کے بھیدی کی یہ باتیں بھی سننے کی ہیں:۔

"سنسکرت اور ہندی بھاشاؤں کے ہوتے ساتے ہندوؤں نے اردو کو اوراد و وظائف سے یا زیادہ احتیاط سے یہ کہیئے کہ مذہبی اور تی تقریبوں سے خارج نہیں کیا۔ شکت چالیسی ایک اردو کی کتاب استوتر یعنی وظیفہ کی ہے یہ اردو کے مخمس ترجیع بند کی صنف سے ہے۔ ہر بند کے چار مصرعے ٹھیٹ اردو میں ہیں اور ترجیع کا مصرع "تمس تسی" چار بار آتا ہے۔ ہندوؤں نے پوجن کے سلسلہ میں وظیفہ یا مناجات کی طرح پڑھتے ہوئے دیکھا ہے اور یہ دھیان میں رکھنے کی بات ہے کہ تلسی داس رامائن لکھ چکے تھے۔ اس کی کتھا برابر ہو رہی تھی۔ مہابھارت اور بہت سے پران اور دوسری مذہبی کتابیں ہندی میں منتقل ہو چکی تھیں۔ لیکن اپنے اہالی ملت میں دھرم پرچار کی کمی محسوس ہوتی جب تک کہ اردو سے کام نہیں لیا گیا۔ اس ضمن میں وہ تمام اردو دنیا کے شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے مہابھارت، رامائن، گیتا، مہاتم شو پران، گنیش پران، اور جانکی بجے وغیرہ دھرم پستکیں اردو میں تصنیف اور ترجمہ کیں، یہ کتابیں منشی نولکشور کے مطبع سے چھپکر آج تک شائع ہو رہی ہیں اور ہندوؤں میں ان کے مذہب کی تلقین اور روایات ملی کے زندہ رکھنے کا زبردست آلہ ہیں۔ ان منظم کی کتابوں کے علاوہ بہت سے اپنشد اور چھ شاستر اور سمرتیاں اردو نثر میں منتقل ہو کے شائع ہوئیں اور آج تک ان کی مانگ برابر جاری ہے یہی حال آریہ سماج کے لٹریچر کا ہے"

یہ کہانی کہتے کہتے پنڈت جی نے کہی ہوئی باتوں کو پھر ایک جگہ اکھٹا کر کے ایک چیلنج بھی دیا ہے جس کا نچوڑ یہ ہے:۔

"آپ نے دیکھا کہ اردو کی تعمیر و تدوین اور ترویج میں ہندوؤں کا کتنا مقتدر حصہ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ہندوؤں کی مذہبی ادبی کتابیں کس کثرت سے اردو میں لکھی گئیں اور آپ دیکھتے ہیں کہ بھگوت گیتا کے ایک سو زیادہ نئے ترجمے اور تفسیریں اردو نظم اور نثر میں ہر سال بلاناغہ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی ہندی والا (میرا مطلب ہے اردو ہندی کے جھگڑے کا علمبردار) اس وقت یہاں موجود ہے تو سامنے آکر بتائے کہ جو واقعات ابھی پیش کئے گئے ان میں سے کون صداقت سے محروم ہے"

پنڈت کیفی کی باتیں سنتے سنتے آپ اکتا گئے ہوں گے۔ یہاں تک تو آپ سن ہی چکے گنتی کی دو ڈھائی باتیں اور سن لیجے۔ یہ لکھت کسی مسلمان کی ہوتی تو سچ مانئے اس میں سے دو بول بھی کبھی یہاں نہ لکھتا۔ پر اس کا لکھنے والا ہندو اور ہندو بھی ایسا ویسا نہیں بڑی سوجھ بوجھ کا پنڈت ہے جس کی آنکھیں سچائی پر جمی ہوئی ہیں۔ اپنے ساتھ کے بھٹکے ہوؤں کو پکار پکار کے ادھر ہی بلانا چاہتا ہے جدھر سچائی کا اجالا ہے۔ اس کی لکھت کے ایک ایک بول سے یہی دکھائی دیتا ہے۔ جن باتوں سے دیس نڈھال ہوتا جارہا ہے ان پر وہ جی ہی جی میں کڑھ رہا ہے، اونٹ رہا ہے اور بھرا بیٹھا ہے۔ اس لکھت میں جی کی بھڑاس نکالی ہے اور پتے پتے کی باتیں ایسی جگہ اکھٹی کر دی ہیں جنہیں کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ اسی میں ایک جگہ پنڈت جی نے یہ بھی لکھا ہے:۔

"جب مہاتما گاندھی نے اپنے سابرمتی کے آشرم کی بھجناولی مرتب کرنے کا حکم دیا اس وقت بھارتیہ ساہتیہ کا یہ نظریہ جو اب ناگپور میں ہنگامہ آرا ہوا کہاں چلا گیا تھا۔ یہ معلوم کرنا دلچسپی کا موجب ہوگا کہ مہاتما جی کے مرحوم سابرمتی آشرم کے بھجنوں کے اس ہندی کے مجموعے میں کل ۱۸۱ بھجن ہیں۔ جن میں ۱۰۲ بھجنوں کو ہندوستانی نام دیا گیا ہے۔ باقی ۷۹ بھجن گجراتی، مرہٹی وغیرہ دوسری زبانوں کے ہیں۔ اور یہ واضح رہے کہ ان ۱۰۲ ہندوستانی بھجنوں میں کئی غزلیں بھی ہیں۔ جیسے:۔

ہے بہارِ باغِ دنیا چند روز   دیکھ تو اس کا تماشا چند روز

یہ بھجناولی ہندی میں چھپی ہے۔ اب اگر اردو کے لفظ سے کسی وجہ سے بے اعتنائی ہو گئی تھی تو بھارتیہ ساہتیہ میں

ہندوستانی ہی سے کام رکھتے ؟

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی کہی یہ سب باتیں ٹھیک ہیں۔ اچھا انہیں چھوڑیئے۔ بیچ میں بات میں سے بات نکل آئی۔ اور جو کہنا چاہتا تھا نہ کہہ سکا۔ میں یہ کہہ رہا تھا اُردو میں آپ نے عربی، فارسی بولوں کی ریل پیل دیکھ کے اسے مسلمانوں کے دھرم کی بھاشا سمجھ لیا۔ دیکھئے بات یہ ہوئی۔ اُردو کی جب نیو ڈالی جارہی تھی تو یہاں کے چھوٹے بڑے جیتے سب ہی اس میں لگے ہوئے تھے اور مسلمانوں کا راج تھا اس لئے عربی، فارسی کے بول اُردو میں آئے اور بہت آئے۔ اور جو مسلمان راج کی جگہ کوئی اور راج ہوتا تو اسی راج کی بھاشا کے بولوں کی بھیڑ بھاڑ اُردو میں لگ جاتی۔ کسی بھاشا میں دوسری بھاشا کے بولوں کی بھرمار دیکھ کر بے سمجھے بوجھے کہہ دینا یہ بھاشا اس جتھے کے دھرم کی بھاشا ہے۔ سوچئے تو یہ کتنی بڑی بھول ہے۔ آج کل اُردو میں انگریزی بول بڑھتے جارہے ہیں کوئی نہ جاننے والا انگریزی بولوں کی بہتات دیکھ کر اُردو کو انگریزوں کے دھرم کی بھاشا کہنے لگے تو سچ کہیئے اس کے اس کہنے پہ کیا آپ اپنی ہنسی روک سکیں گے۔

دھرم اور بھاشا ان دونوں کے ڈانڈے الگ الگ ہیں۔ ان دونوں کے گھال میل کو جس سے پوچھئے یہی کہے گا یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ جب دھرم اور بھاشا کا آپس میں گڈمڈ کرنا ٹھیک نہیں کہا جاتا تو منہ سے جو کہا جارہا ہے وہ کیا کیوں نہیں جاتا۔ چبا چبا کے باتیں کرنا کس لئے۔ دونوں کا میل جول اچھا لگتا ہے تو کھل کر کہہ دیجئے۔ دھرم اور بھاشا کو ہم الگ الگ نہیں دیکھ سکتے اور دونوں کو ملا دینا چاہتے ہیں۔ اس کہنے پر بھی کوئی آپ کو ٹوکے تو اُسے جو جی چاہے کہیئے۔ پر جب تک آپ منہ سے یہ نہ کہیں گے تب تک پوچھا گچھی کی نے بڑھتی ہی رہے گی۔

پہلے پہل جو بھاشا کے جھگڑے کی بھنک کانوں میں پڑی تو میں نے جی میں کہا۔ کہیں ایسا تو نہیں نئے نئے مولوی، ملا اپنی بڑائی جتانے کے لئے چھانٹ چھانٹ کے ایسے موٹے موٹے اور بھاری بھاری عربی، فارسی کے بول بات چیت میں ٹھونستے ہیں جو بہت سے ہندو نہیں سمجھ سکتے یہ بات ہندوؤں کو بُری لگی ہو اور جھلا کر انہوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ چننے کی ٹھان لی ہو۔ ساتھ ہی یہ بھی دھیان آیا ایسا تھا بھی تو اس کا یہ توڑ تو نہ تھا جو کیا جارہا ہے۔ وہ بات بنا کیا تھی۔ دونوں جگہ کے لکھے پڑھے سمجھ داروں کو بلا لیا ہوتا یہ سب ایک جگہ بیٹھ کے گھڑی دو گھڑی میں یہ جھگڑا چکا دیتے۔

یہ بھی آج کل کا ایک نیا ڈھکوسلا ہے۔ جسے دیکھئے "اُردو" اور "ہندی" کا منتر پڑھ رہا ہے اور اسی کی مالا جپ رہا ہے۔ بہت سے پڑھے لکھوں سے یہ پہیلی بوجھی جاچکی۔ میرا پوچھنا یہی تھا اور ہے۔ جب اُردو کا ڈیل ہندی ہی کی مٹی سے بنا ہے تو پھر "اُردو کے ساتھ" اور "ہندی" لکھنا کس لئے۔ اُردو میں ہندی ایسی بری ہوئی ہے جو کبھی اس سے الگ ہی نہیں ہوسکتی اور کیسے الگ ہوسکتی ہے جب اُردو کی کھال، چمڑا، ہڈیاں، ڈھانچا جو کچھ ہے وہ ہندی ہی ہے۔ اپنی اپنی سب کہہ رہے ہیں اور اسے کوئی دیکھتا ہی نہیں یہ ہے کیا۔ جانچئے تو گھڑی بھر میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ دکھائی دینے لگے گا۔ اس کے پرکھنے اور جانچنے کا یہ ڈھب ہے۔

دو اچھے پڑھے لکھے سامنے بٹھا کر ایک سے کہئے تم ایسی اُردو لکھو جس میں عربی، فارسی بولوں ہی کی ریل پیل ہو اور بھولے سے بھی کہیں ہندی کا ایک آدھ بول تک نہ آئے۔ ہندی کے کسی بول کے نہ آنے پہ بھی پوری لکھت اُردو ہی رہے۔ دوسرے سے کہا جائے تم عربی، فارسی کو ہاتھ نہ لگاؤ اور ایسی اُردو لکھو جس میں عربی، فارسی بولوں کی کہیں چھاں نہ آئے اور پوری کی پوری لکھت ٹھیٹ اُردو رہے۔ تو پہلا ایسے ڈھائی بول بھی نہیں لکھ سکتا جس میں اُردو پن رہ سکے۔ پہلے لکھنے والے کی لکھت عربی، فارسی بولوں کی ایسی کھچڑی ہو کے رہ جائے گی جسے اُردو سے نہ کوئی لگاؤ ہوگا اور نہ کوئی اُسے اُردو کہہ سکے گا۔

دوسرا لکھنے والا عربی، فارسی بولوں کی بھیڑ چیرتا ہٹاتا آگے بڑھ کے ٹھیٹ اُردو لکھ سکتا ہے تو اُردو لکھنے اور بولنے میں ہندی سے کترا کے کوئی کتنا ہی نکلنا چاہے کبھی نہیں نکل سکتا اور کیسے نکل سکتا ہے جب اُردو کے پتلے میں پوری مٹی ہندی ہی کی لگی ہوئی ہو۔ باہر والی بولیوں میں سے عربی، فارسی بول اس میں بہت سہی پر ہندی کی بہتات کے آگے وہ ایسے ہی ہیں جیسے موسلا دھار مینہ کے سامنے پانی کی کچھ بوندیں۔

یہ کبھی نہیں ہوسکتا جو ہندی کو نہ چھوا جائے اور عربی، فارسی بولوں ہی کی الٹ پلٹ سے اُردو لکھت اور بات چیت ہوسکے۔ ہندی کو ہاتھ نہ لگانے اور عربی، فارسی بولوں کے اکٹھا کر دینے سے اُردو نہیں رہ سکتی۔ اُردو میں سے عربی فارسی بول نکال کے یوں لکھا جاسکتا ہے جیسے یہی لکھنے کا ڈھنگ جس میں آپ سے باتیں کی جارہی ہیں۔ جب کسی جتن سے بھی ہندی کو اُردو سے الگ نہیں کیا جاسکتا تو پھر "اُردو کے ساتھ ساتھ" اور "ہندی" کا ٹکڑا کس لئے بڑھایا جارہا ہے۔ کیا آپ یہ بتا سکیں گے۔

اور سُننے۔ پُھل گیندا نہ، اردو لگت کلواہیں جوٹ، سائیں سے بچارہ اور بندہ سے ست بھاؤ، موہ ڈار دیو سارے رنگ کی لگر۔ یہ سب، اور لکھنے کا یہ ڈھب جس میں بات چیت ہورہی ہے کہ ان میں سے آپ کسے ہندی کہیں گے۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ جو ایک لاٹھی سے سب کو ہانک دیں اور کسی کو بھی آپ ہندی نہ کہیں۔

پھر ان میں سے آپ جسے بھی ہندی کہیں اپنے بنارس کے "ہنس" کو اس سے ملا کے تو دیکھیے۔ ہنس کی لکھت کیا اسی کی سی ہے۔ آپ ہنس کی لکھت کے ڈھب کو کٹھن نہیں سمجھتے نہ سمجھئے۔ اوروں سے پڑھوا کے تو دیکھئے۔ نہ سب پڑھ بھی تو نہیں سکتے اور کیسے پڑھ سکیں گے۔ اسکی ایسی نرالی لکھت ہے جو پہلے اور آج کل کے ہندوؤں کی لکھت سے میل ہی نہیں کھاتی

"ہنس" اور کچھ ہنس والوں کو چھوڑ کے ہندوؤں میں سے کیا دو ایک کی بھی ایسی لکھت آپ دکھا سکیں گے۔ ہنس میں اودا کے ایسے ایسے من مانے ڈھب سے کڈھب بول ٹھونسے جارہے ہیں اور ایسے بھولے بسرے بولوں کی بھرمار کی جارہی ہے جن کے سمجھنے کے لئے مسلمان تو مسلمان ہندوؤں کو بھی سنسکرت کی ڈکشنری دیکھنی پڑتی ہے۔ آج کل کے نئے ہندی لکھنے والوں کی نہ کہیئے۔ یہ سب اودان کے توتے ہیں۔ کچھ لکھنا لکھانا ہوا، جھٹ سے سنسکرت کی ڈکشنری گھسیٹ لی لے سامنے رکھکر آئیں بائیں شائیں جو جی میں آیا دیکھ دیکھ کے بھولے بسرے بول کے بول لکھتے چلے گئے۔ میں یہ نہیں کہتا۔ انکے لکھنے کا ڈھب پکار پکار کے کہہ رہا ہے۔

سنسکرت کا ہندو دھرم کی بھاشا ہونا اور اس بھاشا کا کبھی نہ برتا ہوا پھیلاؤ کون ایسا پڑھا لکھا ہے جو نہیں جانتا۔ اس میں دیکھنے کی جو بات ہے وہ یہی ہے سنسکرت جب سہاگن تھی اور راج کی چہیتی بھاشا سمجھی جاتی تھی تب بھی چھوٹے سے لیکر بڑے تک سب اسے نہیں بول سکے۔ کچھ ہی لوگ تھے جو اس میں بات چیت کر سکتے تھے۔ تو راج کی بھاشا ہونے پر بھی جب یہ سب کی بھاشا نہ بن سکی تو اب کیا بن سکتی ہے۔ راج کے پانی ہی سے جو پودا نہ پھیک سکا وہ بھول میں کیا پھل پھول سکتا ہے۔ پھلواری کی دیکھ بھال اور اس کے ٹھیک ٹھاک ہونے پر بھی جو پھول نہ کھل سکے تو اب پت جھڑ میں کیا کھلیں گے جس مچھی بھون کو راج بھی نہ بنا سکا تو راج کی دھوپ ڈھل چکنے پر وہ کیا بنتا۔ جب دانت تھے جبھی جو چنے نہ چب سکے تو دانت ٹوٹنے پر وہ کیسے چبائے جا سکتے ہیں۔ وہ پرانے ڈھنگ کے سڈول موتی جو راج کا سنگار ہونے پر بھی مٹی میں اٹے رہے اب ٹوٹ پھوٹ پر ان کی جھاڑ پونچھ ہوئی بھی تو کیا۔

پھر یہ بھی دیکھیے آج جس نئے گھر کی نیو رکھی جارہی ہے یہ بنتا بھی رہا تو کب تک پورا بن سکے گا۔ بھاشا کا گھر اور گھروں کا سا تو نہیں جو کچھ دنوں میں بن بنا کے پورا ہو گیا اور اس میں گھر والے رہنے سہنے لگے۔ بھاشا کا گھر بنانا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے اور یہ ایک آدھ جنے کے بوتے کا روگ نہیں۔ اسکے بنانے کیلئے سب کا ایکا اور بڑی سوجھ بوجھ چاہیئے۔ یونہی سی آنکھ بچی اور کچھ سے کچھ ہو گیا۔ یونہی سی چوک ہوئی اور کی کرائی باتوں پر پانی پھر گیا۔

نہ ماننے اور اپنی بات کی پچ کرنے کی تو اور بات ہے۔ پر ٹھنڈے جی سے دیکھیے تو آپ کی اردو میں وہ سب باتیں پائی جارہی ہیں جو بڑھنے والی بڑی سے بڑی بھاشا میں ہونا چاہئیں اور جو سچ کہنا کوئی پاپ نہ ہو تو مجھے یہ کہنے دیجئے اردو میں کچھ پھیلاؤ کی ایسی ایسی باتیں چھپی ہوئی ہیں جو اوروں میں نہیں۔ ابھی اس کا چھٹپنا ہے۔ اس چھٹ پن ہی میں بھولی بھولی باتوں کے ساتھ ساتھ وہ چنچلی گہری گہری باتیں بھی اس میں ہیں جنہیں دیکھ کر اچنبھا ہوتا ہے۔ بڑے بوڑھوں نے سچ کہا ہے۔ بہو کے بول گھونگھٹ میں، ریوت کے پاؤں پالنے میں۔ اس پوت کے پاؤں پالنے میں دیکھیے تو جب ابھی سے اسکی او دھم کٹی باتیں جی موہے لیتی ہیں تو آگے کیا ہوگا۔ کسی بھاشا کے پھیلاؤ کے جانچنے کے اور بہت سے ڈھبوں میں سے ایک ڈھب یہ بھی ہے۔

جگ میں لوگوں کی چھٹائی بڑائی ایک سی نہیں ہوتی۔ سنسار میں یہی ہوتا رہا ہے۔ کوئی چھوٹا ہے تو کوئی بڑا۔ کوئی بہت چھوٹا ہے تو کوئی بہت بڑا۔ کوئی راجہ ہے تو کوئی مہاراجہ۔ کوئی اس کی چوکھٹ کا منگتا ہے اور کوئی اس منگتا کے گھر کا بھکاری۔ ایسے ہی ایسی بہت اونچ نیچ اور سینکڑوں اتار چڑھاؤ لوگوں میں پائے جاتے ہیں تو جس بھاشا میں ایسے اتار چڑھاؤ کے لئے الگ الگ بات کرنے کے ڈھب (Form of address) جتنے بہت ہوں اس بھاشا کا پھیلاؤ ماننا پڑیگا۔

عربی، فارسی، سنسکرت ان سب میں کسی میں بھی بات کرنے کے ڈھب بہت سے بہت نکلیں گے تو تین چار۔ انہیں کے سامنے اب اپنی اردو کا پھیلاؤ دیکھیے۔ گنیئے گا تو ان کی گنتی اردو میں سولہ، سترہ تک پہونچے گی اور پورا پورا سوچ بچار کیا جائے تو ایسے اور اور بول بھی نکل سکیں گے۔ انہیں دیکھ کے کہیں یہ نہ کہہ اٹھیے گا یہ بول ہیں کہاں کہاں کے۔ جہاں کے بھی ہوں اب یہ سب کے سب اردو ہی کے ہیں۔ اردو کوئی ایک بھاشا تو نہیں کہ میل مٹھائی ہے۔ اچھا اب انہیں دیکھیے۔

تو، تم، آپ، جناب، جناب من، جناب مکرم، جناب محترم، جناب والا، والاجناب، عالی جناب، سرکار، حضور، پیر و مرشد، جلالتمآب، اعلیحضرت، ملک معظم، شہنشاہ، جہاں پناہ۔ یہ موتی جن جن سیپیوں سے ملے ہیں کیا وہاں بھی انہیں ایک جگہ یوں ہی اکھٹا کر دیا گیا ہے جیسے ان بکھرے ہوئے موتیوں کی اردو نے چمکتی ہوئی لڑیاں بنا دیں۔ یہ آپ جب چاہیں دیکھ سکتے ہیں۔

تو جب ندی کا پاٹ اتنا چوڑا ہو چکا ہو جس کا اتھلا پن گہرے پن میں چھپتا جا رہا ہو۔ لاتے بانٹنے کی دھن میں۔ ان رات نئے نئے جتن کرنا اور ایک نئی ندی نکالنے کے سوچ بچار میں آتے دن کھکیڑیں اٹھانا کیا کوئی سمجھ والا اسے اچھا کہہ سکتا ہے۔

سوئی کو آپ ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے چھانتے ہیں۔ پر فارسی سے آپ کی یہ چڑ کیسی۔ فارسی اور سنسکرت یہ دونوں تو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ان دونوں کے کچھ بول لکھتا ہوں ان کا ملا جلا پن دیکھئے۔

فارسی اور سنسکرت کے ملتے جلتے بول

فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت
مہ	مہا	شاخ	شاکھا	ترس	تراس	کافور	کرپور
آستاں	ستھان	بیوہ	ودھوا	بیم	بھیم	بار	بھار
بروت	بھرودت	تپاس (عبادت)	تپسیا	کرباس	کپاس	جندال	چنڈال
نگرپچ	گمریچھ	انگارہ	انگار	موش	موشک	باش	باس
فرمان	پرمان	ریشم	رشمی	است	استی	داغ	داگھ
کف	کپھ	خشخاش	کھس کھس	بند	بندھ	ابرو	ابھرو
زانو	جانو	انگشت	انگشٹ	ادرک	آدرک	آتش	آتشن
اشتر	اشٹر	سرشت	سرشٹی	خسر	سوئسر	خر	کھر
سخت	شکٹ	بادام	باتام	دیر	دھیر	سریر	شریر
میغ	میگھ	نیلوفر	نیلوت پل	کان	کھان	گنج	گنج
گرم	گھرم	کام	کامنا	در	دوار	گرہ	گرہ
تن	تنو	ماست	مستو	یک	ایک	شام	شائم
برشگال	برشاگال	بارش	برشا	جنگل	جنگل	میش	میش
ارج	ارج	بوم	بھوم	شغال	سرگال	گاؤ	گئو
ماہ	ماس	روز	روچ	گندم	گودھوم	شیر	کشیر
جو	یو	پارینہ	پورانہ	چرم	چرم	خون	شون
پدر	پتر	مادر	ماتر	برادر	بھراتر	پور	پتر
دختر	دہتر	ششم	ششٹم	پنجم	پنچم	پُر	پورن
سرین	شرونی	بخش	بکش	هسته، ہستہ (گٹھلی)	استھی		

آپ نے ان بولوں کا ملا جلا ہونا تو دیکھ لیا۔ اب فارسی اور سنسکرت کے پرانے میل ملاپ کی کچھ اور کڑیاں بھی ساتھ ساتھ دیکھ لیجے۔ یوں تو انگریزی اور جرمن بھاشا کے بھی کہیں کہیں سے اکا دکا کچھ بول سنسکرت سے ملتے جلتے ہیں۔ پر جو بات پرانی فارسی اور سنسکرت کے بولوں کو آمنے سامنے رکھنے پر دکھائی دیتی ہے وہ اور کسی بھاشا میں نہیں۔ اسی سے تاڑنے والے نہ رہ سکے اور یہ کہہ اٹھے۔

ایران کے کیانی، زردشتی اور ہندوستان کے سپوت برہمن، چھتری ان سب کے پُرکھا اور بڑے بوڑھے ایک ہی گھرانے کے تھے جن میں کبھی بڑی

گا رہی جھنتی تھی۔ ایک ہی جگہ سب کا رہنا سہنا اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ پُرانی فارسی اور سنسکرت ایک ہی بھاشا تھی۔ جب آپس میں پھوٹ پڑنے سے یہ الگ ہوتے تو الگ الگ رہنے سے اس ایک بھاشا میں پہلے پہل تھوڑا بہت اُل بُل ہوتا گیا۔ ژند اوستا اور سنسکرت کے بول ایسے ایک سے ہیں جنہیں نہ جاننے والا سُنے تو ایک ہی سمجھے اور دونوں کو ایک ہی بتائے۔

پُرانی فارسی کو الگ الگ تین نمبروں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک ژند اوستا کی بھاشا، دوسرے پہلوی بھاشا جو ژند کے پیچھے بڑھی اور پھیلی۔ تیسرے دری بھاشا جو ساسانیوں کے راج میں پھلی پھولی۔ یہ دری بھاشا ژند اوستا سے بہت الگ اور محمود غزنوی کے راج کی بھاشا سے میل کھاتی ہے۔ ساسانی راج کی بھاشا اور غزنوی راج کی بھاشا جیسے یہ دونوں ملتی جلتی دکھائی دیتی ہیں۔ ایسی ہی ژند اوستا اور سنسکرت ہیں۔ یہی دیکھ کے یورپ کے کھوج لگانے والے یہ کہنے لگے "یوں ہی سی گھٹ بڑھ سے ویدک گیت اوستا میں اور اوستا کے بول ویدک کے سانچے میں ڈھل سکتے ہیں"۔

اوستا کا منترا اور ہوم، اور وید کا منتھرا اور سوما، دونوں کے دونوں ایک ہیں۔ ایسے ہی ژند اوستا کا منترا وہی ہے جو رگوید کا منترا، منتھرا ہے۔ رگوید کا ارمین دیوتا اور ژند اوستا کا ایرمین یہ دونوں بھی ایک ہی ہیں۔ ایران کی راجدھانی میں پہلے پہلے بن جن کا راج رہا وہ رگوید اور ژند اوستا میں ایک ہی سے ہیں۔ ژند اوستا کا یما خشائتا (جمشید) رگوید میں یما راجہ ہے۔ خشائتا مہاراجہ (بادشاہ) کو کہتے ہیں۔ اس لئے یما خشائتا اور یما راجہ یہ دونوں ایک ہی ہوئے۔ ژند اور رگوید میں کیکاؤس اور کاویہ اشانس دونوں کی باتیں ایسی ایک سی ہیں جن میں رتی بھر اُل بُل نہیں۔

بھینٹ دینے والے اور چڑھاوے چڑھانے والے کو ژند اوستا میں اتروا کہتے ہیں۔ وید میں اسی اتروا کو اتھروَن کہا گیا ہے۔ کوئی یہ بول ویدوں میں آنے والی باتوں کے جاننے والوں اور بڑے بھاری بھرکم سمجھ والوں کے لئے بولا گیا ہے۔ ایران میں بھی بڑے بڑے راج پاٹ والوں کے لئے یہی بول بولا جاتا تھا۔ جیسے کوی ہسرو (کیخسرو) کوی کوات (کیقباد)۔ ٹوہ لگانے والوں نے تو یہاں تک کھوج لگا لیا پوجا پاٹ میں جو بول مُنہ سے نکلتے تھے وہ ژند اور ویدوں میں کہیں کہیں یونہی سا اُل بُل ہو تو ہو، نہیں تو دونوں کے بول کے بول ایک ہی سے ہیں۔

وید میں سورج کو گھوڑے والا اور دوڑنے والا بتایا گیا ہے۔ اوستا میں بھی یہی ہے۔ سورج دیوتا کو وید میں اریامن کہا گیا ہے۔ یہاں وہاں دونوں جگہ اس دیوتا کے منتر بیاہ کی شُبھ گھڑی میں پڑھے جاتے تھے۔ انگیرا رشی کی پود سے آگ کی پوجا کا پرچار ہندو مانتے ہیں اوستا میں اسی آگ کی پوجا کا پرچار انگرو اور اس کے گھر والوں سے مانا گیا ہے۔ تریتا کو اوستا میں پہلا بید بتایا ہے۔ رگوید اور اتھروَن وید میں یہی تریتا تھریتا اتریتا ہے۔ جو دُکھوں سے اچھا کرنے والا دیوتا مانا گیا ہے۔ اگنی ماتا کو جیسے ہندو گھروں میں رکھتے تھے ایسے ہی ایرانی بھی۔ ایرانی آگ پوجنے والوں کے رات دن گانے کے منتر کو گاتا کہتے تھے۔ ہندوؤں میں، یہی گاتا گاتتری منتر کہلاتا ہے۔ جون سے برس ہندو اپنے لڑکوں کو جنیو پہناتے ایرانی بھی اسی برس پہناتے تھے۔

یہاں ندیوں پر جیسے اشنان کے میلے لگتے ہیں۔ ایسے ہی ایرانیوں میں آب ریز کے تہوار ہوا کرتے تھے۔ جاڑے آتے جیسے یہاں دِوالی کا تہوار ہوتا ہے۔ ایسے ہی ایران میں چراغاں کی دھوم دھام ہوا کرتی تھی۔ ہولی سے اگلے دن یہاں ہندو جو کیا کرتے ہیں یہی سب ایران میں کوسہ برنشیں کے تہوار میں کیا جاتا تھا۔ جس مہینے میں یہاں بسنت کا میلا لگتا ہے۔ ایران میں بھی اسی مہینے "جشنِ گل کوبی" منایا جاتا تھا۔ اِن باتوں سے یہی پتہ چلتا ہے۔ پہلے پہل یہاں کے آریہ جب ایرانیوں سے الگ ہوئے تو یہ اور ایرانی ایک ہی دھرم رکھتے تھے پُرانے لکھنے والوں میں سے کچھ نے ایران سے آریوں کے نکلنے کی باتیں یوں لکھی ہیں۔

ان میں کا ایک، جتھا دھرم کی باتوں میں کچھ کتر بیونت کر کے دھرم کو بگاڑنا چاہتا تھا۔ اس سے اک آگ بھڑک اٹھی اور دھرم کے بچاؤ کیلئے تلواریں ٹیک ٹیک کے سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ بڑا رن پڑا۔ لڑائی بھڑائی ہو چکنے پر آپس میں ایسی جھمّ جھٹا ہوئی جو پھر کبھی ایک جگہ مل جل کے نہ بیٹھ سکے۔ ہارا ہوا جتھا ٹھوکریں کھاتا ادھر آ نکلا اور یہیں رہ پڑا۔

۱۷۵۰ میں پُرانی دُھرانی لکھت کے کچھ ٹکڑے کسی پارسی کے ہاتھ سے نکل کے یورپ پہونچے۔ پھر پُرانی لکھت کے کھُدے ہوئے کئی ٹکڑے ڈھونڈنے والوں کو ایران سے ملے۔ ان سب کو دیکھ بھال اور جانچ پڑتال کے بال کی کھال نکالنے والوں نے سوچ بچار سے ان بکھری ہوئی کڑیوں کی لڑیاں بنا دیں۔

ان باتوں کا پھیلاؤ یہاں نہیں سما سکتا۔ اس لئے انہیں چھوڑتا ہوں۔ فارسی اور سنسکرت کے کبھی کے میل جول پر جو لکھا گیا وہ اتنا بھی نہیں جتنا اک بہتی ہوئی ندی سے چلّو بھر پانی۔ پھر بھی آپ نے یہ تو دیکھ ہی لیا ہوگا، فارسی اور سنسکرت ایک ہی پیڑ کی ڈالیاں، ایک ہی پھلواری کے پھول، ایک ہی سیپی

رہے موتی اور ایک ہی منہ کی دو آنکھیں ہیں۔ جب ان دونوں کا میل ملاپ آپ دیکھ چکے تو اب فارسی بدیشی بھاشا کہاں رہی۔ یہیں کی ہوئی اور جب یہیں کی ہوئی تو پھر اس کے بولوں کو ٹھکرانا کس لئے۔

فارسی اور سنسکرت کے نبٹیرے کے بعد پریم کی کہانی میں آریوں کے باہر سے آنے کی بات چھڑتی ہے تو یہیں وہ جھگڑا بھی چکا دینا چاہیئے جو مسلمانوں اور ہندوؤں میں چلا آرہا ہے۔ ان دونوں جتھوں میں چلی گئی اور جو نوک جھونک چلی آئی ہے اس میں سب سے بڑھکر ہندوؤں کی یہ ہنکار رہی ہے۔ ہند ہمارا دیس اور ہمارا ہی جنم بھوم ہے۔ دیس کا بھولا ہوا یہ بھی لیتے ہیں اور ہمیں اس میں جھومتے رہیں گے۔ پہلے سے ہمیں یہاں کے رہنے والے ہیں۔ باہر سے آنیوالے جو ساتھ رہے پڑے یہ کبھی یہاں کے نہیں بن سکتے۔ دیس کے اکلوتے سپوت ہمیں ہیں اور رہیں گے یہ دیس کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا۔

گونڈ، بھیل، لمباڑے یہ بات کہیں تو سچ ہے۔ سچ نہیں کوئی جھٹلا نہیں سکتا اور سچ بھی یہی۔ انہیں گونڈ، بھیل، لمباڑوں کی یہ جگہ جنم بھوم ہے اور انہیں کے ہم جیسے دیس والے ہیں جو ننگے دھڑنگے پہاڑوں، بنوں، جنگلوں میں مارے مارے پڑے پھر رہے ہیں۔ انہیں چھوڑ کے دیکھئے تو پھر کوئی دیس والا ہی نہیں رہتا۔ آگے پیچھے سب باہر ہی سے آئے رہنے ہیں۔

کسی بھی پرانی سے پرانی لکھت اٹھا کے کیوں نہ دیکھئے یہی پتا ملے گا آریہ پہلے سے یہاں کے رہنے والے نہیں، یہ باہر ہی سے آئے اور یہاں رہ پڑے۔ جیسے آریہ یہاں باہر سے آئے ایسے ہی مسلمان بھی آدھمکے۔ دونوں کے یہاں آنے میں کبھی بڑا بل تھا۔

آریہ جو آئے تو آتے ہی اپنی دھاک بٹھانے کے لئے انہوں نے یہاں کے بسنے والوں کا مار مار کے ایسا کچومر نکالا جو گنگلے دیس والے یہاں کا رہنا سہنا چھوڑ چھاڑ بھاگ بھوگ کر اندھیری گھاٹیوں میں منہ چھپا کے بیٹھ رہے اور جو نہ بھاگ سکے شودر کہلائے۔ یہ اور ان کی پود داس بن کے باہر والوں کی سیوا کرتی رہی۔ دھن دولت چھیننا، گھر کی جھاڑو پونچھ، کوڑا کرکٹ اٹھا اٹھا کے پھینکنا، چکیاں پیسنا، برتن باسن مانجھنا، لکڑیاں چیرنا، کاٹنے بھینسوں کو چرانا، گوبر اٹھانا، ملے تھاپنا۔ انہی دھندوں میں ان دیس والوں کے دن رات کٹتے تھے۔ یونہی سی بھول چوک پہ ان کی وہ درگت بنتی جیسے دھیان سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر یہ لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے مندروں میں آنا جانا کیسا۔ انکی پرچھائیں سے پوجا پاٹ کی ستھری جگہ پاپ کی کیچڑ میں لتھڑ جاتی تو ایسے ملیچھ وہاں کیسے پھٹک سکتے تھے۔

یہ دھرم دیکھ کے سنسار نے کروٹ لی۔ وہ ڈری ہوئی بھیڑیں جو آئے دن کی مار دھاڑ سے چپ چاپ رہتی تھیں اب سب کی سب ہل کے چیخ اٹھیں ایسے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر اب آنکھیں کھلیں اور انہیں پچکار پچکار کے روکا تھاما جا رہا ہے اور ان کے لبھے سے الگ نہ ہونے کے لئے سینکڑوں جتن کئے جا رہے ہیں اور یہ جو کچھ بھی کہا جا رہا ہے انکے لئے نہیں، یہ بھی سب اپنے ہی لئے ہے۔ ڈر یہ لگا ہوا ہے کہ کہیں یہ پورا ریوڑ کا ریوڑ کسی اور گلے میں جا کے نہ مل جائے اور ان کے ملنے سے وہ سر اپنی بہتات کے گھمنڈ پہ آگے بڑھ جائیں اور ہمیں چپ بیٹھنا پڑے۔

رہے مسلمان تو وہ یہاں ایسے آئے جیسے کوئی اپنے گھر میں آتا ہے کسی نے انہیں دیکھ کے ٹیڑھی ٹوپی کی تو راج نے ڈانٹ ڈپٹ دیا، نہیں تو یہاں والوں کو مسلمان اپنے راج کی جگمگاتی سبھا میں ساتھ بٹھاتے رہے۔ بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں۔ ان میں اکبر کا پوچھنا ہی کیا یہ تو اوتار ہی مان لیا گیا۔ اوروں کو بھی ہندو اچھا ہی جانتے ہیں برا نہیں کہتے۔ اس لئے ان کی باتیں چھیڑنا نہیں چاہتا۔ ان سب میں سے ایک اورنگزیب ہی ایسا ہے جسے دھرم کا کٹر، بس کی گانٹھ، ہندو دکھ کا دکھ دینے والا، اور نجانے کیا کیا اسے ہندو کہا کرتے ہیں۔

یہی اورنگ زیب جو ہندوؤں کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جب دکھن کا گورنر تھا تو ہندوؤں کو آگے بڑھانے، انہیں جنجال سے چھڑانے کیلئے اس نے کیا کیا کیا۔ یہ کہانی سر جدوناتھ سرکار کے منہ سے سننے کی ہے۔ دھرم کا کٹر اورنگ زیب، شاہجہاں کو ہندوؤں کے لئے ایسے ایسے ڈھب سے لکھتا تھا جو کبھی کبھی شاہجہاں کی تیوری پر بل پڑ جاتے تھے۔ اس پر بھی اس نے ہندوؤں کا ساتھ دینا نہ چھوڑا اور انکی جو باتیں اسے سچی دکھائی دیں شاہجہاں کے سامنے ان کے کہنے سے نہ چوکتا تھا۔

دیوگڈھ کا راجہ کیسری سنگھ، راؤ کرن راجپوت، ہیش داس راٹھور، نرسنگھ داس، حیات سنگھ، سارنگدھر، اندرمن، یہ اور ایسے ہی اور ہندوؤں کو سکھ چین سے بٹھانے کے لئے اورنگزیب اپنے سے جتن کرتا رہا۔

یہ باتیں تو جب کی ہیں جب یہ کنور تھا اور اس نے اپنے راج میں ہندوؤں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا انہیں کیسی کیسی جگہیں دیں۔ انکی بڑی سے بڑی بھول اور بھاری سے بھاری چوک کو بھی کیسا ٹالا۔ اس کے لئے پیچھے ہٹ کے یہ دیکھنا چاہیئے۔ کھجوا کی لڑائی میں مہاراجہ جسونت سنگھ نے دارا شکوہ سے مل کے

اورنگ زیب کو نیچا دکھانا چاہا۔ ویسے ہی اجمیر کی لڑائی میں کنور رام سنگھ سے جو بڑی بھاری چوک ہوئی۔ کوئی اور راج ہوتا تو انہیں پاپی ٹھہرا کے ان کے ایسے کرتوت سے نہ جانے ان کی کیا درگت بنا دیتا۔ پر اورنگ زیب نے نہ جب اور نہ لڑائیاں جیتنے پر کبھی ان سے کبھی کچھ پوچھ گچھ نہ کی اور جو کچھ ہو چکا تھا اسے ایسا کر دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

دھیراج راجہ جے سنگھ، بیجے سنگھ، راجہ دیبی سنگھ بندیلا، دیپ سنگھ بندیلا، رتن سنگھ راٹھور، راجہ راج روپ، رائے رایاں راجہ رگھوناتھ داس، رام سنگھ ہاڈا، راجہ رام سنگھ کچھواہا، رگھوناتھ سنگھ سیسودیہ۔ یہ اور ایسے اور بہت سے نکلیں گے جو اورنگ زیب ہی کی چھایا سے پہلے پھولے اور پروان چڑھے۔ ان باتوں کے پھیلاؤ کے لئے نہ یہ جگہ ہے اور نہ یہ ڈھائی بولوں میں سما سکتی ہیں۔

تو آپ نے دیکھا کہ بھارت آنے میں مسلمان اور ہندو دونوں کے دونوں ایک سے ہیں۔ بل اتنا ہی ہے۔ آریوں نے پہلے آ کے سندھ میں چھاؤنی چھائی اور مسلمان آریوں کے پیچھے یہاں آئے۔ آگے پیچھے آنے کا اول بل ایسا نہیں ہو کہ تاج پہلے آنے والے جس جگہ آ کے ٹھہر گئے ہیں اسے ہم بھوم سمجھیں اور اپنے پیچھے آنیوالوں کو باہر والا ہی سمجھتے رہیں۔

یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے کسی جگہ آگے پیچھے دو جتھے باہر سے آ کے ٹھہریں اور پھر وہیں رہ پڑیں۔ ان دونوں میں سے پہلے آنے والا جتھا اپنے پیچھے آنیوالوں سے یہی کہتا ہے یہ جگہ ہماری ہی ہے۔ تم ساتھ رہنے سہنے پر بھی کبھی یہاں کے نہیں بن سکتے اور نہ یہ جگہ کبھی تمہاری ہو سکتی ہے تو اس اینٹ اور بٹ کرنے کو سمجھ والے بالک ہٹ کہیں گے۔ بات کا بتنگڑ بنانا کوئی اچھی بات نہیں۔ مسلمان، ہندو، جو بھی یہاں آ آ کے رہ پڑے ہیں اب ان سب کا جنم بھوم ہے اور رہے گا۔ منہ سے کہہ دینے سے یہ کسی ایک جتھے کا دیس کبھی نہیں بن سکتا

دیس کے باہر اب بھی ایک چھوڑ کئی کئی راجدھانیاں مسلمانوں کی ہیں۔ پر ان میں سے کسی میں بھی یہاں کے مسلمانوں کے لئے جڑ ٹیکنے کی بھی جگہ نہیں۔ جیسے ہندوؤں کا باہر کوئی ٹھکانا نہیں ہے ایسے ہی یہاں کے مسلمان بھی ہیں۔ جن کا رہنا سہنا اٹھنا بیٹھنا مرنا جینا جو ہے وہ سب یہیں تو پھر اب یہ باہر والے کیسے ہو سکتے ہیں۔

یہ سچ ہے مسلمان ہندوؤں سے تھوڑے ہیں اور بہت تھوڑے۔ پر جب ان کے دکھ سکھ، مرنے جینے کی بات بیچ میں آ پڑے تو پھر تھوڑے بھی تھوڑے نہیں رہتے۔ آٹھ کروڑ کا ٹڈی دل کبھی ایسا نہ بن سکے گا جس کا ہونا نہ ہونا ایک سا ہو کے رہ جائے۔ سانس لینے والا اتنا بڑا جتھا مٹی کا تھوا بنے سے رہا۔ اس میں کھلونوں کی سی من مانی توڑ پھوڑ کبھی نہیں ہو سکتی۔ اس کا یہاں رہنا سہنا کیچڑ کا سا دھبہ نہیں ہے جسے جب چاہا دو ڈول کے پانی سے دھو دھلا کے چھڑا ڈالا۔

مہاتما جی۔ پرماتما کے لئے دیس والوں سے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اڑنا، ہٹ کرنا چھوڑئیے۔ تیری میری چھوٹی بڑی موٹی ایسی بے سری الجھی ہوئی ڈور کب تک۔

دیکھئے اسی آپس کی جھک جھک پٹک پٹک تن تھن سے دیس اب تک کتنے ٹوٹے میں رہا۔ آپ میں بھلائی اچھائی کی جو جو باتیں ہیں انہیں بھگوان کی دیا سمجھ کے آگے بڑھئے اور جگت گرو بنئے۔ یہ ایک جتھے کا لیڈر بنا کیا آپ کو تو پورے دیس کا گرو بننا چاہئے۔ سچ ہے یہ بات ایسی نہیں کہ جس میں نہ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور بیٹھے بٹھائے سب کچھ ہو جائے۔ پر آپ تو پاؤں توڑ کے بیٹھنا نہیں چاہتے آپ تو بپتا مار نکلے ہیں۔ کٹھن سے کٹھن باتیں ہم جیسوں کے ست ہٹا جانے کے لئے بہت ہی پر آپ کے سامنے تو یہ کچھ بھی نہیں۔ آپ تو دیس ہی کے سدھارنے کی دھن میں رہے اور ہیں۔ تو دیس والوں کو بھی ایسا بنا دیجئے جو آپ کی دیکھا دیکھی یہ سب بھی دیس کے ہمدرد بن جائیں اور جو یہ ابتک آگ لگا کے پانی کو دوڑتے رہے ہیں ایسی اندھا دھند دوڑ دھوپ سے اکتا کے آپ کے ساتھ ساتھ اس چوڑی سڑک پر چلنے لگیں جو پریم نگر پہنچا دیتی ہے۔ ان کے من کی انگیٹھیوں میں پریم کی دبی ہوئی چنگاریوں کو کرید کرید کر منتروں کے پنکھے سے دھونک کے ایسی بھڑکتی ہوئی آگ بنا دیجئے جو بھول چوک کے پانی کے چھینٹوں سے کبھی نہ بجھے اور نہ کبھی بجھ سکے۔

مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی، یہودی، پارسی، پرماتما نے ان سبھوں کو ایک سا ڈیل ڈول، ہاتھ، پاؤں، آنکھیں، ناک کان دئے ہیں۔ جیسے اس نے یہ سب کو ایک سا رکھنا چاہا تو کیا بڑی بات تھی جو سارے جگ میں ایک ہی دھرم کا ڈنکا بجتا۔ ایک ہی دھرم کے ماننے والے سب مل جل کے ایک ہی ڈھب پر اس کی پوجا کرتے ہیں پر بھگوان نے ایسا نہیں کیا۔ کسی نے اسے ایک ڈھب پر پوجا، دوسرے نے اس کے پوجنے کا اور ڈھنگ نکالا، تیسرے نے کسی اور ڈھب سے اس سے لو لگائی۔ سب دھرموں کو دیکھئے تو یہ سب کے سب چھوٹی بڑی الگ الگ سڑکیں ہیں جو ہر ایک کے پاس پہنچانے کے لئے

ہوئی ہیں جس نے راج کا پھیلاؤ بہوتے بڑے لاکھوں کروڑوں ان گنت سنساروں سے بھی آگے بجائے کہاں تک یوں ہی گھیرے ہوتے ہے۔ ایسے سنسار اُسے نہ ناپیں اور اس کے پوجنے کا دھاگا سب مل کر توڑ تاڑ کے رکھدیں جب بھی اس کے امٹ راج میں سے ایک رتی بھی کبھی گھٹ نہیں سکتی۔ ایسے ہی انہیں جگمگاتے سنساروں کے رہنے والے کیسی ہی بڑھ چڑھ کے اس کی پوجا پاٹ کیوں نہ کریں پر اس سے اسکا راج رتی بھر بڑھ نہیں سکتا۔

دھرموں کے ماننے نہ ماننے کی بھلائی بُرائی جو بھی ہے وہ دھرم والوں ہی کے لئے ہے۔ وہ ماں باپ سے بڑھ کے پیار کرنے والا پرماتما ان باتوں سے ایسا الگ تھلگ ہے جو یہاں کے دکھ سکھ کی دھوپ چھاؤں اس پر پڑ نہیں سکتی۔ اس کے نہ مٹنے والے راج کی چوکھٹ اتنی اونچی ہے جو یہ سنسار اپنے پہاڑوں کے ہاتھوں سے بھی اُسے چھو نہیں سکتے ہمارے دھیان کا پھیلاؤ اور پھرتی جس کے سامنے بجلی کا چھلاوا بھی پانی بھرتا ہے اور جو گھڑی بھر میں اونچی سے اونچی جگہ کو روند کے اس کی اونچائی ناپ توپ کے رکھ دیتا ہے وہاں تک پہونچنے میں یہ بھی اپاہج ہے۔ رات دن سے گھرے ہوتے سنسار اس کے راج کے پھیلاؤ کو کبھی نہیں پا سکتے۔

جب سب کے سب اسی ایک کو اپنے اپنے من کی ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں۔ اپنے اپنے ڈھنگ پر اسی کے آگے چڑھاوے چڑھا رہے ہیں اور اسی کے دھیان میں دھونی رمائے بیٹھے ہیں۔ تو الگ الگ دھرم ہونے پر دھرم کیلئے آپس میں یہ اتنے ترنے کرنا کیسا۔ دھرم الگ الگ ہیں ہوا کریں اس سے کیا ہوتا ہے۔ جو دھرم ہے وہ اپنی جگہ اچھا۔ کسی کو بھول کر بھی یہ نہ چاہیئے جو اپنے دھرم کو اچھا اور دوسرے دھرم کو بُرا کہے۔ بُرا کہنا کس لئے۔ ایک کے دھرم کی پوچھ گچھ دوسرے سے تو ہونے سے رہی۔ جو جس کا دھرم ہے اس کا بوجھ اسی کے کاندھوں پر ہے۔ اس کے پیچھے آئے دن آپس میں لڑنا جھگڑنا بڑی بُری بات ہے۔

مسلمان اور ہندوؤں کا ایکدن دو دن کا تو ساتھ نہیں۔ پہلے بھی یہی مسلمان تھے اور یہی ہندو، یہی مسجدیں تھیں اور یہی مندر، یہی دکھ کا اندھیرا تھا اور یہی سکھ کا اجالا۔ یہی سنہرے دن تھے اور یہی روپہلی راتیں۔ باجا گاجا مسجدوں کے سامنے بھی بجتا تھا اور مندروں کے بھی۔ اس پر نہ کبھی مسجد والے بھڑکے اور نہ کبھی مندر کے پجاری بڑبڑائے۔ آپس میں مل جل کے رہتے اور جس سے جتنی جان پہچان ہو جاتی مرتے مرتے اُسے نباہتے اور اس میں کچھ بل نہ آنے دیتے تھے۔ بُڈھے بڑھوں سے ہندو مسلمانوں کے میل ملاپ کی جو کہانیاں کان سن چکے ہیں وہ اب ساری کی ساری من گھڑت اور ڈھل دکھائی دینے لگیں۔

آج کل کے ہندو مسلمان تو ایسے ہو گئے جیسے توے سے روٹی الٹ جاتی ہے۔ بات بات میں آپے سے باہر۔ یونہی سی کچھ بات ہوئی اور بھڑک اٹھے پھر کیا تھا۔ چیخم چاخ بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھی جو آپس میں گتھ گئے۔ سمجھ والے اجڈوں کی گتھم گتھا الگ تھلگ ہو کے دیکھنے لگے۔ آپس کی لاگ ڈانٹ کی آگ بجھانے کا دھیان کسی کو بھی نہیں۔

یہ سنتے سنتے کان جھنانے لگے۔ آج یہاں جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا، کل وہاں لاٹھی چلی۔ پرسوں اُس جگہ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ سینکڑوں کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے، لہولہان ہوئے، بیسیوں مارے گئے۔ جب لڑتے لڑتے دونوں تھک کے ہانپنے لگے تو راج نے پکڑ دھکڑ کے جیل میں ڈال کے بیچ بچاؤ کر دیا بیٹھے بٹھائے الگ۔ چھوٹنے کی دوڑ دھوپ میں جو کچھ انٹی میں تھا وہ ہاتھ سے الگ نکل گیا۔ جن دھندوں سے چار پیسے ہاتھ میں آرہے تھے وہ دھندے الگ چھٹے اور گانٹھ میں ایک جھنجی کوڑی بھی نہ رہی۔ بیٹھے بٹھائے جو اکڑ تکڑ کا دھیان آگیا تھا اس کا یہ پھل مل گیا۔ چلئے چھٹی ہوئی۔

یہ آئے دن کی جھڑپ، بات بات میں ٹرٹر مس، گھڑی گھڑی کا ٹرا پن۔ دیس والوں کی ایسی سمجھ پر تیل مائی اتار رہے اور جیسے بنے انہیں نچے پن سے روکئے۔ یہ سمجھ کے بیٹھے کانوں کے کچے آپس میں گتے چلے جاتے ہیں اور ان کی جھپٹ میں دیس کا ستیاناس ہوتا جا رہا ہے آپس کی نوچ کھسوٹ اور لوٹم لاٹ نے دیس کے لنگوٹی بندھوا دی۔ مہاتماجی۔ آپکے سامنے ایسی باتیں کرنا سورج کو دیا دکھانا ہے۔ پر یہ بھی دیکھا گیا ہے کبھی بڑے بڑے سمجھ والوں سے بھی سامنے کی باتیں دیکھنے سے رہ جاتی ہیں۔

اب پھر اسی بھاشا کو لیجے۔ کٹھن باتیں چھوڑ چھاڑ کے نئی بھاشا بنانے کے جنجال میں پھنسنا اور منجھی منجھائی بھاشا کو ٹھکرا کے منہ پھیر لینا یہ بھی نئی بات ہے۔ میں مانتا ہوں دیس کے کچھ ٹکڑوں کی بولیاں ایسی الگ الگ ہیں جو ایک دوسرے سے نہیں ملتیں اور ایک ٹکڑے کی بولی بولنے والا دوسرے کی بولی نہیں سمجھتا پر یہ سب کی سب بولیاں ایسی چھوٹی چھوٹی سی ہیں جو دیس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں ہی میں بولی جاتی ہیں باہر انہیں کوئی جانتا بھی نہیں۔ ان سب میں اکیلی اردو ہی ایسی ہے جو سارے دیس میں تھوڑی بہت بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ دیس کی پوری بولیوں میں سے اک اردو ہی کا ایسا بھید اؤ ہے جو ٹھیک ٹھیک پورے دیس کی بھاشا بننے کا بل بوتا رکھتا ہے۔

کسی بھاشا میں باہر والی بولیوں کے بولوں کی بہتات سی بہتات جتنی بھی ہو پرکھنے والے اُسے تو بھاشا کی بڑھوتری سمجھتے ہیں اور آپ بجائے کیا چاہتے ہیں جو

عربی، فارسی بول اُردو میں دیکھ نہیں سکتے اور یہ بھی نہیں بتاتے یہ بول کیوں آپ کو بُرے لگتے ہیں۔ کیا آپ کوئی بھی ایسی آگے بڑھنے والی بھاشا دکھا سکیں گے جو باہر کی بولیوں کو ٹھکرا کے اپنے ہی گِنے چُنے ڈھائی بول لئے بیٹھی رہی ہو۔ اور انہیں کے سہارے آگے بڑھ کے یہ ٹٹ پونجیا بھاشا ایسی پھلی پھولی ہو جو دوسری بڑھنے اور پھیلنے والی بولیوں کے ٹک بھگ کہی جاسکے۔ عربی فارسی بولوں کے نکال ڈالنے سے اُردو کی بڑی لمبی چوڑی اکنائی گھٹ گھٹا کے بالشت بھر رہ جائے گی۔ یہ سچ ہے ہندوؤں کو چوڑی چکلی اکنائیاں اچھی نہیں لگتیں اور اس لئے وہ اپنے اپنے گھر کی اکنائی چھوٹی چھوٹی سی رکھا کرتے ہیں۔ پر یہ گھر اور بھاشا کا گھر دونوں کے دونوں تو ایک سے نہیں ہوسکتے۔ جس بھاشا کی بڑھوتری دن دونی رات چوگنی ہو اور جس کی دوڑ پھیلاؤ سے پھیلاؤ کو بھی روندتی چلی جا رہی ہو اُسے آپ ٹھکرانا چاہتے ہیں۔ اسے تو کلیجے سے لگائے رکھئے۔

آپ سے یہ تو کوئی نہیں کہتا۔ عربی فارسی کے نئے نئے من من بھر کے بھاری سے بھاری بول اُردو میں آپ ٹھونستے چلے جائیں۔ جو یہ کہے اُسے سٹری سمجھئے۔ پر ان دونوں بولیوں کے وہ بول جنہیں پڑھے لکھے تو پڑھے لکھے، اَن پڑھ گاؤں والے اور گنوار تک دن رات بولتے جاتے ہیں۔ انہیں اُردو میں سے نکالنے کے جتن کرنا تو ٹھیک نہیں۔

دیکھئے ہل جوتنے والے جو پَو پھٹتے ہی تاروں کی چھاؤں میں اپنے اپنے دھندوں میں لگے تو سورج ڈوبنے پر ستانے کے لئے ٹھہرتے ہیں۔ وہ بھاشا واشا کے کھٹراگ کو کیا جانیں پر یہ اُردو کا پھیلاؤ دیکھنے کا ہے جو اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے عربی، فارسی کے سینکڑوں بگڑے ہوئے بول کے بول بے جھجک بولتے جاتے ہیں۔

جب آپ گاؤں گاؤں اچھوتوں کیلئے پھر رہے تھے تو یہ سب کچھ آپ سن چکے ہونگے جو اَب آپکو سنایا جا رہا ہے۔

عربی فارسی کے وہ بگڑے ہوئے بول جو گاؤں والے اور گنوار رات دن بولتے ہیں

مرجی (مرضی)، ناراج (ناراض)، کھپا (خفا)، منجور (منظور)، تکدیر (تقدیر)، جمین (زمین)، سپھت (صفت)، منائی (منع)، کبالہ (قبالہ)، کھزانہ (خزانہ)، تنکھا (تنخواہ)، مجوری (مزدوری)، کھون (خون)، بے دکھلی (بے دخلی)، دستاویج (دستاویز)، کاگج (کاغذ)، کلم (قلم)، کاجی (قاضی)، راجی (راضی)، کھتا (خطا)، جلم (ظلم)، کابل (قابل)، کبول (قبول)، جکام (زکام)، نجلا (نزلہ)، کم بھکت (کمبخت)، ہاجر (حاضر)، کھالی (خالی)، کسور (قصور)، سجا (سزا)، بکھار (بخار)، رجا (رضا)، پھیج محمد (فیض محمد)، کھیرات (خیرات)، کیامت (قیامت)، اجاب (عذاب)، ناجک (نازک)، سورت (شہرت)، زلدی (جلدی)، تراترا (طرح طرح)، میجود (موجود)، مالوم (معلوم)، نغد (نقد)، مالا (معاملہ)، گلت (غلط)، مندرسا (مدرسہ)، نانت (لعنت)، رونک (رونق)، مولی صاب (مولوی صاحب)، ہمیسہ (ہمیشہ)، کم جور (کمزور)، کھسامد (خوشامد)، ریسم (ریشم)، جمانت (ضمانت)، جامن (ضامن)، مکدما (مقدمہ)، کھارج (خارج)، دسکھت (دستخط)، کواب (کباب)، سادی (شادی)

یہ کچھ بول تو یونہی لکھدئے ہیں۔ سوچ بچار کیا جائے تو اور ایسے سینکڑوں بول کے بول نکل آئیں گے۔ عربی، فارسی کے بگڑے ہوئے کچھ بول ابھی آپنے سنے اب انہی بولیوں کے وہ بول بھی دیکھ لیجئے جنہیں اَن پڑھ سے اَن پڑھ گاؤں والے اور گنوار جوں کا توں بولتے ہیں۔

جیسے۔ مکان، دُکان، میدان، جان، ران، تکیہ، لتہ، صورت، بدن، گردن، سینہ، پلک، کمر، آدمی، عورت، بچہ، اگر، مگر، کتاب، سردی، گرمی، بادام، ادرک، کام، نام، کمان، تیر، لگام، مال، عینک، گلاب، بہار۔

میرا کہنا یہی ہے۔ یہ اور ایسے اور اور عربی، فارسی کے وہ بول جو اُردو میں پورے سما چکے ہیں۔ جنہیں چھوٹے بڑے سب بولتے ہیں انہیں ہاتھ نہ لگایئے۔ ایسے ہی ہندی کے وہ گھلے ملے بول جو سب کی بات چیت میں چلے آرہے ہیں ان سب کو ملا جلا کے اُردو کو اور آگے بڑھانے کے نئے نئے ڈھب نکالئے۔ ہند جیسے ہندو مسلمان سب کا جنم بھوم ہے ایسے ہی اُردو بھی ان میں سے کسی ایک کی بھاشا نہیں۔ یہ بھی ان سب کی بھاشا ہے۔ سب کی بھاشا اس لئے کہہ رہا ہوں، اُردو کے آگے بڑھنے اور پنپنے کیلئے مسلمان اور ہندو دونوں ساتھ ساتھ ابتک اپنے اپنے سے جتن کرتے رہے۔

یہ کہہ چکا ہوں، ہند کے چپے چپے کی چھوٹی چھوٹی بولیاں ایسی بہت سی ہیں جو دیس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں الگ الگ بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ ان میں دیکھئے اور ڈھونڈیئے تو عربی، فارسی بول چھپے چھپائے ملیں گے۔ بس اتنا ہی ہوگا کسی میں بدیسی بولیوں کے بول بہت ہونگے۔ کسی میں تھوڑے اور کسی میں بہت تھوڑے۔

دیس کی سب بولیوں کے گنتی ہی کے کچھ کچھ بول یہاں لکھے جائیں تو یہ لکھت پڑھ کے نجانے کہاں تک پہونچے۔ اس لئے وہ سب تو نہیں اک مرہٹی بھاشا کے کچھ بول لکھتا ہوں۔

عربی فارسی بولوں کی ریل پیل مرہٹی میں

ایمن (آمین)، اکل (عقل)، اکتیار (اختیار)، انکسار (انکسار)، آکھر (آخر)، اکسیر (اکسیر)، اکہ (آخر)، ایمانی (صفائی)، عجب، اجمت (عظمت)، آجاس (احساس)، آزمائش، آجار (آزار)، اجاری (آزاری)، اتر (عطر)، عداوت،
عداوت، امانت (امانت)، ایمکہ، ابجرہ، ابھوا (ہوا)، اباد (آباد)، ابیاری، امباری، ابھر (ابر)، عیب، ارکھ (عرق)، ارج (عرض)، الاہیدہ (علیحدہ)، اول (اوّل)، آتسباجی
(آتشبازی)، آپ گرجی (خود غرضی)، آمیچ (آمیز)، اواج (آواز)، شک، عشق، آشک (عاشق)، اشک باج (عشق باز)، اکرار (اقرار)، اجت (عزت)، اکلاس (اخلاص)، ایجا (ایذا)،
اتبار (اعتبار)، اتلا (اطلاع)، انساپھ (انصاف)، انام (انعام)، ارادہ، عنایت، امان (ایمان)، عادت، عالم، انگلستان (انگلستانہ)، آلیسان (عالیشان)، عبرت، الاکھا (علاقہ)،
علت، علاج، عمر، اداب، امین، امیدوار، اولاد۔

مرہٹی کی بات پہ بات پہ ایک بھولی بسری بات دھیان میں آئی۔ بہت دن ہوئے جو مرہٹی کے ایک نامی کھلاڑی سے مٹ بھیڑ ہوئی۔ اکلا دوکلا جو تھا وہ مرہٹی اور انگریزی اور کوئی بھاشا جانتا نہ تھا۔ کچھ لوگ بیس میں کسی بھاشا کے پھیلاؤ پر کچھ کہہ سن رہے تھے۔ مرہٹی کا نیا کھلاڑی جو سب الگ بیٹھا تھا یہ بات چیت سن کے نہ رہ سکا اور وہیں سے بول اٹھا۔ ہماری بھاشا کا سب بھید بیس کی کسی بھاشا میں نہیں۔ چار دن سے اردو بڑھ چلی ہے یہ بھی ہماری بھاشا کے بل پر۔ مرہٹی نے اردو کی کیسی سیوا کی ہے کہ سیکڑوں بول اردو میں آگئے جنہیں اردو والے اپنے یہاں کا سمجھتے ہیں۔ وہ بول کون کون سے ہیں اس پوچھنے پر وہ مسکرائے کہنے لگا: ایک دو، سینکڑوں! یہ کہہ کے اوپر لکھے ہوئے بولوں میں سے کئی بول اس نے سنائے۔ بس پرجاننے والے ہنس پڑے اور وہ ہکا بکا ہوئے ایک ایک کا منہ دیکھنے لگا۔ اس ہنسی کی کونسی بات ہے ایسی پہنسے اچنبھا ہوا۔ مظفر پور میں ہندی ساہتیہ سمیلن کے ایک بڑے بدھاری جھم کم ہی نے جو وہاں پڑھ کے سنایا۔ اس کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا یہاں لکھتا ہوں۔

"ہماری ہندی کے کویوں کی متی گتی بالکل نرالی ہے وہ کبتا کی گاڑی کے دھرے اور پہیے بھی بدل رہے ہیں۔ اپنے اد بھت جھگڑے میں پیچھے کی اور ملی ہتو جوت کر گنتو یتہ پر پہونچایا جاتے ہیں۔ یہ اتنی نہیں منو کہتا کا لکش ہے۔ اس کبتا کا سدھار نہیں سنگھار ہو رہا ہے ۔"

کیا ایسی ہی ان گھڑ بھاشا سارے دیس کی بھاشا بن سکتی ہے۔ کیا ایسی ہی انوکھی بولی پورے دیس میں پھیل سکتی ہے۔ کیا ایسی ہی لکھت کے پرچار پر آپ تلے ہوتے ہیں۔ کیا یہی سب جنم بھوم والوں کی اکیلی بھاشا بن سکے گی اور کیا اسے ہی سب چھوٹے بڑے بول سکیں گے۔ دیکھئے تو یہ کیسا دھوم مچا ہوا ہے۔ عربی فارسی کے گھلے ملے بول جو سب بولتے چالتے ہیں۔ جان جان کے انہیں چھوڑ چھاڑ اور چھانٹ چھانٹ کر توپیں، متی گتی، کبتا، ادبھت، گنتو یتہ، منوکہتا، لکش۔ ان بھولے بسرے بولوں کو ٹھونسا گیا ہے۔ باہر والی بولیوں سے کترا کے اور بچ بچا کے نکلنے پر بھی بدیسی بولوں سے یہ لکھت نہ بچ سکی اور گنتی ہی کے سہی پر کئی بول اس میں آہی گئے۔ کچھ فلم بنانے والی کمپنیاں بھی اپنے یہاں کے ڈراموں میں ایسی ہی ٹھونس ٹھانس کر رہی ہیں۔ یہ جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے دیس کے ماتھے کے لئے کلنک کا ٹیکا ہے۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اس انیچ کو دیکھ کے نہ رہ سکے اور انہیں یہ کہنا ہی پڑا۔

"زبان کیونکر کل ملک کی زبان ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے اور کوئی مذاق سلیم اور اردو میں شعور رکھنے والا اردو کو چھوڑ کر اسے کس طرح اختیار کر سکتا ہے۔"

فارسی کے رسیا بھیم سین کانستھ، پٹن کے ایسری داس، پٹیالے کے سبحان رائے، جگجیون داس، کیول رام اگروال، منشی بھوپٹ رائے، منشی چندر بھان، اودے راج، منشی ٹیکچند بہار، یہ اور ایسے اور اور ہندوؤں کی فارسی لکھتیں دیکھنے کو آج نہیں کہا جاتا ہے وہ نئے یگ لئے اردو لکھنے والے ہندو جنہوں نے اردو کی ایسی سیوا کی جس پر اتنا لکھا جاتا ہے جو لکھتے لکھتے ایک بڑا ڈھیر لگ جائے۔ انکی لکھتوں کو تو دیکھ لیجے۔

پنڈت دیا شنکر نسیم۔ پنڈت بینڈولال زار، پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت نوبت رائے نظر، پنڈت بشن نرائن در ابر، پنڈت برج نرائن چکبست، منشی درگا سہائے سرور، منشی پریم چند۔ سر تیج بہادر سپرو، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، پنڈت امرناتھ جہا، پنڈت گنگا ناتھ جھا، پنڈت آنند نرائن ملا، پنڈت کشن پرشاد کول۔ پنڈت منوہر لال زتشی۔ مسٹر رگھوپتی سہائے فراق، مسٹر اقبال ورما سحر، مسٹر رام پرشاد کھوسلا ناشاد، مسٹر کرشن سہائے۔ مسٹر تلوک چند محروم، مہاراج بہادر برق، چودھری جگت موہن لال رواں، پروفیسر سری رام شرما، مسٹر رام دیال سکسینہ، ٹھاکر ججے ار رائے، لالہ روشن لال، مسٹر رام سرن نگم، مسٹر سری نرائن نگم، مسٹر دیا نرائن نگم۔ مسٹر سورج نرائن مہر، مسٹر سدرشن، مسٹر شیام موہن لال جگر۔ یہ سب کے سب ہندو دھرم رکھنے والے ہندو ہیں پر بھی ان کی لکھتوں کا ڈھیر ایسا ہی جس میں کویوں، متی گتی، کبتا، ادبھت، گنتو یتہ، منو کہتا، لکش، سمپتی، شکتی، رکچھا، نویدن، آشا، دشا، سمبندھ، کلاہل، دیاکرن، ہتوں۔ ایسے ایسے بولوں کا پتا بھی نہیں اور ڈھونڈے سے بھی ایسے کٹھ بول ان میں کہیں نہ مل سکیں گے۔

ان ہندوؤں کی لکھت کا وہی ڈھنگ ہے جو مسلمانوں کا۔ دونوں میں بال برابر بل نہیں۔ اور بل ہو کیسے جب ہندو مسلمانوں نے مل جل کے ابتک اردو

کو یہاں تک سدھارا جو راج کے بل پر بڑھنے والی بولیوں کے لگ بھگ دکھائی دینے لگی۔ بہنک پہلا سا نہیں۔ ہی اُردو کے بولنے جاننے میں ہی تھوڑا بہت جو بھی ہے، ہے تو ایکا۔ یہی ایکا آگے بڑھکر جب مت سیدھی ہو گی تو پورا بھی ہو سکتا ہے اور جو یہ تھوڑا بھی نہ رہا تو پھر رہا کیا۔ اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ۔

ہندوستان کا گہنا پاتا جو بھی تھا ایک ایک کر کے سب کا سب کب کا لٹ لٹا چکا اور آئے دن کی نوچ کھسوٹ اور لوٹم لاٹ نے ایک چھلا بھی نہ چھوڑا۔ لے دے کے یہی اُردو ہندو مسلمانوں کے ملاپ کی ایک پرانی انگوٹھی دیس کے ہاتھ میں پڑی رہ گئی تھی۔ آج کل اس کی بھی چھیننا جھپٹی ہو رہی ہے اور دیس کی اُنگلی سے اُسے بھی اتارنے کے جتن کئے جا رہے ہیں۔ یہ پرانی انگوٹھی بھی چھن گئی تو پھر کیا ہوگا۔ یہ آپ سوچئے۔

اُردو کو مسلمانوں کے دھرم کی بھاشا آپ کہہ چکے ہیں۔ اس نے یہ ڈر لگتا ہے کہیں اس بات چیت سے آپ یہ نہ سمجھ لیں۔ اپنی بھاشا کی پرچار لے جا رہی ہے؟ اور اس کے بچاؤ کے لئے یہ باتیں بنائی جا رہی ہیں۔ کسی کے دھیان پر کیسے روک ٹوک ہو سکتی ہے جس کا جو جی چاہے سمجھ لے۔ پر سچی بات تو یہ ہے۔ دیس کے لئے یہ باتیں چھیڑنا پڑیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ دیس کے منہ پر کیسی جھریاں پڑتی چلی جا رہی ہیں۔ یہ کیسا ندھال ہوتا جا رہا ہے۔ آپا دھاپی کے کیسے جھکڑ چل رہے ہیں۔ ایسا اندھیارا ہے جو آنکھیں کھولنا دوبھر ہو گیا ہے۔ دیس کے اندھیرے کھنڈر میں ہٹا کٹا لمبا تڑنگا بھوت، ہاتھ پھیلائے دانت نکالے کھڑا ہنس رہا ہے۔ اسکے پرچھاویں سے یہاں والے سڑی بن کے آپس میں لڑے مرتے ہیں۔ کوئی بڑا منتر پڑھنے والا ایسا منتر پڑھے اور ٹونا ٹوٹکا کرے جس سے دیس پر سے یہ بھوت اتر جائے اور بھوت اتر جانے سے یہاں کے ساتھ رہنے سہنے والوں کی ایسی آنکھیں کھلیں جو سب مل ملا کے سارے جینے کے یہ ڈھائی دن آپس میں ہنس بول کے کاٹ دیں۔ بھوت اتارنا ہنسی کھیل نہیں۔ اسکے لئے بڑی پڑھنت پھونک چاہئے جسے آپ ہی کر سکتے ہیں۔

رہی اُردو تو اب یہ مٹنے مٹانے کے جوکھوں سے نکل چکی۔ اس کا پودا اب پودا نہیں رہا۔ جو لو کے تھپیڑوں اور ٹھنڈک سے جھلس اور ٹھٹھر کے رہ جاتا۔ یہ پودا پیڑ بنا اور بن رہا ہے۔ اس کی جڑیں آگے تک پھیلیں اور پھیل رہی ہیں۔ اس کی بڑی بڑی ڈالیاں، موٹے موٹے تنے اور ہری بھری ٹہنیوں سے موٹی پتلی اور ٹہنیاں نکل نکل کے ان میں نئی نئی کونپلیں پھوٹتی چلی جا رہی ہیں

اس کا تو اب کچھ ڈر ہی نہیں۔ اس میں ایک ہی بات دیکھنے کی ہے۔ جس دھن دولت کو سب اب تک مل جل کے برتتے تھے اب ان میں پھوٹ پڑنے اور الگ تھلگ ہو جانے سے ایک ہی جتھے کو وہ پورا بوجھ اٹھانا پڑیگا جسے پہلے سب مل ملا کے اٹھاتے تھے۔ اس سے بڑھتی ہوئی چال دھیمی پڑ جائے گی اور پہلی سی پھرتی نہ رہے گی۔ پہلے جو بات دنوں میں پوری ہوتی تھی وہ اب مہینوں پہ جا پڑے گی۔ پر مجھے تو یہ دکھائی دیتا ہے۔ پورے ہندو بھی کبھی اپنی اُردو کو چھوڑ نہیں سکتے اور اپنے بڑے بوڑھوں کے گاڑھے پسینے سے سینچی ہوئی اس ہری بھری کھیتی سے کبھی ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔

مہاتما جی۔ دیکھئے تو آپ کی اُردو کسی بھاشا سے بھی ہیٹی اور دبتی ہوئی نہیں۔ وہی باتیں، وہی گھاتیں ایک ایک کر کے اس میں دیکھ لیجئے تو نئی بھاشا کی جگہ اپنی اسی اُردو کو ایسے ہی آگے بڑھائیے نا۔ جیسے آج تک ہندو مسلمان سب مل جل کے اسے بڑھاتے اور سدھارتے چلے آئے۔

اس کے پرچار کے لئے پہلے ایسی ریڈریں لکھوائی جائیں جن میں عربی، فارسی، ہندی ان سب کے وہی گھلے ملے بول ہوں جنہیں سب بولتے ہیں۔ جیسے عربی، فارسی کے کڈھب بول ان میں جگہ نہ پا سکیں۔ ایسے ہی ہندی کے بھولے بسرے بول بھی ان میں کہیں نہ آنے پائیں۔ اسی بات میں آگے بڑھکر یہ دیکھ بھال بھی کرنا پڑے گی۔ اُردو کے اور پھیلاؤ اور بڑھانے کے لئے کہاں کہاں سے اور کون کون سے بول چنے جائیں۔ یہ گتھی ایسے لوگوں کے اکٹھا کرنے سے سلجھ سکتی ہے جو بھاشا کی بناوٹ، اُس کا اُتار چڑھاؤ، لوچ، گھلاوٹ اور بولوں کی ناپ تول، ان کا بھدا پن، ہلکا پن، یہ اور ایسی اور اور باتوں کو پرکھ سکتے ہوں۔

جیسی جگہ ہو جن جن کے ویسے ہی بولوں کا وہاں جڑنا اور بٹھانا جانتے ہوں۔ سب لوگ بھاشا کا ست لڑا نہیں بنا سکتے۔ بڑی سی بڑی سبھاؤں سے بھی چھانٹیں گے تو ایسے لوگ کچھ ہی نکلیں گے۔ عربی، فارسی، ہندی ان میں سے نئے بول جس کے بھی ہوں پورے سوچ بچار سے جانچ جانچ کے ان کا چننا اور انہیں اپنی اپنی جگہ ایسا جمانا جو وہ پھر نہ اکھڑ سکیں ایسے ڈھب انہیں لوگوں کو آتے ہیں جو بھاشا کے پورے ہتھکنڈے جانتے ہوں۔ ایسے لوگوں کی دیکھ بھال سے یہ ریڈریں ایسی لکھی جائیں گی۔ جن میں نہ بھاری بھاری عربی، فارسی کے بول ہوں گے اور نہ ہندی کے بھولے بسرے بھدے بول۔ ان میں نہ مولویوں، ملاؤں کے ان گھڑ بول دکھائی دیں گے اور نہ پنڈتوں کے کٹھن اور کڈھب بول، ان میں نہ ٹھیٹ ملا پن ہوگا اور نہ ٹھیٹ پنڈت پن۔ یہ ریڈریں ٹھیٹ مولویوں اور ٹھیٹ پنڈتوں کی لکھتوں سے الگ ہوں گی۔

ان کے لکھنے کا ڈھب ایسا سمویا ہوا، موتی سا چمکتا، میٹھا پانی ہوگا جس میں بھولے بسرے بولوں کی ٹھونس ٹھانس کا کوڑا کرکٹ اور گدلا پن کچھ بھی نہ رہ سکے گا اور یہ سوجھ بوجھ بڑھانے والا امرت جل آنکھوں سے پیا جائے گا۔ جس سے من دھلتے دھلتے چمک اٹھیں گے اور آگے نئی والی پود پہلے ہی سے

یہ پریم جل پی کے سمجھ کی پوری آنکھ کھلنے تک ایسے ستھرے من کی ہو جائے گی جسے پھرتی سے آگے بڑھنے اور دیس کے سنبھالنے میں کوئی رکاوٹ ہی نہ رہیگی۔

پہلے ہی سے عربی، فارسی، ہندی ان سب کے مواں بول ساتھ ساتھ پڑھنے لکھنے سے پھوٹ ڈالنے والا یہ دھیان کبھی بھولے سے بھی پھر کسی کو نہ آئیگا۔ اس لکھت میں بدیسی بولیوں کے جتنے بول ہیں اور دیسی بولی کے جتنے ان میں سے انہیں چھوڑ کر انہیں چن لینا چاہیئے۔ سب بولوں کے ساتھ ساتھ دیکھتے دیکھتے لڑتے بھڑتے پڑھتے ان سب کا پیار، میل جی میں جڑ پکڑتا چلا جائے گا اور سب اسی اردو کو اپنی بھاشا سمجھیں گے اور اس کے اور ادر بناؤ سنگھار کے لئے سوچ سوچ کے نئے نئے ڈھب نکالتے رہیں گے۔ تو اس جتن سے بھاشا الگ پھلے پھولے گی اور آجکل کی سی جھیڑ جھاڑ جس سے دیس کو گھن لگتا جا رہا ہے یہ بات بھی پھر نہ رہے گی۔ سانپ مرے نہ لاٹھی نہ ٹوٹے اس کہاوت کو سچا کر کے دکھا دیجئے اور جو اوپر لکھا جاچکا ہے اس کا پرچار ایسا کیجے جس سے گھڑی گھڑی کے جھگڑے ٹنٹے کا سانپ بھی مر کے رہ جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹنے پائے۔

بھاشا کے لکھنے کا ڈھنگ ([illegible]) کونسا رکھنا چاہیئے یہ بھی ایک بڑی الجھی ہوئی گتھی ہے۔ اس پر بھی یہیں لکھنا چاہتا تھا پر اس لئے چھوڑتا ہوں۔ ایک تو یہ بات کٹھن ہے اور اس کے کٹھن ہونے سے بہت پھیلنا پڑے گا دوسرے یہاں تک جو کچھ لکھا جاچکا ابھی یہ بھی دیکھنا ہے اسے دیکھ کے آپ کہتے کیا ہیں۔ یہ باتیں آپ نے کان دھر کے سن لیں تو پھر کبھی اس پر بھی جو جو باتیں دھیان میں ہیں ایک ایک کر کے سب لکھوں گا اور بتاؤں گا اس کے لئے کیا کرنا چاہئے۔

یہاں تک اُدھ کٹے بولوں میں جو بھی کہا جاچکا ٹھنڈے جی سے اُسے آپ نے سُنا اور سوچ بچار کی آنکھوں سے دیکھا تو سمجھو نگا یہ لکھت ٹھکانے لگی اور جو یونہی دیکھ دکھا کے ڈال دیا تو بات آئی گئی ہوئی۔ اچھا چلتے چلتے یہ ایک بات اور سن لیجے۔

اب تک میں نے جو بھی کہا اُسے آپ نہیں سنتے اور نہیں مانتے نہ سنئے اور نہ مانئے۔ عربی، فارسی بولوں کو آپ ہاتھ لگانا نہیں چاہتے۔ نہ لگائیے۔ ان بدیسی بولیوں کے بول آپ نہیں دیکھ سکتے۔ نہ سہی۔ اچھا ٹھیٹ اردو لکھنے کا یہی ڈھب جو آپ کے سامنے ہے اسی کو برتئے اور اسی کا پرچار کیجے۔ عربی، فارسی بول جن سے آپ کو چڑ ہے، دیکھ لیجے اس میں ان کا پتا بھی نہیں۔ تو پھر کیوں، متی گتی، کیتا، اُدبُھت، گنتو بیتھ، منو کامنا، لکش، کرتویہ، ساہتیہ، سو بھاؤ، شبتے، جیون، آشا، دشا، شکتی، شکشا، سمبندھ، انیکتا، ہتوں، ابھیاس، دشے، شبد، رکچھا، نیشچے، کلاہل، دیاکرن، اودے، راج نیتی! ایسے ایسے بھولے بسرے بولوں کی ٹھونس ٹھانس سے نئی بولی بنانے کی کھکیڑیں اٹھانے سے کیا یہ اچھا نہیں جو آپ اسی ٹھیٹ اردو لکھت کے پرچار کی حامی بھریں اور اسی کو پھیلائیں اسی کو آگے بڑھائیں۔

آپ سے باتیں کرنا تھیں اور آپ کو بدیسی بولیوں سے چڑ، تو پھر لکھنے کا یہ ڈھب نہ رکھتا تو کیا کرتا۔ عربی، فارسی، ہندی بولوں کو سمو کے لکھتا جیسے لکھا کرتا ہوں تو اُس کے دو بول بھی آپ نہ دیکھتے۔

اسے دیکھ چکنے پر جو بھی بات آپ کو دکھائی دے وہ آپ لکھ بھیجیں۔ پرماتما کرے آپ انند ہوں۔

سید ابوالقاسم

سرگذشت عروس۔ نارضامندی کی شادی اور انمل بے جوڑ رشتوں کی وجہ سے کس قدر ناگوار صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں دلچسپ اور عبرت انگیز آپ بیتی۔ قیمت عہ

نرگس جمال۔ بلجیم کے مشہور تمثیل نگار "موریس میٹرلنک" کے ڈرامے "جائزل" کا شستہ و رفتہ ترجمہ۔ نئے نئے خیالات و جذبات کی ترجمانی۔ 〃 عہ

پروین و ثریا۔ موریس میٹرلنک کی تمثیل "ایگلے وین اینڈ سیلے سٹ" کا پاکیزہ ترجمہ۔ حسن و عشق کا ایک جدید منظریہ بہت عمدہ کتاب ہے۔ 〃 علہ

چندرا موہنی۔ حسن و عشق کی داستانِ خونچکاں، محبت کا مذہب ہمیں کیا سکھاتا ہے۔ سچے عشق کی المناک کہانی۔ موثر اور مفید۔ 〃 علہ

دلی کا آخری دیدار۔ ۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے کی دلی کی سوسائٹی کیا تھی۔ لال قلعہ آباد تھا تو چمنستان دہلی میں کیسی بہار تھی۔ سو سال پہلے کی ایک جھلک 〃 ۱۲؍

لال قلعہ کی ایک جھلک۔ لال قلعہ کے عجیب و غریب واقعات جن کو پڑھ کر آپ مسرور بھی ہونگے اور حیرت زدہ بھی۔ 〃 علہ

نرگس۔ ایک طوائف نے عشق و محبت کی خاطر اپنی جان پر بنالی اور ایسے ایثار سے کام لیا کہ اپنی جان تک گنوا دی۔ 〃 ۱۲؍

عروسِ ادب۔ قاضی عباس حسین صاحب ظرافت کے بہترین افسانوں کا مجموعہ جو بہت پسند کیا گیا ہے۔ ہر افسانہ سیدھی سادی اردو میں لکھا گیا ہے 〃 علہ

چار چاند۔ دلی کی ٹکسالی اور ستھری ستھری زبان کا اگر آپ لطف اٹھانا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو طلب کیجئے جو حضرت فراق مرحوم کی تصنیف ہے۔ 〃 ۸؍

(گذشتہ سے پیوستہ)

فاؤسٹ

چھٹا باب

رُوڈا کا گرجا خُوب بھرا ہوا تھا۔ ماں اور بیٹے کی ایک ہی رات میں اس دوجہ غمناک موت کا ہر ایک کی زبان پر ذکر تھا۔ اب یہ سب جمع ہو کر مرنے والوں کی رُوحوں کے لئے دُعا خوانی کر رہے تھے۔ گرجے کے باہر ایک ستون کی آڑ میں کھڑی دروازے کی جھری میں سے مارگریٹ اندر جھانک رہی تھی۔ وہ اب بھی لڑکی سی معلوم ہوتی تھی، سیدھی سادی اور نازک لیکن اس کے چہرے پر نو عمری کے آثار سب معدوم تھے۔ چہرہ دھوئے کپڑے کی طرح سفید پڑا تھا اور اس پر نہ خوشی ظاہر تھی نہ غم۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ شدتِ غم نے اُس کے خدوخال جامد کر دیئے تھے۔ آنکھیں پھیلی ہوئی اور غمناک نہیں لیکن اُس کے آس پاس جو کچھ ہو رہا تھا اُس کا احساس اُن میں مطلق نہ تھا۔ نہ تو آنے جانے والوں کو وہ دیکھ رہی تھی اور نہ دُعا خوانی کا اثر اُن میں نمایاں تھا۔

اِس منظر کو وہ جھری میں سے اس طرح دیکھتی رہی گویا وہ ایک ایسی چیز تھی جو اُس کی حدِ نظر سے پرے تھی، کوئی چمکدار تصویر تھی جو اُس کی نظروں کے سامنے آگئی تھی۔ رنگین لیکن بے معنی۔ کوئی پُر اسرار تصویر تھی جسکو سمجھنے کی اُس میں صلاحیت نہیں تھی۔ اُس نے لوگوں کو سر جُھکائے دیکھا، حمد گانے والے لڑکوں کو آہستہ آہستہ جھککر کھاکر اُترتے اور گاتے دیکھا، پادریوں کو دُعا خوانی کرتے دیکھا لیکن اُس کی نگاہیں ہمیشہ دو بڑی سی اُبھری ہوئی چیزوں کی طرف کھنچکر جم جاتی تھیں جو پہلو بہ پہلو رکھی ہوئی تھیں۔ اُس کو صرف اتنا معلوم تھا کہ یہ دو ناگوار چیزیں ہیں، ایسی چیزیں جن کو اُس کی رُوح سمجھنا چاہتی تھی اور جن کے متعلق آگے کچھ معلوم کرنے سے اُس کی طبیعت دیوانہ وار اجتناب کرتی تھی۔ اُن دو مخملی چادروں کے نیچے اُسے معلوم تھا کہ کوئی چیز نہایت خوفناک ہے لیکن یہی کوئی چیز اُسے آواز دے رہی تھی اور اُسے میٹھا میٹھا درد محسوس ہوتا تھا اور بھولی بسری باتیں یاد آتی تھیں۔

دروازہ ایک دم سے بند ہو گیا اور اندر سے بُسے بڑے پادری کے کچھ کہنے کی آواز اور بہت سے آدمیوں کے جواب دینے اور آمین کہنے کی بھنبھناہٹ سنائی دی۔

ایک حمد گونجنے لگی اور مارگریٹ کو اُسکے الفاظ یاد آگئے:۔

"یہ کائنات بھی لرزیگی
جب مُردے جاگ کے اُٹھیں گے
اور مالک اُن سے پوچھے گا"

بیشک مُردے جاگ گئے اور جتنے نیک بندے تھے سب یکجا ہوگئے اور نورِ خدا وندی میں نہاگئے۔ موت بھی کیسی نعمت ہوگی، آرام سے ہو جانا اور ایک بار پھر اُن محبوب ہستیوں سے ملنا جو بچھڑ گئیں ہیں! لیکن مارگریٹ کے خیالات پر کیسی دیوانگی چھاگئی۔ اُس کا تو کوئی عزیز مرا ہی نہیں تھا۔ وہ تو تنہا تھی، بالکل تن تنہا۔

پھر ایک حمد گرجے میں سے گونجتی ہوئی اُسکے کانوں تک آئی:۔

"جب منصف تخت پر بیٹھے گا
سب عیب عیاں ہو جائیں گے"

عیب! شرمناک بھید! یہ کیا ہوتے ہیں؟ مارگریٹ نے یہ حمد سینکڑوں ہی دفعہ تو گائی ہوگی اور ہمیشہ اُسے ان الفاظ پر اچنبھا ہوتا تھا۔ شرمناک بھید! کیا جھوٹ بولنا؟ یا شاید وہ شیریں خیالات جن کی پرورش وہ تنہائی میں کرتی تھی۔ لیکن یقیناً اُن میں کوئی عیب کی بات نہیں۔ وہ راز کی باتیں تھیں اور ان میں وہ اپنی پیاری ماں کو بھی شریک نہیں کرسکتی تھی . . . .

حمد ختم ہوگئی۔ دُعا مانگنے کی بھنبھناہٹ سُنائی دی اور پھر سب نے مل کر آمین کہا۔ قدموں کی آواز آئی اور دروازہ کُھل گیا۔ لوگ سر جھکائے باہر نکلنے لگے۔ مردوں کی ٹوپیاں ابھی اُن کے ہاتھوں ہی میں تھیں اور وہ ایک قطار سی بنائے ہوئے تھے۔ جنازے اُٹھائے گئے اور پادری کے پیچھے پیچھے گرجے کی پُشت کی طرف یہ سب چلے۔ ان میں سے بعض نے مارگریٹ کی طرف اُچٹتی نظر سے دیکھا اور اس کے بے اثر چہرے کو دیکھتے گئے۔ ایک بڈھے نے اپنے برابر والے سے کہا "عجیب دُنیا ہے! ذرا سوچو تو سہی کہ بعض عورتیں ایسے بچے جننے کی آرزو میں اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالتی ہیں"۔

اس کا جواب یہ ملا "جی ہاں! اور پھر کیسی بھولی بھالی معلوم ہوتی تھی۔ کیسا دھوکہ دیا ہے اس نے سب کو۔ ذرا اس کے چہرے کو تو دیکھو جو ملال کی کوئی شکن بھی اس پر ہو۔ ماں اور بھائی کو موت کے گھاٹ

انار کو بھی اپنے دامن کے دھیان میں لگی ہوتی ہے اس پر تو شیطان ہی عاشق ہوا ہوگا!"

جب جنازے مارگریٹ کے سامنے آئے تو بے اختیاری میں اُس کے ہاتھ اُن کی طرف خود بخود پھیل گئے. یہ لوگ اُن چیزوں کو لئے جا رہے تھے جن سے اُسے ڈر لگتا تھا. لیکن ابھی انھیں لے نہیں جانا چاہیئے کیونکہ ان سے اُسے کچھ کہنا تھا. وہ کیا بات تھی جس کے کہنے کی آرزو اُس کے دل میں اب تک شدید تھی؟ یہ ایک پیغام تھا، آخری پیغام، اور اس پیغام کے اتنے سارے الفاظ تھے کہ وہ اُن کو یاد نہ رکھ سکی. وہ اُس کے سامنے سے گزر رہے تھے اور اب وہ انہیں کبھی نہ دیکھ سکے گی.

چمک کی طرح سے اس کی یادداشت عود کر آئی. بھیانک واقعات کی یاد تازہ ہوگئی. گزشتہ دو دن کا سوہانِ روح. اس کی ماں کی اندوہناک موت، اس کے پیارے بھائی کا دردناک قتل اور اس کے ہم جان ہستیوں سے نفرت کا اظہار، اُس کے عاشق کی فراری، اُس غمکدہ میں دو لاشوں کے ساتھ تنہائی کی طویل گھڑیاں، ہمسایوں اور راہگیروں کی پیشگوئیاں...

ایک خفیف سی چیخ مار کر وہ جنازوں پر گر ہی لیکن کلیسا کے ایک خادم نے بغیر اس کی طرف دیکھے ہوئے دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا اور وہ اس ستون سے ٹکرا کر سنبھلی جس کے قریب وہ کھڑی ہوئی تھی. وہاں وہ کھڑی ہاتھ ملتی رہی، دیوانوں کی طرح پھٹی آنکھوں سے آہستہ آہستہ گزرتے جنازوں کو دیکھتی رہی اور اس کے لب جلدی جلدی ہل رہے تھے گویا گڑگڑا گڑگڑا کر التجا کر رہی تھی.

آخر میں خالہ مارتھا آ رہی تھی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی. جب اُس نے مارگریٹ کو ستون کے پاس کھڑے دیکھا تو اس کا چہرہ سخت ہوگیا اور اُسے اس طرح گھور کر دیکھا گویا وہ مجرم تھی. لڑکی نے اسے دیکھا. اب ساری دنیا میں صرف یہی ایک اُس کی رشتہ دار رہ گئی تھی. مارگریٹ اُسے دیکھ کر چیخی اور امداد کے لئے اس کی طرف ہاتھ پھیلا دئے. لیکن خالہ مارتھا کی آنکھیں اُسے بے رحمی سے گھورتی رہیں. ان میں وہ ہمدردی نہیں تھی جو پہلے ہمیشہ ہوا کرتی تھی. بلکہ اب اُن میں غصہ اور حقارت نمایاں تھی. اُس نے چیخ کر کہا:-

"تو! یہاں آنے کی ہمت! اری رنڈی کیا تیری ساری شرم و حیا غارت ہوگئی! دیکھ تیرے جسم کی خواہش اور دولت کی لالچ نے تجھے کس حد تک پہونچا دیا. کتنی ہی دفعہ منع کیا تھا تجھے!"

پھر مارگریٹ کے دیکھتے دیکھتے سب لوگ گرجا کے عقب میں غائب ہوگئے.

اُس کی محبوب ہستیوں کے جنازے روپوش ہوتے ہی اُس کے خیالات پھر اُمڈ آئے اور اُس کا کرب و صعوبت اور بھی زیادہ شدید ہوگیا. بہت سی باتوں کی یاد اس کے ذہن میں تازہ ہوگئی. خوشی کے قہقہوں کی یاد، اعتبار و اعتماد، خوشیاں منانا، بعض غم کی باتوں کی یاد، اور ان سب نے مل کر اُسے اُن سے جا ملایا جو اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئے تھے.

اُن کا خیال آتے ہی اُس کے گلے سے عجیب طرح کے رونے کی آوازیں نکلنے لگیں. لیکن اُس کی آنکھیں خشک تھیں کیونکہ وہ اب رو بھی نہیں سکتی تھی.

ساتواں باب

ایک ہفتہ پہلے تک مارگریٹ کی زندگی یکسر معصوم و پُرمسرت تھی. بچپن میں جب اُس کے باپ کا انتقال ہوا تھا جب سے اب تک اُس کے گھر میں غم کی ہوا تک داخل نہ ہوئی تھی. اتنا ضرور ہوا تھا کہ جب کسی لڑائی کے موقع پر اُس کا بھائی جدا ہوتا تو اُسے صدمہ ہوتا لیکن اس کا بدلہ اسے انتہا خوشی سے ہو جاتا تھا جب وہ فتحمند واپس آتا تھا.

مارگریٹ کی مسرتیں سیدھی سادی ہوتی تھیں، لیکن اُس کی زندگی ان سے چھلکتی رہتی تھی کیونکہ ذرا ذرا سی بات پر اُس کا دل خوشی سے دھڑکنے لگتا تھا. پرندوں کی چہکار، پھولوں کی مہکار، صبح کی ٹھنڈی ہوا، تازہ ہوا کے خلاف دوڑنا، معمولی سا تحفہ، کوئی نیک کام یا چند محبت کے الفاظ اسے لبریز مسرت کر دیتے تھے. اس کی دلچسپیوں کا کوئی شمار نہ تھا کیونکہ جتنی چیزیں اس کے گرد ہوتی تھیں اُن سب سے وہ لطف اٹھاتی. پڑوس کے بچوں کے ساتھ کھیلتی، گاتی اور ناچتی. اپنے بڑے بھائی کی عجیب و غریب کہانیوں اور ہنسی مذاق کی باتوں پر خوب ہنستی اور گھر کے کام کاج میں دل لگا کر مصروف ہوتی.

پھر اُس کی زندگی میں ایک نیا جذبہ پیدا ہوا جس سے شروع شروع میں اُسے ڈر لگا. لیکن اس نئی قوت نے جلد ہی اُسے جذب کر لیا اور زندگی اس کے لئے ایک ایسی دنیا بن گئی جس کی کوئی حد نہیں تھی گویا ایک لامحدود دنیا میں اس نے اب پھر جنم لیا تھا. پہلے تو گویا وہ زندگی میں جھجکتی تھی اور بُعد کی تھی اور اب بڑے بڑے پر لگائے آسمان میں اُڑ رہی تھی.

یکایک، ایک ہی رات میں، زندگی کے وہ سارے خوف و خطر اُس پر ٹوٹ پڑے جو اب تک یونہی گزر جایا کرتے تھے. وہ نہیں جانتی تھی کہ موت کیا ہوتی ہے لیکن اُس رات کو اس کی ماں اور بھائی دونوں نے اُس کی آنکھوں کے سامنے دم توڑا. اُس کے لئے یہ سانحے یوں اور بھی عذاب

بن گئے کہ دونوں کی موت کا سبب وہ ہستی تھی جس نے اُس کی زندگی میں اس درجہ عجیب و غریب تبدیلی کی تھی، اور جس کی رُوح اس کی رُوح میں گھل مل گئی تھی۔

وہ اپنے اُسی گھر میں بیٹھی ہوئی تھی جو اس کے گیتوں اور قہقہوں سے گونجتا رہتا تھا، ماں کی محبت آمیز باتوں اور بھائی کے پُر بیدار ٹھٹھوں سے آباد رہتا تھا۔ لیکن اب یہی گھر اُجاڑ اور بھیانک بن گیا تھا۔ اُس کا دل سرد پڑ گیا تھا اور غم میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُس نے اپنی ماں کی آخری دل شکن نظر دیکھی اور اپنے سگے بھائی کی نحیف حقارت آمیز ہنسی سُنی اور وہ کبھی نہ فراموش ہونے والے الفاظ جو آخری وقت اُس کے مُنہ سے نکلے تھے۔ کیا اُسی اپنے گناہوں کی سزا مل رہی تھی؟ اُسے یہ نامنصفانہ معلوم ہو رہا تھا کہ اُس کا صحیح القلب بھائی اور متقی و پرہیزگار ماں دونوں کے دونوں اس قدر خوفناک موت مریں، اور اُن کے آخری خیالات محض اس کے گناہ کی وجہ سے اس درجہ تکلیف دہ ہوئے۔ لیکن اُسے سب سے زیادہ رنج اپنے عاشق کی فراری کا تھا۔ اب صرف اسی کا خیال تھا جس نے اُسے زندگی سے وابستہ کر رکھا تھا۔ وہ اپنے عاشق پر غور کرنا نہیں چاہتی تھی۔ محبت کے پہلے بوسہ میں اُس نے اپنی رُوح اور اپنا کُل اعتماد اُسے سونپ دیا تھا لیکن یہ اُس کی محبت ہی تھی جو اُس کی زندگی میں کچھ اہمیت رکھتی تھی۔

مارگریٹ سمجھ رہی تھی کہ اب وہ غم کی انتہاء گہرائیوں میں پہونچ گئی ہے۔ کوئی انسان اس سے زیادہ کرب و صعوبت برداشت کر کے جیتا نہیں رہ سکتا۔

وہ اپنے غموں میں گھری بیٹھی تھی کہ دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا، حکم دینے کی ایک کرخت آواز سُنائی دی اور چار سپاہی گھر میں داخل ہوتے۔ یہ کلیسا کے دستہ محافظ کے سپاہی تھے۔ اُن کے پیچھے پیچھے ایک پادری لمبا سیاہ جُبہ پہنے تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک لپٹا ہوا محضر تھا۔ یہ ایک دراز قد دُبلا سوکھا ہوا آدمی تھا، لمبا سا چہرہ اور چھوٹی چھوٹی چمکدار آنکھیں تھیں۔

مارگریٹ تھر تھر کانپتی کھڑی ہو گئی کیونکہ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اب کوئی خبر اُسے کوئی نہیں سنائے گا۔ اُس کے دوست اور کُنبے رشتے والے سب کے سب اُسے یا تو نفرت سے دیکھنے لگے تھے یا بُرا بھلا کہنے لگے تھے، نئے آنے والے اور اجنبی لوگ بھی ان سے کم اور کیا کہتے بلکہ شاید کچھ بُری خبریں ہی اور ساتھ لاتے۔

پادری نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا "تو ہی مارگریٹ ہے، ولنٹین کی بہن؟"

مارگریٹ نے کہا "جی ہاں"۔ اُس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور چہرہ جامد تھا۔

پادری نے محضر کھولا اور پھر کپکپاتی لڑکی کی طرف دیکھ کر بہت خشک آواز میں بولا "بڑے پادری صاحب نے آج صبح تیرے گناہوں کو جانچا اور بہت سے گواہوں کی سماعت کی۔ اُنہوں نے اپنا فیصلہ یہ لکھا ہے کہ حرامکاری کے گناہ کی پاداش میں اور جسم کی ناجائز بھوک سیر کرنے کے جُرم میں تجھے سزا دی جاتی ہے کہ چوراہے پر چھ گھنٹے تک شکنجہ میں تجھے کھڑا رکھا جائے تاکہ بدکرداروں کو عبرت ہو اور خود تیری رُوح کو اِس سے فائدہ پہونچے۔ یہ تجھے آج ہی کرنا ہوگا۔"

مارگریٹ نے جب یہ خبرِ بد سُن لی تو اُس کا کپکپانا جاتا رہا کیونکہ دل میں ڈر رہی تھی کہ کہیں یہ بُری خبر فاؤسٹ کی ذات سے متعلق نہ ہو۔

پادری نے پھر کہنا شروع کیا۔

"پھر میری بچی، کفارہ اور توبہ کے بعد وہ گناہ جو تُو نے خدا کے کئے ہیں معاف ہو جائیں گے۔ لیکن تجھ پر اور گناہوں کا بھی شبہ ہے ——— انسان کے گناہ۔ ان کا فیصلہ عدالت دیوانی کرے گی لیکن اگر تو ہمارے اُن سوالات کا تشفی بخش جواب دیدیگی جو ہم تجھ سے اب پوچھیں گے تو تجھ پر آگے مقدمہ نہیں چلایا جائیگا۔

تیرا عاشق کہاں ہے ——— تیرے بھائی ولنٹین کا قاتل؟"

"مجھے نہیں معلوم" اور پھر چُپکے سے دل ہی دل میں کہنے لگی۔

"کاش مجھے معلوم ہوتا!"

"یہ کون شخص ہے؟ اس کا کیا نام ہے؟"

مارگریٹ پھر کپکپانے لگی اور اُس کی مٹھیاں زور سے بھنچ گئیں۔ لیکن وہ خاموش رہی

پادری نے دیر تک اس کی طرف گہری نظر سے دیکھا اور اُس کا چہرہ سخت پڑ گیا۔

"تیری خالہ نے ہمیں بتایا ہے کہ وہ کوئی شہزادہ ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟ بول!"

مارگریٹ اب بھی خاموش رہی۔ لیکن اُس کے سانس کی رفتار بڑھ گئی اور آنکھوں کے خوف میں زیادتی ہو گئی۔

"بول!" پادری نے حکم دیا مگر وہ گونگی بنی رہی۔

"تیرے عاشق اور اُس کے ساتھی کا تعلق شیاطین اور ناپاک رُوحوں سے تھا نا؟ مُنہ سے بول! جو کچھ تجھے معلوم ہے بتا دے ورنہ تیرے حق میں بہت بُرا ہوگا۔"

مارگریٹ نے آہستہ آہستہ انکار میں اپنا سر ہلایا لیکن کوئی

رہے نہیں دیا

پادری نے بے چینی سے سپاہیوں کی طرف پلٹ کر کہا "باندھ دو اس کی مشکیں" اور مارگریٹ کی طرف پھر دیکھ کر بولا "شکنجے میں کھڑے رہنے کے بعد شاید اللہ تعالیٰ کا جو تیری زبان کھول دے گا"

ایک سپاہی آگے بڑھا اور مارگریٹ کے ہاتھ پیچھے کھینچ کر رسے سے باندھ دیے گئے۔ دوسرے نے بڑھ کر اس کے پاؤں میں رسے ڈال دیے۔ پھر ان سب نے ان کے جمعدار کے حکم پر اور سب کے سب گھر سے باہر نکلے۔ مارگریٹ بیچ میں تھی۔ دو سپاہی آگے اور دو پیچھے۔ اور ان کے برابر ذرا ہٹ کر پادری اپنی آستینوں میں ہاتھ ڈالے چل رہا تھا

دن کے بیچوں بیچ چھ گھنٹے تک مارگریٹ شکنجے میں کھڑی رہی اور جب سورج غروب ہو گیا تو خدام کلیسا آئے اور گراں زنجیروں کو کاٹا جن سے اس کے ہاتھ پاؤں جکڑے ہوئے تھے۔

چھ گھنٹے تک وہ اس حالت میں ایک چبوترے پر مجمع کی ہیبت ناک نظروں میں کھڑی رہی تھی تاکہ تماشائی اسے اچھی طرح دیکھ سکیں، اسے منہ چڑائیں، آوازے کسیں، مذاق اڑائیں اور اگر جی چاہے تو اس کے منہ پر تھوکیں۔ شکنجے کے گرد لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی اور تماشائی چبوترے پر پلے پڑتے تھے۔ دو سپاہی پہرے پر کھڑے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پہرہ بدلتا رہتا تھا۔ یہ سپاہی بھیڑ کو روکے ہوئے تھے ورنہ مجرمہ پر ٹوٹ پڑتے اور اس کے چیتھڑے اڑا دیتے۔ کبھی کبھی بھیڑ کم ہو جاتی تھی لیکن ہر وقت وہاں ایسے لوگ موجود رہتے تھے جو مذاق اڑاتے اور بری بری باتیں کہتے۔ ان میں زیادہ تر شہر کی لڑکیاں شریک تھیں۔ عمر رسیدہ لوگ اسے کڑی نظروں سے دیکھتے اور بدی کا نمونہ سمجھ کر کہتے کہ خدا اس کی بدکرداری کی سزا دے رہا ہے نوجوان اس کی غمناک آنکھوں کو دیکھ کر پسیج جاتے تھے لیکن ان میں سے کوئی کوئی مارگریٹ کی ہیئت کذائی پر فقرہ چست کرتا اور اس پر اور سب مل کر قہقہہ لگاتے گویا بڑے موقع کی بات کہی۔

لیکن لڑکیوں کی کشش کا کچھ اور ہی جذبہ تھا۔ یہ سب بھیڑ کے بیچ میں تھیں اور مارگریٹ کی طرف انگلیاں اٹھا اٹھا کر طرح طرح کی باتیں جوش میں کہتی تھیں اور جب تک مارگریٹ شکنجے میں کھڑی رہی یہ سب بھی کھڑی رہیں اور طعنے تشنے دیتی رہیں۔ ان میں سے ایک نے بڑی حقارت سے مسکرا کر کہا۔

"کیوں مارگریٹ اب اس تخت پر بیٹھنے کے بعد تیرا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا؟ میں سمجھتی ہوں کہ ان زنجیروں کے پہننے میں وہ مزا تو تجھے نہیں آ رہا ہوگا جو تیرے عاشق کے لپٹنے میں آیا ہوگا"

ایک اور بولی "اری معصوم مارگریٹ! تو کیسی اچھی رہی کہ اپنی نیک چلنی کے باعث ہم سب سے اتنے بلند مرتبے پر پہنچ گئی!"

لیکن یہ دل لگی بہت جلد بدمزہ ہو گئی کیونکہ جس لڑکی پر ان نشتروں کی بارش کی جا رہی تھی وہ اپنے اطراف و اکناف سے بالکل بے خبر تھی۔ اسکا چہرہ سفید اور مرجھایا ہوا تھا۔ کوئی بہت گہرا جذبۂ غم اس کے دل پر چھایا ہوا تھا۔ اس کے کان ساری بیرونی آوازوں کے لئے بہرے اور اس کی آنکھیں کل بیرونی اشیاء کے لئے اندھی تھیں۔ وہ انسانی ہستیاں جو اسکی حمایت کر رہی تھیں ننھے ننھے بچے تھے۔ دو بچے بڑی دیر سے آخیر تک اسکے شکنجے کے پاس کھڑے رہے۔ ان میں سے ایک چیخیں مار مار کر رو رہا تھا اور دوسرا جو ذرا بڑا تھا برا بھلا کہنے والوں پر چیخ رہا تھا اور طعنے دینے والی لڑکیوں کو ڈانٹ رہا تھا۔ لیکن مارگریٹ اپنے ننھے حمایتیوں سے بھی اتنا ہی بے خبر تھی جتنی ان سے جو اسکی ذلت پر خوشیاں منا رہے تھے۔

جب سورج غروب ہوا تو اس کی زنجیریں کاٹ دی گئیں اور ایک سپاہی نے اسے پکڑ کر شکنجے میں سے نکال زمین پر اتارا۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ چبوترے پر سے خود اتر آئے۔ کیونکہ کمزوری کی وجہ سے وہ بیدم ہو رہی تھی۔ وہ خون جو زنجیروں کی جکڑ بند سے رک گیا تھا اب پھر رواں ہوا اور اس سے اسے سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ لڑکیوں اور جوان عورتوں کی ایک بھیڑ اس کے گرد لگ گئی اور یہ سب کی سب مل کر اسے گالیاں دے رہی تھیں۔ جب تک وہ ان میں نہیں گھر گئی وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر رہی۔

وہ اپنے چاروں طرف حیران ہو ہو کر دیکھ رہی تھی۔ چیخنے والی لڑکیوں کی بھیڑ، شکنجہ، اس کا محافظ سپاہی، چھوٹا سا لڑکا جو اسکے قریب کھڑا رو رہا تھا اور اس کے ہاتھ کو کھینچ رہا تھا، ان سب کو حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ پھر ایک دم سے اسے اپنی زبوں حالی کا احساس ہوا۔ سارے دن میں اب پہلی دفعہ اس کے رخساروں پر سرخی آئی۔ پھر ذلت اور شرمندگی کی لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ اس نے نظریں نیچی کیں اور اپنے ننگے پیروں کو دیکھا اور پھر خوفزدہ ہو کر اس مجمع کو دیکھا جو اسے گھیرے کھڑا تھا۔

اس کی آنکھوں میں ایک وحشیانہ چمک تھی جیسے اس شکار کی آنکھوں میں ہوتی ہے جس کے تعاقب میں شکاری ہو۔ گھبرا کر وہ غضبناک سے بھیڑ میں بے تحاشہ گھس گئی اور دوسری طرف نکل گئی۔ لیکن سپاہیوں کے روکتے روکتے کئی لڑکیوں نے اس پر ہاتھ چھوڑ دیا۔ پھر بازار میں د

اس طرح بھاگی جیسے شکاری کتے اس کا پیچھا کر رہے ہوں اور جلدی ہی ان سب کو پیچھے چھوڑ اس واحد جائے امان کا رُخ کیا جو اس کا آخری ٹھکانہ تھا۔ غمناک اور اُجاڑ، جس میں ہیم و ہراس پہرہ دے رہے تھے اور ان سب سے زیادہ اس کے جملہ عیش و نشاط کا مزار ــــ ــ ــ وہی جو کبھی اُس کا گھر تھا۔

جب وہ اپنے گھر پہونچی تو ور دست بُری طرح ہانپ رہی تھی اور اس کی حالت سنبھلتے سنبھلتے کافی وقت گزر گیا۔ تھوڑی دیر تک آرام سے بیٹھی رہی اور اس کا ذہن گذشتہ واقعات کی یاد سے گڈمڈ ہو رہا تھا۔ پھر اُٹھ بیٹھی اور خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ جس چیز پر بھی نظر پڑتی تھی اُس سے کوئی نہ کوئی ناخوشگوار یاد وابستہ ہوتی تھی۔ ایک کمرے میں سے دوسرے میں گئی۔ الماریاں کھولیں اور ان تمام چیزوں کو چھوا جو اس کی ماں کے استعمال میں رہتی تھیں۔ کوئی کوئی چیز ایسی بھی تھی جس میں کشیدہ کاری یا سوئی کا کام اَدھورا رہ گیا تھا۔ اس کے بھائی کی بڑی سی تلوار اب ایک دروازے کے پیچھے رکھی تھی، اور اُسکے موٹے چمڑے کا سینہ بند تلوار کے اوپر ایک کھونٹی پر لٹکا ہوا تھا۔

اس کے چہرے پر پھر زردی کھنڈ گئی تھی اور بے حس و حرکت آنکھیں خشک پڑی تھیں۔ اب اُس کمرے میں داخل ہوئی جس میں یہ رہتے سہتے تھے اور جس کی کھڑکی میں سے بازار نظر آتا تھا۔ کھڑکی کے پاس ہی اُس کی ماں کی کُرسی اُسی طرح رکھی تھی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی ابھی اُٹھکر باورچی خانے گئی ہے۔ اس کے پاس جاکر مارگریٹ نے محبت سے اس کُرسی پر ہاتھ پھیرا۔ پھر ایک دم سے اس کُرسی کے آگے زانو ہو گئی اور ہاتھ بڑھا کر اُس سے اس طرح بغلگیر ہونے لگی جیسے کوئی اس پر بیٹھا ہوا نظر آرہا ہے اور وہ اسکی طرف غم آمیز نظروں سے اس طرح دیکھ رہا ہے گویا وہ سمجھ رہا ہے اور معاف کر رہا ہے۔

سسکیوں سے وہ لرزنے لگی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسکی ایک چیخ نکلی اور یہ چیخ تنہائی اور دہشت کی تھی۔

"اماں! اماں!"

آٹھواں باب

مارگریٹ روڈا کے چوراہے پر شکنجے میں کھڑی کی گئی تھی۔ اب اس بات کو تقریباً ایک سال ہو گیا۔ یہ سال سختیاں اور مصائب جھیلتے گزرا، اور اس کے دن بھی اِس طرح کٹے کہ کسی طرح کاٹے نہ کٹتے تھے کہنے کو ایک سال مگر اُس کے لئے صدیاں بیت گئیں، اور اُس کے لئے زندگی اجیرن ہو گئی۔ اس عرصے میں اس نے بڑے بڑے کڑوے جام پئے لیکن یہاں جام خالی ہو کہ پہلے سے بھی زیادہ کڑوا چھلکتا جام اُس کے لبوں سے لگ جاتا تھا اور وہ اس کڑوے گھونٹ کو اپنے حلق سے نیچے اُتارنے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ گرمیاں اور خزاں اُس کے لئے ایسے ہی اُجاڑ اور بدرنگ تھے جیسے اب جاڑا جو ملک پر حکومت کر رہا تھا۔

اب کے جاڑا بھی غضب کا پڑ رہا تھا۔ پانچ دن سے برف کی ایک مسلسل چادر پڑ رہی تھی جس سے سورج کی روشنی تک لپٹ کر رہ گئی تھی۔ گاؤں کے کتنے ہی گھر برف کے نیچے دب چکے تھے۔ دس دس اور پندرہ پندرہ فٹ موٹے دل کی تہیں زمین پر چڑھی ہوئی تھیں اور ان لوگوں کیلئے جو زمین کے نشیب و فراز سے ناواقف تھے ایسے میں گھروں سے نکلنا خطرناک تھا۔

روڈا سے سات میل کے فاصلے پر ایک پرانا اُجڑا ہوا کھلیان تھا۔ اس سے تین تین میل دور تک کوئی بستی نہیں تھی۔ دیواروں کے تختے گل سڑ کر بہت سے گر چکے تھے اور چھت بھی بس یونہی سی کچھ باقی رہ گئی تھی۔ اس کھنڈر کے ایک کونے میں تھوڑی سی خشک گھاس پر مارگریٹ سُکڑی سُکڑائی پڑی تھی۔ سرد و بے وفا ہوا کی سیٹیاں گونج رہی تھیں۔ اس کے ہاتھوں میں کوئی اینٹ لپٹائی چیز تھی جسے اپنے سینے سے چمٹا رکھا تھا۔

وہ زندگی جس کی ساری اُمیدیں چھن چکی ہوں اتنی ہی بیزار ہوتی ہے جتنی کہ موت۔ مارگریٹ بھی اپنی اس زندگی کو کبھی کی چھوڑ چکی ہوتی اگر اسکے دل میں اُمید کی ایک کمزور سی ہوتی چنگاری نہ ہوتی۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ اسکا عاشق اسے ان مصائب سے چھٹکارہ دلانے ضرور آئے گا۔ لیکن مصیبتوں کے کٹھن دن اس نے کاٹ دئے تھے ان میں سے بعض بعض تو ایسے بھیانک تھے کہ اپنے ہی ہاتھوں اپنی زندگی ختم کرنے کا ارادہ ہوتا تھا مگر اس کے محبوب کے آنے کی کوئی صورت نہ نکلی۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ اسکے دل کی چنگاری روشن ہو گئی۔ شروع شروع میں اُسے یقین نہ آیا بلکہ اُس میں یہ سمجھ لینے کی جرأت بھی نہیں تھی کہ خوشی کا یہ وعدہ اس کے لئے مقدر ہوا ہے۔ جھڑکیاں اور مصیبتیں جھیلتے جھیلتے غم و اندوہ کی وہ اس قدر عادی ہو گئی تھی کہ اُسکی زندگی میں خوشی کا آنا اُسے ناممکن معلوم ہوتا تھا، بلکہ اسے ایک ایسی مداخلت بیجا تصور کرنے لگی تھی جس کا سدِباب کرنا اس کے لئے ضروری تھا۔

لیکن جیسے جیسے ہفتے گزرتے گئے اُس کے شبہات رفتہ رفتہ دُور ہو گئے اور اسکی دیوانہ وار اُمید زندگی میں تبدیل ہو گئی۔ یہ تھا فاؤسٹ کا

جواب اُس کی ساری آہ و زاری اور اُس کے تمام آنسوؤں کا جو تنہائی میں اُس کے دُکھے ہوئے دل نے بہائے تھے۔ وہ اُس کی دعاؤں کا عجیب دعا نیتجہ جواب تھا کہ اُسکی روح روشن ہو گئی تھی۔

مارگریٹ کے اندر جو زندگی اُبھر رہی تھی سے وہ پروان چڑھاتی رہی اور اسی میں اپنی طاقت صرف کرتی رہی۔ وہ سوچتی تھی کہ اگر اُس کا محبوب فاؤسٹ مر بھی گیا ہو یا اگر اس کے لئے یہ مقسوم ہو چکا ہے کہ فاؤسٹ تو اسے کبھی نہ دیکھے پھر بھی اُس کا بیش قیمت تحفہ تو اس کے پاس تھا جو ان دونوں کے درمیان ایک ابدی کڑی تھی اور اس تحفے کو وہ دنیا میں لانے والی تھی۔ باوجود پادریوں اور خدام کلیسا کی سخت گیری اور ظلم کے شاید خدا نے اسکا گناہ معاف کر دیا تھا

سب دوستوں نے اس کی طرف سے منہ موڑ لیا تھا کیونکہ کلیسا نے اُسے ملعون و مردود قرار دیا تھا اور اسوجہ سے بھی کہ عام روایت تھی کہ مارگریٹ کا تعلق ابلیس کے کسی غلام سے رہا ہے۔

گھر کا سامان سب بک گیا اور جو تھوڑی سی رقم اُس کے پاس تھی اُسے لیکر اپنے اُس شہر کو چھوڑا جو تکلیف دہ یادوں، دل کو ٹھیس لگانے والی باتوں اور نامہربان منظروں کا گہوارہ بن گیا تھا۔ اب اُسے ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں اُسے کوئی نہ جانتا ہو اور جہاں محنت مزدوری کرکے اتنا کما سکتی ہو کہ اپنا اور اپنی نوزائیدہ اُمید کا پیٹ پال سکتی ہو۔ لیکن سکون اُسکی قسمت میں ابھی نہیں تھا۔ خدام کلیسا نے اُس کا کھوج نکال لیا۔ چونکہ انہیں اس کے عاشق کا نام اور حلیہ معلوم نہ ہو سکا تھا اور نہ اس لئے ضروری تھا کہ اُسے ویلنٹائن کا قاتل سمجھا جا رہا تھا۔ اس لئے ان شکاری کتوں سے اپنی جان بچانے کے لئے مارگریٹ کو ایک جگہ چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ ایک گاؤں میں مارگریٹ نے سلائی اور کشیدہ کاری کا کام شروع کر دیا تھا اُسے کام بھی ملنے لگا تھا لیکن جب خدام کلیسا کی زبانی گاؤں والوں کو معلوم ہوا کہ مارگریٹ کون ہے اور اُس پر کیا گزر چکی ہے تو انہوں نے اُسے اپنے گاؤں سے نکال دیا اور بعض جگہ تو اس نکالے کے ساتھ جھڑکیاں اور گالیاں بھی ملیں۔ لیکن اُس جان کی خاطر جس کی محافظ وہ تھی اور جسے وہ اپنے اندر کانپتا محسوس کرتی تھی وہ ہر سختی جھیلنے کے لئے آمادہ اور ہر مصیبت برداشت کرنے کو تیار تھی۔ اُس کی خاطر مشکل سے مشکل اور ناگوار سے ناگوار کام کرنے کو تیار تھی۔ آخر میں اُس نے آس پاس کے گاؤں میں پھیری پر پھرنا شروع کیا اور گھروں میں اُوپر کا کام کرنے لگی۔ کہیں کپڑے دھوتی، کہیں جھاڑ و جھٹکا کرتی، کہیں فرش اور گھر دھلواتی، غرض گندہ سے گندہ اور ناپاک سے ناپاک کام خندہ پیشانی سے کرتی اور تھوڑی سی تنخواہ ہر گھر سے اُسے ملتی۔ چند مہینے اسی طرح گزرے۔ خدا کا شکر ادا کرتی تھی کہ پیٹ کو روٹی اور تن کو کپڑا اُجڑا، اور یہ سب کچھ اسی ننھی سی جان کی خاطر، پیسے جو کچھ بچتے انہیں بڑی احتیاط سے اس گٹھڑی میں چھپا کر رکھتی جس میں چند اُونی اور ریشمی کپڑوں کے ٹکڑے بندھے رہتے یہ گٹھڑی ہر دم اسکے ساتھ رہتی تھی۔

جب وقت قریب آیا تو اُسے یہ خطرہ ہوا کہ اس کا بچہ بالکل غیر لوگوں میں پیدا ہوگا، اور غیر بھی ایسے کہ ان پر ناک بھوں چڑھائیں گے اور پیرچول کریں گے اور جب انہیں معلوم ہوگا کہ یہ وہی مارگریٹ ہے تو غالباً گھر سے نکال دینگے، عین اُس وقت جبکہ اُسے آرام اور دیکھ بھال کی ضرورت سب سے زیادہ ہو گی۔ اس خطرے نے اسکا آرام اور چین غارت کر دیا اور ایک دن چپکے سے رات کے وقت وہ گھر سے روانہ ہوگئی۔

اُس نے دل میں کہا کہ خالہ مارتھا کے گھر چلوں اور اُن سے گڑگڑا گڑگڑا کر رحم کی درخواست کروں۔ گو اُنہوں نے آخری دفعہ بہت سخت باتیں کہی تھیں لیکن جب وہ میری زدہ حالت دیکھیں گی تو اُن کا دل پسیج جائے گا۔ بھلا کون ایسا سنگدل ہوگا کہ جب میں اپنے پیدا ہونے والے معصوم بچے کا واسطہ دونگی تو انکار کر دے گا۔ پھر بھلا خالہ مارتھا جو اسقدر نرم دل ہیں اور پہلے مجھے سب سے زیادہ عزیز بھی رکھتی تھیں کیسے مُنہ موڑ لیں گی؟ بہت دُور کا سفر اُسے پیدل طے کرنا تھا کیونکہ روڈا یہاں سے مینج میل تھا۔ لیکن مارگریٹ کو اُمید تھی کہ اگر راستہ میں بھیک نہ بھی ملی تب بھی کام کاج اور محنت مزدوری کرتی تین دن میں روڈا پہنچ جائے گی۔

مگر خالہ مارتھا کے گھر تک وہ پہونچ ہی نہیں سکی۔ دوسرے دن کے اختتام پر اُس کی طبیعت بگڑ گئی اور بڑی مشکل سے گھسٹ گھسٹا کر سڑک کے کنارے ایک خالی جھونپڑی میں پہونچی۔ یہاں پہونچ کر بیہوش ہو گئی۔

اُسی رات کو اُس کے ہاں بچہ پیدا ہوا، لڑکا، کمزور دُبلا پتلا۔ اور جب یہ بچہ اپنی باریک نحیف آواز میں رویا تو مارگریٹ کو ایسا معلوم ہوا کہ اس آواز میں اُسکی تمام مصائب و آلام کا نوحہ ہے۔

لیکن مارگریٹ کے لئے یہ بچہ اُمید کا ستارہ تھا۔ اُسے محسوس ہوتا تھا کہ اُس کا عاشق اُس کے قریب موجود ہے۔ زندگی کی مُرجھائی ہوئی کلی اب پھر کھل کر پھول بن گئی غم کلفت معدوم ہو گیا اور مسرت اُس پر چھا گئی۔ ناقابل بیان خوشی اور چین نے اُس کی طبیعت کو شگفتہ کر دیا۔ اپنی ساری زندگی کو آغوش میں لئے نیم بیداری کی حالت میں پڑی تھی اور

شیریں خیالات اُسے چاروں طرف سرگوشیاں کر رہے تھے۔

تین ہفتے بعد مارگریٹ ایک ٹوٹے ہوئے کھلیان کے کونے میں سکڑی سُکڑائی اپنے بچے کو سینے سے لگائے پڑی تھی۔ ٹوٹی ہوئی دیواروں اور سُوراخوں میں سے ہوا چیختی ہوئی گھس رہی تھی جب زور کا کوئی جھونکا آتا تو مارے تختے کھڑکھڑانے لگتے۔ سردی غضب کی پڑ رہی تھی اور برف کے گالے گر رہے تھے۔

مارگریٹ کو اپنی تکلیف اور بے سروسامانی کا ذرا بھی خیال نہیں تھا سیلی ہوئی پیال پر جس پر وہ سُکڑی ہوئی پڑی تھی، سردی جو چیونٹیوں کی طرح اس پر رینگ رہی تھی، یا بھوک پیاس کی اُسے پروا نہیں تھی اُس کی تو ساری زندگی بچے سے وابستہ تھی۔ جس ننھی سی جان کو وہ گود میں لئے ہوئی تھی صرف اُس کے ذریعہ سے اُس کا احساس زندہ تھا۔ صرف بچے ہی کی وجہ سے اُسے اپنی زبوں حالی محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے سوچا کہ سر چھپانے اور کھانا پینا حاصل کرنے کے لئے ایک بار پھر پوری پوری کوشش کر لی چاہیئے ورنہ رہی سہی طاقت بھی جاتی رہے گی اور بچے کو پال نہ سکیگی۔ بچے کو اُس نے اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ ایک کمبل کا ٹکڑا اس پر ڈھک دیا اور مزید احتیاط کے خیال سے اپنا پھٹا کوٹ اُس کی کمر اور پیروں پر لپیٹ دیا تھا۔ مارگریٹ نے اُس کے مُنہ پر سے کپڑا ذرا سا ہٹا کر محبت بھری مُسکراہٹ سے دیکھا۔ وہ نہ تو اُسے اپنے سرد لبوں سے پیار کر سکتی تھی اور نہ ٹھنڈے ٹھنڈے ہاتھ اُس پر پھیر سکتی تھی۔ بس صرف یہ کر سکتی تھی کہ اُسے گرم رکھنے کے لئے اپنے سینے سے لگائے رہے جُھک کر چپکے سے بولی "دل کے ٹکڑے۔ ننھے فاؤسٹ، کیا تجھے بھی میرے گناہ کا خمیازہ بھگتنا پڑیگا؟ لیکن نہیں، میری پیاری ننھی سی جان۔ ایسا نہ ہوگا' اسکا میں تجھ سے عہد کرتی ہوں"

ایک دن پہلے کا ذکر ہے، ابھی مارگریٹ اسی جھونپڑی میں تھی جس میں بچہ پیدا ہوا تھا کہ موسم میں تبدیلی ہوئی۔ ہوا بند ہوگئی، برف باری رُک گئی، بادل چھٹ گئے اور سُورج چمکنے لگا۔ مارگریٹ اپنی خالہ کے ہاں پہونچنے کی جلدی میں تھی۔ جو کچھ بچا کھچا کھانا تھا سمیٹ سماٹ گٹھڑی باندھ سڑک پر چل کھڑی ہوئی۔ روڈا سے اب وہ دس میل کے فاصلے پر تھی۔ سوچتی تھی کہ رات سے پہلے شہر میں پہونچ جائے گی۔ لیکن گھنٹہ بھر چلنے کے بعد ہی سیاہ اودے بادل پھر گھر آئے اور ہوا بھی چل پڑی اور دم بدم بڑھنے لگی۔ پھر برفانی ہوا کا جھکڑ چلنے لگا۔ لیکن اپنی خوش قسمتی اور بچے کے نصیب سے اُسے دو سو گز کے فاصلے پر ایک ٹوٹا ہوا کھلیان دکھائی دے گیا۔ برف کے گرنے سے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ گرتی پڑتی کسی نہ کسی طرح بیدم ہو کر وہ کھلیان تک پہونچ ہی گئی۔

خوشی کی ایک چیخ مار کر وہ کھلیان میں داخل ہوئی۔ بچے کے کپڑوں پر سے جلدی جلدی برف جھاڑی۔ کونے میں تھوڑی سی سیلی ہوئی پیال نظر آئی۔ ہانپتی کانپتی اُس پر بیٹھ گئی، بچے کو سینے سے لگا لیا اور باہر برف کو دیکھتی رہی جس کا دَل بڑھتا جا رہا تھا۔

ساری رات برف گرتی رہی یہاں تک کہ آدھا کھلیان اس کا بھر گیا۔ تڑکے مارے مارگریٹ کی نیند اڑ گئی۔ تیسرے پہر تک برف باری میں کچھ کمی آئی۔ جھکڑ بھی ہلکا ہو گیا یہاں تک کہ آہستہ آہستہ مطلع صاف ہو گیا۔

مارگریٹ کی طاقت اب جواب دے چکی تھی۔ کھانا تو بہرحال چاہیئے ہی تھی اور گھر اور گرمی کی بھی ضرورت تھی۔ ہاتھ پاؤں سردی سے اکڑ گئے تھے اور جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔ اب بچے نے بھی کمزور آواز میں رونا شروع کیا۔ اب اُسے یہاں سے چلنا چاہئے تھا تاکہ سر چھپانے کی کوئی جگہ ملے ورنہ خود اور بچہ دونوں کے بھوک اور سردی سے مرجانے کا اندیشہ تھا۔

بڑی ہمت کر کے وہ لڑکھڑاتی اٹھی۔ ٹانگیں سیدھی کرنے میں کافی دیر لگ گئی۔ لمبا سفر در پیش تھا جس کے خیال ہی سے دل ڈوبا جاتا تھا۔ جبر کر کے کھلیان کے دروازے میں سے نکلی اور برف کے تودوں پر سے ہوتی ہوئی اُس سمت میں چلی جہاں اُسے خیال تھا کہ سڑک ہوگی۔

تھوڑی ہی دور چلی تھی کہ یہ معلوم ہونے لگا جیسے مدتوں سے برف کے لامتناہی سلسلے پر چل رہی ہے۔ اس سے اُس کے پیر شل ہو گئے تھے اور بار بار گر پڑتی تھی لیکن آبادی کا کوئی نشان تک اسے دکھائی نہیں دیا۔ بالآخر اُسے ایک پھوس کی چھت والا گھر دور سے نظر آیا۔ دیوانہ وار اُسی طرف دوڑی کہیں ٹھوکر لگی کہیں گری لیکن بچے کو اس طرح اُٹھائے رہی کہ اُسے کوئی ضرر نہ پہونچے۔

دروازے تک کسی نہ کسی طرح پہونچ ہی گئی اور اُسے کھٹکھٹایا۔ کتنی ہی دیر بعد وہ کھلا اور یہ عرصہ مارگریٹ کو صدیوں لمبا معلوم ہوا۔ دروازہ کھلا تو ایک بدمزاج عورت کا چہرہ نظر آیا جس نے تیز تیز نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

مارگریٹ کے مُنہ سے الفاظ بھی نہیں نکلتے تھے۔ بمشکل دقت بولی۔ "پناہ دیجئے، مجھے اور میرے بچے کو"

عورت نے اُسے گھور کر دیکھا اور بولی "اچھا اندر آجا۔ باہر تو اکڑ

کر مر جائے گی۔"

مارگریٹ نے تکلیف سے سانس کھینچ کر شکریہ ادا کیا اور گھر میں داخل ہوئی۔ کمرے میں کیسی اچھی گرمی تھی! انگیٹھی میں آگ دہک رہی تھی اور چولھے پر جو دیگچی چڑھی ہوئی تھی اس میں سے کیسی اچھی خوشبو آ رہی تھی۔ اب اپنے بچے کو اس وقت تک وہ یہاں بچا سکے گی۔ خدا اُسے بھولا نہیں تھا۔ خدا نے اُسے سزا دی تھی لیکن اب معاف کر دیا تھا۔

عورت نے یکایک اُس کے قریب آ کر مُنہ پر سے کپڑا ہٹایا اور گھور کر کرخت آواز میں بولی "ارے تو مارگریٹ ہے نا! وہی جو روزانہ شکنجے میں کھڑی کی گئی تھی! مارگریٹ بیسوا!"

مارگریٹ کا مُنہ کھُل گیا اور آنکھیں بند ہو گئیں گویا اپنی زبانِ خاموش سے کہہ رہی تھی "خدا کے لئے رحم کرو۔ مجھ پر ترس کھاؤ۔"

عورت بولی "نکل یہاں سے مُردار۔ اس گھر کے لئے تیرا سانس گندہ اور زہریلا ہے۔"

مارگریٹ کے مُنہ سے الفاظ گویا پھٹ پڑے "نہیں نہیں۔ آپ یہ نہیں کر سکتیں۔ رحم کیجئے۔ میرے بچے پر رحم کیجئے۔"

"دفان ہو اور اپنے شیطان کے بچے کو لیکر یہاں سے غارت ہو۔"

مارگریٹ ڈر سے چیخ کر بولی "نہیں، ابھی نہیں۔ میرا بچہ مر جائے گا۔ رحم کرو۔"

اتنا کہکر اُس نے وہ گٹھری اُس کی طرف دردناک طریقے سے بڑھائی جس میں اُس کا بچہ لپٹا ہوا تھا۔

"باہر نکل چڑیل، جلدی اِس ملعون کو ساتھ لے جا، موئی حرامکار۔"

عورت نے اتنا کہا اور دروازہ کھول کر مارگریٹ کو باہر دھکا دیدیا اور وہ مُنہ کے بل برف میں جا پڑی۔

رات کا اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا اور برف باری پھر شدت سے ہو رہی تھی۔ ہوا سے کچھ بچے ہوئے ایک گڑھے میں کوئی تاریک سی چیز دُھندلی دُھندلی نظر آ رہی تھی۔ اس کے چاروں طرف برف کا چٹیل میدان تھا جس کی میلے نیلے رنگ کی مدھم روشنی چمک رہی تھی۔

یہ مارگریٹ تھی۔ اُس کا سر کندھے اور بازوؤں کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ باقی برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ اِس وقت زندگی اور موت کی درمیانی حالت اُس پر طاری تھی۔

اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ برف کے ناپیدا کنار فرش پر ہمیشہ چلتے رہنے کی اُسے سزا ملی ہے۔ اور یہ فرش اُس کے پیروں تلے سمٹ رہا تھا اور دب رہا تھا۔ ہاتھوں میں کوئی بہت قیمتی اور نازک سی چیز تھی جسکا بوجھ بڑھنا شروع ہوا اور اُس کے کانوں میں آوازیں آنے لگیں کہ اِسے پھینک دے مگر وہ نہ مانی۔ اس کا اُسے یقین تھا کہ اس فرش کا سرا ضرور ہے اور اُسے معلوم تھا کہ جب اُس سرے پر پہونچ جائے گی تو وہاں سے کون ملے گا۔ وہاں خدا اپنے تختِ زریں پر جلوہ فرما ہوگا اور اس کی حضور میں فرشتے حمد و ثنا کر رہے ہونگے۔ اُس کی جناب میں اپنا وہ خزانہ پیش کرے گی جو اتنی دُور سے اُٹھائے لا رہی تھی اور یقیناً اُسے علم ہوگا کہ یہ خزانہ اُس کا بچہ ہے۔ وہاں اُسے مہر اور رحم کی التجا نہیں کرنی پڑیگی بلکہ ایک لفظ کہنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ بس جب وہ اپنا بچہ پیش کرے گی تو سارے فرشتے اُس پر مُسکرانے لگیں گے اور سب باتیں ٹھیک ہو جائیں گی۔

وہ کانپی اور ایکدم سے چونک پڑی۔ اب وہ کہاں تھی؟ اس کا بچہ کون لے گیا؟ ہاتھ ایسے سُن ہوئے تھے کہ ٹٹول بھی نہیں سکتی تھی۔ ارے وہ تو گود میں پڑا کمبل میں گرم گرم سو رہا ہوگا۔ وہ پھر اُونگھنے لگی اور سمجھی کہ بچے کو لوری دیکر سُلا رہی ہے۔

گرنے والی برف کے گھنے گالوں میں سے لٹکی ہوئی لالٹینیں قریب آتی دکھائی دے رہی تھیں۔ جب لالٹینیں قریب آ گئیں تو مدھم مدھم سی شکلیں بھی نظر آنے لگیں۔ ہتھیاروں کی جھنکار بھی سُنائی دینے لگی۔

تحکم کی ایک آواز گونجی "ٹھہرو۔ سامنے کوئی کالی کالی چیز ہلتی نظر آ رہی ہے۔"

دستے نے اپنا رُخ بدلا اور مارگریٹ کی طرف سب کے سب بڑھے۔ یہ خُدامِ کلیسا کا شب گرد دستہ تھا۔ ایک سپاہی نے اپنی لالٹین مارگریٹ کے چہرے کے قریب کی اور بولا "ارے یہ تو کوئی عورت ہے۔ برف کے جھکڑ نے اِسے گھیر لیا۔ برف میں آدھی دب چُکی ہے۔ بیچاری ادھ موئی ہو گئی ہوگی۔"

دستے کے افسر نے آگے بڑھکر اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا اور اُسکی آنکھوں میں پہچاننے کی چمک پیدا ہوئی پھر اطمینان کے لہجے میں بولا "چلو اچھا ہوا ہمیں یہ مل گئی۔ یہ وہی مارگریٹ ہے جس کا پتہ چلانے کا حکم بڑے پادری صاحب نے دیا ہے۔ کل اِسے اُنکے سامنے پیش کرینگے۔ اِسے کھینچکر باہر نکال لو اور اپنے ساتھ لیچلو۔"

دو سپاہیوں نے اُس کے بازو پکڑے اور اُٹھا کر کھڑا کر دیا۔ مارگریٹ کے ہاتھوں میں سے لپٹا ہوا بچہ چھوٹ کر نیچے قدموں میں گر پڑا۔ ایک سپاہی نے اُسے کھول کر دیکھا اور پھر افسر کی طرف دیکھ کر بولا "بچہ ہے بہت چھوٹا مرا ہوا۔"

افسر کی آنکھیں چالاکی سے چمکنے لگیں۔

"اسی کا بچہ ہے۔ تو یہ کھوکھلی بے حیائی اور گناہ کا ثبوت غارت کرنے کی فکر کر رہی تھی۔ پکڑو اس خونی ڈائن کو۔"

یہ دستہ روڈا کی طرف پلٹا۔ دو سپاہی نیم بیہوش مارگریٹ کو سنبھالے ہوئے نہیں بلکہ اُٹھائے ہوئے تھے اور ایک سپاہی پیچھے پیچھے اس کا بچہ اُٹھائے چل رہا تھا۔

یکایک مارگریٹ کے ذہن میں جان پڑ گئی۔ ڈری ہوئی نظروں سے اپنے گرفتار کرنے والوں کو دیکھا خوف سے دل اُچھلنے لگا۔ چیخ کر بولی "میرا بچہ کہاں ہے؟ میری ننھی سی جان کو تم نے کیوں چھین لیا؟"

"تجھے خوب معلوم ہے کہ تیرے بچے کو کیا ہوا؟" افسر نے غرّا کر کہا "اری ڈائن۔ اپنے گناہ کو چھپانے کے لئے تو نے اپنے بچے کو مار ڈالا۔ وہ رہا ہمارے پاس اس کا ثبوت۔ دیکھ!" اتنا کہہ کر اُس نے گٹھڑی کی طرف اشارہ کیا جسے پیچھے پیچھے سپاہی اُٹھائے لا رہا تھا۔

چند لمحوں تک مارگریٹ گٹھڑی کی طرف گھورتی رہی اور اُن الفاظ کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتی رہی جو اُس نے ابھی ابھی سنے تھے۔ جب اس کی سمجھ میں آیا کہ بچہ مر گیا تو اُس کی ایک خوفناک چیخ نکلی، لمبی اور وحشیانہ۔ پھر اُس نے اُن سپاہیوں کو مارنا شروع کیا جو اُسے پکڑے ہوئے تھے اور اپنے بچے تک پہونچنے کے لئے مچل گئی۔ لیکن اُنہوں نے اُس کے بازو پکڑ کر اُٹھا لیا اور وہ اُن کے ساتھ چلنے پر مجبور تھی۔

اُس کی عقل و تمیز جاتی رہی تھی۔ ہر چیز اور ہر انسان جس سے اُسے محبت تھی اُس سے چھین لی گئی تھی۔ سب، سب کچھ جا رہا تھا، اُمید کی آخری چنگاری بھی، اس کا کمزور غریب بچہ۔

اُس کا سر پیچھے کو گرا ہوا تھا، سپاہی اُسے گھسیٹے لئے جا رہے تھے اور وہ چیخیں مار رہی تھی جیسے کوئی پاگل چیخے۔ چیختے چیختے اُس کے لبوں پر ایک نام آ گیا اور وہ اس نام ہی کو بار بار وحشیانہ طور پر چیخ رہی تھی۔

"فاؤسٹ! فاؤسٹ! فاؤسٹ! فاؤسٹ!"

نواں باب

قیدخانے کی کوٹھڑی میں مارگریٹ خشک گھاس پر پڑی ہوئی تھی۔ یہ کوٹھری بڑے بڑے پتھروں کو چن کر بنائی گئی تھی۔ اس میں چاروں طرف اندھیرا تھا۔ صرف اوپر چھت کے قریب ایک موکھا تھا جس میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ان میں سے اندھی اندھی روشنی کوٹھڑی میں آ رہی تھی۔

کچھ دیر مارگریٹ بےحس و حرکت پڑی رہی۔ پھر اُس نے گھاس کو نوچنا شروع کیا، مٹھیاں بھر بھر کر اُٹھاتی اور اس پر محبت سے ہاتھ پھیر کر کہتی "خوشنما پھولو۔ لاؤ اپنے محبوب کے لئے میں تمہارا ایک گجرا گوندھوں۔ اس کے لئے بادشاہ کا ایک تاج بناؤں۔ اس سرفرازی سے تمہاری عزت افزائی ہوگی نا؟ اس کی پیشانی پر تمہیں جگہ ملے گی، اور وہاں سے جھک کر تم اُس کی سیاہ آنکھوں میں جھانک کر دیکھو گے۔"

اُس نے بڑی تیزی سے خشک گھاس کو گوندھ کر گھیرا سا بنایا اور اپنی ہتھیلیوں پر رکھ کر ہاتھ پھیلا دئے۔ وہ عجیب شان سے سیدھی کھڑی تھی۔ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور پتھرائی ہوئی۔ لیکن ان میں شرم و حجاب کی جھلک تھی گویا وہ اپنے محبوب کو دیکھ رہی تھی مگر اُس سے بات کرنے کی جسارت نہ کرتی تھی۔ پھر گھاس کا تاج اُٹھایا اور بڑی تمکنت سے اپنے سر پر رکھ لیا اور جیسے کوئی بھولی بسری باتیں یاد آ رہی ہوں آہستہ آہستہ بولی "دیکھو میں تمہیں اپنا ملکہ بنا کر تاج پہناتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر دبی ہوئی آواز میں اُس نے وہ گیت گانا شروع کیا جو گھیرے کے کھیل میں بچوں نے وادی میں گایا تھا اور فاؤسٹ آنکھوں میں محبت کی چمک لئے اُس کے قریب آیا تھا۔

"اوپر ڈھونڈو نیچے ڈھونڈو۔

اُس کے سر پر تاج رکھو

تاج تو خوشیاں لائے گا لیکن

بوسے سے پہلے چھو تو لو۔"

مارگریٹ نے سر پر سے تاج اُتار لیا اور پھر محبت سے اُس پر ہاتھ پھیر کر بولی "خوبصورت۔ آج۔ میرے لئے تو کتنی خوشی لایا ہے، گو بعض لوگ کہتے ہیں کہ میں اس خوشی کی مستحق نہیں ہوں۔

اوپر ڈھونڈو نیچے ڈھونڈو......"

اُس نے پھر گانا شروع کیا لیکن ایک دم سے رک گئی اور کہنے لگی: "فضول سا تھکا دینے والا گیت ہے۔ بچوں آؤ ایک اور گیت گائیں۔ "ایک دو تین

تم آزاد ہو

ایک بوسہ اُس کے لئے

ایک بوسہ تمہارے لئے"

"دیکھو پیارے بچو! سپنا کیسا سہانا گیت ہے! بس اس نے پیار کیا اور تمہارا گھیرا ٹوٹا۔ ایک بوسہ۔ اور چھٹی ارے واہ جوں!"

اس کے چہرے پر انتشار کی کیفیت پیدا ہوئی۔ ہاتھ سے گھاس کا گچھا چھوٹ کر نیچے گر پڑا اور قید کی دیواروں کو گھبرا گھبرا کر دیکھنے لگی۔ پھر اس نے کمرے میں سے باہر کی طرف دیکھا۔ اسے اٹھانے کے لئے جھکی مگر اتنے ہی میں اپنا ارادہ بدل دیا اور گھاس ہی پر دوزانو ہوگئی۔ گود میں بہت ساری گھاس اٹھالی اور اسے سینے سے لگا کر بل کر لوری دینے لگی:-

آنکھیں موندو رات کا وقت ہے۔
آنکھیں کھولو دن کا وقت ہے۔
تیرے ابا آئے ہیں۔
سونے کی گاڑی میں آئے ہیں۔
ہم کو لینے آئے ہیں
سو جا میرے راج دلارے۔
سو جا میری آنکھوں کے تارے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

پھول کی ڈنڈی ہاتھ میں تیرے۔
سر پہ ہے پھولوں کا تاج۔
جہاں سنہری پھول کھلے ہیں،
بھینی بھینی خوشبو ہے،
وہاں تری سکھ سیج سجے گی۔
سو جا میرے راج دلارے،
سو جا میری آنکھوں کے تارے۔

کوٹھڑی کے باہر قدموں کی آواز سنائی دی۔ قفل میں کنجی پھری۔ مارگریٹ پیچھے ہٹ کر کونے میں دبک گئی اور دروازے کی طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔

دروازہ کھلا اور محافظ کنجیوں کا بھاری گچھا لئے اندر آیا۔ یہ ایک بڈھا آدمی تھا جس کا دل دردناک مناظر دیکھتے دیکھتے سخت ہوگیا تھا۔ اس کے پیچھے دروازے کے باہر دو سپاہی کھڑے تھے۔ محافظ نے بے جذبہ آواز میں کہا—

"عدالت کلیسا تمہارے مقدمے کی سماعت کرے گی۔ اپنے بچے کو مار ڈالنے کی فردِ جرم تم پر لگائی گئی ہے۔"

مارگریٹ نے ایک چیخ ماری اور محافظ سے لپٹ گئی اور رو رو کر پوچھنے لگی "تم نے اسے کہاں چھپا دیا؟ میرا بچہ! اے رحمدل پیرمرد بتاؤ میرا بچہ کہاں ہے؟ اسے کہاں لے گئے ہیں؟"

محافظ نے اپنا کوٹ اس کے ہاتھوں سے چھڑایا اور مارگریٹ پھوٹ پھوٹ کر روتی گھاس پر گر پڑی۔

پھر اس کی طبیعت میں انقلاب سا ہوا۔ وحشیانہ عجلت کے ساتھ وہ اپنے گھٹنوں پر جھکی اور بڑی تیزی سے گھاس کو ہٹانے اور اچھالنے لگی گویا کسی چیز کو تلاش کر رہی تھی۔ پھر مسکرانے اور ہنسنے لگی اور آپ ہی آپ کہنے لگی "اب یاد آیا ہے۔ وہ تو برف ... کے نیچے آرام سے گرم گرم سو رہا ہے۔"

دسواں باب

مارگریٹ کی پریشانیوں کے زمانے میں اس طویل مدت میں اسے فاؤسٹ کو نہ تو کوئی پیغام پہونچا اور نہ اس کی کوئی خیر خبر ملی۔ فاؤسٹ کو اسنے چند بار اپنے خوابوں میں دیکھا تھا —— نور کا ایک مجسمہ جس میں سے محبت اور پیار کی کرنیں نکل رہی تھیں بعض اوقات اس نے فاؤسٹ کی محبت آمیز سرگوشیاں سنی تھیں لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ سب حقیقت خواب ہیں جو خود اس کے متخیلہ نے بنائے ہیں۔ کئی دفعہ اس نے اپنی تمام ذہنی قوتوں کو مجتمع کیا اور خلا بسیط میں انہیں منتشر کیا تاکہ اس کے محبوب تک پہونچ جائیں۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کی محبت اس قدر شدید ہے کہ فاؤسٹ ضرور کبھی کبھی اسکے وجود کو اپنے نزدیک محسوس کرتا ہوگا۔

اس کا اسے یقین تھا کہ فاؤسٹ ابھی زندہ ہے، دل گواہی دیتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی آتا تھا کہ کسی بہت بڑے خطرے میں گھرا ہوا ہے۔ مگر فاؤسٹ نے اپنی روح کو اس کی تلاش میں کبھی نہیں بھیجا تھا۔ شاید مارگریٹ کا شبہ غلط نہ ہو۔ فاؤسٹ مر نہ گیا ہو۔ مگر نہیں۔ یہ خیال کرنا دیوانہ پن ہے بلکہ گناہ ہے۔ اس کی روح میں ایک یقین تھا جسے سارے صدموں نے زائل نہیں کیا، جو اتنا ہی واثق تھا جتنا کہ خدا کا یقین۔ اور وہ یہ تھا کہ مرنے سے پہلے وہ اپنے محبوب کو ضرور دیکھیگی۔

مارگریٹ کا خیال ٹھیک تھا۔ فاؤسٹ ابھی دنیا میں گھوم رہا تھا۔ گو اس نے اپنی محبوبہ کو کوئی پیغام نہیں پہونچایا تھا تاہم اس کے خیالات میں وہ ضرور بسی ہوئی تھی۔

ولنٹین کی موت پر میفسٹو کے کہنے کے مطابق وہ روڈا سے فرار ہوگیا تھا مگر اس خیال سے اس کا دل بے چین تھا کہ اپنی محبوبہ کو اس کے ہاتھوں کس درجہ رنج و غم کا شکار ہونا پڑا۔ تکلیف دہ خیالات کا ایک دور اس پر گزرا اور نتیجے کے طور پر اس نے ایک زبردست ارادہ کیا۔ جدائی کا تحفہ خود اس کے لئے

اور ان کے لئے بھی جن سے اُسے محبت تھی ایک عذاب ثابت ہوا۔ مارگریٹ پہلی عورت تھی جس سے اس نے بے لوث اور سچی محبت کی لیکن اُس کے لئے تباہی و بربادی کے سوا کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ بس تو آئندہ پھر کبھی وہ اسے نہ دیکھے گا۔ فاؤسٹ کی قسمت کا منحوس ستارہ اس کے مطلع حیات کو آئندہ کبھی مکدر نہ کریگا۔

فاؤسٹ کو پوری طرح علم نہیں تھا کہ مارگریٹ پر مصیبتوں کے کیسے کیسے پہاڑ ٹوٹے۔ وہ تو صرف اتنا جانتا تھا کہ مارگریٹ کی زندگی اُسنے برباد کردی، اس کا دل توڑ دیا اور ساری عمر کے لئے اس کا چین اور آرام غارت کر دیا۔ اس کے بھائی کے مرجانے کا اُسے یقین تھا۔ ماں کو مرتے دیکھا تھا مگر یہ معلوم نہ تھا کہ وہ مرگئی۔ سوچتا تھا کہ جب اسے معلوم ہوا ہوگا کہ بیٹی پر کیا سانحہ گزر گیا تو ماں کا دل کیسا کیسا کُٹتا ہوگا۔ اس نے چاہا تھا کہ اپنی محبوبہ پر اپنی محبت کے سارے خزانے لٹا دے مگر اس کے بدلے یہ کیا کہ سانپوں سے بھرا ہوا ایک بکس اس کے حوالے کر دیا۔ بس اب تو یہی کرنا چاہئے کہ مارگریٹ کی زندگی سے یکسر علیحدہ ہو جائے اور اس کے خیال کو بھی اپنے دل سے اکھاڑ پھینکے۔

اس خیال کو بھلانے کے لئے میفسٹو کی ہدایتوں کے مطابق وہ ایک سے ایک نئی دلچسپی میں منہمک ہوا۔ بھیس بدل بدل کر ساری دُنیا کا سفر کیا۔ مشرق اور شمال کے دُور سے دُور ممالک میں پھرا اور یورپ کے تقریباً ہر شہر میں گھوما۔ تاریخ کے گزرے ہوئے زمانوں میں سحر کے زور سے پہونچ گیا اور عیش و نشاط میں غرق ہو گیا کہ کسی طرح اس غمگین صورت کی حسین لڑکی کی یاد دل سے محو ہو جائے جس کی زندگی کو اس نے اس بُری طرح برباد کیا تھا۔ لیکن وہ اُس کے ذہن سے ایک لمحہ کے لئے بھی جُدا نہ ہوتی تھی۔

اس وقت فاؤسٹ ایک بہت بڑے غار میں کھڑا تھا۔ میفسٹو کے ارضی مسکنوں میں سے ایک یہ بھی تھا جو اس قدر پوشیدہ اور اُجاڑ مقام تھا کہ انسان کا خیال بھی اُس کی طرف پرواز نہیں کرتا تھا۔ جب سے دُنیا بنی تھی سوائے فاؤسٹ کے کسی انسان نے اس خطہ پر قدم نہیں رکھا تھا۔ اُس کا چہرہ غم آلود اور سر جھکا ہوا تھا۔

اُسکے پیچھے اسکا عکسِ بدی میفسٹو کھڑا تھا۔

میفسٹو نے تند نظروں سے فاؤسٹ کی طرف دیکھا کہ اس شخص کے دل سے خصائص خداوندی ابھی تک پوری طرح زائل نہیں ہوئے تھے، بولا "تو اب بھی مطمئن نہیں ہے فاؤسٹ۔ دولت، عورتیں، عیش، علم اور دُنیا کی ساری طاقتوں پر تجھے اقتدار حاصل ہے۔ لیکن تو اب بھی سوچ میں ہے۔ اب بھی رو رو کر اُسی بیوقوف چھوکری کی دُھن سوار ہے۔"

فاؤسٹ غصے سے پلٹ کر بولا "تو نے مجھے دھوکا دیا۔ میرے گناہوں کی سزا مارگریٹ کو مل رہی ہے۔ میں نے اُس کی آواز سنی ہے۔ جب میں عشرتوں میں غرق ہو کر اس کے خیال کو بھلانے کی کوشش کرتا ہوتا تھا تو اُس کی آواز خلا کو چیرتی ہوئی میرے کانوں تک آتی تھی اور میں اس سے بچنے کے لئے اپنی رُوح کو چھپاتا تھا کیونکہ اُس کا جواب دینے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ کل رات کو وہ میرے خواب میں آئی اور اُسکے چہرہ پر عجیب بیم و ہراس کے آثار تھے۔ میرا ارادہ مرجھا گیا۔ مجھے معلوم کرنا ہے کہ اُس پر کیا بیت رہی ہے۔"

میفسٹو نے حقارت سے جواب دیا "اور اگر اس پر بُری بیت رہی ہوگی تو کیا تیری وجہ سے؟ اُس نے اپنے کرتوتوں سے پادریوں کو اپنے پیچھے لگا لیا جو اُسے اسکی غلطیوں کی سزا دے رہے ہیں۔"

"اچھا! اُس کی زندگی میں ہمارا کچھ دخل ہی نہیں! تُو نے ہی تو وہ عرق بنایا تھا جو میں نے اُسے پلایا تھا۔"

فاؤسٹ نے بڑے غصہ سے جواب دیا۔ پھر ایک دم سے اُس نے اپنا سر پھیرا اور کان لگا کر سننے لگا۔ ہاتھ کی جنبش سے میفسٹو کو خاموش رہنے کا حکم دے کر بولا "خاموش! میری محبوبہ مجھے پھر آواز دے رہی ہے۔" وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ لب سے لب جدا تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ مارگریٹ کی آواز اُسے سنائی دے رہی تھی اور اس آواز میں کرب و صعب کی دردناک التجا تھی:-

"میرے محبوب تیری مارگریٹ تجھے پکارتی ہے۔ آ۔ اس سے پہلے کہ پانی سر سے اُونچا ہو جائے۔"

فاؤسٹ نے چیخکر کہا "تو کہاں ہے مارگریٹ!" مگر کوئی جواب نہیں آیا گو فاؤسٹ دیر تک کان لگائے سنتا رہا۔ پھر جلدی سے میفسٹو کی طرف پلٹ کر بولا "مجھے دکھا وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے"

میفسٹو کی آنکھیں سکڑ گئیں اور چہرے سے نارضامندی ظاہر ہو رہی تھی لیکن وہ تعظیماً جھکا اور بولا "تُو نے حکم دیا ہے۔ اچھا تو دیکھ اس غار میں۔"

جس غار میں یہ کھڑے تھے اُس کے پیچھے ایک اور چھوٹا غار تھا اور اُس کے تاریک دہانہ میں فاؤسٹ گھورتا رہا۔ اس میں رفتہ رفتہ روشنی چمکنے لگی اور ایک منظر واضح ہوتا گیا۔ یہ منظر اتنا صاف ہو گیا کہ اس میں انسان چلتے پھرتے نظر آنے لگے، بالکل جیسے گوشت پوست کے انسان چل پھر رہے ہوں۔

فاؤسٹ نے دیکھا کہ ایک نیچی سی چھت کا کمرہ ہے۔ اس میں ایک،

بیں میز بچھی ہے۔ اس کے ایک طرف کئی آدمی کالے کالے چغے پہنے بیٹھے ہیں۔ اُس کا دل دھک سے ہو گیا کیونکہ ان آدمیوں کے سامنے اسے مارگریٹ اس طرح کھڑی نظر آئی کہ ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے اور سپاہیوں کا ایک دستہ اس کی نگرانی کر رہا تھا۔ مارگریٹ اس قدر بدل گئی تھی کہ فاؤسٹ اس کی موجودہ ہیئت کذائی کو دیکھ کر کانپ اٹھا۔ جب اُس نے پہلے پہل دیکھا تھا تو وہ ایک چونچال لڑکی تھی، جنگلوں کی رانی۔ کبھی ہنستی اور مسرت سے اس کا چہرہ معصومیت اور خوشی سے چمکتی تھی لیکن اب روشنی اور قہقہو کے ساتھ تمام مسرتیں ختم ہو چکے تھے۔ اب تو حالت یہ تھی کہ اُسے دیکھ کر ترس آتا تھا۔ وہ پتھر کی طرح جامد اور خود مجسم غم و اندوہ بنی ہوئی تھی۔ سیاہ لباس والوں میں سے ایک کھڑا ہوا۔ فاؤسٹ کی طرف اس کی پیٹھ تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے اوپر اٹھائے اور اس کے دونوں ہاتھوں کے درمیان ایک سفید چھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ ایک دم سے جھکے اور ان کے جھکتے ہی وہ چھڑی ٹوٹ گئی۔ فاؤسٹ نے دیکھا کہ مارگریٹ کے چہرے پر موت کی زردی چھا گئی اور لبوں سے معلوم ہوتا تھا کہ شدت غم سے وہ چیخ رہی ہے۔ پھر یہ ساری شکلیں گڈمڈ ہونے لگیں اور دھوئیں کی طرح مل کر یہ منظر فاؤسٹ کی نظروں سے غائب ہو گیا۔

فاؤسٹ نے ایک خوفناک چیخ ماری۔

"سفید چھڑی! اُسے یہ تو موت ہے! میفسٹو اُسے بچا۔ بچانا پڑے گا تجھے! اُسے میرے پاس لے آ۔ ورنہ میری ابدی بددعا تیرے لئے ہو"

میفسٹو بے رحمی سے ہنس کر بولا: "تیری بددعا! کیا میں منتقم کے الفاظ کو بے اثر کر سکتا ہوں! اُس کے انتقام کی بجلیوں کو میں کیسے لوٹا سکتا ہوں! اُسے بچاؤں؟ بھلا اُسے تباہ و برباد کرنے والا کون تھا، میں یا تو؟"

"تو میفسٹو! ہر زمانے کی بدی کا محرک! تو وہ غلاظت ہے جس سے چاروں طرف غلاظت پھیلتی ہے۔ تو نحس عطیات سے سرفراز کرتا ہے۔ بس ایک آخری تحفہ میں تیرے ہاتھ سے اور لوں گا۔ مارگریٹ کو بچانے کیلئے مجھے لے چل"

"کیا تجھے معلوم نہیں ہے فاؤسٹ کہ روڈا میں تیرے لئے کیا خطرہ ہے؟ تو قاتل ہے۔ روڈا میں تو نے خون بہایا ہے۔ مقتول کے شہر پر انتقام کی روحیں قاتل کے انتظار میں منڈلا رہی ہیں۔ روڈا میں تیری قسمت پر میری قوتیں اثر انداز نہیں ہو سکتیں"

فاؤسٹ نے بے صبری سے چیخ کر کہا: "مجھے اُس کے پاس فوراً لے چل"

میفسٹو کی بھنویں سکڑ کر آڑی ہو گئیں اور اس نے دیدے چمکا کر کہا: "اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ پانی سر سے اونچا ہو چکا۔ تیری امداد کا وقت نکل گیا۔ تیری محبوبہ کے لئے تو چتا چنی جا رہی ہے"

"ابھی تک تو میرا غلام ہے۔ تیار ہو جلدی۔ ابھی میں تجھے حکم دیتا ہوں"

میفسٹو نے سر تسلیم خم کیا۔ چہرہ نفرت و حقارت سے بگڑا ہوا تھا۔ غار کے دہانے پر آ کر بولا: "میرے گھوڑے تیار ہیں"

باہر میفسٹو کی جہنمی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ اس میں چار شب رنگ گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ اُن کی آنکھیں دہک رہی تھیں، بے صبری سے بار بار اپنا سر اچھالتے اور زمین پر سُم مارتے تو چنگاریاں جھڑنے لگتیں۔

گاڑی میں دونوں سوار ہوئے اور اس تیز رفتاری سے آسمان میں اڑے جیسے بجلی کوند رہی ہو، لیکن فاؤسٹ یہی کہے جاتا تھا کہ "تیز چلو اور تیز چلو۔ میں اپنی محبوبہ کو ایک دفعہ اور ضرور دیکھوں گا میں اُسے آگ سے ضرور بچاؤں گا"

ادھر تو یہ خلا کو چیرتے چلے آ رہے تھے اور اُدھر مارگریٹ کمرۂ عدالت سے نکل کر سیدھی اُس مقام کی طرف لائی جا رہی تھی جہاں وہ جلائی جانے والی تھی۔ یہ ایک نیچی سی پہاڑی تھی جس کی چوٹی پر ایک لوہے کی لاٹ گڑی ہوئی تھی اور اس لاٹ کے چاروں طرف لکڑیوں کے بڑے بڑے گٹھے چنے ہوئے تھے۔

جب قید خانہ کی کوٹھڑی سے نکال کر مارگریٹ کو عدالتِ کلیسا کے سامنے پیش کیا گیا تھا تو وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر تھی۔ جب قید خانہ کے محافظ نے اُس کے بچے کا ذکر کیا تھا تو اُس کی یادداشت ابھر آئی تھی اور اس کے ساتھ ہی غم کی چھریاں بھی اُس کے دل پر چلنے لگی تھیں۔ اس دردناک کیفیت کو اس فریب دل نے گویا ازراہ کرم زائل کر دیا کہ اُسے اپنا بچہ برف میں سے مل گیا تھا۔ جب عدالت میں گئی تھی تو اُسے یہی خیال تھا کہ اپنے بچے کو گود میں لئے ہوئے ہے۔

کالے کالے لباس پہنے سخت سخت چہرے والے آدمیوں نے اُس سے کئی سوالات کئے تھے جن میں سے ایک کو بھی وہ سمجھ نہ سکی تھی۔ یہ لوگ اُسے پادری معلوم ہو رہے تھے۔ بس تو میں انہی لوگوں سے کہوں گی کہ میرے ننھے فاؤسٹ کو بپتسمہ دیدیں۔ نہیں، یہ نام تو اُسے اپنی زبان سے نکالنا ہی نہیں چاہیئے ورنہ انہیں معلوم ہو جائے گا۔ اب وہ خائف بھی

نہیں تھی کیونکہ اب تو سپاہی اُسے گھیرے کھڑے تھے تاکہ اس کے بچے کو کسی قسم کا گزند نہ پہونچے۔

پھر اس نے اپنے محبوب کا نام سنا۔ اُس کا جسم کانپنے لگا اور دل پر اندیشہ پیدا ہوا ذہن میں اس کا شائبہ سا آیا کہ اس طرح لوگوں کا اُس کے گرد جمع ہونے کا کیا مقصد تھا سنتے ہی ہیں ایک غضب آلود آواز اُس کے کان میں آئی "جواب نہیں دے گی تو؟ تیرے عاشق کا یہی نام ہے نا؟ اسی کو تونے آوازیں دی تھیں نا؟ یہ فاؤسٹ ہی ہے نا جس نے تیرے بھائی ویلنٹین کو قتل کیا ہے!"

مارگریٹ یکدم سے چیخ مار کر بولی "نہیں، نہیں! وہ یہ نہیں کر سکتا تھا۔ فاؤسٹ ایسی حرکت کر ہی نہیں سکتا"

اب پھر اس کا حافظہ زائل ہو گیا، اور اس پر سکتہ کا سا عالم طاری ہو گیا۔

وہ لوگ جو اُسے گھیرے ہوئے تھے اور سوالات پوچھ رہے تھے اُس کی اس خود فراموشی کو ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی سمجھے کہ دیکھو کیسی دیدہ دلیر اور چالاک ہے کہ اپنے جرم پر نادم تک نہیں ہوئی اور اس کوشش میں لگی ہوئی ہے کہ کسی طرح ویلنٹین کے قتل کا پتہ نہ چلنے پائے۔

بالآخر اس کے منصفوں نے چپکے چپکے آپس میں مشورہ کیا۔

ان میں سے ایک نے کہا "اس فاؤسٹ کا پتہ ہم اس سے کچھ نہ چلا سکے اس پر جو الزامات تھے وہ پایۂ ثبوت کو پہونچ گئے۔ بس ہمیں اپنا فیصلہ سنا دینا چاہیے۔

سب نے بہ اتفاقِ رائے فیصلہ سنایا "چتا! قاتلہ کو چتا میں جھونک دیا جائے"

ایک دبلا لمبا سا پادری جو بیچ میں بیٹھا ہوا تھا کھڑا ہوا اور میز پر سے موت کی سفید چھڑی اٹھائی، سر سے اونچی کی اور بہ آوازِ بلند بولا "مارگریٹ۔ اس مقدس عدالت نے تیرے مقدمے کو میزانِ عدل میں تولا اور تجھے مجرم پایا۔ تیرے ساتھ کسی قسم کی نرمی برتی نہیں جا سکتی کیونکہ تجھ سے جو معلومات ہم حاصل کرنا چاہتے تھے تو نے اُسے اخفا کیا۔ اپنے بچے کو مار ڈالنے کے جرم میں تجھے ہم موت کا حکم سناتے ہیں اور وہ اس طرح کہ تو آگ میں جلائی جائے۔ اس عدالت سے چتا تک تجھے شہر کے باہر باہر لے جایا جائے گا۔ خدا کا رحم تجھ پر نازل ہو اور اس سے پہلے کہ تیری روح تن سے جدا ہو تیرا ضدی دل اُس کے رحم و کرم سے پگھل جائے"

بچے کا ذکر آتے ہی مارگریٹ کے سلب شدہ ہوش و حواس پھر عود کر آئے۔ فیصلہ سنانے والے منصف کی خوفناک صورت کو اُس نے دیکھا اور سفید چھڑی کو اُس کے ہاتھوں میں ٹوٹتے سنا۔ گمشدہ بچے کا خیال، خود اس پہ جو وحشیانہ الزام لگایا گیا اور پایۂ ثبوت کو پہونچایا گیا، اپنے محبوب کی یاد جسے آئندہ کبھی دیکھنا نصیب نہ ہوگا اور پھر وہ خوفناک سزا جو عدالت سے باہر نکلنے کے بعد اُسے ملنے والی تھی، ان سب باتوں کے دھیان سے اُس کی ایک دردناک چیخ نکل گئی۔ یہی انتہائی صدمہ اور تکلیف کی چیخ تھی جو خلا کے رازوں کو چیرتی چلی گئی اور فاؤسٹ جو میفسٹو کے ساتھ اس غار میں کھڑا تھا اُس کی روح میں یہ چیخ تحلیل ہو گئی اور وہ خوف سے کانپنے لگا۔

فاؤسٹ اور میفسٹو ایک پہاڑی پر کھڑے تھے جو روڈا کے قریب تھی۔ اس سے ایک میل کے فاصلہ پر ایک اور پہاڑی تھی جس کی طرف یہ دونوں نظر جمائے ہوئے تھے۔ اُس پہاڑی کی چوٹی پر وہ لوہے کی لاٹ صاف دکھائی دے رہی تھی جس کے چاروں طرف لکڑیوں کے گٹھے چنے ہوئے تھے۔

فاؤسٹ نے کہا "بس وقت پر آگیا دیکھو۔ لوگوں کی بھیڑ پہاڑی پر ابھی آدھے راستے تک پہونچی ہے میری محبوبہ ابھی دکھائی نہیں دیتی۔ مجھے اس پہاڑی پر لے چل۔ پھر میں اسے بچا لونگا"

میفسٹو نے اُس کی طرف تمسخر سے دیکھکر کہا "اس مقام پر میری قوت ختم ہو جاتی ہے۔ روڈا میری طاقت سے باہر ہے۔ اگر اُسے تو بچانا ہی چاہتا ہے تو اپنے ہی بل بوتے اور اپنی ہی ذمہ داری پر بچا"

یہ الفاظ گھونسے کی طرح فاؤسٹ کے دل پر لگے۔ ایک لمحہ کیلئے تو اُس کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ منہ کھولے بس میفسٹو کی طرف دیکھتا رہا۔ جب اس کا احساس ہوا کہ میفسٹو نے کس طرح اُسے دھوکا دیا اور فریب میں مبتلا کیا تو غضبناک ہو کر میفسٹو سے بولا "دنیا کے دل کو چبانے والے زہریلے کیڑے کاش تو مجھے شباب کا لالچ دے کر اس عذاب میں مبتلا نہ کرتا۔ لعنت ہو اس شباب پر۔ ہزار لعنت"

جلدی سے پلٹ کر اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ اس پہاڑی سے اترنے کا کونسا راستہ ہو سکتا ہے جو سامنے والی پہاڑی سے قریب ترین بھی ہو۔ پھر وہ کودا اور بڑی بڑی چھلانگیں مارتا نیچے اتر میدان میں سرپٹ بھاگا جا رہا تھا جیسے کسی ڈراؤنی بلا سے کوئی ڈر کر بے تحاشہ بھاگ رہا ہو۔

میفسٹو اُسے دیکھتا رہا اور پھر ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔ پہاڑی

کی چوٹی پر اب کچھ لوگ نظر آنے لگے تھے اور فاؤسٹ بھی پہاڑی کے قریب پہونچ اب تھا۔ میفسٹو نے ایک نغمہ سا سنا اور دیکھا جس کے بیچ میں ایک عورت پشیمانوں کا لمبا سفید کرتا پہنے چل رہی تھی۔ یہ جلوس بہت پوش پہاڑی پر چڑھ رہا تھا آہستہ آہستہ یہ مختصر جلوس پہاڑی میں مدغم ہو گیا اور اتنے ہی میں پہاڑی پر بڑی تیزی سے فاؤسٹ نے چڑھنا شروع کیا۔

میفسٹو نے ایک تمسخرانہ نظر فاؤسٹ پر ڈالی اور اپنے جبہ میں سے ایک چھوٹا سا آئینہ نکالا۔ یہ آئینہ وہی تھا جو ایک دفعہ پہلے بھی اس نے فاؤسٹ کے کمرہ مطالعہ میں نکالا تھا۔ اس آئینے کو اس نے دیکھنا شروع کیا۔ بوڑھے فاؤسٹ کا چہرہ اس میں نظر آ رہا تھا جو بڑی منت سماجت سے التجا کر رہا تھا۔ فاؤسٹ اس کی طرف دیکھکر اس طرح ہنسا جیسے کوئی منہ چڑا رہا ہو۔ پھر اس آئینے کو اس طرح اوپر اٹھایا کہ بوڑھے فاؤسٹ کا منہ سامنے والی پہاڑی کی طرف ہے اور اپنے ہاتھ کو زور سے جھٹکا دیکر فاؤسٹ کی طرف اشارہ کر کے کرخت آواز میں بولا۔

"تو نے شباب کو عذاب بتایا ..... اس عذاب کو میں تجھ سے دور کر دونگا۔ کم از کم اس عذاب سے تو تجھے نجات دلا ہی دوں .. .. تو نے خود ہی اس کی خواہش کی ہے"

پھر اس کی آنکھیں دہکنے لگیں اور ان میں شعلے بھڑکتے نظر آئے گویا جہنم کا سانس انہیں ہوا دے رہا تھا چہرہ خباثت سے مسخ ہو گیا تھا۔ ایک دفعہ پھر اس نے اپنی بھیانک مسکراہٹ سے آئینہ میں دیکھا اور چیخکر بولا "جیسا تو تھا ویسا ہی ہو جا" اتنا کہا اور شیطانی جذبہ سے اس آئینے کو نیچے پتھروں پر دے مارا۔

فاؤسٹ لوگوں کے مجمع سے کوئی سو گز کے فاصلے پر تھا۔ اپنی مارگریٹ کو لوہے کی لاٹ سے بندھا ہوا دیکھ سکتا تھا۔ یہ دیکھکر اس کی روح کانپ گئی کہ ایک جلاد نے مشعلیں روشن کیں اور اپنے ماتحتوں کو دیں۔ صدمہ سے دل پاش پاش ہو رہا تھا۔ وہ آگے بڑھا لیکن اب امید بندھ گئی تھی کہ وقت پر پہونچ جائے گا۔ اس پر اس نے غور ہی نہیں کیا کہ جب وہاں پہونچ جائے گا تو کیا کرے گا۔ غرض صرف یہ تھی کہ اپنی محبوبہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر اس سے معافی کا خواستگار رہو۔

پھر ایک دم سے گویا اس پر بجلی گر پڑی۔ اس کی ٹانگوں نے جواب دیدیا۔ اور تھوڑی دیر تک گرا ہوا اپنی بے بسی و بے چارگی پر حیران ہوتا رہا۔ اٹھا، قدم لڑکھڑائے، بمشکل سنبھلا ہاتھوں پر نظر پڑی تو سوکھے اور مرجھائے ہوئے۔ خود بخود چہرے پر ہاتھ پہونچ گئے۔ اب خوفناک

حقیقت اس پر کھل گئی۔

وہ شباب جسے اس نے عذاب بتایا تھا اور جس کی اس وقت سب سے زیادہ ضرورت تھی اس سے چھن گیا تھا۔ اب وہ پھر وہی بوڑھا فاؤسٹ تھا۔ سفید لٹیں اور لمبی سفید ڈاڑھی۔ طاقت اس میں نام کو نہ صرف ارادہ کی قوت تھی جس سے اس عورت تک پہونچنا چاہتا تھا جو جسمانی اور روحانی ہلاکت کا باعث بنا تھا۔ بڑی مشکل سے لرزتا کانپتا وہ آگے بڑھا اور شدید اذیت و تکلیف سے مجمع میں داخل ہوا۔ لوگوں نے اس بڈھے کے لئے راستہ چھوڑ دیا لیکن آگے سپاہیوں نے اس کا راستہ روک دیا۔ سپاہیوں کے گھیرے میں سے اس نے مارگریٹ کو دیکھا کہ لوہے کی لاٹ سے کس کر بندھی ہوئی ہے۔ اس کے خوبصورت بال کھلے ہوئے کمر تک لٹکے ہوئے تھے۔ اعضا میں وہی اگلا سا لوچ لیکن جیسا اس وقت تھا جب وادی میں فاؤسٹ نے اسے اپنی آغوش میں سینے سے لگایا تھا اور اسے اپنی ملکہ بنایا تھا۔ مارگریٹ کے چہرے سے خون سُت گیا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ اس کے لب آہستہ آہستہ ہل رہے تھے گویا کسی ایسی ہستی سے کچھ کہہ رہی ہے جسے اور سب نہیں دیکھ سکتے۔

فاؤسٹ نے بڑی تکلیف سے اس منظر کو دیکھا۔ پھر سپاہیوں کے گھیرے میں سے اپنا سر نکال کر باریک کپکپاتی آواز میں کہا "مارگریٹ! مارگریٹ! میری پیاری! مارگریٹ!"

اس کی آنکھیں ایک دم سے کھل گئیں گویا وہ نیند سے چونک پڑی تھی۔ اس آواز نے اس کے احساس کو ٹہوکا دیا اور اس کی یادداشت کے ساز کو چھیڑ دیا۔ لیکن اسے صرف ایک بوڑھا کھڑا دکھائی دیا جس کی لمبی سفید ڈاڑھی تھی۔ یہ بڈھا سپاہیوں کے گھیرے میں سے اس کی طرف اپنا ہاتھ پھیلائے ہوئے تھا۔ مارگریٹ نے اپنے دل میں کہا "بچارا رحمدل بڈھا! اس کی آنکھوں میں ترس کیسا جھلک رہا تھا۔ دنیا میں کس قدر غمگین ہے۔" اس کے بعد جو سزا اسے دی جا رہی تھی اس کا سہم اس پر چھا گیا۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دعا مانگنے لگی۔ اس نے دعا مانگی کہ اس کے سارے گناہ معاف کر دئے جائیں۔ جنت میں داخل ہونے کی اجازت ملے یا نہ ملے اس کی اجازت مل جائے کہ اپنی ماں اور بھائی سے مل لے۔ اپنے بچے کو ایک بار پھر گود میں لے سکے۔ اور ہاں اتنی رعایت اور کی جائے کہ فاؤسٹ کے لبوں پر معافی اور محبت کا صرف ایک بوسہ ثبت کر سکے۔

پھر شدتِ خوف کی سنسنی سارے بدن میں دوڑ گئی۔ لگ

میں آگ دیدی گئی تھی اور آگ کے شعلے گھیرا بنائے اس کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ خوفناک تپش بڑھتی جا رہی تھی۔ بھیانک سینگ پہلے تو لوگ کے تھپیڑوں کی طرح اُس کے جسم پر پڑے اور پھر اُسے نوچنے اور کھانے لگے۔ اُس نے ایک چیخ ماری۔

اس کے بعد اُسے کچھ یونہی سا معلوم ہوا کہ کسی نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔ کوئی شعلوں کو چیرتا ہوا اُس کے پاس آیا تھا۔ کسی کے رد رد کر التجا کرنے کی آواز اُسے سنائی دی۔

"معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو۔"

اس آواز کو سنکر اُس نے آنکھیں کھولیں۔ اسی بدمست نے اپنے بازو میں اُسے لے رکھا تھا۔ اُس کی رحم بھری نظریں مارگریٹ کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔

بڈھے نے چیخکر آواز دی "مارگریٹ!"

پھر ایک شعلہ جھپٹا۔ یہ اندرونی شعلہ تھا، پہچاننے، سمجھنے اور محبت کا شعلہ۔ اور اس شعلے نے ایک لمحے کے لئے اُن بھڑکے بیرونی شعلوں کو مسترد کر دیا جنہیں انسان کے ہاتھوں نے بھڑکایا تھا۔ یہ وہ شعلہ تھا جو زندگی کے مرکزوں کے گرد اچھل رہا تھا، جسے روح ہوا دے رہی تھی اور اس میں ایک جلا کر بھسم کر دینے والا جذبہ تڑپ رہا تھا۔ زندگی کا ٹمٹماتا دیا بھی بجھنے والا تھا کہ گزشتہ ایک سال کی اُجڑی ہوئی زندگی میں اُس کی جو دلی مراد تھی وہ اس وقت ایک لمحے میں بر آئی۔ عقیدہ کی تجدید، مسرت و سکون، محبوب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر اس کھوئی ہوئی محبت کو اُس نے حاصل کر لیا جو بیکراں اور ابدی ہوتی ہے۔

بڑی کوشش سے اُس نے سسک سسک کر کہا۔

"پیارے! میرے فاؤسٹ ... جانتی تھی کہ تم آؤ گے ضرور ... نشاط ... تمہارے ساتھ مرنا بھی ... نشاط انگیز ہے۔ اللہ بڑا مہربان ہے۔"

اتنا کہکر اُس کا سر فاؤسٹ کی طرف ڈھلک گیا۔

فاؤسٹ نے اپنے آخری سانس میں بدقت تمام کہا۔

"مارگریٹ! ... روشنی کے ستارے ... تو نے مجھے بچا لیا ... پیاری ... محبت ... ابدی محبت ...!"

اُن دونوں کے لب ملے۔ یہ اُنکی ابدی محبت کی مہر تھی جسے کوئی انسانی آگ جلا نہیں سکتی تھی۔

پھر شعلوں نے انہیں لپیٹ لیا اور آسمان کی جانب ایک نورانی چادر بنکر گاتے ہوئے اُٹھے گویا موت اور محبت کی شادی کی مبارکباد گا رہے تھے۔

اختتامیہ

پھر ابلیس در نور پر آیا۔ اور اُس کا آنا ایسا تھا جیسے آتشین شہاب ثاقب آسمان پر شرارے چھوڑتا جائے۔ اور اُس کی صدائے پرواز ایسی تھی جیسے اُجڑی ہوئی روحوں کے رونے کی آواز۔ اور اُس نے آسمان پر اپنی کہنی ٹکا کر زور سے آواز دی۔

اور در نور کھلا اور اس میں سے بہت تیز روشنی نکلی۔ اور ابلیس نے اپنا منہ پھیر لیا کیونکہ وہ اس روشنی سے نظر نہیں ملا سکتا تھا۔ اور فرشتۂ نور باہر آیا اور اُس کا حسن ایسا تھا کہ اُسے دیکھنے سے خوف آتا تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں ایک دمکتی شمشیر تھی۔

پھر ابلیس نے اپنا ہاتھ پھیلایا لیکن اُس کا منہ پھرا ہوا تھا۔ اور اُس کے ہاتھ میں معاہدہ تھا۔ اور اس نے معاہدہ کھول کر پھیلایا اور اس پر جو الفاظ تھے وہ خون سے لکھے گئے تھے۔ اور اُس نے فرشتۂ نور کو بآواز بلند مخاطب کر کے کہا۔

"میں نے جو شرط تجھ سے لگائی تھی وہ میں نے جیت لی ہے۔ میں تجھ سے اس معاہدے کی پابندی چاہتا ہوں۔"

پھر فرشتۂ نور بولا۔ اور اُس کی آواز ایسی تھی جیسے بانسریاں بجتی ہوں۔

"فاؤسٹ کی روح جنت میں داخل ہوگی۔ تو اپنی شرط ہار گیا۔"

پھر ابلیس کی آنکھوں میں آگ دہکنے لگی۔ اور جواب میں وہ چیخکر بولا۔

"اُس کی روح جنت میں داخل نہیں ہو سکتی۔ دنیا کے عیش و عشرت کیلئے اُس نے اپنی روح مجھے سونپ دی تھی۔"

اور فرشتۂ نور نے اپنی شمشیر کی ایک ضرب لگائی اور اُس کے چاروں طرف جو روشنی تھی وہ بہت بڑھ گئی۔ اور ابلیس پھر نرم پڑ گیا اور اُس نے کوئی گرمی نہیں دکھائی۔ لیکن فاؤسٹ کی روح کا اقرارنامہ وہ اسی طرح فرشتۂ نور کی طرف بڑھائے کھڑا رہا۔

پھر فرشتۂ نور ایک بار پھر بولا۔

"نہیں! فاؤسٹ ضرور جنت ہی میں جائے گا۔ ایک لفظ نے اس معاہدے کو فسخ کر دیا اور اُس لفظ کو تو خوب جانتا ہے۔ اے ابلیس تو نے فاؤسٹ کی اُس چنگاری کو کتنی دفعہ بجھانے کی کوشش کی؟"

تب ابلیس نے وہ لفظ پوچھا گو جواب سننے سے وہ بیحد خائف تھا۔

اور فرشتۂ نور نے بانسریوں کی سی آواز میں اس کو جواب دیا اور جواب صرف ایک لفظ تھا۔

"محبت!"

(ایڈیپرسٹن او ہنری سے ماخوذ)

پھر فرشتۂ نور رخصت ہوا اور درِ نور بند ہو گیا اور اس کے بند ہونے میں موسیقی کی سی آوازیں تھیں۔ اور ابلیس کے پاس سے روشنی ہٹا لی گئی۔ اور تاریکی کے ویران خلا میں ایک بھیانک چیخ گونج گئی۔

ختم شد

شاہد

طاہرہ

طاہرہ جسے قرۃ العین اور تاجِ زریں بھی کہتے ہیں جامع حیثیت ایرانی خاتون تھی۔ عہدِ قاچاری میں جبکہ ایران پر جمود مسلط تھا اس نے ملک کی نمایاں اور نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔ حسن صوری و معنوی میں یکتا تھی۔ زبردست فلسفی، مقرر اور خوش گو شاعرہ تھی اس کے براہین کے سامنے بڑے بڑے مجتہد العصر گردنیں جھکا دیتے تھے صداقت پرست اور راست گفتار تھی۔ نہایت جری اور آزاد خیال تھی مجتہدین کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتی تھی۔ جب ان کے حلوے مانڈے میں فرق آنے لگا تو طرح طرح کے الزامات تراش کر بادشاہِ وقت سے اس کے قتل کے احکام حاصل کر لئے۔ بادشاہ کو جب اس کے جمال ظاہری اور باطنی کا علم ہوا تو فوراً ایسا حکم قتل اس نے واپس طلب کیا مگر مجتہدین نے جو طاہرہ کے خون کے پیاسے تھے اسے حوالۂ جلاد کر دیا اور یہ اطلاع کرا دی کہ حکم کی تعمیل ہو چکی ہے بادشاہ کفِ افسوس ملکر رہ گیا۔

(ترمذی)

طاہرہ

اے فروغِ حریت جوہر شناسِ کائنات
آب و تابِ ملک و ملت گوہر والاصفات

تو تھی تصویرِ عمل اور پیکرِ صدق و صفا
نور تھی صورت میں اور سیرت میں تھی حسنِ وفا

تھے تری شیریں بیانی پر فدا اہلِ زباں
مانتا لوہا تھا تیرے نطق کا سارا جہاں

ساحلِ ایراں پہ منظر جبکہ طوفاں خیز تھا
قلزمِ دل تیرا غور و فکر سے لبریز تھا

ہو رہا تھا جب ضمیرِ عصر کا رنگ دگر
کروٹیں لیتا تھا سینہ میں ترے دردِ جگر

تو بھی تصویرِ خموشی غم کا دل پر سنگ تھا
زیست تجھ پر تلخ تھی اور زرد تیرا رنگ تھا

بے کسی چھائی تھی ہر سو مضمحل تھی انجمن
منتشر اعضا تھے اور ایراں تھا لاشِ بے کفن

فیضِ قدسی ناگہاں تجھ پر ہوا پرتو فگن
شعلۂ غیرت ہوا سینے میں تیرے موجزن

تو نے بنیادیں ہلا دیں قصرِ استبداد کی
توڑ کر سقفِ ستم طرحِ دگر ایجاد کی

فلسفے نے تیرے زندہ کر دئے سیف و قلم
جان تھی تو دورِ قاچاری کی خاتونِ عجم

پھونک دی اک روح تو نے واقفِ رازِ حیات
کر دیا پھر ٹھیک تو نے قوم کا سازِ حیات

تو نے مینائے عجم میں بھر دیا رنگِ حجاز
سنگ و آہن ہو گئے تیرے کرشموں سے گداز

نشۂ راہِ فداکاری سے تھی سرشار تو
جور و باطل سے رہی ہے برسرِ پیکار تو

خواب و بیداری تری آزادیِ اہلِ وطن
راحت و آرام تیرا تختۂ دار و رسن

خون سے سینچا تھا تو نے باغِ ملت طاہرہ
تو تھی وجہِ ارتقائے ملک و دولت طاہرہ

سید [illegible] حسن ترمذی

صنوبر کے سائے

۱

میں جب سے اِن پہاڑی علاقوں میں آئی تھی "نہر روحناک" کی رعنائیوں کا ذکر ہر خاص و عام سے سنتی تھی۔ لوگ کہتے اس کے صنوبر کے سایوں سے ڈھکے ہوئے کناروں پر سہانی خوابوں کی رومان جھلملاتی ہے۔ پہاڑی خانہ بدوشوں کا بیان تھا کہ نامعلوم پہاڑوں کی بلندیوں نے ایک مقام پر آسمان کے نیل میں شگاف کر رکھا ہے اور روحناک کی نیلی دھار وہیں سے اترتی اور کوہساروں میں سے ہرتی پھرتی اس وادی میں ایک ندی بن کر آنکلتی ہے۔

بھلا آپ غور کیجئے، ان رومانی فقروں کو سنکر مجھ جیسی سیر و سیاحت کی دلدادہ سے کب نچلا بیٹھا جاسکتا تھا؟

ایک دن میں نے اپنی محبوب سہیلی جسوتی سے مچل کر کہا۔ جسوتی! ہمیں یہاں آئے دو ہفتے گزر چکے مگر ہم نے نہر روحناک کی سیر اب تک نہیں کی۔ تم پسند کرو تو آج بشام کشتی کی سیر کو چلیں"

جسوتی کو آپ جانتے ہیں سفید چہرے والی سلیم الطبع لڑکی ہے۔ اس سفر میں میں اُسے اپنے ساتھ تقریباً کھینچ لائی تھی۔

اُس نے مسکرا کر کہا "جیسی تمہاری مرضی روحی۔ لیکن پانی سے مجھے ڈر لگتا ہے"

اسی وقت جسوتی کے ایک محبوب حبشی نژاد خانہ زاد نے کہا "خاتون میں نے سنا ہے ساحل روحناک پر ایک بہت مشاق سو سال کا بوڑھا ملاح رہتا ہے۔ اس کی کشتی کبھی لہروں پر نہیں ڈگمگائی۔ اگر آپ اجازت دیں تو اسی ملاح کی کشتی کرائے پر لے لی جائے"

میں نے بے پروائی سے کہا "کوئی ملاح اور کوئی کشتی ہو"

جسوتی کہنے لگی "سو سال کا ملاح خاک کشتی چلاتا ہوگا"

خانہ زاد نے کہا "خاتون، سنا ہے وہ ستر سال سے کشتی بانی کرتا ہے اور آج تک اس کی کشتی کو کوئی حادثہ پیش نہیں آیا"

غرض اسی وقت ہم نے اُسے کشتی کرائے پر لینے اور شام کی چائے کا انتظام کشتی ہی میں کرنے کے لئے روانہ کر دیا۔

۲

جب ہم دونوں اُس مقام پر پہونچے جہاں سے سیاح روحناک کی سیر کے لئے پانی کا سفر شروع کرتے ہیں تو ہم نے دیکھا کہ ایک سُرخ اور نیلے رنگ کا مرصع شکارا ہمارے انتظار میں ہے۔ اُس کے موتیوں کے کانپتے ہوئے پردوں میں سے اندر ایرانی قالین پاروں پر رکھے ہوئے خوش وضع اور خوش قطع تکیے دعوتِ استراحت دے رہے ہیں۔

میں نے مسکرا کر جسوتی سے کہا "یہ تو خلیفۂ بغداد کا خرابِ تفریح معلوم ہوتا ہے"

اندر آرام سے نیم دراز ہونے کے بعد ہم نے مڑ کر کشتی چلانے والے کو دیکھا۔ ایک پیر صد سالہ کشتی کے پرلے سرے پر چپو ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا۔ اُسکے مرجھائے ہوئے چہرے پر سفید لمبی ڈاڑھی کے بال ہلکی ہلکی ہوا سے کانپ رہے تھے۔ پُرانی آنکھوں میں زندگی کی تابانی اور درخشانی نہ تھی بلکہ ـــــ جیسے ایک دھند میں سے ماضی کی حسرت دیدار جھلکتی نظر آرہی تھی۔

حبشی خانہ زاد نے چائے تیار کر رکھی تھی۔ ہم گرم گرم چائے کے خوشگوار گھونٹ حلق سے اتارتے دھیرے دھیرے روحناک کی طرف بڑھ رہے تھے، جیسے نیل پر غروبِ آفتاب جھلملکہ شہد بانٹی کر رہا۔ تھا منظر بتدریج وارفتہ سا ہوا جا رہا تھا ہواؤں میں نکہت بڑھ رہی تھی۔ پانی کی چھوٹی چھوٹی لہروں کی آواز پر شبہ ہوتا تھا جیسے کہیں دور خواب کے جزیرے میں پانی برس رہا ہو۔ فطرت اپنی بے ساختہ رعنائیوں کا دامن پھیلائے ہمارے سامنے تھی۔ ایک تصویر جس میں ڈھلتے ہوئے سورج کا بہ محمد نئے انداز سے رنگین موقلم کی شعبدہ بازیاں دکھا رہا تھا۔ اے اللہ! سچ مچ وہ خواب کی سرزمین تھی۔ رومان کا جزیرہ تھا! سیدھے اور رعنا صنوبر جیسے دم بخود کھڑے تھے۔ ان کے درمیان سے کہیں پھولوں سے ڈھنپی ہوئی ڈھلوانیں نظر آتیں کہیں ایک اچھوتے نور میں نہائے ہوئے ٹیلے اور کہیں افق کے سحاب پاروں میں کھوتے ہوئے کہسار۔

ہم چپ تھے۔ مجھے معلوم نہ تھا ہم کتنی دور نکل گئے اور ہمارے شکارے کو چلتے کتنا وقت ہو گیا۔

یکایک حبشی خانہ زاد کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

"جناب اب واپس چلئے آفتاب غروب ہو رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پانی کے راستوں پر ہم بھٹک جائیں۔"

بوڑھے ملاح نے ایسے چہرے سے جس پر مسکراہٹ کا شبہ ہو سکتا تھا کہا: "راہ سے بھٹکنا ناممکن ہے۔ میں ساٹھ ستر سال سے ان آبی راستوں کا عادی ہوں۔"

میں ذرا دیر چپ چاپ ملاح کا چہرہ تکتی رہی جس پر زندگی کے گرم و سرد نے طرح طرح کی جھریاں ڈال رکھی تھیں۔ پھر پوچھا "گویا تم قریب قریب ایک صدی سے یہاں رہتے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"تمہارا مکان کہاں ہے؟"

"مکان کہیں نہیں خاتون ــــــ صنوبر کے ان سایوں کے تلے پڑ رہتا ہوں۔"

مجھے محسوس ہوا یہ کہتے ہوئے اس کے ضعیف سینے نے اک آہ بھری ہے۔

"صنوبر کے سایوں تلے؟" میں نے حیران ہو کر کہا: "بے پناہ گرمی اور لرزا دینے والی سردی تمہیں زندگی سے بیزار نہیں کرتی! اس کا تمہارے پاس کیا علاج ہے؟"

"علاج؟" اس نے ایک پھیکی ہنسی کے ساتھ کہا: "میرے پاس پرانی یادیں ہیں۔ جس کے پاس کوئی یاد ہو اس پر کسی موسم کا اثر نہیں ہوتا۔"

میری دلچسپی یکلخت بڑھ گئی: "تمہارا ماضی تو افسانوں سے لبریز معلوم ہوتا ہے۔"

مگر بڈھے نے میری بات کی طرف توجہ نہیں کی وہ خود ہی خود بڑبڑا رہا تھا: "مجھے صنوبر کے سایوں تلے رہنا پسند ہے۔ مجھ پر ان سایوں سے چند گھنٹوں کی مفارقت بھی شاق گذرتی ہے۔ جب ہی تو میں شہر میں مزدوری کرنے نہیں جاتا۔ میں ان سایوں تلے کشتی لئے ادھر ادھر پھرتا رہتا ہوں۔"

"کیا تم ہمیں اس راز سے آگاہ کر سکو گے کہ صنوبر کے سایوں سے تمہیں کیوں عشق ہے؟" میں نے التجا کے لہجے میں پوچھا۔

"یہ کوئی راز نہیں۔" اس نے دم توڑتے ہوئے سورج کے مقابل ایک سیاہ تصویر بن کر کہا: "سبھی جانتے ہیں کہ مجھے صنوبر کے

ساؤں سے کیوں محبت ہے۔ اور کیوں میں اپنی زندگی کے آخری سانس انکے نیچے ختم کرنا چاہتا ہوں "

جسوتی اور میں کہنیاں تکیوں پر رکھکر متوجہ ہوگئیں۔ کشتی بہاؤ پر جا رہی تھی۔ بڈھا چپو ہاتھ میں تھامے بے پروائی سے اپنی زندگی کی کہانی کہہ رہا تھا۔

۳

"آج سے ستر سال پہلے کا ذکر ہے کہ دنیا میری نظروں میں نوجوان تھی۔ زندگی کی ہر ہر کروٹ میں ہزاروں ہی دلفریبیاں محسوس ہوتی تھیں۔ میں غریب ملاح نہ تھا۔ ان پہاڑی علاقوں کا ایک خوشحال تاجر تھا۔

بہار کے موسم میں ایک دن شام کے آسمان پہ سنہرا چاند ہنس رہا تھا جب میں اسی رودبار کے ساحل پر انہیں صنوبر کے ساؤں تلے چہل قدمی کے لئے نکل آیا۔ میری نظر ایک پہاڑی حسن کے ایک نادر نمونہ پہ پڑی . . . . ایک کمسن لڑکی پر جو صنوبر کے سائے تلے ایک سبز پتھر پر بیٹھی ایک ٹوکری بُن رہی تھی۔ مجھ سے تفصیل کی رنگینی نہ مانگئے۔ رات کا اندھیرا اتر آئے گا۔ سمجھ لیجئے۔ میں خود وہاں نہ آیا تھا۔ مجھے وہ قوت وہاں کھینچ لائی تھی جو ہر نوجوان دل کو زندگی کے پھولوں کے درمیان کشاں کشاں لئے پھرتی ہے۔ ہم میں محبت شروع ہوگئی۔ ہم شباب کی ایک رنگین وارفتگی میں باہم محبت کرنے لگے۔ ہم ہر روز انہیں صنوبر کے کانپتے ہوئے ساؤں تلے ملتے اور اپنی آرزوئیں ایک دوسرے کے دھڑکتے ہوئے دل سے کہتے۔ بہت جلد ہماری شادی ہوگئی"۔

اسی وقت اچانک صنوبر کے درخت پر سے ایک ناشاد بلبل یکایک چلائی۔ بوڑھے نے مڑکر اُسے دیکھا اور پھر لرز کر کہا "یہ دیوانہ پرندہ کیا کہہ رہا ہے؟ یہی نا؟ کہ محبت بہت ظالم چیز ہے"

جسوتی نے مجھے اور میں نے جسوتی کو چپ چاپ دیکھا۔ اس بوڑھے دل میں یقیناً کبھی شعر کے چشمے اُبلتے رہے تھے۔ بوڑھے نے چند ہاتھ چپو کے چلائے اور ایک آہ بھر کر بولا۔

"شادی کے بعد چھ مہینے نہایت سنہرے گذرے۔ پھر ایک نحس خواب نے ہماری زندگی کا رخ پلٹا دیا۔ ایک صبح جونہی میری بیوی نے تکئے پر نیند سے آنکھیں کھولیں اُداس لہجے میں بولی "میں نے ایک ہولناک خواب دیکھا ہے"

میری محبت کی نظروں نے اس سے پوچھا "کیا خواب؟"

بیوی نے آہ کھینچکر کہا "میں نے رات تقدیر کے فرشتے کو دیکھا جو پہاڑوں کی بلندیوں پر اپنے پَر ہلا ہلاکر کہہ رہا تھا کہ اگر تم نے رات تک اپنے بالوں میں ایک کاسنی رنگ کا گلاب نہ سنوارا تو تمہارا گھر اُجڑ جائیگا"

آج سے ستر سال پہلے دنیا بہت اوہام پرست تھی۔ چنانچہ بیوی کا یہ ہولناک خواب سُنکر میرا عشق سہم سا گیا۔

میری پریشانی دیکھکر بیوی بولی "پر اتنے فکر کی کیا بات؟"

میں نے کہا "فکر کیسے نہ ہو؟ شیریں ترین! کیا تجھے نہیں معلوم کہ کاسنی رنگ کا گلاب ان پہاڑی علاقوں میں نایاب ہے؟"

میری بیوی کا چہرہ پیلا پڑ گیا "نایاب؟ پھر کیا کروگے؟ کاسنی رنگ کا گلاب آج رات تک بالوں میں لگانا ضروری ہے۔ ورنہ ہمارا یہ مسکراتا ہوا گھر تباہ ہوجائیگا۔ فرشتے نے یہی کہا تھا"

نامعلوم اندیشوں سے گھبراکر وہ رونے لگی۔ میں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگالیا۔ اور وعدہ کیا کہ اطراف کے علاقوں کے تمام

باغوں میں شہر کے باغبانوں کو بھیجونگا۔ اور تاکید کرونگا کہ خواہ کسی قیمت پر دستیاب ہو کاسنی رنگ کا ایک گلاب لے آئیں۔"

میری بیوی اپنے لمبے لمبے بال کھول کر نہانے کے لئے ایک پہاڑی چشمے پر چلی گئی تاکہ گلاب کے آنے سے پہلے بال سنوار لے۔

میں پریشانی کے عالم میں اُسی وقت کاسنی گلاب کی تلاش میں نکل گیا۔ شہر کے ہر باغبان سے ملا۔ مگر ایک ایک نے کہا کہ اس علاقے میں اس رنگ کا گلاب کہیں نہیں مل سکتا۔ بیزار اور مایوس ہو کر میں حاکمِ شہر کے باغبان کے ہاں گیا۔ اپنی ضرورت اُسکے آگے کہی۔ وہ بڑا ہی چالاک آدمی تھا۔ سوچکر بولا "کاسنی گلاب ہمارے باغ میں ہے تو۔ پر اُسکی قیمت چھ اشرفی سے کم نہیں۔"

تب میں نے چھ اشرفیاں اُس کی ہتیلی میں رکھدیں اور کاسنی گلاب لیکر خوش خوش گھر پہونچا۔

میری بیوی کاسنی گلاب دیکھکر باغ باغ ہوگئی اور مُسکرا کر بولی "اگر آج میں کاسنی گلاب بالوں میں نہ سنوار سکتی تو نجانے ہم پر کیا مُصیبت آتی۔"

میں نے کہا "اسے فوراً بالوں میں لگالو"

پرجانے اُس نے کس خیال سے کہا "میرے بال گیلے ہیں ابھی نہیں لگاؤں گی جب رات شروع ہوگی تو لگالونگی۔"

یہ کہکر اُس نے ایک بلوری صراحی میں پانی بھرا اور پھول کو اس میں رکھکر تازہ ہوا کے خیال سے صراحی دریچے میں رکھدی۔

میں دن بھر گلاب کی سرگردانی میں اپنے کام پر نہ جاسکا تھا۔ دُکان پر جابیٹھا۔ رات کے وقت جب واپس گھر آرہا تھا تو میرا پُرانا دوست خمری مجھے میرے گھر کے قریب ہی مل گیا۔ اسے میں نے ادھر کئی ہفتوں سے نہ دیکھا تھا۔ خوش ہو کر گلے سے لگالیا۔

"میں تمہارے ہی ہاں گیا تھا تم نہ ملے تو مایوس ہو کر واپس آگیا۔"

اُس نے یہ جملہ ختم بھی نہ کیا تھا کہ میری نظر اسکی عبا کے کاج پر پڑگئی۔ میرا خون میری رگوں میں جم کر رہ گیا۔

میں نے یکلخت پوچھا "خمری یہ کاسنی گلاب تمہیں کہاں سے ملا؟"

خمری طبعاً شوخ تھا ہنسکر بولا "کیوں؟ تمہیں کیوں کرید پیدا ہوئی؟ میری محبوبہ نے مجھے تحفہ دیا ہے۔ نایاب چیز ہے۔"

میری آنکھوں تلے اندھیرا چھاگیا۔ اور میں لڑکھڑا سا گیا۔ وہ خواب! تقدیر کا فرشتہ! اسکی پیشینگوئی! وہ سب جھوٹ تھا! محض اسی کی عبا کا کاج سجانے کے لئے میری بیوی نے یہ رنگین جھوٹ تراشا تھا۔ ہائے ظالم زندگی! سنگدل زندگی۔

۴

میں غصہ میں کانپتا ہوا گھر پہونچا۔

مجھے دیکھتے ہی میری بیوی دوڑی دوڑی آئی اور اشک آلود آنکھوں سے بولی "افسوس! بدبختی دیکھو کہ وہ پھول غائب ہوگیا۔ اے خدا میں اب کیا کروں؟ ہم پر ضرور کوئی مُصیبت نازل ہوگی۔"

"ضرور نازل ہوگی" میں نے گرجکر کہا "موت سے زیادہ بڑی مصیبت اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ سمجھ لو کہ تمہاری موت آگئی۔"

بیوی حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگی مگر اس وقت مجھے اُس کی ایک ایک حرکت سے عیاری ٹپکتی معلوم ہوتی تھی میں نے پھر چیخکر کہا۔

"تمہاری موت آگئی۔ تقدیر کے فرشتے کی پیشینگوئی کے لئے تیار ہوجاؤ۔"

وہ متعجب ہو کر بولی "تم کیا کہتے ہو! ایسا نہ کہو۔ خدا کے لئے کاسنی گلاب کو ڈھونڈو۔ میں نے اُسے باغ کی دریچی میں تازہ ہوا کیلئے

رکھدیا تھا اندر بال سنوار نے گئی تھی واپس آکر دیکھتی ہوں تو پھول وہاں نہ تھا۔"

اس کی ان مکار باتوں نے میرے تن بدن میں شعلے سے بھڑکا دئے۔ میں نے اسکے نرم بازوؤں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں پکڑ لیا اور اس زور سے دیوار پر دھکا دیا کہ ٹکرا کر اس کے سر سے خون کا ایک سرخ فوارا پھوٹ نکلا۔ راتوں رات میں نے اُسے اسی صنوبر کے سائے تلے دفنا دیا جہاں اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

ایک جنون کی بے اختیاری میں میں گھر کی طرف لوٹ رہا تھا کہ اتفاق سے میرا دوست حمدی پھر مجھے ایک گلی کے موڑ پر مل گیا۔ اُسے دیکھتے ہی میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔

وہ ہنسکر بولا "تمہاری آنکھیں ایسی سرخ ہو رہی ہیں جیسے تم خون کر کے آئے ہو"

وہ اس طرح باتیں کر رہا تھا گویا میں اسکے راز سے ناواقف ہوں۔

میں نے لپک کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور بولا "بدمعاش! تو سمجھتا ہے کہ میں نے خون نہیں کیا! میں اُسے ٹھکانے لگا چکا ہوں"

یہ کہکر کاسنی رنگ کا گلاب میں نے اس کی عبا کے کاج سے نوچ کر زمین پر دے مارا اور اپنے جوتوں کی مجنونانہ حرکت سے مسل ڈالا۔

حمدی آنکھوں میں وحشت سے مرا چہرہ تک رہا تھا جب میں نے اس سے کہا کہ میں نے اس کی محبوبہ کا خاتمہ کر دیا اور اب اسکا کام تمام کرنے پر آمادہ ہوں تو اس نے ایک دلدوز چیخ ماری اور کہنے لگا "کوتہ اندیش اور جلد باز! تو بدبخت ہے! وہ گلاب تو میں نے سڑک پر سے اٹھایا تھا۔ میں بازار میں سے گزر رہا تھا کہ گلاب کا پھول دیکھکر اٹھا لیا۔ شاید تمہارے ہی دریچے سے نیچے گر پڑا ہو"

یہ سنکر میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ ایک ایسا اندھیرا ــــــ جس نے آج تک دنیا کی رنگینیوں کو مجھ سے اوجھل کر رکھا ہے۔

(۵)

تقدیر کے فرشتے کا کہنا درست نکلا۔ میری بیوی اُس رات کاسنی گلاب اپنے بالوں میں نہ سنوار سکی۔ ہمارا گھر میری بیوقوفی اور جلد بازی کے ہاتھوں تباہ ہو گیا!

آج اس قصے کو ستر سال گزر گئے۔ مگر میں اپنی غلطی پر نادم اس مٹی کی پرستش کر رہا ہوں جس میں ان صنوبروں کے سایوں تلے میری محبت دفن ہے"

کشتی ساحل سے آلگی۔

حجاب امتیاز علی

ضد

پہلی ضد

تیرے جلووں سے بزمِ مہ درخشاں کر کے چھوڑوں گا　　میں تیرے حسن کو ہستی پہ احساں کر کے چھوڑوں گا
تجلی سے کروں گا کائنات اب جگر ہوئے اکتہ　　نگاہِ شوق کو میں گُل بداماں کر کے چھوڑوں گا

دوسری ضد

تصور میں تری زلفیں پریشاں کر کے چھوڑوں گا　　میں ہر اک تارِ دامن کو گریباں کر کے چھوڑوں گا
تمناؤں میں وہ ہنگامہ شوق کو تسکین سے آزادی　　جہاں کے ذرے ذرے کو بیاباں کر کے چھوڑونگا

تیسری ضد

تری جور و جفا کو زیست ساماں کر کے چھوڑونگا　　ترے ہر تیر کو اپنی رگِ جاں کر کے چھوڑوں گا
جراحت کے مزے لے لے کے نکلے گا ہر اک نشتر　　میں زخمِ دل کو ہمدوشِ نمکداں کر کے چھوڑونگا

چوتھی ضد

ترے رخ پر تری زلفیں پریشاں کر کے چھوڑونگا　　میں کفرِ حسن سے تجدیدِ ایماں کر کے چھوڑوں گا
کروں گا سوزِ الفت سے میں اک اک داغِ دل روشن　　تری تصویر کا ہر رخ نمایاں کر کے چھوڑوں گا

پانچویں ضد

ترے جلووں سے داغِ دل فروزاں کر کے چھوڑونگا　　مثالِ آئینہ تجھکو بھی حیراں کر کے چھوڑوں گا
کروں گا آشنا تجھکو بھی غم کی تلخ کامی سے　　تری راتیں شریکِ شامِ ہجراں کر کے چھوڑوں گا

چھٹی ضد

ہر ارماں کو ہلاکِ عہد و پیماں کر کے چھوڑوں گا　　فریبِ حسن پر تجھکو پشیماں کر کے چھوڑوں گا
تری بزمِ غرور و ناز کو درسِ وفا دوں گا　　تجھے اپنے لئے ممنونِ احساں کر کے چھوڑوں گا

ساتویں ضد

غرورِ حسن سے تجھ کو گریزاں کر کے چھوڑونگا　　تجھے اک دن عبودیت پہ نازاں کر کے چھوڑونگا
نہ دونگا میں وفاؤں سے تجھے دادِ جفا ہرگز　　تجھے تیری جفاؤں پر پشیماں کر کے چھوڑوں گا

آٹھویں ضد

میں اپنے درد ہی کو اپنا درماں کر کے چھوڑوں گا　　میں الفت کی ہر اک مشکل کو آساں کر کے چھوڑونگا
نہ رکھوں گا جبینِ بندگی لیکن ترے در پر　　تری آباد بزمِ ناز ـــــ ویراں کر کے چھوڑوں گا

تابش دہلوی

رزم و بزم

عناصر اپنے قہر کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ زمین انسانی خون سے اپنی پیاس بجھاتی جاتی ہے تو تیں معطل رہتے رہتے اُکتا گئی ہیں سکون اپنی سرد کیفیتوں سے گھبرا کر مائل بہ حرکت ہے طبیعتیں محض رازونیاز سے نکل کر میدانِ حرص و آز میں آ رہی ہیں۔ کبھی مذہبی جذبات میں جوش پیدا ہوتا ہے کبھی انانیت اور خودسری آمادۂ فساد کرتی ہے۔ کبھی ملک گیری کی ہوس، کبھی طاقت کا اظہار عیش پسند طبیعتوں سے بدلتا ہے اور ہنگامۂ رزم شروع ہو جاتا ہے۔

بادشاہ اپنے قلعہ میں یا کسی میدان میں یا دشمن کے قلعہ پر دھاوا کرنے کے لئے تلوار باندھے طبل بجا رہا ہے۔ کہیں تلوار چلتی ہے، تیروں کی بارش ہوتی ہے۔ گولیوں کا مینہ برستا ہے زخمی بیٹا تڑپ رہا ہے، بیاہا بھائی آنکھوں کے سامنے ہے۔ ضعیف باپ نیزہ کھا کر گھوڑے سے گر پڑا ہے امن پسند شہری اپنے وطن کی حفاظت کے لئے جانیں لڑا رہے ہیں۔ نہ بیوی کی پروا ہے نہ بچوں کا خیال فقرا اپنے حجروں سے اور صوفی اپنی خانقاہوں سے نکل آئے ہیں غازی بننے کا شوق اور بہشت میں جانے کی خواہش دلوں میں ہے۔ شراب خانے اوندھے پڑے ہیں عشرت کدوں میں اُلّو بول رہا ہے۔ حسن و عشق کی داستانوں کے بدلے جہاد کے وعظ اور فتح کی دعائیں ہو رہی ہیں۔

رزم جارحانہ ہو یا مدافعانہ مذہبی ہو یا ملکی۔ قیامت کا نمونہ ہوتی ہے اپنے بیگانے کی تمیز نہیں رہتی۔ ہر طرف آگ کے شعلے بھڑکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی طاقت اور اپنے حواس کے سوا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔ کامیابی کے لئے خزانے لٹائے جاتے ہیں کبھی دشمنوں کو نوازا جاتا ہے اور دوستوں کی گردنیں کاٹی جاتی ہیں۔ کہیں یار اغیار بن جاتے ہیں اور رقیب مددگار ثابت ہوتا ہے۔ دن ہتھیاروں کی جھنکار سننے، اپنی جان بچا کر مخالفوں کی جان لینے میں گزرتا ہے تو رات شبخونوں کے خوف سے جاگتے یا خواب میں بزن و بگیر کی آوازیں سنتے گزرتی ہے۔ الغرض رزم اپنے اندر ہزاروں قسم کے رنگا رنگ جذبات رکھتی ہے۔ اُمید و یاس، جوانمردی و بزدلی، محبت، منافرت آرام طلبی و سخت کوشی کا صحیح اندازہ اسی میدان میں ہوتا ہے بلکہ قومیت، وطن پرستی. مذہب اور ایمان کا اصل جوہر یہیں کھلتا ہے۔

رزم کا آغاز دین کیلئے ہو دُنیا کے لئے۔ اس کی غرض حفاظت قومی ہو یا ملکی تجارت کا فروغ اس کا مدعا خلقِ خدا کی خونریزی کا شوق ہو یا عدل و انصاف کا قیام۔ کمزور اقوام کی حفاظت مدنظر ہو یا اس کے پردے میں مظلوم اقوام کی گردن میں غلامی کا طوق ڈالنا ہو انجام کار نہایت عبرتناک ہوتا ہے۔ گنہگاروں کے ساتھ لاکھوں بے گناہ. ظالموں کے ساتھ ہزاروں مظلوم فنا ہو جاتے ہیں۔ معاشرت اور تمدن کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ ادنیٰ طبقے کے لوگ اعلیٰ اور اعلیٰ درجے کے اشخاص ادنیٰ ہو جاتے ہیں۔ ایک نئی تہذیب کا دور شروع ہوتا ہے۔ شخصی امتیاز اور ملی اعتبار جاتا رہتا ہے تھکے ہوئے دماغ، بے سکت ہاتھ پاؤں۔ مجروح جذبات اور راحت کا خواہاں دل۔ ایک اچھے سکون، فرحت بخش زندگی اور بے تکلف ماحول کے متلاشی ہوتے ہیں اور اس طرح گویا بزم کی ابتدا ہوتی ہے۔

بادشاہ کے درباروں سے لیکر غریبوں کی جھونپڑیاں تک آباد ہیں۔ بے فکری اور فارغ البالی کی فضا میں سانس لئے جا رہے ہیں۔ فلاح و بہبود کے سامان مہیا ہیں۔ دشمن کا خوف ہے نہ رقیب کا ڈر، مہد سے لیکر لحد تک زندگی کے ہر شعبے میں اطمینان ہی اطمینان ہے۔ بزم عیش ہو یا بزم ماتم آرائش و آسائش سے خالی نہیں۔ عیش میں اگر خوشی کے قہقہے ہیں اور حسن و عشق اس کا اسبابِ زینت ہے تو صفِ ماتم میں غم کے آنسو ہیں اور دلوں کو گداز کرنے والے بیان۔ ہر طرف یکسوئی کی باتیں، تن آسانی کے خیالات۔ مرادمندیاں۔ ذوق و شوق کی داستانیں اور حالات

کو اپنے مطابق بنانے والی گھائیں ہیں۔

درباروں میں مسرت کا دور دورہ ہے خلعت تقسیم ہورہے ہیں۔ جاگیریں دی جارہی ہیں۔ خطابوں کی فہرست بن رہی ہے۔ شعرا قصیدے پڑھ رہے ہیں۔ غزل خوانیاں، واہ واہ اور سبحان اللہ کا شور ہے۔ زرق برق پوشاکوں اور مسرور چہروں کی چمک سے ایوانِ حکومت کی شان ہی نرالی ہے۔ اُمرا کے محلات عشرت کدے بنے ہوئے ہیں۔ ناچ رنگ کی محفل آراستہ ہے۔ داد و دہش کے جلسے ہورہے ہیں۔ کہیں خوش باشوں کا ہجوم ہے۔ بساطیں بچھی ہوئی ہیں۔ شطرنج، پچیسی، چوسر ہورہی ہے۔ قہقہے ہیں، چہچہے ہیں۔ دن عید ہے رات شب برات۔ عاشقوں میں عشق کے جذبات کا نشو و نما ہو رہا ہے۔ کبھی مرتے ہیں کبھی جیتے ہیں۔ وحشت کی نمائش اور اندوہِ محبت کے اظہار میں طرح طرح کی جدتیں ہورہی ہیں۔ فقرا اپنے کشکولِ گدائی کو سنبھالے ہیں۔ صوفی کو اپنے خانقاہوں کی زیب و زینت کا خیال ہے۔ عروسوں کو شاندار اور جاذبِ نظر بنانے میں مصروف ہیں۔ حُسن فروش اپنے متاعِ دستِ گُر سے ان کو آراستہ کررہی ہیں۔ ان کی کوشش ہے کہ مژگاں کو تیر اور ابرو کو تلوار بنا کر دکھائیں۔ قتل و غارت کا ہنگامہ نہ سہی مدہوشی اور خود فراموشی تو ضرور پیدا ہو جائے۔

شاعر رجز خوانی چھوڑ کر زمزمہ سرائی کر رہے ہیں۔ تڑپتی ہوئی لاشوں کو دفن کرکے لیلیٰ و مجنوں فرہاد و شیریں کے گڑے مُردے اکھاڑ رہے ہیں۔ حقیقت سے دور مصنوعی حیات و موت کی غلام گردشوں میں اپنی دُھن میں مست ہیں۔ مسجدیں مدرسے اور ہر درسگاہ تعلیم و تعلم کا گہوارہ بنی ہوئی ہے کہیں قومیت پر بحث ہے۔ کہیں معاش و معاد کے مناظرے قائم ہو رہے ہیں۔ کہیں جا مذہبی دیوانوں کا اجتماع ہے تو کہیں جا کافر بنانے کی مشین تیار ہو رہی ہے۔ مقنن نئے نئے قوانین بنانے میں محو ہیں۔ تو ارکانِ حکومت قیامِ امن کی تدابیر سوچ رہے ہیں۔ مورخ اپنی تاریخوں میں تمدن و تہذیب پر مقالے لکھ رہے ہیں تو مصنف اخلاقیات اور نفسیات میں کتابیں تصنیف کر رہے ہیں۔

یہاں تک کہ بزم کی یہ کیفیت، حیات کی یہ یکرنگی، معاشرت کا یہ جمودی پہلو، فضا کا یہ سرد سکون، قضا و قدر کو ناگوار گذرتا ہے عیش و راحت کی یہ افراط اور قانونِ فطرت سے اغماز رنگ لاتا ہے اور حالات بدلنے شروع ہوتے ہیں۔ آرام کی زیادتی آلام پیدا کرتی ہے۔ سرور کا انجام خُمار ہوتا ہے۔ سونے کے بعد جاگنا لازمی ہے۔ غفلت کی موت ہے یا ہوشیاری۔ چنانچہ اس محمد شاہی زندگی اور رنگیلے گردوپیش کا نتیجہ نادر کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ سلطنت گردی کی نوبت آتی ہے۔ افراد برباد۔ قومیت تباہ اور دولت مالِ غیر ہو جاتی ہے۔ اور پھر ایک خیال مدت تک لطیفۂ غیبی کا منتظر رہنا پڑتا ہے اور وہ بھی اُمید موہوم پر اس لئے کہ انقلاب تو ہوتے ہیں مگر ان کا مفید یا غیر مفید ہونا یقینی نہیں ہوتا۔ استعداد شرط ہے۔ اگر بازوؤں میں قوت، ضمیر میں زندگی اور پریشانی میں جمعیت باقی ہے تو ایک نہ ایک دن نکبت اور غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہو جانا ممکن ہے ورنہ پھر انقلاب ٹھکرا کر منزل سے دور کرتا چلا جاتا ہے اور پھر ابھرنا نصیب نہیں ہوتا۔

اشرف صبوحی

طوفان

کسی زمانے کا ذکر ہے کہ سمندر میں کہیں دُور ایک جزیرہ تھا۔ اس کے رہنے والوں میں صرف دو آدمی تھے۔ ایک بُڈھا پروسپیرو اور دوسری اُس کی جوان خوبصورت بیٹی میرنڈا۔ یہ جوان حسین لڑکی بہت کم سنی میں یہاں آئی تھی۔ اُسے مطلق یاد نہ تھا کہ سوائے اپنے باپ کے کسی اور انسان کی صورت اُس نے دیکھی ہے۔

یہ دونوں ایک چٹان کے غار میں رہتے تھے۔ اور یہ غار کئی حصوں میں تقسیم تھا جن کی شکل کمروں کی سی تھی۔ ان میں سے ایک کمرے کو پروسپیرو اپنے پڑھنے کا کمرہ کہا کرتا تھا۔ اسی کمرے میں اُس کی بہت سی کتابیں جو زیادہ تر طلسم و سحر سے تعلق رکھتی تھیں رکھی تھیں۔ یہ علم اس زمانے کے تعلیم یافتہ طبقے میں بہت مقبول تھا اور پروسپیرو کے حق میں تو وہ بہت ہی فائدہ مند ثابت ہوا تھا۔ کیونکہ اتفاق سے جس جزیرے میں وہ آکر رہا تھا اُس پر ایک ساحرہ سیکروز نامی نے جادو ڈال رکھا تھا۔ یہ جادوگرنی پروسپیرو کے آنے سے کچھ دنوں پہلے مر چکی تھی۔ اسی ساحرہ نے بہت سی نیک روحوں کو درخت بنا کر صرف اس قصور میں قید کر رکھا تھا کہ وہ اس ساحرہ کے ظالمانہ حکموں کی تعمیل نہیں کرتے تھے۔ پروسپیرو نے یہاں آتے ہی اپنے سحر کے زور سے ان روحوں کو آزاد کر دیا۔ آزاد ہوتے ہی یہ نیک روحیں پروسپیرو کی تابع فرمان ہو گئیں۔ ان آزاد روحوں میں ایریل سب کا سردار تھا۔

ایریل ایک ننھی سی زندہ دل روح تھی۔ اُس کی طبیعت میں شرارت بالکل نہ تھی البتہ ایک بدصورت بہیئت عفریت کو ستانے اور دق کرنے میں اُسے بہت لطف آتا تھا۔ اس عفریت کا نام کلیبان تھا اور ایریل کو اُس سے پرانی خصومت اس وجہ سے بھی تھی کہ وہ اس کے جانی دشمن سیکروز جادوگرنی کا بیٹا تھا۔

پروسپیرو جب اس جزیرے میں آیا تھا تو اس نے کلیبان کو جنگل میں ایک جگہ پڑا پایا۔ یہ نہایت ہی بدقطع بدہیئت عفریت تھا۔ اُس کی صورت آدمی کے بچے کی سی نہ تھی بلکہ بندر سے ملتی جلتی تھی۔ پروسپیرو کلیبان کو اٹھا کر پرورش کرنے اپنے غار میں لے گیا۔ اور اُس کو بولنا بات کرنا سکھایا۔ پروسپیرو گو اُس پر بہت مہربانی کرتا تھا مگر کلیبان کی بدطینتی نے جو اُسکو اس کی ماں کی طرف سے پہنچی تھی کسی اچھی اور مفید بات کو حاصل نہ کرنے دیا۔ اس لئے اب کلیبان سے مثل ایک غلام کے خدمت لی جاتی تھی مثلاً لکڑیاں ڈھونا یا ایسے ہی اور سخت محنت کے کام اُسے کرنے پڑتے تھے اور ایریل کے ذمے یہ خدمت تھی کہ وہ کلیبان سے کام لیا کرے۔

جب کلیبان اپنے کام میں سستی یا غفلت کرتا تو ایریل (جو پروسپیرو کے سوا اور سب کی نظر سے پوشیدہ رہتا تھا) چپکے سے آکر اُس کے چٹکیاں لیتا اور کبھی کبھی اُسے اُٹھا کر دلدل میں دے پٹختا۔ پھر بندر بن کر اُسکو مُنہ چڑاتا اور پھر خارپشت کی شکل اختیار کر کے کلیبان کے رستے میں لوٹنا شروع کر دیتا۔ کلیبان خارپشت کے تیز کانٹوں سے ڈرتا تھا کہ کہیں اُس کے پاؤں میں نہ چُبھ جائیں۔ غرض جب کبھی کلیبان کسی ایسے کام میں سستی کرتا جس کا پروسپیرو نے حکم دیا تھا تو ایریل

اُسے مختلف حرکتوں سے ستایا کرتا۔

غرض انہیں طاقتوں، اور فرمانبردار روحوں کے ذریعے سے جنہیں پروسپیرو نے آزاد کیا تھا وہ سمندر کی موجوں اور فضا کی ہواؤں پر حکمرانی کرتا تھا چنانچہ ایک دن پروسپیرو کے حکم سے ان روحوں نے سمندر پر ایک طوفان برپا کیا اور پروسپیرو نے اس طوفان میں اپنی بیٹی کو ایک بڑا خوبصورت جہاز دکھایا سمندر کی طوفان خیز موجیں ہر گھڑی جہاز کو غرق کر دینے کا ڈراوا دیتی تھیں پروسپیرو نے بیٹی کو یہ بھی بتایا کہ اس جہاز میں ہم جیسی جیتی جاگتی صورتیں بہت سی موجود ہیں۔ لڑکی نے کہا "اے میرے پیارے باپ آپ نے اپنے علم کے زور سے ایسا خوفناک طوفان پیدا کیا ہے تو جو مخلوق اُس میں ہے اُس کی حالت زار پر رحم کیجئے دیکھئے جہاز ٹوٹ کر پاش پاش ہونے کو ہے اور جو غریب جانیں اس میں ہیں وہ سب غارت ہونیوالی ہیں اگر مجھ میں قدرت ہوتی تو میں سمندر کو زمین میں دھنسا دیتی اور اس خوبصورت جہاز اور قیمتی جانوں کو تباہ نہ ہونے دیتی"۔

پروسپیرو نے کہا "بیٹی میرنڈا اس قدر پریشان نہ ہو کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچیگا۔ میں نے پہلے ہی حکم دیدیا ہے کہ جہاز کے کسی متنفس کو بھی گزند نہ پہونچے۔ پیاری بیٹی یہ جو کچھ میں نے کیا ہے تیری ہی خاطر کیا ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئی ہو اور علاوہ اس کے کہ میں تمہارا باپ ہوں تمہیں اس کی بھی خبر نہیں کہ میں دراصل کون ہوں اور اس ذلیل غار میں کیوں رہتا ہوں کیا اس غار میں آنے سے پہلے کا زمانہ تمہیں یاد ہے میں سمجھتا ہوں کہ کچھ بھی یاد نہ ہوگا۔ کیونکہ جب میں یہاں آیا ہوں تو تم تین برس کی بچی تھیں"۔

میرنڈا ــــــ کچھ کچھ تو ضرور یاد ہے۔

پروسپیرو۔ اچھا پیاری بیٹی اگر کوئی گھر یا آدمی تمہیں یاد ہو تو بتاؤ۔

میرنڈا ــــــ کیا بتاؤں جو کچھ یاد ہے وہ ایک خواب سا معلوم ہوتا ہے صرف اتنا یاد ہے کہ چار پانچ عورتیں میری خدمت میں رہا کرتی تھیں۔

پروسپیرو۔ ہاں یہ بات ضرور تھی بلکہ اس سے بھی زیادہ عورتیں تمہاری خدمت پر مقرر تھیں لیکن یہ بات تمہیں اب تک کیوں کر یاد رہی کیا تمہیں یہ بھی یاد ہے کہ تم اس جزیرے میں کیونکر آئیں۔

میرنڈا۔ نہیں مجھے کچھ اور یاد نہیں۔

پروسپیرو کہتا رہا کہ میرنڈا بارہ برس گذرتے ہیں کہ میں میلان کا بادشاہ تھا اور تم میری اکلوتی بیٹی میرے تاج و تخت کی وارث تھیں، میرا ایک چھوٹا بھائی تھا جس کا نام انطونیو تھا۔ مجھے اُس پر ہر طرح کا بھروسہ تھا اور چونکہ مجھے کُتب بینی و خلوت نشینی کا شوق تھا اس لئے میں نے جملہ امورِ سلطنت کا انتظام تمہارے اسی چچا کے ہاتھ میں چھوڑ رکھا تھا۔ مگر تمہارا یہ چچا بڑا ہی دغاباز نکلا میں دُنیا کے تمام دھندوں سے علیحدہ ہو چکا تھا اُن کے انجام کو مطلق نہ سوچتا تھا۔ ہر وقت کتاب کا کیڑا بنا رہتا تھا۔ اپنا کُل وقت دماغی اور روحانی ترقی کی تحصیل پر وقف کر رکھا تھا۔ جب میرے بھائی نے میرے اختیارات پر اس طرح قبضہ حاصل کر لیا تو وہ اپنے آپ کو بادشاہ تصور کرنے لگا اور جو موقعہ میں نے اُسے اپنی رعایا کی نظروں میں عزیز بنانے کا دیا تھا اُس سے اُس کی فطرتِ بد میں ایک مغرورانہ خواہش پیدا ہوئی اور وہ یہ تھی کہ مجھے میری ریاست سے محروم کر دے اُس کی یہ

خواہش شاہ نیلپنز کی مدد سے جلد پوری ہوگئی۔ یہ بادشاہ بڑا طاقتور تھا اور مدت سے میرا دشمن چلا آتا تھا۔

میرنڈا نے کہا۔ انھوں نے اُس وقت ہمیں کیوں نہ مروا ڈالا۔

باپ نے جواب دیا۔ پیاری بیٹی میری رعایا مجھے اسقدر چاہتی تھی کہ تیرے چچا کی اتنی جرأت نہ ہوسکی کہ وہ ہمیں مروا ڈالتا انطونیو نے یہ کیا کہ ہمیں ایک جہاز پر سوار کرایا اور جب جہاز ساحل سے چند میل کے فاصلے پر نکل آیا تو اُس نے ہمیں زبردستی ایک چھوٹی سی کشتی میں سوار کرایا اس کشتی میں نہ بادبان تھے نہ مستول تھا نہ کوئی اور چیز جس سے کشتی چلائی جاتی ہے غرض اس طرح ہلاک ہونے کے لئے وہ ہمیں چھوڑ کر چلتا بنا۔ مگر میرے دربار کا ایک مہربان امیر غنزالو نامی تھا جو مجھ سے بہت محبت کرتا تھا اُس نے کشتی میں کچھ کھانا، چند کپڑے تھوڑا سا پانی اور چند کتابیں جن کو میں اپنی سلطنت سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا پہلے ہی سے خفیہ طور پر رکھدی تھیں۔

میرنڈا بولی۔ باباجان اُس وقت تو میں آپ کے لئے ایک مصیبت ہوگئی ہونگی۔

پروسپیرو۔ نہیں میری پیاری بچی تم تو اُس وقت ایک ننھی سی جان تھیں اور یہی ننھی سی جان وہ تھی جس نے مجھے زندہ رکھا۔ تمہاری معصوم صورت مجھے اپنی بدنصیبی کی سختیوں کو برداشت کرنے کی قوت بخشتی تھی۔ ہمارے ساتھ کھانے پینے کا جو سامان تھا وہ اس ویران جزیرے تک آنے کے لئے کافی ہوا یہاں آکر میری سب سے بڑی خوشی یہ تھی کہ میں خود تمہاری تعلیم و تربیت کروں۔ میرنڈا میری تعلیم سے تم نے بہت جلد فائدہ اُٹھایا۔

میرنڈا۔ پیارے باباجان خدا آپ پر رحمت کرے۔ اب مہربانی فرما کر یہ تو بتایئے کہ اس طوفان کے برپا کرنے کی کیا وجہ ہے۔

پروسپیرو۔ اچھا تو یوں سمجھو کہ اس طوفان نے میرے پرانے دشمن شاہ نیلپنز اور میرے ظالم بھائی دونوں کو اس جزیرے پر ڈالدیا ہے اتنا کہہ کر پروسپیرو نے آہستہ سے اپنی بیٹی کو جادو کے عصا سے چھوا۔ چھوتے ہی وہ غافل سوگئی۔ وجہ اُس کے سُلا دینے کی یہ ہوئی تھی کہ ایریل اس وقت طوفان کے حالات بیان کرنے اور یہ بتانے کہ کس طرح اُس نے جہاز کے لوگوں کو علیحدہ کردیا ہے اپنے مالک کے پاس آیا تھا۔ یہ روحیں اگرچہ ہمیشہ سے میرنڈا کی نظروں سے پوشیدہ رہتی تھیں مگر پروسپیرو یہ نہیں چاہتا تھا کہ میرنڈا اُسکو ہوا سے باتیں کرتے دیکھے۔ جیسا کہ اسوقت ظاہر ہوتا۔

پروسپیرو۔ میرے بہادر ایریل بتاؤ تم نے اپنا کام کس طرح انجام دیا۔ ایریل نے طوفان کی سختی اور ملاحوں کی خوفزدہ حالت کا نقشہ کھینچنا شروع کیا اور کہا کہ شاہ نیلپنز کا بیٹا فرڈی نند سب سے پہلے کیونکر جہاز پر کود پڑا اور کیونکر اُسکے باپ نے خیال کیا کہ اُس کا لخت جگر اُس کی آنکھوں کے سامنے سمندر کی موجوں کی نذر ہوگیا اور ہمیشہ کو گم ہوا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ خیریت سے ہے اور اس جزیرے کے ایک گوشے میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے اپنے باپ کی موت پر افسوس کررہا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ باپ ڈوب گیا حالانکہ اُس کا ایک بال بھی بیکا نہیں ہوا۔ البستہ اتنا ہوا کہ سمندر کے پانی میں اُس کا شاہی لباس بھیگ گیا ہے۔ مگر اس سے اب وہ پہلے سے بھی زیادہ صاف اور ستھرا معلوم ہوتا ہے۔

پروسپیرو۔ میرے نازک ایریل یہ سب کچھ ٹھیک ہوا مگر فرڈی نند کو یہاں تک لاؤ تاکہ میری بیٹی اُس نوجوان شہزادے

کو دیکھ سے۔ اب اتنا اور بتاؤ کہ میرا بھائی اور بادشاہ کہاں ہیں۔ ایریل نے کہا میں نے انہیں فرڈی نند کی تلاش میں مصروف چھوڑا ہے، مگر اُس سے ملنے کی انہیں کچھ بھی اُمید نہیں۔ کیونکہ انہیں صرف اتنا یاد ہے کہ اُسکو سمندر میں کود کر ڈوبتے انھوں نے دیکھا تھا۔ جہاز کے اور لوگوں میں بھی کوئی گم نہیں ہوا ہے اگرچہ اُن میں ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ دوسروں میں سے کوئی شخص بھی زندہ نہیں اور جہاز بھی گو ان لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہے مگر وہ بندرگاہ میں محفوظ ہے۔

پروسپیرو۔ ایریل تم نے اپنا کام نہایت لیاقت و وفاداری سے کیا ہے لیکن ابھی کچھ کام اور باقی ہے۔

ایریل۔ کیا ابھی کچھ اور کام بھی ہے، میرے آقا مجھے یاد دہانی کی اجازت ملے آپ نے مجھے آزاد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اب میری التجا ہے کہ اس وعدہ کو یاد فرما کر مجھے آزاد کیجئے۔ میں نے آپ کی خدمت دل وجان سے کی ہے۔ کبھی آپ سے جھوٹ نہیں بولا، اور کبھی کام میں کوئی خطا نہیں کی اور بغیر حیل وحجت جو کام آپ نے بتائے انہیں انجام دیا۔

پروسپیرو۔ ہائیں تم یہ کیا کہہ رہے ہو کیا تم بھول گئے کہ میں نے تمہیں کس اذیت اور تکلیف سے نجات دی تھی۔ کیا تمہیں وہ بدذات پاپن جادوگرنی سیکروز یاد نہیں رہی جس کی کمر بڑھاپے اور بغض نے دوتا کر دی تھی۔ وہ کہاں پیدا ہوئی تھی، بولو بتلاؤ۔

ایریل نے جواب دیا اُس کی پیدائش ملک الجیریا کی تھی۔

پروسپیرو۔ کیا وہ الجیریا کی تھی۔ اب ایریل سُنو میں بتاتا ہوں کہ تم کون تھے، غالباً تم کو یہ بات یاد نہ رہی ہوگی اس بدذات ساحرہ سیکروز کا نام جادوگرنی کی وجہ سے اتنا وحشت خیز تھا کہ انسان کے کان اُس کے سُننے کے بھی متحمل نہیں ہوسکتے تھے۔ یہ ساحرہ الجیریا سے جلاوطن کی گئی تھی اور ملاح اُسکو اس جزیرے پر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ تم چونکہ ایک لطیف اور پاکیزہ روح تھے اُس کے احکام کو جو گناہوں سے بھی بدتر تھے بجا نہیں لاسکتے تھے۔ اُس نے تم کو ایک درخت بنا کر مقید کر دیا تھا اور تم کُتّے کی طرح روتے چیختے اور چلاّتے تھے۔ بس اس تکلیف اور صعوبت کو یاد کرو۔ جس سے میں نے تم کو نجات دلائی۔

ایریل۔ میرے پیارے آقا مجھے معاف کیجئے۔

ایریل دل میں شرمندہ ہوا کہ اُس سے ناشکر گذاری ظاہر ہوئی، کہنے لگا کہ جو حکم حضور دینگے بجا لاؤنگا۔

پروسپیرو۔ اگر تم حکم بجا لاتے رہوگے تو آخر کار میں تمہیں آزاد کر دونگا۔ اس کے بعد پروسپیرو نے آیندہ کے لئے احکام صادر کئے اور اب ایریل پھر چلا گیا۔ پہلے تو وہاں گیا جہاں فرڈی نند کو صدمے اور رنج میں ہاتھ ملتے چھوڑا تھا اور اب تک اسے وہیں گھاس پر غمگین اور افسردہ حالت میں پایا۔

ایریل نے اُسے دیکھ کر کہا۔ اے میرے شریف نوجوان میں تمکو یہاں سے لے جاؤنگا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ تم یہاں محض اس لئے لائے گئے ہو کہ تمہاری حسین صورت کو خاتون میرنڈا ایک نظر دیکھ لیں۔ آیئے جناب میرے ساتھ چلیئے یہ کہہ کر ایریل نے گانا شروع کیا۔

سمندر کی تہ میں بیس ہاتھ نیچے تیرا باپ پڑا ہے اُس کی ہڈیوں سے مونگے اور مرجان بنتے ہیں، اُسکی آنکھیں موتی ہوگئیں

ہیں، کوئی چیز بھی اُس کی فنا نہیں ہوئی ہے صرف ایک بحری انقلاب پیدا ہوا ہے اُس کی صورت شکل اب کچھ عجیب ہو گئی ہے سمندر کی پریاں اُس کی موت کا گھنٹہ بجاتی ہیں۔ لو اب تو گھنٹے کی آواز میں تمہیں سُناتا ہوں۔ ڈنگ ڈونگ۔ ڈنگ ڈونگ۔

اپنے غرق شدہ باپ کے متعلق یہ خبر سن کر فردی نند بیہوشی کے عالم سے جلد ہوش میں آگیا اور اسی حیرانی و پریشانی میں ایریل کی آواز کے پیچھے پیچھے ہو لیا حتیٰ کہ وہ آواز کے ساتھ ساتھ پروسپیرو اور میرندا تک آگیا، یہ دونوں ایک بڑے درخت کے سائے میں بیٹھے تھے۔ میرندا نے اس سے پہلے سوائے اپنے باپ کے کسی انسان کو نہ دیکھا تھا۔ پروسپیرو نے بیٹی سے پوچھا میرندا بتلاؤ تو وہ دُور کیا چیز ہے۔ میرندا نے حیرت و استعجاب سے کہا اوہو بابا جان یقیناً یہ تو کوئی روح ہے۔ دیکھئے تو وہ کیوں کر ادھر اُدھر دیکھتا ہے بابا جان یقین کیجئے کہ یہ تو کوئی بہت ہی خوبصورت مخلوق ہے کہیں یہ کوئی فرشتہ تو نہیں ہے۔

پروسپیرو نے جواب دیا نہیں بیٹی یہ کھاتا بھی ہے اور سوتا بھی ہے۔ اور جیسے حواس ہم رکھتے ہیں ویسے ہی یہ بھی رکھتا ہے۔ یہ نوجوان مرد جسے تم دیکھ رہی ہو جہاز میں تھا اُس کے ساتھی کھوئے گئے ہیں اور یہ اُن کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اس کی صورت کو غم نے کچھ بدل دیا ہے ورنہ یہ ایسا تھا کہ تم اُسے خوبصورت کہہ سکتی تھیں۔

میرندا سمجھتی تھی کہ تمام آدمیوں کی صورتیں اُس کے باپ پروسپیرو کی طرح سنجیدہ اور متین ہونگی اور سب کے مُنہ پر ایسی ہی سفید سفید لمبی ڈاڑھیاں ہونگی، یہ لڑکی اس حسین نوجوان شہزادے کی وضع دیکھ کر بہت خوش ہوئی، فردی نند نے ایسی خوبصورت لڑکی ایسے ویران دشت و بیابان میں کبھی نہ دیکھی تھی اس حسینہ کو دیکھ کر اور اُس عجیب و غریب آواز کو سُنکر جسے سُنتا ہوا یہاں تک آیا تھا، اُسے خیال ہوا کہ یہاں ضرور کسی سحر یا طلسم کا عمل ہے اور یقیناً یہ ایک مسحور جزیرہ ہے جس میں وہ آن پہنچا ہے اور یہ لڑکی اس جزیرے کی دیوی ہے۔ چنانچہ اسی ادب سے اُسنے میرندا کو مخاطب کیا۔ میرندا نے شرما کر جواب دیا کہ وہ اس جگہ کی دیوی نہیں ہے بلکہ ایک معمولی بن بیاہی لڑکی ہے، قریب تھا کہ میرندا اپنے کُل حالات سے شہزادے کو آگاہ کر دے۔ مگر پروسپیرو نے اُسکو روک دیا۔

پروسپیرو یہ بات دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی تعریف کرتے ہیں اور یہ بھی وہ پہچان گیا جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ دیکھتے ہی ایک دوسرے پر فدا ہو گئے ہیں، مگر پروسپیرو فردی نند کی محبت کی پائیداری کو آزمانا چاہتا تھا اور اسی وجہ سے اُس نے ارادہ کیا کہ چند دشواریاں اُن کے عشق و محبت کی راہ میں پیدا کر دے چنانچہ آگے بڑھکر پروسپیرو نے شہزادے سے کرخت لہجہ میں کہا کیا تم اس جزیرے میں جاسوس بن کر آئے ہو تاکہ اُس کے مالک سے اُسے چھین لو۔ میرے پیچھے آؤ کہ میں تمہاری مُشکیں کس لوں، اب تمہیں سمندر کا کھاری پانی پینا پڑیگا اور گھونگے باسی ترکاریاں اور بلوط کے بیجوں کی بھوسی کھانے کو ملے گی۔

فردی نند نے جواب دیا کہ نہیں ہرگز نہیں اگر کسی نے اس طرح میری خاطر و مدارات کی تو میں اُسی سے لڑونگا، یہاں تک کہ مجھے آپ سے بھی زیادہ کسی طاقتور دشمن سے لڑنا پڑے، اتنا کہہ کر فردی نند نے تلوار سونت لی لیکن پروسپیرو نے اپنے جادو کے عصا کو پھرایا اور فردی نند جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ اب فردی نند میں جنبش کرنیکی بھی طاقت نہ رہی۔

میرندا یہ حال دیکھ کر بڑی عاجزی سے کہنے لگی "باباجان آپ اسقدر سنگدل کیوں ہو گئے اُسپر رحم کیجئے میں اُس کی ضامن بنتی ہوں، یہ دوسرا انسان ہے جسے میں نے دیکھا ہے اور مجھے تو وہ سچا اور باوفا معلوم ہوتا ہے"

باپ نے کہا: خاموش اگر ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو تجھے سزا دونگا تو سمجھتی ہے کہ دُنیا میں اس سے اچھی صورت کا آدمی نہیں کیونکہ تو نے صرف اسے اور کلیبان کو دیکھا ہے مگر اے نادان بیٹی حسن میں تجھے بتاتا ہوں کہ بہت سے آدمی حسن وزیبائی میں اس شخص پر ایسی ہی فوقیت رکھتے ہیں جیسے کہ یہ کلیبان پر رکھتا ہے۔

پروسپیرو نے یہ الفاظ اپنی بیٹی کی محبت کو آزمانے کے لئے کہے تھے۔ بیٹی نے جواب دیا مجھے جو اُلفت و محبت اس سے ہے اُس میں بہت فروتنی شامل ہے اس سے زیادہ حسین آدمی کے دیکھنے کی مجھے خواہش نہیں۔

پروسپیرو نے کہا فرڈی نند آگے بڑھو تم میں میری عدول حکمی کی طاقت نہیں ہے۔ فرڈی نند بولا کہ واقعی اب مجھ میں طاقت نہیں رہی۔

فرڈی نند کو معلوم نہ تھا کہ جادو کے زور سے اُس کی قوت سلب کر لی گئی ہے، وہ محسوس کرنے لگا اور حیران تھا کہ وہ کچھ عجیب طریقے سے پروسپیرو کے پیچھے پیچھے چلنے پر مجبور ہے۔ وہ میرندا کو مڑ مڑ کر دیکھتا رہا حتیٰ کہ پروسپیرو کے پیچھے پیچھے وہ غار میں داخل ہوا۔ یہاں اُس نے کہا کہ میری تمام طاقت ایسی سلب ہو گئی ہے کہ گویا میں خواب میں ہوں لیکن اگر اسی حالت قید سے روزانہ ایک مرتبہ اس مہ پارہ کو دیکھ لیا کروں تو اس بڈھے کی دھمکیاں اور وہ کمزوری جس کا احساس مجھ کو اس وقت ہو رہا ہے بہت خفیف ہو جائے۔

پروسپیرو نے فرڈی نند کو زیادہ عرصہ تک غار میں مقید نہ رکھا اور جلد اس قیدی کو باہر نکال کر ایک سخت کام پر لگا دیا اور اس بات کی کوشش بھی کی کہ اُس کی بیٹی کو خبر ہو جائے کہ یہ نوجوان کیسے سخت مشقت کے کام میں مصروف ہے۔ پروسپیرو خود کچھ بہانہ کر کے اپنے پڑھنے کے کمرے میں چلا آیا مگر یہاں چھپ کر وہ فرڈی نند اور میرندا کی حرکات وسکنات کو دیکھتا رہا۔

پروسپیرو نے فرڈی نند کو حکم دیا تھا کہ لکڑی کے بھاری بھاری کندے اُٹھا کر ایک جگہ جمع کرے مگر بادشاہوں کے بیٹوں کو ایسی محنت ومشقت کی عادت کب ہوتی ہے۔ میرندا کو جلد معلوم ہو گیا کہ اُس کا عاشق تھکن کے مارے مرا جاتا ہے میرندا نے کہا: آپ کیوں اتنی محنت شاقہ اُٹھاتے ہیں، میرا باپ تو اس وقت مطالعہ میں مشغول ہے اور تین گھنٹے تک باہر نہیں آئیگا آپ اتنی دیر آرام کیجئے۔ فرڈی نند نے کہا کہ اے میری پیاری خاتون مجھے ایسا کرنے کی جرأت نہیں ہے آرام کرنے سے پہلے مجھے اپنا کام ختم کرنا ہے، میرندا نے کہا کہ آپ تھوڑی دیر تو دم لے لیں، میں آپکی جگہ لکڑیوں کے یہ کندے ڈھوتی رہونگی مگر فرڈی نند اس بات پر کسی طرح راضی نہ ہوا اور بجائے اسکے کہ میرندا اس کے کام میں مدد کرتی ایک طرح کی رکاوٹ ہو گئی۔ کیونکہ باتوں میں کندے اُٹھانے کا کام سست پڑ گیا۔ پروسپیرو نے فرڈی نند کو اس کام پر محض اُس کی محبت کی آزمائش کی غرض سے لگایا تھا، وہ اُس وقت کتب بینی میں مشغول نہ تھا جیسا کہ اُس کی بیٹی کا خیال تھا۔ بلکہ سب کی نظروں سے پوشیدہ اُنکے پاس کھڑا اُن کی گفتگو سن رہا تھا۔

فرڈی نند نے میرندا کا نام پوچھا، اپنا نام اُس نے فوراً بتا دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ باباجان نے مجھے تاکید کر دی تھی

کہ اپنا نام کسی کو نہ بتانا۔ مگر اُن کے حکم کے خلاف میں نے آپ کو اپنا نام بتا دیا ہے۔ پروسپیرو اپنی بیٹی کی پہلی نافرمانی کو دیکھ کر مسکرایا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ خود ہی اپنے جادو کے زور سے اُن دونوں کو گرفتارِ محبت کرنے کا باعث ہوا ہے۔ اس وجہ سے وہ بیٹی کی اس نافرمانی پر ناراض نہ ہوا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ بات بھی محبت کی وجہ سے ہوئی ہے۔ وہ خوش ہو کر فرڈی نند کی طول طویل تقریر سُنتا رہا جس میں اُس نے کہا تھا کہ وہ میرنڈا کو طبقۂ نسواں میں ممتاز ترین حسینہ خیال کرتا ہے اور اُس کو دل وجان سے چاہتا ہے۔ فرڈی نند نے یہ بات میرنڈا کے حُسن وجمال کی تعریف و توصیف میں کہی تھی۔ میرنڈا نے اس کا جواب نہایت سادگی سے یہ دیا کہ مجھے کسی عورت کا چہرہ یاد نہیں ہے اور نہ میں نے سوائے تمہارے اور اپنے باپ کے کسی مرد کو دیکھا ہے۔ میرے پیارے رفیق میں نہیں جانتی کہ دُنیا میں اور کیسی صورتیں ہوتی ہیں، لیکن آپ یقین کریں کہ مجھے سوائے آپ کے کسی اور رفیق کی خواہش نہ ہوگی۔ اور نہ میرا تخیل بغیر آپ کے اور کوئی صورت پیش کرتا ہے جسے میں پسند کر دوں، لیکن مجھے خوف ہے کہ میں نے اپنے والد کے حکم کو فراموش کر رکھا ہے اور اپنے طرزِ گفتگو میں آزادی اختیار کی ہے۔

پسیر پروسپیرو نے مسکرا کر سر ہلایا گویا کہتا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے میری مرضی و منشا کے مطابق ہے۔ اب میری بیٹی نیپلیز کے تخت پر ملکہ بن کر بیٹھے گی۔

فرڈی نند نے پھر بڑے فصیح و بلیغ اور مرصع الفاظ میں کہنا شروع کیا اور وجہ اس کی یہ تھی کہ اس زمانے میں نوجوان شہزادے نہایت ادب اور حسنِ اخلاق کے رنگین طرز میں گفتگو کیا کرتے تھے، چنانچہ میرنڈا سے اُس نے کہا کہ وہ نیپلیز کے تخت و تاج کا وارث ہے اور اُس کی خواہش ہے کہ میرنڈا اُس کی ملکہ بنے۔ میرنڈا نے کہا کہ اے میرے رفیق میں بیوقوف سمجھی جاؤں گی جو خوش ہونے کی جگہ آنسو بہاؤں۔ میں آپ سے نہایت سادگی اور پاکیزگی سے کہتی ہوں کہ اگر آپ مجھ سے شادی کریں گے تو آپ کی بیوی بننا مجھے منظور ہوگا۔

اتنا سُنتے ہی پروسپیرو فوراً ظاہر ہو گیا اور فرڈی نند ابھی میرنڈا کا شکریہ بھی ادا نہ کرنے پایا تھا کہ پروسپیرو نے کہا: پیاری بیٹی ڈرو مت تم دونوں میں جو باتیں اس وقت ہوئی ہیں وہ سب میں نے سُنیں اور میں نے اپنی اجازت بھی دیدی پھر فرڈی نند سے کہا کہ شہزادے میں نے تمہارے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا ہے مگر اپنی بیٹی دے کر اس کی تلافی کرتا ہوں، یہ کل اذیت و مشقت تمہاری محبت کو پرکھنے کے لئے تھی اور اس کسوٹی پر تم کھرے نکلے۔ یہ میری بیٹی تمہارا وہ انعام ہے جسے تمہاری سچی محبت اور اعلیٰ قابلیت نے حاصل کیا ہے۔ میں اپنی یہ عزیز بیٹی تمہیں دیتا ہوں۔ اور اگر میں فخر سے کہوں کہ وہ تعریف سے بالاتر ہے تو اُس پر ہنسنا نہیں۔ اتنا کہہ کر پروسپیرو کسی ضرورت سے رُخصت ہوا اور کہتا گیا کہ تم دونوں میری واپسی تک یہیں بیٹھے بات چیت کرتے رہو۔ یہ حکم ایسا تھا کہ میرنڈا اس کے خلاف کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھی۔

پروسپیرو نے ایریل کو طلب کیا۔ وہ فوراً حاضر ہوا اس وقت وہ نہایت اضطراب کی حالت میں تھا کہ اُس کے بھائی انطونیو اور شاہ نیپلیز کے ساتھ جو جو سلوک اس نے کیا ہے وہ سب پروسپیرو سے بیان کرے۔ چنانچہ حاضر ہوتے ہی ایریل نے بڑی تفصیل سے کل حالات بیان کئے اور کہا کہ میں نے ان دونوں کو عجیب و غریب چیزیں دکھا کر اور بڑی بڑی بھیانک آوازیں

سُنکر خوف سے بدحواسی کے عالم میں چھوڑ کر آیا ہوں اور یہ بھی کہا کہ یہ دونوں جنگل میں پھرتے پھرتے تھک کر چُور ہوگئے ہیں اور کھانا نہ ملنے سے مرنے کی نوبت آئی ہے۔ یہ دیکھ کر میں نے اُن کے سامنے نہایت لذیذ کھانے رکھے لیکن جونہی کھانے کی طرف اُنھوں نے ہاتھ بڑھایا تو میں خود ایک خوفناک دیو کی صورت میں ظاہر ہوا اور کھانا غائب ہوگیا۔ یہ دیکھ کر اُن کے تعجب و حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اب اس خوفناک دیو نے اُن کے تمام گذشتہ مظالم جو اُنہوں نے پروسپیرو کو اُس کی سلطنت سے نکالنے میں کئے تھے یاد دلائے اور کہا کہ آپ نے پروسپیرو اور اُس کی معصوم بچی کو سمندر میں غارت ہونے کے لئے چھوڑ دیا اور اُن سے یہ بھی کہا کہ اس وقت جو تکلیفیں آپ کو پہونچ رہی ہیں اور جو خوف آپ کے دل میں پیدا ہو رہا ہے یہ خود آپ ہی کی حرکاتِ ذمیمہ کی پاداش ہے۔ نیپلیز کا بادشاہ اور دغاباز انطونیو اپنی زیادتیوں اور بے انصافیوں پر سخت نادم ہوئے۔ ایریل نے آقا سے کہنے لگا کہ اُن کی اس وقت کی ندامت و پشیمانی سچے دل سے ہے اور یہ کہ گو میں محض ایک رُوح ہوں پھر بھی اُن پر رحم کھائے بغیر نہ رہ سکا۔ اتنا سُنکر پروسپیرو نے ایریل سے کہا۔ جاؤ اور اُن دونوں کو یہاں حاضر کرو۔ تم اگر ایک روح ہوکر اُن کی مصیبت و خستہ حالی پر رحم کرتے ہو تو کیا میں جو اُنہی کی طرح انسان ہوں اُن پر رحم نہ کرونگا۔ جا میرے چُست و چالاک ایریل جا اُنہیں جلد یہاں لے آ۔ ایریل فوراً روانہ ہوا اور پھر جب آیا تو اس طرح آیا کہ شاہ نیپلیز اور انطونیو ایریل کے پیچھے تھے اور بوڑھا غنزالو ان دونوں کے پیچھے تھا۔ اور وہ ہوا میں اس گانے کی آواز پر حیرت زدہ تھے جو ایریل گاتا ہوا ہوا پر اُڑتا تھا۔ تاکہ اس گانے کو سُنتے ہوئے وہ پروسپیرو کے سامنے آجائیں۔ یہ غنزالو وہی تھا جس نے کچھ کھانے پینے کی چیزیں اور چند کتابیں پروسپیرو کے لئے کشتی میں خفیہ طور پر رکھدی تھیں اور یہ وقت وہ تھا جبکہ اُس کے بدطینت بھائی نے اُسکو سمندر پر ایک کھلی کشتی میں بے آب و دانہ اور بے سروسامانی کی حالت میں بٹھا کر موت کے حوالے کیا تھا۔

شاہ نیپلیز اور انطونیو کی حالت خوف و صدمے سے ایسی ہو رہی تھی کہ اُن کے حواس باختہ تھے۔ پروسپیرو نے سب سے پہلے اپنے آپ کو غنزالو پر ظاہر کیا اور یہ کہہ کر پکارا کہ غنزالو تم تو میری جان کے بچانے والے ہو۔ اتنا سُنتے ہی بادشاہ نیپلیز اور اُس کے بھائی نے پہچان لیا کہ یہ ستم رسیدہ پروسپیرو ہے۔ انطونیو کے دل میں ندامت و پشیمانی کے چشمے اُبل پڑے اور آنکھوں سے آنسوؤں کی دو نہریں جاری ہوگئیں اور نہایت تاسف بھرے الفاظ میں اپنے بھائی سے معافی کا خواستگار ہوا۔ بادشاہ نیپلیز نے بھی اپنے قصور کا اعتراف کیا۔ اور اس بات پر ندامت ظاہر کی کہ اس نے انطونیو کو مدد دی کہ وہ اپنے بھائی پروسپیرو کو تخت سے معزول کرے۔ پروسپیرو نے ان دونوں کو سچے دل سے معاف کر دیا اور ان دونوں نے وعدہ کیا کہ وہ اُسکی سلطنت واپس کر دینگے۔ اسپر پروسپیرو نے شاہ نیپلیز سے کہا کہ میں بھی ایک تحفہ آپکو پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کہہ کر اُس نے ایک دروازہ کھولا اور بادشاہ کو اُس کا بیٹا فرڈی ننڈ اور میرنڈا دونوں شطرنج کھیلتے ہوئے نظر آئے۔

باپ اور بیٹے کو اس خلاف توقع ملاقات کی خوشی سے بڑھکر اور کیا نعمت ہوسکتی تھی۔ اب تک باپ سمجھ رہا تھا کہ بیٹا اور بیٹا سمجھ رہا تھا کہ باپ سمندر میں ڈوب کر ہلاک ہوگئے ہیں۔

میرنڈا نے متعجب ہوکر کہا۔ یہ کیسی شریف ہستیاں معلوم ہوتی ہیں، وہ دُنیا بھی جن میں یہ آباد ہونگی یقیناً نہایت شاندار ہوگی۔

شاہِ نیپلیز بھی میرنڈا کے حُسن وجمال اور فطرتی خوبیوں کو دیکھ کر ایسا ہی حیرت زدہ ہوا جیسے کہ اُس کا بیٹا ہوا تھا۔ بادشاہِ نیپلیز نے پوچھا کیا یہ لڑکی کوئی دیبی ہے۔ ضرور وہ ایسی ہی ہو جسنے ہم کو جُدا کر کے پھر یوں ملا یا۔

فرڈی ننڈ یہ دیکھ کر مسکرایا اور کہنے لگا کہ میرنڈا کو دیکھ کر میرے باپ کو بھی وہی دھوکا ہوا جو شروع میں مجھے ہوا تھا۔ فرڈی ننڈ نے اپنے والد سے کہا نہیں جناب یہ تو ایک فانی ہستی ہے مگر ایک غیر فانی ہستی نے اسکو میرا بنا دیا۔ میں نے ایسی حالت اور وقت میں اپنے لئے منتخب کیا، جبکہ میں آپ سے اجازت حاصل نہ کر سکتا تھا۔ مجھے خبر نہ تھی کہ آپ زندہ ہیں، یہ پروسپیرو کی بیٹی ہیں جو میلان کے مشہور امیر و مالک ہیں۔ جن کی شہرت و ناموری تو میں نے بہت کچھ سُنی تھی مگر اُن کو دیکھنے کا ابھی تک اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اُنہوں نے مجھے ایک نئی زندگی بخشی ہے یعنی اپنی پیاری بیٹی مجھے دے کر اپنے آپکو میرا دوسرا باپ بنایا ہے اور مجھے فرزندی میں لیا ہے۔ بادشاہ نے کہا تو پھر مجھے بھی اس لڑکی کا باپ بننا چاہیئے لیکن یہ بات کانوں کو ناخوشگوار معلوم ہوتی ہے کہ میں اپنی ہی بیٹی سے معافی مانگوں۔

پروسپیرو نے کہا۔ اس کا کچھ تذکرہ نہ کیجئے ہمیں اپنے گذشتہ مصائب کو بالکل فراموش کر دینا چاہیئے بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ اُن کا انجام اس قدر مسرت بخش ہوا ہو۔ اس کے بعد پروسپیرو اپنے بھائی سے بغلگیر ہوا اور اس کو یقین دلایا کہ وہ اُس کے تمام قصور معاف کر چکا ہے۔ اور کہا کہ یہ خدائے قادرِ مطلق اور مسبب الاسباب کی مرضی تھی کہ میں اپنی حقیر سی ریاستِ میلان سے خارج کر دیا جاؤں اور اس میں منظور تھا کہ میری بیٹی نیپلیز کے تخت وتاج کی وارث ہو۔ کیونکہ یہ اسی صحرائی زندگی میں باہم ملاقات کا نتیجہ ہے کہ بادشاہ کا بیٹا میرنڈا پر فریفتہ ہوگیا یہ پُردرد الفاظ پروسپیرو نے اپنے بھائی انطونیو کی تسلّی تشفی کے لئے کہے تھے مگر بھائی پر اُن کا یہ اثر ہوا کہ ندامت سے روتے روتے اُس کی ہچکی بندھ گئی نیک دل غنزالو بھی اس محبت بھرے ملاپ کو دیکھ کر خوشی سے رونے لگا اور دولھا دُلہن کے لئے دعائے خیر و برکت مانگی۔

پروسپیرو نے کہا کہ آپ کا جہاز بندرگاہ میں محفوظ ہے اور اس کے ملاح بھی محفوظ ہیں اور یہ کہ کل وہ مع اپنی بیٹی کے اُن کے ساتھ وطن واپس ہوگا۔ اور یہ بھی کہا کہ ناشتہ جیسا بُرا بھلا میسر ہے اُس میں سب شریک ہوں اور شام کو تفریح کے لئے اپنی زندگی کے حالات جب سے کہ وہ اِس جزیرے میں آیا ہے بیان کریگا۔ اس کے بعد اُس نے کلیبان کو حکم دیا کہ کھانا تیار کرے اور غار میں سب چیزوں کو درست کر کے رکھے، وہ سب اس بدصورت دیو کی بے ڈھنگی بناوٹ اور وحشیانہ صورت کو دیکھ کر حیران تھے مگر پروسپیرو کے پاس صرف یہی ایک خدمتگار تھا۔

پروسپیرو نے جزیرے کو خیرباد کہنے سے پہلے ایریل کو اپنی ملازمت سے رُخصت کیا۔ یہ بات اِس زندہ دل روح کے لئے نہایت مسرت کا باعث ہوئی اگرچہ وہ اپنے آقا کا وفادار ملازم تھا، پھر بھی اپنی آزادی کا متمنی اور اُس کے لُطف اُٹھانے کا خواہشمند تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ فضا میں بلا کسی روک ٹوک کے ایک طائرِ آزاد کی طرح گشت لگائے۔

ہرے بھرے درختوں کے سائے میں بسیرا ے ۔ لذیذ پھلوں اور خوشبودار پھولوں میں چین کرے۔

پرو سپیرو نے اس ننھی سی روح کو آزاد کرنے وقت کہا اے میرے لائق ایریل تمہاری جُدائی کا مجھے افسوس ہوگا مگر میں تمہیں آزاد کئے دیتا ہوں۔ ایریل نے جواب دیا اے میرے پیارے آقا میرا بہت بہت شکریہ قبول ہو اور پیشتر اس سے کہ آپ مجھ حکم بردار روح کی مدد کو خیرباد کہیں مجھے اجازت دیجئے کہ میں بادِ موافق کے ساتھ ساتھ آپ کے جہاز کے ہمراہ آپ کے وطن تک چلوں، اور اے آقا جب میں آزاد ہونگا تو کیسی مسرت سے زندگی بسر کرونگا ۔ اتنا کہہ کر اُس نے یہ دلکش نغمہ شروع کیا۔

"شہد کی مکھیاں جہاں شہد چوستی ہیں وہیں میں بھی شہد چوسونگا، میں کسی پھول کے کٹورے میں رہونگا اور خوشی خوشی گرمی کے بعد شپرک کی پُشت پر سوار ہوکر اُڑونگا اور بہت خوش ہوکر اُس پھول کے نیچے رہونگا جو شاخوں پر جُھکا ہوا ہو۔

اب پروسپیرو نے اپنی کتابیں اور جادو کا عصا زمین میں گہرا دفن کردیا کیونکہ اب اُس کا ارادہ ہوگیا تھا کہ کبھی وہ علم سحر سے کام نہ لیگا وجہ یہ تھی کہ اب اپنے دشمنوں پر اُس نے غلبہ پالیا تھا اور اپنے بھائی اور شاہِ نیپلیز سے ملاپ بھی ہوگیا تھا، اب کوئی چیز ایسی باقی نہ تھی کہ اُسکی خوشی میں اضافہ کرسکتی سوائے اس کے کہ وہ پھر اپنے وطن کو دیکھے اور اپنی ریاست پر قبضہ کرے۔ اور اپنی بیٹی اور شہزادے فردی نند کے جشن شادی میں شریک ہو۔ شاہِ نیپلیز نے کہہ رکھا تھا کہ اُس کے فرزند فردی نند کی بڑی دھوم دھام اور تزک و احتشام سے نیپلیز جاکر رہیگی، چنانچہ وہ سب ایریل کی محافظت میں ایک خوشگوار سفر کے بعد نیپلیز پہنچ گئے۔

(باقی) فرخندہ اختر بیگم

خوشی کا کفّارہ

پھر دیدنی ہے میرے خیالات کی بہار
حسنِ نشاط شیشۂ دل میں ہے رنگ کار
بھر جام، اور جام کو یوں مُسکرا کے دیکھ
ساقی! مری رگوں میں مچلنے لگیں شرار

موجِ ہوا کا نغمۂ جاں بخش سُن ذرا
ہے شبنم و شراب سے آسودہ روزگار
حسن اور جام، بادۂ گُلرنگ اور شام
جنّت کو کر رہے ہیں یہ اسباب شرمسار

ہے صوتِ چنگ رُوح کسی گل کی ساقیا
نغمہ بھی ہے طلسمِ گہِ معنیٔ بہار
یہ زندگی ہے جشنِ سرِ رہگزر فقط
پھر ہم کہاں، کہاں یہ جوانی، کہاں بہار

جز کیفِ انبساط نہیں مجھکو کچھ خبر
میں کون ہوں، غلام کہ خواجہ کہ شہریار
اِک لمحۂ مسرّتِ بے انتہا کے بعد
رہتا ہے کس کو زندگیٔ رائگاں سے پیار

اے ساقیٔ حسیں تری آغوشِ ناز میں
کاش آج مجھکو موت پہ مِل جائے اختیار
ذوقِ بلند کی کوئی تحسین چاہیئے
ضِد ہے مجھے کہ موت بھی رنگین چاہیئے

عدم

ایک ایکٹ کا ڈراما

حلقۂ مسموم

افراد

ملکہ — شہزادے کی مکار اور بیوہ ماں جو کارڈینل کی سازش سے اپنے مرحوم شوہر کو ہلاک کر کے فرمانروائے سلطنت بنی ہوئی ہے
شہزادہ چارلس — ولی عہد سلطنت
لارڈ کارڈینل — شاہی کلیسا کا پادری
کیتھرین — ایک خوبصورت دوشیزہ شہزادے کی محبوبہ
البرٹ — کیتھرین کا باپ
خادم — شاہی خدمت گار

منظر:۔ شاہی محل کا ایک کمرہ دائیں طرف اندر آنے کے لئے ایک بڑا دروازہ ہے بائیں جانب ایک چھوٹا سا دروازہ محل کے اندر کھلتا ہے۔ پیچھے دیوار میں ایک کھڑکی ہے جہاں سے شاہی باغات پر نظر پڑتی ہے۔ کمرے کے عین وسط میں ایک بڑی میز ہے جس پر ایک بیش قیمت کپڑا پڑا ہوا نیچے زمین تک لٹک رہا ہے۔ میز کے گرد چار کرسیاں ہیں۔ پاس ہی کچھ فاصلے پر ایک صوفا پڑا ہے۔ اس کے علاوہ کمرہ ضروری سامان سے آراستہ ہے۔ میز پر ایک چاندی کی طشتری رکھی ہوئی ہے۔ جب پردہ اٹھتا ہے تو ملکہ طشتری میں کیک چننے میں مصروف نظر آتی ہے۔ نہایت احتیاط سے وہ چند کیکوں میں ایک شیشی سے تھوڑا سا سفوف نکال کر ڈال دیتی ہے۔ پھر اپنا کام ختم کر کے میز کے قریب آجاتی ہے۔

ملکہ:۔ آہا۔ خوب۔ بہت خوب۔ شاہی خاندان کے کسی فرد سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ اس کام کو اتنی خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکے۔ تقدیر کا عمل دنیا کی تمام چیزوں پر ہوتا ہے لیکن یہ پہلا موقع ہے کہ پنیر کے کیکوں پر اسکے عمل کی ابتدا ہونے والی ہے۔

(میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجاتی ہے۔ شاہی خادم دائیں دروازے سے اندر داخل ہوتا ہے۔)

جاؤ۔ شاہی کلیسا کے محترم بزرگ لارڈ کارڈینل کو بلاؤ۔

(اودھر ادھر ٹہلنے لگتی ہے۔ پھر میز کے قریب آکر کھڑی ہو جاتی ہے اور طشتری میں پڑے ہوئے کیکوں کو غور سے دیکھتی ہے۔)

یہ کیک کتنے خوش ذائقہ اور لذیذ ہوتے ہیں۔ ایک شاندار دعوت — اور — پھر تمام معاملات کا بخوبی حل۔

(کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

تعجب ہے کہ ایسی تجویز پیشتر از یں میرے فہم میں نہ آسکی۔

(لارڈ کارڈینل دروازے میں ظاہر ہوتا ہے)

کارڈینل۔ (دروازے پر رُکتے ہوئے) کیا ملکہ صاحبہ کو میری خدمات درکار ہیں — ؟

ملکہ:۔ ہاں! عزیز کارڈینل۔ مجھے اس وقت تمہاری سخت ضرورت تھی۔ دروازہ بند کردو۔ اور یہاں آؤ (طشتری کی طرف اشارہ کرکے) تم یہ کیک دیکھ رہے ہو؟۔

کارڈینل:۔ ہاں۔ یہ حضور کی مرغوب ترین غذا ہے۔

ملکہ:۔ تم اس سے کیا نتیجہ اخذ کرتے ہو؟۔

کارڈینل:۔ یہی کہ علیاحضرت کو اس وقت بھوک لگ رہی ہے۔

ملکہ:۔ نہیں۔ بلکہ یوں کہو کہ میں اس وقت سیر ہو چکی ہوں۔

کارڈینل:۔ اور پھر بھی اتنے کیک باقی رکھے ہیں۔ غالباً یہ خلاف معمول ہے۔

ملکہ:۔ میری بات دُرست ہے۔

کارڈینل:۔ اور ساتھ ہی دلچسپ بھی۔

ملکہ:۔ تم اس کی پروا نہ کرو۔ یہ بتاؤ کہ تم کس نتیجہ پر پہونچے ہو۔

کارڈینل:۔ میرے خیال میں وہی سابقہ دقت درپیش ہے

ملکہ:۔ ٹھیک ہے لیکن اس مرتبہ واقعات حد سے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہو رہے ہیں۔

کارڈینل:۔ کیا شاہزادے کے اطوار حدِ اصلاح سے گزر چکے ہیں۔

ملکہ:۔ بالکل۔ میں اس کی بدمذاقی اور بیہودہ پن سے تنگ آچکی ہوں۔ اُسنے کئی منحوس جانور پال رکھے ہیں اور اس کے دماغ میں ہر وقت اُن کی نگہداشت کا خبط سمایا رہتا ہے۔ مزید برآں اسے میری ذرہ بھر بھی پروا نہیں تم کس سوچ میں ہو؟۔

کارڈینل:۔ مجھے ہمیشہ حضور کی تکالیف کا خیال ستاتا رہا ہے۔

ملکہ:۔ اوہو۔ میری تکالیف۔ ہر مصیبت کے دوران میں ایک وقت ایسا آتا ہے جبکہ انسان کو اُسکے تدارک کا فوری انتظام کرنا چاہیئے۔ اور میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ مجھے ایسا موقع بہت جلد ہاتھ آجاتا ہے۔

کارڈینل:۔ اور ہر مرتبہ جبکہ حضور نے ایسا کیا ہے۔ دُنیا کی آبادی میں ایک خفیف سی کمی ہوتی رہی ہے۔

ملکہ:۔ مجھے اس کی مطلق پروا نہیں۔ اور آج — ان کیکوں کی موجودگی کا یہ مطلب ہے کہ مجھے ایک بار پھر ایسا موقع مل رہا ہے — لیکن تم تو متعجب نہیں ہو — ؟

کارڈینل:۔ فی الحقیقت نہیں۔ بہرحال یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ حضور نے ایسی لذیذ خوراک تیار کروائی۔

ملکہ:۔ یہ دُرست ہے۔ مگر آج کی طرز ترتیب معمول سے زیادہ دلپذیر ہے۔ مثلاً تم دیکھ سکتے ہو کہ یہ کیک ایک خاص ترتیب سے طشتری میں چُنے گئے ہیں۔

کارڈینل:۔ (میز پر رکھی ہوئی طشتری کو دیکھتے ہوئے) واقعی ایک عجیب ترتیب! اوہو! یہ کیک تو انگریزی حرف (M) کی شکل بنائے ہیں۔

ملکہ:۔ ہر ایک کیک میں ایک پنیر کا ٹکڑا ہے۔

کارڈینل:۔ پنیر کے ٹکڑے!

ملکہ:۔ اور پنیر کے ہر ٹکڑے میں خشک انگور کا ایک دانہ موجود ہے۔

کارڈینل:۔ خشک انگور کے دانے؟۔

ملکہ:۔ اور سوائے ان کیکوں کے جو حرف (M) کے دونوں سروں پر رکھے ہوئے ہیں انگور کے باقی تمام دانوں میں ایک مہلک زہر کے ذرات ڈالے گئے ہیں

کارڈینل:۔ اوہو! کتنی عجیب ترکیب اور گذشتہ تمام تجاویز سے زیادہ موثر۔ ظاہر ہے کہ یہ کیک کسی مخصوص شخصیت کے لئے تیار کئے گئے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ کس کے لئے ؟۔

ملکہ:۔ ان میں سے ایک تمہارے لئے ہے۔

کارڈینل:۔ (متعجب ہوکر) میرے لئے!

ملکہ:۔ بیشک۔ مگر وہ میرے والا کیک جو زہر آلود نہیں اور اسی طرح کا دوسرا میرے لئے۔ باقی تمام بدذات کیھترین اور اُس کے منحوس باپ کے لئے ہیں۔

کارڈینل:۔ کیا شاہزادہ انکے دام فریب میں گرفتار ہو چکا ہے۔ کیا وہ

شاہی توجہ پر اپنا دام پھیلا چکے ہیں۔

ملکہ۔ (اُٹھتے ہوئے) مجھے پچھلے ہفتے اس بات کا علم ہوا۔ آہ! (اب میں) اسے برداشت نہیں کر سکتی۔ چارلس حد سے زیادہ بیوقوف بن رہا ہے کیھترین مجھ پر سبقت لے جا رہی ہے۔ اور اس کا بوڑھا باپ دن بدن شاہی اقتدار حاصل کر رہا ہے۔ معزز کارڈینل، کیا تمہیں اس بات کا احساس ہے کہ اگر اس بدذات عورت نے اسی طرح ایک ماہ کے اندر اندر شاہزادہ پر پوری طرح قابو پالیا تو مجھے تمام عمر بیکسی کی حالت میں دن گزارنے ہونگے۔ کیا میری اس سے زیادہ بدقسمتی بھی ہو سکتی ہے

کارڈینل۔ غالبًا نہیں۔

ملکہ۔ شاہزادہ اپنے کتوں اور بلیوں سے کھیل سکتا ہے۔ اپنے تمام پالتو جانوروں سے دل بہلا سکتا ہے۔ اور اگر اُس کی منسوبہ ڈچز آف براٹن کورٹ اس کی خوشنودی کر سکے تو اسے بھی خاطر میں لا سکتا ہے۔ مگر جس وقت عوام پر سے کسی کو اپنی محبوبہ بنانے پر آمادہ ہو تو اُس کی والدہ کو مجبورًا دخل انداز ہونا پڑے گا۔

کارڈینل۔ اور آپ کی تجویز۔

ملکہ۔ نہایت آسان اور معمولی ہے۔ میں نے صحیح طور پر دریافت کر لیا ہے کہ کیھترین اور اس کا باپ ہر روز شام کے وقت سیر کرنے کے لئے شاہی باغ میں آتے ہیں۔ (کھڑکی کے قریب جاتی ہے) یہاں سے وہ مقام بخوبی نظر آسکتا ہے۔ اب تم فورًا جاؤ اور اُنہیں میرا پیغام دو کہ ملکہ نے آپ کو دعوت پر بلایا ہے۔ اور کھانے کے لئے شاہی باورچی خانے کے مشہور ترین کیک تیار کر لئے ہیں۔ پھر اس کے بعد جب وہ یہاں آجائیں گے تو تم افتتاحی طور پر پہلے کیکوں کی طشتری مجھے پیش کرنا۔ اور پھر اس کے عوض میں تم ہیر کیک اُٹھانے کے لئے کہوں گی ـــــ اور یہ دونوں وہی بےضرر کیک ہونگے جو حرف (M) کے پہلے اور دوسرے سرے پر رکھے ہوتے ہیں۔ بعدازاں تو وارد مہمان باقی کیکوں کو خود بخود پوری سرگرمی سے کھانا شروع کر دینگے۔ اور تمہیں معلوم ہو کہ یہ کتنا دلچسپ مذاق ہوگا۔

کارڈینل۔ مذاق! یہ تو کافی تکلیف دہ ہوگا۔ ہہ ہہ ہہ (یکلخت سنجیدہ ہو کر) بلاشبہ یہ دونوں کیک بالکل بےضرر ہیں۔ مجھے اپنی ذات کی چنداں پروا نہیں بلکہ اس بات کا خیال ہے کہ شاہی کلیسا کو میری ضرورت ہے ـــ اور ـــ؟

ملکہ۔ کلیسا سے زیادہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ محترم کارڈینل یقین رکھو۔ کہ جب تک تم اپنے عہدے پر فائز ہو تم بالکل محفوظ ہو۔

کارڈینل۔ اسکے لئے میں دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ملکہ۔ لو اب تیار ہو جاؤ۔ غالبًا پانچ بجنے والے ہیں۔ تمہیں اپنے فرائض کی تکمیل کے لئے فورًا شاہی باغ میں پہونچنا چاہیئے۔ اور جتنی جلدی ہو سکے انہیں یہاں لے آؤ۔

(یکلخت دروازہ کھلتا ہے اور شاہزادہ اندر داخل ہوتا ہے۔)

چارلس! تمہیں میں نے پیشتر ہی کہدیا تھا کہ آج شام مجھے ہرگز ملنے نہ آنا۔

شہزادہ۔ (ملکہ یعنی اپنی والدہ سے) آپ کا زیادہ دیر تک تنہا رہنا خطرہ سے خالی نہیں۔ لہذا میں آپ کی خوشنودی کے لئے چلا آیا۔ ہیلو! کارڈینل میں چاہتا ہوں کہ تمہارے جیسا لباس زیب تن کر سکوں۔ (میز کے قریب پہونچکر) آہا۔ یہاں تو شاہی باورچی خانے کے مخصوص اور خوش ذائقہ کیک رکھے ہوئے ہیں۔

ملکہ۔ چارلس۔ انہیں ہرگز ہاتھ نہ لگانا۔

شہزادہ۔ مگر یہ مجھے بہت مرغوب ہیں۔ اور میں نے یہ خواہش آپ ہی سے ورثہ میں پائی ہے۔

ملکہ۔ مجھے خوب علم ہے کہ تم نے میری کوئی خصلت بھی وراثت میں نہیں پائی، تم بالکل اپنے مرحوم باپ کی مانند ہو۔

شہزادہ۔ میرا مرحوم باپ ایک نیک انسان تھا۔ اور کم از کم میری طرح وہ جانوروں کا دلدادہ ضرور تھا۔ اور ہاں ـــ اس کی موت کیسے واقع ہوئی تھی ـــ؟

ملکہ۔ تم ہمیشہ اسی قسم کے بیہودہ سوالات کرتے ہو۔

شہزادہ۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس سوال پر آپ ہمیشہ برافروختہ ہو جاتی ہیں خدا معلوم اس میں کیا اسرار ہے۔

(کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔)

کارڈینل:۔ (بیچ میں دخل دیتے ہوئے) ملکہ صاحبہ اُمورِ سلطنت سے قدرے پریشان ہو رہی ہیں۔ کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ انہیں اسی حالت میں محوِ خیالات رہنے دیا جائے۔

شہزادہ:۔ ہرگز نہیں۔ میں خود تھکا ماندہ ہوں۔ اور بھوکا بھی ——— لہٰذا اس حالت میں خوراک کے علاوہ کسی اور چیز کا خیال کرنا میرے لئے ناممکن ہے۔

(طشتری کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔)

ملکہ:۔ چارلس! ان کیکوں کو پڑا رہنے دو۔

کارڈینل:۔ (شاہزادے سے) جناب مجھے یقین ہے کہ شاہی باورچی خانہ میں اور بہت سے کیک موجود ہیں۔

ملکہ:۔ ہاں مجھے خوب یاد آیا کہ باورچی نے قریباً دو درجن کیک تیار کئے تھے۔ مزید برآں چونکہ تمہاری جیبوں سے ظاہر ہے کہ وہ اشیائے خوردنی سے بھری ہوئی ہیں اس لئے تمہیں مطلق بھوک محسوس نہیں ہونی چاہیئے۔

شہزادہ:۔ آپ غلط فرما رہی ہیں۔

ملکہ:۔ خوب، تو پھر ان میں کیا ہے۔

شہزادہ:۔ آپ کس لئے دریافت کرنا چاہتی ہیں۔

ملکہ:۔ (قریب آکر) چارلس! بیوقوف مت بنو۔ بتاؤ تمہاری جیبوں میں کیا ہے۔

شہزادہ:۔ فقط جانور۔

ملکہ:۔ جانور! کس قسم کے جانور؟!

شہزادہ:۔ (دائیں جیب پر ہاتھ مارتے ہوئے) اس میں کتے کا ایک خورد سال بچہ ہے لیکن یہ مر چکا ہے۔

ملکہ:۔ (کھڑکی کے قریب جاکر) کتنا بیہودہ پن۔

کارڈینل:۔ (چالاکی سے) اور جناب کی دوسری جیب میں؟

شہزادہ:۔ اس میں ایک ننھا سا خرگوش ہے۔ لیکن یہ زندہ ہے۔

ملکہ:۔ (واپس میز کے قریب آکر) زندہ! خدایا پناہ! کیا شاہی خاندان کے کسی فرد نے کبھی ایسا کیا ہے؟

شہزادہ:۔ (خرگوش کو جیب سے قدرے باہر نکال کر) دیکھئے کتنا پیارا خرگوش ہے۔ میں آج رات کو اسے اپنے ساتھ بستر پر سلاؤنگا۔

ملکہ:۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

(کہیں سے گھنٹے کی آواز پانچ بجاتی ہے۔)

معزز کارڈینل! تم شاہی کام کی تکمیل کے لئے روانہ ہو جاؤ۔ میں اس شریر لڑکے سے نبٹ لونگی۔

(کارڈینل آداب بجا لاکر نکل جاتا ہے۔)

شہزادہ:۔ آپ نے اس بوڑھے پادری کو کہاں بھیجا ہے۔

ملکہ:۔ تمہیں ایسا بیہودہ سوال کرنے کا کوئی حق نہیں۔

(پھر کھڑکی کے قریب چلی جاتی ہے)

خرگوش کو جیب سے نکال دو۔ تاکہ میں اسے ذبح کرنے کے لئے نوکر کے حوالے کر دوں۔

شہزادہ:۔ ہرگز نہیں۔ اس کی جان لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ خرگوش بہت مفید ثابت ہو۔

ملکہ:۔ (کھڑکی سے باہر جھانکنے لگتی ہے۔) بیوقوف۔ یہ خرگوش کی طرح مفید ثابت ہو سکتا ہے ——— ہیلو! وہ آرہے ہیں۔

شہزادہ:۔ (اٹھتے ہوئے) کون!

ملکہ:۔ (کھڑکی میں سے باہر جھانکتے ہوئے) زیادہ باتیں مت بناؤ۔ نوکر کو آواز دو تاکہ وہ خرگوش کو باہر لے جائے۔

(شہزادہ چپ چاپ دروازے کے قریب جاتا ہے اور اسے آہستہ سے کھول کر خرگوش کو باہر پھینک دیتا ہے۔ پھر واپس میز کے قریب آکر کھڑا ہو جاتا ہے اور طشتری میں چنے ہوئے کیکوں کو دیکھتا ہے۔)

شہزادہ:۔ یہ کیک انگریزی حرف (M) کی شکل میں کیوں ترتیب دئے گئے ہیں۔ (طشتری کو اٹھا لیتا ہے) اس کا دایاں سرا کیوں اتنا لمبا ہے۔ (حرف (M) کے دائیں سرے کا پہلا کیک اٹھا کر کھا جاتا ہے) اور بایاں سرا بھی

قدرے بڑھا ہوا ہے۔ (بائیں طرف کا پہلا کیک بھی اُٹھا کر کھا جاتا ہے پھر طشتری کو میز پر رکھ کر پیچھے ہٹ جاتا ہے)

ملکہ:۔ (کھڑکی سے ہٹ کر، واپس میز کے پاس آجاتی ہے) چارلس! لاؤ وہ خرگوش میرے حوالے کر دو۔

(گھنٹی بجاتی ہے اور نوکر اندر داخل ہوتا ہے۔)

خادم:۔ جہاں پناہ! غلام حاضر ہے۔

ملکہ: شہزادے کے پاس ایک خرگوش ہے جسے وہ ۔۔۔۔

شہزادہ:۔ (بات کاٹ کر) نہیں۔ میرے پاس کچھ نہیں۔ (خالی جیب دکھا کر) آپ خود دیکھ سکتی ہیں کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ اور ہاں! اب چونکہ نوکر حاضر ہے اس لئے میں یہ تمام کیک لے سکتا ہوں اور وہ آپ کیلئے آسانی سے اور لا سکتا ہے۔

(طشتری کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔)

ملکہ:۔ چارلس، انہیں رہنے دو۔ (خادم سے مخاطب ہو کر) طشتری کو فوراً اٹھا کر لے جاؤ اور ان کیکوں کی خوب نگہداشت رکھو۔

(خادم طشتری کو ہاتھ میں لئے ہوئے باہر نکل جاتا ہے۔)

شہزادہ:۔ (صوفے پر جا کر بیٹھ جاتا ہے) آپ بہت ہوشیار ہیں۔ کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ یہ کیک کس کے لئے تیار کئے گئے ہیں۔

ملکہ:۔ بس چپ رہو۔ خرگوش کہاں ہے!

شہزادہ:۔ میں نے آپ کی عدم توجہ میں اسے کمرے سے باہر بھگا دیا تھا۔

ملکہ:۔ کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ وہ شاہی کمروں میں گشت لگا رہا ہوگا۔ خدایا پناہ! شاہی محلات میں یہ طوفانِ بدتمیزی!

(گھنٹی بجاتی ہے اور خادم داخل ہوتا ہے۔)

کیا تم نے خرگوش دیکھا ہے۔

خادم:۔ خرگوش! جہاں پناہ!

ملکہ:۔ شہزادہ صاحب کا خرگوش شاہی محل میں کہیں کھو گیا ہے۔ سمجھے۔

شہزادہ:۔ بھورے رنگ کا ایک فربہ اندام خرگوش جو بہت بھوک محسوس کرتا ہے۔ سمجھے!

خادم:۔ ہاں! جہاں پناہ!

ملکہ اور شہزادہ:۔ (یکدم) کیا تم نے اُسے دیکھا ہے!

خادم:۔ نہیں جہاں پناہ! غلام نے ابھی تک کوئی خرگوش نہیں دیکھا۔

شہزادہ:۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اُسے بھگا دیا۔ لیکن اس غریب کے بچاؤ کی اور کیا ترکیبیں ہو سکتی تھیں۔ آپ خادم کو اس کی تلاش میں بھیجدیں اور اس دوران میں مَیں یہیں بیٹھتا ہوں۔

(صوفے پر بیٹھ جاتا ہے)

ملکہ (کھڑکی کے قریب جا کر باہر جھانکتی ہے) چارلس! بہتر یہی ہے کہ اب جتنی جلدی ہو سکے تم یہاں سے چلے جاؤ۔

شہزادہ:۔ جبتک مجھے اپنا خرگوش نہ مل جانے میں یہاں سے نہیں جاؤنگا۔

ملکہ:۔ جاؤ نوکر کو ساتھ لے جاؤ اور خود جاکر خرگوش کی تلاش کرو۔

خادم:۔ اور جہاں پناہ! کیا وہ کیک باہر ہی پڑے رہیں۔

ملکہ (میز کے قریب آکر) خدایا پناہ! کیک! (خادم سے) فوراً جاؤ اور جاکر اُن کی حفاظت کرو۔

(خادم باہر نکل جاتا ہے)

(شاہزادے سے) بیوقوف لڑکے! آج تم نے مجھے حد سے زیادہ پریشان کیا ہے۔ تم خود جاکر اپنے منحوس خرگوش کی تلاش کرو۔ خدا معلوم کہ وہ ابتک کہاں پہونچ گیا ہوگا۔ یاد رکھو! میں اس جگہ کی منتظم ہوں اور اس محل میں ہر ایک چیز میرے تابع فرماں ہے۔

(شاہزادے کو محل کے اندر جانے کے لئے چھوٹے دروازے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔)

شہزادہ:۔ مگر میرا خرگوش تو اس راستے سے باہر نہیں گیا تھا۔

ملکہ:۔ (شہزادے کا کان ۔۔ پکڑ کر دروازے تک لے جاتی ہے۔) بس جاؤ۔ محل کے اندر جاکر اپنے خرگوش کی تلاش کرو۔ اور خدا کرے کہ وہ تمہیں راستے ہی میں مل جائے۔

(ملکہ مہمانوں کے استقبال کے لئے دوسرے دروازے کی طرف مڑتی ہے شہزادہ مجبوراً دروازہ کھولتا ہے پھر

یہ دیکھ کر کہ ان کی ماں کا ادھر دھیان نہیں دروازہ بند کر دیتا ہے۔ اور واپس آ کر جلدی سے میز کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ کیتھرین۔ البرٹ اور کارڈینل کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔)

ملکہ:۔ کارڈینل! شکر ہے کہ تم لوگ آ گئے۔ خوش آمدید عزیزہ کیتھرین اور معزز البرٹ خوش آمدید! آج بہت دنوں بعد تم نے شاہی مہمان خانے کو زینت بخشی ہے۔

البرٹ:۔ حضور کی عزت افزائی ہمارے لئے باعث افتخار ہے۔

ملکہ:۔ آیئے تشریف رکھئے۔

(میز کے ایک طرف خود کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ سامنے دونوں کرسیوں پر کیتھرین اور البرٹ بیٹھ جاتے ہیں کارڈینل صوفے پر جا بیٹھتا ہے۔)

ملکہ:۔ چونکہ آج ہماری طبیعت قدرے اداس تھی۔ اس لئے محترم کارڈینل نے تمہاری صحبت سے لطف اندوز ہونے کی صلاح دی۔

البرٹ:۔ جیسا کہ میں راستے میں محترم کارڈینل سے کہہ رہا تھا کہ خوبصورتی کے لحاظ سے میری لڑکی دنیا کی حسین ترین عورت کو شرماتی ہے مگر عقل کے بارے میں ——

کیتھرین:۔ (بات کاٹتے ہوئے) بس رہنے دیجئے۔ (ملکہ سے مخاطب ہو کر) شاہی محلات کی زندگی بھی کیا خوش نصیب زندگی ہے۔ یہاں کی ہر ایک چیز ایک خاص ترتیب سے رکھی ہوتی ہے۔ چارلس ہمیشہ آپ کے حسن انتظام کی تعریف کرتا ہے۔

ملکہ:۔ بہت خوب! معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں بھی چارلس کا کچھ خیال ہے۔

کیتھرین:۔ خیال! آہا ہا۔ چارلس اور میں تو بہت گہرے دوست ہیں۔ آپکو معلوم ہو گا کہ چارلس سے پہلی دفعہ میری ملاقات شاہی باغ میں ہوئی تھی۔ میں کتوں کی لڑائی دیکھنے میں مشغول تھی۔ اس وقت وہ سادہ لباس میں ملبوس تھا۔ اور آتے ہی اس نے کتوں کو چھڑانے کی بے سود کوشش شروع کر دی۔ مجھے یہ منظر دیکھکر بے حد ہنسی آئی۔ ازاں بعد شہزادے نے دوسرے روز مجھے ملاقات کا پیغام بھیجا اور یہاں سے ہماری دوستی کی ابتدا ہوئی۔

ملکہ:۔ یہ واقعہ کافی دلچسپ ہے۔ چونکہ اب تم تھکاوٹ محسوس کر رہے ہو گے اس لئے میرا خیال ہے کہ ہمیں دعوت شروع کرنی چاہیئے۔ غالباً تم نے شاہی باورچی خانے کے "پنیر کے کیکوں" کی تعریف ضرور سنی ہو گی۔

کیتھرین:۔ کیوں نہیں۔ ان کے نام سے ہمیشہ شہزادے کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔

البرٹ:۔ اور میں نے سنا ہے کہ خوش ذائقہ ہونے کے علاوہ معدہ کی اصلاح کے لئے بھی یہ کیک نہایت مفید ہیں۔

ملکہ:۔ باورچی نے آج بھی انہیں پھر تیار کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ تم بھی ان کی لذت سے لطف اٹھاؤ۔

(گھنٹی بجاتی ہے اور دروازے سے خادم اندر داخل ہوتا ہے)

کیک حاضر کرو۔

(خادم بیلے طشتری میں چنے ہوئے کیک لیکر حاضر ہوتا ہے اور طشتری کو ملکہ کے آگے میز پر رکھ دیتا ہے۔ پھر شراب سے لبریز چار جام لا کر میز پر رکھ دیتا ہے اور باہر نکل جاتا ہے۔)

کارڈینل:۔ (صوفے پر سے اٹھتے ہوئے) کیا حضور دعوت کو شروع نہیں فرمائیں گے۔

ملکہ:۔ نہایت خوشی سے (طشتری کی طرف اشارہ کر کے) کیتھرین! تم نے دیکھا کہ یہ کیک کس خوبصورتی سے ترتیب دئے گئے ہیں

کیتھرین:۔ انگریزی حرف (M) کی شکل۔ خوب! شاہی محل کی ہر ایک چیز اپنی مخصوص ترتیب میں رکھی ہوتی ہے۔

ملکہ:۔ محترم کارڈینل! اٹھو اور اپنے مقدس ہاتھوں سے اس دعوت کی ابتدا کرو۔

کارڈینل:۔ (میز کے قریب آ جاتا ہے) علیا حضرت کا ارشاد بسر و چشم!

(طشتری کو اٹھا کر ملکہ کے سامنے پیش کرتا ہے اور

خود بائیں جانب کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔)

ملکہ:۔ (کھانے کے لئے ایک کیک اُٹھا لیتی ہے اور پھر طشتری کارڈینل کے آگے کر دیتی ہے) کلیسا کی بزرگی کا احترام ہر ایک بادشاہ پر فرض ہو۔

کارڈینل:۔ (طشتری میں سے ایک کیک اُٹھا کر کھانے لگتا ہے۔) حضور کی قدر افزائی کا شکریہ ادا نہیں ہو سکتا۔

ملکہ:۔ (کیکوں کی طشتری کو کیتھرین اور البرٹ کے آگے کر دیتی ہے) لو اب تم بھی شروع کرو۔ اور ان کیکوں کو کھا کر اُن کے ذائقہ سے لطف اندوز ہو۔

(سب کیک کھاتے ہیں اور پھر شراب پیتے ہیں)

وقفہ

ملکہ:۔ (کرسی سے اُٹھ کر کیتھرین اور البرٹ کی طرف غور سے دیکھتی ہے۔) تعجب۔ حیرت! تم ابھی تک زندہ ہو۔ اب تک تو تمہاری رُوحوں کو عالم بالا پر پہونچ جانا چاہیئے تھا

کیتھرین اور البرٹ:۔ (گھبرا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔) عالم بالا پر؟

ملکہ:۔ یقیناً! اور تمہارا ابھی زندہ رہنا قوتِ جسمانی کی ایسی حیرت انگیز مثال ہے جو قبل ازیں میرے مشاہدے میں نہیں آئی۔

کیتھرین:۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) او ہو! دھوکا! فریب! (البرٹ سے) بیوقوف بڈھے! تمہیں اس سازش کا علم کیوں نہ ہوا۔

ملکہ:۔ اتنا متعجب ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیا تمہیں یقین تھا کہ میں چارلس کے ساتھ تمہارے نازیبا تعلقات کو جاری رہنے دوں گی۔ تم نے اُس بیوقوف لڑکے کیلئے دامِ فریب بچھایا تھا مگر میں تم سے بھی زیادہ ہوشیار ہوں اور چند لمحات تک میں اپنے محترم کارڈینل کی مدد سے اپنی سلطنت کو دو خطرناک ہستیوں سے پاک کرنے میں کامیاب ہو جاؤنگی۔

کیتھرین اور البرٹ:۔ نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ہمیں اس بات کا یقین آ سکتا ہے۔

ملکہ:۔ (کارڈینل سے) محترم کارڈینل۔ بہتر ہے کہ اب تمام حالات سے انہیں آگاہ کر دیا جائے۔

کارڈینل:۔ (اُٹھتے ہوئے) یہ تدبیر نہایت ہی آسان اور معمولی تھی۔ ملکہ معظمہ نے اپنی حیرت انگیز قابلیت کے ساتھ حرف (M) کے تمام درمیانی کیکوں کو زہر آلود کر دیا تھا سوائے پہلے اور آخری کیک کے جو۔۔۔۔

شہزادہ:۔ (یکدم میز کے نیچے سے نکل کر درمیان میں آ جاتا ہے۔) جو میں نے کھا لئے تھے جبکہ والدہ صاحبہ کا دھیان نہیں تھا۔

خوفناک وقفہ

ملکہ:۔ (ہوش بجا لاکر) چارلس تم کہاں تھے؟

شہزادہ:۔ میں میز کے نیچے چھپا ہوا تھا اور جو کچھ میں نے کیکوں کی نسبت بیان کیا ہے۔ وہ بالکل دُرست ہے۔

ملکہ:۔ مگر تم نے انہیں کس وقت اُٹھا لیا تھا۔

شہزادہ:۔ جب آپ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

کارڈینل:۔ (گھبراہٹ میں) مگر وہ دونوں تو میرے اور علیا حضرت کے لئے رکھے ہوئے تھے۔

شہزادہ:۔ بہت خوب! تب آپ نے اگلے دو اُٹھا لئے ہوں گے۔ (ملکہ سے) میں نے آپ کو کہا تھا کہ حرف (M) کے دونوں سرے قدرے بڑھے ہوئے ہیں۔

کارڈینل:۔ خدایا پناہ! تب اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم سب کو۔۔۔

تمام:۔ (یکدم) زہر دے دیا گیا۔

کیتھرین:۔ زہر دے دیا گیا۔ کیا میری تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ (دوڑ کر شہزادے کا دامن پکڑ لیتی ہے) کیا میں نے اپنا تمام وقت اسی لئے ضائع کیا تھا۔ کیا میں نے اسی دن کے لئے اپنے حُسن کو برقرار رکھنے میں پانی کی طرح روپیہ بہایا تھا۔ کیا میری تمام تدابیر اسی دن کے لئے تھیں کہ میں ایک دغاباز اور مکار عورت کے ہاتھوں تباہ ہو جاؤں جو پیشتر ازیں اپنے خاوند کے علاوہ قریباً نصف یورپ کو زہر سے ہلاک کر چکی ہے۔

البرٹ:۔ کیتھرین سچ کہتی ہے۔ افسوس! اپنی تمام کوششوں کے باوجود بھی میں اس منحوس لڑکی کو شاہی محل کی زینت نہ بنا سکا۔

کارڈینل:۔ اُف، کیسا جانکاہ صدمہ۔ کم از کم شاہی کلیسا کے محافظ کو

ایسا واقعہ پیش آنا چاہیئے تھا۔

ملکہ:۔ کارڈینل۔ یہ خود ستائی کا وقت نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے کمبخت لڑکے کی بیوقوفی مجھے متعجب کرنے سے باز نہ رہ سکی۔ اسکی حماقت کا خیال مرتے دم تک میرے دل سے نہیں نکل سکے گا۔

شہزادہ:۔ مگر مجھے سخت سست کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں خود اس واقعہ سے سخت متحیر ہوں۔

(سب مبہوت ہوکر ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگتے ہیں۔ سب پر نشے کی سی حالت طاری ہوجاتی ہے۔ ایک دم باہر شور سُنائی دیتا ہے۔ سب چونک پڑتے ہیں)

البرٹ:۔ کیا سچ مچ ہم عالمِ افلاک پر پہونچ گئے ہیں۔

(خادم دوڑتا ہوا اندر داخل ہوتا ہے۔ اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھکر جُھک جاتا ہے۔)

خادم:۔ عالی جاہ! شاہزادہ بلند اقبال کا خرگوش ــــــ

ملکہ:۔ (عالمِ بیخودی میں دونوں بازو پھیلاتے ہوئے) بیوقوف! ہم اب دوسری دُنیا میں پہونچ چکے ہیں۔

کارڈینل، کیھترین، البرٹ:۔ (ایکدم، اپنے اپنے بازو پھیلاتے ہوئے) بیشک دوسری دُنیا میں پہونچ چکے ہیں۔

خادم:۔ مگر سرکار ــــــ ایک بہت بڑی تباہی عرصہ وجود میں آئی ہے ــــــ!

ملکہ:۔ (اسی حالت میں) تباہی اب ہمارے لئے کوئی ہستی نہیں رکھتی ــــــ!

کارڈینل، کیھترین، البرٹ:۔ (اسی حالت میں) کوئی ہستی نہیں رکھتی۔

خادم:۔ مگر حضور شہزادے صاحب بہت خفا ہونگے۔

ملکہ:۔ شہزادے کا غصہ ہمارے لئے ہیچ ہے۔

کارڈینل، کیھترین، البرٹ:۔ بالکل ہیچ۔

شہزادہ:۔ (نوکر کو جھنجھوڑتا ہی) بیوقوف! کیا ہوا!۔

خادم:۔ سرکار! آپ کا خرگوش جاں بحق ہوگیا ہے۔ اُس نے تمام پنیر کے کیک چٹ کر دئے ہیں۔

سب (ہوش بجا لاکر) پنیر کے کیک۔

خادم:۔ سرکار، غلام کی خطا معاف فرمائی جائے۔ حضور کے بُلانے کے بعد جب میں دوبارہ باورچی خانے میں گیا تو اس خرگوش کو میں نے آخری کیک کھاتے ہوئے دیکھا جسکو ختم کرتے ہی اس نے لڑکر جان دیدی (باورچی نے شاہی) توہین خیال کرتا تھا۔

ملکہ (آگے بڑھکر) مگر تم نے تو کیک واپس یہاں لا رکھے تھے۔

خادم:۔ حضور، میں نے باورچی خانے سے اور کیک حاصل کرلئے اور باورچی کی مدد سے اُنہیں حسب سابقہ ترتیب دینے میں کامیاب ہوگیا ہم دونوں کا خیال تھا کہ سب کام ٹھیک ہوجائے گا۔

ملکہ:۔ (دوسروں کی طرف دیکھتے ہوئے) سب کام ٹھیک ہوجائیگا!۔

شہزادہ:۔ میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ میرا خرگوش ضرور مُفید ثابت ہوگا۔

(پردہ)

(ترجمہ) ــــــــــــ ساغر جعفری۔ بی۔ اے، ایل ایل بی

شام

سوئے مغرب گامزن خورشید ہو آتی ہے شام
مضطرب دنیا میں پیغامِ سکوں لاتی ہے شام

آگئی لو مایۂ تسکین و آرام آگئی
اک جہاں کو انتظارِ شام تھا شام آگئی

یہ غلط، بالائے گردوں ہے شفق پھولی ہوئی
ہے نظر کے سامنے جنت کوئی بھولی ہوئی

یہ نظارہ چشمِ شاعر کے لئے ہے دیدنی
پردۂ عالم پہ ہے کچھ تیرگی کچھ روشنی

اس دھندلکے سے مگر ظاہر ہوا ایمائے شب
دے رہی ہے اپنے آنے کی خبر لیلائے شب

وقتِ راحت آگیا دنیائے کلفت کے لئے
فرصتِ آرام ہے اربابِ محنت کے لئے

جس طرف اب دیکھئے، ہے خامشی چھائی ہوئی
کارگاہِ دہر کو ہے نیند سی — آئی ہوئی

وادیاں ساکت ہیں، بے آواز ہر اک جادہ ہے
یعنی اس عالم کی ہر شے ہے سکوں آمادہ ہے

دم بخود ہے ہر کلی، برگ و شجر خاموش سا
گلشنِ ایجاد آتا ہے نظر خاموش سا

شورِ پیہم کی وہ پہلی گرم بازاری نہیں
اور کیا ہے گر جہاں پر بیہشی طاری نہیں

ہے حکومت شام کی، دن کا علم ہے سرنگوں
آبِ دریا کی روانی کو بھی ہے حاصل سکوں

دیکھتا ہوں طائروں کو صف بہ صف اڑتے ہوئے
اپنے اپنے آشیانوں کی طرف مڑتے ہوئے

ختم ہو منزل کہیں، یہ ہر زباں پر ذکر ہے
ہوں وہ چوپائے کہ انساں، سب کو گھر کی فکر ہے

روح کو عرفاں کی لہروں میں ڈبوتی ہے اذاں
کتنی وجد آگیں وقتِ شام ہوتی ہے اذاں

صرفِ جنبش ہیں زبانیں حمدِ باری کے لئے
سرخمیدہ ہو گئے طاعت گذاری کے لئے

شام کیا آئی چمک اٹھا جہانِ بتکدہ
دیدہ و دل میں کھبی جاتی ہے شانِ بتکدہ

سر جھکائے آرہے ہیں نازکیشانِ جمال
دل میں پوجا کی لگن ہے ہاتھ میں پھولوں کا تھال

دہر میں حاصل کسی کو فارغ البالی نہیں
حسن بھی ذوقِ پرستش سے یہاں خالی نہیں

دلستاں ہرچند ہے نظارۂ حسنِ دیر کا
تم نہ کیوں کیجے ارادہ میکدے کی سیر کا

میکدے کی شام پر کیونکر نہ ہو ایقانِ صبح
ہے فروغِ بادۂ رنگیں سے پیدا شانِ صبح

کامرانی چپے چپے پر تبسم ریز ہے
میکدہ ہے یہ یہاں بزمِ نشاط انگیز ہے

وشتر بوئے ام کی تفسیر مے خواروں میں ہے
ولولہ سا ولولہ پیمانہ برداروں میں ہے

کیف ساماں نیز ہیں صدائیں نغمۂ رندانہ کی
ہے کھنک لحظہ بہ لحظہ ساغر و پیمانہ کی

شام آخر ہے سواری آرہی ہے رات کی
دیکھیے دیکھی آنکھوں فضا دیہات کی

آرہا ہے کھیت سے دہقاں تھکا ہارا ہوا
زندگی سے سرگراں افلاس کا مارا ہوا

دوش پر "ہل" کا ہے اک بارِ گراں رکھے ہوئے
ہے صعوبت گاہِ ہستی کا مزہ چکھے ہوئے

صبح سے تا شام وقفِ محنتِ پیہم ہے یہ
فکرِ اک عالم کی ہے وہ محسنِ عالم ہے یہ

چارہ فرمائے جہاں ہو کر بھی لاچاروں میں ہے
حلقۂ سرمایہ داری کے گرفتاروں میں ہے

ہر نفس ہے تلخ تر دورِ زماں اس کے لئے
کم جہنم سے نہیں ہے یہ جہاں اس کے لئے

شکل پژمردہ سی دل میں ایک دنیا یاس کی
چلنے پھرنے والی یہ تصویر ہے افلاس کی

قول ہے اُس کا عذابِ جانستاں ہے زندگی
اُس کے حق میں واقعی ننگِ گراں ہے زندگی

اک یہی ہے جو خصوصاً مرجعِ آلام ہے
ورنہ سب پر شام کا فیضانِ راحت عام ہے

نہال سیوہاروی

زندگی کے دو رُخ

"اب تو دلّی میں اچھی خاصی گرمی پڑنے لگی ہوگی!"

"ہاں، آتا سکھیا کی بہو کہا سنے آئی تھی تو کہہ رہی تھی دو چار روز میں لاٹ صاحب کے دفتر کے لوگ آجائیں گے ——— پھر تو شملہ میں بڑی چہل پہل ہو جائے گی ——— دیکھو تم اپنی رکشا کو ٹھیک کر لو، اب دن ہی کے رہ گئے ہیں . . . . . رات میں سوچ رہی تھی کہ خدا کے کام بھی کیسے ہیں، قربان جاؤں اس کی قدرت کے، بچہ بھی ہو رہا ہے تو اس وقت جبکہ تم اس قابل ہو جاؤ گے کہ کما سکو ——— دیکھو ایک دفعہ جی توڑ کر مزدوری کرنا، میں نے تو یہ سوچ لیا ہے کہ اپنے بچے کی پیدائش پر اپنے سب رشتے داروں کی دعوت کرونگی، میں تو اس کے لئے ابھی سے تیاری کر رہی ہوں۔ کل داروغہ جی کے ہاں گئی تھی وہاں سے بچوں کے کرتے بخیہ کرنے کو لے آئی کہ اسی طرح کچھ مل جائے گا ——— ابھی پچھلے دنوں لکھنؤ والی بیگم کے لڑکا پیدا ہوا تھا تو انہوں نے کیسی اچھی دعوت کی تھی۔ ایسے ایسے کھانے تھے کہ میں نے تو اپنی عمر میں کبھی دیکھے نہیں تھے، ہم اس قابل کہاں کہ ان جیسی دعوت کر سکیں، پر میں اپنے خاص خاص عزیزوں کو تو ضرور بلاؤں گی۔ سمجھے!"

"ہاں، سمجھ گیا"

"سمجھے خاک میرا سر، تمہارا تو اب مزدوری میں بھی دل نہیں لگتا، ہر وقت امیروں کی برائیاں کرتے رہتے ہو، فلاں امیر کے پاس کتنی اچھی کوٹھی ہے، ہمارے پاس اپنا ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا بھی نہیں، لاٹ صاحب کے دفتر کے اس آدمی کو تین سو روپیہ مہینہ ملتا ہے، ہمیں دس روپے مہینہ بھی نہیں پڑتا، تمہیں تو امیروں سے بیر سا ہو گیا ہے، اور سچی بات تو یہ ہے کہ اگر انہیں اتنی اتنی تنخواہیں نہ ملیں تو رات دن تمہاری رکشا یونہی کھڑی رہے ——— اب میں کہتی ہوں کہ تم یونہی گال پر ہاتھ رکھے سوچتے رہو گے یا پھر رکشا کو ٹھیک کرو گے۔ مزدوری ہو بھی تو کیسے! کوئی گندی رکشا میں کیوں بیٹھنے لگا، اول تو بیکاری سے چھٹکارا نہیں ملتا، اس پر نہ معلوم کس جھاڑو پھرے نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے جو اس طرح کی باتیں کہنے لگے ہو"

"اچھا، بس کرو، بس کرو، میرا سر نہ کھاؤ"

"سچی بات کہو تو کہتے ہیں سر نہ کھاؤ ——— اچھا تو پھر اٹھو، دو چار روز میں سب آدمی آجائیں گے، اس سے پہلے پہلے تم سب ٹھیک ٹھاک کر لو"

"اچھی بات ہے"

وائسرائے صاحب کا دفتر دہلی سے منتقل ہو کر شملہ آگیا ہے، بڑے لوگ دہلی کی چلچلاتی ہوئی دھوپ اور بے پناہ گرمی برداشت نہیں کر سکتے، پانچ ساڑھے پانچ بجے کا وقت ہے، شملہ کی ہر سڑک پر چہل پہل ہے، زرق برق پوشاکیں، صاف ستھرے لباس، مرد اور حسین عورتیں، مغرور سر اور چمکتے ہوئے جوتے، سنیما اور رقص گاہیں، شراب اور عورتیں، ہنسی، خوشی اور قہقہے، کچھ لوگ مال روڈ پر رکشاؤں میں اڑے چلے جاتے ہیں، کچھ دور، ہری بھری پہاڑیوں کا عزم کئے ہوئے ہیں، دوکانوں پر خرید و فروخت ہو رہی ہے۔

"آج تو آپ نے کمال ہی کر دیا، تقریر میں وہ جوش تھا کہ کیا کہوں، سارے ہاؤس پر سناٹا چھایا ہوا تھا، سوائے اس کے کہ کبھی کبھی لوگوں کی زبان سے بے ساختہ تعریفی کلمات نکل جاتے تھے، آج تو کانگریسی جماعت بھی خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی۔ ورنہ ان لوگوں نے تو اپنا شعار بنا لیا ہے کہ ہم لوگوں کا مذاق اڑائیں"

"ہاں صاحب، مجھے بھی حیرت تو اسی بات پر ہو رہی تھی کہ

یہ لوگ خاموش کیوں ہیں، واقعہ تو یہ ہے کہ میں نے اس تقریر کے تیار کرنے میں محنت بھی بہت کی تھی؟"

"وہ تو آپ کی تقریر ہی سے ظاہر ہے ـــ کاش اسی طرح ہماری پارٹی کے لوگ تیار ہو کر آیا کریں"

"اگر آپ خدا لگتی پوچھیں تو میں عرض کردوں ـــ اگر سب لوگ اسی طرح تیار ہو کر آئیں تو ہمیں اس طرح شکست کا مُنہ نہ دیکھنا پڑے، صاحب بڑی خفت تو اس وقت ہوتی ہے جب اخباروں کے پہلے ہی صفحوں پر اپنی شکست کا اعلان پڑھتے ہیں اور یہ کمبخت اخباروں کے اڈیٹر سرخیاں بھی ایسی ایسی تلاش کرتے ہیں کہ خواہ مخواہ ہر شخص کی نظر اُن پر جم کر رہ جاتی ہے"

"اخبار کے اڈیٹروں کا نہ پوچھئے، اگر وہ ایسا نہ کریں تو اُن کا اخبار کیسے چلے"

اسمبلی ہاؤس سے دو ممبر آپس میں باتیں کرتے چلے آرہے تھے ـــ

"دیکھئے، آپ کبھی اُس پہاڑی پر گئے ہیں ـــ سنا ہے بڑا حسین نظارہ ہے، شملہ آئے ہوئے اتنے دن ہوگئے لیکن یقین کیجئے، اس تقریر کی وجہ سے مجھے دم لینے کی فرصت نہ تھی، اگر آپ کی رائے ہو تو اسوقت چلا جائے"

"ہاں، ہاں، چلئے کیا مضائقہ ہے"

"ارے او، رکشا والے"

"جی حضور!"

"دیکھو اُس پہاڑی پر چلو"

"بہت اچھا حضور ـــ ایک رکشا کو اور آواز دے لوں، آپ تو دو صاحب ہیں"

"ایک ہی میں چلیں گے، کچھ ایسی زیادہ چڑھائی بھی ہو"

"چڑھائی تو صاحب بہت ہے، اور میں ذرا بیمار بھی ہوں ـــ"

"کمبختوں کے مزاج ہوگئے ہیں، چلئے صاحب، سامنے دو کئی رکشائیں کھڑی ہیں، وہاں سے کسی کو پکڑ لیں گے"

"نہیں، نہیں صاحب، چلتا ہوں، بیٹھئے"

"دیکھا آپنے جب تک ان سے سیدھے مُنہ بات کرو، یہ لوگ مزاج دکھاتے ہیں، اب آگئے اپنی راہ پر"

اسمبلی کے دونوں ممبر رکشا میں بیٹھ گئے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں۔

"ہاں صاحب، تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اُن لوگوں کو شکست دینے کے لئے ہمیں کافی تیار ہو کر آنا چاہئے۔ آئے دن کے "واک آؤٹ" سے تو اور بھی ناک میں دم ہے، یہیں پر یہ بات ختم نہیں ہوجاتی بلکہ پبلک علیحدہ فقرے چُست کرتی ہے"

"جی ہاں، ان حالات کو دیکھ دیکھکر تو اور بھی ہمتیں پست ہوتی جارہی ہیں"

"ارے بھئی خوب یاد آیا ـــ میرا لڑکا امسال بی۔ اے کرلے گا، کیا کراؤں اب اُس سے، آپکی کیا رائے ہے، ایم۔ اے۔ کرانا تو میرے خیال میں بیکار ہے"

"اور کیا، ایم۔ اے کرا کے کیا کیجئے گا، بی۔ اے کے بعد ہی اُسے کسی طرف لگا دیجئے۔ ہمارے لڑکوں کے لئے بھلا ملازمتوں کی کوئی کمی ہے"

اس پر دونوں حضرات نے اپنے پھیپھڑوں کی اندرونی گہرائیوں سے قہقہہ بلند کیا۔

"میں سوچتا ہوں کہ ایک مرتبہ زمینداروں کے لگان میں کمی کرانے کی تجویز پیش کی جائے ـــ آپ کی کیا رائے ہے؟"

"خیال تو اچھا ہے، غریب زمینداروں کی حالت تو بہت خراب ہو چلی ہے، بس اشان ہی شان ہے، غضب خدا کا اس دن میرا کارندہ لگان وصول کرنے کے لئے گاؤں گیا تو گاؤں والوں نے

لگان دینے سے صاف انکار کر دیا کہہ دیا کہ زمیندار صاحب سے کہہ دینا کہ بارش کی زیادتی کی وجہ سے سب فصل خراب ہوگئی ہم ایک پائی بھی نہیں دے سکتے، یقین کیجئے کہ یہ سنکر خون کھولنے لگا۔ اگر اسوقت میں پولس کی مدد نہ لیتا تو ایک پیسہ بھی وصول نہ ہوتا۔ اب تو دیہاتی لوگ بھی بہت سرکش ہوتے جا رہے ہیں، ان ذلیل بھک منگوں کے بھی دماغ نہیں ملتے، خدا معلوم اپنے آپ کو اب یہ کیا سمجھنے لگے ہیں۔"

"ارے او رکشا والے، کیا جسم میں جان نہیں ہے، تیز نہیں چلاتا۔"

"ہاں صاحب، بیمار ہوں۔"

"بیمار ویمار ہم کچھ نہیں جانتے، بیکار ہی جھوٹ بولتے ہو۔ جیسے خاصے موٹے تازے تو ہو ــــ دوڑو، دوڑو، ذرا تیز دوڑو، دیر ہو کر ہمیں "پرنس آف ویلز" سینما بھی تو جانا ہے۔"

"بہت اچھا حضور۔"

یہ کہکر رکشا والا پوری طاقت سے دوڑنے لگا۔ پسینے کے قطرے اس کے ماتھے اور گالوں پر سے ٹپک ٹپک کر اس کے متعفن ملبوس میں جذب ہو رہے تھے۔

"اب ٹھیک ہے، اسی رفتار سے چلو"

"بہت اچھا حضور۔"

"آدمی شریف معلوم ہوتا ہے، تفریق مدارج کو ملحوظ رکھکر باتیں تہذیب سے کر رہا ہے ــــ بھئی رکشا میں تو موٹر سے بھی زیادہ لطف آتا ہے، دیکھئے کتنے مزے میں کھینچتا چلا جا رہا ہے۔"

"تم شملہ ہی کے رہنے والے ہو؟"

"نہیں صاحب، رہنے والا تو شملہ کا نہیں ہوں، لیکن اب تو بہت دنوں سے یہیں ہوں۔"

"بیوی بچے والے معلوم ہوتے ہو۔"

"جی حضور، ایک بیوی اور چار بچے ہیں۔"

"ابھی تو تم جوان ہی ہو اور بچے بھی ہوگئے۔"

"ہاں صاحب، ایک دو دن میں ایک اور بھی ہونے والا ہے۔"

یہ سنکر دونوں نے طویل قہقہہ بلند کیا۔

"لیجئے صاحب، بس یہیں تک رکشا آتی ہے۔ اسکے آگے رکشا کا راستہ نہیں ہے، پگڈنڈی پگڈنڈی چلے جایئے گا۔"

"ارے نہیں نہیں، چلے چلو، ہم یہاں نہیں اتریں گے، ابھی تو کافی فاصلہ ہے اور چڑھائی بھی ایسی کونسی ہے۔"

"اس سے آگے تو صاحب بہت چڑھائی ہے اور راستہ بھی ٹھیک نہیں، میں آپ لوگوں کو اتنی چڑھائی پر نہیں کھینچ سکتا۔"

"اس نے پھر نخرے شروع کر دئے ــــ دیکھو تم ہمیں واپس بھی لے چلنا، ہم وہاں تھوڑی ہی دیر ٹھہریں گے، اسکے بعد ہمیں "پرنس آف ویلز" پہونچا دینا، چلو، چلو، اب دیکھ کیا رہے ہو۔ ہم تمہیں پانچ روپے انعام دینگے۔"

پانچ روپے کا نام سنکر رکشا والے کا بیمار چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ اسکی نظروں میں گھر کا نقشہ پھر گیا، اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اسکی بیوی کے پہلو میں ایک چھوٹا سا بچہ لیٹا ہوا ہے اور اس کا انتظار کر رہی ہے، اس نے جلدی سے یہ خیال کر کے رکشا کا جوا اٹھایا کہ جب وہ اپنی بیوی کو پانچ روپے دیگا تو وہ کس قدر خوش ہوگی۔ اور پہاڑ کی بلندیوں پر پہاڑی بھیسوں کی طرح دو موٹی لاشوں کو کھینچنے لگا۔

وہ پسینہ میں تربتر تھا، کتے کی طرح ہانپ رہا تھا، اور بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر اپنی خشک زبان پھیرتا جاتا تھا۔ آنکھوں میں پہاڑ کی بلندیوں کی ٹھنڈی ہوا گھس رہی تھی، جس کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے، اور ہر چیز دھندلی نظر آ رہی تھی، لیکن وہ برابر بلندی پر چڑھتا چلا جا رہا تھا، یکایک اس کے پاؤں کو زمین میں ابھرے ہوئے ایک پتھر سے ٹھوکر لگی، رکشا کا

دہ اُس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا، اور پتھریلی زمین پہ منہ کے بل آ رہا۔ خون کی ایک تیز اور موٹی دھار اُس کے منہ سے نکلکر قریب کے سبزے پر پھیل گئی۔ قریب ہی ایک چھوٹی سی کھائی میں جا کر رکشا گری، لیکن لمبے لمبے گھاس کے پودوں کی وجہ سے اُن لوگوں کے زیادہ چوٹ نہ آئی۔

شام کے وقت شملہ کے سول اسپتال کی طرف بہت سی رکشائیں بڑی تیزی سے چلی جا رہی تھیں، اسپتال کے خوبصورت ترین وارڈ میں دو پلنگوں پر دو مریض قریب قریب پڑے تھے، رکشا کے اچانک ٹوٹ جانے کی وجہ سے ان لوگوں کے سر اور ٹانگوں میں چوٹ آئی تھی، دس بارہ نرسیں اور چار پانچ ڈاکٹر دونوں پلنگوں کو گھیرے ہوئے تھے، قریب ہی ان مریضوں کے دوست اور ملنے والے آپس میں اس اچانک حادثہ پر اظہارِ افسوس کر رہے تھے۔

اسپتال میں دوسری طرف خیراتی وارڈ میں ایک کتنا والا کچھ گنوار دن اور غریب لوگوں کے درمیان ایک ٹوٹی ہوئی ڈولی میں پڑا تھا، اُس کے تمام کپڑے خون میں لتھڑے ہوئے تھے اور سانس رُک رُک کر آ رہا تھا۔

یک بوڑھے نے ایک ڈاکٹر کو آتے دیکھکر بڑی ہمت کر کے کہا "حضور، میرا بیٹا دم توڑ رہا ہے، ذرا اُسے دیکھ لیجئے، اُس کی تلی پھٹ گئی ہے، اگر ذرا بھی دیر ہوئی تو وہ مر جائیگا۔"

ڈاکٹر کی پیشانی پر بل پڑ گئے، اُس نے اپنی خونخوار آنکھوں سے بوڑھے کی طرف دیکھا اور بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

"اندھے ہو گئے ہیں کمبخت ——— سوجھتا نہیں ——— ابھی تیرے بیٹے کی جان سے زیادہ قیمتی جانیں بچانا ہیں۔"

بوڑھے کی آنکھوں سے آنسو باہر نکلنے کے لئے مچلنے لگے، وہ اپنے بیٹے کے نیم مردہ جسم کو جھک کر دیکھنے لگا، آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے اُس کی آنکھوں سے نکل کر نوجوان کے چہرے پر گر پڑے، اور شبنم کے اُن قطروں کی طرح چمک رہے تھے جو مرجھائے ہوئے پھول پر مسکرا رہے ہوں۔

شاہد لطیف

* * *

رُباعیات

صہبا فصلِ شباب میں دے ساقی!
لا ساغرِ آفتاب میں دے ساقی!
پیمانہ ہے مہتاب مے ہے خورشید
خورشید کو مہتاب میں دے ساقی!

وا ہے مری آغوشِ تمنا ساقی
لیکر قدح و جام اِدھر آ ساقی
اک ساعتِ عیش آ گزاریں باہم
بیگانہ تر از خیالِ عقبیٰ ساقی

اِک موجِ صبا ہے عمرِ فانی ساقی
از بس ہے گریزپا جوانی ساقی
لا بادۂ گلرنگ صراحی سے انڈیل
ہے وہمِ حیاتِ جاودانی ساقی

گلزار کو میخانہ بنا دے ساقی!
ہر پھول کو پیمانہ بنا دے ساقی
قُربان ترے لا جلد گلابی لا جلد
اعجاز کو مستانہ بنا دے ساقی

لا آج مری پیاس بجھا دے ساقی!
ساغر نہیں خُم پہ خُم پلا دے ساقی!
یہ کیف ہو جھومنے لگیں کون و مکاں
اِک بار تو اِس قدر اُٹھا دے ساقی!

تا منزلِ راہِ عشق ہو طے ساقی،
لا جامِ طربناک پیاپے ساقی!
میخانہ کا در ہے ترے رندوں کیلئے
تختِ زرِ جم مملکتِ کَے ساقی

لا رُوحِ نشاطِ جاوداں مے ساقی
یعنی کہ شرابِ ارغواں دے ساقی!
اُٹھتی نہیں مجھ سے یہ گرانیِ خمار
لا، رطلِ گراں زماں زماں دے ساقی

پھر حد سے ہوا دردِ نہاں ہے ساقی!
لا دے بھی مئے ناب کہاں ہے ساقی!
بخش اپنے گدائے در کو للہ اک جام
بے کیف حیات گزراں ہے ساقی!

میگھ

چپکے چپکے آہستہ کون نزدیک آرہا ہے؟

گرج اور دل کو دہلا دینے والی آوازیں اسکی آمد کا پتہ

دے رہی ہیں، اس کا سُرخ برقی پرچم تاریک فضا میں لہرا رہا ہے۔

ہیبت ناک گرج اس کا طبلِ جنگ ہے۔

وہ شاہانہ وقار اور تمکنت کے ساتھ آرہا ہے۔

دیکھو! ——— وہ ہجوم کے درمیان بادلوں کے

ہاتھی پر سوار ہے۔

اپنی شاہانہ سواری کس شان سے بڑھاتے ہوئے

آرہا ہے۔

کیا یہ باراں ہے ——— باراں!

کنول کے ہرے پتوں جیسے کالے کالے بادلوں نے

آسمان کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا ہے،

وہ فضائی راستوں پر بہتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔

اور بسا اوقات اپنے "آبی بار" کے ساتھ غرق بھی

ہو جاتے ہیں،

جب اُن کے آنسوؤں کا دھارا زمین پر گرنے لگتا ہے۔

تو ہمارے کانوں میں ایک سامعہ نواز اور ترنم انگیں نغمہ

بجنے لگتا ہے۔

اے محبت کے پرستارو! اب مغموم و حزیں رہنے کا وقت

نہیں ہے۔

اُٹھو! اور اپنی روحوں کو مسرت و نشاط کی پوشاک

زیبِ تن کر دو۔

حیف ہے اُس پر جو ہجرِ محبوب میں زندگی کے دن تیر کر رہا ہے!

ایسے میں جبکہ ہر فرد و بشر مسرور اور آلام و کلفت سے دور ہے۔

اُس کا دل غموں سے چُور اور نالہ و فغاں کرنے کے لئے

مجبور ہے۔

بارش کا ہر قطرہ زمین بوس ہو کر اُسکے سیلابِ آلام کو اور

موجزن کر دیتا ہے۔

جب وہ اپنی نگاہیں آسمان کی جانب اُٹھاتا ہے تو اُسے

قوسِ قزح مختلف رنگوں کے لباس میں ملبوس آسمان کے گلے میں

باہیں ڈالے نظر آتی ہے۔

اور اس کا برقی کمر بند چمک چمک کر نگاہوں کو خیرہ کر رہا ہے

یہ منظر دیکھکر اُس کے مغموم دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے۔

اور وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

اُس وقت اُسے اپنی محبوبہ کا دھیان آتا ہے اور وہ تصور

کی آنکھ سے دیکھتا ہے، کہ:

وہ جواہرات جنہیں وہ استعمال کرتی تھی، اُن کا رنگ

قوسِ قزح کے رنگوں کو دعوتِ مقابلہ دے رہا ہے!

اور اُس کا کمر بند ——— بادل کی برقی کوند کی چمک

دمک کو مات کر رہا ہے،

سطحِ ارض پر ہر طرف گھاس رنگا رنگ کھلے ہوئے ہیں،

ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ گویا مادرِ گیتی کے سینے پر چمکدار

اور رنگین — تتلیاں پر جوڑے بیٹھی ہیں،

اے دخترِ ارض! کیا کسی نازنین کے پاس ایسے بیش بہا

جواہرات ہیں —

جن کی تُو مالک ہے۔

ایسے خوبصورت ہار کسی راجہ رانی کے گلے میں بھی نہیں دیکھے
گئے۔
جیسے تیرے سینے پر آویزاں ہیں۔

کیا کوئی ایسا متنفس بھی اس دُنیا میں سانس لے رہا ہے،
جس کے دھڑکتے ہوئے دل کو یہ دلفریب منظر بیتاب نہ کر دے
اور نہ
از دیادِ نشاط و فرطِ مسرت سے بیخود ہو کر جھومنے لگے۔
ذرا ادھر کی جانب نظر کرو اور دیکھو کہ
ہر درخت میں نئی زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اور وہ
کروٹیں لے لے کر اپنی حیاتِ نو کا ثبوت دے رہا ہے۔
ذرا دریا کے ساحل پر بھی ایک نگاہ ڈالو، جہاں،
نرگسی آنکھوں والیاں درختوں کی آڑ میں چھپنے کی کوشش
کر رہی ہیں،
ان کے نازک نازک لب گلاب کی پتیوں کو شرما رہے
ہیں ـــ
اور ان کی نگاہیں دلوں پر ہزاروں بجلیاں گرا رہی ہیں۔

مور اپنے جواہرات سے بھرے ہوئے پروں کو فضا میں پھیلا کر
اِدھر اُدھر رقص کرتے پھر رہے ہیں۔
آج وہ جذبۂ مسرت سے مجبور ہو کر اپنا جنگلی رقص کرتے
رہیں گے۔
یہاں تک کہ اُن کے پاؤں تھک جائیں، اور اُن کی ناتوانی
اُنہیں مزید ـــ
رقص سے روک دے،

یہ وقت وصلِ محبوب سے حظ اندوز ہونے کا ہے۔

کوئی پروا نہیں۔ اگر آسمان پر بادل گرج رہے ہیں
کوئی پروا نہیں، اگر کائنات سیاہ ردا میں لپٹی ہوئی ہو
اور راستہ دکھائی نہیں دیتا۔
بیا، محبت حسینوں کو انتظار کی مزید تاب نہیں۔
برق کی چمک اِن کی رہنمائی کرے گی۔
اور وہ اپنے دلنواز عشاق کے مکان کا راستہ بہر نوع
ڈھونڈھ لیں گی۔

اس وقت کہ لیلیٔ شب کی زلف کمر تک آ چکی ہے۔ اور بادل
کی خوفناک گرج دلوں کو دہلائے دے رہی ہے۔ شوہر پرست بیوی
اپنے بیوفا خاوند کے تصور میں محو ہے۔ اس کی بیوفائیاں یاد آ کر
اس کا کلیجہ چھلنی کئے دے رہی ہیں۔ مگر اب اُس کے کھنچے ہوئے ابرو
رفتہ رفتہ پُرسکون ہوتے جاتے ہیں۔ اور وہ اس عالمِ بیم و رجا میں بھی
اپنے شوہر سے لپٹ جانے کیلئے تیار ہے۔

لیکن وہ نوجوان اور مخمورِ شباب لڑکیاں جو محبت کے
ہاتھوں ستائی ہوئی ہیں۔
اُنکے درد و غم کو کون سمجھ سکتا ہے؟
اُنکے خوبصورت ہونٹ سوکھ گئے ہیں۔
اُن کی آنکھوں کے کنول میں آنسوؤں کے جو قطرے نظر
آ رہے ہیں وہ اُنکے دلی رنج و غم کے آئینہ دار ہیں۔
اُنکی اُمیدیں یاس سے بدل چکی ہیں۔
کیا امشب نااُمیدی کی تلخیوں کے ہجوم میں وہ زرق برق
لباسوں سے تسکین حاصل کر سکتی ہیں؟۔

جب ہم پہاڑی کی طرف نگاہ اُٹھاتے ہیں۔ تو
مسرت اور شادمانی سے ہمارا سینہ معمور ہو جاتا ہے۔

دیکھو، چشمے کا پانی چاندی کی طرح چمک رہا ہے۔
اور طاؤس وفورِ مسرت سے بیخود ہو کر رقص کناں ہیں۔
ہر خوبصورت پودا اپنے تمام گنجینۂ خوشبویات کو کائنات
پر نچھاور کر رہا ہے۔
اور بادل جو اُن سے انتہائی محبت رکھتا ہے انکی نرم و
نازک پتیوں پر موتی برسا رہا ہے۔

یاسمن اور گلاب کے خوشبودار پھول نازنین کے گیسوؤں میں
گندھے ہوئے ہیں۔
اس کا لباس بے ترتیب اور آنچل شانوں سے ڈھلکا ہوا ہے۔
گلے میں خوبصورت پھولوں کا ہار پڑا ہوا ہے
اُسے تمام شگفتہ کلیوں سے زیادہ وہ پھول محبوب ہیں جو اُس
کے گلے میں حائل اور سینے پر آویزاں ہیں۔
ضرورت ہے، ہاں، اس موقع پر ضرورت ہے۔
کہ کوئی عاشق اس کے پیارے لبوں پر بوسوں کی مہرِ ثبت
کر کے کارِ عشق تمام کر دے۔

فطرت کے بیش بہا عطیات خاکدانِ ارض پر بکھرے پڑے
ہیں ــــ
جن کا نہ کوئی شمار ہے اور نہ حساب۔
مسرت کے احساس سے ہر نخل و ثمر کا چہرہ تمتا رہا ہے۔
پہاڑ کی چوٹیاں جب بادل کے سینے پر بوسہ دیتی ہیں، تو وہ
ٹھہر ٹھہر کر کچھ دیر کے لئے توقف کر جاتے ہیں۔
گویا پانی کا بوجھ اُٹھائے پھرنے سے تھک کر آرام کرنے
لگتے ہیں۔
اور پہاڑیاں موسم گرما کے آتشدان کے نیچے زور زور سے

سانس لینا شروع کر دیتی ہیں۔

پھر جب بادل کے فوارے انہیں تر و تازہ کر دیتے ہیں تو
وہ اپنے جنگلی سروں کو نمایاں کرتی ہیں۔
شہد کی مکھیاں یاسمن کے گرد ہجوم کر کے آتی ہیں اور
اپنی نغمہ زا بھنبھناہٹ سے کانوں کو خوش آیند راگ سناتی ہیں،
پھر وہ کنول کے پھولوں کی طرف رخ کرتی ہیں۔
مگر طاؤس جو قریب ہی رقص کر رہا ہے،
اپنے خوشنما پروں کو پھیلا کر اُن کا راستہ بند کر دیتا ہے اور وہ
گھبرا کر ٹھہر جاتی ہیں اور نہیں جانتی ہیں،
کہ نکاس کا راستہ کدھر ہے

صبا کے تند جھونکے چل رہے ہیں۔
اوہ! ان کا سانس کس قدر سرد ہے!
چشمے کی روانی میں سرعت آگئی ہے۔
وہ پھولوں کے ساتھ ساتھ رقص میں مصروف ہیں اور بار
بار پھولوں کے نازک عارض کو،
بوسے پر بوسہ دے رہے ہیں۔
زمین پر ہر طرف سیاہی کا دور دورہ ہے۔

بادل اپنے ہاتھی پر سوار ہو کر،
ہجوم کے درمیان شاہانہ متانت اور قہاری کے ساتھ بڑھا
چلا آرہا ہے۔
لو، یہ آہی گیا۔
باراں! باراں!

⁂

(کالیداس) ـــــــ مترجمہ محمد ابراہیم ہوش

"مسز کرڈھلے"

یعنی

اعلیٰ حضرت ہز رائیل ہائنس دی ڈیوک آف ونڈسر کے نام کھلا مکتوب!

از

مرزا عظیم بیگ چغتائی بی۔اے۔ایل ایل۔بی (علیگ) چیف جج عدالت العالیہ دربار جاورہ

ایک انتہا سے زیادہ سنجیدہ اور باوقار مگر طول وطویل مکتوب جو کہ ہز رائیل ہائنس کی رفیع والی پوزیشن اور جملہ آداب شاہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک ذمہ دار مصنف لکھ سکتا ہے۔ اور وہ بھی انتہائی ادب اور لطافت کے ساتھ!

افسانہ نگاری اور ناول نویسی کا نرالا انداز اس عجیب غریب مکتوب نما ناول میں دیکھئے۔ نفس مضمون کی نزاکت اور مصنف کی سنجیدہ ظرافت اور عشق و محبت کی ایک دلربا اور چکتی دمکتی ہوئی کہانی! دیکھئے کہ مصنف کا یہ عجیب و غریب ناول کس احترام اور لطافت کیساتھ حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے وہ بھی ایسے کہ واقعہ حابلہ کا ذکر کیا اشارہ تک نہیں ہے۔ کتاب پریس میں دیدی گئی اور تیاری کے بعد مع انگریزی ترجمہ کے حضرت ڈیوک موصوف کے پاس بھیجدی جائیگی۔ اس عجیب و غریب ناول کو دیکھنا ہو تو آج ہی آرڈر رجسٹر کرا دیجئے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک۔ محدود ایڈیشن۔

ملنے کا پتہ: ساقی بکڈپو۔ دہلی؛

سالانہ چندہ ... محصولڈاک
ششماہی تین روپے ... ر

جرعات

قیمت فی پرچہ چھ آنے (۶ر)
نمونے کا پرچہ مفت

جلد ۱۵ | ساقی دہلی۔ بابت ماہِ مئی ۱۹۳۷ سنہ عیسوی | نمبر ۵

قیمت چھ آنے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

پنجاب کے مشہور ادیب حضرت ایم۔ اسلم اپنے ایک گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"جہانتک اُردو کا تعلق ہے ساقی ایک بلند معیار کا پرچہ ہے۔ اور اُردو سے ذوق رکھنے والوں کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اس قومی کام میں آپ کا ہاتھ بٹائیں"

ناظرین ساقی جانتے ہیں کہ اسلم صاحب ساقی کے ایک نہایت سرگرم قلمی معاون ہیں۔ پھر انکی اعانت صرف قلمی ہی نہیں ہے بلکہ ساقی کی توسیع اشاعت کا بھی بطورِ خاص خیال رکھتے ہیں۔ چنانچہ گزشتہ مہینے میں آپنے پانچ حضرات کو ساقی کی خریداری پر مائل فرمایا اور آئندہ بھی آپ کا کرم جاری رہیگا۔ اُردو کے پرچوں کو پہلی شکایت یہی ہے کہ ان کی مالی حالت اچھی نہیں ہے۔ ساقی بھی اس ساڑھے سات سال کے عرصے میں مالی زیرباریوں سے بے نیاز نہ ہوسکا یہ شکایت تواب ایک بے مزہ حکایت بنکر رہ گئی ہے۔ اسلم صاحب کی طرح چند ہمدردانِ ساقی کی مہربانی سے نقصان کی کچھ تلافی ہوجاتی ہے اور اس خلوص وہمدردی سے ڈھارس بندھ جاتی ہے کہ اُردو رسائل کے اچھے دن بھی کبھی نہ کبھی آئیں گے۔

اُردو ہندی کی کشمکش کا جو اثر اُردو رسائل پر پڑا اسکے لئے گاندھی جی کی جان کو دعا دینے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ پھر مصائب جب آتی ہیں تو اکٹھی آتی ہیں۔ یکم اپریل سے برہما کے علیحدہ ہوجانے کا نتیجہ ہمارے لئے یہ نکلا کہ فی پرچہ دو پیسے محصولڈاک دینے کے بجائے اب برہما کے ہر پرچہ کیلئے پونے گنے سے بھی زیادہ یعنی نو پیسے فی پرچہ محصولڈاک ادا کرنا پڑتا ہے۔ اسکے یہ معنی ہیں کہ اُردو رسائل اب برہما جاچکے۔ جنگ چھڑنے یا نہ چھڑنے مگر اس کی برکات کا نزول تو شروع ہوگیا کہ کاغذ کی قیمتیں سوائی اور ڈیوڑھی ہوگئیں۔ اور کاغذی دُگنی اور تگنی کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ اللہ رحم کرے ہماری حالت پر۔

افسانہ نمبر ساقی کا افسانہ نمبر ہر سال کی طرح اس سال بھی جولائی میں شائع ہوگا۔ اس کے لئے چند نہایت پاکیزہ افسانے موصول ہوچکے ہیں۔ پروفیسر اسلم جیراجپوری مدظلہٗ نے قدیم عرب کی ایک دلکش کہانی عنایت کی ہے۔ محترمہ مسز برلاس نے جاپان سے ایک لطیف داستان بھیجی ہے۔ محترمہ حجاب امتیاز علی صاحبہ نے اپنے مخصوص اسلوب کا دلکش نمونہ "اندھی محبت" کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ جب محبت کے دیوتا کیوپڈ کی آنکھیں پیدا ہوتی ہیں تو کیا ہوتا ہے؟۔ ان افسانوں کے علاوہ مولانا عنایت اللہ دہلوی۔ حضرت ایم۔ اسلم، چغتائی صاحب، جناب قیسی رامپوری۔ پریم پجاری۔ اختر رائے پوری۔ مسٹر صادق الخیری، قریشی صاحب، انصار ناصری صاحب، علامہ مضحک، ڈاکٹر اعظم کریوی، پروفیسر احمد علی، مسٹر سجاد ظہیر، مسٹر ظفر قریشی۔ محترمہ فرخندہ اختر بیگم، محترمہ طاہرہ دیوی شیرازی اور دیگر مشہور افسانہ نگار حضرات نے افسانہ نمبر کے لئے افسانے بھیجنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ آئندہ اشاعت میں مفصل اعلان کیا جائے گا۔

شاہد

راسیلاس

اٹھائیسواں باب

راسیلاس اور اسکی بہن نیکایہ گفتگو جاری رکھتے ہیں

راسیلاس کہنے لگا: "پیاری بہن۔ تم مبالغہ آمیز گفتگو کی عام غلطیوں میں پڑ کر ایک معمولی بحث میں قومی آفات کی مثالیں اور وسیع پیمانے پر ایسی مصیبتوں کے نقشے کھینچنے لگیں جس کا تذکرہ کتابوں میں بہ نسبت دنیا میں وقوع میں آنے کے زیادہ ملتا ہے۔ چونکہ یہ مصائب اور آفات ہولناک ہوتے ہیں اس لئے نادر الوقوع ہیں۔ ایسی برائیاں اور خرابیاں جن کا ادراک ہمیں نہیں ہوتا ان سے ہمیں غرض نہیں اور نہ ہمارا مقصد انسان کی زندگی کو نقصان پہونچانا ہے۔ میں اس مخاصم و منازع فصاحت و بلاغت کو برداشت نہیں کر سکتا جو ہر شہر کو ایسے محاصرے کا جیسا کہ یروشلم کا محاصرہ تھا خوف دلاتی یا جو ہر پروازِ طمع کو ایک عالمگیر قحط کا پیش خیمہ اور بادِ جنوب کے ہر جھونکے میں بیماری اور وبا کو معلق بتاتی ہیں۔

ایسی لازمی اور ناگزیر بلاؤں کی نسبت جو سلطنتوں کو چشم زدن میں غارت کر دیں بحث کرنا بیکار ہوگا۔ جس وقت ایسی بلائیں نازل ہوں تو سوائے ان کو برداشت کرنے کے کوئی چارہ نہیں۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ جب یہ عالمگیر آفات ٹوٹ پڑتی ہیں تو انسان فی الواقع انکو اتنا محسوس نہیں کرتا جتنا کہ ان سے ڈرتا ہے۔ اسی پرآشوب زمانے میں ہزارہا بلکہ لاکھوں جوان پھولتے پھلتے ہیں اور اتنے ہی بڈھے اور ضعیف مرجھا کر مر بھی جاتے ہیں۔ ان کو سوائے روزمرہ گھر کی مصیبتوں اور جھگڑوں کے کسی بات کا علم تک نہیں ہوتا۔ بادشاہِ وقت خواہ رحمدل ہو خواہ ظالم۔ خواہ ملک کے لشکر اور جیوش دشمن کا تعاقب کرتے ہوں، خواہ دشمن کے سامنے سے پسپا ہوتے ہوں ملکی مسرتیں اور تکلیفیں ایک ہی سی رہتی ہیں۔ شاہی درباروں کے امرا اور اعیان میں خواہ ان کی اہلیت و صلاحیت پر بحث و مباحث کا بازار کیسا ہی گرم ہو اور سفیرانِ دولت دُولِ غیر سے خط و کتابت میں کتنے ہی مصروف ہوں مگر لوہار اپنے سندان پر ہتھوڑا اور کسان اپنے کھیت میں بدستور لیے چلاتا ہے ضروریاتِ زندگی ہمیشہ میسر ہوتی رہتی ہیں اور ہر موسم کے کاروبار اپنے اپنے دور میں انجام پاتے رہتے ہیں۔

ہمیں ایسی باتوں پر غور نہ کرنا چاہیئے جو کبھی پیش نہ آئیں گی، یا اگر پیش بھی آئیں تو وہ انسان کے تخمین و تامل پر حقارت کی ہنسی ہنسیں گی۔ عناصرِ عالم کی گردش و حرکت کو بدلنے کی کوشش ہمیں کرنی زیبا نہیں۔ اور نہ سلطنتوں کے مقدر کو لکھنا ہمارا کام ہے۔ ہمارا کام تو صرف اس بات پر غور کرنا ہے کہ ہماری مثل مخلوق خود اپنی مسرت کو حاصل کرنے یا اپنے ہی حلقے میں خواہ وہ کیسا ہی تنگ و محدود ہو دوسروں کی مسرت کیلئے کیا کرتا ہے۔

شادی فی الحقیقت فطرت کا ایک حکم ہے۔ مرد اور عورت پیدا ہی اسلئے ہوئے ہیں کہ ایک دوسرے کے ساتھی اور غمخوار بنیں۔ بس میں کوئی فیصلہ بجز اسکے نہیں کر سکتا کہ شادی ایک ذریعہ حصولِ مسرت کا ہے۔"

اس پر شہزادی بولی: "تاہل کی بدمزگیاں اور کدورتیں، آئے دن کے ٹنٹے اور جھگڑے جو خلافِ توقع اسباب سے یکلخت پیدا ہو جاتے ہیں، مزاجوں اور خیالات کا اختلاف، متغائر و معاکس خواہش جو شدید وجوہ کی بنا پر دلوں میں تحریک کرتی ہے، متباین نیکیاں

جن میں فریقین میں ہر ایک کی نیت اچھی ہوتی ہے۔ غرض جب میں ان سب باتوں کو دیکھتی اور ان پر غور کرتی ہوں تو میں بھی اکثر اقوام کے ماہرین اسباب علل کی ہمخیال ہو کر کہنے لگتی ہوں کہ شادی گو ضروری رکھی گئی مگر وہ پسندیدہ نہیں سمجھی گئی۔ اور تاوقتیکہ وہ اشتہا جسکے سیر کرنے میں زیادتی کی جاتی ہے مجبور نہ کرے تو کبھی انسان ایسے معاہدوں کے جال میں نہ پھنسے جو کسی کے توڑے نہ ٹوٹ سکیں۔"

راسیلا اس نے جواب دیا "بہن شاید تم اپنا یہ قول بھول گئیں کہ تجرد بمقابلہ تاہل کے کم مسرت آفریں ہے۔ ممکن ہے کہ یہ دونوں حالتیں بُری ہوں مگر اُن کو بدترین حالت نہیں کہا جاسکتا۔ بات یہ ہے کہ جب دو غلط رائیں دل میں رکھی جاتی ہیں تو وہ ایک دوسرے کو خود ہی مٹا کر قلب کو صاف کر دیتی ہیں اور پھر طبیعت حق بات کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔"

شہزادی نے جواب دیا "میں اس بات کی متوقع نہ تھی کہ اُس چیز کو غلط یا دروغ سمجھا جائے گا جو فی الحقیقت نتیجہ انسان کے ضعف و عاجزی کا ہے۔ طبیعت کے لئے بھی جیسا کہ بینائی کا حال ہے کہ نہایت وسیع و ممتد چیزوں اور ان کے اجزا کی وسعت کا اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے، جہاں ہم کسی کل کو ایک نظر میں دیکھ لیتے ہیں تو اس کے اجزا کا اندازہ بھی آسانی سے دریافت ہو جاتا ہے اور ہم اسکے ایک جزو کو دوسرے جزو پر مُرجح سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن جب دو ایسے بڑے نظام پیش نظر ہوں جن میں سے ایک نظام کی بھی وسعت اور اس کی پیچیدگیوں کا انسان کی نظر احاطہ نہ کر سکے تو پھر کیا عجب ہے کہ کل کا اندازہ اُس کے اجزا کرنے میں کبھی ایک جزو سے اور کبھی دوسرے جزو سے جیسا کہ وہ میرے تصور و تخیل پر اثر کرے گا میں متاثر ہونگی۔ جب ہم کسی مسئلہ کے ایک جزو کو دیکھتے ہیں تو اس میں ہمارا اختلاف ایسا ہی ہوتا ہے جیسے دو انسانوں میں فرق ہوتا ہے۔ یہی حال سیاسیات اور اخلاقیات کے مختلف تعلقات میں نظر آتا ہے۔ لیکن جب ہم کل کو ایک ہی نظر میں دیکھ سکتے ہیں جیسے کہ علم الاعداد کی مثالوں میں ہوتا ہے تو ہم سب ایک ہی فیصلہ اور نتیجے پر متفق الرائے ہوتے ہیں۔ اس وقت ہم میں سے کسی کی رائے میں اختلاف نہیں ہوتا۔"

شہزادے نے کہا "دُنیا میں اتنی خرابیاں اور بُرائیاں موجود ہیں کہ بحث و مباحثے کی تلخی و تُرشی کو اُس پر اضافہ کرنا ہرگز مناسب نہیں اور نہ یہ مُناسب ہے کہ ہم استدلال کی موشگافیوں میں ایک دوسرے پر فائق ہونے کی کوشش کریں۔ ہم ایک مسئلہ کو اس وقت تحقیق کرتے ہیں کامیابی کی صورت میں ہم دونوں اس سے فائدہ اٹھائیں گے اور ناکامی کی شکل میں نُقصان۔ اس لئے مُناسب یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کی مدد کریں۔ شادی کی بے لُطفیاں اور بد مزگیاں دیکھکر تم نے اس نتیجے پر پہونچنے میں جلدی کی ہے کہ سرے سے شادی کا دستور یا قاعدہ ہی غلط ہے۔ تو کیا اس نتیجے سے انسان جب شادی کے بعد اس کے رنج و آلام پیدا ہوتے دیکھیگا تو وہ یہ نہ سمجھنے لگیگا کہ خدا نے یہ جان ہمیں بطور انعام کے نہیں دی ہے بلکہ بطور عذاب اور سزا کے دی ہے۔ دُنیا کو آباد کرنا ضروری تھا، خواہ شادی کا قانون نافذ کر کے ایسا کیا جاتا خواہ اُسے بغیر نافذ کئے۔ ہر حال میں دُنیا کو مخلوق سے آباد کرنا لازمی تھا۔"

اس پر شہزادی کہنے لگی "دُنیا کو آباد کرنا نہ میرا کام تھا اور نہ تمہارا۔ میں تو اس میں کوئی خطرہ نہیں سمجھتی کہ موجودہ نسل اپنے بعد اپنا کوئی وارث نہ چھوڑے۔ ہم اسوقت دُنیا کے متعلق کوئی تحقیقات نہیں کرتے۔ جو کچھ دریافت کرتے ہیں صرف اپنے لئے کرتے ہیں۔"

اُنیتسواں باب

شادی کے متعلق بحث جاری رہتی ہے

راسیلاس کہنے لگا: کُل کی خیر اور اُس کے تمام اجزا کی خیر ایک ہی بات ہے۔ اور افراد کے لئے بھی وہی چیز بہترین ہے جو کُل کے لئے بہترین ہے۔ بنی نوعِ انسان کے لئے شادی بہترین چیز ہے۔ ورنہ ایک مُستقل اور ضروری فرض موجبِ شر و خرابی قرار پاتا ہے۔ اور اِس حالت میں بعض لوگوں کو دوسروں کی راحت و آسائش کے لئے قُربانی بننا پڑتا ہے۔ جو اندازہ تم نے خود اِن دونوں حالتوں کا کیا ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تجرّد کی تکلیفیں اور اذیتیں ایک بڑی حد تک ضروری اور یقینی ہیں۔ لیکن تاہل کی تکلیفیں اور آزار اتفاقی ہیں اور دور رکھے جا سکتے ہیں۔

میں اپنی اِس خوشی کو ظاہر کرنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ اگر احتیاط اور طبیعت کی نیاضی سے کام لیا جائے تو تاہل کی حالت کو خوش اور مسرت انگیز بنایا جا سکتا ہے۔ اس کے خلاف عام شکایت کا سبب بنی نوعِ انسان کی حماقت اور بیوقوفی ہے جو عالمگیر ہے۔ جوانی میں جبکہ عقل پختہ نہیں ہوتی ہوا و ہوس کے جوش میں بغیر دور اندیشی یا بُرے بھلے کی تمیز اور بلاتحقیق اِس امر کے کہ دونوں کے خیالات میں مطابقت، دونوں کے اطوار اور چلن میں تشابہ اور یکسانی اور مزاجوں میں راستبازی اور صفائی ہے یا نہیں انتخاب کیا جاتا ہے تو پھر بجز مایوسی و پشیمانی کے اور کس بات کی توقع کی جا سکتی ہے۔

شادی کرنے کا بالعموم یہی طریقہ ہے کہ جوان لڑکا اور جوان لڑکی کہیں اتفاق سے ملاقات کرتے ہیں یا اُن میں کسی تدبیر سے ملاقات کرائی جاتی ہے۔ اِس کی نظر اُس پر پڑتی ہے اور اُس کی اِس پر۔ اخلاق سے ایک دوسرے سے پیش آتا ہے اور پھر اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ یہاں ایک دوسرے کا تصوّر باندھتا ہے۔ چونکہ خیال کو کسی دوسری طرف متوجہ کرنے کے لئے کوئی چیز نہیں ہوتی اِس لئے حالتِ جُدائی میں دونوں بیقرار رہنے لگتے ہیں اور دونوں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اگر وہ ساتھ رہینگے تو دونوں خوش رہیں گے۔ پس وہ شادی کر لیتے ہیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ چیز نظر آتی ہے جسے دیکھنے ہی کہتے ہیں کہ ایسے ہی دیدے پھوٹے ہونگے جو یہ چیز ہم سے اُسوقت چھپی رہی! اب اُنکی زندگی رات دن جھگڑوں میں کٹنے لگتی ہے اور وہ فطرت پر ظلم و جفا کا الزام دھرتے ہیں۔

عنفوانِ شباب میں جو شادیاں کی جاتی ہیں اُن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ والدین اور اولاد میں برابری اور ہمسری کا دعویٰ ہونے لگتا ہے۔ بیٹا جوان ہو کر اُنہیں لذتوں سے متمتع ہونا چاہتا ہے جن سے باپ نے اب تک شغل رکھا ہے۔ غرض دو پشتوں کے ساتھ رہنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ بیٹی کا گُلِ جوانی اُس وقت شگفتہ ہوتا ہے کہ ماں ابھی تک اپنی جوانی کا پژمُردہ ہونا نہیں مانتی۔ اور دونوں ایک ہی جگہ رہنے سے خوش نہیں ہوتے۔

لیکن اگر تامّل اور تاخیر سے کام لیا جاتا تو یقیناً یہ خرابیاں دُور رکھی جا سکتی تھیں۔ احتیاط بتاتی ہے کہ اس معاملے میں اگر دیر اور تامّل کو کام میں لایا جاتا تو پھر ایسا محکم اور اُستوار ہوتا کہ کبھی نہ ٹوٹتا۔ لذتہائے جوانی کی گوناگوں مسرتوں اور خوشیوں میں بغیر بیوی کی مدد کے زندگی گُزر سکتی تھی۔ اگر تاخیر کی جاتی تو زیادہ زمانہ گزرنے سے تجربہ بڑھتا اور خیال میں وسعت پیدا ہونے سے تحقیق اور انتخاب کے بہتر موقعے ملتے۔ اور ایک نفع یہ بھی ہوتا کہ والدین اپنے بچوں کے مقابلے میں زیادہ سن رسیدہ نظر آتے۔"

نیکایہ کہنے لگی: مجربات عقل اور تجربے نے نہیں سکھائی انسان اُسے دوسروں سے سُنکر حاصل کر سکتا ہے۔ مجھ سے کسی نے کہا تھا کہ زیادہ عمر میں جنہوں نے شادیاں کی تھیں وہ بھی کچھ زیادہ خوش اور مسرور نہیں رہے۔ یہ سوال ایسا ہے جس کی طرف سے غفلت ہرگز نہ ہونی چاہیئے۔ اور یہی سوال میں نے ایسے لوگوں سے کیا جو سلامتیِ رائے اور وسعتِ علم رکھتے تھے اور اِسی بنا پر اُن کی رائے کو دوسروں

میں بڑی وقعت حاصل تھی۔ انہوں نے یہی رائے ظاہر کی کہ مرد اور عورت کے خیالات جب اپنے اپنے طریقے پر قائم اور عادات پختہ ہو چکی ہوں تو پھر انہیں اپنی اپنی تقدیر کو وابستہ کرنا خطرناک ہے یعنی اس وقت جبکہ مرد اور عورت کا حلقۂ احباب اور دائرۂ انس ومحبت جدا جدا قائم ہو چکا ہو اور اپنی زندگیوں کیلئے انہوں نے ایک خاص روش اختیار کر لی ہو اور ایک عرصے تک سمجھ بوجھکر اس کا اندازہ بھی کر لیا ہو کہ انکی زندگی کس حال میں گزریگی تو ایسی حالت میں یہ زیادہ عمر کی شادیاں بھی تکلیف دہ ثابت ہوتی ہیں۔

یہ امر حیطۂ امکان میں آنا مشکل ہے کہ جب شوہر اور بیوی بخت واتفاق کی رہبری میں دنیا میں ہمسفر ہوں اور انہیں ایک ہی راستہ چلنے کا بتا دیا گیا ہو تو اس حالت میں اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ دونوں میں سے کوئی نہ کوئی اس راستے سے ہٹ گیا ہے جسے دستور اور رواج نے خوشگوار اور سہل گزار بنایا تھا۔ جب جوانی کی تلون مزاجیاں اور بے ربط حرکتیں درست ہو کر ایک قاعدہ اور ضبط کے تحت آجاتی ہیں تو پھر مزاج میں تبختر پیدا ہو جاتا ہے جو دوسرے سے مغلوب ہونے میں دل کو شرمندہ اور خجل کرتا ہے یا طبیعت میں اصرار اور ضد پیدا ہو جاتی ہے اور بات بات میں نزاع پیدا کرنے میں ایک لطف آنے لگتا ہے اگرچہ آپس کی قدر دانی اس بات کی خواہش پیدا کرتی ہے کہ ایک دوسرے کو خوش بھی کرتا رہے۔ لیکن زمانہ جو بلا محسوس ہوئے ظاہری صورتوں میں تغیر وتبدل پیدا کرتا رہتا ہے وہ خود اس بات کا اندازہ کرتا ہے کہ خواہشیں کونسی راہ اختیار کرینگی۔ اس سے زن وشو دونوں کے مزاج میں ایک قسم کی ایسی سختی پیدا ہو جاتی ہے جس میں نرمی نہیں پیدا ہوتی پرانے دستور و رواج آسانی سے نہیں توڑے جا سکتے۔ اور جو شخص اپنی زندگی کی راہ یا طریقے کو بدلنا چاہے اس بارے میں اسکی کوشش اکثر رائیگاں جاتی ہے۔ جب ہم اپنے ہی لئے ایک بات بہت کم پیدا کر سکتے ہیں تو دوسرے کیلئے اس کا پیدا کرنا کیونکر آسان ہو سکتا ہے"

شہزادے نے قطع کلام کر کے کہا: "اس تقریر میں تم نے انتخاب کی اصلی وحقیقی وجہ کو فراموش کر دیا۔ یا اسکی طرف توجہ نہیں کی۔ مجھے تو جب کبھی بیوی کی تلاش ہوگی تو پہلا سوال یہ ہوگا کہ آیا بیوی عقل کے مطابق زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہے یا نہیں"

اس پر نیکایہ بولی "بس یہی چیز تو ہے جو حکیموں اور فلسفیوں کو دھوکے میں ڈالتی ہے۔ روزمرہ کے ہزاروں جھگڑے ٹنٹے ایسے اٹھتے ہیں کہ عقل ہرگز ان کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ یہ جھگڑے اور نزاع ایسے ہوتے ہیں کہ کسی قسم کا تفحص وتجسس وہاں کارگر نہیں ہوتا۔ اور آپ کا منطق ایک قابل مضحکہ چیز ٹھیرتا ہے۔ یہ جھگڑے اس قسم کے ہوتے ہیں کہ انسان ان میں کچھ کر بیٹھے تو کر بیٹھے مگر بات کرنیکی مجال کم ہوتی ہے۔ بنی نوع انسان کی حالت پر غور کروگے تو معلوم ہوگا کہ ایسے لوگ دنیا میں بہت کم نکلیں گے جو کسی موقع پر چاہے وہ موقع بڑا ہو یا چھوٹا اس عقل کے مطابق جو اس وقت گرہ میں رکھتے ہونگے کچھ کر سکیں گے۔ وہ میاں بیوی حد درجہ مصیبت وبے بسی کے حال میں رہیں گے جو صبح اٹھتے ہی تہیہ کریں کہ آج خانہ داری کے کاموں کو عقل کے مطابق انجام دینگے۔

جو لوگ بڑی عمر میں شادی کرتے ہیں وہ اولاد کی دست درازیوں اور بیجا اخلتوں سے بچتے رہتے ہیں۔ لیکن اس نفع کے بدلے میں یہ ہوگا کہ خود مر کر اپنی اولاد کو جاہل اور بے کس کسی محافظ یا ولی کے رحم وکرم پر چھوڑ جائیں گے۔ اگر ایسا پیش نہ آیا تب بھی احتمال ہے کہ اپنے بچوں کو جن سے الفت ومحبت تھی سمجھدار اور بڑا آدمی بننے سے پہلے خود دنیا سے چل بسیں۔

اگر اولاد کے بارے میں انہیں کوئی خوف نہ رہا تو بھی وہ کوئی خوش امید اپنے ساتھ نہ لے گئے اور شباب کے عشق والفت کی لذتوں سے محروم رہے جس کا کوئی بدل ان کو نہ مل سکا اور نہ انکو یہ موقع نصیب ہوا کہ جوانی میں شادی کر کے زن وشو کی حیثیت سے مدت تک

ساتھ رہتے اور اس ساتھ میں اپنے طور طریقوں میں یکسانی پیدا کرتے۔ جوانی کا زمانہ ایسا ہوتا ہے کہ طبیعتیں نئے نئے نقش جلد قبول کرتی ہیں۔ غرض اس عرصۂ دراز کی معیت میں انکے مزاجوں کا فرق اس طرح مٹ جاتا ہے جیسے دو نرم مادے مدت تک آپس میں رگڑیں کھاتے کھاتے اپنی اپنی سطح کو ایک دوسرے کے مطابق کر لیتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ جو لوگ زیادہ عمر میں شادی کرتے ہیں ان کو اپنے بچوں سے بہت محبت ہوتی ہے۔ اور انہیں دیکھکر وہ باغ باغ ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ کم عمری میں شادی کرتے ہیں وہاں میاں بیوی میں بہت اُنس اور محبت ہوتی ہے۔

ان دونوں قسموں کی محبت کا جمع ہو جانا وہ چیز ہے جس کی سب کو خواہش رہتی ہے۔ ممکن ہے کہ شادی کرنے کا کوئی وقت ایسا بھی ہو کہ زن و شو میں اتحاد اور یگانگی رہے اور یہ وقت ایسا ہو کہ جو نہ باپ کے لئے قبل از وقت ہو اور نہ شوہر بننے کے لئے زیادہ دیر کا۔"

شہزادی نے جواب دیا " مجھے تو ہر گھڑی املاک نے اس بحث میں جو پہلو اختیار کر کے اپنی زبان سے کہا تھا اس کی صحت کا یقین ہوتا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ فطرت نے انسان کے دائیں بائیں نعمتوں کے انبار لگا دئے ہیں۔ اُمید کو خوشی اور خواہش کو اپنی طرف کھینچنے کی جو ضروری شرطیں بتائی گئی ہیں اُن کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ جب ہم ایک کے نزدیک آتے ہیں تو دوسری سے دُور ہوتے جاتے ہیں۔ یہ مال ایک دوسرے کے سامنے مگر بیچ میں اتنے فصل سے رکھے ہیں کہ ہم ہاتھ بڑھا کر دونوں سے اتنی دُور رہ کر گزرتے ہیں کہ کسی کو بھی چھو نہیں سکتے۔ غرض زیادہ غور و فکر کرنے کے یہی نتیجے ہیں۔ جو شخص اس فکر میں ہوتا ہے کہ انسان کو جس قدر کوشش کرنے کی اجازت ملی ہوئی ہے اُس سے زیادہ کوشش کرے، وہ کچھ نہیں کرتا۔ متضاد لذتوں سے اپنا دل خوش نہ کرو۔ جو نعمتیں اپنے سامنے ہیں انہی میں سے اپنے لئے کوئی نعمت منتخب کر لو۔ اور قانع رہو۔ موسم بہار کے پھولوں کی خوشبو سے جو شخص اپنا دماغ معطر کرتا ہے وہ خریف کے شیریں میوے ساتھ ساتھ نہیں چکھ سکتا۔ وہ اپنا ظرف سرچشمۂ نیل اور دہانۂ نیل کے پانی سے ایک ہی وقت میں پر نہیں کر سکتا۔"

تیسواں باب

املاک کمرے میں آتا ہے اور گفتگو کا مضمون بدل دیتا ہے

باتیں ہو رہی تھیں کہ املاک کمرے میں آیا اور گفتگو میں مخل ہوا۔ راسیلاس نے کہا " املاک میں اس وقت شہزادی کی زبان سے انسان کی رنج کی زندگی کے دردناک حالات سننے میں مصروف تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان حالات کو سُنکر مزید تحقیقات کے لئے میری ہمت پست ہو چلی ہے۔"

املاک بولا " مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طرز زندگی کے انتخاب میں آپ اتنے مصروف رہتے ہیں کہ جینے کا لطف بھی کھو دیا۔ صرف ایک ہی شہر میں آپ پڑے پھرتے ہیں، گویہ سچ ہے کہ شہر بہت بڑا اور طرح طرح کی چیزوں سے بھرا پڑا ہے مگر آپ نے اتنی مدت تک اس کی سیر کی ہے کہ اب اس میں کوئی نئی چیز دیکھنے کو باقی نہیں رہی۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس وقت آپ ایسے ملک میں ہیں جہاں نہایت قدیم زمانے میں بڑی بڑی مطلق العنان بادشاہیاں تھیں، جو صولت و سطوت میں یگانہ اور جن کے باشندے عقل و فراست میں شہرۂ آفاق تھے۔ یہ وہ ملک ہے جہاں علوم و فنون کا آفتاب سب سے پہلے طلوع ہوا۔ اور اس نے دنیا کو اپنے نور سے منور کر دیا۔ جسکے باہر نہ خانہ داری کی زندگی کا پتہ تھا اور نہ معاشرت کا۔

مصرِ قدیم کے باشندے اپنی محنت و مشقت اور قوت کی بہت سی یادگاریں اپنے بعد چھوڑ گئے۔ یہ یادگاریں ایسی رفیع الشان اور عظیم العمارۃ تھیں کہ یورپ کی تمام شان و شوکت انکے سامنے گرد تھی۔ انکی عمارات کے کھنڈر آج ماہرینِ فنِ تعمیر کیلئے درسگاہوں کا کام دے رہی ہیں۔ اِن عجیب و غریب آثار میں جو سلامت بچے ہیں وہی بتاتے ہیں کہ زمانے نے ان میں کیا کچھ غارتگری کی ہے۔"

راسیلاس بولا "مجھے اس طرف رغبت نہیں ہے کہ میں پتھروں کے انبار اور مٹی کے ٹیلوں کا معائنہ و مطالعہ کرنے میں اپنا وقت صرف کروں۔ مجھے جو کچھ مطلب ہے وہ انسان سے ہے۔ میں یہاں اِس غرض سے نہیں آیا ہوں کہ عبادت گاہوں اور بُت خانوں کے آثارِ شکستہ کی پیمائش کروں یا ان سنگین پانی کے خزانوں کا پتہ چلاؤں جو اب مٹی سے اَٹے پڑے ہیں۔ میرا کام تو موجودہ دُنیا کے مناظر کو دیکھنا ہے۔"

شہزادی نے کہا "جو چیزیں اس وقت ہمارے سامنے ہیں وہ ہماری توجہ کی محتاج اور اُسکے لائق ہیں۔ مجھکو زمانۂ سلف کی یادگاروں یا اُس وقت کے سورماؤں سے کچھ مطلب غرض نہیں کیونکہ زمانۂ سلف پھر واپس نہ آئیگا۔ اور پُرانے سورما اُس زمانے میں گزرے تھے جبکہ اُن کا طرزِ زندگی اُن اُصولوں سے مختلف تھا جنکی پابندی کی ضرورت یا اجازت آج کل کے بنی نوعِ انسان کو ہے۔"

امن پیرامالاک بولا "کسی شے کے علم کے لئے اس بات کا جاننا بھی ضروری ہے کہ اُس شے نے کیا نتائج پیدا کئے۔ آدمیوں کے دیکھنے اور جانچنے کیلئے اُن کے کاموں کا دیکھنا اور پرکھنا بھی ضروری ہوتا ہے تاکہ ہم معلوم کریں کہ ان کے کاموں میں کونسے کام ایسے تھے جو مقتضائے عقل تھے اور کونسے ایسے تھے جو جذبات سے مشتعل ہو کر عمل میں آئے تھے۔ اور یہ بھی دریافت کریں کہ وہ کیا چیز تھی جس نے ایسے کاموں کی تحریک ان میں پیدا کی۔ حال کا فیصلہ کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ ماضی کو مقابلے میں لایا جائے، کیونکہ محاکمے کا دارومدار تقابل پر ہے۔ مستقبل کے متعلق ہم کوئی علم نہیں رکھتے۔ واقعہ یہ ہے کہ کوئی طبیعت حال پر غور کرنے میں زیادہ مصروف نہیں ہوتی۔ زیادہ تر مصروفیت گزشتہ کی یاد و مستقبل کے خیال کرنے میں رہتی ہے اور اسی میں ہمارا کُل وقت گزرتا ہے۔ ہمارے جذبات یا تو خوشی اور غم کے ہوتے ہیں یا محبت و عداوت کے یا وہ خوف اور اُمید کے ہوا کرتے ہیں۔ خوشی اور رنج میں مدنظر زمانۂ ماضی اور اُمید و خوف میں زمانۂ مستقبل ہوتا ہے۔ بلکہ محبت اور نفرت میں بھی زمانۂ گزشتہ کا قیاس کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ سبب مسبب سے مقدم ہوتا ہے۔

حالتِ حاضرہ نتیجہ ہے کسی حالتِ گزشتہ کا اور یہ امر دریافت کرنا انسان کے لئے قدرتی بات ہے کہ جس بھلائی یا خیر سے ہم اِسوقت خوش ہیں یا جس خرابی اور درد سے ہم اسوقت رنجیدہ اور مغموم ہیں اسکا مبدا کیا ہے۔ اگر ہمیں اپنے لئے کچھ کرنا ہے تو پھر تاریخ کے مطالعے سے غفلت یا پرہیز کرنا ہرگز درست نہیں۔ اور اگر دوسروں کے لئے کچھ کرنا ہے تو پھر یہ غفلت اور پرہیز ہرگز قرینِ انصاف نہیں۔ جاہل یا لاعلم رہنا اگر وہ قصداً ہے تو وہ ایک جرم ہے۔ جو شخص بُرائی یا خرابی کو دور کرنے سے انکار کرتا ہے وہ خود بُرا اور خراب آدمی ہے۔

تاریخِ عالم کے وہ حصے سب سے زیادہ مفید ہیں جن میں انسان کی عقل و ادراک کا فروغ پانا، علوم و فنون کا رفتہ رفتہ ترقی کرنا، علم و جہل کے ایسے بڑے بڑے انقلاب اور آشوب جو صاحبِ ادراک مخلوق کے حق میں نور اور ظلمت کا حکم رکھتے ہیں بیان کئے گئے ہیں، نیز وہ حصے بھی مفید ہیں جن میں فنون کی موت اور دوبارہ زیست اور عالمِ عقلی و ذہنی کے تغیرات مذکور ہوں۔ اگر جنگ و جدل، مشکل کشی کے حالات کو صرف بادشاہوں اور جہانبانوں سے تعلق ہے تو اُن کو علوم مفید و لطیف سے بھی غافل اور لاعلم نہ رہنا چاہیے۔

اور یہ چیزیں اُن لوگوں کے لئے بھی جنکو سلطنتوں کا انتظام کرنا ہے اپنے ادراک اور عقل کی پرداخت اور ترقّی کے لئے مُفید اور ضروری ہیں۔

مثال ہمیشہ تعلیم سے زیادہ مُفید ہوتی ہے۔ سپاہی لڑائی میں سپاہی بنتا ہے اور مُصوّر تصویروں کی نقل اُتارنے سے۔ جو زندگی غور و فکر کی ہے وہ ہمیشہ نفع میں رہتی ہے۔ بڑے کام اکثر نظر سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ لیکن فنون کے کارنامے ہر وقت ظاہر اور قریب ہوتے ہیں۔ بالخصوص اُن لوگوں کیلئے جو کسی فن کی نسبت معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اُس نے دُنیا میں کیا کیا کام کئے۔

جب کسی فن کا کوئی غیر معمولی کام یا نمونہ ہماری نظر یا ذہن کے سامنے آکر ہمیں تعجب و حیرت زدہ کرتا ہے تو پھر ایک ہوشیار طبیعت کو یہ کُریدنی ہوتی ہے کہ وہ کونسے وسائل اور ذرائع تھے جن سے یہ اعلیٰ صنعت وجود میں آئی۔ اس کے بعد اُس میں وہ فکر و تجسُّس شروع ہوتا ہے جو نئی نئی امثال اور خیالات سے فہم و ادراک کو وسعت بخشتا ہے۔ یہی غور و فکر ہیں ممکن ہے کہ ہم کوئی ایسا فن دریافت کرلیں جو بنی نوع انسان کسی وقت میں گم کرچکی تھی۔ یا معلوم کریں کہ یہ فن ہمارے مُلک میں بھی تھا مگر کم درجے پر تھا۔ اس غور و فکر میں کم از کم اتنا ضرور ہوتا ہے کہ ہم اپنے زمانے کے کاموں کو گذشتہ زمانے کے کاموں سے مقابلہ کرتے ہیں۔ اس میں یا تو ہم اپنے کاموں کو ترقی یافتہ دیکھکر خوش ہوتے ہیں۔ یا پھر اپنی خامیوں اور نقائص کو دریافت کرتے ہیں۔ اور یہ پہلی تحریک ہماری طرف سے خیر اور بھلائی کی ہوتی ہے۔"

شہزادے نے کہا "میں ایسی چیزوں کو دیکھنے کیلئے تیار ہوں جو میرے مسئلہ زیر تحقیق کے شایاں ہوں۔"

شہزادی کہنے لگی "میں بھی اُن طور طریقوں کو معلوم کرکے خوش ہونگی جو قدامت میں انسان رکھتا تھا۔"

املاک بولا "باشندگانِ مصر کی گزشتہ عظمت، جاہ و جلال کی سب سے پُرشکوہ یادگار، جو انسان کے ہاتھوں کا بنایا ہوا ایک عظیم الشان کام ہے وہ اہرامِ مصر ہیں جن کی تعمیر زمانہ تاریخ سے قبل عمل میں آئی تھی۔ اور جن کے ابتدائی حالات ایسی روایات سے حاصل ہوتے ہیں جن کا یقین کرنا دُشوار ہے۔ ان اہرام میں جو ہرم سب سے بڑا ہے وہ ابھی تک سلامت ہے۔ زمانے کے ہاتھوں اُسے بہت کم نقصان پہونچا ہے۔"

نیکایہ نے کہا "اچھا کل اُسے دیکھنے چلنا چاہیئے۔ مصر کے اہرام کا ذکر اکثر سُنا ہے۔ اب جب تک میں اُن کو اندر باہر سے نہ دیکھ لونگی چین نہ آئے گا۔"

اکتیسواں باب

اہرام کو دیکھنے سب جاتے ہیں

جب ارادہ پختہ ہولیا تو دوسرے دن وہ سب اہرام دیکھنے چل پڑے۔ ڈیرے خیمے اُونٹوں پر رکھے گئے۔ کیونکہ ارادہ تھا کہ جبتک اہرام کو اچھی طرح نہ دیکھ لیں وہیں قیام رہے۔ سفر شروع کیا۔ راستہ میں جو چیز بھی قابلِ دید ملی اُنہیں دیکھا۔ وہاں کے لوگوں سے بات چیت کی اور جو شہر ویران یا راستے میں آئے خواہ وہاں زراعت ہوتی ہو یا نرے کھنڈر ہوں اُنہیں بھی دیکھا۔

جب بڑے ہرم کے سامنے آئے تو اُس کے قاعدے کا طول و عرض اور اس کی چوٹی کی بلندی کو دیکھکر حیرت میں گئے۔ املاک نے

وہ اصول سمجھائے کہ ایسی عمارت کی شکل ہرم کی کیوں بنائی گئی ہے۔ اس کی تعمیر کے وقت یہ خیال پیش نظر تھا کہ جب تک دنیا قائم رہے یہ ہرم بھی قائم رہے۔ اُس نے بیان کیا کہ وہ نیچے سے اس قدر چوڑی اور رفتہ رفتہ اوپر اتنی تنگ ہوتی گئی ہے۔ یہ بات اس کی مضبوطی کی غرض سے رکھی گئی ہے۔ تاکہ عناصر کے معمولی حملوں کو رد کرتی رہے۔ ایسے زلزلے بھی اس کو صدمہ نہ پہونچا سکے جو قدرت کے حملوں اور صدموں میں سب سے بڑھکر ناقابل برداشت تھے۔ اگر کوئی صدمہ ایسا سخت ممکن ہو جو اس ہرم کو تہ و بالا کرسکے تو پھر سمجھئے کہ تمام براعظم افریقہ کو غارت کرنے کی قوت اس میں ہوگی۔

اُنہوں نے ہرم کو سب طرف سے دیکھا۔ اُس کے نیچے اپنے خیمے نصب کئے۔ دوسرے دن اُنہوں نے ہرم کے باہر والے درجوں میں داخل ہونے کی تیاریاں کیں اور معمولی رہبروں کو اُجرت پر مقرر کرکے ہرم پر چڑھے۔ جب اُس مقام پر پہونچے جہاں سے ہرم کے اندر نیچے کی طرف راستہ جاتا تھا تو شہزادی کی بڑی چاہیتی سہیلی بیکواہ اس راستے اور وہاں کے اندھیرے کو دیکھکر پیچھے ہٹی۔ اور تھر تھر کانپنے لگی۔ شہزادی نے پوچھا "بیکواہ تم کس چیز سے ڈرتی ہو؟"

بیکواہ نے جواب دیا "اس تنگ و تاریک زینے اور راستے اندھیرے کو دیکھکر مجھے خوف معلوم ہوتا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ ہم ایسی جگہ جاتے ہیں جہاں بھتنا اور بیقرار رُوحیں رہتی ہیں۔ جب ہم اندر پہونچیں گے تو اِن تاریک تہ خانوں کے مالک اپنی اپنی قبروں سے اُٹھکر ہمیں اسی اندھیرے میں بند کردینگے" اتنا کہکر بیکواہ نے شہزادی کے گلے میں باہیں ڈالدیں۔

شہزادے نے کہا "بیکواہ اگر تمہیں رُوحوں کا ڈر ہے تو میں تمہاری حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔ کیونکہ جو مرچکے ہیں اُن سے کیا ڈرنا۔ جب ایک مرتبہ وہ خاک میں دبا دئے گئے تو پھر وہ کب نظر آسکتے ہیں"

املاک کہنے لگا "یہ بات کہ مُردے دفن ہونے کے بعد نظر نہیں آتے میں اس کا قائل نہیں۔ کیونکہ ہر زمانے اور ہر قوم میں یہ اعتقاد چلا آتا ہے کہ مُردے دُنیا میں بعد الموت نظر آتے ہیں۔ کوئی قوم خواہ وحشی ہو خواہ مہذب ایسی نہیں ہے جس نے مُردوں کی رُوحوں کا ظاہر ہونا اور اِس کا یقین نہ کیا ہو۔ یہ خیال وہ ہے جو غالباً روئے زمین پر جہاں جہاں انسان آباد ہے مشہور اور شایع ہے۔ اس خیال کا عالمگیر ہونا ہی اسکے سچ ہونے کی دلیل ہے۔ وہ لوگ جو دوسروں کے حال سے باخبر نہیں رہتے ایک ایسے واقعہ کی صحت میں متفق الکلام نہیں ہوسکتے جسکو بجز تجربے کے کوئی دوسری چیز باور نہیں کراسکتی۔ بعض بیباک ایسے بھی ہیں جنہیں اِس سے انکار ہے لیکن وہ اس کی کثیر اور عام شہادت کو نہ توڑ سکے۔ بعض ایسے بھی ہیں کہ زبان پر انکار ہوتا ہے مگر کہتے وقت دل میں خوف رکھتے ہیں۔

مگر میرا مقصد یہ نہیں کہ بیکواہ جو خود خوفزدہ ہورہی ہے میں کچھ کہکر اس کا خوف اور بڑھاؤں۔ کوئی وجہ نہیں کہ اہرام کے اندر رُوحیں بہ نسبت دیگر مقامات کے زیادہ گشت لگاتی رہتی ہوں۔ اور نہ اِسکی کوئی وجہ ہے کہ یہ رُوحیں بگڑی ہوں اور پاکبازوں کو کوئی ضرر پہونچائیں۔ ہمارا داخل ہونا اُنکے اختیارات میں مخل نہیں ہوسکتا۔ نہ ہم کو اُن سے کچھ مل سکتا ہے اور نہ ہم اُنہیں ناراض کرسکتے ہیں"

شہزادی نے کہا "پیاری بیکواہ۔ میں راہ طے کرنے میں ہمیشہ تمہارے آگے اور املاک تمہارے پیچھے چلیں گے۔ جب دو آدمیوں کے بیچ میں رہوگی تو پھر ڈرنے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ اِس بات کو بھی یاد رکھو کہ تم شہزادی حبش کی مصاحب و مقرب ہو"

بیکواہ بولی "اگر حضور کی یہی مرضی ہے کہ بیکواہ مرجائے تو پھر میری موت کے لئے پہلے سے حکم ہوجائے۔ اور یہ حکم ایسا نہ ہو کہ خوف ہی سے میری جان نکل جائے۔ مثلاً یہ کہ اِس غار تاریک میں مقید ہوکر جان دوں۔ میں جانتی ہوں کہ میں حضور کی حکم عدولی نہیں کرسکتی اگر

حضور کا حکم یہی ہو کہ میں اندر جاؤں تو میں ضرور اندر جاؤں گی لیکن یقین فرمائیں کہ اندر جانے کے بعد پھر زندہ واپس نہ آؤنگی۔"

شہزادی سمجھ گئی کہ پیکوآہ پر دہی خوف طاری ہے جو سمجھانے یا ڈانٹنے سے دُور نہ ہوگا۔ شہزادی نے اپنی سہیلی کو گلے لگاکر کہا "اچھا جبتک ہم واپس آئیں تم اپنے خیمے میں رہو" پیکوآہ کا اطمینانِ خاطر اس پر بھی نہ ہوا۔ اور وہ شہزادی سے بڑی منت سماجت سے کہنے لگی "مگر حضور کیوں ہرم کے تاریک حصے میں جانیکا قصد رکھتی ہیں؟"

شہزادی بولی "اگر دوسروں کو ہمت و جرأت سکھانی مجھے نہیں آتی تو اُن سے بزدلی بھی نہیں سیکھ سکتی۔ جس غرض سے میں یہاں آئی ہوں اُس کو پورا کئے بغیر نہیں چھوڑ سکتی۔"

بتیسواں باب

املاک، راسیلاس اور شہزادی ہرم میں داخل ہوتے ہیں

پیکوآہ ہرم پر سے اُتر کر اپنے خیمے میں جا بیٹھی۔ باقی لوگ ہرم کے اندرونی حصوں میں اُترے۔ ہرم کے اندر اُسکے باہر کے درجوں اور سنگِ مرمر کی محراب دار چھتوں کو مُلاحظہ کیا اور اُس صندوق کو بھی دیکھا جس کے بارے میں فرض کیا جاتا ہو کہ بانیِ اہرام مصر کی لاش اُس میں بند ہے پھرتے پھرتے وہ ایک عالیشان کمرے میں کچھ دیر آرام کرنے بیٹھ گئے اور کچھ دیر کے بعد اُنہوں نے واپسی کا قصد کیا۔

املاک کہنے لگا "اب ہم نے انسان کے بنائے ہوئے کام کو دیکھکر اپنے دلوں کو اطمینان دے لیا۔ یہ اہرام بجز دیوارِ چین کے انسان کے سب سے بڑے کاموں میں شمار ہوتے ہیں۔

دیوارِ چین کی وجہ تعمیر بتانی آسان ہے۔ اس دیوار کی تعمیر سے مقصود تھا کہ ایک دولتمند مگر بزدل اور کم زہرہ قوم کو وحشی قوموں کے حملوں سے محفوظ و مصئون رکھا جائے۔ یہ وحشی چونکہ ہر قسم کے فنون سے بے بہرہ تھا اس لئے اسکے لئے یہی بات آسان تھی کہ وہ اپنی ضروریاتِ زندگی کو بجائے محنت و مزدوری کے لُوٹ مار اور غارتگری سے حاصل کیا کرے۔ چنانچہ یہ غارتگر وحشی وقتاً فوقتاً تجارتی شہروں پر اس طرح گرتے تھے جس طرح گدھ اور کرگس گھر کی مرغیوں اور بطخوں پر جھپٹتے ہیں۔ اِن لٹیری قوموں کی تندی و تیزی اُنکے اچانک حملوں نے اس دیوار کی تعمیر ضروری کردی اور ان کی جہالت نے اِس دیوار کو پناہ کا کافی ذریعہ بنادیا۔

لیکن مصر کے اہرام بنانے کا کوئی مقصد ابھی تک بیان نہیں ہوا کہ کیوں اس قدر محنت اور روپیہ صرف کرکے انہیں بنایا گیا۔ انکے اندر کے درجوں کی تنگی ظاہر کرتی ہے کہ دُشمن سے پناہ لینے کی وہ کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ اور نہ وہ دولت و خزانہ رکھنے کے لئے کوئی معقول جگہ سمجھ میں آتی ہے۔ کیونکہ خزانہ کے لئے کوئی اور تعمیر اس سے کم صرف میں تعمیر کی جاسکتی تھی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ عظیم الشان عمارت قوتِ متخیلہ و مُصورہ کے شوق اور گرسنگی کو مٹانے کے لئے بنائی گئی تھی جو ہمیشہ انسان کی جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔ پھر یہ گرسنگی اور شوق وہ ہے جو کسی نہ کسی کام پر ہزار ہا مخلوق کو مُقرر کرنے سے سیر ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو اُن کی خواہش کے مطابق سب کچھ میسر ہے وہ اپنی خواہشوں کو بڑھانا ضروری سمجھتے ہیں۔ جو شخص رفاہِ عام کے لئے عمارتیں کھڑی کرتا ہے جب اُن کے فوائد حاصل ہو جاتے ہیں تو پھر نام و نمود کے لئے عمارتیں بنانے لگتا ہے۔

میں تو اس زبردست عمارت کو اِس بات کی یادگار سمجھتا ہوں کہ انسان کو خواہ کتنی ہی مسرتیں حاصل ہو چکی ہوں مگر وہ ہمیشہ اُنہیں ناکافی

سمجھتا ہے گویہ اہرام انسان کی مسرتوں کے غیر مکتفی ہونے کی یادگار ہیں۔ایسا بادشاہ جس کی قوت وشوکت کی انتہا نہ رہی ہو، جس کے پاس دولت اتنی ہو کہ وہ حقیقی اور غیر حقیقی ہر ضرورت کو کفایت کرے تو پھر اس بادشاہ کو ایک ہرم بنانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ملک گیری اور کسب دولت کا شوق جب سیر ہوچکتا ہے اور تمام مسرتیں بے لطف اور پھیکی ہوجاتی ہیں تو انسان اپنی عمر کے زمانۂ انحطاط میں وقت کاٹنے کے لئے اس طرح دل بہلاتا ہے کہ وہ ہزارہا مخلوقِ خدا کو کسی ایسے کام میں لگادے جس میں محنت ومشقت کی انتہا نہ ہو۔ اور اس مخلوق کی ساری عمر پتھر پر پتھر رکھنے میں بسر ہوجائے۔ ایسے شخص جو معتدل حالت پر قناعت نہیں کرتا اور اس خیال میں ہے کہ حکومت اور دولت ہمیشہ شوقِ ندرت وبدعت کو پورا کرسکتی ہیں (خواہ وہ شخص جو چاہے تو کوئی ہو) کہ تجھے مصر کے اہرام کو دیکھکر اپنی غلطی اور خطاکاری کا معترف ہونا ضروری ہے۔

تیتیسواں باب

شہزادی کو اتفاق سے ایک سخت صدمہ پہونچتا ہے۔

اب وہ سب کھڑے ہوئے اور جس دروازے سے ہرم کے اندرونی حصے میں داخل ہوتے تھے اسی دروازے سے باہر نکلے۔ شہزادی نے دل میں بڑے بڑے منصوبے باندھے کہ جب وہ اپنی عزیز سہیلی پیکواہ سے ملے گی تو جو جو تاریک وسیاہ تہ خانے دیکھے ہیں یا جو عالیشان ایوان اور کمرے نظر سے گزرے ہیں اور ان کے جو نقش دل پر اترے ہیں ان کا تذکرہ اس سے کرے گی۔ لیکن جب وہ اپنے ڈیرے خیموں کے قریب پہونچی تو دیکھا کہ سب لوگ خاموش اور افسردہ خاطر بیٹھے ہیں اور انکے چہروں پر ایک قسم کی ندامت اور خوف طاری ہے، اور عورتیں خیموں میں بیٹھی رو رہی ہیں۔ انہوں نے اس کا سبب دریافت بھی نہ کیا تھا کہ ایک ملازم قریب آیا اور کہنے لگا "آپ مشکل سے ہرم کے اندر گئے ہونگے کہ عربوں کا ایک گروہ سرپٹ گھوڑے ڈالے ہم پر حملہ آور ہوا۔ ہم تعداد میں کم ہونے کی وجہ سے ان کا مقابلہ نہ کرسکے۔ اور سستی کی وجہ سے بھاگ بھی نہ سکے۔ عرب خیموں کی تلاشی لیکر ہم سب کو اونٹوں پر سوار ہونے کا حکم دینے ہی کو تھے کہ اتنے میں ترکی سواروں کا ایک دستہ نمودار ہوا اور اس نے ان عربوں کو بھگا دیا۔ لیکن اس پر بھی یہ عرب پیکواہ اور اس کی دو خادماؤں کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے چلتے بنے۔ ہم نے ترکوں سے فریاد کی چنانچہ اس وقت ترک انہی عربوں کے تعاقب میں جارہے ہیں لیکن اندیشہ یہ ہے کہ کہیں یہ ترک ان عربوں کو گرفتار نہ کرسکیں۔"

شہزادی اتنا سنتے ہی خوف وحیرت سے سرد پڑگئی۔ راسیلاس کو بھی اتنا غصہ آیا کہ تلوار سونت کر اپنے ملازموں سے کہنے لگا "ہمارے ساتھ آؤ" اور اسی طرح تلوار ہاتھ میں لئے ان قزاقوں کے تعاقب کے لئے تیار ہوگیا۔ املاک شہزادے سے کہنے لگا "حضور، اس وقت زور کام دے سکتا ہے نہ ہمت۔ عرب گھوڑوں پر سوار ہیں اور گھوڑے لڑائی اور لڑائی سے فرار ہونے کے لئے سدھے ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس صرف بارکش جانور ہیں۔ اگر اس وقت ہم یہاں سے چلے گئے تو پھر شہزادی بے یار ومددگار تنہا رہ جائیں گی درحالیکہ پیکواہ کے بازیاب کرنے کی بھی کوئی توقع نہ ہوگی۔"

تھوڑی دیر میں ترک واپس آئے اور کہا کہ ہم دشمن کو نہ پاسکے۔ شہزادی اتنا سنکر چیخ چیخ کر رونے لگی۔ راسیلاس بھی ان ترکوں کو بزدل کہے بغیر نہ رہ سکا۔ لیکن املاک نے کہا کہ عربوں کا فرار ہوجانا ہماری اس مشکل وپریشانی کو کچھ زیادہ نہیں کرتا۔ کیونکہ یہ عرب اپنے قیدیوں کو واپس

کرنے کی جگہ اُن کو قتل کر دیتے ہیں.

چونتیسواں باب

سب لوگ بغیر بیگواہ کے قاہرہ واپس آتے ہیں

اہرام کے قریب اب زیادہ قیام کرنے سے کچھ حاصل نہ تھا۔ غرض سب قاہرہ واپس آ گئے۔ اہرام کی سیر کو جانے پر سب کے دل نادم تھے، حکومت مصر کی غفلت و بدانتظامی پر طرح طرح کے اعتراض شروع ہوئے۔ اور خود اپنی عجلت و بے احتیاطی پر افسوس ہوا کہ جاتے وقت کیوں ایک دستہ سپاہیوں کا حفاظت کی غرض سے نہ لیا۔ اب بہت سی صورتیں ایسی نظر آئیں کہ اگر انکو مدنظر رکھا جاتا تو بیگواہ اس طرح غائب نہ ہو جاتی۔ سوچنے لگے کہ بیگواہ کو بازیاب کرنے کی کوئی تدبیر کی جائے مگر کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں.

شہزادی نیکایہ پریشان غمگین اپنے کمرے میں منہ لپیٹ کر پڑ رہی۔ یہاں اسکی خواصیں شہزادی کو یہ کہکر تسلی و تشفی دینے لگیں کہ دنیا میں ہر انسان کیلئے تکلیفیں اترتی ہیں۔ بیگواہ نے مدت تک عیش و آرام سے زندگی بسر کی۔ اب قسمت کی یہ گردش بھی اٹھالیں۔ دعا ہے کہ جہاں کہیں بھی ہوں چین اور آرام سے ہوں اور شہزادی صاحبہ کو انکا نعم البدل کسی اور مصاحب میں ملے۔

شہزادی اُنکی کسی بات کا جواب نہ دیتی تھی مگر یہ خواصیں برابر چاپلوسی اور مکاری کی باتیں کئے جاتی تھیں۔ دل میں کسی کو بھی اس بات کا رنج نہ تھا کہ شہزادی کی سب سے چاہیتی سہیلی اُس سے جدا ہو گئی

دوسرے دن راسیلاس نے ایک عرضداشت بادشاہ مصر کی خدمت میں پیش کی اور وہ ظلم و زیادتی جو اُس کے ساتھ ہوئی تھی بیان کی۔ ایک درخواست بھی اُس کے تدارک کے لئے گزرانی۔ بادشاہ مصر نے قزاقوں کو سخت سزا دینے کی دھمکی سُنائی لیکن ان کی گرفتاری میں مطلق کوشش نہ کی۔ مجرموں کی شناخت کے لئے بھی کچھ اتا پتہ نہ دیا گیا کہ تفتیش ہو سکتی۔ غرض بہت جلد معلوم ہو گیا کہ حکومت اس مقدمے میں کچھ نہ کریگی۔ کیونکہ والیان ملک کو اس کثرت سے جرائم سُننے پڑتے ہیں کہ وہ ہر مجرم کو سزا نہیں دے سکتے۔ اور اتنے جرائم وقوع میں آتے ہیں کہ وہ سب کا تدارک نہیں کر سکتے۔ اس لئے وہ سب کی طرف سے بے پروائی اور غفلت کر کے اپنے دل کو تسلی دے لیتے ہیں اور سامنے سے سائل کے ہٹتے ہی اسکی فریاد کو بھول جاتے ہیں۔

املاک نے اب بیگواہ کی خیر خبر کے جاسوس دوڑا کر معلوم کرنی چاہی۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جنہوں نے جھوٹ موٹ کہا کہ عرب جہاں جہاں جمع ہوتے ہیں ہمیں وہ کل مقامات معلوم ہیں اور ہم ان عرب قزاقوں کے سردار سے خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ بہتوں کو دعویٰ ہوا کہ ہم قزاقوں سے حال دریافت کر کے بیگواہ کا پتہ ضرور چلالیں گے۔ ان میں سے بعض کو سفر خرچ بھی دیا گیا مگر وہ روپیہ لیکر چلتے بنے۔ پھر کسی نے انکی شکل نہ دیکھی۔ بعض کو اس غرض سے روپیہ دیا گیا کہ وہ بیگواہ کا کچھ حال کہیں گے۔ حالات انہوں نے مفصل بیان کئے، مگر سب جھوٹ اور غلط تھے۔ شہزادی کو کسی طرح صبر و قرار نہ تھا اور کوئی ذریعہ بیگواہ کے پتہ چلانے کا خواہ وہ کیسا ہی کمزور اور ناقابل یقین ہو ایسا نہ تھا جسے بغیر آزمائے چھوڑا ہو۔ جب ایک تدبیر ناکام رہی تو دوسری اختیار کی۔ اگر ایک قاصد نامراد آیا تو دوسرا آدمی دوسری سمت میں روانہ کیا گیا۔

دو مہینے اسی تگ و دو میں گزر جاتے ہیں مگر بیگواہ کا کچھ حال نہیں معلوم ہوتا۔ اُمیدیں بندھ بندھ کر مٹنے لگتی ہیں۔ شہزادی نے جب

دیکھا کہ کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی تو وہ سخت رنج و غم میں مبتلا رہنے لگی۔ ہزاروں مرتبہ اپنے تئیں ملامت کرتی کہ ہائے میں نے کیوں اتنی آسانی سے پیکواہ کو خیمے میں جا بیٹھنے کی اجازت دیدی۔ کیا میری مروت اور احسان نے میرے رعب داب میں اتنی کمی پیدا کر دی کہ پیکواہ کو میرے ساتھ نہ چلنے کی جرأت ہوئی۔ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا کو پیکواہ کو میرے سامنے اپنا خوف ظاہر کرنے کی ہمت ہرگز نہ ہوتی۔ رُوحوں کے خوف سے اُس کو میرا ڈر کہیں بڑھکر ہوتا۔ یا جب اُس نے خوف ظاہر کیا تھا اگر میں تیز نظر سے اُس کو دیکھتی تو پھر اُس کی زبان سے ایک حرف نہ نکل سکتا۔ اور فوراً جو کچھ میں کہتی وہی کرتی۔ یہ میری سراسر حماقت تھی کہ اُس وقت میں نے اُس کی خاطر کی۔ میں نے کیوں اُس سے بات کی اور جو کچھ اُس نے کہا تھا اُس سے انکار نہ کر دیا۔

املاک نے کہا: "اے عالی نسب شہزادی۔ حضور کیوں اپنے تئیں تو وہ ملامت بناتی ہیں۔ حضور نے ایک نیک بات کی تھی۔ اتفاق سے اس کا نتیجہ بُرا ہوا۔ اس پر آپ اپنے تئیں کیوں قابلِ الزام قرار دیتی ہیں۔ پیکواہ کی اِس کمزوری پر کہ وہ اندھیرے سے ڈرتی آپکا لطف و کرم محض آپ کی فیاضی اور مہربانی سے ہوا تھا۔ جب ہم اپنے فرض کے مطابق کوئی کام کرتے ہیں تو پھر اُس کے نتیجے کو ہم خدا کے سپرد کر دیتے ہیں۔ جس کی حکمت سے ہمارے سب کام عمل میں آتے ہیں۔ اور اگر ہم نے خدا کی فرمانبرداری کی ہے تو اس کے لئے وہ ہمیں ہرگز سزا نہ دیگا۔ اگر کسی بھلائی کی اُمید میں خواہ وہ بھلائی قدرتی ہو یا اخلاقی، ہم اُن قواعد سے رُوگردانی کرتے ہیں جو ہمارے لئے منضبط ہوتے ہیں تو پھر ہم حکمتِ اعلیٰ کے راستے سے ہٹ جاتے ہیں اور اُس کے نتائج کو اپنے ذمہ لیتے ہیں۔ علل اور اُن کے نتائج کے سلسلہ سے انسان اتنی واقفیت نہیں رکھتا کہ وہ کوئی خطا، صواب کی غرض سے کرے۔ جب ہم اپنی کسی غرض کی پیروی میں جائز اور معقول ذریعے سے کام لیتے ہیں مگر ناکامی ہوتی ہے تو اِس ناکامی پر ہم اپنے دل کو یہ کہکر تسلی دے لیتے ہیں کہ اِس کا اجرِ نیک ہم کو آئندہ ملے گا۔ جب ہم اپنی عقل سے مشورہ کر کے کسی بھلائی کے لئے قریب تر راستہ اس طرح دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ خیر و شر کی مقررہ حدود کو پھلانگ جائیں تو اِس صورت میں کامیابی پر بھی ہم خوش نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ہم کو اپنی غلطی و خطا کا علم ستاتا رہتا ہے، اور اِس غلطی و خطا کے علم سے بچنا ممکن نہیں۔ اگر اس میں ناکام رہے تو پھر ہماری مایوسی لاعلاج طریقے پر تلخ و تکلیف دہ ہوتی ہے۔ خیال فرمائیں کہ اُس شخص کا رنج کس قدر تکلیف دہ ہوگا جس کو ایک ساتھ خطا کی تکلیف اور مُصیبت کا احساس اور پریشانی جو خطا کی وجہ سے اس کے سر پر آئی ہیں محسوس ہوتا ہوگا۔

شہزادی صاحب۔ حضور خیال فرمائیں کہ اُس وقت آپ کا کیا حال ہوتا اگر پیکواہ آپ کے ساتھ چلنے پر منت سماجت سے اصرار کرتی مگر آپ اُسے ساتھ نہ لے چلتیں بلکہ خیمے ہی میں اُسے چھوڑ جاتیں اور پھر خیمے سے اُسے کوئی اُٹھا لے جاتا۔ یا آپ اُس تکلیف کی کیونکر متحمل ہوتیں کہ آپ اُسکو ہرم کے اندرونی حصّوں میں لے جاتیں اور وہاں خوف سے اس کی جان نکل جاتی۔"

شہزادی کہنے لگی: "اگر ان دونوں باتوں میں سے ایک بھی پیش آتی تو میں اَب تک ہرگز زندہ نہ رہ سکتی تھی۔ میں تو اپنی سہیلی پر اِس ظلم و جبر کو یاد کر کے دیوانی ہو جاتی اور خود اپنے سے اتنی نفرت کرتی کہ اِسی میں گھل گھلکر ختم ہو جاتی۔"

املاک بولا: "پھر آپ کی نیکی کا اجر کم سے کم اتنا تو مِلا کہ کوئی ایسا بُرا واقعہ پیش نہ آیا جس کا رنج و الم اور افسوس آپ کو اِس وقت ہوتا۔"

* * *

پینتیسواں باب

شہزادی اپنی سہیلی بیکواہ کے پاس نہ ہونے سے رنج و غم میں گھلی جاتی ہے۔

املاک کے سمجھانے سے نیکایہ کو کسی قدر تسلی ہوئی مگر معلوم ہوا کہ کوئی آفت ایسی ناقابلِ برداشت نہیں ہے جیسے کہ اِس امر کا احساس رکھنا کہ ہمارے ساتھ کوئی بدسلوکی یا ظلم کیا گیا ہے۔ املاک کے سمجھانے کے وقت سے نیکایہ کو رنج و غم کی شدت سے کسی قدر نجات ضرور ہوئی۔ اب اُسے چُپ لگی اور ایک تاریک آسودگی محسوس ہوئی۔ صبح سے شام تک بیٹھی جو کچھ بیکواہ کہا کرتی اُسے یاد کرتی رہتی۔ ذرا ذرا سی بات بھی جو بیکواہ کے مُنہ سے اتفاقاً بے پروائی کے ساتھ نکلی تھی اور جو بیکواہ کی یاد دلاتی تھی اُسے ایک دولت سمجھکر دل کے خزانے میں محفوظ کرتی۔ اب بیکواہ کی محبت کی باتیں جس سے ملنے کی توقع نہ رہی تھی نیکایہ کے حافظہ میں زندگی کے قواعد کی طرح نقش تھیں۔ اور جب کوئی بات سوچتی بھی تھی تو اس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ اگر بیکواہ پاس ہوتی تو وہ کیا رائے یا مشورہ دیتی۔

جو خواصیں خدمت کے لئے قریب ہوتیں اُن کو نیکایہ کے دل کا اصلی حال کچھ معلوم نہ ہوتا۔ اور اگر اُن سے کچھ بات بھی کرتی تو احتیاط ملحوظ رکھتی۔ کسی بات پر تعجب کر کے اُسے دریافت کرنا بھی اب کم ہو گیا اور نہ معلومات جمع کرنے کا شوق رہا تھا جسے بیان کرنے میں کسی قسم کی راحت محسوس ہوتی۔ راسیلاس نے پہلے تو بہن کو تسلی تشفی دینے کی کوشش کی۔ پھر اُسنے مُغنی و مُطرب بُلوائے۔ جب وہ گانے لگے تو نیکایہ معلوم ہوتی تھی کہ گانا سُن رہی ہو مگر فی الواقع وہ سُنتی نہ تھی۔ چند اُستاد مقرر کئے کہ وہ بہن کو مختلف فنون پڑھائیں۔ لیکن اُن کی یہ کیفیت ہوئی کہ آج جو سبق پڑھایا تھا کل جب آئے تو پھر وہی سبق پڑھانا پڑا۔ اب کسی مسرت یا خوشی میں ذائقہ یا چاشنی باقی نہ تھی، اور فوقیت یا بزرگی حاصل کرنے کا شوق بھی نہ رہا تھا۔ طبیعت کا یہ حال تھا کہ گو تھوڑی دیر کو دوسری طرف مائل ہوتی مگر اپنی پیاری سہیلی کی صورت ہر وقت آنکھوں میں پھرنی بند نہ ہوتی۔

املاک صبح اُٹھتے ہی بیکواہ کی تلاش میں سختی سے تاکید کرتا۔ جب رات ہوتی تو شہزادی اُس سے پُوچھتی کہ "کہو بیکواہ کی کچھ خبر آئی؟" املاک نے جب دیکھا کہ شہزادی کے حسبِ مُراد کوئی جواب نہیں دے سکتا تو شہزادی کے سامنے آنا اُس نے رفتہ رفتہ کم کر دیا۔ شہزادی بھی اِس بات کو تاڑ گئی اور ایک دن حکم دیا کہ املاک ہمارے سامنے آئے۔ جب املاک حاضر ہوا تو شہزادی کہنے لگی: "املاک میری بیقراری کو میرا غصّہ نہ سمجھو اور نہ یہ فرض کرو کہ میں تم کو کسی قسم کی غفلت یا بے پروائی کا مرتکب سمجھتی ہوں۔ تمہارے نہ آنے پر مجھے تعجب نہیں ہوتا کیونکہ میں جانتی ہوں کہ غمزدہ اور افسردہ دل دوسروں کو خوش نہیں کر سکتے۔ قُدرتی طور پر ہر شخص ایسے لوگوں کی صحبت سے بھاگتا ہے جو مُصیبت زدہ اور آفت رسیدہ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے اِس طرح گُریز کیا جاتا ہے جیسے مرضِ متعدّی کے مریض سے کوئی بھاگے۔ دوسرے کے مُنہ سے اُسکے درد و تکلیف کی شکایتیں سُننی، خواہ سُننے والا خوش ہو یا رنجیدہ، موجبِ خستگی ہوتی ہیں۔ خوش رہنے والوں میں کون ایسا ہے جو اپنے خوشی کے موقعوں کو، جنکی اجازت زندگی بہت کم وقت کیلئے دیتی ہے، دوسروں کا غم سنکر اُنہیں بے لُطف کریں۔ اور رنجیدہ لوگوں میں کون ایسا ہے جو اپنے ہی رنج و آلام میں مُبتلا ہو کر مُفت میں دوسروں کا رنج و غم مول لے۔

وہ وقت قریب آرہا ہے کہ نیکایہ کی آہیں کسی کو زیادہ نہ ستائیں گی۔ حصولِ مسرت کے متعلق جس تحقیقات میں میں معروف تھی وہ اب ختم ہوئی۔ میرا ارادہ ہے کہ اب میں دُنیا کی مسرتوں اور فریبوں سے کنارہ کش ہو کر ترکِ دُنیا کروں اور گوشۂ عُزلت اختیار کر کے تنہائی میں اپنے خیالات

ا ترتیب و تہذیب کے سوا دوسرا کام نہ کروں اور اپنی زندگی کے اوقات سیدھے سادے معصومیت کے کاموں میں بسر کروں، حتیٰ کہ طبیعت
ی ہوجائے کہ دُنیا کی تمام خواہشیں دل سے دُور ہوکر اس طرف رجوع کردیں جس طرف سب دوڑے جاتے ہیں۔ پھر مجھے اُمید ہوسکتی ہے کہ
واہ میری پیاری سہیلی کی صحبت مجھے نصیب ہو"

املاک بولا "حضور اپنی طبیعت کو ایسے پختہ اور مُصمم ارادے کرکے خلجان میں نہ ڈالیں اور نہ زندگی کے اس بارِ گراں کو دیگر مصائب بضافہ
کے زیادہ کریں جس وقت پیکواہ کی یاد دل سے جاتی رہیگی تو پھر تنہائی کی تکلیف یا تو بدستور رہیگی یا اس میں زیادتی ہوجائیگی۔ یہ بات کہ آپ ایک
مرت سے محروم ہوئیں اس امر کو لازمی نہیں کرتی کہ باقی تمام مسرتوں سے دستکش ہوجائیں"

شہزادی نے کہا کہ "چونکہ مجھ سے میری پیکواہ اب جُدا کردی گئی ہے اس لئے اب میرے پاس کوئی خوشی ایسی نہیں رہی جس سے حظ
ھانے یا جسے جاری رکھنے کی مجھے پروا ہو۔ جب کسی عورت کے پاس وہ چیز نہیں رہتی جس سے وہ محبت کرے یا جس پر وہ بھروسا کرے
پھر اُمید بھی اُس سے رُخصت ہوتی ہے۔ مسرت یا خوشی کے اساسی اُصول وہ کھو بیٹھتی ہے۔ غالباً ہم اس بات کو تسلیم کرلیں کہ دُنیا جو
اطمینان انسان کو بخشتی ہے وہ دولت، علم، اور نیکی کے یکجا ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن دولت جب تک وہ دوسروں کو نہ دی جائے
ر علم جب تک دوسروں کو نہ پہونچایا جائے بے معنی و بیکار چیزیں ہیں۔ اب کون بیٹھا ہے جس کو یہ دونوں چیزیں دوں گی! نیکی البتہ ایسی
ز ہے جسے بغیر دوسروں کو دیئے انسان حظ نہیں اٹھا سکتا۔ یعنی نیکی وہ چیز ہے جس سے دُنیا ترک کرنے کی صورت میں بھی انسان لُطف
ھا سکتا ہے"

املاک نے جواب دیا "اس وقت اس سوال سے بحث نہیں ہے کہ تنہائی کس حد تک نیکی کرنے یا نیکی کو ترقی دینے کی اجازت دیگی۔ اس
ت تو آپ اُس پرہیزگار زاہد کا قول یاد فرمائیں جس نے کہا تھا کہ جس وقت آپکے دوست کی صورت آپکے ذہن سے نکل گئی تو اُس وقت آپ پھر
یا میں واپس ہونا چاہیں گی"

نیکایہ بولی "وہ وقت کبھی نہ آئے گا۔ طبیعت کی وہ فیاضی، وہ صاف باطنی، وہ شرم و حیا کے ساتھ اطاعت گزاری، وہ ایمانداری
ساتھ رازداری جو پیکواہ میں تھی وہ کسے نصیب ہے؟ جب میں عُزلت گزینی ترک کرکے پھر دُنیادار بنوں گی تو یہی چیزیں اور زیادہ یاد
کریں گی"

املاک کہنے لگا "جس طبیعت پر کوئی ناگہانی آفت آئی ہو تو اُس کا حال نئی نئی مخلوق کی ہوئی دُنیا کے اُن دو باشندوں کا سا ہوگا کہ جب
دُنیا میں پہلی رات آتے اُنہوں نے دیکھی تو سمجھے کہ دن پھر نہ نکلے گا۔ جب مطلعِ دل پر سیاہ بادل چھا جاتے ہیں تو پھر اُن کے دوسری طرف
نہیں دکھائی دیتا اور نہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ تاریک بادل کیونکر ہٹیں گے۔ لیکن نیا دن پھر رات کے بعد نکلتا ہے اور غم کو بھی راحت کا انتظار
یادہ نہیں کرنا پڑتا۔ لیکن وہ لوگ جو حالتِ رنج و غم میں کسی طرح تسلّی و تشفّی گوارا نہیں کرتے تو اُن کا حال اُن وحشیوں کا سا سمجھنا چاہیئے جو
ت کا اندھیرا دیکھتے ہی اپنی آنکھیں پھوڑ لیتے۔ ہماری طبیعتیں بھی مثل ہمارے جسم کے ہر وقت حالتِ سیلان میں رہتی ہیں۔ ہر لمحے اور ہر لحظے
م کچھ نہ کچھ کھوتے اور کچھ نہ کچھ پاتے ہیں۔ زیادہ کھونا طبیعت اور جسم دونوں کے لئے مُضر ہے۔ جب تک قوتِ حیات سلامت ہے فطرت
نقصان کی تلافی کردے گی۔ دُوری اور بُعد کا طبیعت پر وہی اثر ہوتا ہے جو بصارت پر ہوتا ہے۔ وقت کے بہتے دریا میں سب بہے چلے
اتے ہیں۔ جو چیز پیچھے چھوڑی وہ جسامت میں کم اور جو قریب آرہی ہے وہ جسامت میں زیادہ نظر آنے لگتی ہے۔ زندگی میں بند پانی کی طرح ہوئے

فساد نہ آنے دیجیے۔ مگر اس میں حرکت و روانی نہ رہی تو پانی گدلا ہو کر کیچڑ معلوم ہونے لگے گا۔ بس ایک بار پھر دُنیا کے بہتے دریا میں اپنے تئیں ڈال دیجیے۔ پھر پیکواہ رفتہ رفتہ آپ کے خیال سے دُور ہو جائے گی اور اِسی زندگی میں کوئی دوسری سہیلی آپ کو مل جائیگی۔ ورنہ طبیعت کو عام گفتگو میں ہر طرف پانی کی طرح پھیلا دینا سیکھیے"۔

راسیلاس نے کہا: "کم سے کم جب تک کُل تدبیریں عمل میں نہ آجائیں ترکِ دُنیا نہ کرو۔ تمہاری عزیز سہیلی کی تلاش ابھی تک جاری ہے اور اس میں اور زیادہ کوشش کی جائیگی، بشرطیکہ تم ایک سال تک کوئی ایسا ارادہ نہ کرو جو ٹل نہ سکے"۔

نیکایہ نے بھائی کے اِس خیال کو بہت معقول تصوّر کیا اور اُس سے اِس امر کا وعدہ کیا جو املاک نے سمجھا کر راسیلاس کے ذریعے کہلوایا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ املاک کو بھی پیکواہ کے پھر ملنے کی کوئی اُمید نہ رہی تھی، لیکن اُسے خیال ہوا کہ اگر اِس وقت ایک سال کا وعدہ لے لیا تو پھر اِس کا اندیشہ نہیں رہیگا کہ نیکایہ دُنیا چھوڑ کر کسی دَیر میں جا رہے۔

چھتّیسواں باب

پیکواہ کی یاد دل سے نہیں جاتی۔ رنج بڑھتا ہی جاتا ہے۔

نیکایہ نے یہ دیکھکر کہ پیکواہ کی تلاش میں کوئی بات اُٹھا نہیں رکھی گئی اور ترکِ دُنیا کے قصد کو ملتوی کرنے کا اقرار جب بھائی سے کر لیا تو خود بخود بلا محسوس کئے روزمرہ کے کام کاج اور تفریحات کی طرف راغب ہوگئی۔ گو خود مُنہ سے اقرار نہیں کیا مگر رنج و غم کے اِس التوا پر خوش ہوئی۔ بعض وقت ایسا ہوتا کہ جب دیکھتی کہ پیکواہ کی یاد دل سے مِٹنے لگی ہے، جسے ہمیشہ یاد رکھنے کا قصد تھا، تو اپنے اُوپر خفا ہوتی۔

اب نیکایہ نے دن میں ایک خاص وقت پیکواہ کی خوبیاں اور اُس کی محبّت کو یاد کرنے کا مقرّر کیا۔ اور کئی ہفتے تک یہ ہوتا رہا کہ اِس وقتِ مقرّرہ پر کہیں دُور جا بیٹھتی اور جب وہاں سے آتی تو آنکھیں روتے روتے سُوجی ہوئی اور مُنہ پر غم کا غُبار ہوتا۔ پھر رفتہ رفتہ اِس پابندی میں کمی ہونے لگی۔ یعنی اگر کوئی ضروری کام آپڑتا تو اِس یاد کرکے رونے دھونے کے مقرّرہ وقت میں تاخیر ہو جاتی۔ پھر معمولی کام آجانے پر بھی اس میں دیر ہونے لگی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بالکل ہی یاد کرنا، جس سے اب خوف سا معلوم ہونے لگا تھا، بھُول جاتی تھی۔ آخر کار نوبت یہانتک پہونچی کہ مقرّرہ وقت پر تنہا بیٹھکر اُسے یاد کرنے کی پابندی بالکل ترک ہوگئی۔ اس پر بھی پیکواہ سے جو محبّت حقیقت میں تھی اس میں کمی نہ آئی۔ دن میں ہزاروں موقعے ایسے آتے کہ وہ یاد آجاتی اور ہزاروں ضرورتیں ایسی پیش آتیں جن کے رفع کرنے کے لئے کسی مُحبّ رازدار کی مُحتاج ہوتی۔ ایسے موقعوں پر پیکواہ کی یاد پھر ستانے لگتی۔ چنانچہ ایک دن املاک سے کہنے لگی کہ "دیکھو پیکواہ کی تلاش میں جو کوشش کی جارہی ہے اُس میں کمی نہ ہونے پائے۔ اور کوئی ذریعہ مُخبری یا جاسوسی کا ایسا نہ رہے جس سے کام نہ لیا جائے تاکہ مجھے یہ اطمینان رہے کہ ہماری غفلت یا کاہلی سے پیکواہ تکلیف میں نہیں ہے۔ لیکن نیکایہ دل میں کہنے لگی کہ جب مسرّت خود ہماری تکلیف و آزار کا موجب ہو تو پھر اسکی تلاش کرنے سے کیا حاصل۔ پھر ایسی چیز کی تلاش میں کیوں کوشش کی جائے جس کا ملنا سخت دُشوار ہو۔ پس میں اب اس بات سے خائف رہونگی کہ حصولِ عزّ و شرف خواہ وہ کیسا ہی اعلیٰ و روشن ہو اور اُس کی محبّت میں خواہ وہ کیسی ہی نرم و نازک ہو کبھی اپنا دل نہ لگاؤنگی، تاکہ وہی چیزیں پھر ہاتھ سے نہ دینی پڑیں جو پیکواہ میں کھوئی بیٹھی ہوں"۔

سینتیسواں باب

شہزادی کو پیکواہ کی خبر ملتی ہے۔

جس دن نیکایہ نے اقرار کیا تھا کہ وہ پیکواہ کا ایک سال تک انتظار کرے گی اُسی روز چند قاصد پیکواہ کی تلاش میں روانہ کئے گئے تھے۔ غرض اب سات مہینے کے بعد اُنہی قاصدوں میں سے ایک مُلک نوبیہ کی سرحد سے خبر لایا اور یہ خبر بھی تلاش و تفتیش میں بہت سی ناکامیوں کے بعد کہ پیکواہ کو ایک عرب سردار نے قید کر رکھا ہے، اور یہ عرب ایک عالیشان قصر یا قلعے کا مالک ہے اور قلعہ مصرِ شمال کی سرحد پر ہے۔ اِس سردار کی آمدنی لُوٹ کا مال ہے۔ اور وہ اِس بات پر رضامند ہے کہ پیکواہ کو مع اُس کی دو کنیزوں کے پانسو تولے سونے کے عوض میں رہا کر دے۔

یہ رقم اب مطلق بحث طلب نہ تھی۔ نیکایہ نے جب سُنا کہ پیکواہ زندہ ہے اور ایک خفیف رقم دینے پر رہا ہو سکتی ہے تو اُس کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور چاہا کہ پیکواہ کی رہائی یعنی اُس کی اور اپنی خوشی میں ایک لمحہ کی دیر نہ ہو، اور بھائی سے بڑی منت کر کے کہنے لگی کہ قاصد کو ابھی یہ رقم دے کر روانہ کیا جائے۔ لیکن جب املاک سے مشورہ کیا گیا تو اوّل تو اُس کو قاصد کی بات کا پورا یقین نہ آیا اور اُس عرب سردار پر بھی بھروسا نہ ہوا کہ اتنی بڑی رقم لینے کے بعد کہیں وہ روپیہ اور قیدیوں دونوں کو اپنے ہی پاس نہ رہنے دے۔ املاک نے اس بات کو بھی خالی از خطر نہ سمجھا کہ وہ سب خود اِس عرب سردار کے علاقے میں جا کر اُس کے پنجے میں گرفتار ہو جائیں، اور یہ بھی خیال آیا کہ یہ قزاق بھی اتنا بھولا اور بے وقوف نہ ہوگا کہ وہ خود اپنے قلعہ سے نکل کر مصرِ شمال میں آئے اور پاشاہ مصر کے سپاہی اُسے دیکھتے ہی گرفتار کر لیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جب فریقین میں بدگمانی ہو تو پھر کسی معاملے کا تصفیہ دشوار ہو جاتا ہے۔ غرض کچھ بحث کے بعد املاک نے قاصد سے کہا کہ وہ عرب سردار سے جا کر کہے کہ وہ پیکواہ کو دس سواروں کے ہمراہ خانقاہِ سنت انطونی میں لائے۔ یہ خانقاہ شمالی مصر کے صحرا میں واقع ہے اور وہاں پیکواہ کی حفاظت کے لئے اتنے ہی سوار اور موجود ہونگے، اور اِسی خانقاہ میں جو رقم پیکواہ کی رہائی کی اُس نے مانگی ہے وہ ادا کی جائے گی۔

اب وقت مطلق ضائع نہ ہونا چاہیئے تھا کیونکہ املاک کو پورا یقین تھا کہ اِس صورت میں اِس عرب سردار کو پیکواہ کو خانقاہ میں لانے میں عُذر نہ ہو سکے گا۔ پس اب اِن سب نے خانقاہ پہونچنے کے لئے سفر کا سامان دُرست کیا۔ جب یہ سب خانقاہ کے قریب پہونچے تو املاک نے قاصد کو ساتھ لیا اور وہ عرب سردار کے قلعہ کو روانہ ہوا۔ راسیلاس نے بھی املاک کے ساتھ جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن شہزادی اور خود املاک نے اس بات کو پسند نہ کیا۔ جب املاک قلعہ میں پہونچا تو عرب سردار نے اپنی قوم کے دستور کے مطابق مہمان نوازی کے جملہ قواعد کا بالخصوص ایسے مہمان کا جو اپنے تئیں بالکل میزبان کے حوالے کر دے پورا لحاظ کیا۔ اور چند روز میں وہ پیکواہ اور اُس کی دونوں کنیزوں کو ساتھ لئے اپنے قلعہ سے چل پڑا۔ سفر چھوٹی چھوٹی منزلوں میں راحت و آرام سے کرنا شروع کیا اور چند روز میں وہ مقررہ موقع پر پہونچ گیا۔ یہاں جب وہ رقم جو فریقین میں قرار پائی تھی اُسے ادا کی گئی تو اُس نے نہایت تعظیم و ادب سے پیکواہ اور اُسکی دونوں کنیزوں کو راسیلاس کے حوالے کر دیا اور یہاں تک کہا کہ میں سب کو قاہرہ تک پہونچانے پر آمادہ ہوں تاکہ راستہ میں کوئی لٹیرا یا رہزن انکو نہ ستائے۔

شہزادی اور پیگواہ بہت خوش ہو کر گلے ملیں۔ جو خوشی ان دونوں کو اس وقت ہوئی تھی اُسے بیان کرنا مشکل ہے۔ دونوں کچھ دُور آگے چلی گئیں تاکہ محبت کے آنسو دونوں کی آنکھوں سے تنہائی میں جاری ہوں اور ایک کی مہر و محبت اور دوسرے کی شکر گزاری کا اظہار ہو۔ چند گھنٹے بعد وہ خانقاہ کے کنیسہ کے ایک کمرے ـــــ میں آکر بیٹھے اور پیگواہ نے اسقف اور قسیسوں کی موجودگی میں جو کچھ قید کے زمانے میں پیش آیا تھا بیان کرنا شروع کیا۔

اڑتیسواں باب

خاتون پیگواہ کی سرگزشت

"یہ تو آپ کے نوکروں نے آپ سے کہا ہوگا کہ کب اور کس طرح قزاق ہمیں پکڑلے گئے۔ یہ سانحہ ایسا یکایک پیش آیا کہ رنج و خوف تو کجا سرے سے ہوش و حواس ہی بجا نہ رہے اور اس بھاگڑ میں جبکہ تُرکی سوار قزاقوں کا پیچھا کرتے تھے دماغ کو اور پریشان کر رکھا تھا۔ جب یہ تُرکی سوار عرب رہزنوں کو گرفتار کرنے سے ناامید ہوئے تو جنہیں اب تک وہ ڈرانا دھمکانا چاہتے تھے وہی خوف ان سے ڈرنے لگے۔

جب عربوں نے دیکھا کہ تُرکوں کا خطرہ نہیں رہا تو انہوں نے بھاگنے میں رفتار ہلکی کر دی۔ شدت سے بھاگ دوڑ میں جب جسمانی اذیت کم ہوئی تو پھر دل میں ایک بیقراری اور بے چینی محسوس ہوئی۔ کچھ دیر بعد ہم ایک پُر فضا میدان میں ایک چشمے کے قریب جہاں درختوں کا خوب سایہ تھا ٹھہرے۔ یہاں ہم گھوڑوں سے اتار کر زمین پر بٹھائے گئے۔ قزاقوں نے کچھ کھانا نکالا اور جو کچھ وہ خود کھاتے تھے ہمیں بھی پیش کیا۔ مجھے میری کنیزوں سے الگ بٹھایا گیا تھا۔ کسی قزاق نے نہ ہماری تسلی کی اور نہ توہین۔ اب مجھے اپنی مصیبت کا پورا اندازہ ہوا۔ میری کنیزیں بھی مجھ سے دور بیٹھی چپکے چپکے روتی رہیں اور دلاسے کے لئے میری طرف مڑ مڑ کر دیکھتی تھیں۔ ہمیں کچھ علم نہ تھا کہ خدا جانے ہماری کیا گت ہونے والی ہے۔ اور نہ یہ سمجھ میں آتا تھا کہ کہاں لیجاکر یہ قزاق ہمیں قید کریں گے۔ اور پھر حالتِ اسیری سے رہائی کی کیا صورت ہوگی۔ اور میرے لئے اس امر کے فرض کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ ان قزاقوں کا رحم ان کے انصاف سے زیادہ ہوگا یا یہ کہ جوش ہوا و ہوس میں یا طیش جور و جفا میں وہ ہمارے ساتھ کیا کچھ نہ کر بیٹھیں گے۔ بہرکیف میں نے اپنی کنیزوں کو پیار کیا اور یہ کہکر انہیں تسلی دی کہ اب تک تو ان قزاقوں کا برتاؤ ہمارے ساتھ اچھا ہے، اور چونکہ اب ہم ترکوں سے جو ہمارے تعاقب میں تھے دُور نکل آئے ہیں اس لئے قزاقوں کے ہاتھ سے مارے جانے کا خوف نہیں رہا ہے۔

جب ہم پھر آگے جانے کیلئے گھوڑوں پر سوار کئے جانے لگے تو میری کنیزیں مجھے لپٹ گئیں۔ کسی طرح چھوڑتی نہ تھیں۔ میں نے انہیں حکم دیا کہ دیکھو جن کے قبضے میں ہم ہیں انہیں غصہ نہ دلاؤ۔ اب جتنا دن باقی تھا اس میں ہم ایسے ملک میں گزرتے رہے جو غیر آباد تھا اور جس میں کوئی راستہ تھا نہ سڑک۔ رات ہوئے جب چاندنی نکلی تو ہم ایک پہاڑی کے پہلو میں پہونچے۔ یہاں قزاقوں کے اس گروہ کے باقی لوگ ٹھہرے ہوئے تھے۔ جو قزاق ہمارے ساتھ تھے اُن کے خیمے نصب ہوئے اور آگ جلائی گئی۔ عرب سردار جو ہمارے ساتھ تھا اُس کی تعظیم ماتحتوں نے جنہیں اپنے سردار سے بہت محبت تھی، نہایت ادب سے کی۔

اب ہمیں ایک بڑے خیمے میں لایا گیا۔ یہاں ہم نے دیکھا کہ کچھ عورتیں بھی موجود ہیں جو اپنے شوہروں کے ساتھ اس دھاوے میں آئی ہوئی تھیں۔

اِن عورتوں نے ہمارے سامنے کھانا رکھا جو اُنہوں نے تیار کیا تھا۔ میں نے جو کچھ کھایا وہ بُھوک سے نہ تھا بلکہ محض اس لئے تھا کہ میری کنیزیں کچھ کھالیں۔ جب کھانا ہٹا دیا گیا تو سونے کے لئے قالین بچھائے گئے۔ میں تھکی ہوئی تھی اور سمجھی کہ شاید نیند آجائے جو انسان کو ہر تکلیف سے چندے راحت بخشتی ہے اور فطرت اپنے اِس عطیہ سے کسی سے دریغ نہیں کرتی۔ کپڑے بدلنے کو میں نے اپنی کنیزوں کو پاس بُلایا۔ اُس وقت خیمے میں جتنی عورتیں تھیں وہ مجھے غور سے دیکھنے لگیں۔ جب کنیزوں نے میری اُوپر کی عبا اُتاری تو اندر کے پُرتکلف لباس کو دیکھکر یہ عورتیں حیران رہ گئیں۔ ایک عورت قریب آئی اور اُس نے میری صدری کے کارچوبی کام کو ہاتھ لگاکر دیکھا۔ اسکے بعد یہ عورت چلی گئی۔ اب ایک عورت اور آئی جس کی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ درجے میں اونچی اور دوسروں پر اختیار اور حکومت رکھتی تھی۔ اِس نے سامنے آتے ہی مجھے بہت جُھک کر سلام کیا اور میرا ہاتھ پکڑکر مجھے ایک چھوٹے سے خیمے میں لائی۔ یہاں قالین اعلٰی درجے کے بچھے تھے۔

یہاں میں نے امن وعافیت سے اپنی کنیزوں کے ساتھ رات بسر کی۔

صبح میں گھاس کے تختے پر بیٹھی تھی کہ عرب سردار میری طرف آیا۔ جب وہ قریب آیا تو میں کھڑی ہوگئی۔ اُس نے بہت جُھک کر مجھے تعظیم دی اور کہا "اے خاتونِ عالی نسب۔ میری تقدیر اس سے بڑھکر نکلی جتنا کہ میں اُسے خیال کرتا تھا۔ میری عورتوں نے مجھے اطلاع دی ہے کہ میرے خیمہ گاہ میں ایک شہزادی رونق افروز ہے"

اِتنا سُنکر میں نے کہا "جناب آپ کی عورتوں نے خود دھوکا کھایا اور آپ کو دھوکا دیا ہے۔ میں کہیں کی شہزادی نہیں ہوں، بلکہ اِس ملک میں ایک بدقسمت اجنبی ہوں۔ میں اِس ملک میں نووارد تھی اور یہاں سے جلد جانا چاہتی تھی۔ لیکن قسمت میں یہ لکھا تھا کہ اِسی مُلک میں ہمیشہ اسیر رہوں"

عرب سردار بولا "جو کچھ بھی آپ ہوں مگر آپ کے اور آپکے نوکروں کے لباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا مرتبہ بڑا ہے۔ اور آپ بڑی دولتمند ہیں۔ جب آپ قید سے رہائی کے لئے رقم ادا کرسکتی ہیں تو پھر آپ اِس خیال میں کیوں جائیں کہ آپ اِس مُلک میں ہمیشہ قید رہیں گی۔ میرے اِن دھاووں اور دھاڑوں کا مقصد صرف اِتنا ہوتا ہے کہ میری دولت بڑھے، بلکہ سچ پوچھئے تو میری اِس لُوٹ مار کا مقصد مُلک سے خراج وصول کرنا ہے۔ ہم فرزندانِ اسمٰعیل براعظم کے اس حصّے کے قُدرتی اور موروثی مالک چلے آتے ہیں لیکن کچھ زمانے سے بدنسل بادشاہوں اور فوج کشوں نے اُس پر اپنا قبضہ جمالیا ہے۔ پس ہم ابنائے اسمٰعیل تلوار کے زور سے وہ چیز حاصل کرتے ہیں جو انصاف کے ذریعے ہمیں نہیں دی جاتی۔ لڑائی کے گھمسان میں کسی چیز میں تمیز نہیں رہتی۔ وہ برچھا جو مجرم اور طاقتور کے لئے اُٹھایا جاتا ہے ممکن ہے کہ وہ کسی بے گناہ کمزور شریف کو زخمی کرے"

اس پر میں نے کہا "کل جب میں گرفتار ہوئی تھی تو کیسے خبر تھی کہ یہ برچھا مجھی کو گھائل کریگا"

عرب سردار بولا "آفت اور مُصیبت کا انسان کو ہر وقت منتظر رہنا چاہیئے۔ اگر چشمِ عداوت دوسروں کا لحاظ یا اُن پر رحم کرنا سیکھ لے تو پھر آپ جیسا معزز اور عالی منصب ہر آفت اور نقصان سے محفوظ رہے۔ لیکن درد وعذاب کے فرشتے اپنے تیز چنگل نیکوں اور شریروں، زبردستوں اور زیردستوں پر یکساں طریقے سے چلاتے ہیں۔ آپ ہرگز سراسیمہ یا پریشان خاطر نہ رہیں۔ میں صحرا کے ظالم وجفاکار قزاقوں میں نہیں ہوں۔ میں شائستہ اور مہذب زندگی کے طور طریقوں سے واقف ہوں۔ میں آپ کی رہائی کے لئے ایک رقم کا تعین کردونگا اور قاصد کو پروانۂ راہ داری دیکر آپ کے عزیزوں کے پاس روانہ کردونگا تاکہ وہ بحفاظت اُن تک پہونچ جائے، اور جو عہد وپیمان ہوگا اُسکا

ٹھیک وقت پر پابند رہونگا"

آپ آسانی سے باور کرسکتے ہیں کہ اس قزاق کی خوش کلامی اور حُسنِ اخلاق سے کس درجہ مجھے خوشی ہوئی۔ اور یہ معلوم کرکے کہ اس قزاق کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد کسبِ زر ہے میں اپنے خطرے کو کتنا کم سمجھنے لگی۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ بھاری سے بھاری رقم بھی اتنی نہ ہوگی جو پیکواہ کی رہائی کے لئے نہ دی جاسکے۔ میں نے عرب سردار سے کہا کہ "اگر آپ نے میرے ساتھ اچھا برتاؤ رکھا اور میری رہائی کیلئے صرف ایسی رقم تجویز کی جو ایک معمولی درجہ کی خاتون کے لئے ادا کی جاسکے اور آپ نے مجھے کہیں کی شہزادی سمجھ کر کسی بھاری رقم کے تجویز کرنے پر اصرار نہ کیا تو پھر آپ کو میری جانب سے ناحسانمندی کی شکایت ہرگز نہیں ہوگی"

عرب سردار نے اتنا سُنکر کہا "میں رقم کے متعلق پھر غور کرکے بتاؤنگا" اتنا کہکر اُس نے جھُک کر تعظیم دی اور مُسکراتا ہوا چلا گیا۔

اب عورتیں میرے قریب آئیں اور ان میں ہر ایک نے دوسرے سے میرا ادب و لحاظ کرنے میں سبقت لے جانی چاہی۔ میری کنیزوں کے ساتھ بھی وہ ادب سے پیش آئیں۔ اب ہم سب چھوٹی چھوٹی منزلیں طے کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ چوتھے دن عرب سردار آیا اور کہا کہ میری رہائی کی رقم پانسو تولے سونا ہوگا۔ میں نے اس رقم کے ادا کرنے کا وعدہ ہی نہ کیا بلکہ کہا کہ اگر میری کنیزوں کے ساتھ اچھا سُلوک رہا تو میں پچھتر تولے سونا اور اس رقم کے ساتھ دونگی۔

اس سے پہلے میں زر کی طاقت سے واقف نہ تھی۔ یہ سمجھئے کہ اس وقت سے میں قزاقوں کی سردار بن گئی۔ یہ بات کہ کس دن کم یا زیادہ کتنی مسافت طے کی جائے گی یا خیمے کہاں نصب کئے جائیں گے میری مرضی پر موقوف کردی گئی۔ اب ہمارے لئے اونٹ اور دیگر ذرائع آسانی سے سفر کرنے کے مُہیا کردئے گئے۔ اب میری کنیزیں ہر وقت میری خدمت کے لئے میرے پاس رکھی جاتی تھیں۔ اور میں ان صحرائی قوموں کے رسم و رواج، طور طریقوں کو دیکھکر اُن پر غور کیا کرتی تھی۔ راستے میں قدیم عالیشان عمارتیں شکستہ حال نظر آئیں۔ کسی زمانے میں ان عمارتوں سے اس ویران مُلک کی زیب و زینت تھی۔

قزاقوں کا یہ سردار ناخواندہ نہ تھا۔ ستاروں اور قُطب نُما کو دیکھکر سفر کرتا تھا۔ تاخت و تاراج کے معرکوں میں اُس نے ایسے مقامات کو غور سے دیکھ رکھا تھا جو مُسافروں کے لئے قابلِ دید ہوں۔ ایک دن کہنے لگا کہ ایسے مقامات کی عمارتیں جہاں انسان کی آمد و رفت کم ہو یا جہاں تک اُس کی رسائی مشکل ہو، زیادہ محفوظ رہتی ہیں۔ کیونکہ جہاں کوئی مقام اپنی گزشتہ شان و عظمت سے گرنے لگے اور وہاں زیادہ باشندوں کی سکونت باقی رہی تو پھر یہ لوگ پُرانی شکستہ عمارتوں کو غارت کرنے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ٹوٹی دیواروں کے پتھر چُننے کان سے پتھر نکالنے سے زیادہ آسان کام ہے۔ غرض اس طرح پُرانے عبادتخانوں اور پُرانے محلوں اور قصوروں کے پتھروں سے سنگِ خارہ کے اصطبل اور سنگِ ساق کے جھونپڑے بننے شروع ہوجاتے ہیں۔"

اُنتالیسواں باب

پیکواہ کی بقیہ سرگزشت

اس طریقے سے ہم کئی ہفتے تک سفر کرتے رہے۔ عرب سردار کہتا تھا کہ وہ میری سیر و تفریح کیلئے سفر کو بڑھا رہا ہے اور میں سمجھتی تھی کہ اپنی آسانی یا کسی خاص غرض سے ایسا کر رہا ہے۔ میں اپنا حال ایسا ظاہر کرتی تھی جس سے اطمینان معلوم ہو کیونکہ تکدر یا سراسیمگی ظاہر کرنا بیکار

تھا۔ اپنے تئیں مطمئن ظاہر کرنے کی کوشش نے ایک قسم کا سکون طبیعت میں پیدا کیا۔ لیکن دل ہر وقت نیکا یہ میں پڑا رہتا تھا۔ رات کی تکلیفیں دن کی تفریحوں سے بڑھی رہتی تھیں۔ میری کنیزوں نے اب اپنا سارا بوجھ مجھ پر ڈال دیا تھا۔ جب سے انہیں معلوم ہوا تھا کہ قزاق میرا ادب و لحاظ کرنے لگے ہیں وہ خوش رہنے لگی تھیں۔ میں بھی انہیں خوش دیکھکر خوش ہوتی تھی اور ان کے اطمینان سے میری جان میں جان آتی تھی۔ مجھے اب خوف نہیں رہا تھا کیونکہ میں جان گئی تھی کہ یہ عرب قزاق آوارہ گردی محض حصولِ زر کے لئے کرتے ہیں۔ طمع ایسا عیب ہے کہ اُس کے عمل میں ایک قسم کی یکسانی نرمی اور لوچ ہوتا ہے۔ باقی دماغی آزار مختلف طبیعتوں میں اُنکی ساخت کے مطابق مختلف ہوا کرتے ہیں۔ عیب جو ایک طبیعت قبول کر لیتی ہے اُسی کو دوسری طبیعت قبول نہیں کرتی۔ لیکن طامع اور لالچی کو متوجہ کرنیکا اس طریقے کے سوا دوسرا نہیں کہ "روپیہ لاؤ۔ پھر کسی بات سے انکار نہیں"

آخرکار ہم سردار کے مسکن تک پہونچ گئے۔ یہ ایک مضبوط عالیشان سنگین قصر تھا جو دریائے نیل کے ایک ٹاپو میں بنا تھا۔ سردار نے مجھ سے کہا کہ "اے خاتونِ عالی وقار، اس سفرِ دراز کے بعد آپ چند ہفتے یہاں آرام فرمائیں اور حضور اپنے کو اس جگہ کا بادشاہ اور مالک سمجھیں۔ چونکہ میرا پیشہ لڑنا اور لوٹنا ہے اس لئے میں نے یہ گمنام جگہ اپنی سکونت کے لئے پسند کی ہے۔ یہیں سے میں تاخت و تاراج کے لئے اُٹھتا ہوں اور یہیں پیشتر اس سے کہ دشمن میرا پیچھا کر سکے واپس آجاتا ہوں۔ آپ یہاں امن و عافیت کے ساتھ آرام سے رہیں۔ یہاں گو مسرت و تفریح کا سامان کم ہے لیکن خوف یا خطرہ مطلق نہیں۔" اب یہ سردار میرے ساتھ قصر کے اندر کے کمروں میں آیا اور ایک پُر تکلف کوچ پر اس نے مجھے بٹھا دیا۔ اور پھر زمین تک جھک کر مجھے تعظیم دی اور چلا گیا۔ سردار کی عورتوں نے سمجھا کہ میں اُن کی حریف یا رقیب ہوں اور وہ مجھے بغض و حسد کی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ لیکن انہیں جلد معلوم ہو گیا کہ میں کوئی بڑی امیرزادی ہوں اور زرِ فدیہ ادا ہونے تک یہاں نظربند رہوں۔ پھر یہی عورتیں میری خاطر و مدارات میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگیں۔

جلد رہائی کا یقین دلا کر میری تسلی و تشفی کی گئی۔ نئی جگہ تھی، نئی نئی چیزوں کے دیکھنے کی مصروفیت نے دل کی بیقراری میں کمی کی، قصر میں کئی اونچے اونچے برج تھے۔ یہ اتنے بلند تھے کہ جب میں اُن کے اوپر پہونچی تو بہت دور دور کی چیزیں نظر آنے لگیں اور رودِ نیل کے پیچ و خم خوب دکھائی دیتے تھے۔ آفتاب جیسے جیسے بلند ہو کر اپنے نور سے رونق بخشتا میں بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی۔ یہاں بہت سی چیزیں میں نے بھی دیکھیں جو میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں۔ نہنگ، مگرمچھ، دریائی گھوڑے دیکھنے میں آئے۔ اس ویران ملک میں یہ جانور بکثرت تھے۔ میں انہیں ڈرتے ڈرتے دیکھتی تھی گو میں جانتی تھی کہ وہ آزار دہ نہیں ہیں۔ مجھے توقع تھی کہ میں اُن عجیب و غریب عورتوں اور مردوں کو بھی دیکھوں گی جن کے اوپر کے دھڑ انسان کے سے اور نیچے کے دھڑ مچھلی کے سے ہوتے ہیں اور دُم میں مڑی ہوتی ہیں۔ ایک مرتبہ املاک نے کہا تھا کہ یورپ کے سیاحوں نے ان نواح کو ایسی ہی عجیب و غریب مخلوقات سے آباد بتایا تھا۔ لیکن یہ عجیب شکل کی مخلوق مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ جب میں نے عرب سردار سے انکے بارے میں دریافت کیا تو میری سہل اعتقادی پر وہ ہنسا۔

رات کے وقت جب میں ایک بلند برج میں جا بیٹھتی جو مشاہداتِ فلک کے لئے مخصوص تھا تو یہ عرب مجھے ستاروں کے نام اور اُنکی گردشوں کے راستے بتاتا۔ اس سردار کو نجوم کا بہت شوق تھا مگر میری طبیعت اس طرف راغب نہ تھی۔ لیکن جو کچھ وہ بتاتا تھا ناچار دیکھنا پڑتا تھا۔ اس کی باتیں میں بظاہر توجہ سے سنتی تھی تاکہ وہ خوش ہو، مگر واقعہ یہ تھا کہ یہ قزاق علم نجوم کا بڑا ماہر تھا۔ جہاں ہمیشہ ایک ہی سی چیزوں

کو دن رات دیکھتے دیکھتے جی اکتا گیا ہو وہاں چند روز میں یہ اختر شماری کا شغل اچھا معلوم ہونے لگا۔ صبح اٹھتے ہی وہی چیزیں نظر آتی تھیں جنہیں دیکھتے دیکھتے کل شام آئی تھی۔ پس بجائے اس کے کہ کچھ نہ کرتی ستاروں کا مشاہدہ غنیمت سمجھا۔ لیکن کبھی پوری توجہ اُس طرف نہ ہوتی۔ میرا دل ہر وقت نیکایہ میں پڑا رہتا۔ دیکھنے والے سمجھتے کہ میں مُطالعہ افلاک میں مُنہمک ہوں۔ چند روز کے بعد سردار مع اپنے قزاقوں کے کہیں لوٹ مار کرنے روانہ ہوا۔ اب میرا شغل یہی تھا کہ اپنی کنیزوں میں بیٹھی اس واقعہ کا تذکرہ بار بار کیا کروں جس میں میری اور میری کنیزوں کی گرفتاری پیش آئی تھی۔ اور یہ کہ جب اس قید سے رہائی ہوگی تو کیسی خوشی ہوگی۔"

پیکواہ کی سرگزشت یہانتک سُنکر نیکایہ بولی "اس عرب سردار کے قلعے میں عورتیں بھی تو تھیں۔ تم نے اُن سے دوستی کر کے اُن کی باتوں سے کیوں جی نہ بہلایا اور اُن کی تفریحوں میں کیوں شرکت نہ کی؟ جہاں اُن کے کھیل تماشے ہوتے تم بھی وہاں جاتیں۔ خالی بیٹھی غم میں کیوں جان گھُلایا کیں۔ چند روز کے لئے تم بھی وہی باتیں برداشت کر لیتیں جو اِن غریب عورتوں کو عمر بھر برداشت کرنی پڑتی تھیں۔"

پیکواہ نے جواب دیا "ان عورتوں کی تفریحیں اور کھیل تو بچوں کے سے کھیل تماشے تھے۔ جو طبیعتیں زیادہ اہم اور خطیر معاملات میں مصروف رہنے کی عادت رکھتی ہیں وہ ایسی خفیف اور سُبک باتوں میں لُطف نہیں اُٹھا سکتیں۔ میں بھی اگر مذاقِ سلیم کو دُور رکھ کر محض حواسِ خمسہ سے کام لیتی تو اِن سب تفریحوں میں شریک ہو سکتی تھی جن سے یہ عورتیں خوش ہوتی تھیں۔ مگر یہاں تو دل و دماغ سب پرواز کر کے قاہرہ میں جا بسے تھے۔ یہ عورتیں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں ایسی دوڑتی پھرتی تھیں جیسے پرندہ اپنے پنجرے میں ایک تار سے اُڑ کر دوسرے تار پر جا بیٹھے۔ ان کے ناچ محض جسم کو حرکت دینے کے لئے ہوتے تھے۔ اور ناچنے میں وہ اس طرح اُچھلتی کودتی تھیں جیسے گھاس کے تختے پر بھیڑ کے بچے پھُدکتے پھریں۔ اس میں کوئی جھوٹ مُوٹ چوٹ کھا کر گرتی ہے کہ باقی سہیلیاں ڈر جائیں۔ کوئی کہیں چھپ جاتی ہے کہ ساتھ والیاں ڈھونڈتی پھریں۔ ان کا کچھ وقت اس میں گزرتا تھا کہ دریا میں جو ہلکی چیزیں بہتی نظر آئیں انہیں یا آسمان پر بادل جو مختلف شکلیں بناتے ہیں اُنہیں غور سے دیکھا کریں۔

ان عورتوں کا شغل زیادہ تر کاڑھنا سینا پرونا ہوتا ہے۔ اس میں میں خود اور میری باندیاں اُن کی مدد کر دیتی تھیں۔ لیکن آپ جانتی ہیں کہ جب دل ٹھکانے نہ ہو تو پھر وہ انگلیوں کو کب ٹھیک چلنے دیتا ہے۔ اور یہ بھی آپ خیال فرما سکتی ہیں کہ حالتِ اسیری اور نیکایہ کی عدم موجودگی میں ریشم کے پھُول کاڑھنے کب دل کو تسکین دے سکتے تھے۔ اور نہ اِن عورتوں کی باتوں میں جی لگ سکتا تھا۔ پھر ان سے کس قسم کی گفتگو کی میں توقع کر سکتی تھی۔ دُنیا اُنہوں نے دیکھی نہ تھی۔ ابتدائے جوانی سے اِسی تنگ جگہ میں وہ مُقیّد چلی آتی تھیں۔ جو چیزیں کبھی اُن کی نظر ہی سے نہ گزری ہوں اُن کا علم اُنہیں کیا ہو سکتا تھا۔ پڑھنا اُنہیں آتا نہ تھا۔ بجز چند چیزوں کے جو اُن کے سامنے رہتی تھیں اور کسی چیز کا خیال یا تصوّر اُن کے ذہن میں نہ تھا۔ انہیں سوائے گھر میں برتنے کی چیزوں کے کسی چیز کا نام تک معلوم نہ تھا۔ چونکہ قابلیت میں میں اُن سے زیادہ تھی اِس لئے اُن کے آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ کیا کرتی تھی۔ اور اپنے فیصلوں میں میں حق و انصاف کو ہمیشہ مدِّ نظر رکھتی تھی۔ اگر میں اس طرف متوجّہ ہوتی کہ ہر عورت کی شکایت جو وہ باقی سب عورتوں کے ساتھ رکھتی تھی سُنا کرتی تو سوائے اس کے کچھ نہ ہوتا کہ طول طویل قصّوں اور داستانوں کے سُننے میں اپنا وقت ضائع کرتی۔"

راسیلاس نے پیکواہ سے دریافت کیا کہ جب آپ کہتی ہیں کہ قزاقوں کا سردار بڑا لائق پڑھا لکھا آدمی تھا تو پھر اپنے حرم سرائے میں بیٹھکر

ایسی عورتوں سے جیساکہ آپ نے نہیں بیان کیا ہے کیا لطف یا حظ اُٹھا سکتا تھا۔ کیا یہ عورتیں حد سے زیادہ حسین تھیں؟"

پیکواہ نے جواب دیا "اُن میں بھی ایسے بلا تاثیر حُسنِ غیر شریفانہ کی کمی نہیں ہے جس میں نہ بشاشت ہوتی ہے نہ عالی ظرفی جو خیال کی رفعت اور نیکی کے جوہر سے معرا ہوتا ہے۔ یہ حُسن ایک عرب کے لئے ایسا پھول ہوتا ہے جسے وہ اُٹھا تو لیتا ہے لیکن پھر اُسے توڑ مروڑ کر بے پروائی سے پھینک دیتا ہے۔ جو مسرت وہ اپنی عورتوں میں حاصل کرتا ہے وہ اس معاشرت کی مسرت نہیں ہوتی جس میں عشق و محبت کا رنگ تیز ہو۔ جب یہ عورتیں اس کے گرد اُچھلتی کودتی ہیں تو وہ اُن کی طرف اس طرح دیکھتا ہے جیسے کوئی اُن سے اعلیٰ شخص بغیر توجہ کے کسی طرف دیکھے۔ جب وہ آپس میں رقیب بنکر اُسے اپنی طرف مائل کرنا چاہتی ہیں تو وہ متنفر ہوکر اُن کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے۔ چونکہ اُن میں تمیز کرنے یا انتخابِ نیک کی قابلیت نہیں ہوتی اِس لئے اُن کی سچی یا جھوٹی محبت مرد میں تفاخر پیدا کرسکتی ہے اور نہ کسی قسم کی منت گزاری۔ ایسی عورت کے تبسم سے جس نے کبھی دوسرے مرد کو نہیں دیکھا ہے مرد کے دل میں خود اُس کی قدر نہیں بڑھتی اور نہ وہ اس عورت کی قدر شناسی اور توجہ کا ممنون ہوتا ہے کیونکہ اِس توجہ کے متعلق اُسے علم نہیں ہوتا کہ وہ سچے دل سے کی گئی ہے، اور جسے وہ جانتا ہے کہ اس کے خوش کرنے کے لئے وہ اتنی نہیں ہے جس قدر کہ رقیب کی دل آزاری کے لئے ہے۔ جو عشق بطور تحفے کے پیش کیا گیا اور وہ قبول بھی ہوگیا تو ایسے عشق کو فضول اور زائد وقت کا بیکار مصرف سمجھنا چاہیئے۔ اب عشق جو مرد اُس سے کرے جس سے اُسے نفرت ہو تو پھر یہ عشق وہ ہوتا ہے جس میں نہ اُمید ہو نہ خوف، نہ مسرت ہو نہ رنج۔"

املاک بولا "خاتون پیکواہ، آپ اپنے تئیں خوش قسمت سمجھیں کہ کتنی آسانی سے آپ وہاں سے رخصت کردی گئیں۔ جہاں دماغی اوصافِ حسنہ کا قحط ہو اور وہاں ایک ایسا شخص بھی ہو جو علم کا بھوکا ہو تو پھر یہ مشکل تھا کہ وہ پیکواہ کی ضیافتِ تقریر سے محروم رہ جاتا۔"

پیکواہ بولی "میں اِس امر کے باور کرنے کی طرف مائل ہوں کہ یہ عرب سردار باوجود اپنے قول و اقرار کے جب کبھی میں کوئی قاصد قاہرہ بھیجنا چاہتی تھی تو اُسے تامل ہوتا اور کوئی نہ کوئی حیلہ یا بہانہ تاخیر کا نکالا کرتا۔ جب تک میں اِس سردار کے قلعہ میں رہی کئی مرتبہ قرب و جوار میں لوٹ مار کی غرض سے وہ گیا۔ اگر اِن دھاڑوں میں اُسے دل خواہ مال مل جاتا تو ممکن تھا کہ وہ مجھے رہا کرنے سے انکار کر دیتا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تھا کہ جب وہ مُہم سے واپس آتا تو مجھ سے نہایت اخلاق سے پیش آتا۔ مُہم کے حالات میرے سامنے بیان کرتا۔ اور جو کچھ میں کہتی اُسے غور سے سنتا اور کوشش کرتا کہ علمِ نجوم میں میری مہارت ترقی کرے۔ اور جب کبھی میں اصرار کرتی کہ میرے خطوط جلد روانہ کر دئے جائیں تو وہ نہایت اخلاق کے ساتھ میری تسلی کرتا اور جب سمجھتا کہ میری درخواست کا قبول کرنا اخلاق کے ساتھ ممکن نہیں تو پھر اپنے غول کو لیکر کسی طرف روانہ ہوجاتا۔ میں اِس کی اس عمداً تاخیر سے سخت پریشان تھی۔ اور کبھی کبھی مجھے خوف ہوتا تھا کہ آپ سب مجھے بھول گئے ہیں اور کیا عجب ہے کہ قاہرہ سے بھی روانہ ہوجائیں اور مجھکو نیل کے اس ٹاپو میں ہمیشہ کے لئے چھوڑ جائیں۔

آخر کار نا اُمید ہوکر پریشان حال رہنے لگی۔ اور اب اس عرب سردار سے باتیں کرنے سے مجھے بیزاری ہوئی۔ کچھ زمانے سے وہ میری کنیزوں سے زیادہ بات چیت کرنے لگا تھا لیکن اگر وہ مجھ سے یا میری کنیزوں سے اظہارِ عشق کرتا تو نتیجہ غالباً مُہلک ہوتا۔ اب میں اُس کی ملاقات اور دوستی کے بڑھنے سے خوش نہ ہوتی تھی۔ مگر میری یہ پریشانی زیادہ دن تک نہ رہی۔ جب میں پھر کسی قدر بشاش رہنے لگی تو اُس نے پھر میرے پاس آنا شروع کیا۔ مجھے اب پھر پہلی سی پریشانی اور نفرت محسوس ہوئی۔

میری رہائی کے لیے جو رقم اُس نے مقرر کی تھی اُس کے منگوانے میں وہ دیر لگاتا رہا اور کیا عجب تھا کہ وہ اس کام کے لئے بہانا ادم کبھی نچنتہ نہ کرتا۔ مگر اسی زمانے میں آپ کا قاصد پہونچا۔ سونا جو اِس سردار کو کبھی اتنا لوٹ مار میں میسر نہ ہوتا جب اُسے پیش کیا گیا تو پھر اُسے قبول کرنے سے انکار نہ بنا پڑا۔ اب اُس نے بہت جلد ہمارے سفر کا سامان کیا۔ اس وقت اُس کی حالت ایسی تھی جیسے کوئی ہر وقت کے درد سے شفا پا جائے۔ اب میں قلعہ میں جو لوگ رہتے تھے اُن سے رخصت ہوئی اور اُن سب نے بالکل بے پروائی کے ساتھ مجھے الوداع کہا۔"

نیکایہ نے جب اپنی سہیلی کی سرگزشت سُن لی تو کھڑی ہوئی اور پیکواہ کو گلے سے لگایا۔ رانیلاس نے ڈیڑھ سو تولے سونا پیکواہ کو دیا۔ پیکواہ نے اس میں سے پچھتر تولے سونا حسبِ وعدہ قزاقوں کے سردار کو دیا۔

(باقی آئندہ)

عنایت اللہ۔

طلسمِ گفتار

ذرا پینے دے پیکر دو گھڑی آرام کرنے دے
کسی صورت علاجِ گردشِ ایام کرنے دے

دُعاؤں سے خدا کو دام میں تو لا چکا زاہد
مجھے آہوں سے کچھ اندازہ اصنام کرنے دے

سُنا ہے عرصہ یک گام ہیں اے عشق! دو عالم
چل آ ہم کو بھی سیرِ عرصہ یک گام کرنے دے

مجھے بدنام کرتے ہیں دل میں جو مسرور رہتے ہیں
انہیں مسرور ہونے دے انہیں یہ کام کرنے دے

بہت تنگ آ گیا ہوں سُود مندانہ تفکر سے
ذرا اے عقل اب کوئی خیالِ خام کرنے دے

عدم الزامِ ناحق زندگی کا میں سہوں کب تک
مجھے مرنے دے ردِ تہمت و الزام کرنے دے

عدم

"مُرغِ اسیر"

کُنجِ قفس میں نغمۂ بُلبُل بدل گیا
وہ دن گئے کہ مُنہ میں جو آیا نکل گیا
تاثیرِ آب و دانۂ صیاد دیکھئے
پنجرہ ذرا ہوا سے ہلا دل دہل گیا

۲

وہ دن بھی تھے کہ اپنا نشیمن چمن میں تھا
ذکرِ حسین لالہ و گل انجمن میں تھا
پابندیاں کہاں تھیں مرے عرضِ حال پر
جو دل میں تھا نہاں وہی پیدا سخن میں تھا

۳

بے بس ہی ہو گئی ہے اسیری میں جانِ شوخ
پنجرے میں کٹ گئی ہے چمن کی زبانِ شوخ
اب تو نوائے درد ہے یا آہِ سرد ہے
گلشن میں بھول آئے ہیں گویا زبانِ شوخ

۴

پھنس کر کھلا کہ خود کششِ دانہ دام تھی
گویا کسی کے ہاتھ میں اپنی لگام تھی
مانوس جس نے مجھکو اسیری میں کر دیا
تھی کچھ تو حرص کچھ ہوسِ ننگ و نام تھی

امین حزیں سیالکوٹی

بوستانِ خیال

نثر اور نظم کے فرق کو سب جانتے ہیں، اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ شاعری کا انحصار اکثر نظم میں ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگ شاعری اور نظم دونوں کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہماری زبان میں انگریزی لفظ پوئٹری (Poetry) کے مانند کوئی ایک لفظ ایسا موجود نہیں جس سے وہ سب معنی پیدا ہو سکیں جو اس انگریزی لفظ میں موجود ہیں لیکن اُس سے کچھ ملتا جلتا اگر کوئی لفظ ہے تو شاعری ہے اور جس طرح پوئٹری کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس کا انحصار نظم یا کلام موزوں ہی میں ہو اسی طرح میں بھی یہ کہہ سکتا ہوں کہ شاعری نظم اور نثر دونوں میں ہو سکتی ہے۔ شاعری یعنی پوئٹری کی مشرق و مغرب میں بہت سی منطقی تعریفات پیش کی گئی ہیں لیکن ان میں کسی پر بھی ادیبوں اور عالموں کا اتفاق رائے نہیں ہو سکا۔ غالباً اس میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں ہوگا کہ شاعری یا شاعرانہ خیالات کی پیداوار انسان کے ذہن یا دماغ کے اُس حصّہ سے تعلق رکھتی ہے جسکو تصوّر یا تخیل کہتے ہیں اور جو واقعات کی دُنیا سے الگ ہو کر بھی اپنا کام جاری رکھ سکتا ہے۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے اپنی آنکھوں کے سامنے کی چیزوں سے اپنی توجہ کو ہٹا لیں اور اپنے خیالات کو آزاد چھوڑ دیں تو ہمارا دماغ بالکل خالی نہیں ہو جاتا بلکہ وہ بہت سی ایسی صورتیں ہماری آنکھوں کے آگے لاکر کھڑی کر دیتا ہے جن کا اُس وقت ہم کو کوئی خیال بھی نہیں ہوتا۔ اس طرح سونے میں جب جسم کی کھڑکیاں اور دروازے یعنی حواس تقریباً بند ہو جاتے ہیں۔ دماغ کا یہ حصّہ برابر کام کرتا رہتا ہے اور ہم اچھے یا بُرے خواب دیکھتے رہتے ہیں جن میں سے بعض جاگنے کے بعد بھی یاد رہ جاتے ہیں۔ لیکن خواب خواہ سوتے میں دیکھے جائیں یا جاگتے میں ان میں کوئی ربط و سلسلہ نہیں ہوتا۔ ایک شکل دوسری شکل میں بدل جاتی ہے۔ آدمی شیر یا بھیڑیا بن جاتا ہے۔ جنگل دریا ہو جاتے ہیں۔ آگ اور پانی کی خاصیت میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ شاعری بھی اگرچہ اپنا سامان دماغ کے اسی حصّہ سے لیتی ہے جس سے خوابوں کی پیداوار ہوتی ہے۔ لیکن شاعری میں عقل اور حواس کو بھی دخل ہوتا ہے، اور انسان جتنا عقل کو اپنے معاملات میں دخیل کار بنانے کی طرف مائل ہوتا جاتا ہے اتنا ہی اس کی شاعری محض تصوّر اور تخیل سے زیادہ دُور اور منطق سے زیادہ قریب ہوتی جاتی ہے۔ خوش قسمتی سے ایشیائی اقوام نے کبھی منطق کو اپنا اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا اور باہر کے عجائبات کے مطالعہ میں کبھی ایسے غرق نہیں ہوئے کہ اپنے تصوّر کے عجائبات میں دلچسپی لینا چھوڑ دیتے۔ نہ صرف اُن کی شاعری بلکہ اُن کا مذہب اور فلسفہ بھی عقل اور منطق سے زیادہ ان کے تصوّر و تخیل پر بھروسہ کرتے رہتے ہیں یا شاید یہ کہنا چاہیئے کہ اُن کے مذہب اور فلسفہ کو ان کی شاعری سے الگ پہچاننا مشکل ہے کیونکہ جہاں تصوّر اور تخیل کام کرتے ہوئے نظر آئیں وہاں شاعری کا موجود ہونا لازمی ہے۔ جس شخص کو مشرقی شاعری کی بہار دیکھنی منظور ہو اُسکو صرف نظم ہی تک اپنی نگاہ کو محدود نہ رکھنا چاہیئے بلکہ نثر کی کتابوں کو بھی دیکھنا چاہیئے۔ خصوصاً قصّہ کہانی کی کتابیں جن کا اگرچہ بہت سا حصّہ نثر میں ہوتا ہے لیکن کہیں کہیں نظم کو بھی استعمال کیا جاتا ہے اور بعض داستانیں تو اوّل سے لیکر آخیر تک نظم ہی میں بیان کی جاتی ہیں۔ چونکہ اُردو نثر اُردو نظم کے مقابلہ میں کمسن اور ناتجربہ کار ہے۔ اُردو کے اکثر پُرانے قصّے نظم ہی میں لکھے گئے۔ اُن میں سے میر حسن دہلوی کی مثنوی

بے نظیر عرف بدرِ منیر اور پنڈت دیا شنکر لکھنوی کی گلزارِ نسیم عرف گل بکاؤلی کو سب سے زیادہ شہرت نصیب ہوئی۔ جب نثر میں قصہ لکھنے کا رواج شروع ہوا تب بعض لکھنے والوں نے یہ کوشش کی کہ اپنی نثر کو مقفی اور مسجع بنا کر جہاں تک ممکن ہو نظم کا رنگ پیدا کر دیں۔ اس قسم کی تحریر کا بہترین نمونہ مرزا رجب علی بیگ سرور کا فسانۂ عجائب ہے۔ اور اکثر اُردو داستانوں میں اس طرزِ تحریر کی تقلید کی گئی۔ چونکہ آج سے سوڈیڑھ سو سال پہلے چھپی ہوئی کتابیں کمیاب تھیں اور پڑھے لکھے آدمیوں کی بھی کمی تھی۔ قصے کہانیاں پڑھنے سے زیادہ سُننے کا رواج تھا۔ اور امیر و غریب۔ خواندہ ناخواندہ سب اس قسم کی دماغی تفریح کا تھوڑا بہت شوق رکھتے تھے۔ اسی شوق کی بدولت امرا کی سرپرستی میں ایک گروہ داستان گویوں کا پیدا ہو گیا تھا جنکو بہت سے قصے کہانیاں یاد ہوتی تھیں اور جو کسی کتاب کی مدد کے بغیر ان کو نہایت روانی سے بیان کرتے تھے۔ اُن لوگوں کا حافظہ اور زبان دونوں میں بلا کی تیزی تھی۔ اکثر پرانی داستانیں بہت پیچیدہ اور اُلجھی ہوئی ہیں لیکن اٹکنا یا بھولنا تو درکنار وہ ہر ایک داستان میں اپنی طرف سے نئے پیوند لگانے جاتے تھے اور جب کسی واقعہ یا منظر کی کیفیت بیان کرتے تھے تو اپنے بیان کو اس قدر پھیلاتے تھے کہ ایک داستان کئی کئی ہفتوں نہیں بلکہ کئی کئی مہینوں تک جاری رہتی تھی۔ اس دستور کا یہ نتیجہ ہوا کہ کسی داستان کا بہت طویل ہونا بھی ایک قسم کی خوبی سمجھی جانے لگی اور چونکہ اس وقت آسودہ حال لوگوں کو فرصت کی بھی کمی نہ تھی ایسی داستانوں کا سُننا اُن کا دلچسپ مشغلہ بن گیا۔ ممکن ہے کہ ہم اس مشغلہ کو وقت ضائع کرنے کا ایک موثر طریقہ خیال کریں لیکن ہم کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اُس وقت تھیٹر۔ سینما۔ ریڈیو۔ تفریح کے اور سامان موجود نہ تھے اور ان حالات میں کہانیاں کہنے اور سننے کے شوق کو مضر خیال کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ خالی وقت گذارنے کے لئے اور بہت سی تفریحات کے مقابلہ میں یہ شوق ایک بیضرر شوق تھا اور اسی شوق کی بدولت اُردو ادب میں چند ایسی نادر تصانیف کا اضافہ ہو گیا جن کا اُس کے بغیر موجود ہونا ممکن نہ تھا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جب ملک میں چھاپے کا عام رواج ہو گیا تو بعض باہمت مالکانِ مطابع نے ان داستانوں کو قلمی نسخوں سے ترتیب دیکر یا داستان گویوں کی زبان سے نقل کر کے چھپوانے کا اہتمام کیا اور اس طرح یہ ادب اور شاعری کے خزانے تلف ہونے سے بچ گئے۔

اس قسم کی داستانوں میں سب سے زیادہ مشہور و مقبول دو داستانیں ہیں۔ ایک داستان امیر حمزہ اور دوسری بوستانِ خیال۔ اُردو ناولوں کے رواج سے بیشتر اکثر اُردو خواندہ لوگوں کی دماغی تفریح کا وسیلہ یہی دو کتابیں تھیں، عوام اور کم تعلیم یافتہ آدمی داستان امیر حمزہ کو زیادہ پسند کرتے تھے لیکن ادبی اور علمی مذاق کے لوگوں میں بوستانِ خیال کا زیادہ چرچا تھا۔ دونوں کتابیں غیر معمولی ضخامت کی ہیں۔ امیر حمزہ کی داستان بیس پچیس موٹی موٹی جلدوں میں ہے۔ اور اگر اُن سب قصوں کو بھی ملا لیا جاتے جو مختلف داستان گویوں نے اپنی جدت و ذہانت سے تصنیف کر کے اس میں شامل کر دئے ہیں تو بلا مبالغہ ایک پوری الماری اس کی تمام جلدوں کے لئے درکار ہوتی ہے۔ بوستانِ خیال ضخامت میں داستان امیر حمزہ سے بہت کم ہے تو بھی اس کی نو جلدیں ہیں جن میں سے ہر ایک جلد چھ سات سو صفحہ کی ہے اور ہر ایک صفحہ تقریباً دو فٹ لمبا اور ایک فٹ چوڑا ہے۔ یہ تو ان عجیب و غریب کتابوں کی ظاہری شکل ہے۔ اُن کے مضمون و مطلب کو مختصر طور پر بیان کرنا ذرا مشکل کام ہے۔ داستان امیر حمزہ سے تو فی الحال ہمیں سروکار نہیں۔ بوستانِ خیال بظاہر ایک تاریخی قصہ ہے،

کیونکہ اس میں فاطمی خلافت افریقہ و مصر کے بانی عبداللہ المہدی اُن کی اولاد اور اُن کے سپہ سالاروں کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں، لیکن جن واقعات کا اُن میں ذکر کیا گیا ہے اُن کو صحیح تاریخی واقعات سے بہت کم واسطہ ہے۔ پہلی اور دوسری جلد میں مہدی کی فتوحات اور اُن کے بیٹے اور پوتے کی مہمات کا تذکرہ ہے اُن میں تاریخ کی کسی قدر جھلک نظر آتی ہے۔ تیسری جلد سے مہدی کے پڑپوتے معزالدین یعنی چوتھے فاطمی خلیفہ المعزالدین اللہ اور ملکہ شمسہ تاجدار کے عشق کی داستان شروع ہوتی ہے جس کو تاریخ سے کوئی علاقہ نہیں۔ معز شمسہ کی تلاش میں جاتے ہیں اور راستے میں بہت سے خطرات میں سے گذرتے ہیں اور بہت سے حریفوں کو زیر کرتے ہیں اور بھی بہت سے شاہ اور شاہزادے شمسہ کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اُن میں سب سے زبردست جمشید خود پرست ہے جسکو معز کا سب سے بڑا حریف خیال کرنا چاہیئے۔ معز اور شمسہ کی داستان کے ضمن میں ایک اور داستان شروع ہو جاتی ہے۔ یعنی ملکہ شمسہ تاجدار کے آبا و اجداد کی تاریخ اور آخر تک یہ دونوں داستانیں نہایت خوبصورتی سے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں یہاں تک کہ معز اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور ملکہ شمسہ سے ان کی شادی ہو جاتی ہے۔ اس مختصر سی کیفیت سے اُن عجیب و غریب باتوں کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا جسکو مصنف نے اپنی حیرت ناک قوت ایجاد اور بے نکان تخیل سے قصہ کی ترتیب میں جمع کر دیا ہے۔ لیکن اس سے اتنی بات ضرور معلوم ہو سکتی ہے کہ بوستانِ خیال اپنے مضمون کے لحاظ سے اُس قسم کا قصہ ہے جسے یورپین زبانوں میں ایپک کہتے ہیں۔ اور جسکو اُردو میں عموماً رزمیہ داستان کہا جاتا ہے ایسے قصوں کی دلچسپی زیادہ تر دو جذبات پر منحصر ہوتی ہے۔ عشق اور جنگ جوئی اور بوستانِ خیال میں بھی زیادہ تر انہیں دونوں باتوں کا ذکر ہے لیکن ان دو کے ساتھ ایک تیسری دلچسپ چیز بھی شامل ہے جسے عیاری کہنا چاہیئے کیونکہ ہر ایک جنگ جو کے ساتھ دو ایک عیار بھی رہتے ہیں جن کا کام جاسوسی کے علاوہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف بھیس بدل کر اور طرح طرح کے سوانگ بھر کر اپنے آقا کو دشمن پر غالب آنے میں مدد دیں اور جو کام زور و قوت سے نہ نکل سکے وہ تدبیر و حیلہ سے نکال دیں۔ چونکہ ایسے قصوں کے ہیرو کو بڑے بڑے سورماؤں اور پہلوانوں کے علاوہ ساحروں اور جادوگروں کا بھی مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ عیاروں کی امداد کے بغیر اس کا کامیاب ہونا ممکن نہیں اور اُن عیاروں کے مکر و فریب نہ صرف قصہ میں اس قسم کی دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں جو زمانہ حال کے سراغرسانی کے ناولوں میں پائی جاتی ہے بلکہ کچھ ہنسی مذاق کا بھی سامان مہیا کر دیتے ہیں جس سے اتنی طویل داستانوں کے پڑھنے کا بوجھ کسی قدر ہلکا ہو جاتا ہے۔

یوں تو بوستانِ خیال کے مصنف نے ہر ایک موقع کے بیان اور ہر ایک منظر کی کیفیت کو واضح کرنے میں اپنی جادو نگاری کا کافی ثبوت دیا ہے لیکن مختلف قسم کے طلسمات کی ترتیب میں اس کا زورِ قلم اور اُس کی ذہانت خاص طور پر نمایاں ہے۔ ہر ایک طلسم بجائے خود ایک ایسی خیالی دنیا ہے۔ جیسی بعض بہت بڑے شعرا مثلاً ڈینٹے اور ملٹن اپنے حسن تخیل سے پیدا کر سکتے ہیں یا جیسی بعض صوفیوں نے اپنے زبردست روحانی مکاشفہ سے ظاہر کی ہے لیکن اس بینائی دُنیا کی تعمیر محض خیالی بنیادوں پر نہیں ہوئی۔ بلکہ ہیئت۔ ہندسہ۔ نجوم۔ طبعیات۔ کیمیا اور علم حیوانات کے اُن اصولوں پر ہوئی ہے جو مصنف کو معلوم تھے اور اس طرح قدیم مشرقی علوم کے متعلق بہت سی دلچسپ معلومات اس کتاب کے مطالعہ سے

حاصل ہوسکتی ہے۔ اس طرح مختلف فرقوں اور پیشوں۔ فنونِ لطیفہ اور فنونِ جنگ کا بھی بہت سا ذکر اس کتاب میں موجود ہے اور اس لحاظ سے اِسے محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ کی تہذیب و تمدّن کا ایک دلکش مُرقع تصوّر کر سکتے ہیں۔ ان تاریخی۔ علمی اور ادبی خوبیوں کے علاوہ بوستانِ خیال میں ایک مذہبی اور اخلاقی رنگ بھی ہے۔ کیونکہ اس میں نیکی اور بدی کفر اور ایمان ایک دوسرے کے خلاف صف آرا نظر آتے ہیں اور آخرکار ایمان اور نیکی بدی اور کفر پر انسانی شجاعت اور تائیدِ الہٰی سے غالب آجاتے ہیں۔ بوستانِ خیال کی یہ صنعت اس کو اُن مذہبی روایات سے بہت مُشابہ بنادیتی ہے۔ جو زمانۂ قدیم سے تقریباً تمام قوموں میں مروّج رہی ہیں۔

بوستانِ خیال کا مُصنّف ایک شخص میر تقی خیاؔل تھا جس نے اس قصّہ کو فارسی زبان میں لکھا تھا۔ میر تقی کے متعلق صرف اس قدر معلوم ہے کہ غالبًا ایرانی الاصل تھا۔ اور احمد آباد گجرات سے دہلی آیا تھا۔ یہاں اُسکو ایسی صحبت ملی جس میں داستان امیر حمزہ کی بہت قدر تھی۔ ایک دن اس کے کسی ہم جلیس نے یہ کہدیا کہ عالم فاضل بن جانا آسان ہے لیکن ایسی داستان لکھدینا بہت مشکل ہے۔ میر تقی کو اس کا یہ کہنا ناگوار گذرا اور اُس نے داستان امیر حمزہ کا جواب لکھنا شروع کر دیا۔ جب اس کا کچھ حصّہ تمام ہوگیا تو اپنے دوستوں کو سُنایا سب نے بہت پسند کیا اور رفتہ رفتہ اس کی شہرت موتمن الدولہ نواب اسحٰق خاں سالار جنگ کے کانوں تک پہونچی جو محمد شاہ بادشاہ کے دربار کے ایک رکن تھے۔ نواب صاحب نے میر تقی کو طلب کر کے بادشاہ کے حضور میں پیش کیا۔ بادشاہ نے کتب خانہ کی خدمت اس کے سپرد کی اور حکم دیا کہ اس داستان رنگین بیان کو پورا کرو لیکن ابھی قصّے کی پہلی دو جلدیں تمام ہوئی تھیں کہ بادشاہ کا انتقال ہوگیا اور میر تقی خیاؔل تباہ حال ہوکر بنگال پہنچا۔ یہاں نواب سراج الدولہ نے اس کی سرپرستی کی اور آخیر پچیس[۲۵] برس کی مدت میں یہ بے مثل افسانہ ختم ہوا۔ اس کا اُردو ترجمہ خواجہ بدر الدین عرف خواجہ اماؔن دہلوی نے الور کے مہاراجہ شیو دھان سنگھ کے حکم سے شروع کیا لیکن ابھی پانچ چھ جلدیں ہی پوری ہوئی تھیں کہ ان کی عمر تمام ہوگئی اور آخری تین جلدوں کا ترجمہ میرٹھ کے حکیم مقرب حسین نے کیا۔ خواجہ اماؔن نے کسی مصلحت سے قصّے کی پہلی دو جلدوں کو چھوڑ کر تیسری جلد کا ترجمہ شروع کیا تھا۔ اُن ابتدائی جلدوں میں قصّہ کے ہیرو معز الدین کے آبا و اجداد کا حال ہے۔ اور اماؔن کو قصّہ کی تمہید خیال کرنا چاہیئے اُن کا ترجمہ لکھنؤ کے مرزا محمد عسکری عرف چھوٹے آغا نے کر دیا۔ بعد میں منشی نولکشور کے اہتمام سے بوستانِ خیال کا ایک مکمل اُردو ترجمہ نو جلدوں میں لکھنؤ سے شائع ہوا جو نواب محسن علی خاں اور مرزا محمد عسکری کی مشترکہ کوشش کا نتیجہ ہے۔ لاہور کے سیّد نادر علی سیفی نے اس لکھنؤ کے ترجمہ کا ایک خلاصہ کرنا شروع کیا تھا اور اس کے چند حصّے بھی شائع ہوتے تھے لیکن وہ اپنے کام کو ادھورا چھوڑ کر فوت ہوگئے۔ فی الحال لکھنؤ کا ترجمہ زیادہ دیکھنے میں آتا ہے اور خواجہ اماؔن کا ترجمہ بہت مشکل سے ملتا ہے۔ اس ترجمہ کی جب پہلی جلد شائع ہوئی تو مرزا غالب نے جو خواجہ اماؔن سے کچھ قرابت رکھتے تھے اس کا دیباچہ لکھا جس کے چند فقرے میں آپ کو سُناتا ہوں۔ فرماتے ہیں کہ "ہر چند خرد مند بیدار مغز تواریخ کی طرف بالطبع مائل ہونگے لیکن قصّہ کہانی کی ذوق بخشی و نشاط انگیزی کے دل میں قائل ہونگے۔ کیا تواریخ میں ممتنع الوقوع حکایات نہیں؟ ناانصافی کرتے ہیں۔ یہ کچھ بات نہیں سام اپنے فرزند کو پہاڑ پر پھنکوائے سیمرغ اُسکو اپنے گھونسلے میں اُٹھا لائے۔ پرورش کر کے (رستم) پہلوان بنائے آداب حرب و ضرب سکھائے پھر جب

رستم اسفندیار کی لڑائی سے گھبرائے زال اس اسم باسمیٰ کو بلائے سیمرغ گردان کبوتر کی طرح سیٹی کی آواز پر چلا آئے۔ رستم دس برس کی عمر میں مست ہاتھی کو ہلاک کرے۔ جب پشم بد دور جوان ہو۔ دیو سفید کو تہ خاک کرے فرعون کا دعویٰ خدائی مشہور ہے۔ شداد و نمرود کا بھی تواریخ میں ایسا ہی مذکور ہے اگر اہل طبیعت ایک پہلوان زبردست حمزہ دیوکش رستم جیسا قرار دیں اور ایک زمرد شاہ گمراہ دعویٰ کرنے والا خدائی کا گھڑ لیں گو یا ایک ڈھکوسلا بنایا ہے مگر اچھا بنایا ہے نہیں روایات کا چربہ اٹھایا ہے مگر اچھا اٹھایا ہے۔ داستان طرازی منجملہ فنون سخن ہے سچ یہ ہے کہ دل بہلانے کیلئے اچھا فن ہے۔ عمرو کی عیاریاں دیکھو حمزہ کی میدان داریاں دیکھو جامع ان حکایات (یعنی داستان امیر حمزہ) کا کوئی سخنور ایران کا ہے مگر وہ میر تقی محمد شاہی جو قدیم مومن الدولہ اسحاق خاں کا ہے گویا باغ ارم کو ہندوستان میں اٹھا لایا اس نے بوستان خیال میں کچھ اور ہی تماشا دکھایا۔ دینبولا میر برادر زادہ سعادت توامان خواجہ بدرالدین خاں عرف خواجہ امان کہ وہ ایک جوان شیریں بیان تیز ہوش ہے اور ہر فن کے کمال کی تحصیل میں محنت کش و سخت کوش ہے۔ ستار ایسا بجایا کہ میاں تان سین کو انگلیوں پر نچایا۔ مصوری کی طرف جو طبیعت آئی وہ تصویر کھینچی کہ اسکو دیکھ کر مانی و بہزاد کو حیرت آئے اس اقبال آثار کا یہ ارادہ ہوا معزالدین نامہ کی فارسی نثر کو اردو کرنے پر آمادہ ہوا۔"

غالب کی اس تحریر میں دو چیزیں خاص طور پر قابل غور ہیں؟ ایک تو یہ کہ وہ بالکل صحیح فرماتے ہیں کہ ناممکن اور عقل وقیاس سے دور باتیں مذہبی روایات اور قدیم کتب تواریخ میں بھی پائی جاتی ہیں لیکن اس کے باوجود لوگ ان نوشتوں کی قدر کرتے ہیں؟ پھر کیا وجہ ہے کہ ایسی باتوں کی موجودگی کو کسی قصے یا داستان کے لئے عیب خیال کیا جائے؟ دوسرا قابل غور امر یہ ہے کہ جن لوگوں نے غالب کی اردوئے معلیٰ وغیرہ کی صاف وسلیس عبارت کو دیکھا وہ اس تحریر کی مقفیٰ اور فارسی سے مغلوب عبارت کو دیکھکر ضرور حیران ہونگے۔ لیکن بات دراصل یہ ہے کہ اس وقت یہی رنگین روش تحریر قصہ اور داستان کیلئے مقبول تھی اور اگرچہ بوستان خیال کے اردو ترجمہ کی عبارت قافیہ کی قید کی سختی کے ساتھ پابند نہیں لیکن اور لحاظ سے مرزا غالب کی اس عبارت سے بہت ملتی ہوئی ہے۔ (باجازت ڈائریکٹر صاحب دلی ریڈیو اسٹیشن)

مرزا محمد سعید ایم۔ اے

باقیاتِ فانی

آپ سے شرحِ آرزو تو کریں
آپ تکلیفِ گفتگو تو کریں

وہ یہیں ہیں جو وہ کہیں بھی نہیں
آیئے دل میں جستجو تو کریں

اہلِ دُنیا مجھے سمجھ لیں گے
دل کسی دن ذرا لہو تو کریں

رنگ و بُو کیا ہے یہ تو سمجھا دو
سیرِ دُنیائے رنگ و بُو تو کریں

آ گئے ہو تو رو بھی لینے دو
سجدہ واجب ہوا وضو تو کریں

تم سے ملنے کی آرزو ہی سہی
تم سے ملنے کی آرزو تو کریں

وہ اُدھر رُخ اِدھر ہے میّت کا
لوگ فانیؔ کو قبلہ رُو تو کریں

فانیؔ بدایونی

سچی کہانی

(از پریم پجاری)

انگلستان کے نامور افسانہ نگار، رائڈر ہیگرڈ نے اپنی سب سے مشہور تصنیف "ہے یارک" کے متعلق بیان کیا ہے کہ "جن لوگوں کی یہ سرگزشت ہے اُنہیں میں سے ایک نے یہ تمام واقعات لکھکر میرے پاس بھیجدئے تھے اور مجھ سے خواہش کی تھی کہ میں اسے شایع کردوں۔ اسلئے جہانتک اس کتاب کا تعلق ہے میری حیثیت ایک ایڈیٹر سے زیادہ نہیں"

آج سے پندرہ سال پہلے جب میں نے "ہے یارک" کا مطالعہ کیا اور اُس کے مصنف کا یہ بیان پڑھا تو مجھے اسکی صداقت پر یقین نہ آیا اور میں نے خیال کیا کہ غالباً کتاب کو زیادہ جاذب توجہ بنانے کے لئے یہ حیلہ تراشا گیا ہے کیونکہ کسی کی "آپ بیتی" قدرتی طور پر پڑھنے والوں کیلئے ایک فرضی اور خیالی افسانے سے کہیں زیادہ دلکشی رکھتی ہے۔ اسوقت مجھے خیال بھی نہ تھا کہ پندرہ برس کے بعد خود مجھے بھی ایک "سچی کہانی" کا اسی طرح پبلک سے تعارف کرانا ہوگا۔

۱۸ فروری ۱۹۳۷ء کو مجھے ایک خط ملا جس کی چند سطریں درج ذیل ہیں۔

"میری اپنی زندگی کا ایک واقعہ، ایک جانگسل اور روح فرسا داستانِ محبت، میرے دماغ میں کھولتے ہوئے خون اور دہکتی ہوئی آگ کی طرح موجزن ہے۔ متعدد مرتبہ کوشش کی کہ اس کو تحریر کروں تاکہ جی کی کچھ بھڑاس نکل جائے لیکن جب لکھنے بیٹھا دل بیطرح اُچھلنے لگا۔ ہاتھ کانپنے لگے اور ہر مرتبہ ناتمام ہی چھوڑنا پڑی۔ میں اتنا کرسکتا ہوں کہ خاص خاص چیزیں آپ کو تحریر کردوں۔ کیا آپ ایک اجنبی پرستار کی خوشی کے لئے اتنی تکلیف گوارا فرمائیں گے کہ اسے مرتب کردیں۔ میری مدت کی آرزو پوری ہوجائیگی اور آپ کو ایک "سچی کہانی" کیلئے ایک سچا پلاٹ مل جائے گا۔ پھر میری خاطر سے اتنی زحمت اور بھی گوارا فرمائیں کہ اپنے نام سے کسی رسالہ میں شائع کرادیں۔ یقیناً اس میں آپ کو بہت تکلیف ہوگی لیکن مجھے آپکے اخلاق سے اُمید ہے کہ آپ اسے گوارا فرمائیں گے۔۔۔۔۔ آپ کی اس ادبیت سے جس کا میں معترف ہوں مستفید ہونا چاہتا ہوں۔ آپکو اپنی "سی غریتا" کی قسم مجھے مایوس نہ کیجئے گا۔۔۔۔۔ نیازمند، عابد پریمی"

چند روز بعد ایک خط کی شکل میں یہ افسانہ وصول ہوا اس افسانے کے تمام اشخاص اور مقامات کے نام فرضی ہیں۔

(پریم پجاری)

مُرادآباد۔ یکم مارچ ۱۹۳۷ء

میرے محترم حسب وعدہ اپنی پریم کہانی بھیج رہا ہوں۔

خدا جانے کیوں، افسانے پڑھنے کا شوق مجھے بچپن سے تھا چنانچہ ابا سے چھپا چھپا کے میں نے اُردو کے بیسیوں ناول پڑھ ڈالے۔ چھپا کر پڑھنے کا سبب یہ تھا کہ اگر وہ کبھی کوئی ناول میرے ہا[تھ] دیکھ پاتے تو ایسے گھبرا جاتے جیسے ایک ننھے بچہ کے ہاتھ میں

بےعلف

پاتو دیکھ لیا اور پھر اس قدر خفا ہوئے کہ جیسے میں نے کوئی سنگین جرم کیا ہے۔ ناولوں کے وہ ایسے ہی دشمن تھے جیسے پنڈت جواہر لال نہرو سرمایہ داری کے اور ہمارے مولوی ایمانداری کے۔ میں حیران تھا کہ اگر ناول واقعی ایسی بری چیز ہیں تو پھر کیوں لکھے جاتے ہیں۔ کیوں چھپتے ہیں کیوں بکتے ہیں۔ ابا کہتے تھے کہ ناول پڑھنے سے اخلاق خراب ہو جاتے ہیں اور میں دیکھتا تھا کہ ہر شخص ناول پڑھتا ہے۔ وہ خود بھی پڑھتے تھے۔ اوروں کے متعلق اگر نہیں تو کم از کم خود اپنی بابت مجھے یقین تھا کہ ناولوں نے ان کے اخلاق پر کوئی برا اثر نہیں ڈالا۔ میں نے بارہا ان کے دوستوں اور کاروباری لوگوں سے ان کی خوش خلاقی اور نیک اطواری کی تعریف سنی تھی۔ پھر جہاں تک میں اس وقت اندازہ کر سکتا تھا، مجھے خود اپنے اخلاق و اطوار پر بھی ناول پڑھنے کا کوئی خاص مضر اثر محسوس نہیں ہوا۔ بہرحال ابا کی ممانعت کے باوجود میں نے یہ شغل جاری رکھا۔ جاڑوں کے زمانہ میں اکثر یہ کرتا کہ شام ہی سے کمرے میں جا لیٹتا۔ سرہانے ایک طرف اسکول کی کوئی کتاب کھلی رکھی ہے۔ دوسری طرف بستر کا کونا الٹا ہوا ہے اور ناول دیکھا جا رہا ہے جیسے ہی کسی کے پاؤں کی آہٹ سنی، بس فوراً ناول بستر کے نیچے، اسکول کی کتاب ہاتھ میں، سبق یاد ہو رہا ہے۔ آخر یہ "چوری" بھی ایک دفعہ پکڑی گئی۔

ناولوں میں سب سے زیادہ ناقابل فہم چیز میرے لیے محبت تھی۔ ماں باپ کی محبت کو میں جانتا تھا۔ بہن بھائی کی محبت کا مجھے اندازہ تھا مگر جس محبت کا ناولوں میں ذکر ہوتا تھا وہ میرے لیے معمہ تھی۔ شرر کا مشہور ناول "حسن انجلینا" جب میں نے پڑھا تو کسی طرح یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ حسن کو انجلینا سے اور انجلینا کو حسن سے کیوں محبت ہو گئی۔ میں اپنے دل میں کہتا تھا کہ یا اللہ یہ عجیب قسم کے لوگ ہیں۔ نہ رشتہ نہ تعلق۔ نہ جان نہ پہچان، بالکل اجنبی، بالکل بیگانے کیا معنی۔ غیروں میں صرف ایک قسم کی محبت مجھے قدرتی چیز تھی یعنی ساتھ کے کھیلنے اور پڑھنے والے لڑکوں کا پیار۔ نہ سہیلیوں کا بہناپا۔ پھر محبت کیوں ہوئی اور کس لئے ہوئی اس سے زیادہ حیرت انگیز بات میرے لئے یہ تھی کہ اچھا جب کسی کو کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو یہ والدین اور عزیز و اقارب کیوں خواہ مخواہ بیچ درمیان میں رخنہ اندازیاں کیا کرتے ہیں۔ کیوں انہیں ملنے نہیں دیتے۔ کیوں ان کے دشمن بن جاتے ہیں۔ کیوں ہمیشہ ان کی جدائی کے درپے رہتے ہیں۔ پھر ان نوجوان محبت کرنے والوں کی اس حماقت پر بھی تعجب ہوتا تھا کہ مانا محبت ہے مگر اس کے لئے اپنے کو تباہ کرنے کے کیا معنی۔ بات بات پہ رونا بات بات پر تڑپنا، آخر یہ بھی کوئی عنوان ہے۔ جب تک کوئی تکلیف نہ ہو بچہ بھی نہیں روتا۔ یہ جوان ہو کر روتے ہیں۔ شرم نہیں آتی۔ کوئی بیمار ہو، کوئی تکلیف ہو، جب بھی خیر ایک بات ہے۔ ماشاء اللہ تندرست، ہٹے کٹے، اور بیٹھے رو رہے ہیں۔ محبت نہ ہوئی دیوانگی ہو گئی کہ جب چاہا ہنس دیے جب چاہا رو دیے۔ سب سے زیادہ غصہ مجھے ان لوگوں پر آتا تھا جو فراق کی برداشت نہ لا کر جان دے دیتے تھے۔ میں اپنے جی میں کہتا تھا کہ ان بے دردوں کو اپنے ماں باپ پر بھی ترس نہیں آتا۔ اپنی جان دی تو دی مگر اتنا نہ سوچا کہ بدنصیب ماں کا کیا حال ہو گا۔ بدبخت باپ پر کیا بنے گی۔ وہ تو جیتے جی مر جائیں گے۔ زندہ درگور ہو جائیں گے۔ رفتہ رفتہ میرے حاسوں میں ایک انقلاب شروع ہوا اور خود بخود محبت کا ایک مبہم سا مفہوم میرے دماغ میں جاگزین ہو گیا۔ مگر میں ابھی تک جنسی کشش اور صنف نازک کی جاذبیت سے بے خبر تھا۔ اس وقت میری عمر پندرہ سال کی تھی۔ یہ ۱۹۳۱ء کا واقعہ ہے۔

آگرہ میں میری ننھیال ہے اور کچھ کاروباری تعلقات بھی۔ اس لئے اکثر وہاں آنا جانا رہتا ہے۔ ۱۹۳۱ء ختم ہو رہا تھا کہ میں آگرہ گیا۔ نانی کے یہاں ٹھہرا۔ رفیق اور رئیس میری دو خالائیں بھی اس وقت وہاں موجود تھیں۔ رفیق میری ہمسن ہیں اور رئیس مجھ سے چھوٹی۔ خردی بزرگی کا رشتہ ہوتے ہوئے بھی ہم لوگ بالکل بہن

بھائیوں کی طرح تھے کیونکہ ہماری عمروں میں کچھ ایسا فرق نہ تھا۔ رفیق کی طبیعت پر شاید اُن کے نام کا اثر پڑا۔ جب دیکھو دو ایک سہیلیاں اُن کے ساتھ ہیں۔ پڑوس کے گھر کچھ اس طرح واقع ہوئے تھے کہ آنا جانا کچھ دُشوار نہ تھا۔ صبح سے شام تک کوئی نہ کوئی اُن کی ہجولی آتی ہی رہتی تھی۔ رئیس کی سہیلیاں اُس کی کتابیں تھیں۔ کتابوں کو وہ پڑھتی کیا تھی کھاتی تھی۔ کوئی رسالہ ہاتھ میں لیا اور گھنٹہ بھر میں ختم۔

جاڑے کے دن تھے، صبح کا وقت، میرے سر میں درد ہو رہا تھا۔ آنگن میں پلنگ بچھوا کر دھوپ میں لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں دھوپ تیز ہو گئی۔ میں نے پلنگ بیری کے سایہ میں کھینچ لیا۔ اتنے میں رفیق آگئیں۔ میرے پاس ہی بیٹھ گئیں۔ کہنے لگیں "لاؤ تیرا سر دبا دوں"۔ میں نے کہا "نہیں اب ایسا درد نہیں ہے"۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ جدھر میری پیٹھ تھی اُدھر سے کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ آنے والا شاید مجھے دیکھکر جھجکا۔ رفیق نے کہا "آؤ، آؤ، کوئی نہیں، عابد ہے"۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ کوئی تیرہ چودہ سال کی ایک بھولی بھالی خوبصورت لڑکی۔ وہ آئی۔ برابر ہی ایک اور پلنگ پڑا تھا اس پر بیٹھ گئی۔ یہ رفیق کی بہت ہی پیاری سہیلی نجمہ تھی۔ اوّل تو میری عمر کچھ ایسی زیادہ نہ تھی پھر آگرہ میں ہمارے مرادآباد جیسا سخت پردہ ہے بھی نہیں۔ اس کے علاوہ نجمہ کی والدہ مرحومہ سے ہماری بہت دُور کی کچھ رشتہ داری بھی تھی اور نجمہ بارہا رفیق سے میرا ذکر سُن چکی تھی اس لئے بے جھجک سامنے آگئی۔ رفیق اور نجمہ باتوں میں مصروف تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ کل کس گاڑی سے مرادآباد واپس جاؤں۔ یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا کہ نجمہ دورانِ گفتگو میں رفیق اور خود میری نظر بچا کر بار بار مجھے دیکھتی ہے۔ پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ شاید اتفاقیہ طور پر اُس کی نظر میری طرف اُٹھ گئی ہوگی لیکن جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ نہیں، "اتفاقیہ" کا یہاں کوئی سوال نہیں۔ آخر ایک دفعہ ہماری آنکھیں چار ہو گئیں۔ نجمہ نے فوراً نہایت بے پروائی کے ساتھ رُخ پھیر لیا۔ اور پھر کئی منٹ تک میری طرف نہ دیکھا جس سے مجھے شُبہ ہوا کہ غالباً میرا پہلا خیال ہی صحیح تھا۔ بہرحال میرے دل میں ایک عجیب قسم کی خلش سی پیدا ہو گئی۔ نجمہ نے پھر ایک بار میری طرف دیکھا۔ پھر ہماری نگاہیں ملیں۔ پھر وہ دوسری طرف متوجہ ہو گئی۔ میری نگاہیں برابر نجمہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے دیکھا، اُس کے رُخساروں پر سُرخی کی ایک جھلک نمودار ہوئی۔ شاید وہ اپنی "چوری" کھُل جانے کی وجہ سے جھینپ گئی تھی۔ خُدا جانے کیوں خلافِ معمول اس وقت میرا دل کچھ زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ نجمہ یکایک اُٹھ کھڑی ہوئی۔ رفیق نے کسیقدر متعجب ہو کر پوچھا۔

"کیوں! کہاں؟"

"کہیں نہیں ذرا پانی پیونگی"۔

"بیٹھو، میں لاتی ہوں"۔

یہ کہکر رفیق پانی لانے چلی گئیں۔ نجمہ بیٹھ گئی۔ اُس کے سر پر دھوپ آرہی تھی میرا پلنگ سایہ میں تھا۔ میں نے کہا "آپ کے اوپر دھوپ ... اِدھر آجایئے"۔ اب تک میں لیٹا ہوا تھا۔ یہ کہکر اُٹھ بیٹھا۔ سرہانے کی طرف نجمہ کے لئے جگہ چھوڑ دی۔ پہلے وہ کچھ جھجکی ایک بار میری طرف دیکھا۔ پھر کچھ کہے بغیر میرے پلنگ پر آکر بیٹھ گئی۔ اتنے میں رفیق بھی آگئیں۔ نجمہ نے پانی پیا اور پھر باتیں ہونے لگیں میں بھی اُن کی گفتگو میں شریک ہو گیا۔ نجمہ کی بھولی بھولی معصومانہ باتیں۔ بے جھجک آزادانہ گفتگو۔ الّڑھ پن کے ساتھ ساتھ ایک خاص لجاہٹ ہر شئے میں میرے لئے ایک دلکشی تھی۔ نجمہ کے ساتھ باتیں کرنے سے اُس وقت میرے دل کو جو خوشی ہوئی وہ زندگی میں میرا پہلا اور بالکل نیا تجربہ تھا۔ نجمہ بھی اس مختصر صحبت سے بہت مسرور معلوم ہوتی تھی۔ میری "چٹکیوں" اور "گدگدیوں" نے اُسے بہت ہنسایا تھا۔ اور ہم ایک دوسرے سے خاصے بے تکلف ہو گئے تھے۔

نجمہ تھوڑی دیر کے بعد چلی گئی۔ اس کا گھر دیوار بیچ تھا۔ اسکے چلے جانے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اُسے دوبارہ دیکھنے کے لئے میری آنکھیں اور میرا دل دونوں آرزومند تھے۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ کہ مجھے قریب قریب یقین تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر آ ئیگی۔ حالانکہ اس یقین کی بظاہر کوئی وجہ نہ تھی۔ بہر حال میں منتظر تھا۔ وہ آئی اور کئی بار آئی۔ کبھی کوئی کام، کبھی کوئی پیغام، کبھی کچھ لینے کے لئے، کبھی کچھ دینے کیلئے۔ گھر میں ذراسی کوئی بات ہوئی اور کہنے کے لئے دوڑی آئی۔ ہر مرتبہ مجھ سے بھی ایک دو بات کر جاتی۔ اس وقت میں نے اسے "حسنِ اتفاق" سے تعبیر کیا۔ مگر اب کہہ سکتا ہوں کہ یہ سب بہانے تھے۔ بار بار عابد کے دیکھنے کو جی چاہتا تھا اس لئے کوئی نہ کوئی حیلہ، کوئی نہ کوئی عذر ضروری تھا۔ شاید کوئی نفسیات کا ماہر بتا سکے، میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ بھولی نجمہ اتنی جلد اس قدر چالاک کیسے ہوگئی۔

دن ختم ہوا۔ رات آئی۔ مراد آباد جانے والی ٹرینوں کے اوقات کے بجائے اب نجمہ کا خیال میرے دماغ میں جاگزین تھا۔ سویا تو اس کا خیال لیکر سویا۔ جاگا تو اس کا خیال لیکر جاگا۔ صبح کو نانی اماں نے پوچھا۔

"عابد، کس گاڑی سے جائیگا؟" میں نے کہا "میں تو ابھی نہیں جاتا۔" وہ بولیں "عجب لڑکا ہے۔ میں تو خود ہی کہہ رہی تھی کہ اب آیا ہے تو دو چار دن رہ جا۔ تجھی کو خدا جانے کیوں اتنی جلدی تھی۔ اچھی بات ہے۔ آج کیا دن ہے، جمعہ؟ جمعہ، سنیچر، اتوار، پیر۔ پیر کو جانا۔ مبارک دن ہے۔" میں چپ ہو رہا۔ نجمہ کل کی طرح آج بھی کتنی ہی بار آئی۔ آج میں نے سارا دن گھر ہی میں گذار دیا۔ باتیں ہوئیں اور بہت ہوئیں۔ ہم دونوں کیلئے ایک دوسرے کی صحبت یکسر خوشی تھی۔ جاڑوں کے دن یوں بھی چھوٹے ہوتے ہیں مگر مجھے تو گھنٹوں کی طرح مختصر معلوم ہوتے تھے۔ ابھی صبح تھی اب دوپہر ہوگئی۔ اب شام ہے۔ لو پھر دن نکل آیا۔ اور دیکھتے دیکھتے تمام ہوگیا۔ ایک ہفتہ اسی طرح گذر گیا۔ میرے جذبات و احساسات میں ایک زبردست انقلاب رونما ہو رہا تھا۔ روز میری آنکھوں سے پردے اُٹھتے جا رہے تھے۔ اب میں وہ عابد نہ تھا جو کل تک حسن اور انجلینا کی محبت کی نوعیت سمجھنے سے قاصر تھا جس کے نزدیک چاہنے اور چاہے جانے کی لذتیں، فراق کی کاہشیں، یکجائی کی مسرتیں مُعمّے اور پہیلیاں تھیں۔ اب مجھ میں محبت کی رنگین لطافتوں سے لذت گیر ہونے کی کافی صلاحیت پیدا ہوگئی تھی۔

نجمہ اب واقعی میرے لئے ایک ستارہ تھی، آسمانی ستارہ سے زیادہ تابناک۔ زیادہ خوبصورت۔ اُس نے میرے دل کو محبت کے انوار سے بھر دیا تھا۔ بڑی سرعت کے ساتھ ہم بالکل غیر شعوری طور پر ایک دوسرے سے نزدیک ہوتے جا رہے تھے۔ ہماری رُوحیں بربط کے تاروں کی طرح ہم آہنگ ہوگئی تھیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کیلئے بیتاب رہنے لگے تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ مجھے نجمہ سے زیادہ محبت تھی یا نجمہ کو مجھ سے۔ ایک دن نانی اماں اور رئیس کہیں پڑوس میں گئی ہوئی تھیں رفیق غسل کر رہی تھیں کہ نجمہ آئی۔ گھر اکیلا دیکھکر واپس جانے لگی۔ میں نے روکا۔ وہ ہچکچائی۔ کچھ گھبرائی۔ آخر بیٹھ گئی۔ تنہائی تھی۔ آزادی تھی۔ کسی قسم کا خوف نہ تھا۔ ہم نے آج ہمیشہ سے زیادہ کھل کر باتیں کیں۔ نجمہ کی آنکھیں جرأت آموز تھیں اور میں اظہارِ آرزو کے لئے بیتاب۔ قریب ہوکر میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ خدا جانے کیوں وہ باتیں کرتے کرتے یکایک چپ ہوگئی اور زمین کی طرف دیکھنے لگی۔ میں بھی خاموش تھا۔ سینہ میں جذبات کا تلاطم برپا تھا مگر زبان یاری نہیں دیتی تھی۔ آخر بڑی مشکل سے میں نے کہا "نجمہ!" اپنا نام سُنکر وہ چونک پڑی۔ میں نے اُسکے ہاتھ میں ایک لرزش سی محسوس کی۔ اُس نے سر اُٹھاکر میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں پریم کا ساگر موجیں مار رہا تھا جس میں حجاب اور معصومیت کی پریوں کو میں نے نہاتے دیکھا۔ ہماری نگاہیں ملیں۔ شاید اس وقت میری تمام آرزوئیں سمٹ کر میری آنکھوں میں آگئی تھیں جبھی تو وہ میری خاموشی کے باوجود سمجھ گئی کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں اور شرماکر سر

کوئی دو منٹ تک ہم دونوں اسی طرح خاموش بیٹھے رہے۔ آخر میں نے طلسم خاموشی کو توڑا اور جو کچھ کہنا تھا بے ساختہ کہہ ڈالا۔ جب وہ چپ بیٹھی سنتی رہی۔ نہ سر اٹھایا نہ جنبش کی۔ اُس کا ہاتھ اب بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ کوئی ایک منٹ تک ہم پھر خاموش رہے۔ اب میں نے دعوائے محبت کی تصدیق کے لئے قسمیں کھانی شروع کیں۔ کیا بتاؤں کس کس کی قسم کھائی مگر وہ اس طرح بُت بنی بیٹھی تھی گویا کچھ سُن ہی نہیں رہی۔ آخر میں نے کہا "نجمہ، جو کچھ میں نے کہا اگر جھوٹ ہو تو خدا کرے میں کبھی تجھے نہ پا سکوں۔" نجمہ اِن لفظوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس نے ایک جھرجھری سی لی اور ایک نہایت دلربایانہ انداز سے میری طرف دیکھکر مسکرانے لگی۔ پھر دونوں ہاتھوں سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ یہ خاموش جواب میرے لئے بالکل کافی تھا۔ مجھے اطمینان ہوگیا کہ اُسے میری محبت کا یقین آگیا اُس وقت کی خوشی کن الفاظ میں بیان کروں۔ میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ کسی کے پاؤں کی چاپ سُنائی دی۔ رفیق نہا کر آرہی تھیں۔ نجمہ فوراً کھسک کر مجھ سے ذرا دُور بیٹھ گئی۔

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ نجمہ رفیق کی بہت پیاری سہیلی تھی مگر ایسا بھی خیال نہ تھا کہ وہ اس واقعہ کو بھی اُن سے کہدیگی۔ مگر اس نے اوّلین فرصت میں سب کچھ انہیں بتا دیا۔ رفیق نے اسکے متعلق مجھ سے کوئی تذکرہ نہیں کیا لیکن میں نے دیکھا کہ اب جب نجمہ آتی تو وہ کسی نہ کسی بہانے سے اِدھر اُدھر ہو جاتیں۔ تاکہ ہم لوگ آپس میں ہنس بول لیں۔ میں کُل تین دن کے لئے آگرہ آیا تھا مگر بارہ دن گذر گئے مگر کسی طرح جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ والد کا خط ملا کہ پہلی ٹرین سے مرادآباد پہونچو۔ اس نادر شاہی فرمان کی تعمیل نہ کرنا میرے امکان سے باہر تھا۔ چنانچہ دوسرے دن واپسی کا تہیہ کر لیا۔ نجمہ میرے جانے کی خبر سُنکر سخت مضطرب ہوگئی اور روانگی سے کچھ پہلے آخری بار ملنے آئی۔ رفیق کی مہربانی سے ہمیں پھر ایک بار تنہائی میں ملنے کا موقع ملگیا۔ میں اپنی اس وقت کی حالت کن الفاظ میں بیان کروں۔ رنج وغم کی شدّت سے میرا کلیجہ نکلا پڑتا تھا۔ بے اختیار دل بھرا آرہا تھا۔ آخر ضبط نہ ہو سکا اور میری آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ شاید آپ مجھ پر ہنسیں گے۔ اور آپ کو ہنسنے کا حق ہے۔ ہاں میں وہی عابد تھا جو سوچا کرتا تھا کہ یہ محبت کرنے والے کیا دیوانے ہوتے ہیں جو بچوں کی طرح روتے ہیں، انہیں شرم نہیں آتی۔ مجھے اشکبار دیکھکر نجمہ سخت بیقرار ہو رہی تھی۔ آخر وہ اُٹھی، اپنے دوپٹہ کے آنچل سے میرے آنسو پونچھنے لگی اور کہا۔ "عابد، روؤ نہیں" اسکی آواز بھرّائی ہوئی تھی۔ یا تو مجھے تسلی دے رہی تھی یا مُنہ پھیر کر خود بھی رونے لگی۔ میں حیران تھا کہ کیا کروں۔ روتے روتے اُس کی ہچکی بندھ گئی۔ آخر میں نے کہا "نجمہ خُدا کیلئے نہ رُو، میرا دم نکلا جاتا ہے۔ میں بہت جلد آگرہ آنے کی کوشش کرونگا۔ خُدا کو منظور رہے تو ہم پھر یکجا ہونگے۔ اس وقت میرے دونوں ہاتھ نجمہ کے کاندھوں پر رکھے ہوئے تھے۔ ہم دونوں کھڑے تھے۔ نجمہ نے آج تک ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا تھا جسے اعترافِ محبت کہا جاسکے لیکن آخر چوٹ کھایا ہوا دل کہاں تک برداشت کر سکتا ہے۔ اُس نے کہا "عابد، میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گی" شاید وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر جذبات کے ہیجان میں نہ کہہ سکی۔ اتنے میں رفیق خالہ نے آواز دی کہ عابد، گاڑی کا وقت تنگ ہو رہا ہے۔ تانگہ والا چلّا رہا ہے۔ میں نے کہا "اچھا نجمہ خدا حافظ" نجمہ خاموش کھڑی مجھے دیکھتی رہی اور کوئی جواب نہ دیا۔ میں کمرہ سے نکل کر چلا آیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میری ٹرین بڑی تیزی کے ساتھ مجھے مرادآباد کی طرف اُڑائے لئے جا رہی تھی۔ آج پیر کا دن تھا۔ وہی پیر جسے نانی امّاں بہت مبارک خیال کرتی تھیں۔ مگر آج میں نے محسوس کیا کہ پیر سے زیادہ منحوس ہفتے میں کوئی دن نہیں۔ گھر پہونچکر طبیعت کی کچھ عجیب کیفیت تھی۔ دل پر غم کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی آنکھیں برسنے لگتی تھیں۔ معصوم مسرتوں کی وہ خوشگوار ساعتیں جنہیں نجمہ کی دلنواز مسکراہٹوں نے میرے لئے منتہائے آرزو بنا دیا تھا رہ رہکر یاد آتی تھیں اور مجھے بُری طرح تڑپاتی تھیں۔ نجمہ کی بھولی صورت ہر وقت آنکھوں کے سامنے تھی۔ بارہا مجھے ایسا محسوس ہوتا

تھا جیسے کوئی آہستہ سے میرے کان میں کہہ رہا ہے "عابد، میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گی" چند روز بہت تکلیف سے گذرے لیکن رفتہ رفتہ اضطراب کم ہوگیا۔ گھر کے کام، تعلیم کا مشغلہ۔ بہت سی چیزیں تھیں جن میں توجہ بٹ گئی۔ لیکن نجمہ کو بھول جانا میرے بس کی بات نہ تھی۔ پھر ہر تیسرے چوتھے مہینے آگرہ جانا ہوتا رہا۔ نجمہ سے ہر مرتبہ ملاقات ہوتی اور محبت کے نقش جو دوری کے سبب کچھ دھندلے پڑجاتے تھے چند لمحوں کی ملاقات کے بعد پہلے سے زیادہ روشن ہوجاتے۔ ہمارے ساتھ ساتھ ہماری محبت بھی شباب کی پُرآشوب منزلیں طے کررہی تھی۔ جوانی دیوانی مشہور ہے اور محبت تو اندھی ہوتی ہی ہے۔ پھر جب ان دونوں کا ایک جگہ اجتماع ہوجائے تو خدا کی پناہ۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں اُسے نہ کوئی دیکھ سکتا ہے نہ سمجھ سکتا ہے مگر سب دیکھتے تھے اور سب سمجھتے تھے۔ جب ہماری بے باکیاں چشم پوشی کی حد سے گذرنے لگیں تو پابندیاں عائد کی گئیں۔ نجمہ کا مجھ سے پردہ ہوگیا۔ مگر یہ پردہ اُسی قسم کا تھا جسے اصطلاح میں کہنا پردہ کہتے ہیں۔

غرض اسی طرح زمانہ گذرتا گیا یہاں تک کہ ۱۹۳۳ء آپہونچا۔ اس سال میں علیگڈھ نمائش دیکھنے گیا۔ وہاں ایک دوست سے یونیورسٹی جاکر ملنا تھا۔ ان کا پورا پتہ مجھے معلوم نہ تھا۔ علیگڈھ میں اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ اس لئے کسی جگہ کا کوئی صحیح اندازہ نہ تھا۔ پوچھتا پوچھتا چلا۔ ایک بڑی سی عمارت کے قریب پہونچا تو دو لڑکے جاتے ہوئے ملے۔ میں نے ان سے اپنے دوست کا پتہ پوچھا۔ یا تو انہوں نے شرارت کی یا میں نے حماقت کی۔ بہرحال اُن کے بتائے ہوئے پتہ پر ایک کوٹھی میں داخل ہوگیا۔ خدا جانے یہ کون جگہ تھی جس وقت میں نے عمارت کے برآمدے میں قدم رکھا مجھ سے کوئی دس قدم کے فاصلے پر ایک لڑکی نکلی۔ سیاہ ریشمین برقعہ اُس کے کاندھے پر پڑا ہوا تھا۔ ایک شانِ استغنا کے ساتھ وہ میرے آگے آگے جانے لگی۔ کمرہ سے نکلتے وقت اُس نے مجھے نہیں دیکھا تھا لیکن اب میرے پاؤں کی آہٹ سُنی تو پلٹ کر دیکھا۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ اُس نے برقعہ کھینچکر منہ پر ڈال لیا اور تیزی سے پھر چل پڑی۔ بیساختہ میرے منہ سے نکلا "جیسے ہیں ہی بڑی خوبصورت" حقیقتاً وہ بہت خوبصورت تھی مگر میں نے یہ الفاظ محض چھیڑنے کی غرض سے کہے تھے۔ وہ جھلا گئی اور پلٹ کر بولی "اپنے آپ جیسے بڑے حسین ہیں" یہ کہا اور جھٹ برابر والے کمرے میں داخل ہوگئی۔ میں نے محسوس کیا کہ یقیناً میں کسی غلط جگہ چلا آیا۔ یہ لڑکوں کا بورڈنگ نہیں ہوسکتا لہذا جلد سے جلد اس کوٹھی سے نکل آیا۔ جن صاحب کی تلاش تھی انہیں ہر چند ڈھونڈا مگر وہ نہ ملے۔ دوسرے دن میں مرادآباد واپس آگیا۔

چند ہی روز کے بعد والد صاحب نے ایک شادی میں شرکت کی غرض سے مجھے علیگڈھ بھیجا کیونکہ وہ خود نہیں جاسکتے تھے۔ میں شادی میں شریک ہوا اور شام کو آگرہ جانے کی غرض سے ہاوڑہ، دہلی اکسپرس میں سوار ہوگیا۔ گاڑی نے سیٹی دی اور آہستہ آہستہ رینگنا شروع کیا۔ اتنے میں دو برقعہ پوش عورتیں دوڑتی ہوئی پلیٹ فارم پر آئیں۔ جو آگے تھی وہ بغیر کچھ دیکھے بھالے میرے ڈبے میں سوار ہوگئی۔ جو پیچھے تھی وہ نہ چڑھ سکی، رہ گئی گاڑی جب تک پلیٹ فارم کے برابر چلتی رہی، میں کھڑکی سے سر نکالے باہر دیکھتا رہا، مگر جب اسٹیشن کافی پیچھے رہ گیا تو میں پہلو بدل کر بیٹھ گیا۔ قدرتاً ان محترمہ پر میری نظر پڑی۔ حسنِ اتفاق بلکہ سوءِ اتفاق سے ہم دونوں کے سوا اس درجے میں اور کوئی مسافر نہ تھا۔ اس ظالم نے خدا جانے کیا سوچکر برقعہ اتار ڈالا۔ میں چونک پڑا۔ یہ وہی شرارت کی پتلی تھی جسے میں نے علیگڈھ میں دیکھا تھا۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ کبھی کبھی باہر کی طرف دیکھنے لگتا۔ وہ بالکل میرے مقابل بیٹھی ہوئی تھی۔ آخر میں اُسے نہ دیکھتا تو کیا کرتا۔ اُس نے ایک لمحہ کیلئے بھی میرے چہرے سے نظر نہیں ہٹائی۔ کچھ دیر وہ چپ رہی، پھر اُسکے گلابی ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اُس نے نہایت ہی دلربایانہ انداز سے پوچھا۔

"آپ آگرہ جارہے ہیں نا؟"

"جی ہاں" میں نے کسی قدر متعجب ہو کر کہا۔

"آگرہ میں شاہ گنج جانیے گا ؟"

"جی ہاں" میرا تعجب اور بھی بڑھ گیا۔

"آپ مراد آباد سے آئے ہیں نا ؟"

"جی ہاں" اب میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔

"آپ کا نام عابد ہے ؟"

ظالم کے اس سوال نے تو مجھے مبہوت ہی کر دیا کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ الہام ہے یا معجزہ یا کوئی شعبدہ۔ آخر میں نے گھبرا کر کہا۔

"جی ہاں۔ مگر آپ کو کیسے معلوم ؟"

اُس نے ایک زور کا قہقہہ لگایا جس سے میں خواہ مخواہ جھینپ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اُس روز علیگڈھ میں میں نے جو گستاخی کی تھی اس نے آج اچھی طرح اس کا انتقام لے لیا اور اب اپنی کامیابی پر مسرور ہے۔ اِن احساس کی بنا پر میرے مزاج کا پارہ نقطۂ اعتدال سے ذرا اونچا ہو گیا۔ وہ نہایت دلچسپی کے ساتھ میرے چہرے کے تغیرات کا مطالعہ کر رہی تھی اور برابر مسکرا رہی تھی جس سے مجھے یہ خیال ہوا کہ یقیناً وہ میرے اندرونی کیفیات کو بھی سمجھ رہی ہے۔ آخر اُس نے یکایک متین صورت بنا کر کہا۔

"میرے ہنسنے پر آپ شاید بُرا مان گئے"

"بُرا ماننے کی تو کوئی بات نہیں" میں نے نہایت رکھائی سے جواب دیا۔

"اچھا تو اب بتا ہی دوں کہ میں آپ کو کس طرح جانتی ہوں ؟"

اُس نے پھر مسکرا کر پوچھا۔

"آپ کا جی چاہے تو بتا دیجیے"

اگرچہ میرے جواب میں اظہارِ اشتیاق کا ذرا سا بھی شائبہ نہ تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں اس پُراسرار حقیقت سے واقف ہونے کیلئے سخت بےچین ہو رہا تھا۔ میرا استغنا فقط ظاہری تھا مگر خدا جانے کس طرح اُس پرکالۂ آفت نے میرے دل کی یہ چوری بھی پکڑ لی۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"خوب، میرا جی چاہے تو بتا دوں۔ ورنہ آپ کو تو اُس سے کوئی دلچسپی نہیں" یہ کہہ کے اُس نے میرے چہرے پر ایک پُر معنی نظر ڈالی میں نے خاموشی ہی میں عافیت دیکھی۔ اس لئے اس کے اس طعنہ آمیز سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ایک لمحہ خاموش رہ کر بولی :

"اچھا تو سُنیئے، آپ کی رفیق خالہ میری دوپٹہ بدل بہن ہیں۔ میں بھی وہیں شاہ گنج میں اُن کے قریب ہی رہتی ہوں۔ رفیق سے ملنے آپ کی نانی کے یہاں اکثر جایا کرتی ہوں۔ ابھی کوئی دس روز ہوئے ایک دن میں وہیں بیٹھی ہوئی تھی کہ آپ کا خط اور آپ کی تصویر پہونچی۔ تصویر میں نے بھی دیکھی۔ میرے پوچھنے پر رفیق نے آپ کے متعلق سب باتیں مجھے بتائیں۔ اُس دن علیگڈھ میں جو آپ سے سامنا ہوا تو فوراً خیال گذرا کہ میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔ بہت سوچنے کے بعد یاد آیا کہ نہیں آپ کو تو نہیں دیکھا البتہ آپ کی تصویر دیکھی ہے۔"

"اور وہاں آپ تھیں کیوں ؟" میں نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں، علیگڈھ میں ؟ وہاں میں پڑھتی ہوں"

"کس کلاس میں ؟"

"نویں میں"

میں نے اور اسی قسم کے سوال کئے۔ وہ سب کا جواب دیتی رہی۔ آخر میں نے اس کے والد کا نام پوچھا، اس نے بتایا۔ میں ان کا نام پہلے بھی سُن چکا تھا۔ نہ صرف نام بلکہ یہ بھی سُنا تھا کہ وہ شیعہ طبقہ کے معززین میں سے ہیں۔ اس کا نام اپنا نام عذرا تھا۔ باتوں باتوں میں اُس نے بیان کیا کہ "جب سے آپ کی تصویر دیکھی تھی بے اختیار جی چاہتا تھا کہ آپکو دیکھوں"

"یہ کیوں ؟"

"یہ تو خود مجھے بھی نہیں معلوم" جس وقت عذرا کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے کافور ہو گئی۔ چہرہ پر ایک ہلکی سی اُداسی دوڑ گئی۔ اُس کی گردن جھک گئی۔ وہ چپ ہو گئی۔ خُدا جانے کیا سوچنے لگی۔ پھر یکایک بول اٹھی۔

"آپ نے یوسف زلیخا کا قصہ پڑھا ہے؟"

میں نے کہا: "پڑھا تو نہیں سنا ہے۔"

"کیا سنا ہے؟"

"یہی کہ زلیخا نے یوسف کو خواب میں دیکھا اور عاشق ہو گئی۔"

"کیا ایسا ممکن ہے؟"

"کیوں، ممکن کیوں نہیں۔"

"کیا یہ بھی ممکن ہے کہ صرف تصویر دیکھ کر کوئی کسی کو چاہنے لگے؟"

میں اُس کے اِس سوال کا مقصد سمجھ گیا۔ میں نے کہا: "شاید"

"شاید؟ یقیناً نہیں؟"

"مجھے کیا خبر۔ جسے اس کا تجربہ ہوا ہو وہ جانے۔"

اُس نے اپنا اٹیچی کیس کھول کر ایک لفافہ نکالا۔ اور مجھ سے پوچھا۔

"آپ جانتے ہیں اس میں کیا ہے؟"

میں نے کہا: "نہیں تو۔"

"کھول کر دیکھئے۔" اُس نے لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے لفافہ کھولا۔ اس میں میری وہی تصویر تھی جو میں نے رفیق کو بھیجی تھی۔

"یہ تمہارے پاس کہاں سے آئی" میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"چرا کر لائی ہوں۔" اُس نے مسکرا کر جواب دیا۔

اتنے میں ٹونڈلہ کا اسٹیشن آگیا۔ ہم نے گاڑی بدلی۔ اتفاق سے پھر ہمیں تنہا بیٹھنے کا موقع مل گیا۔

"آپ کب واپس جائیں گے؟" اُس نے پوچھا۔

"پرسوں رات کی گاڑی سے۔ اور آپ؟"

"شاید کل۔"

اِس کے بعد اُس نے پھر وہی قصہ چھیڑ دیا اور طرح طرح سے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ مجھے چاہتی ہے۔ شاید میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ وہ خوبصورت تھی۔ مگر صرف خوبصورت کہدینا اُس کے بے پناہ جمال و رعنائی کی توہین کرنا ہے۔ کس طرح آپ کو سمجھاؤں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ فرضی افسانوں میں خیالی حسن و زیبائی کے جو مُرقعے پیش کئے جاتے ہیں عذرا اُس کا ایک سچا نمونہ تھی۔ پھر بلا کی شوخ غضب کی چلبلی۔ دل کو موہ لینے والی باتیں۔ نجمہ کی محبت اگر پہلے سے میرے قلب و رُوح کی انتہائی گہرائیوں میں جاگزین نہ ہو چکی ہوتی تو یقیناً میں اُس کی پرستاری کو حاصلِ زندگی سمجھتا۔ نجمہ اگر ایک ستارہ تھی تو عذرا کہکشاں تھی۔ نجمہ اگر ایک پھول تھی تو عذرا ایک گلدستہ بلکہ گلستاں تھی۔ لیکن محبت کرنیوالے کا دل ایک ایسا گھر ہے جس میں ایک وقت میں ایک سے زیادہ مہمان کے ٹھہرنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔

آخر اُس نے سراپا اشتیاق بنکر پوچھا۔

"آپ نے میری بات کا کچھ جواب نہ دیا۔"

"کس بات کا؟" میں نے ہنسکر کہا۔

"آپ بھی مجھ سے محبت کر سکتے ہیں یا نہیں؟"

مجھے کسی افسانے کا ایک جملہ یاد تھا۔ وہی دہرا دیا کہ "بیوقوف، محبت کرنے کی چیز نہیں، ہو جانے والی شے ہے۔"

"تو آپ خود کو میری طرف راغب کیجئے۔ میری طرف ملتفت ہو جئے۔ آپ کو یقیناً محبت ہو جائیگی۔"

"مگر میرے کونسا بھینس نے کاٹا ہے کہ خواہ مخواہ اِس بکھیڑے میں پڑوں۔"

اِن لفظوں سے اُس کے دل پر سخت چوٹ لگی۔ اُس نے نہایت دردناک اور مایوسانہ لہجہ میں کہا: "بڑے بیدرد ہیں آپ۔"

اِتنا کہکر خاموش ہوگئی۔ آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لئے اور کوئی دو منٹ کے بعد جب ہٹائے تو میں نے دیکھا کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اُس کی یہ حالت دیکھکر میں بھی بے چین ہو گیا اس لئے کہ مبتدیٔ مرزا داغ کے:۔

کون یہ دیکھ سکے کوئی حسین روتا ہے
ہو بناوٹ سے بھی رونا تو قلق ہوتا ہے

محض اسکی خاطر میں اُٹھا اور چاہا کہ اُس کے آنسو پونچھکر اُسے تسکین دوں۔ اُسنے سخت لہجے میں کہا:۔

"آپ وہیں تشریف رکھئے۔ جو کچھ کہنا ہے، وہیں سے کہئے"

میں بیٹھ گیا۔ اب میں کیا کہتا۔ خاموش تھا اور اس اُدھیڑ بن میں مبتلا کہ کیا کروں جی میں کہتا تھا عجب لڑکی ہے خواہ مخواہ گلے کا ہار ہوئی جاتی ہے آخر اُس نے قسمیں کھا کھا کر اپنی محبت کا یقین دلانا شروع کیا۔ میں نے تنگ ہو کر کہا:۔

"فرض کرو مجھے تم سے محبت ہوگئی۔ پھر اس کا فائدہ؟"

"فائدہ! خوب کسی سے محبت کر کے دیکھو۔ بس پھر یہی آرزو ہوگی کہ کسی طرح یہ بھی مجھے چاہے"

غرض اس طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ یہانتک کہ آگرہ آنیکے آثار شروع ہو گئے۔ وہ سنبھل کر برقعہ اوڑھکر اترنے کے لئے تیار ہو بیٹھی۔ اُس نے میرا پتہ مانگا تھا مگر میں نے یہ کہکر پتہ دینے سے انکار کر دیا کہ میرے سب خط والد صاحب کے ہاتھ میں جاتے ہیں اسلئے خط و کتابت ناممکن ہے۔ اسٹیشن سے وہ اور میں ایک ہی مقام کو الگ الگ سواریوں میں چلے گئے۔

تیسرے دن رات کو دس بجے میں آگرہ سٹی اسٹیشن سے سوار ہوا۔ اُسی ڈبہ میں وہ پہلے سے بیٹھی ہوئی آگرہ کینٹ سے آرہی تھی اُسکے ساتھ اُس کی ایک سہیلی اختری بھی تھی۔ آج عذرا بہت افسردہ نظر آرہی تھی۔ چہرہ کملایا ہوا تھا۔ میں نے کہا تم تو کل واپس جانے والی تھیں؟ اُس نے کہا: ہاں، مگر کل طبیعت خراب ہوگئی۔ نہ جا سکی۔" پھر اُس نے وہی پہیلوں کی سی باتیں شروع کر دیں۔ اپنی محبت کے افسانے دُہراتی رہی رفتہ رفتہ بار بار موضوع گفتگو محبت سے بدل کر شادی ہو گیا۔ اس کا اصرار حد سے زیادہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے کہا: "سنو عذرا، تم شیعہ ہیں سُنّی۔ بھلا میرا تمہارا کیا جوڑ۔ تمہارے والدین کب اس رشتہ کو گوارا کر سکتے ہیں؟"

اُس نے کہا: "والدین کو راضی کرنا میرا کام ہے۔ رہا شیعہ سُنّی کا سوال تو مجھے افسوس ہے کہ آپ ایسی کمزور بات کہتے ہیں۔ محبت کرنے والوں کا مذہب فقط محبت ہوتا ہے۔ سُنّی کیا اور شیعہ کیا سُنّی شیعہ تو پھر مسلمان ہیں، محبت کے بندے تو کفر و اسلام میں بھی کوئی فرق نہیں کرتے۔ آپ نے سنا ہوگا، دلّی کے آصف علی بیرسٹر نے ایک ہندو بنگالن سے شادی کی ہے۔ لاہور کے کوئی رئیس ہیں لالہ ہرکشن لال، اُن کے بیٹے گوپال کی بیوی مسلمان ہے۔ یہ جو مسلمانوں کے بڑے مشہور لیڈر ہیں محمد علی جینا، انکی بیوی پارسی تھیں۔ کل ہی آپا ذکر کر رہے تھے کہ بمبئی کی کوئی بڑی معزز مسلمان خاتون ہیں عطیہ فیضی ان کے میاں یہودی ہیں۔ پھر ولایت جانے والے کتنے ہندو مسلمان، میمیں لے آتے ہیں جو سب عیسائی ہوتی ہیں۔ تو کیا اس سے انکی زندگی کی مسرتوں میں کوئی کمی آجاتی ہے۔ بہرحال اگر تم اس بے معنی اختلاف کی بنا پر مجھے ٹھکرا رہے ہو تو اچھا تم اپنے گھر مجھے شیعہ مت رہنے دینا!"

"مگر تمہارے والدین کبھی اس رشتہ پر راضی نہیں ہو سکتے"

"یہ آپنے کیسے فرض کر لیا۔ آپ انہیں مجھ سے زیادہ جانتے ہیں؟ آپ کو کیا خبر کہ وہ مجھے کتنا چاہتے ہیں۔ نو بہن بھائیوں میں میں اکیلی بچی ہوں۔ دونوں مجھے دیکھکر جیتے ہیں۔ آجتک میری کوئی خواہش رد نہیں کی۔ کیا میری زندگی بھر کی خوشی خاک میں ملا دینگے؟"

"اچھا میں والدہ سے مشورہ کر کے بتلاؤں گا"

"خوب، شادی ہو آپکی اور مشورہ دیں والدہ!"

"مگر میں اُن کے مشورہ کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا"

"اچھا، خدا حافظ" کہکر وہ کھڑی ہوگئی۔ علیگڈھ کا اسٹیشن

آگیا۔ ٹرین رک گئی۔ وہ اور اختری دونوں اتر کر چلی گئیں۔ میں نے گھر پہونچکر والدہ سے ان واقعات کا قطعی ذکر نہیں کیا۔ دراصل میں نے عذرا سے جو کچھ کہا تھا وہ سب دفع الوقتی کیلئے تھا۔ اس واقعہ کے چھ مہینے بعد میں پھر آگرہ گیا۔ عذرا کو کسی طرح خبر ہو گئی۔ اس نے بہت منتوں سے کہلا کر بھیجا کہ "مجھ سے ملے بغیر واپس نہ جانا"۔ ملاقات کا دن اور وقت مقرر ہوا۔ مجھے اختری کا رشتہ کا بھائی بتایا گیا۔ عذرا کے والدان دونوں کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ میری بے انتہا خاطر مدارات کی گئی۔ عذرا بظاہر پردے میں رہی۔ اختری سامنے آئی۔ اس نے عذرا کے امتحان میں پاس ہونے کی خوشخبری سنائی۔ عذرا نے پھر وہی رونا رونا شروع کیا۔ عاجزانہ منتیں۔ بیکسانہ التجائیں۔ آہیں، آنسو کونسی چیز تھی جو اس نے پیش نہیں کی۔ میں سخت الجھن میں مبتلا تھا۔ آخرٹالنے کی ایک صورت میری سمجھ میں آگئی۔ میں نے کہا "اچھا تم انٹرنس پاس کر لو۔ میں شادی کیلئے تیار ہوں۔"

تقریباً ایک سال گذر گیا۔ اس درمیان میں کئی مرتبہ آگرہ جانا ہوا۔ مگر عذرا سے صرف ایک ملاقات ہوئی۔ انٹرنس کے امتحان میں وہ فیل ہو گئی تھی۔ اس خبر سے مجھے خوشی بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ میں نے کہا شادی کے لئے شرط امتحان پاس کرنے کی تھی۔ وہ تم نے پوری نہیں کی۔ اب مجھے الزام نہ دینا۔ اس پر وہ بہت بگڑی۔ کہنے لگی "اچھا ایک سال اور مصیبت جھیلونگی"۔

خدا جانے کیوں میرے والدین اب میرے آگرہ جانے کو شک کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ اس لئے وہ پہلی سی سہولتیں اب نہیں رہی تھیں۔ بہرحال جب موقع ملتا میں آگرہ ضرور جاتا۔ اس میں شک نہیں کہ نجمہ سے مجھے محبت تھی۔ لیکن جب عذرا سے ملاقات ہوتی تھوڑی دیر کے لئے میں نجمہ کو بھول جاتا۔ کچھ دن اور گذر گئے۔ والد نے ایک کام سے دہلی بھیجا۔ میں دہلی ہوتا ہوا آگرہ پہونچا۔ یہاں عذرا کے چچا کے انتقال کی خبر سنی۔ میں تعزیت کے لئے عذرا کے یہاں گیا۔ بہت دیر تک عذرا سے باتیں ہوئیں۔ میں نے کہا "عذرا میری والدہ کسی طرح اس شادی پر راضی نہیں ہوتیں۔ بتاؤ اب میں کیا کروں"۔

"آپ کچھ نہ کریں صرف میرے ساتھ شادی کرلیں"۔

"اور اگر والدین نے مجھے گھر سے نکالدیا تو؟"

"تو میرا گھر موجود ہے"۔

"نہیں عذرا، باپ کا گھر تمہارا گھر نہیں ہوسکتا"۔

"شاید نہ ہوسکتا ہو۔ مگر آپ پہلے اپنا اطمینان کرلیجئے۔ ہمارا اپنا جو کچھ ہے اس کا حال تو شاید آپ کو معلوم ہی ہوگا۔ پھر چچا ابا نے بھی کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ چچی پہلے مر چکی ہیں۔ ان کے تمام ترکہ کی وارث میں اکیلی ہوں۔ جہانتک میں نے سنا ہے نقد و جنس سب ملاکر پچاس ہزار سے کم کی مالیت نہ ہوگی۔ میں اسکے لئے بالکل تیار ہوں کہ پہلے آپ اپنے نام جائداد لکھوالیں بعد میں شادی کریں۔ آمدنی اتنی ہو کہ اگر آپ کچھ نہ کریں تو بھی ہم عیش سے زندگی گزار سکتے ہیں"۔

یہ سب تفصیلات سنکر ایک لمحہ کیلئے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مگر جلد ہی یہ سب کچھ مجھے خوبصورت لفظوں کا ایک گھروندا معلوم ہوا اور بس۔ گھر آکر رفیق سے جو کچھ سنا اس سے عذرا کے حرف حرف کی تصدیق ہو گئی۔ انسان کے نفس کی کمزوریوں کا شمار شاید کوئی نہیں جانتا۔ نہ ان کی نوعیت کا سمجھنا ممکن ہے۔ کیا قیامت ہے کہ انسان کبھی خود اپنے آپ کو بھی دھوکا دینے لگتا ہے۔ میں برابر اس امر کا مدعی تھا کہ مجھے نجمہ سے محبت ہے لیکن اس کے باوجود خیال اب بار بار ایک تصویر سامنے لاتا تھا جس میں عذرا دلہن بنی عابد کے شبستان راحت کی زینت نظر آتی تھی۔ مراد آباد پہونچکر میں نے والدہ کو سب حال سنایا اور عذرا سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی ——

اللہ اکبر! معلوم ہوتا تھا کہ کوئی تباہ کن طوفان امنڈ آیا۔ یا بارود کے ڈھیر میں چنگاری جا پڑی۔ یا کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹ گیا۔ یا وہ آخری زلزلہ آگیا "جب زمین اپنے بوجھ باہر نکال پھینکے گی"۔ کتنا چیخیں، کتنا چلائیں، کتنا گرجیں، کتنا برسیں۔ میں سخت پشیمان کہ میں نے کیوں ان سے اس بات کا تذکرہ کیا۔ عذرا میں اگر جواہرات بھی جڑے تھے

تو اُن کے لئے وہ بیکار تھی، کیونکہ وہ شیعہ تھی۔ پھر نہ اپنا کُنبہ نہ خاندان، نہ ذات نہ برادری۔ سرے سے سرے تک بیگانگی ہی بیگانگی۔ سب پر طُرّہ پردیس۔ جس لڑکی میں یہ سب خرابیاں ہوں وہ ہرگز اُنکی بہو نہیں ہو سکتی۔ اُن کا یہ فیصلہ قطعی اور اُن کا حکم آخری تھا جس میں نظرِ ثانی کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ میری جان عجب کشمکش میں مُبتلا تھی ادھر عذرا کا یہ حال کہ اگر مجھ سے شادی نہ ہوئی تو مر ہی جائیگی۔ ادھر نجمہ کی محبت رہ رہ کر دامنِ دل کھینچتی تھی۔

بہت دنوں کے بعد میں پھر آگرہ گیا۔ عذرا اس مرتبہ بھی امتحان میں فیل ہو گئی تھی۔ میں نے اس کی ناکامیابی کا تذکرہ کیا تو رونے لگی اور اس طرح تڑپ تڑپ کر روئی کہ مجھ سے اُس کی وہ تباہ حالت کسی طرح دیکھی نہ گئی۔ کلیجہ مُنہ کو آنے لگا۔ باتیں تو گھنٹوں ہوئیں مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ مَیں پلٹا ہوں تو دل حد درجہ افسردہ و غمگین تھا۔ عذرا سے میں ایک قسم کی لڑائی سی کر کے آیا تھا۔ مگر انسان بھی عجب ہیولا ہے، ذرا سی دیر کسی ایک صورت پر قائم نہیں رہتا۔ اُدھر عذرا کو صاف جواب دے دیا۔ اِدھر ہر لحہ یہ ارادہ پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ چاہے کچھ ہو عذرا ہی کو اپنی رفیقۂ حیات بناؤنگا۔ آج شام ہی سے کھانا کھا کر لیٹ رہا اور آدھی رات تک دماغ اِنہیں خیالات کا آماجگاہ بنا رہا۔ صبح کو نجمہ آئی۔ اتفاق سے ہمیں تنہائی مِلگئی۔ وہ سخت پریشان معلوم ہوتی تھی۔ خلافِ معمول اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر پہلے دبایا پھر چُوم لیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ بجلی کی ایک رَو سر سے پاؤں تک میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میں نے انتشار کا سبب پوچھا۔ اُس نے کہا "رات میں نے ایک بہت ہی پریشان خواب دیکھا ہے۔ کیا دیکھتی ہوں کہ ایک جنگل ہے۔ سُنسان، ویران، شام ہو رہی ہے۔ تم میرے زانو پر سر رکھے سو رہے ہو کہ برابر کی جھاڑی سے ایک خونخوار بھیڑیا نکلا۔ اُس نے ہم پر حملہ کیا اور تمہیں اُٹھا کر لے چلا۔ تمہیں چُھڑانے کی کوشش میں مَیں بُری طرح زخمی ہو گئی مگر ناکام رہی۔ دہشت اور تکلیف کے مارے میری چیخ نکل گئی۔ اُسی سے آنکھ کھل گئی۔ جاگی ہوں تو دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ حواس بجا نہ تھے۔ ابھی خوب رات تھی۔ پھر صبح تک نیند نہ آئی۔ جب سے ابتک دل کو سخت وحشت ہو رہی ہے۔" میں نے کہا "واہ، یہ تو بہت اچھا خواب ہے اِس کی تعبیر مجھ سے سُنو۔ میری موت کے معنی ہیں طولِ حیات اور تم سے جُدائی کا مطلب ہے ابدی یکجائی۔ کیونکہ عورت کا خواب اُلٹا ہوتا ہے۔" میری اِن باتوں سے نجمہ شگفتہ ہو گئی۔ مسرت کی چمک اُس کی آنکھوں میں نمایاں تھی۔ تبسّم انبساطِ قلب کا آئینہ دار تھا۔ پھر ہم ایک دوسرے کے ساتھ محبت کی چُہلوں اور چوچلوں میں مصروف ہو گئے۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے مگر یہ واقعہ ہے کہ نجمہ کی صورت دیکھکر رات کی ساری باتیں، سارے ارادے ایک خواب بن گئے تھے۔ وہی مثل تھی کہ رات گئی بات گئی۔ عذرا کی تصویر دُھندلی ہو گئی تھی۔ اور میرے دل کے جو گوشے اُس نے نجمہ سے چھین لے تھے پھر ایکبار نجمہ کے قبضہ میں آگئے تھے۔ آج پھر نجمہ میری ہونیوالی شریکِ زندگی تھی۔

اس واقعہ کے پانچ مہینے بعد یعنی ۱۹۳۵ء کے آخر میں مَیں پھر آگرہ گیا۔ نجمہ سے مُلاقات نہیں ہوئی۔ وہ اپنی بہن کے یہاں سہارنپور مہمان گئی ہوئی تھی۔ آگرہ میں میرا دل نہ لگا۔ دو دن رہ کر واپس چلا آیا۔ جس روز میں واپس آرہا تھا رفیق نے برسبیلِ تذکرہ ایک واقعہ سُنایا جس کے تصوّر سے اِس وقت بھی میرا کلیجہ کانپ رہا ہے۔ انہوں نے کہا "کئی مہینے ہوئے عذرا کے والد یکایک سخت بیمار پڑ گئے۔ علالت نے کچھ ایسا طول کھینچا کہ اُنہیں اپنی زندگی سے مایوسی ہو گئی۔ وہ چاہتے تھے کہ جس طرح ہو اُن کی کھلی آنکھوں عذرا کی شادی ہو جائے۔ عذرا کو بے یار و مددگار چھوڑ جانے کا خیال اُنہیں اور بھی ہلاک کئے ڈالتا تھا۔ اتفاق سے ایک مُناسب موقع بھی جلد ہی ہاتھ آگیا۔ عذرا لب گور باپ کی آخری تمنّا کو پورا کرنے کے لئے شادی پر آمادہ ہو گئی۔ اُسی روز وہ مجھ سے ملی تھی۔ ایسی حالت تھی جیسے کوئی مہینوں کا بیمار۔ چند روز کے بعد علیگڈھ کے ایک صاحب مسٹر جعفر بی۔ اے۔ سے اُس کا عقد ہو گیا۔ اُس وقت وہ خاصی بیمار تھی۔ بیماری ہی کی حالت

میں رخصت کی گئی۔ علیگڈھ جاکر اُس کی طبیعت اور بھی زیادہ خراب ہو گئی۔ جب وہاں علاج سے کچھ فائدہ نہ ہوا تو یہاں آکر ہسپتال میں داخل ہو گئی۔ اُس کے آگرہ آنے کے کوئی بیس روز بعد اُس کے والد کا انتقال ہو گیا وہ اُسی بیماری کی حالت میں گھر آگئی۔ اُدھر خود اپنی طویل علالت، اُدھر باپ کی موت کا صدمہ۔ بہت نڈھال ہو گئی تھی۔ ایک دن ہمارے یہاں آئی۔ میں تو اُسے دیکھکر ڈر گئی۔ بلکہ میں نے تو اسی وقت سمجھ لیا تھا کہ اب یہ بھی کوئی دن کی مہمان ہے۔ اُس وقت نجمہ بھی یہیں تھی۔ اور بھی کئی لڑکیاں میرے پاس بیٹھی تھیں۔ اُس نے آتے ہی بلا کسی تمہید کے مجھ سے تمہارا پتہ دریافت کیا۔ میں نے کہا کیا کرو گی؟ کیا خط لکھو گی، اس پر نجمہ اُسے بنانے لگی۔ شمیم نے کہا: شریفوں میں تو یہ دستور نہیں ہے کہ ایک سے منگنی ایک سے بدھائی۔ تمہاری تو شادی ہو چکی ہے۔ اس پر اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ میں نے شمیم کو ڈانٹا۔ اب وہ میرے گلے میں باہیں ڈالکر اور بھی زار و قطار رونے لگی اور کہا: "رفیق، میرا کہا سنا معاف کر دینا۔ یہ آخری ملاقات ہے۔" اُس کے ان لفظوں سے میرا دل دکھ گیا مگر میں نے اُسے تسلی دینے کیلئے کہا کہ "دیوانی ایسی فالیں کیوں نکالتی ہے۔ چند روز میں اچھی ہو جائیگی۔" اُس نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور خدا حافظ کہہ کے رخصت ہوئی۔ اُسی روز ایک نوکر کو ساتھ لے رات کی گاڑی سے علیگڈھ روانہ ہو گئی۔ آدھی رات کو گھر پہونچی۔ اتفاق سے مسٹر جعفر اُس شب کو کہیں شادی میں گئے ہوئے تھے۔ صبح کو آئے تو نوکروں سے بیوی کی آمد کا حال سنا۔ حیران رہ گئے۔ کمرے میں جاکر دیکھا تو عذرا سو رہی تھی۔ انہوں نے نام لیکر پکارا۔ مگر عذرا میں جواب دینے کی قوت ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکی تھی۔ اُس کی نیند ایسی نہ تھی کہ وہ جگانے سے جاگ اُٹھے۔ شوہر کے انتقال اور جوان بیٹی کی موت کے صدمے نے عذرا کی والدہ کو دیوانہ کر دیا۔ یہاں تک حالت خراب ہوئی کہ اب شہر کے گلی کوچوں میں ماری ماری پھرتی ہے۔"

رفیق سے یہ واقعات سُنکر میری جو حالت ہوئی نہ میں اُسے بیان کر سکتا ہوں نہ شاید کوئی سمجھ سکتا ہے۔ بہرحال میں ایک بیہوشی کے عالم میں اسٹیشن آیا۔ تانگہ سے اتر رہا تھا کہ مسافر خانہ کے باہر ایک عجب عبرتناک اور رقت آور منظر دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر کی پاگل عورت، گندے چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی، جھاڑ جھنکار کی طرح اُلجھے ہوئے بال۔ چہرے پر وحشت کے آثار۔ "میری بیٹی، میری بیٹی" چلاتی ہوئی ایک طرف کو بھاگی جا رہی تھی۔ لڑکوں کا غول اُس کے پیچھے تھا۔ میں نے اُسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ یہ بدنصیب عذرا کی ماں تھی۔ میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ بے اختیار اُس کی طرف دوڑا۔ سامنا ہوا تو وہ مجھے دیکھکر کچھ ٹھٹکی۔ نیچے سے اوپر تک مجھے دیکھا۔ میں ابھی کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ وہ ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگی۔ میں دم بخود تھا۔ پھر وہ چپ ہو گئی۔ پھر آپ ہی آپ کچھ باتیں کرنے لگی۔ پھر ایک زور کا قہقہہ لگایا اور ایک طرف کو دوڑی چلی گئی۔ لڑکوں کا غول اُس کے پیچھے تھا۔ اس بدنصیب عورت کو اس حال میں دیکھکر میرا جی بھر آیا۔ بہت ضبط کیا، آنسو نہ رُکے۔ جی چاہتا تھا کہ چیخیں مار مار کے روؤں۔ اُس وقت پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ اس بھرے گھر کی تباہی کا باعث میں ہوں۔ عذرا کو میں نے قبر کی آغوش میں سلایا۔ اُس کی ماں کو میں نے سودائی بنایا۔ میں ریل میں سوار ہوا۔ ایک عجب خود فراموشی کا عالم تھا۔ کچھ خبر نہ تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور میں کہاں جا رہا ہوں۔ جی بار بار اُمنڈتا تھا۔ رات کا بیشتر حصہ رونے میں کٹا۔ گھر پہونچکر بھی سکون نصیب نہ ہوا۔ طبیعت سخت وحشت زدہ رہی۔ کئی مہینے اسی رنج و غم میں کٹے۔ سب سے عجیب بات یہ کہ نجمہ کی یاد اب بالکل فراموش ہو چکی تھی۔ اب مجھے عذرا سے محبت تھی۔ آپ میری حماقت پر ہنسیں گے۔ یقیناً آپ کو ہنسنا چاہیئے۔ عذرا مجھے دل سے چاہتی تھی۔ مجھ پر جان قربان کرتی تھی مگر میں نے جیتے جی کبھی اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ کبھی ایک لفظ پیار کا نہیں کہا۔ مایوسیوں نے زندگی کی ساری مسرتیں اس سے چھین لیں۔ بدبخت عابد کو نہ پا سکنے کا غم اُس سے نہ اٹھ سکا۔ آخر موت کے دامن میں اُس نے پناہ لی۔ زمین لئے نگل

گئی خاک میں مل کر خاک ہوگئی اور میں ہمیشہ کیلئے اپنی نامرادی اور اپنی بدبختی پر آنسو بہانے کے لئے زندہ رہ گیا۔

میں آپ سے بیان کر چکا ہوں عذرا بہت خوبصورت تھی۔ نجمہ سے کہیں زیادہ۔ پھر بھی وہ میرے دل کو رام نہ کر سکی۔ مگر جب یاس و محرومی نے اُسے موت کی گود میں ابدی نیند سُلا دیا تو میری آنکھیں کُھلیں۔ وہ جذبات جو اُس بدنصیب کی زندگی میں خوابیدہ تھے اب انگڑائیاں لے لیکر جاگ اُٹھے۔ جو کچھ مجھے یاد تھا سب بھول گیا اور جو کچھ بھولا ہوا تھا یاد آگیا۔ اب میں نے محسوس کیا کہ واقعی مرنے والی کو مجھ سے محبت تھی۔ ایسی شدید محبت جو عام طور پر نہیں ہوتی۔ جو کام اُسکے حُسن و جمال سے نہ ہو سکا تھا اُس کی محبت نے کیا۔ اُس کی حشر ساماں جوانی مجھ پر فتح نہ پا سکی حُسن کو شکست ہوگئی۔ لیکن اس کی موت کے بعد جب مجھے اُس کی محبت کا احساس ہوا تو میرے دل کی دُنیا ہی بدل گئی۔ میں اُس کے لئے دیوانہ ہوگیا۔ اِسی خیال کو میں نے ایک شعر میں بیان کیا ہے جو اکثر وردِ زبان رہتا ہے اور مرنے والی کی یاد کو تازہ رکھتا ہے۔ آپ بھی سن لیجئے اور دو آنسو بہا کر میرے ختم نہ ہونے والے غم میں شریک ہو جائیے۔

برقِ جمال نے تو نہ کھوئے تھے میرے ہوش
ہاں، تم نے مجھکو چاہ کے دیوانہ کر دیا

نجمہ اب بھی مجھ سے پہلے کی طرح محبت کرتی ہے اور اِس اُمیدِ موہوم پر مسرور ہے کہ میں اُس سے شادی کر لونگا۔ مگر میرا دل سرد ہو چکا ہے۔ عذرا کے ساتھ مر چکا ہے۔ تاہم محض اُس کی خوشی کے لئے میں اُس سے شادی کرنے پر تیار ہوں لیکن میرے والدین کسی طرح راضی نہیں ہوتے۔ سبب وہی کہ پردیس ہے۔ عذرا کا خون میری گردن پر ہے۔ اب نجمہ کی زندگی برباد کرنے کا ذمہ دار بھی یقیناً میں ہی ہوں گا۔ للہ، اب آپ ہی بتائیے کہ میں کیا کروں!

والسلام۔ آپکا عابد پریمی

ہاں ایک چھوٹا سا واقعہ اور سُن لیجئے۔ اختری کے متعلق میں بیان کر چکا ہوں کہ وہ میری عذرا کی رازدار سہیلی تھی۔ وہ اکثر عذرا کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ جہاں تک میرا خیال ہے اُس کی تعلیم کے مصارف اور دیگر اخراجات کے کفیل بھی عذرا کے والد ہی تھے۔ اُس کے متعلق مجھے اِس سے زیادہ اور کچھ معلوم نہیں۔ ابھی چند روز ہوئے میرے ایک دوست بمبئی سے تشریف لائے۔ بمبئی کی نامور فلم ایکٹرسوں کا ایک البم انہوں نے تیار کیا ہے۔ مجھے بھی دکھایا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ اختری کی تصویر بھی اس میں موجود ہے۔ اب اُس نے اپنا نام مس کنول کماری رکھ لیا ہے۔ اختری کی تصویر دیکھکر پرانے زخم ہرے ہوگئے۔ عذرا کی معصوم صورت اور رشک آور دو آنکھیں سامنے آگئیں اور بے اختیار میرے آنسو گرنے لگے۔ میرے دوست نے پوچھا کیا تمہیں کنول کماری سے غائبانہ محبت ہوگئی ہے؟"

میں نے کہا "ہاں" میں یہ ساری داستان انہیں کہاں تک سُناتا۔ فقط۔

بادۂ سرجوش

قانون کچھ اور، آدمیت کچھ اور
آداب کچھ اور، حکمِ فطرت کچھ اور
اللہ کا قول و فعل اتنا متضاد
احکام کچھ اور ہیں، مشیت کچھ اور

ساغر شبِ ماہتاب میں چھلکے جائے
تارے ہیں چمکتے ہیں دھندلکے جائے
آنکھوں سے پیے جام تری زلفوں کا
شبنم سے کلی کا رنگ جھلکے جائے

افسوس یہ ظلم و جبر سہنا تیرا
فطرت نہیں مانتی ہے کہنا تیرا
ہے صرف اک امر اتفاقی واللہ
ہندو ہونا، زمیں پہ رہنا تیرا

ماضی کی ہنسی خون رلاتی ہے مجھے
گزری ہوئی زندگی ستاتی ہے مجھے
جو عہد کہ گزرا تمہاری صحبت میں
اس عہد کی یاد کھائے جاتی ہے مجھے

جوش ملیح آبادی

میرے خواب کے جزیرے

بہار کے بادل

یکایک کہیں دُور کی دُنیاؤں سے ہین ہین بادل آگئے۔

تم نے کبھی بہار کے سنہرے بادلوں کو برستے دیکھا ہے؟۔

اے اللہ! جب بہار کے بادل، سنہرے کاسنی، ورنارنجی بادل زمین پر برستے ہیں تو آدمی بالکل نہیں بھیگتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پریوں کی آنکھوں میں سے ٹپ ٹپ آنسو ٹپک رہے ہوں۔

برسات کی آواز میں ایسا ترنم ہوتا ہے جیسے رات کے وقت خواب کے جزیرے میں کوئی ہلکی ہلکی محبت میں ڈوبی ہوئی کہانی سنا رہا ہو۔

حسن

چہرہ مومی فانوس کے شعلے کی طرح دمک رہا تھا۔

اور ہونٹ عشق پیچاں کے آتشی رنگ پھولوں کی طرح گلابی ہو رہے تھے۔

کیا بات ہے؟ — آج تم پر کس دیوتا کا سایہ پڑ رہا ہے؟۔

خوابناک سماں

وہ خوابناک رات!

سفید چاند چپ چاپ نکل رہا تھا۔

جیسے رُوح آہستہ آہستہ جسدِ خاکی سے علیحدہ کرلی جارہی ہو۔ کھڑکی سے نارنگی اور ہارسنگھار کی کلیوں کی تیز لپٹیں آرہی تھیں۔ جیسے جل پریاں اپنی خوشبودار پوشاک میں ہواؤں میں تیر رہی ہوں!

حجاب امتیاز علی

کسان باپ

صبح سے تا شام محنت کر کے میں
دھوپ میں دن بھر مشقت کر کے میں

تھک گیا ہوں خستگی سے چور ہوں
پھر بھی خوش ہوں شاد ہوں مسرور ہوں

کیونکہ اپنا کھیت کاٹ آیا ہوں میں
لانک سے کھلیان پاٹ آیا ہوں میں

بیوی بچوں میں ہوں اپنے اب مگن
روز یونہی رہتے ہیں ہم سب مگن

میرا بیٹا میری قسمت کا شریک
جس سے رہتا ہے مرا ہر کام ٹھیک

وہ رہے گا رات کو کھلیان میں
تاکہ کھٹکا ہو نہ میرے دھیان میں

رکھی سوکھی کھا کے سو جاؤں گا میں
تازہ دم پھر صبح ہو جاؤنگا میں

دل سے بیٹا اپنا پیارا ہے مجھے
اس سے جینے کا سہارا ہے مجھے

میری دیکھا بھالی کرتا ہے یہی
ہر طرح رکھوالی کرتا ہے یہی

سیوا کرتا ہے جو ہو کچھ دکھ مجھے
اس سے ملتا ہے جہاں کا سکھ مجھے

میری ساری کھیتی باڑی اس سے ہے
میرے گھر کی چلتی گاڑی اس سے ہے

میری بھینسیں میری گائیں میرے بیل
جو گئے ہیں دھیرے دھیرے انکی بیل

جو مرے سامانِ راحت ہیں تمام
میرے بیٹے کی بدولت ہیں تمام

یہ دہی، یہ دودھ، یہ گھی، یہ اناج
ساری دنیا کو ہے جس کی احتیاج

جس کا بھوکا راج بھی دربار بھی
جس سے مستغنی نہیں سرکار بھی

باپ بیٹے ہم مہیا کرتے ہیں
کاشتکاری کر کے پیدا کرتے ہیں

خود کسی سے لینے کچھ جاتے نہیں
ہم دیا انسان کا کھاتے نہیں

دست و بازو پر بھروسہ ہے ہمیں
خود خدا نے پالا پوسا ہے ہمیں

بادشاہ ہو یا ہو راجہ، کوئی ہو
کیسے ہم بندوں کا خواجہ کوئی ہو

ہم کسی کی چاکری کرتے نہیں
کارِ دریوزہ گری کرتے نہیں

بلکہ ہیں اُن کا اُٹھاتے بار ہم
اپنی دیدیتے ہیں پیداوار ہم

گو نحیف و خستہ حال و زار ہیں
لیکن اس دنیا کے پالن ہار ہیں

ہم نہیں رکھتے لئیمانہ سرشت
دی ہے قدرت نے کریمانہ سرشت

راحت تھانوی

ساس کا خط بہو کے نام

(شادی سے پہلے)

جانِ مادر!

جیو! جیو! میرے لڑنے جھگڑنے کے ارمانوں کا خزینہ اور میرے وقت بے وقت کے غصہ کا تختۂ مشق بننے کے لئے ہزار برس جیو!!۔

میری دُعا ہے کہ تم جلد از جلد اس راز سے واقف ہو جاؤ کہ ساس کس بلا کا نام ہے۔ خدا مجھے وہ دن جلد دکھائے جب میں اپنے بنے اور بنی کو آباد اور خوش و خرم دیکھ دیکھ کر ایک زخمی سانپ کی طرح پیچ و بل کھاؤں اور تمہاری بات بات پر ناک بھوں چڑھاؤں۔

بیٹی! میری کسقدر تمنا ہے کہ جب تم میرے ویرانے کو آباد کرو تو تمہیں آنکھوں پر بٹھاؤں۔ تاکہ ایک ساس کے نوکِ مژگاں کا ذرا تم بھی مزا چکھ لو۔ تمہیں اپنے دل میں جگہ دوں تاکہ تم کہیں آتے ہی گھر پر قبضہ جما کر مجھے بے دخل نہ کر سکو۔

میں خُدا کی بے حد احسانمند ہوں کہ اس نے مجھے زیورِ علم و سعادت سے آراستہ ایک بنی عنایت کی تاکہ اُسے بھی میری جہالت دیکھ دیکھکر کچھ خوشی حاصل ہو اور اُسے معلوم ہو کہ بہو بن کر لڑکی کس مصیبت سے دوچار ہوتی ہے۔ وہ مصیبت جس پر میں تو ہزار مسرتیں نثار کر دوں۔ وہ گھر ہی کیا جہاں آٹھ پہر میں سولہ بار بہو ساس میں کھٹ پٹ نہ ہوا کرے۔

جانِ مادر! تمہارا خیال تو میرے لئے محرم کا چاند ہے اور میری رُوح تمہاری آمد آمد کے خیال سے گھبرانے لگتی ہے! اور میں تو اس گھڑی کا انتظار کر رہی ہوں جب میری چوٹی تمہارے ہاتھ میں ہوگی اور میاں کا جوتا تمہارے سر پر برس رہا ہوگا۔

ہاں مجھے اس بات سے دُکھ ضرور ہوتا ہے کہ تم خانہ داری کے اُمور کو خوب سمجھتی ہو۔ اور اس سے تمہیں خاصی دلچسپی بھی ہے۔ کیونکہ اس طرح تو مجھے ایک عضوِ معطل بنکر گھر میں رہنا ہوگا۔

بنی! بھرے گھر کا راج چھوڑنا کون پسند کرتا ہے۔ اور یہ تو مجھے تم ایسی سگھڑ اور سعادتمند بہو سے اُمید ہی ہے کہ تم آتے ہی میاں کو لیکر الگ مجلس جماؤ گی۔ لیکن میری جان! مجھ سے نبٹنا اتنا آسان بھی نہ سمجھ رکھنا۔ میں تو ایک ایک بات پر سو جان سے قربان ہو ہو جانے والی ہوں۔

بیٹی! میں تو اللہ میاں کی درگاہ میں ہاتھ اٹھا اُٹھا کر التجا کرتی ہوں کہ میری زندگی میں تو تمہیں ایک پل کا چین نصیب نہ ہو۔ تمہاری نند بھی تم سے ایک آدھ جھپٹ لینے کو تلملا رہی ہے۔ خُدا تمہیں ہم ماں بیٹی کی بدمزاجی کا تختۂ مشق بننے کیلئے سلامت رکھے۔

راقمہ تمہاری "میمی"[1]

(یعنی بکری کی بچی)

ایم - اسلم

[1] میمی، ممانی کا مخفف ہے۔

افرودائتی کا ایک باب۔

دیوی کے باغات

افرودائتی استارتی کا ہیکل شہر پناہ کے باہر ایک وسیع مرغزار میں تعمیر کیا گیا تھا۔ جہاں مختلف الالوان پھولوں کے تختوں اور سایہ دار کُنجوں کی کثرت تھی۔ اس جگہ رود نیل کا پانی سات چھوٹی چھوٹی نہروں کے ذریعے آکر اس سرسبز و شاداب اور عظیم الشان چمنستان کو سدا بہار رکھتا تھا۔

یہ خطۂ گل، یہ ساحل بحرِ زخار، یہ ندیاں عمیق و تیز رفتار، یہ جھیلیں صاف و شفاف، یہ سبزہ زار پُرشکوت و شاداب اِس قلب صحرا میں وقتِ مذکور سے دو صدی پیشتر دائرۂ وجود میں آئے تھے۔ یعنی بطلیموس اوّل[1] کے عہدِ حکومت میں ان کی بُنیادیں رکھی گئی تھیں۔ اس کے حکم سے لگائے ہوئے انجیر کے درخت اس طویل مدّت میں نشو و نُما پاکر گھنے اور فلک بوس ہوگئے تھے۔ اس آبِ حیات افزا کے زیر اثر بے برگ و بار میدان سرسبز و شاداب ہوگیا تھا، اور چھوٹے تالاب پھیل کر جھیلوں میں بدل گئے تھے۔ غرض یہ ہے کہ قدرت کی فیاض دیوی نے اِس مختصر سی سرزمین کو ارتقاکی تمام منزلوں سے گذار کر فردوس بداماں کر دیا تھا۔

وہ باغات بلحاظِ وسعت ایک وادی، یا ایک مسلسل خطے بلکہ ایک ملک سے زیادہ تھے۔ وہ بذاتِ خود ایک پوری دُنیا تھے۔ سنگین دیوار سے محدود اور ایک دیوی کے زیر فرمان۔ جو اِس عالمِ رنگ و بو میں رُوحِ حیات اور مرکزِ کائنات کا درجہ رکھتی تھی۔ کھلے چبوترے کی مانند ایک بالکل گول عمارت تھی جس کا طول اسّی اسٹیڈیا[2] اور ارتفاع بتّیس فٹ تھا۔ یہ کوئی معمولی دیوار نہ تھی۔ بلکہ ایک عظیم الشان شہر تھا جس میں ایک ہزار چار سو مکانات تعمیر کئے گئے تھے۔ اتنی ہی تعداد میں یہ مقدّس شہر مرلیوں سے آباد تھا۔ جو ستّر مختلف اقوام کی نمائندہ تھیں۔

یہ مقدّس مکانات یکساں نقشہ جات کے مطابق تعمیر ہوئے تھے۔ ہر دروازے پر، جو قرمزی تانبے کا تھا ——— کیونکہ تانبہ دیوی سے منسوب کیا جاتا تھا ——— کھٹکھٹانے کے لئے ایک کنڈی اور اُس کے ساتھ ہی مخصوص علامات کی وضع میں ایک گول تھالی آویزاں ہوتی تھی۔ تاکہ اس پر ضرب لگائی جاسکے۔ اسکے نیچے مکین کا نام مروّجہ حروف کے ساتھ کندہ ہوتا تھا۔ مثلاً:

Ω. Ξ. E.

ΚΟΧΛΙΣ

Π. Π. Π.

---

[1] اسکندرِ اعظم نے مصر فتح کرنے کے بعد ۳۲۳ ق.م میں اپنی فوج کے افسرِ اعلیٰ کو اسکندریہ کا صوبہ دار بنا دیا۔ سکندر کی وفات کے بعد ۳۰۵ ق.م میں مقدونیہ کا وہ خاندان سریر آرائے سلطنت ہوگیا۔ وہی صوبہ دار جس کا نام "لاگی" یعنی "نجات دہندہ" تھا بطلیموس اوّل کہلایا۔ اسکے قائم کئے ہوئے عجائب گھر اور کتبخانے کو تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ ۲۸۵ ق.م میں وہ تخت سے دستبردار ہوا اور دو سال بعد مرگیا۔

[2] زمین ناپنے کا یونانی پیمانہ جو یونانی ۶۰۰ فٹ اور انگریزی ۵۸۲ فٹ کے برابر ہے۔ اسّی اسٹیڈیا آٹھ میل سے کچھ زیادہ ہوئے۔

دروازے کے دونوں پہلوؤں میں دو صحنچیاں دکانوں کی وضع کی ہوتی تھیں یعنی باغیچے کی جانب کوئی دیوار تعمیر نہیں کی جاتی تھی۔ دائیں جانب کی صحنچی "جلوہ گاہ" کہلاتی تھی۔ جب لوگوں کی آمد و رفت کا وقت ہوتا تو مرلیاں بن سنور کر اس میں ایک بلند چبوترے پر بیٹھ جاتی تھیں۔ بائیں جانب کی صحنچی ان تماش بینوں کی پذیرائی کیلئے مخصوص تھی جو ساری رات کھلی فضا میں بسر کرنا چاہتے تھے تاہم گھاس پر سونا پسند نہیں کرتے تھے۔ کھلے ہوئے دروازے میں سے گزر کر ایک غلام گردش کی راہ کشادہ صحن میں پہونچنا پڑتا تھا جس کا فرش سنگِ مرمر کا تھا اور وسط میں ایک بیضوی حوض تھا۔ ستونوں کی ایک قطار روشنی کی چمک کو اس مقام تک پہونچنے نہ دیتی تھی۔ اور اسی کے ذریعے مکان کے ساتوں کمروں کا راستہ ہوا کے سرد جھونکوں سے محفوظ بھی ہو جاتا تھا۔ پشت کی جانب سنگ سرخ سے بنا ہوا استھان ہوتا تھا۔ ہر عورت کا فرض تھا کہ اپنے وطن سے دیوی کی ایک چھوٹی سی مورت اپنے ہمراہ لائے۔ اور اس گھریلو استھان پر رکھدے۔ وہ اپنی مادری زبان میں اس دیوی کی پوجا کرتی تھی جس کا مفہوم قریب کی دوسری عورتیں سمجھنے سے قاصر تھیں۔ لاکھی، ستارتیت، وینس، استر، فریجہ، مالیطہ، کاتیرس وغیرہ ان دیویوں کی مقدس شہوانی لذتوں کے مذہبی نام تھے۔ بعض مُرلیاں دیوی کے بجائے تمثیلی اشکال کی پرستش کرتی تھیں۔ مثلاً ایک سرخ گول ہنڈیا، ایک مخروطی شکل میں تراشا ہوا پتھر، ایک بڑی خاردار سیپ۔ ان میں سے اکثر مُرلیوں نے نرم لکڑی کے قدمچوں پر بھدی وضع کی چھوٹی مورتیں رکھ چھوڑی تھیں۔ جن کے بازو پتلے دبلے، پستان دبیز لٹکے ہوئے اور کولھے حد سے زیادہ فربہ تھے۔ جب ان کی کوئی دُعا قبول ہو جاتی تو وہ ان مورتوں کے قدموں پر برگ ہائے حنا بکھیرتیں، استھان پر گل فشانی کرتیں اور لوبان وغیرہ جلا کر دھونی دیتی تھیں۔ وہ مورتیں اُن کے رنج و غم کی تنہا رازدار، اُن کی تمام خدمات کی حقیقی شاہد، اور اُن کے عیش و نشاط کی واحد سرچشمہ تصور کی جاتی تھیں۔ جب کسی مُرلی کا انتقال ہو جاتا تو وہ مورت اس کے مختصر سے نازک تابوت میں رکھدی جاتی تاکہ اس آخری منزل کی محافظ و نگراں ثابت ہو۔

ان میں سب سے زیادہ حسین لڑکیاں ممالکِ ایشیا سے آتی تھیں۔ ہر سال باجگزارانِ سلطنت اور ہمعصر والیانِ ریاست کے پیش کردہ تحائف سے لدے ہوئے جہاز اسکندریہ میں اترتے تھے۔ ان میں روئی وغیرہ کی گٹھڑیوں اور حریمی بوتلوں کے علاوہ ایک سو دوشیزہ لڑکیاں بھی ہوتی تھیں جنکو مقدس باغات کی خدمت کیلئے ہیکل کے کاہن منتخب کرتے تھے۔ ان میں فلسطین کی یہودنیں، مائسیہ [۵]، فرانغیہ، اقریطش، اقباطنہ، بابل، خلیج فارس کے ساحلوں، اور گنگا کے مقدس کناروں پر رہنے والیاں سبھی شامل ہوتی تھیں۔ بعض کا رنگ صبیح، چہرے سکے کی مانند گول، اور گداز سینے۔ بعض کا رنگ پیلا جیسے بارش کے بعد مٹی کی حالت۔ نتھنوں میں طلائی بلاق، اور شانوں تک لہراتے ہوئے سیاہ گیسو۔

بعض ان سے بھی زیادہ دور دراز ملکوں سے آئی تھیں۔ پستہ قد، سڈول جسم اور سادہ لوح۔ جنکی زبان کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اور جو زرد بندروں سے مشابہ تھیں۔ ان کی آنکھیں کنپٹیوں تک طویل ہوتی تھیں۔ اور وہ اپنے سیاہ عمودی بالوں کو بغیر کسی ترتیب کے سنوارتی تھیں

---

[۵] یہ سب قدیم زمانے کے مشہور ترین مقامات ہیں۔ مائسیہ بحیرۂ مارمورا کے کنارے اشیائے کوچک کے شمال مغرب میں اطالوی صوبہ تھا۔ فرانغیہ بھی ایشیائے کوچک میں تین دریاؤں کے بیچ میں تین ہزار فٹ کی بلندی پر بہت وسیع سطح مرتفع تھی۔ اقریطش جسے انگریزی میں کریٹ کہتے ہیں بحیرۂ روم میں سب سے بڑا یونانی جزیرہ ہے۔ اقباطنہ جسے عہدِ جدید میں ہمادان کہتے ہیں۔ کوہ الوند کے دامن میں ملک میڈیا کا جو اب ایران کا ایک حصہ ہے مشہور دارالسلطنت تھا۔

تمام عمر بھٹکے ہوئے جانوروں کی مانند خائف سی رہا کرتی تھیں۔ وہ محبت کی ظاہر داریوں سے واقف مگر بوس و کنار کی مخالف تھیں۔ تماشہ بینوں
ِ جودگی میں وہ پنجوں کے بل بیٹھ کر آپس میں کھیلتیں اور بچوں کی طرح دل بہلاتی تھیں۔
ایک علیحدہ مرغزار میں ارضِ شمال کی سُرخ و سفید نازنینیں طائفہ کی صورت میں اکٹھی رہا کرتی تھیں جو رات کے وقت فرشِ سبزہ ہی کو
بستر بناتی تھیں۔ ان میں سرماطیہ کے خانہ بدوش قبائل کی عورتیں بھی تھیں۔ یہ اپنے بالوں کو تین حصوں میں تقسیم کر کے چوٹیاں گوندھتی تھیں
ب فربہ اندام اور قوی ہیکل تھیں۔ درختوں کی شاخوں سے اپنے لئے تاج بنانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اور کبھی کبھی اپنا دل بہلانے کیلئے
ِتی تھیں۔ تورانی بردی عورتیں ـــ چپٹی ناک، دبیز پستان، گھنے بال۔ قد آور طوطانی عورتیں جو اپنے بالوں سے مصری خواتین کو
ع کر دیتی تھیں۔ ان کا رنگ زرد بالکل بوڑھے آدمی کی مانند اور جسم کا گوشت بچوں کے گوشت سے زیادہ ملائم اور پلپلا۔ قوم گول کی عورتیں
یسے سُرخ گو یا مویشیوں کی اُون۔ بلا وجہ قہقہے لگانا اُن کی فطرت میں داخل تھا۔ قوم قلط کی باحیا نوجوان لڑکیاں جن کی پتلیوں کی رنگت
کے پانی کی طرح سبزی مائل تھی۔
کہیں کہیں، دن کے وقت گندمی رنگ کی ہسپانوی عورتیں نظر آتی تھیں۔ وہ اپنے گھنے بالوں کو بہت کاریگری سے سنوارتی تھیں۔
ںداز بدن اور اعلیٰ جسمانی صحت اہلِ اسکندریہ کے لئے مرکزِ خیال بنی رہتی تھی۔ لوگ ان کو شریکِ بستر بنانے کے ساتھ ساتھ انکے رقص
سے بھی اتنا ہی لُطف اندوز ہوتے تھے۔
نار کے پھیلے ہوئے سایوں میں افریقہ کی رہنے والیاں آباد تھیں ـــ نومیدیا کی سفید نقاب پوش۔ قرطاجنی سیاہ آبِ رواں کی چادروں
ں ہوئی۔ اور حبشنیں مختلف الالوان لباسوں میں ملفوف نظر آتی تھیں۔
ان کی کل تعداد چودہ سو تھی۔
جب کوئی عورت وہاں داخل ہو جاتی تو پھر اُسکے لئے منزلِ پیری میں پہلا قدم رکھنے سے قبل باہر نکلنا محال تھا۔ ہر عورت اپنی نصف
مندر کی نذر اور باقی رقم سامانِ خورد و نوش اور اشیائے تزئین کی خریداری میں صرف کرتی تھی۔
وہ کنیزیں نہیں تھیں۔ بلکہ حقیقتاً ہر ایک کے قبضہ میں ایک ایک مکان ہوتا تھا۔ لیکن لوگ اُن کی قدر و منزلت یکساں طور پر نہیں کرتے
ان میں جو سب سے زیادہ خوش نصیب ہوتیں۔ وہ عموماً ملحقہ مکانات بھی خرید لیتیں۔ کیونکہ ان کی مالکائیں فاقہ کشی کے خوف سے اُنہیں
ن کر دیتی تھیں۔ ایسی صورت میں وہ خانماں برباد عورتیں اپنی مورتوں کو باغیچے میں لے جاتیں اور کسی کونے میں ایک ہموار پتھر کو استھان بنا کر
ا عمر وہیں گذار دیتیں۔ مفلس سوداگر اس چیز سے واقف تھے۔ چنانچہ وہ ایسی ہی عورتوں کے پاس جو اپنی پرستش گاہ کے قریب فرشِ
پر کھلی فضا میں رہتیں شب باشی کو ترجیح دیتے تھے۔ بعض اوقات ایسے سوداگر بھی اُن کے لئے عنقا ہو جاتے تھے۔ ایسی صورت میں
ب لڑکیاں آپس میں شریکِ مصائب و آلام ہو کر ایک دوسرے کی سہیلیاں بن جاتیں۔ یہ والہانہ دوستی غیر فانی محبت ثابت ہوتی۔
ا جمع پونجی حتیٰ کہ بیکار چیتھڑوں تک میں برابر کی حصہ دار ہوتیں۔ وہ جنسی تعلقات کے ذریعے ایک دوسرے کی خواہشات کو تسکین دیکر
لی دیرینہ محرومیوں کی تلافی کرتی تھیں۔

ِریائے والگا کے کنارے واقع تھا۔ ۵ یورپ کی ایک قوم جو جرمنی اور اُس کے قُرب و جوار میں آباد تھی۔

اگر ایسی کوئی عورت کسی کی سہیلی نہ بن سکتی تو وہ مجبور ہو کر دوسری خوش قسمت مُرلیوں میں سے کسی کی کنیز ہو جانا قبول کر لیتی۔ ایسی صورت میں بارہ سے زیادہ غریب لڑکیوں کا ایک ہی مُرلی کی خدمت میں مامور رہنا قانوناً منع تھا۔ لیکن یہ تعداد بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ ایسی صرف بائیس شاہدانِ بازاری کا حال معلوم ہو سکا جن کے پاس بارہ بارہ کنیزیں تھیں۔ انہوں نے اپنی خدمت کے لئے تمام اقوام میں سے ایک ایک لڑکی منتخب کی تھی۔

اگر اتفاقاً کسی عورت کے بطن سے لڑکا پیدا ہو جاتا تو اُس کی پرورش مندر ہی میں ہوتی جہاں وہ مجسمے کے مکمل نمونۂ صنعت کا غائر مطالعہ کرنے اور دیوی کی خدمت کرنے میں مصروف رہتا۔ اگر اس کے ہاں لڑکی پیدا ہوتی تو اُسے دیوی سے منسوب کر دیا جاتا۔ پیدائش کے پہلے ہی روز اُس کی روایتی شادی دایونائیسس[1] کے بیٹے سے کر دی جاتی۔ بعد ازاں اُسے ویدا سکیلین میں داخل کر دیا جاتا۔ جو اس زمانے کی سب سے بڑی یادگار درسگاہ تھی۔ وہاں نوجوان مُرلیوں کو سات جماعتوں میں مندر کے اسرار و رموز سکھائے جاتے تھے۔ ہر شاگرد اپنی مرضی سے اپنے داخلے کا دن مقرر کر لیتی۔ کیونکہ دیوی کے کسی حکم کی خلاف ورزی غیر ممکن تھی۔ اس مقررہ دن ایک مختصر سا مکان اُسے مل جاتا۔ ایسی نوجوان لڑکیوں کے متعلق مسلم تھا کہ وہ سب سے زیادہ بے تکان سرگرمِ عمل رہ سکتی ہیں۔ چنانچہ تماش بینوں میں زیادہ تر آمد و رفت انہی کی خلوت میں رہا کرتی تھی۔

ویدا سکیلین کا اندرونی حصہ، ساتوں درسی کمرے، مختصر بازی گاہ اور ایوان کے ستون بانوے ۹۲ منقش تصاویر سے مزین تھے۔ یہ تصاویر گویا درسِ محبت کی شرحِ مختصر تھیں۔ وہ سب اسکندریہ کے شہرۂ آفاق مصور قلوشاریز کی حاصلِ زندگی تھیں۔ یہ شخص آپلیز[2] کا حقیقی فرزند اور شاگردِ رشید تھا۔ اُس نے زندگی کے آخری لمحات میں اُن کی تکمیل کی تھی۔ ملکہ بیرینائس اس مقدس درسگاہ کے حُسنِ انتظام میں خاص دلچسپی لیتی تھی۔ اُس نے اپنی چھوٹی بہنوں کو بھی وہیں داخل کر دیا تھا۔ نیز تکمیلِ آرائش کی غرض سے دیمیطریوس کو حکم دیا تھا کہ سلسلہ وار مرمریں مجسمے تراشے۔ لیکن قصۂ مذکور کے عہدِ وقوع تک صرف بچیوں کی جماعت میں ایک مجسمہ نصب کیا گیا تھا۔

ہر سال کے آخر میں تمام مجتمع مُرلیوں کی موجودگی میں ایک زبردست مقابلہ عمل میں آتا۔ اس موقع پر تمام عورتوں میں احساسِ تفوق غیر معمولی طور پر بھڑک اُٹھتا تھا۔ کیونکہ کامرانی کے ساتھ بارہ میں سے ایک انعام بھی حاصل کر لینا اُن کے لئے اس قدر باعثِ افتخار تھا کہ سال بھر تک وہ اسی کا خواب دیکھا کرتی تھیں۔ جس مُرلی کو وہ انعام مل جاتا وہ کوطائیتن میں داخل ہونے کی حقدار ہو جاتی تھی۔

اس آخری یادگار عمارت کے ساتھ اس قدر اسرار و رموز وابستہ ہیں کہ اس وقت اُن کی مکمل شرح بیان کرنی قطعی محال ہے۔ ہمیں صرف اتنا علم ہے کہ وہ باغ میں شامل تھی اور وضع قطع کے اعتبار سے مثلث نما تھی۔ اس کے آخری خط پر کوطائیتو دیوی کا ہیکل واقع تھا جس کے نام پر خوفناک اور پُر اسرار رسوم ادا کی جاتی تھیں۔ عمارت کے باقی دو پہلوؤں میں اٹھارہ مکان تعمیر کئے گئے تھے۔ جن میں چھتیس مُرلیاں آباد تھیں۔ متمول تماش بین اُن کے اس حد تک قدر داں تھے کہ وہ بطور اُجرت دو مینا سے کم رقم کسی عنوان قبول ہی نہ کرتی تھیں۔

---

[1] دایونائیسس یونانی صنمیات میں شراب اور زرخیزی کا دیوتا سمجھا جاتا ہے۔ اس کا دوسرا نام باقس بھی ہے۔ سب سے بڑے دیوتا زیوس اور کیڈمس کی بیٹی سیمیلی کے وصل سے پیدا ہوا تھا۔ [2] ۳۳۲ ق۔م میں یونان کا سب سے بڑا مصور اور نقاش۔

ہر ماہ میں ایک مرتبہ بدرِ کامل کی نُور افشاں رات میں وہ ہیکل کے قریب جمع ہوتی تھیں۔ اس وقت جذبات برانگیختہ کرنے والی نشیلی اشیاء کے استعمال سے اور مذہبی ملبوسات سے کمربستہ ہونے کے باعث اُن کا دماغی توازن بگڑجاتا تھا۔ ان چھتّیس میں سب سے زیادہ مُعمّر مُرلی کے لیئے لازمی تھا کہ وہ کسی مہلک ترین عرق کا جُرعہ پی چکی ہو۔ ایسی ناگہانی موت کے یقینی احساس سے وہ نڈر اور بالکل بے باک ہو کر ایسے خوفناک اور مذموم افعال کا ارتکاب کر گذرتی جس کے محض تصوّر سے زندہ ہستیاں لرزہ براندام ہو جاتی ہیں۔ اس کا تمام جسم کف آلود ہو جانے کے باعث سرمستیِ رقصاں کا مرکز اور معیاری نمونہ بن جاتا تھا۔ اس وقت کی فلک شگاف چیخوں، سرد آہوں، اشک افشانیوں اور رقص کی سرشاریوں میں ڈوب کر باقی مُرلیاں اس سے لپٹ پٹ جاتیں۔ اپنے بالوں سے اس کا عرقِ جبیں پونچھتیں۔ اور اس اضطرابِ جاں کنی کے مسلسل تشنّجات میں دیوانہ وار برابر کا حصہ لیتی تھیں۔ کامل تین سال تک یہ مُرلیاں اطمینان کی زندگی بسر کرتیں اور چھتّیسویں مہینے کے ختم ہوتے ہی اُن کا انجام اِسی سرخوشی اور بیخودی کے عالم میں ہوتا تھا۔

بعض کم درجے کی پرستش گاہیں تھیں جن کا رُتبہ افرودائتی کے دیگر مظاہر سے منسوب کر کے ان مُرلیوں نے بلند کر دیا تھا۔ ایک استھان یوزنیں سے متعلق ہونے کے باعث متبرک سمجھا جاتا تھا۔ ظاہر دار مُرلیاں اس کے مجسمے کے سامنے باعصمت رہنے کی قسم کھاتی تھیں۔ ایک دوسرا معبد ایپستروفیہ سے منسوب تھا۔ جو محبت کی سوگواریوں کو لوحِ تصور سے محو کر سکتی ہے۔ تیسرا اقراکسیہ سے، جو متموّل عشاق کو دامِ تزویر میں پھنسا سکتی ہے۔ چوتھا کینی طائس سے، جو نوخیز لڑکیوں کی محافظ سمجھی جاتی ہے۔ پانچواں کولیادی سے، جو شدید خواہشاتِ نفس کو برانگیختہ کر سکتی ہے۔ کیونکہ محبت کے ضمن میں ہر فعل دیوی کی نگاہ میں مقدس ہے۔ اس لئے خاص استھان وہی سمجھے جاتے تھے جہاں پرستش کرنے سے جذباتِ اسفل متاثر ہو سکیں۔ روزانہ دیوتاؤں پر بھینٹ چڑھائے جاتے۔ جن کے معاوضہ میں روزانہ مُرلیوں پر نوازشات ہوتیں۔ وہ سب عبادت کے اس تاجرانہ پہلو سے اچھی طرح واقف تھیں۔ جن کی مُرادیں بر آتیں وہ دیوی پر معمولی پھول چڑھا دیتیں لیکن ناکامیابی کا مُنہ دیکھنے والیاں غلاظت وغیرہ پھینک جاتی تھیں۔ ان عبادتگاہوں کو کچھ زیادہ مقدس نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اور نہ اُن کی حفاظت کے لئے پروہت مقرر ہوتے تھے۔ اس لئے بے حُرمتی کرنے والیاں کسی سزا کی مستوجب نہ ٹھیرائی جاتی تھیں۔

تاہم ہیکل کا حُسنِ انتظام اور اسکی قدر و منزلت بالکل برعکس تھی۔

ہیکل، سب سے زیادہ ذی وقار دیوی کا عظیم الشان ہیکل، سرزمینِ مصر کا مقدس ترین مقام، استارتی کی مستحکم ترین ماجگاہ، سنگِ سُرخ سے تین سو چھتّیس فٹ طویل بنی ہوئی تھی۔ جو باغات کی سطح کے متوازی سترہ سیڑھیوں کے ذریعے بلند تھی۔ اس کے طلائی دروازے کی حفاظت بارہ ذوالجنسین[1] مُرلیاں کرتی تھیں۔ جو گویا جذباتِ محبت اور رات کی بارہ ساعتوں کی مظہر تھیں۔

اس کا دروازہ جانبِ شرق ہونے کی بجائے پافوس جانے والے راستے کی طرف تھا۔ یعنی جانبِ شمالِ مشرق۔ چنانچہ اِس

---

[1] یونانی روایت ہے کہ ہرمیس اور افرودائتی کے اتصال سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام ہرم افرودتیس رکھا گیا۔ ایک جل پری کی استدعا پر اُس نے اپنا جسم اُس کے جسم میں اس طرح مدغم کر دیا کہ ایک ہی ہستی میں دونوں قسم کے اعضائے جنسی پیدا ہو گئے۔ چنانچہ ہرم افرودائتی ان عجیب الخلقت انسانوں کو کہا جاتا ہے جن کے اعضا کی ترکیب اس صورت سے ہو۔

ذی وقار، غیر فانی شب نواز دیوی کی پرستش گاہ میں سورج کی شعاعیں براہِ راست نہ پہونچ سکتی تھیں۔ عمارت کی مرغول چھیاسی ستونوں پر قائم تھی۔ نصف بلندی تک ان پر ارغوانی رنگ پھرا ہوا تھا۔ بالائی حصّے حد سے زیادہ سفید روغن کے ذریعے اس سُرخ سطح سے اس طرح جُدا تھے گویا ایک بے دست و پا عورت دو رنگ کا لباس پہنے کھڑی ہو۔

(باقی آئندہ)　　فضل حق قریشی دہلوی

شریر پوسٹ مین

اماں! آپ صحن میں اس طرح خاموش اور اُداس کیوں بیٹھی ہیں؟

دریچے سے بارش کی بوچھاڑ آ رہی ہے اور آپ بھیگ رہی ہیں۔ کیا آپ کو اس کا بھی خیال نہیں؟

اماں! آپ نے گھنٹے کی آواز نہیں سُنی۔ چار بج گئے اور بھیّا اب اسکول سے واپس آ رہے ہوں گے۔

کیوں آخر آپ کو ہو کیا گیا اماں۔ آپ اس قدر پریشان کیوں نظر آتی ہیں؟

کیا ابا کا آج کوئی خط نہیں آیا؟

میں نے تو دیکھا کہ آج پوسٹ مین اپنے تھیلے میں شہر کے ہر آدمی کے لئے خط لے جا رہا ہے؟

کہیں ابا کا خط اس نے پڑھنے کے لئے خود اپنے پاس تو نہیں رکھ لیا۔

اماں! وہ ضرور شریر ہے اور ابا کا خط اُس نے شرارت سے چُرا لیا ہے۔

لیکن آپ اُس کے لئے پریشان نہ ہوں اماں!

برابر والے دیہات میں کل بازار لگنے کا دن ہے۔ آپ اپنی خادمہ سے صرف قلم اور کاغذ منگا لیں۔

میں خود اپنے ابا کے سارے خطوط لکھ لونگا۔ سچ جانیئے اماں، آپ ان میں ایک غلطی بھی نہ نکال سکیں گی

میں "ا" سے "ک" تک بالکل صحیح لکھ دونگا۔

لیکن اماں! آخر آپ مُسکراتی کیوں ہیں؟

شاید اس خیال سے کہ میں ابا کی طرح اچھا سا خط نہ لکھ سکوں گا۔

سچ کہتا ہوں اماں! میں ہوشیاری سے پہلے سارے کاغذ پر لکیریں کھینچوں گا..... پھر ان پر خط لکھونگا۔

اور جب یہ ختم ہو جائیں گے تو کیا آپ یہ سمجھتی ہیں کہ میں ابا کی طرح اپنے خطوط پوسٹ مین کے تھیلے میں ڈالدونگا؟

اماں! میں بغیر کچھ انتظار کئے انہیں خود ہی آپ کے پاس لے آؤنگا، اُن کے پڑھنے میں حرف حرف آپ کی مدد کروں گا۔

مجھے یقین ہے اماں! کہ پوسٹ مین اچھے اچھے خط آپ کو لا کر نہیں دیتا۔

(ٹیگور)　　جمیل احمد کندھائے پوری

کسبی

مشہور ہے جہاں میں کسبی کی بے حیائی
لیکن یہ بے حیائی کس نے اسے سکھائی

بازار کی یہ رونق تھی گھر کی زیب و زینت
او مرد! کی ہے تُو نے آپ اس کی رہنمائی

یہ تیری آرزو تھی، یہ تیری آبرو تھی
تُو نے یہ اپنی دولت خود خاک میں ملائی

پوشش تھی اس کی عصمت، اسکا لباس عفت
بے غیرتی کی چادر تُو نے اسے اُڑھائی

ظالم! یہ آئنہ ہے تیری خباثتوں کا
کسبی میں جلوہ گر ہے خود تیری کج ادائی

انجام دیکھ اپنی "معصوم" خواہشوں کا
نظروں کے سامنے ہے تصویر "پارسائی"

لائی ہے رنگ تیری آوارگی بہیمی
بدبخت! تیرے در پے ہے تیری فتنہ زائی

تُو نے تباہ کر کے یہ دن اسے دکھایا
افسوس۔ مرد ہو کر عورت سے بیوفائی

یہ جنس بے بہا ہے "بالانشین و کم خرچ"
بے شرم! تُو نے اپنی غیرت کہاں گنوائی

[illegible]

تجلیات

صرفِ غم زیست آہ! ہو کے رہی
یعنی ہستی گُناہ ہو کے رہی

تُو اس انداز سے تھا محوِ خرام
ہر جبیں فرشِ راہ ہو کے رہی

شکوہ بیداد پر ہوں میں مائل
اُن سے پھر رسم و راہ ہو کے رہی

تُو نے کچھ اس طرح نظر پھیری
دل کی دُنیا تباہ ہو کے رہی

ہست ہونا گُناہ تھا شاید
میری ہستی گُناہ ہو کے رہی

جو ترے در پہ سجدہ ریز ہوئی
وہ جبیں سجدہ گاہ ہو کے رہی

فرصتِ رنجِ زیست ہے کس کو
زندگی بھی اک آہ ہو کے رہی

تابِ نظارہ مجھکو حاصل ہے
ہر تجلی نگاہ ہو کے رہی

کر دیا غم نے مضمحل تابش
زندگانی تباہ ہو کے رہی

تابش دہلوی

ایک جشنِ سالگرہ

اک "مجمعِ رنگیں" میں وہ گھبرائی ہوئی سی　　بیٹھی ہے عجب ناز سے شرمائی ہوئی سی
آنکھوں میں حیا، لب پہ ہنسی آئی ہوئی سی

ہونٹوں پہ فدا رُوحِ بہارِ گُل و نسریں　　آنکھوں کی چمک رشکِ بزمِ مہ و پرویں
پیراہنِ زرتار میں اک پیکرِ سیمیں

لہریں سی وہ لیتا ہوا اک پھُول کا سہرا　　سہرے میں جھمکتا ہوا اک چاند سا چہرا
اک رنگ سا رُخ پر کبھی ہلکا کبھی گہرا

ہر سانس میں احساسِ فراواں کی کہانی　　خاموشیِ محجوب میں اک سیلِ معانی
جذبات کے طوفاں میں ہے دوشیزہ جوانی

تقدیس گہِ خُلد کی اک حورِ سمن بر　　آتشکدۂ حُسن کا اک شعلۂ مُضطر
میخانۂ فطرت کا چھلکتا ہوا ساغر

فطرت نئے جذبات کے در کھول رہی ہے　　میزانِ جوانی میں اُسے تول رہی ہے
لب ساکت و صامت ہیں نظر بول رہی ہے

سرشار نگاہوں میں حیا جھوم رہی ہے　　ہیں رقص میں افلاک، زمیں گھوم رہی ہے
شاعر کی وفا بڑھ کے قدم چُوم رہی ہے

اے تُو کہ ترے دَم سے مری زمزمہ خوانی　　چہرے پہ ترے تمکنتِ نورجہانی!
آلام سے محفوظ رہے تیری جوانی!

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ　　مہکیں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ!

مجاز۔ بی۔ اے۔ (علیگ)

تصوّف و اخلاق کی سرمدی شراب

رُباعیاتِ حضرت ابوسعید پر تبصرہ

فارسی شاعری میں "رُباعی" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ قریب قریب ہر شاعر نے اس منزل میں تخیلات کو جولاں کیا ہے۔ رُباعی بظاہر جس قدر آسان نظر آتی ہے، اُسی قدر مشکل بھی ہے۔ جب تک کوئی شاعر ایک عرصے کی مشق کے بعد اظہارِ مطلب پر کافی قدرت حاصل نہ کرے، رُباعی کی منزل میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جن نومشق شعرا نے اس صنف کو ہاتھ لگایا ہے وہ اکثر و بیشتر ناکامیاب ہوئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ رُباعی کا اگر ایک مصرع بھی پھُس پھُسا اور غیر وزنی ہو تو رُباعی کا وزن بہت کچھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ رُباعی میں شاعری کی قادر الکلامی، قدرتِ زبان، اظہارِ بیان کی خوبی اور الفاظ کے صحیح استعمال کی قابلیت کا بھرم کھلتا ہے۔ اس کے بعد بلندیٔ خیال کی باری ہے۔ رُباعی میں جب تک کوئی خاص بات پیش نہ کی جائے، رُباعی کی غرض و غایت ہی پوری نہیں ہوتی۔ کامیاب رُباعی، سو نظموں اور پچاس غزلوں پر بھاری ہوتی ہے۔

فارسی شعرا میں عمر خیام کو بہ حیثیت رُباعی گو شاعر کے نہایت ہی بلند رتبہ حاصل ہے۔ عمر خیام کی عظمتِ شاعری سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اُسکی ایک ایک رُباعی دل و دماغ کو کیف و مستی میں غرق کر کے، خیال کو اُس دُنیا میں پہونچا دیتی ہے، جہاں عشرت و مسرت کے سرمدی چشمے اُبلتے ہیں، اور ذرہ ذرہ سے شراب اُبلتی ہے۔ خیام ایک مفکر فلسفی تھا، اپنے غور و تفکر کا نچوڑ اُس نے رُباعیوں کی صورت میں دُنیا کے سامنے پیش کیا، لیکن حیرت ہے کہ ایران سے زیادہ اُس کی قدر یورپ نے کی۔ اور اُس وقت جبکہ خیام کے ایران میں بہت کم جاننے والے تھے، یورپ کے علمی اداروں میں اُس کی پرستش ہو رہی تھی، یورپ نے خیام کی بارگاہ میں عقیدت کا خراج کس لیے پیش کیا؟ اس سوال کے جواب کے لئے کسی خاص غور و فکر کی ضرورت نہیں۔ یورپ پر ان دنوں عیش و مسرت کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں، اور وہ ہر اُس تحریک کو سراہتا ہے جو عیش و مسرت کے محرکات کو قوی بناتی ہو۔ خیام کے فلسفے کا دار و مدار بھی اس خیال پر ہے کہ "کھاؤ، پیو، مزے اڑاؤ، اور مُسکراتے ہوئے چلے جاؤ" خیام دنیوی آلام و مصائب کا سب سے بڑا دُشمن ہے، وہ چاہتا ہے کہ بوریہ نشین فقیر بھی فاقے کی حالت میں عیش و راحت کے تصور سے لطف لیکر زندگی کے لمحے گزارے۔ خیام کی دنیا میں فکر و مُصیبت کا وجود ہی نہیں۔ وہاں تو راحت و مسرت کے ساز چھڑے ہوئے ہیں۔ عشرت و شادمانی کے کنول روشن ہیں اور کیف و مستی کے پیمانوں میں رنگین تمناؤں کی شراب ڈھل رہی ہے۔ خیام سے بہت پہلے اسی فلسفہ کو لذتین گروہ کے امام "اپی کورس" نے پیش کیا تھا، جسکی یورپ میں بہت کچھ قدر کی گئی۔

شعر کی دُنیا صرف شراب و نغمے تک ہی محدود نہیں ہے، مشرقی شاعری کا بڑا سرمایہ تصوف و اخلاق سے عبارت ہے، تصوف و اخلاق مشرقی ادب کا طغرائے امتیاز رہا ہے اور یہی نقطہ ہے جہاں پہونچکر مشرق و مغرب کی حدیں جُدا ہو جاتی ہیں۔ خیام نے بھی تصوف کے موضوع کی اپنی رُباعیوں میں بہت کچھ تشریح کی ہے۔ لیکن اکثر مقامات پر اسکی سرمستی کا نشہ ضرورت سے زیادہ تیز ہو گیا ہے، جس کو دیکھکر یورپ والے تو اپنے ذوق کے مطابق یہی سمجھ بیٹھے کہ خیام درحقیقت ایک رندِ ہوسناک تھا۔ یورپ کے نظریہ سے متاثر ہو کر، مشرقی ادیبوں نے بھی خیام کے متعلق دھوکا کھایا ہے، اور وہ خیام کی رُباعیوں کو پڑھکر یہ سمجھتے ہیں کہ ان رُباعیوں کا مُصنف ہر وقت شراب کی بھٹی کے ارد گرد چکر لگایا کرتا تھا۔ بہرحال اس غلط فہمی کا دُور کرنا میرا موضوعِ بیان نہیں ہے۔ بس اس تمہید کے بعد یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر کیف و مستی سے قطع نظر کر لی جائے تو جہاں تک تصوف و اخلاق کا تعلق ہے، حضرت ابوسعید ابوالخیر رحمتہ اللہ علیہ کا پایہ بہ حیثیت رُباعی گو شاعر کے تمام شُعرا سے بلند ہے۔ یورپ شاید حضرت ابوالخیر کے نام سے آشنا بھی نہ ہوگا، اور اُسے ہونا بھی نہیں چاہیئے۔ کیونکہ تصوّف و اخلاق، مغربی ادب کے موضوع سے خارج ہے، جہاں دن رات وسکی اور برانڈی کے دَور چلتے ہوں، عُریاں رقص کے مناظر پیش کئے جاتے ہوں، حمیت و غیرت کے دامنِ قدس کو پارہ پارہ کیا جاتا ہو، وہاں حضرت ابوالخیر کے نغمہ ہائے تصوّف کو کوئی کیوں سُننے لگا۔

بعض خصوصیات

حضرت ابوالخیر شاعر ہونے کے علاوہ، ایک باکمال صوفی، اور خداشناس مفکر تھے۔ اُن کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کسی سنائی باتیں بیان نہیں کر رہا، بلکہ آپ بیتی سنا رہا ہے۔ اُن کے کلام میں درد ہے، سوز و گداز ہے، حقائق کی صحیح ترجمانی ہے اور تصوف و عرفان کی وہ خوشگوار چاشنی ہے جس کے لئے انسانی روح ہر وقت بے تاب رہتی ہے، اُن کی رُباعیاں عرفان و حقیقت کے رنگین جام ہیں، جس کے پینے کے بعد دل جذبات کی زبان میں پکار اُٹھتا ہے۔

عشق از اوّل و آخر ہمہ ذوق است و سماع ــــ این شرابیست کہ ہم پختہ و ہم خام خوش است

حضرت ابوالخیر مشکل سے مشکل مسئلہ کو اس خوبی کے ساتھ حل فرماتے ہیں کہ دل و دماغ تفکر کی زحمت سے بچ جاتے ہیں۔ اُن کے اشعار پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر روح القدس کی زبان سے عرفان کا پیغام دنیا کو دے رہا ہے اور وہ سارے عالم کو اُس سطح پر لے آنا چاہتا ہے جہاں حرم و کلیسا کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔

مولانا روم تصوف کے امام گذرے ہیں، اُن کی مثنوی کے متعلق کہا گیا ہے۔ ع

"ہست قرآں در زبانِ پہلوی"

لیکن ان تمام اوصاف و محاسن کے باوجود، فنِ شعر کے اعتبار سے مولانا روم کا کلام کوئی خاص درجہ نہیں رکھتا۔ اُن کے یہاں حشو و زوائد بھی ہیں، اور شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے اگر مثنوی مولانا روم کی تحلیل کی جائے تو بہت سی جگہ وجدانِ شعری کو پریشان ہونا پڑے گا۔ اسکے برخلاف حضرت ابوسعید ابوالخیر کا کلام شعری محاسن سے لبریز ہے، اُن کے یہاں حافظِ شیراز کی مستی، اور سعدی کی سلاست پائی جاتی ہے۔ اُن کا کلام پڑھ کر جس طرح روح وجد کرتی ہے اسی طرح زبان چٹخارے لیتی ہے اور وجدان لذت اندوز ہوتا ہے۔ اس زمانے میں جبکہ شعر کو اخلاق و تصوف سے دور کیا جا رہا ہے حضرت ابوالخیر کی رباعیوں کا مطالعہ یقیناً مفید ثابت ہوگا۔

رُباعیات

نگاہِ حق میں کائنات کے ذرّے ذرّے میں خدا کو دیکھتی ہے، حسین چہروں میں بھی نورِ حقیقی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اور پھول پتوں میں بھی جمالِ سرمدی کی رنگینی دکھائی دیتی ہے۔ اس حقیقت کو حضرت ابوسعید کی زبانِ حقیقت ترجمان سے سنیئے۔

ہر شکلِ بتاں رہزنِ عشاق حق است ــــ لا بلکہ عیاں در ہمہ آفاق حق است
چیزے کہ بود ز روئے تقیید جہاں ــــ واللہ کہ ہماں زوجہ الطلاق حق است

آخری مصرع تصوف کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں، فرماتے ہیں کہ تمام آثار و عوالم وجود کی قید میں گھرے ہوئے ہیں، یہی اطلاق کی صورت میں خدا ہیں۔ اور یہ مسئلہ بالکل صاف اور واضح ہے کہ ممکنات، قیدِ وجود سے آزاد ہونے کے بعد "واجب الوجود" رہ جاتے ہیں، کیونکہ ایک ہی حقیقت مختلف اشکال و صور میں جلوہ گر ہے، جب اشکال و صور فنا ہوتی ہیں تو "حقیقت" ہی باقی رہ جاتی ہے۔

اہلِ دنیا، دنیوی عیش و راحت کے لئے بے چین رہتے ہیں۔ اُن کو ہمیشہ اسباب راحت جمع کرنے کی فکر رہتی ہے۔ گل اندام حسینوں سے دل بہلاتے ہیں اور دنیا حاصل کرنے کے غم میں گھلے جاتے ہیں۔ لیکن اہل اللہ کو صرف محبتِ الٰہی کا غم رہتا ہے، اور یہی غم اُن کے ایمان کا سرمایہ اور اُن کی زندگی کی کائنات ہے۔

اے خواجہ ترا غم جمالِ ما ہست ــــ اندیشۂ باغ و راغ خرمن گاہست
ما سوختگانِ عالمِ تجریدیم ــــ ما را غم لا الٰہ الا اللہ است

عالمِ تجرید سے وہ عالم مراد ہے جہاں ذاتِ باری کے سوا کسی شئے کا وجود ہی نہیں۔ اور لا الٰہ الا اللہ سے خود اُسی عالم کی طرف اشارہ ہے۔ اور وجودِ غیر کی نفی موجود ہے۔ اس تشریح کے بعد اب اس رُباعی کو پڑھیئے۔

انسان فطرتاً عجلت پسند واقع ہوا ہے۔ اپنے ہر مقصد کی تکمیل کے لئے وہ چاہتا ہے کہ گھنٹوں کا کام لمحوں میں پورا ہو جائے یہی اضطراب اُسکے خیال کو منتشر اور اُسکے جذبات کو پراگندہ رکھتا ہے، حالانکہ ہر کام کے لئے ایک وقت مقرر کیا گیا ہے اور جب تک وقت نہیں آتا کام کی تکمیل نہیں ہوتی اسی فلسفے کی تشریح کسقدر دلنشیں پیرائے میں فرمائی ہے:۔

تا در نہ رسد وعدۂ ہر کار کہ ہست   سودے نہ دہد یاریِ ہر یار کہ ہست

تا زحمت سرما و زمستاں نہ کشد   پُر گل نہ شود دامنِ ہر خار کہ ہست

آخری مصرعوں میں شاعر نے اس حقیقت پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ محنت و مشقت کے بغیر کوئی کام پورا نہیں ہو سکتا اور اس کی مثال میں کتنی اچھی بات کہی ہے کہ جب تک گرمی اور سردی کے دن نہیں گذر لیتے اُسوقت تک کانٹے کا دامن پھولوں سے نہیں بھرتا یعنی راحت کی تمنا ہے تو محنت کرو اور پھولوں سے دامن بھرنا مقصود ہے تو انگلیوں کو کانٹوں کی خراش کیلئے بھی تیار کر لو۔

آں را کہ فنا شیوہ و فقر آئین است   نہ کشف و یقیں نہ معرفت نہ دین است

ذات او زمیاں رفت خدا ماند خدا   "الفقر اذا تم ہو اللہ" این است

فرماتے ہیں کہ جو لوگ ذاتِ حق میں خود کو فنا کر دیتے ہیں اور فقر جن کا مقصدِ حیات اور آئین ہے، اُن کے یہاں کشف و یقین اور معرفت و دین کے قیود بھی باقی نہیں رہتے۔ کیونکہ جب وہ درمیان سے اٹھ گیا تو خدا باقی رہ گیا۔ اور اسی چیز کا نام "الفقر اذا تم ہو اللہ" ہے۔ یعنی فقر جب کامل ہو جاتا ہے تو پھر "خدا ہی خدا" رہ جاتا ہے، ہستی باقی ہی نہیں رہتی یہ تصوف کی وہ منزل ہے جہاں منصور بے اختیار ہو کر "انا الحق" پکار اٹھا تھا۔

آساں آساں زخود اماں نتواں یافت   ویں شربتِ شوق رایگاں نتواں یافت

زاں مے کہ عزیزِ جانِ مشتاقان است   یک جرعہ بصد ہزار جاں نتواں یافت

خودی کا فنا کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے اور شربتِ شوقِ محبت خود حاصل نہیں ہوتا۔ وہ شرابِ حقیقت کہ جو مشتاقانِ محبت کو جان سے زیادہ عزیز ہے، اُس کا گھونٹ ہزار جان دے کر بھی نہیں مل سکتا۔ اس رباعی میں شرابِ معرفت کی قدر و قیمت پر اس قدر بلیغ پیرائے میں روشنی ڈالی ہے کہ وجدان جوش میں آکر جھومنے لگتا ہے۔ مقصد فرمانے کا یہ ہے کہ شرابِ عشق کا حاصل کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے، اس شراب کی تو ایک بوند ہزار جانوں کے بدلے نہیں مل سکتی۔ اب اس رباعی کو ایک دفعہ پھر پڑھیے۔

از درد نشاں مدہ کہ درجانِ تو نیست   بگذر ز ولایتے کہ آں زآنِ تو نیست

از بے خبری بود کہ با جوہریاں   لاف از گہرے زنی کہ در کانِ تو نیست

بعض ریاکار صوفی دنیا دکھاوے کے لئے "اللہ اللہ" اور "آہ، وائے" کرتے ہیں، حالانکہ اُن کے سینے درد و گداز سے خالی ہوتے ہیں، حضرت ابوالخیر کہتے ہیں کہ وہ درد جس کا تیرے دل میں پتہ نہیں ہے۔ اُس کو لوگوں پر ظاہر نہ کر، کیونکہ اہلِ درد تیری اس بناوٹ پر ہنسیں گے اور وہ اسلئے کہ جوہری کے سامنے اُس موتی کے متعلق ڈینگیں مارنا بیوقوفی ہے جو تمہارے پاس ہے ہی نہیں۔

عشق کی منزل صعوبتوں سے اٹی پڑی ہے، وہاں آرام و آسائش کا نام نہیں، قدم قدم پر مصائب کے پہاڑوں کا سامنا ہوتا ہے، شاعر اسی حقیقت کو بیان کرتا ہے:۔

در کشورِ عشق جائے آسائش نیست   آنجا ہمہ کاہش است افزائش نیست

بے درد و الم توقعِ درماں نہ   بیجرم و گنہ اُمیدِ بخشائش نیست

آخری مصرعے حفظ کرنے کے قابل ہیں۔ فرماتے ہیں کہ درد کے بغیر درماں کی توقع کرنا بیکار ہے۔ درد ہوتا ہے تو درماں بھی کیا جاتا ہے، جب درد ہی نہیں تو درماں کیوں ہونے لگا! اسی طرح گناہوں کے بغیر بخشائش کی اُمید کرنا ہی فضول ہے، بخشائش تو جرموں اور خطاؤں کی ہوتی ہے جب خطائیں اور گناہ ہی نہیں تو بخشائش کا فعل کس پر اور کس لئے سرزد ہوگا۔ یہ بات تو بہت سے شعراء نے کہی ہے کہ رحمت کیلئے گناہوں کی ضرورت ہے، لیکن گناہ کو درد اور درماں کو بخشائش شاید کسی نے نہیں کہا۔

دیر و حرم اور کافر و مسلمان کے موضوع پر حضرت ابوالخیر کا تبصرہ ملاحظہ ہو:۔

زنار پرستِ زلفِ عنبر بُو یت　　　محراب نشیں گوشۂ ابرو یت
یارب تو چہ کعبۂ کہ باشد شب و روز　　　رُوئے دلِ کافر و مسلماں سُویت

"چہ کعبۂ" کی کیا تعریف ہو سکتی ہے، یعنی دُنیا میں جو کعبہ ہے اُس کی طرف صرف مسلمانوں کا سر جھکتا ہے، لیکن اے خُدا تو کس طرح کا کعبہ ہے کہ کافر اور مُسلمان دونوں کے دل تیری طرف جھکے ہوئے ہیں۔

آلودۂ دُنیا، جگر ریش تر است　　　آسودہ تر است، ہر کہ درویش تر است
ہر خر کہ برو زنگے و زنجیری ہست　　　چوں در نگری بار برو بیش تر است

کتنی سچی بات کہی ہے، جو شخص جتنا زیادہ پھنسا ہوا ہے اتنا ہی زیادہ پریشان اور شکستہ حال ہے، اور جو جس قدر زیادہ علائقِ دُنیا سے دُور ہے اُسی قدر زیادہ آسودہ اور مطمئن ہے۔ آخری مصرعوں میں کتنی نادر مثال دی ہے کہ جس گدھے پر گھونگرو اور زنجیر پاؤ گے اس پر زیادہ بوجھ لدا ہوگا یعنی جو شخص ظاہری طور پر زیادہ مالدار اور صاحبِ کر و فر نظر آتا ہے وہ دُنیا کے بہت زیادہ مصائب و آلام میں گرفتار ہے۔ اگر دُنیا میں اطمینان اور آسودگی کی زندگی بسر کرنا چاہتے تو علائقِ دُنیوی کو کم کرنے کی کوشش کرو

گر مُردہ بوم بر آمدہ سالے بیست　　　چہ پنداری کہ گورم از عشق تہیست
گر دست بخاکِ من نہی کایں جا کیست　　　آواز دہم کہ حالِ معشوقم چیست

اگر مجھے مرے ہوئے بیس سال بھی ہو جائیں، تو کیا تم سمجھتے ہو کہ میری قبر عشق سے خالی ہے، اتنی مدت گزرنے کے بعد بھی اگر میری خاک پر ہاتھ رکھکر کہو گے "یہاں کون ہے" تو میں آواز دوں گا کہ "میرا معشوق کس حال میں ہے؟" یہ رُباعی نہیں شاعری کا اعجاز ہے۔ اور یہی وہ بزم ہے جہاں فلسفہ کا چراغ گل ہو جاتا ہے۔

گر سبحۂ صد دانہ شماری خوب است　　　در جامِ مے از کف نگذاری خوب است
گفتی چہ کنم چہ تحفہ آرم برِ دوست　　　"بے دردمیا، ہر آنچہ آری خوب است"

حکم ہوتا ہے کہ زہد و رندی دونوں اپنی اپنی جگہ بہتر ہیں، عاشق دریافت کرتا ہے کہ میں دوست کی خدمت میں کیا تحفہ لیکر جاؤں، تو اس بارگاہِ عشق سے خطاب ہوتا ہے ا۔　　بے درد میا، ہر آنچہ آری خُوب است

یعنی خواہ رندی لیکر آ، یا زہد لیکر آ، کوئی شے بھی لیکر ہمارے حضور میں آ، اچھا ہے، لیکن دردِ محبت کے بغیر ہماری بارگاہ میں قدم نہ رکھ۔

بارگاہِ عشق میں شکستہ دلی کی قدر و قیمت ہے، اس بازار میں صرف جنسِ خستگی و شکستہ دلی کی مانگ ہے۔ مفہوم کو کس قدر دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔

یار آمد و گفت خستہ میدار دست　　　دائم بامید بستہ میدار دست
مارا بشکستگاں نظرہا باشد　　　مارا خواہی شکستہ میدار دست

آخری مصرعے کا زور ملاحظہ ہو، بارگاہِ عشق سے خطاب ہوتا ہے کہ۔

"ہم کو اگر چاہتا ہے تو دل کو شکستہ عشق رکھ"

خُدا کو جس نام سے بھی یاد کیجیے بہتر ہے اور جس راستہ سے بھی منزلِ حقیقت تک پہونچیے اچھا ہے، فرماتے ہیں ا۔

راہِ تو بہر روش کہ پویند خوش است　　　کوئے تو بہر جہت کہ جویند خوش است
روئے تو بہر دیدہ کہ بینند نکوست　　　ذکرِ تو بہر زباں کہ گویند خوش است

ہر مصرعہ اپنی جگہ پر شاعری کا معجزہ ہے، اگر دل میں عرفان کی کوئی دُھندلی سی کرن بھی جلوہ گر ہے تو اس رباعی کے پڑھنے کے بعد دل کی دُنیا جگمگا اُٹھے گی۔

ای دوست، ای دوست، ای دوست ای　　　جورِ تو از آں کشم کہ رُوئے تو نکوست
مردم گویند بہشت خواہی یا دوست　　　اے بیخبراں بہشت با دوست نکوست

مصرعۂ اولیٰ میں "ای دوست" کی تکرار نے جو لطفِ خاص پیدا کر دیا ہے اُس کا مزہ اہلِ ذوق ہی لے سکتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ای دوست میں تیری حسین صورت کے لئے ہی تو اتنی سختیاں برداشت کر رہا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ "تو دوست کو چاہتا ہے یا جنت کو" کوئی اِن اسرارِ عشق کے بیخبروں سے جا کر کہدے کہ بہشت کا لطف تو دوست ہی کے ساتھ ہے۔ اگر دوست نہ ہو تو جنت ویرانہ ت بدتر ہے۔

عصیانِ خلائق ارچہ صحرا صحرا است　　　　ورپیش عنایتِ تو یک برگِ گیا ست
ہر چند گناہِ ماست کشتی کشتی　　　　غم نیست کہ رحمتِ تو دریا دریاست

کوثر وسلسبیل کی پاک موجوں میں اس شعر کو ڈبو کر شاعر کی زبان سے کہلوایا گیا ہے، میں اس شعر کی تشریح نہیں کرتا، اہلِ ذوق کا وجدان اسکا صحیح لطف اُٹھائے گا۔

در عالم اگر فلک اگر ماہ و خور است　　　　از بادۂ ہستیِ تو پیمانہ خور است
فارغ ز جہانی و جہاں غیر تو نیست　　　　بیروں ز مکانی و مکاں از تو پُر است

آسمان، زمین، چاند سورج سب کا وجود ذاتِ باری ہی کے سبب قائم ہے۔ آگے چلکر فرماتے ہیں کہ "اے خدا تو دُنیا میں شامل بھی نہیں ہے اور دُنیا تیرے سوا کچھ ہے بھی نہیں، تو مکان سے باہر بھی ہے اور مکان تیرے جلووں سے لبریز بھی ہے"

یہ مسئلہ اسقدر نازک ہے کہ الفاظ اسکے متحمل ہو ہی نہیں سکتے۔ صوفیائے کرام نے صرف اشارات سے کام لیا ہے، حضرت ابوالخیر نے بھی اشارات پر اکتفا فرمایا ہے۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ ذاتِ باری کو کوئی الفاظ میں کس طرح ادا کر سکتا ہے۔

آں روز کہ آتشِ محبت افروخت　　　　عاشق روشِ عشق ز معشوق آموخت
از جانبِ دوست سرزد ایں سوز و گداز　　　　تا درنگرفت شمع، پروانہ نسوخت

کسی فارسی شاعر کا مشہور مصرعہ ہے۔

"عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود"

حضرت ابوالخیر نے اسی نظریئے کو شمع اور پروانہ کی مثال دے کر واضح کیا ہے، یعنی جب تک شمع کے سینے میں آگ نہیں بھڑکتی، پروانہ نہیں جلتا۔ عشق و محبت کا سوز و گداز فی الحقیقت معشوق ہی کا عطا کیا ہوا ہے، جب تک معشوق کے دل میں جذبۂ محبت پیدا نہ ہو، عاشق کا دل اس جذبہ سے خالی رہتا ہے۔ یہی مفہوم حقیقت میں آکر بڑا ہی دلچسپ بن جاتا ہے کہ روزِ ازل میں شاہدِ حقیقی نے عشاق کے قلوب کو درد محبت کی دولت سے نوازا تھا۔ اور عشق کے ڈھنگ عشاق نے معشوق ہی سے سیکھے ہیں۔

مجنونِ تو کوہ را ز صحرا نشناخت　　　　دیوانۂ عشقِ تو سر از پا نشناخت
ہر کس بہ تو رہ یافت ز خود گم گردید　　　　آنکس کہ ترا شناخت خود را نشناخت

لیلیٰ کے مجنوں کو استغراق کے باوجود کوہ، صحرا، دریا، ناقہ اور ساربان کا ہوش تھا۔ لیکن لیلائے حقیقت کا مجنوں پہاڑ اور جنگل میں تمیز نہیں کر سکتا۔ اور وہ اس لئے کہ جس نے منزلِ حقیقت کا پتہ لگا لیا اُس نے اپنی ہستی کو کھو دیا۔ اور جس نے خدا کو پہچانا وہ اپنے کو نہ پہچان سکا۔ شاعر کا مقصد یہ ہے کہ عشقِ حقیقی کی منزل میں ہستی فنا ہو جاتی ہے اور خودی و غیریت کا ایک نقش بھی باقی نہیں رہتا۔

غازی کہ پئے شہادت اندر تگ و پوست　　　　غافل کہ شہیدِ عشق، فاضل تر ازوست
فردائے قیامت ایں بداں کے ماند　　　　آں کشتۂ دشمن است و ایں کشتۂ دوست

رُباعی کا مضمون بالکل نیا ہے، جو کسی شاعر کے یہاں دیکھنے میں نہیں آیا۔ فرماتے ہیں کہ شہیدِ عشق، اُس شہید سے رُتبے میں بلند ہے جسے کفار کے ہاتھوں جامِ شہادت ملا ہو، قیامت کے دن یہ دونوں شہید کس طرح برابر ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ایک تو دشمن کا مارا ہوا ہے اور دوسرا دوست کا کُشتہ ہے۔ ظاہر ہے کہ کُشتۂ دوست کُشتۂ دشمن سے زیادہ اختصاص اور ترجیح رکھتا ہے۔

مردانِ خدا ز خاکدانِ دگر اند　　　　مُرغانِ ہوا ز آشیانِ دگر اند
منگر تو ازیں چشم بدیشاں کایشاں　　　　فارغ ز دو کون و در مکاں دگر اند

سالکانِ راہِ طریقت کسی دوسرے ہی خطۂ ارض سے تعلق رکھتے ہیں، اُن کو چشم ظاہر سے نہ دیکھو، کیونکہ وہ کونین سے منہ موڑ کر کسی دوسرے عالم میں چلے گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اہل اللہ کے مراتب کا چشم ظاہر ادراک ہی نہیں کر سکتی۔ اُن کے مراتب اور حالات کے دیکھنے اور سمجھنے کے لئے چشم باطن اور ضمیر و ایمان کی قوت درکار ہے۔

هرگز دلم از یادِ تو غافل نشود	گر جان برود مهر تو از دل نرود
افتاده ز روی تو در آئینهٔ دل	عکسی که به هیچ وجه زائل نشود

شاہد حقیقی سے خطاب کر کے فرماتے ہیں کہ میرا دل تیری یاد سے ہرگز غافل نہیں ہوتا، اگر جان بھی چلی جائے پھر بھی تیری محبت دل سے نہ جائے گی، دل کے آئینہ میں تیرے چہرے کا ایسا عکس منجلی ہوا ہے، جو کسی طرح زائل نہیں ہو سکتا۔

هر چند که جانِ عارف آگاه بود	کی در حرمِ قدسِ تو اش راه شود
دستِ همه اہلِ کشف و اربابِ شهود	از دامنِ ادراکِ تو کوتاه بود

سالکانِ راہِ معرفت نے معرفت و ایقان کی تمام دولت حاصل کرنے کے باوجود اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ وہ خدا کی معرفت خاطر خواہ حاصل نہ کر سکے۔ اسی چیز کو شاعر نے رباعی میں پیش کیا ہے کہ تمام اہل کشف اور اربابِ شہود معرفت الٰہی کی منزل میں شکستہ پا ہیں اور انکے یقین و معرفت کے ہاتھ دامن معرفت تک پہونچنے میں کوتاہ ہیں۔

درویشانند هر چه هست درویشانند	در صفهٔ یار در صفِ پیشانند
خواهی مسِ وجود زر گردانی	با ایشان باش کیمیا ایشانند

مقربانِ باری تعالیٰ کی تعریف میں کہتے ہیں کہ جو کچھ ہیں درویش ہیں، کیونکہ یہ لوگ خدا کے دربار میں پیش پیش ہیں۔ اگر تم اپنے وجود کے تانبے کو سونا بنانا چاہتے ہو تو ان درویشوں کے ساتھ خلا ملا رکھو، کیونکہ یہ لوگ کیمیا ہیں۔ اور کیمیا کا خاصہ ہے کہ اس سے جب تانبا مس ہوتا ہے تو وہ سونا بنجاتا ہے۔ یعنی اگر تم بھی صاحبِ معرفت اہلِ یقین اور اربابِ شہود بننا چاہتے ہو تو خاصانِ خدا کی محفلوں میں بار حاصل کرو، انکی توجہ سے تمہارے قلوب کی کثافت دور ہو جائے گی اور تمہاری روحانیت میں اضافہ ہو جائیگا۔

دل صاف کن که حق بدان می نگرد	دلهای پراگنده به یک جو نخرد
نے هر که کند صاف دل از بهر خدا	گوی از همه مردمِ عالم ببرد

خدائے تعالیٰ دل ہی کو دیکھتا ہے اس لئے دل کو غبارِ کثرت اور لوثِ دنیا سے پاک و صاف بنانا چاہیے۔ جو قلوب کہ افکارِ دنیا کے باعث پراگندہ رہتے ہیں، اُن کی قیمت ایک جو کے برابر بھی نہیں ہے، یعنی بارگاہِ حقیقت میں پراگندہ قلوب کی کچھ بھی پوچھ نہیں۔ جو شخص خدا کیلئے دل کو مصفا و منجلی بنا لیتا ہے وہ تمام دنیا کے آدمیوں پر سبقت لے جاتا ہے۔

از شبنمِ عشق خاکِ آدم گل شد	شور برخاست فتنه حاصل شد
سر نشترِ عشق بر رگِ روح رسید	یک قطرهٔ خون چکید و نامش دل شد

تخلیقِ دل شعر و فلسفہ کا خاص موضوع ہے، حضرت ابو الخیر نے اس پیچیدہ بحث کو شیریں پیرائے میں تبصرہ فرمایا ہے۔ وہ ایک ایسی لذت ہے جو الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ اس رباعی کا ایک ایک مصرعہ معارف و حقائق کا دفتر ہے۔ پھر الفاظ کی ترتیب، بندش کی چستی، مصرعوں کا زور اس پر مستزاد۔ فرماتے ہیں کہ آدم کی خاک کو شبنمِ عشق سے گوندھا گیا، اس کے بعد پتلا تیار کیا گیا جسکے بنتے ہی شور اٹھا کہ انسان کا پتلا تیار ہو گیا۔ اسکے بعد عشق کے نشتر کی نوک روح پر آ کر لگی۔ اس سے ایک قطرہ ٹپکا اور اُسی قطرے کا نام دل ہو گیا۔

رباعی نہیں تصوف و معرفت کا میخانہ ہے جسکا ہر جام ایک نئی لذت اور جداگانہ کیف کا حامل ہے۔ یہ رباعی اسی زبان سے نکل سکتی ہے، جو مئے الست کی لذت کو اس دنیائے آب و گل میں بھی محسوس کرتی ہو۔

پھر لطف یہ ہے کہ تمام شاعرانہ لوازم جمع کرنے اور حقیقت کی ترجمانی میں کسی قسم کا ابہام اور ژولیدگی پیدا نہ ہوئی۔ انسان کا مادی جسم فانی ہے۔ اس لئے اُس کی خاک کو شبنمِ عشق سے گوندھا گیا ہے۔ اس لئے کہ شبنم بھی فنا ہو جانے والی چیز ہے، جب انسان کا پتلا بن چکا تو ایک شور برپا

ہوا۔ اس سے تخلیق انسان کی اہمیت دکھانا مقصود ہے۔ آخری مصرعوں کی تو الفاظ میں تشریح ہی نہیں ہوسکتی۔ اُن کی صحیح شرح تو یہی ہے کہ پڑھئے اور وجد کیجئے۔

تا بوئے عشق تو در گوشم شد عقل و خرد و ہوش فراموشم شد
تا یک ورق از عشق تو از بر کردم سی صد ورق از علم فراموشم شد

عشق اور خرد کی ازل ہی سے دشمنی ہے۔ عشق کا غلبہ ہوتے ہی خرد کا چراغ گل ہوجاتا ہے۔ جس طرح آگ کے شعلے خس و خاشاک کو جلا کر خاکستر کردیتے ہیں، اسی طرح عشق کی آگ خرد کے کوہسار کو جلا ڈالتی ہے اس حقیقت کو شاعر نے پیش کیا ہے، آخری مصرعوں میں فرماتے ہیں کہ جب سے میں نے تیری کتابِ عشق کا ایک ورق یاد کیا ہے، علمِ ظاہری کے تین ہزار ورق بھول گیا ہوں۔ اور یہ حقیقت ثانیہ ہے کہ علمِ عرفان و حقیقت کا حصول علمِ ظاہر کو بھلا دیتا ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں: "صد کتاب و صد ورق در نار کن"۔

آں وقت کہ ایں انجم و افلاک نبود ویں آب و ہوا آتش و خاک نبود
اسرارِ یگانگی سبق می گفتم ویں قالب و ایں نوا و ادراک نبود

اس رُباعی میں ایک عجیب حقیقت پیش کی گئی ہے۔ جس کا صحیح لُطف تو اربابِ معرفت ہی لے سکتے ہیں۔ لیکن اہلِ ذوق بھی بقدرِ استطاعت اس شراب کی لذت سے لُطف اندوز ہوسکتے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ اُس وقت جبکہ ستارے، آسمان، آب و ہوا آتش و خاک کا وجود بھی نہ تھا۔ انسانی قالب بھی تیار نہ ہوا تھا، آواز اور ادراک بھی ناپید تھے، میں اسرارِ وحدت کا سبق سیکھ رہا تھا۔ کتنی بڑی بات فرمائی ہے، اور اندازِ بیان کس قدر نادر اور بدیع ہے۔ ظاہر ہے کہ تخلیقِ عالم اور وجودِ انسان سے قبل، انسان، علمِ الٰہی میں تھا اور انسان کو چونکہ وحدتِ مطلق کی معیت حاصل تھی اس لئے وہ درحقیقت وحدت کا سبق حاصل کررہا تھا۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ جبکہ کائنات نمودار بھی نہ ہوئی تھی، انسانی قالب بھی تیار نہ ہوا تھا، آواز و تعقل کا بھی وجود نہ تھا، میں اُس وقت سے وحدت کے اسرار معلوم کررہا ہوں۔

خورشید چو بر فلک ندارایت نُور در پرتوِ آں، خیرہ شود دیدہ زُود
دانم کہ کُنند زیر پردہ ابر ظہور "فاناظر یجنبیہ من غیر قصور"

رُباعی کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ جب کسی دن لکے اور ابر کے ٹکڑے کے بغیر سورج چمکتا ہے تو نگاہ اگرچہ اُسکو بہت دور سے دیکھتی ہے، لیکن شدتِ انوار سے خیرہ ہوجاتی ہے، مگر جب وہی آفتاب بادل کے ٹکڑے کی آڑ سے رخشندہ ہوتا ہے تو دیکھنے والا بلا تکلف اس کا مشاہدہ کرتا ہے۔ شاعر اس مثال کے ذریعے اس حقیقت کو ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ آفتابِ حقیقت کو کوئی نگاہ بے پردہ نہیں دیکھ سکتی، چنانچہ قرآن پاک میں بھی اسکی تصریح موجود ہے کہ "نگاہیں اُس کا ادراک نہیں کرسکتیں"۔ اس لئے آفتابِ حقیقت حجابات کی آڑ سے جب نمایاں ہوتا ہے، تو نگاہیں اُسکو دیکھ سکتی ہیں، اور یہ حجابات، اور یہ پردہ ہائے ابر، کائنات کے تمام مظاہر ہیں۔ دیکھنے والوں نے ان تمام مظاہر و آثار میں ذاتِ باری کو جلوہ گر دیکھا ہے۔

شاہی طلبی، برو گدائے ہمہ باش بیگانہ زخویش و آشنائے ہمہ باش
خواہی کہ ترا چو تاج، بر سر دارند دستِ ہمہ گیر و خاکپائے ہمہ باش

اخلاق کا کتنا مطابقِ فطرت سبق دیا ہے، یعنی اگر بڑا بننا چاہتے ہو تو سب خلق اللہ کی دستگیری کرو، اور سب لوگوں کے پیروں کی خاک بن جاؤ۔ تخت نشیں بننے کی ہوس ہے تو پہلے خاک نشیں بنو۔ جمہوریت پسند دماغ اس شعر کا صحیح لُطف محسوس کرینگے۔

اے آئینہ ذاتِ تو، ذاتِ ہمہ کس مرآتِ صفاتِ تو، صفاتِ ہمہ کس
ضامن شدم از بہر نجات ہمہ کس بر من بنویس سیئاتِ ہمہ کس

یہ خیال ایثارِ نفس کی معراج ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اے قادرِ برتر! میں تمام دُنیا والوں کی نجات کی ضمانت لیتا ہوں، تمام مخلوق کے گناہوں کو میرے نامۂ اعمال میں درج کردیا جائے۔

جس وقت شاعر نے یہ رُباعی کہی ہے نہ معلوم وہ حقیقت کی کس منزل اور عبدیت کے کس جادے میں تھا۔

تا در نزنی بہرچہ داری آتش　　ہرگز نہ شود حقیقت حال خوش
مارا خواہی خطے بعالم درکش　　کاندر یک دل دو دوستی ناید خوش

بارگاہِ محبوبِ حقیقی سے خطاب ہوتا ہے کہ جب تک خودی کو نہ مٹاے گا اور غیریت کو فنا نہ کرے گا، تیری حقیقت تجھ پر روشن نہیں ہوسکتی، ہم کو اگر چاہتا ہے تو دُنیا کو ٹھکرا دے، کیونکہ ایک دل میں دو محبتیں بھلی معلوم نہیں ہوتیں۔ اسی خیال کو خواجہ میر درد دہلوی نے مختلف طریقے پر پیش کیا ہے۔ ایران کے مشہور قصیدہ گو شاعر حبیب قاآنی نے بھی اسی خیال کی ترجمانی کی ہے کہ:

رسمِ عاشق نیست بایک دل دو دلبر داشتن

مسئلہ جبر و اختیار کی بنیاد افعال و اعمالِ انسانی پر رکھی ہوئی ہے۔ متکلمین نے اس مسئلہ پر دفتر کے دفتر سیاہ کر دیئے ہیں۔ حضرت ابوالخیر وجود و ذات کے نظریہ کے تحت اس مسئلہ کی توضیح فرماتے ہیں:

چوں ذاتِ تو منتفی بود اے صاحب بیں　　از نسبتِ افعال بخود باش حزیں
شیریں مثلے شنو مکن روئے ترش　　"ثبت للعرش اولاً ثم انقش"

اے ہوشمند انسان! جب تیری ذات معدوم ہے اور نفی کی حیثیت رکھتی ہے، تو پھر تیری ذات سے جو افعال صادر ہوتے ہیں اُن کو اپنی ذات سے منسوب کرنے میں خاموشی کیوں نہیں اختیار کرتا۔ میں تجھے ایک بڑی پُرلطف مثال سناتا ہوں، جسے ترش رُو ہوئے بغیر سُن، وہ مثال یہ ہے کہ پہلے تخت کو ثابت کر، اُس کے بعد تخت کے نقوش کو ثابت کرنا۔

ایک تخت پر بہت سے نقوش نظر آتے ہیں، تو نقوش ثابت کرنے کے لئے پہلے تخت کے وجود کو ثابت کرنا ہوگا۔ اگر تخت کا وجود ثابت نہیں ہوتا تو پھر نقوش کس طرح ثابت ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح پہلے یہ ثابت ہونا چاہیئے کہ آیا انسان کا وجود بھی کوئی حیثیت رکھتا ہے، اگر انسانی وجود ثابت ہو جائے تو پھر اس کے افعال و اعمال سے بحث ہو سکتی ہے۔ مسئلہ بہت نازک ہے اس لئے میں خود اس سے زیادہ تشریح کرنا نہیں چاہتا، کیونکہ اس بحث کا سرا "جبر" سے جا کر مل جاتا ہے، اور میں خالص اسلامی عقیدہ رکھتا ہوں اور وہ یہ کہ انسان پر اُس کے اعمال کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، لیکن شاعر تو اس منزل میں پہونچ کر کہہ رہا ہے جہاں غیر اللہ کے وجود کا ایک دھندلا سا نقش بھی نظر نہیں آتا۔

روزے ز پئے گلاب می گردیدم　　پژمردہ عذارِ گل در آتش دیدم
گفتم کہ چہ کردۂ کہ مے سوزندت　　گفتا کہ دریں باغ دمے خندیدم

دُنیوی مسرتوں کی بے ثباتی میں پھول کی مثال پیش کی ہے کہ میں نے اُس سے پوچھا کہ تو نے کیا قصور کیا ہے، جو تجھے آتشِ خزاں میں جلایا جا رہا ہے، تو اس نے جواب دیا کہ میں ذرا سی دیر ہنس دیا تھا، اُسکی سزا میں مجھ پر یہ قیامت نازل ہو رہی ہے۔

اندر طلبِ یار چو مردانہ شدم　　اول قدم از وجود بیگانہ شدم
او علم نمی شنید لب بربستم　　او عقل نمی خرید دیوانہ شدم

کہتے ہیں کہ جب میں عاشقِ حقیقی کی جستجو میں نکلا تو پہلے ہی قدم پر مجھے خودی کو فنا کر دینا پڑا۔ میں بہت بڑا عالم تھا، مگر اُسنے علم و فضل کی کوئی بات نہیں سُنی اس لئے میں خاموش ہوگیا، میرے پاس عقل و تدبر کی دولت تھی، اُس نے اِس دولت کو نہ خریدا اسلئے میں دیوانہ ہو گیا۔

داریم زخدا خواہشِ جناتِ نعیم　　زاہد بہ ثواب و من بہ امیدِ عظیم
من دست تہی میروم او تحفہ بدست　　تا زیں دو کدام خوش کند طبعِ کریم

زاہد اور میں دونوں خدائے تعالےٰ سے جنت کی خواہش رکھتے ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ اُس کو اعمالِ حسنہ کے ثواب پر ناز ہے اور مجھے رحمت پر۔ میں خالی ہاتھ جا رہا ہوں اور وہ اعمال کا تحفہ لیکر جا رہا ہے۔ دیکھنا ہے ان دونوں چیزوں میں سے کون سی چیز طبعِ کریم (خُدا) کو خوش کرتی ہے، ظاہر ہے کہ بخشش کرنے والا تہی دست کی تلاش میں رہتا ہے، اور مفلس و قلاش ہی کو دیکھکر طبعِ کریم خوش ہوتی ہے۔ اسلئے خدا میری تہی دستی کو ہی دیکھکر خوش ہوگا۔

در درگہ ما دوستی یک دلہ کن　　ہر چیز کہ غیرِ ماست آنرا یلہ کن
یک صبح باخلاص بیا بر درِ ما　　گر کارِ تو بر نیاید آنگہ گلہ کن

ہم روز دُعا مانگتے ہیں لیکن قبول نہیں ہوتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے دل غیر اللہ سے لگے ہوئے ہیں، شاعر اپنی زبان میں خدا کی طرف سے کہتا ہے کہ ہماری بارگاہ میں بس ہم سے محبت کر اور غیر اللہ کی دوستی کو ختم کر دے، اس کے بعد ایک ہی صبح کو خلوص کے ساتھ ہمارے دروازے پر آ، اگر تیرا مطلب پورا نہ ہو تو پھر ہم سے شکایت کرنا۔

بنگر بجہاں سرِّ الٰہی پنہاں　　چوں آبِ حیات در سیاہی پنہاں
پیدا آمد ز بحر ماہی انبوہ　　شد بحر ز انبوہیِ ماہی پنہاں

کائنات اور ذاتِ باری کا جو تعلق ہے اُس پر کتنے محققانہ اور صوفیانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے کہ نگاہ کے سامنے سے حجابات اُٹھنے لگتے ہیں، فرماتے ہیں کہ جس طرح آبِ حیات اندھیرے میں چھپا ہوا ہے اسی طرح مظاہرِ کائنات میں سرِّ الٰہی پوشیدہ ہے۔ آگے چل کر اس مسئلہ کو واضح کرتے ہیں؛ مچھلیوں کا انبوہ (ماہی انبوہ) دریا سے پیدا ہوا اور پھر دریا مچھلیوں کے انبوہ میں چھپ گیا۔ اسی طرح تمام کائنات وجودِ حقیقی کے منبع سے ظاہر ہوئی اور پھر خود "وجود" کائنات کے مظاہر میں چھپ گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مظاہر و آثار بالذات کوئی حقیقت نہیں رکھتے، دوسرے جب مظاہر اپنے مرکز کی طرف عود کریں گے، اصل حقیقت بے نقاب ہو کر اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہو جائیگی۔

گر سقفِ سپہر گردد آئینہ چنیں　　در تختۂ فولاد شود روئے زمیں
از روزیِ تو کم نشود داں بیقیں　　می داں کہ چنیں است، چنیں است چنیں

قناعت و توکل کی کتنی دل لگتی تعلیم دی ہے، یعنی اگر آسمان سے ایک قطرہ بھی پانی کا نہ ٹپکے اور زمین فولاد کی چادر بن کر استعداد و نمو کو زائل کر دے پھر بھی جو روزی تیرے مقسوم لکھی ہوئی ہے، اُس میں کمی نہیں ہو سکتی۔

درویشی کن و قصدِ درِ شاہ مکن　　وز دامنِ فقر دست کوتاہ مکن
اندر دہنِ مار شود مال مجو　　در چاہ نشیں و طلبِ جاہ مکن

جاہ طلبی اور زر اندوزی کی طمع شرافتِ انسانی کو برباد کر دیتی ہے، اسی قربانگاہ پر انسانی شرف واحترام کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے، شاعر کہتا ہے کہ سانپ کے منہ میں چلا جا لیکن مال و دولت کی تلاش نہ کر، اور کنوئیں میں جا کر بیٹھ جا مگر جاہ و مرتبت کو نہ ڈھونڈ۔ آج دُنیا میں ان ہی چیزوں کی طلب نے فساد و طغیان کا بازار گرم کر رکھا ہے اور ایک انسان، دوسرے انسان کا خون کا پیاسا نظر آتا ہے

از ساحتِ دل غبارِ کثرت رُفتن　　بہ زانکہ بہرزہ دُرِ وحدت سُفتن
مغرور سخن مشو کہ توحیدِ خدا　　واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

رُباعی کا ہر مصرعہ حقیقت کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے، فرماتے ہیں کہ توحیدِ خدا پر خالی خولی بحث کرنے سے یہ بہتر ہے کہ دل کو کثرت کے گرد و غبار سے پاک کیا جائے تو اس بات پر غرہ نہ کر کہ توحیدِ خدا پر تو بہت اچھی بحث کر سکتا ہے، اس لئے کہ توحیدِ خدا "ایک کہنے" کا نہیں بلکہ "ایک دیکھنے" کا نام ہے۔ یعنی توحید کو قال تک محدود نہ رکھ بلکہ "حال" بنا لے، صرف زبان سے "اللہ واحد" کہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ زبان سے کہتا ہے تو دل سے اقرار بھی کر، اور نگاہ کو "وحدت نگر" بنا۔

رفتم بطبیب و گفتم از دردِ نہاں　　گفتا کہ زغیرِ دوست بربند زباں
گفتم کہ غذا؟ گفت ہمیں خونِ جگر　　گفتم زچہ پرہیز؟ گفت از ہر دو جہاں

طبیب سے یہاں مُرشد مُراد ہے، میں طبیب کے پاس گیا اور اُس سے اپنے دردِ نہاں کی کیفیت بیان کی، اُس نے کہا کہ خدا کے سوا کسی کا نام منہ سے نہ نکال، جب وہ دردِ نہاں کا علاج بتا چکا تو میں نے اُس سے پوچھا کہ میں کیا غذا کھاؤں سو اُس نے کہا کہ خونِ جگر، میں نے دریافت کیا کہ کس چیز سے پرہیز کروں، تو اُس نے جواب دیا کہ دونوں جہاں سے پرہیز کر۔ یعنی دردِ یقین کا مداوا منظور ہے تو خدا کے لئے دونوں جہاں سے منہ موڑ لے۔

دُنیائے دنی پر ہوس را چہ کنی　　آلودۂ ہر کس و ناکس را چہ کنی
آں یار طلب کن کہ ترا باشد و بس　　معشوقۂ صد ہزار کس را چہ کنی

دُنیا کو "معشوقۂ صد ہزار کس" کہکر کتنی نادر نفسیاتی حقیقت کو پیش کیا ہے ۔ کہتے ہیں کہ ایسے یار کو ڈھونڈھ جو تیرا ہی ہو کر رہے، دُنیا تو ہزاروں کی معشوقہ ہے، اس پر کیوں لوٹ ہوا جاتا ہے۔

گر صیدِ عدم شوی زخود رستہ شوی　　　در وصفِ خویش ربی بستہ شوی
می داں کہ وجودِ تو حجابِ رہِ تست　　　با خود منشیں کہ ہر زماں خستہ شوی

[illegible] کا درس ہے جو اوپر دیا جا چکا ہے۔ یعنی جب تک خودی باقی ہے خدا نہیں مل سکتا۔

مضمون کے [illegible] کرنا ہے کہ ان میں سے [illegible] مولانا [illegible] کی قدر [illegible] کے یہاں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس توارد کے متعلق اگر [illegible] میں بحث کروں گا۔

ماہر القادری

بحرِ کامل

جو دل و جگر میں اُتر گئی وہ نگاہِ یار کہاں ہے اب　　　کوئی حد ہے زخمِ نہاں کی بھی کہ حیات وہم و گماں ہے اب
ملی عشق کو وہ حیاتِ نو کہ عدم کا جس میں سکون ہو　　　یہ ہیں درد کی نئی منزلیں کہ خلش نہ سوزِ نہاں ہے اب
نہ وہ حسن و عشق کی صحبتیں، نہ وہ ماجرے نہ وہ سانحے　　　نہ وہ بیکسوں کا سکوتِ غم نہ کسی کی تیغِ زباں ہے اب
جنہیں زندگی کا مذاق تھا وہی رازِ مرگ سمجھ سکے　　　نہ اُمید و بیم کے مرحلے نہ خیالِ سود و زیاں ہے اب
کبھی تھیں وہ اُٹھتی جوانیاں کہ غبارِ راہ نجوم تھے　　　نہ بلندیاں وہ نظر میں ہیں نہ وہ دل کی برقِ تپاں ہے اب
مجھے مٹ کے بھی تو سکوں نہیں کہ یہ حالتیں بھی بدل چلیں　　　جسے موت سمجھے تھے عشق میں وہ مثالِ عمرِ رواں ہے اب
یہ فروغِ حسن و جمال کیا یہ فریبِ دید و وصال کیا　　　جو چمک رہا تھا رُکا رُکا وہی دردِ ہجر جواں ہے اب
وہ مذاقِ شعر بدل گیا جسے لکھنؤ میں فروغ تھا　　　جسے لوگ جانِ سخن کہیں نہ "زباں" نہ "حسنِ بیاں" ہے اب
یہ فراق ہے کہ وصال ہے کہ یہ محویت کا کمال ہے　　　وہ خیالِ یار کہاں ہے اب وہ جمالِ یار کہاں ہے اب
وہ فریبِ صبر و سکوں مٹا وہ اُمیدِ چارہ گری مٹی　　　نہ اِدھر نگاہِ کرم اُٹھا نہ ترا التفات گراں ہے اب

وہ نگاہ اُٹھ کے پلٹ گئی، وہ شرارے اُڑ کے نہاں ہوئے
جسے دل سمجھتے تھے آج تک وہ فراق اُٹھتا دھواں ہے اب

میرے نغمے

(از قاضی نذرالاسلام)

جنہوں نے کوہ و بیاباں کے دامن میں شاداب فصلیں کھڑی کردی ہیں،
جن کی مضبوط مٹھیاں پھاوڑے چلاتے چلاتے پتھر کی طرح سخت ہو گئی ہیں،
سہمی ہوئی زمین جن کے آگے پھولوں کی ڈالی پیش کیا کرتی ہے ——
مَیں انہیں کے گیت گاتا ہوں!

حیوانوں اور درندوں کی یہ بستی، موت اور بڑھاپے کی یہ دنیا —— جن کے جتن سے سدا بہار گل بن بن گئی۔
جنہوں نے محبت کے ترانے ایک نئی لَے میں گائے —— اور جن کی ندا کو سنکر یہ کائنات شہابِ ثاقب کی طرح خلا میں چکر لگانے لگی۔
مَیں انہیں کے گیت گاتا ہوں!

جنہوں نے آن کی آن میں ہزاروں جنّتیں بنا کر مسمار کر دیں۔ جن کی زندگی کی روانی کو کوئی نہیں روک سکا،
جنہوں نے ہمالیہ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر سورج سے باتیں کیں، جنہوں نے سمندروں کو بے آب کر دیا،
نئی دنیا کی تلاش میں جو برفستانوں کو چھان آئے اور ہواؤں میں تیرتے پھرے،
مَیں انہیں کے گیت گاتا ہوں!

شباب کا ولولہ بے قید ہے —— وہ چاند اور ستاروں میں، جنّت و دوزخ میں، عرش پر اور فرش پر —— ہر طرف پیامِ زندگی سناتا پھرتا ہے،
وہ زندگی کا سودا خریدنے کیلئے موت کے بازار میں جاتا ہے —— اور میدانِ جنگ کے قمارخانوں میں زندگی کا جوا کھیلتا ہے۔
مَیں جو ایک شاعرِ بے نوا ہوں، اُس کی حمد و ثنا کے سوا اور کر ہی کیا سکتا ہوں۔

جو ہر زمانے میں اور ہر دَور میں انقلاب کا پرچم لہراتے ہیں،
جن کا لبریز شوقِ زندگی اپنے سکون کے لئے زہر کے پیالوں اور پھانسی کے تختوں کا جویا رہتا ہے،
جو پہاڑی ندیوں کی طرح کسی رکاوٹ کی پروا نہیں کرتے، جنہیں کم نظر بد دعائیں دیتے ہیں اور کم ظرف 'بد اخلاق' کہتے ہیں،
مَیں اُن کی چوکھٹ پر سر جھکاتا ہوں اور انہیں کے گیت گاتا ہوں!

مترجمہ:۔ اختر حسین رائے پوری

بادۂ مشرق کے دو جام

۱

رقاصہ

گپتا۔ مہاتما بدھ کا پیرو، شہر متھرا کی فصیل کے پاس خاک پر سویا ہوا تھا۔

چراغ گُل ہو چکے تھے۔ تمام گھروں کے دروازے بند تھے اور آسمان پر ابر نے ستاروں کو چھپا رکھا تھا۔

یکلخت کسی کے پاؤں نے اس کے سینے کو چھوا۔ اور پازیب کی جھنکار نے اُسے بیدار کر دیا۔

وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ ایک عورت ہاتھ میں شمع لئے کھڑی تھی۔ جس کی روشنی گپتا کی معصوم آنکھوں پر پڑ رہی تھی۔

یہ ایک نوجوان رقاصہ تھی۔ جس نے بیش قیمت جواہرات زیب تن کر رکھے تھے وہ جوانی کے نشہ میں سرشار ہلکے نیلے رنگ کا ریشمی دوپٹہ اوڑھے تھی۔

اُس نے شمع کو نیچا کر کے نوجوان گپتا کے انتہائی دلکش چہرے کو غور سے دیکھا۔

"نوجوان سادھو! مجھے معاف کیجئے کہ میں نے آپکو خواب سے بیدار کیا" وہ بولی: "میری التجا ہے کہ آپ غریب خانے پر تشریف لے چلیے۔ کیونکہ یہ خاکی فرش آپ کے سونے کے لئے موزوں جگہ نہیں۔ میرا نرم و گداز بستر آپکے آرام کرنے کیلئے حاضر ہے"

سادھو نے جواب دیا "اے عورت جا! تو اس وقت اپنا کام کر۔ وقت آنے پر میں خود بخود تیرے پاس پہونچ جاؤنگا"

* * *

راستے میں اُگے ہوئے درختوں کی شاخیں گلہائے رنگا رنگ کے بار سے جھکی ہوئی تھیں۔

نسیم بہار کے جانفزا جھونکوں میں دلگداز نغمے ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔

اہالیانِ متھرا موسم بہار کی خوشی میں گلوں کا نظارہ کرنے کیلئے شاداب و سرسبز وادیوں میں نکل گئے تھے۔

آسمان پر سے ماہِ کامل خاموش و سنسان مکانوں کے پُرسکون و غیر متحرک سایوں کا نظارہ کر رہا تھا۔

نوجوان سادھو شہر کی پُرسکوت و سنسان گلیوں میں سے گزر رہا تھا۔ کبھی کبھی ۔۔۔ تھوڑے فاصلہ پر ۔۔۔ کسی آم کے پیڑ پر سے غمزدہ کوئل کی دردناک کوک سنائی دیتی۔ جیسے کوئی نغموں میں محبت کے شکوے بیان کر رہا ہو۔

گپتا شہر کے دروازے سے ہوتا ہوا باہر نکلا اور فصیل کے قریب آکر رک گیا۔

اُس نے دیکھا کہ قریب ہی دیوار کے سایہ میں ایک بیمار عورت حالتِ غشی میں پڑی ہوئی ہے ۔۔۔ وہ طاعون کے مرض میں مبتلا تھی اور اس کا تمام بدن زخموں سے چور چور تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ انتہائی بیدردی سے اسے بہ سرعت گھسیٹ کر شہر سے باہر نکالا گیا تھا۔

نوجوان سادھو وہیں اُس کے پہلو میں بیٹھ گیا اور اس کا سر اُٹھا کر اپنے زانو پر رکھا۔ اس نے بیجان عورت کے خشک لبوں کو پانی سے تر کیا اور اس کے زخموں کی مرہم پٹی کر نیلگا۔

عورت نے آنکھیں کھولیں: "اے نیک دل شخص! تو کون ہے؟"

"آخرکار وہ وقت آ پہنچا کہ میں تیری ملاقات کروں۔ دیکھ! میں تیرے پاس حاضر ہوں" نوجوان سادھو کے منہ سے یہ الفاظ نکلے

(ٹیگور)

راجپوتی نغمۂ محبت

پاربتی: دریچے میں سے:

اے میرے محبوب! اگر تو اس وقت وہ تلسی کا پھول ہوتا جسے میں نے اپنے گیسوؤں میں سجا رکھا ہے — یا تو مرصع اور چمکتا ہوا زنگار نگینہ ہوتا جو میری آستین کی زینت بنا ہوا ہے — اور اگر تو وہ کیوڑہ کی روح ہوتا جس نے میرے ریشمیں لباس کو معطر و مسحور کر رکھا ہے — یا تو اس پٹکہ کا چمکدار اور ارغوانی طرّہ ہوتا جس میں آج بن رہی ہوں۔

میرے محبوب! اگر تو وہ معطر پنکھا ہوتا جو میرے تکیہ پر پڑا ہوا ہے — یا ایک صندلی شہنائی — یا تو نقرئی چراغ ہوتا جو اس وقت میری پرستش گاہ میں جل رہا ہے — تو ہماری زندگی کیا ہی خوش نصیب ہوتی — کیونکہ — اس صورت میں مجھے اس حاسد صبح کا کچھ خوف نہ ہوتا جو ہر روز تحقیر آمیز ہنسی کے ساتھ نمودار ہو کر میرے اور تمہارے درمیان عارضی جدائی کا تاریک و غمگین نقاب حائل کر دیتی ہے —

اے گزرنے والے لمحات! دوڑو — جنگلی مکھیوں کی مانند — باغوں کی جانب جہاں آفتاب غروب ہوتا ہے —

دن کی روشنی! اڑ — جنگلی طوطوں کی مانند — مغرب کے گوشوں کی طرف۔

آ! اے نرم و نازک شب! اپنی شیریں و تسکین بخش تاریکی پھیلا دے اور میرے محبوب کو واپس لا کر جلدی میرے سینے سے لگا دے۔

(سروجنی نائیڈو)

امر سنگھ: گھوڑے کی زین پر سے:

اے میری محبوبہ! اگر تو اس وقت وہ عقاب ہوتی جو میرے ہاتھ پر بیٹھا ہوا پھڑپھڑا رہا ہے اور جسکے گلے میں بندھے ہوئے گھنگرو، جب میرا گھوڑا چلتا ہے، تو نہایت خوش کن آواز پیدا کرتے ہیں — اور اگر تو وہ سُرخاب کا پر ہوتی جو میرے کلاہ کی زینت بنا ہوا ہے — یا تو چمکیلی، تیز و آبدار اور ظفرمند تلوار ہوتی جو میرے پہلو میں لرز رہی ہے۔

میری محبوبہ! اگر تو وہ سپر ہوتی جو مجھے دشمنوں کے تیروں کی زد سے بچاتی ہے — یا تو زمردیں تعویذ ہوتی جو سفر کی صعوبتوں سے محفوظ رکھنے کے لئے میرے بازو پر بندھا ہوا ہے — تو ہماری زندگی کیا ہی خوش نصیب ہوتی — کیونکہ — اس صورت میں نقارۂ صبح کی غریں مجھے تیرے سینے سے کیونکر جدا کر سکتیں؟ اور طلوع صبح کے ساتھ ہمارے وصالِ نیم شبی کے عارضی طور پر ختم ہو جانے کا مجھے مطلق احساس نہ ہوتا۔

اے گزرنے والے لمحات! دوڑو — جنگلی ہرنوں کی مانند — مرغزاروں کی جانب جہاں آفتاب غروب ہوتا ہے —

دن کی روشنی! بھاگ — جنگلی گھوڑوں کی مانند — مغربی چراگاہوں کی طرف! —

آ! اے شب پُرسکوں! اپنی نازک اور آرام دہ تاریکی پھیلا دے۔ اور مجھے میری محبوبہ کے معطر و شمیم نفس سینے پر لے چل —

ساغر جعفری۔ بی۔ اے، ایل ایل۔ بی

اِصلاح رسم الخط

ساقی کے تازہ پرچے میں جناب اختر حسین صاحب رائے پوری کا بصیرت افروز مضمون "اُردو زبان کا مستقبل" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس میں صاحب موصوف نے موجودہ نستعلیق خط میں بعض نہایت مناسب صلاحیں کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ منجملہ اُن کے ایک یہ بھی ہے کہ مختلف مگر ہم آواز حروف کی تعداد کم کرکے ایک کردی جائے۔ جیسے ص، ث اور س ان تینوں حروف کے قائم رہنے سے جو پیچیدگی پیدا ہوتی ہے اُسے اس طرح دُور کیا جائے کہ صرف س سے کام لیا جائے اور ث، ص کو ساقط کر دیا جائے اور اسی طرح ط کو ت کے عوض۔ الف کو ع کے عوض اور ز کو ض۔ ظ۔ ذ، وغیرہ کے عوض طلاق دیدی جائے اور اس طرح قرات اصوات کی باریکیوں اور مخرج کی نازآفرینیوں سے ایک دفعہ ہی آزادی حاصل کرلی جائے۔

اس سلسلہ میں مجھے کچھ اور گذارش کرنی ہے۔ اگر ہم اپنے رسم الخط کو زیادہ آسان اور سائنٹفک بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اعراب اور تنوین کے گورکھ دھندے سے بھی باہر نکلنا پڑے گا۔ مثلاً "فوراً" اور "مثلاً" کو بجائے تنوین سے لکھنے کے فورن اور مسلن یعنی نون سے لکھا جائے اور اس طرح اعلان نون کو جائز قرار دیا جائے۔ تاکہ بولنے اور لکھنے میں زیادہ فرق باقی نہ رہے۔ اور اسی طرح الف لام کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔ اس اہل سے ماسوا اس کے کہ ہجا میں پیچیدگی پیدا ہوتی تلفظ پر غیرضروری بوجھ پڑتا ہے اور حروف شمسی وقمری کی تمیز چونکہ ہر کس وناکس میں نہیں ہوتی تلفظ غلط ہو جاتا ہے۔ لہٰذا الف لام سے جو بے وجہ کا تکلف زبان و تحریر اٹھا رہی ہے اس سے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے۔ بالکل کو بجائے علیحدہ علیحدہ دو ٹکڑوں میں لکھنے کے بلکل ملا ہوا لکھا جائے جس طرح فی الحقیقت بولا جاتا ہے۔ اسی طرح بالتفصیل کو بت تفسیل لکھا جائے اور عبدالرحیم۔ عبدالرحمٰن۔ عبداللطیف کو ابدرّحمان۔ ابدرّحیم۔ ابدل لطیف۔ لکھا جائے اور فی الحقیقت کو فلحقیقت۔

ع تو بے شُبہ بقول اختر حسین صاحب غیرضروری ہے ہماری رائے میں ہمزۂ وصل کا وجود بھی بے کار ہی سا ہے اس لئے موسیٰ اور عیسیٰ کو بجائے اس قدر تکلف سے لکھنے کے موسا اور ایسا ہی لکھ جائے نیز تنخواہ۔ یہی خواہ وغیرہم کا واؤ چونکہ بولنے میں نہیں آتا اس لئے ساقط قرار دیا جائے۔ "تنخاح" اور بحی خاح" لکھا جائے۔ مثلاً اگر کسی شعر میں "شکوہ" کا لفظ ہائے خفی کے ساتھ ہے تو واؤ پر زبر دیکر کام چلا لیجئے۔ اور اگر کھینچکر پڑھا جائے تو الف ایزاد کیجئے۔ شکوا۔ ورنہ ح تو موجود ہی ہے اسے استعمال کر لیجئے۔ بہرحال غیرضروری تکرار اس عجلت پسند زمانہ میں موجبِ تعویق اور سببِ تکلیف ہے اس سے گریز کیجئے۔ یہ چند امثال بطور نمونے کے تحریر کی گئی ہیں۔ جب اصلاح رسم الخط کے لئے کچھ سمجھدار غیرمتعصب اربابِ نظر سر جوڑ کر بیٹھیں گے سینکڑوں غیرضروری عربی و فارسی الفاظ میں تحریف کریں گے۔ علیحدہ کو الاحدا لکھنے میں وہ تامل نہ کریں گے لیکن یہ سب اُس وقت تک کے لئے موقوف ہے جب حامیانِ اُردو رسم الخط کے مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے پر آمادہ ہونگے۔ ابھی تک تو اس طرف عمداً بے پروائی برتی جارہی ہے اور دعویٰ یہ کیا جارہا ہے کہ ہمارے اسلاف و قاعدین نے زمانۂ سابقہ میں جو خطاطی کے قواعد منضبط کر دئے ہیں وہ اٹل ہیں اُن میں ردّ و بدل کی مطلق گنجائش نہیں ہے اور عوبکے ماہرین ابجد نے آج سے سینکڑوں برس پہلے اس زمانے کی ضروریات کا پورا پورا اندازہ کر لیا تھا۔ کسی زبان کا مقصد اصلاح اور تبدیلی کے لئے آمادہ نہ رہنا اُس کے سکوت و جمود پر دلالت کرتا ہے جو بیّن علامت ہے موت کی۔ جو لوگ اُردو زبان اور رسم الخط کے بارے میں آجکل اخبارو

رسائل میں مضامین لکھ رہے ہیں اُن میں (مجھے افسوس کے ساتھ اس تلخ حقیقت کا اظہار کرنا پڑتا ہے) بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے سنجیدگی اور متانت سے باقاعدہ علم لسانیات کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ خود میں بھی اس کا دعویدار نہیں ہوں لیکن اُردو رسم الخط کے نظری پہلو سے زائد اس کے عملی پہلو کو دیکھا ہے اور میں تجربے کی بنا پر ایمانداری اور صاف گوئی سے کہتا ہوں کہ اس میں اصلاح کی خاطر خواہ گنجائش ہے۔ اصلاح کو ہوا سمجھنے والوں کے سامنے ایک شاگرد کی مثال پیش کرتا ہوں۔

حال ہی کی بات ہے کہ میں اپنے ایک خورد سال بچے کو اُردو رسم الخط پڑھا رہا تھا دو فقرے ایسے آئے جن کے سمجھانے اور یاد کرانے میں مجھے اپنی زبان کی کمزوری محسوس ہوئی۔ قاعدہ میں لکھا تھا۔ (۱) وہ ایک ریل ہے۔ (۲) یہ ایک جھول ہے۔ اوّل فقرے میں 'ر' کے نیچے زیر اور دوسرے میں 'جھ' کے اوپر پیش تھا۔ لڑکا کبھی Rel اور کبھی Reel[1] پڑھتا تھا اس لئے کہ 'ر ی' زیر 'رے' بھی ہے اور 'ری' بھی اور اسی طرح کبھی Jhola اور کبھی Jhoola پڑھتا تھا۔ دونوں فقروں کے ہجے ایک ہیں تلفظ میں فرق ہے۔ معنی دونوں طرح تلفظ کرنے سے برقرار رہتے ہیں۔ سیاق سباق تھا نہیں۔ الگ الگ فقرے لکھے تھے جیسا کہ قاعدوں میں عموماً لکھے ہوتے ہیں۔

بہت سے لوگ ہونگے جو اشباع و تنوین کو بجنسہٖ قائم رکھنا پسند کریں گے اور ابجد میں تعریف کرنے پر شدید اعتراضات کریں گے بالخصوص یہ کہ کسی لفظ کا مادہ تلاش کرنا ہوگا تو ہم آہنگی کی بنا پر حروف خلط ملط ہوجائیں گے اور یکرنگی اصوات سے لغت کی تدوین میں بھی دقتیں پیدا ہونگی۔ مجھے شیدائیانِ خط فارسی کے ہر اعتراض کا پورا پورا احترام ہے لیکن میری پُرخلوص استدعا ہے کہ اپنی زبان و خط کو عالمگیر بنانے کے لئے ہمیں ہر ممکن کوشش کرنی ہے اور چونکہ مقابلہ ہندی رسم الخط سے ہے جو بلاشبہ اُردو سے کہیں زیادہ سہل الحصول ہے اس لئے ہمیں جسقدر بھی جانفشانی نہ کرنی پڑے کم ہے۔

کتنے بڑے شرم کی بات ہے کہ ہندی زبان کا ٹائپ رائٹر آچکا، پُرانا ہوچکا اور ہم ہیں کہ نستعلیق کی نوک پلک پر مٹے ہوئے ہیں اور حُروف کو وہی لکھنے پر اصرار کر رہے ہیں۔ اگر یہ خط برادران وطن اہل ہنود کے لئے قابل قبول بنایا جائے گا تو اس میں اُن کی لسانی ضروریات اور خلقی کمزوریوں کا بھی خیال رکھا جائے گا۔ رسم الخط انسان کی سہولیت اور آسانی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ انسان کو رسم الخط کے واسطے خلق نہیں کیا گیا۔ بڑی خوشی کی بات ہے اُردو زبان میں اختر حسین صاحب رائے پوری نے جرأت سے کام لیکر سچی اور بےلاگ تنقید اور مفید اصلاح پیش کی۔ اِس مضمون کو دیکھکر یہ شبہ زائل ہوگیا کہ اُردو محدود النظر ہونے کی وجہ سے ایسے نقادوں کی پرورش نہیں کرتی جو خود اُس کی اچھائیاں اور بُرائیاں دکھا دینے میں بھی تامل نہ کریں۔ یہ مضمون خود تنقیدی کا پہلا اور سچا مضمون ہے جو اُردو کی جنم بھوم سے شائع ہوا ہے۔ ہمیں اُمید ہے اُردو کے بہی خواہ اُردو کو معرب بنانے کی بجائے عربی کو اُڑدوانے میں مصروف ہوجائیں گے۔ اور اصلاحِ خط کے بارے میں سوچ سمجھکر تنقید کریں گے تاکہ اِس اہم مسئلہ کا ہر پہلو روشن ہوجائے۔

سید ابن حسن شارق دہلوی

---

[1] انگریزی حروف میں یہ الفاظ اس لئے تحریر کئے گئے کہ ناظرین اُن کا مختلف تلفظ سمجھ لیں۔ ہندی اِس لئے نہیں لکھی کہ اس سے تو بغض للہی ہے۔